سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

سرگزشت

ماہنامہ کراچی

سعودی عرب میں
قیمت: 12 ریال

اپریل
2005ء

PP
Pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مردور تراش:

ایک پرعزم شخص جس کی جدوجہد نے صدیوں پرانے نظام کو بدل ڈالا۔

سرمایہ دار مفلس:

شخصیات

ایک صفحے میں مکمل مختصر مگر ایک نادر و نگار کا تعارف خاص

15 — ہر گز نشت — ادارہ

16 — شہر خیال — معراج رسول

گفت و شنید

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے شریف آپ کے سوال

سوانح

دو عظیم انقلابی جس کی موت پر صرف پانچ منٹ کا کام بند کر دیا گیا

22 — مزدور تراش — ڈاکٹر ساجد امجد

61 — شامت اعمال — سید جاذب احتشام

جرم و سزا

"آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا

کھلاڑی

کسی مضبوط جسم کے مخالف کی ملکیت یہ کام معمولی بات نہیں

69 — پر استقامت — کاشف زبیر

81 — لمحہ شمار — محمد عباس ثاقب

تبصرے

ایک ایسی فلم کی کہانی جس نے دنیا بھر میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے

یادداشتیں

مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات

84 — ریکارڈ — ادارہ

86 — فلمی الف لیلہ — علی سفیان آفاقی

قلم و صحافت

صحافت اور ادب کی ان کہی کہانیاں، صحافیوں اور ادیبوں کی زندگی کی جھلکیاں

شکاریات

ایک مخصوص نیچہ کے شکار کی خاطر لاسکا کا سفر

115 — ناکام سفر — میاں فاروق

121 — ٹوپلیسوں — ایم شاہد حنفی

کھیل

ان دونوں کی موجودگی بڑے بڑے بازوں کے پسینہ چھڑا دیتی تھی

استاد نامہ

دعا کی قبولیت کے لئے نہ جگہ کی قید ہے نہ وقت کی

127 — آؤ کوپ چلیں — منظر امام

132 — روم کی گلیاں — علی سفیان آفاقی

سفر نامہ

اس نے اٹلی کی سیر کو سونے پر سہاگہ بنا دیا

سراغرسانی

چند نوجوانوں کی قوتی ہیجان کتنی زندگیاں تباہ کر گیا

151 — ترنگ — سید احتشام

159 — بامال لوگ — لبنیٰ زبیر

مہم جوئی

ایسے لوگوں کی حوصلہ مندی کا مظاہرہ جو شکست کے قائل ہی نہ تھے

تاریخ

کیا کوئی جانتا ہے کہ ان میں کیا شامل ہے؟

170 — عجائبات عالم — ادارہ

173 — کیمیا گر — ڈاکٹر عبدالرب بھٹہ

خواہشات

سونا بنانا ابدی حیات پانا کیا انسان کے بس میں ہے؟

معاشرت

انسان کے روز و شب پر مقدر کی آہنی گرفت کا دلچسپ تماشا

178 — مقدر — محی الدین نواب

220 — سرمایہ دار مفلس — جاوید

سچ بیانیاں

ایک لالچی نوجوان کی روداد جس کا خون سفید ہو گیا تھا

241 — ظالم مہدی — طارق محمود

253 — عجیب داستان — صبا جت رضا

سچ یہ ہے کہ "میں کو اک کھونا ظر آتے ہیں جگہ"

265 — فائنل سلیکشن — رمیہ سرمد

277 — زندہ شکار — فلک ناز حسین

خواہشات کے ہاتھوں مجبور ہونے والی ایک لڑکی کی کہانی

287 — مثلث — نو شاد عادل

297 — عشق بلا خیز — کنول عرفان

بعض لوگوں کی فطرت کبھی نہیں بدلتی

303 — ارمانوں کی قبر — ماہ نور جمال

317 — ہم کہ ٹھہرے اجنبی — یمنیٰ احمد

جو انسان کی تقدیر میں ہو اسے کون روک سکتا ہے

325 — فیصلہ — اشتیاق فاطمہ عطیہ

000 — پارچے — قارئین و ادارہ

ان کی کہانیاں نوکے حیرت انگیز فیصلوں کا انجام؟

بابائے ڈراما

سرگزشت

تقدیر کے کھیل دیکھنے ہوں تو دنیا کے نامور لوگوں کی داستانِ حیات پڑھیے۔ جب تک وہ زندہ رہا، کوئی اسے منہ نہیں لگاتا تھا۔ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے مرنے کے ایک سو سال بعد تک اس کا نام گمنامی کے غبار میں چھپا رہا مگر یہ وہ شخص ہے جس کے متعلق اب تک لاکھوں الفاظ لکھے جا رہے ہیں۔ ہر سال ہزاروں لوگ اس گھر کو دیکھنے کے لیے جاتے ہیں، جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

یہ وہ شخص تھا جس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ایک روز اس کا نام ادبی افق پر ستارہ بن کر چمکے گا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی محبت کا انجام بے حد المناک ہوگا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی شادی اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہوگی۔

اس کی فطرت عجیب تھی۔ وہ ایک لڑکی این ویٹلی سے محبت کرتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اور لڑکی این لانگھوے سے بھی معاشقہ لڑا رہا تھا۔ یہ تھوے کو اندازہ ہوا کہ اس کا محبوب کسی اور لڑکی سے بھی رومان لڑا رہا ہے تو اس نے ایک چال چلی اور شور مچایا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کی چال کامیاب رہی اور اسے زبردستی لانگھوے سے شادی کرنی پڑی۔ یہ لڑکی اس سے آٹھ برس بڑی تھی۔ اس نے اس کی زندگی تلخ کر دی۔

اس کا وطن انگلستان میں اسٹراٹ فورڈ نام کا قصبہ ہے۔ یہ آج ایک خوبصورت قصبہ ہے مگر اس کے زمانے میں یہ بے حد گندہ اور غلیظ ہوا کرتا تھا۔

اس کا باپ ہر چند کہ ایک معزز آدمی تھا مگر وہ پڑھا لکھا نہ تھا بلکہ اس کے گھر میں تو کوئی بھی پڑھا لکھا نہ تھا۔ اس نے بھی تیرہ سال کی عمر تک تو پڑھا پھر پڑھائی چھوڑ دی اور اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا، جو ایک کاشت کار تھا اور بھیڑیں پالتا تھا۔

مرتے وقت وہ بے شک امیر تھا۔ وہ اپنے قصبے سے لندن منتقل ہو گیا تھا اور اس نے اداکاری کو پیشہ بنا لیا تھا۔ پھر اس کے پاس اس قدر رقم جمع ہو گئی کہ اس نے لندن میں دو تھیٹر خرید لیے اور لوگوں کو سود پر قرض دینے لگا۔

مرتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کے نام کوئی رقم یا جائیداد نہیں لکھی۔ آپ یقیناً اس کی حسِ مزاح کی تعریف کریں گے کہ اس نے وصیت میں اپنی بیوی کے نام دو چارپائیاں لکھی تھیں۔

وہ دنیا بھر میں اپنے ڈراموں کے لیے مشہور ہے مگر اس کے ڈرامے کی کتاب اس کے سامنے نہیں چھپ سکی تھی۔ آج اگر آپ اس کے اصل مسوّدے کو خریدنا چاہیں تو کم از کم ایک ملین ڈالر خرچ کرنے ہوں گے جبکہ اپنی زندگی میں اسے اس کا معاوضہ صرف سو پاؤنڈ ملا تھا۔

اس کے بارے میں بہت سی متنازعہ باتیں بھی موسوم ہیں۔ کچھ لوگ اس کی شخصیت ہی سے انکاری ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے، یہ ڈرامے کسی اور کے لکھے ہوئے ہیں اور اس کا صرف نام ڈال دیا گیا ہے۔

اس کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے اس پر لکھا ہے ''اچھے دوستو، تمہیں یسوع کا واسطہ میری ہڈیوں پر رحم کرو۔ اگر تم نے انہیں کریدا تو خدا کا عذاب نازل ہوگا۔''

کیا آپ نے پہچانا یہ کس شخص کا بیان ہے؟ یہ ہے وہ شاعر اور ڈراما نگار جسے دنیا کے سب سے بڑے ڈراما نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جس نے شائی لاک یہودی کا کردار تخلیق کیا تھا۔ جس نے ''ہملٹ'' جیسا لازوال ڈراما لکھا۔ جسے دنیا ولیم شیکسپیئر کے نام سے جانتی ہے۔

●●●

قارئین کرام! آداب۔

اپریل کا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ بہار کے خوبصورت رنگوں نے خزاں رسیدہ درختوں کو پھر سے سبز لباس پہنا دیا ہے اور ہر طرف رنگ اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ اس حسین موسم میں دو پرانے اور تاریخی ''حریف'' ایک بار پھر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ یعنی پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیموں کے مقابلے۔ پاکستان کی ٹیم اپنا پہلا ٹیسٹ کھیل رہی ہے اور آثار ہیں کہ یہ میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہو جائے گا۔ کسی بھی کھیل میں ہار یا جیت اس کا اہم حصہ تو ضرور ہوتی ہے لیکن اصل چیز وہ جذبہ ہے جس کے ساتھ دو مدِ مقابل میدان میں اترتیں۔ انفرادی جذبے اور مہارت۔ کے ساتھ لیڈر یا قائد کی صلاحیتیں بھی کسی فیصلے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے استاد ذوق کا یہ شعر سنتے جائیے

راہِ جنوں میں تیز اٹھاؤں جو میں قدم
پائے زمین دہمتِ رہبر کو توڑ دوں

ایک طویل غیر حاضری کے بعد روبینہ نفیس انصاری، کوٹ ادو سے شہرِ خیال میں واپس آ رہی ہیں۔ ''سلام کے بعد عرض ہے کہ میں روبینہ نفیس آپ سب کے درمیان پھر سے موجود ہوں۔ ارے ارے یہ آپ سب منہ کھولے مجھے حیرت زدہ آنکھوں سے پلکیں جھپکے بغیر کیوں تکے جا رہے ہیں۔ ارے بھئی مجھے پہچانا نہیں؟ (آپ کو کون نہیں پہچانے گا۔ آپ کا تو سب کو انتظار تھا۔ ویلکم بلکہ جی آیا نوں) ہم ابھی زندہ جاوید ہیں۔ دیکھنے ابھی تک روبینہ ہی ہیں اور ایک خوش خبری بھی ہے، پر اس کے لیے کچھ انتظار..... مت پوچھئے جناب..... ان چند مہینوں میں کیا کیا قیامتیں گزریں۔

کیسے کیسے امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔ دکھوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو شیطان کی آنت کی مانند ختم شد ہونے پر نہیں آ رہی۔ آنسو اتنے ہیں کہ سیلاب کی صورت اختیار کر گئے اور پھر ان دکھوں، آنسوؤں میں اللہ پاک نے اتنی خوشیاں عطا فرمائیں کہ دامن چھوٹا پڑتا محسوس ہوا۔ ساری عمر سجدہ ریز ہو کر بھی شکر ادا کروں تو کم ہے۔ بس دعا کیجئے گا میری ان خوشیوں کو دشمنوں کی بری نظر سے اور ہر قسم کی مخالفت سے اللہ پاک بچائے۔ (آمین! اللہ تعالیٰ آپ کو، اور سب کو ہمیشہ خوش رکھے) اتنے مہینوں بعد ملی ہوں آپ سب سے اور آتے ہی اپنے دکھوں سے آپ سب کو بھی اداس کر دیا۔ (غم بانٹنے سے کم اور خوشیاں تقسیم کرنے سے زیادہ ہوتی ہیں) میں الحمدللہ ہونیو پتھک کے تیسرے سال میں شامل ہو چکی ہوں۔ آپ سب جلدی جلدی بتائیں کیسے ہیں، کیا ہو رہا ہے؟ مجھے بھی یاد رکھا کہ بھلا دیا (کیا آپ اتنے عرصے شہرِ خیال سے نہیں گزریں؟) مارچ 2005ء کا شمارہ 25 فروری کو ملا۔ ٹائٹل بہت پسند آیا جبکہ بیک سائڈ ہمیشہ کی طرح پسند نہیں آئی۔ اشتہارات پھلانگتے ہوئے پہنچے شہرِ خیال کی جانب کہ جہاں بہت سے جاننے والے نظر آ رہے ہیں اور دیسے بھی ''مجھے رہنا ہے تازہ تجربوں میں۔ پرانے خواب تو میرے نہیں ہیں۔'' عبدالرؤف بھائی ''عدم'' ہو کر بھی موجود ہیں۔ تمیرا کریم بھن کا تبصرہ جذبات سے بھرپور لگا۔ مرد ہوں یا خواتین جو برے ہیں وہ برے ہیں مگر خواتین وحضرات میں ابھی بھی اچھے اور وفا کو نبھانے والے موجود ہیں۔ مرد کو عورت پر فوقیت ہے اس بات کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ مرد اگر عورت سے زیادتی، ظلم یا بے انصافی کرے تو بھئی اللہ کی لاٹھی تو بے آواز ہوتی ہے۔ شفقت علی بھائی آپ کو مجھے ڈھونڈنے کی نوبت سے پہلے ہی میں آموجود ہوں۔ میں نے کہا تھا نا کہ جب تک زندہ ہوں تو آپ سب کے درمیان موجود رہوں گی۔ مجھے یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ یونس بلوچ صاحب آپ ایبسن بھی پہنچ گئے۔ جہاں رہیں خوش رہیں، مگر اپنے خرچے پر۔ حسن اکبر بھائی آپ نے مجھے یاد رکھا خوشی ہوئی مگر یہ تو بتا دیجئے کہ کون ہیں وہ جن کا انتظار ہے مگر نہیں آئے؟ شہرِ خیال میں محبت کے بارے میں ہر بندہ اور بندی اپنے خیالات، جذبات اور تجربات کے ساتھ موجود ہے۔ میں شان احمد بھائی سے کسی حد تک اتفاق کرتی ہوں مگر میرے خیال میں سچی محبت وہ ہوتی ہے جب دونوں فریق ایک دوسرے پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے اپنی برائیوں، بری بات اور خوبیوں، خامیوں سمیت قبول کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی خامیوں کو خوبیوں میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ شادی سے پہلے فریقین اپنے بارے میں مکمل سچائی سے ایک دوسرے کو آگاہ کریں پھر دیکھئے گا محبت کی گہرائی اور سچے جذبات کو۔ خامیاں اور خوبیاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ تو آیئے نا ہم سب پہلے اپنے اندر کی خامیوں پر نظر ڈالیں اور انہیں دور کریں اور محبت کرنے والوں کو خامیوں سمیت قبول کر کے ان کی خامیوں کو بھی خوبیوں میں تبدیل کریں۔ چلئے پہلا قدم اس تبدیلی کے لیے میں اٹھاتی ہوں۔ کہانیوں میں نکاح نامہ پڑھی، قانون کے رکھوالے ہی قانون شکنی کر رہے ہیں۔ پولیس والے نے اپنی ہوس کے لیے دو زندگیاں برباد کر دیں۔ پولیس اہلکاروں کا کام تو عوام کی مال وعزت کی حفاظت کرنا ہے جب پولیس والے عزتوں کو لوٹنے کے بجائے ان کی حفاظت کریں گے؟ (اس جملے میں بھی بہت اچھے لوگ ہیں مگر ان کی تعداد ابھی کم ہے) باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ اب اجازت، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ پاک سب مسلمانوں کو اپنی امان میں رکھے۔ معراج الکل اور اس ادارے کے ہر فرد کو خوشیوں سے بھرپور زندگی عطا فرمائے۔'' (آمین)

☆☆☆

ہمایوں دین پوری یہ خان پور کنور اسے ''تن من دھن لٹانے والا محاورہ سنا تو کرتے تھے لیکن پریکٹیکلی حکیم صاحب کی ذات مبارک میں دیکھا پہلی بار۔ وہ یوں کہ جب آپ دہلی سے روانہ ہوئے تو من لٹ چکا تھا۔ کراچی میں رہ کر دھن لٹایا اور باقی بچا تن تو وہ بھی جاتے جاتے اس پاک سرزمین پر نثار کر گئے۔ ایسی مثال کوئی اور ہے؟ تصور مسلمانوں کی عالمی علامت، حقیقی عالم باعمل اور پاک روح حکیم محمد سعید کی سوانح چھاپ کر سرگزشت بری الذمہ ہوا۔ اس قرض اور فرض سے جو احسانات سعید کی صورت پوری قوم پر واجب الادا ہیں۔ اس کا صلہ آپ کو اللہ تعالیٰ دیں گے

ہم صرف سلام پیش کرتے ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لیے عرض کرتا چلوں کہ شہید پاکستان کے الفاظ سب سے پہلے نامور صحافی مجیب الرحمان شامی نے حکیم صاحب کے لیے استعمال کیے جو بعد میں زبانِ زدِ عام ہو گئے۔ اب رخ شہرِ خیال کا اور پہلا مصافحہ تمیرا کریم سے۔ جنابہ عورت نے حضرت مرد کو جنت سے تو جو نکلوایا سو نکلوایا، ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ایک عورت 70 مردوں کو جہنم میں لے جانے کا باعث بنے گی۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں ان معصوم۔ بندوں نے ''مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''۔ مزید برآں تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں عورت کی سب سے بڑی دشمن خود عورت ہے کہ اس ذات پر جتنا ظلم خود عورت (ساس، نندیں، سوکن، بہو، دیورانی، جیٹھانی) نے ڈھایا ہے مردوں کا حصہ تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ میرے بلوچ بھائی کھٹکوری صاحب یک طرفہ ہو یا دو طرفہ محبت اظہار کے راستے خود بناتی ہے۔ دراصل یہ سارا فتور اہلِ مغرب کا ہے جہاں کچھ اذہان نے اس خیال کو دان کیا کہ آپ جب تک اظہارِ محبت کے لیے یہ تین الفاظ I LOVE YOU ادا کر کے پھر زبان سے ادا نہیں کرتے آپ عاشقی کے مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتے۔ پر ایلم ان کی کون یہ بدعت ہمارے ہاں بھی پھیلی حالانکہ معاملاتِ محبت میں وہ اتنے ہی کورے ہیں جتنے سائنس و ٹیکنالوجی میں ہم۔ کہتے ہیں لارڈ رڈرفورڈ جب پہلی دریافت کر رہا تھا تو ہمارے ہاں لارڈز (راجے، مہاراجے، نوابین) تمام شعرا کی استادی اور غم و ساغر میں ڈوب کر راہِ عاشقی کی تمام منزلیں اور عشق وستی کے تمام اسرار و رموز دریافت کر چکے تھے۔ اس لیے ہماری محبت اہلِ مغرب کی محبت سے زیادہ پختہ ہے۔ ان کی محبت ہوس کے بھنور میں ایسی ڈوبی کہ جنس کا دریا پار کرتے ہی۔ جبکہ ہمارے ہاں محبت اب بھی بے ترتیب دھڑکنوں، الجھی انگلیوں، بھیگی پلکوں، لرزتے ہاتھ، رندھے لہجوں، ٹھنڈی ہواؤں اور جھلکتی آنکھوں سے بس یہ کہہ دیتی ہے جو زبان نہیں کہہ پاتی۔ ہمارے ہاں محبت کی یہ خاصیت ہے کہ ''تیرے سامنے بیٹھ کر روتا ہے دکھ تینوں نیوں دسنا''۔ بتائیں ایسی محبت زبان کی محتاج کیوں ہو۔ دراصل قصور آپ کا بھی نہیں کیونکہ میرے اور آپ جیسے ناچیز بیکار کہاں جانیں یہ رمزیں محبت کی۔ نہایت محترم مستی طلعت صاحبہ آپ کا دو ٹوک اختلاف اتنا پسند آیا کہ ہم دیر تک ہنستے ہی رہے لیکن افسوس آپ نے ہمارے معصوم مشاہدے کو ذاتی تجربہ کہہ کر تو ہین کی صلیب پر چڑھا دیا۔ ضروری نہیں ہر بات ذاتی تجربہ ہی ہو۔ مشاہدے کا جہان بھی آباد ہے۔ شادی اور محبت کو جدا میں نہیں وہ خود کر رہے ہیں۔ ذرا غور کیجئے محبت ایک آفاقی جذبہ ہے اور شادی صرف ایک رشتہ (مگر بھائی یہ ایک رشتہ کتنے اور قیمتی اور قریبی رشتوں کو پیدا کرتا ہے!) رشتے دھاگوں سے بھی کچے، جذبے پہاڑوں کی طرح اٹل، مضبوط۔ آفاقیت تقدس سے تعمیر جبکہ شادی ایک جبلت کی تکمیل۔ کیا یہ فرق نہیں؟ سہیل یہ کہ جس سے شادی ہو، اس سے شاید محبت تو ہو سکتی ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ جس سے محبت ہو اس سے شادی بھی ہو۔ یہ ذہن میں رکھیں اگر ہمارے پیارے جیجا جی آپ سے اخلاق، اچھے حسنِ سلوک اور خود درگزر سے پیش آتے اور دل جوئی کرتے رہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آپ سے عشق فرماتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ برادر مائنڈڈ، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے اور مذہبی ہیں۔ اگر عشق کبھی تھا بھی تو وہ کب کا فور ہو گیا۔ شک ہے تو ابھی پوچھ لیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ سرزمین عدم (راولپنڈی) سے ایک نئی آواز محمد عثمان علی۔ جناب یہ آپ ہی کا تو شہر ہے۔ خوش آمدید اور ہاں یاد آیا تعلیم بالغاں والی کلاس میں ایک بشریٰ افضل بھی ہوا کرتی تھیں۔ ان کی کسی کو خبر ہو تو اطلاع دیں ورنہ گمشدگی کا اعلان مرکزی جامع مسجد شہرِ خیال میں جلد کرائیں کہ ہمیں بے حد تشویش ہے (ایک گمشدہ تو اس ماہ واپس لوٹ آئیں) عیسائیت پڑھی پھر شکر ''پڑھا'' کہ ہم عیسائی نہیں مسلمان ہیں۔ زبردست معلومات خصوصاً شاہد صاحب نے انچ بڑا منی خیز بنایا ہے۔''

☆☆☆

شاذب محمود، جدہ (سعودی عرب) سے یوں ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ ''مدت سے خط لکھنے کا سوچ رہا تھا مگر پھر سرمائے کے حصول کی دوڑ میں گم ہو جاتا تھا۔ سرگزشت کو ترقی کرتے دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے اور جب کوئی ایسا مل جائے جو سرگزشت کو یا آپ کے ادارے کے دیگر پرچوں کو پڑھتا ہو تو اور بھی خوشی ہوتی ہے اور ایسے لوگوں سے دوستی خود بہ خود ہو جاتی ہے۔ میں مقدر کے بارے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔ محی الدین نواب بے شک کہانی نویس میں ایک بڑا نام ہیں اور بڑی شاہکار کہانیاں انہوں نے تصنیف کی ہیں۔ ان کا اپنا لکھنے کا انداز ہے، مکالمہ نگاری، کہانی کا ربط، اس کا ماحول غرض کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں لیکن پچھلے کچھ عرصے سے ان میں جو ایک آگ سی تھی، وہ سرد ہونے لگی ہے۔ نواب صاحب کی کہانیوں میں اب وہ میاں مدن والی بات نہیں رہی۔ جب سے مقدر شروع ہوئی ہے قارئین کی اکثریت اسے ناپسند کر رہی ہے کچھ حمایت میں بھی ووٹ آتے ہیں مگر آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ دیکھیں معراج صاحب آج کا دور ''صدیوں کا بیٹا'' والا دور نہیں ہے اور نہ ہی یہ ''پی'' کا دور ہے۔ آج وہ کہانیاں پسند کی جا رہی ہیں جو کہ عام انسانوں سے متعلق ہوں۔ چاہے وہ کسی بھی ماحول کی ہوں۔ میرے خیال میں مقدر میں ہر ماہ سرگزشت کے بہت سے صفحات ضائع ہو رہے ہیں۔ اس صورت میں قارئین کو احتجاج کا حق ہے۔ آپ کے پاس بہت اچھے لکھنے والے ہیں۔ کسی اور سلسلے وار کہانی کو لگوایئے۔ کاشف زبیر اور غلام قادر کا طرزِ تحریر بھی بہت اچھا ہے۔ میرے خیال میں اگر رسالے کی باقی کہانیاں کچھ نرم بھی ہوں تو چل جاتی ہیں مگر جو مستقل پڑھتے ہیں ان کے لیے سلسلے وار کہانی ڈائجسٹ کی جان ہوتی ہے۔ میں محی الدین نواب اور ان کے تمام پرستاروں سے پیشگی معذرت کرتا ہوں کہ اگر کسی کو میری رائے اچھی نہ لگی ہو تو معاف کر دیں۔ میں ڈائجسٹ پڑھنے والے اور اس میں خط لکھنے والے سب بھائیوں اور بہنوں کو سلام کہتا ہوں اور آپ سب کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں کیونکہ میں ایسی جگہ ہوں جہاں پر مجھے کثرت سے دنیا کے انجائی پاکیزہ مقام پر جانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ آپ کے خطوں کے ذریعے ہی آپ سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ چاہے وہ پولس بلوچ صاحب ہوں یا عبدالرؤف عدم صاحب یا ہمایوں دین پوری مگر شمیری صاحب ایک عرصہ ہوا نظر نہیں آئے ہیں۔ بہنوں میں شہناز جونیجو اور خاص کر ہماری بہت اچھی ثمینہ شاہد (جو کہ اب نہیں ہیں اور جن کے لیے میں اکثر دعا کرتا رہتا ہوں) اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش وخرم رکھے۔''

☆☆☆

سیّد آکاش بخاری، سینٹرل جیل ملتان سے پہلی بار ملاقات کو آ رہے ہیں۔ ''شہرِ خیال میں داخل ہونے کی پہلی جسارت ہے۔ امید ہے خوش آمدید کہا جائے گا (جی آیا نوں) سرورق کی تعریف ضرور کرتا مگر حکیم محمد سعید شہید کی تصویر دیکھتے ہی آنکھیں چھلک پڑیں۔ رویا تو میں اس دن بھی تھا جب جاوید چوہدری کی کتاب زیرو پوائنٹ میں ایک کالم مدینے کا شہید

پڑھا تھا۔ بلاشبہ محرومیوں میں گھری قوم ایک ایسے مسیحا سے محروم ہوگئی ہے جو قوم کی نبض کو پکڑ کے اس کا علاج دریافت کرنے پر کمربستہ تھا۔ پس ورق پہ ہالی وڈ کی دلیر اداکارہ انجلینا جولی کو دکھایا گیا۔ محترم یہ بتائیے کہ یہ دریدن وہی ہے جس کا بڑا بھائی سنتوش کمار پاکستان کا پہلا سپر اسٹار تھا اور ان سے چھوٹا ایس سلیمان عرف صلو بھائی ہے (جی ہاں اور یہ تفصیل تو فلمی الف لیلہ میں بیان بھی کی گئی ہے) ہاورڈ تھرسٹن کی یک سطحی سرگزشت پڑھ کر محسوس ہوا کہ اگر گلن بچی ہوتو انسان ہر کام کرسکتا ہے۔ پہلا نامہ عبدالرؤف عدم صاحب کا پڑھا عمدہ تبصرہ تھا۔ حمیرا صاحبہ احباب کی باتیں دل پہ نہ لیں۔ وہ تو محفل کو دلچسپ بنانے کے لیے ایسا ہوتا ہے تاکہ کسی کی دل آزاری کے لیے۔ پھر انسان جانتا ہے کہ عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ اب آیئے کہانیوں کی طرف سب سے پہلے مقدر پڑھی۔ بھئی جو لوگ ان کہانیوں پہ اعتراض کررہے ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ یہاں سزائے موت نوعمر وارث میں تقریباً تیس لڑکے مقید ہیں جن میں اکثر پڑھے لکھے ہوئے ہیں اور اس کہانی کو سننے کے بعد اکثریت اب یہ رسالہ پڑھنے لگی ہے۔ ہماری طرف سے محی الدین نواب کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ بارہ جھوٹے بڑی دلچسپ تحریر تھی۔ سید احتشام نے دوست ملک چین کی سیر کرائی اور مزاحیہ فقروں سے ہنسایا بھی بہت۔ اس مرتبہ بٹ صاحب نہ جانے کہاں رہ گئے (وہ تو آفاقی صاحب کے ہم سفر ہوتے ہیں) استادنامہ میں منظر امام صاحب اس دفعہ استاد کی شادی کے چکروں میں رہے۔ ویسے ہمارے ہنسنے کا سبب جناتی زبان بھی ہے۔ بانجھ ماں میں ایک عورت کے ایثار نے حیران کردیا مگر دوسری عورت نے پھر اپنے مقام پہ الاٹمنٹ کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اپنا کام کردیا۔ دورِ اہا فیاض خان کی ایک نادان وکم فہم شوہر پہ لکھی تحریر تھی۔ ایسا شوہر جس نے باوفا بیوی کو خودکشی پر مجبور کردیا۔ ہم تمام نوعمر وارڈ والوں کی طرف سے آپ کو اور تمام قارئین کو دعائیں اور سلام قبول ہوں۔'' (وعلیکم السلام اور بہت سی دعائیں)

☆☆☆

ناصر حسین رند بہاولپور سے کافی عرصے بعد تشریف لارہے ہیں۔ ''کافی عرصے بعد خط لکھنے کی جسارت کررہا ہوں۔ امید ہے یہ قبول فرمائیں گے! جس دن سے تاوان کا اختتام ہوا ہے اس دن سے سرگزشت سے کچھ ناتا ٹوٹ سا گیا ہے کیونکہ پچھلے دنوں بازار کا چکر لگایا تو پنجگیر خان پر نظر پڑی تو شمارہ خرید لیا۔ اس بار ہماری نظر ہماری عزیز ترین شخصیت جناب محترم حکیم محمد سعید شہید کی تصویر پر پڑی تو ہمیں اپنا بہت عرصہ پہلے لکھا وہ خط یاد آگیا جس میں حکیم محمد سعید کی آپ بیتی کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری ایک دیرینہ آرزو پوری کردی مگر حکیم محمد سعید صاحب کی کہانی کچھ مختصر تھی۔ خالی ہاتھ پاکستان آنے والے ایک محنتی انسان کی کہانی سے ہمیں کسی کا وہ قول یاد آگیا کہ خوش قسمتی اور محبت ہمیشہ بہادروں کے حصے میں آتی ہے۔ ان ناموں میں ایک اور مخلص کا نام بھی ہوتا اگر اس نے ایک غلط فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ آج وہ پاکستان کا وزیراعظم ہوتا یا ایک مقبول ترین لیڈر ہوتا۔ اگر اس نے پاکستان کے اندر شادی کی ہوتی اس کا نام ہے عمران خان۔ ویسے ہمیں کرکٹ سے آج تک دلچسپی نہیں رہی لیکن بہ حیثیت انسان عمران خان بہت اچھا انسان ہے۔ اور اس کی سوچ سے ہم بہت زیادہ متاثر ہیں۔ انکل اب آپ عبدالقدیر خان کی سوانح بھی شائع کرانے کی کوشش کریں۔ نا قابلِ فراموش ایک اچھی تحریر تھی جس سے ہمیں یہ یقین ہوچلا کہ اگر گلن بچی ہوتو خدا بھی مل جاتا ہے۔ عیسائیت پر جناب ذوالفقار ارشد گیلانی کی یہ معلوماتی تحریر پڑھ کر عیسائیت کے بارے میں خاصی معلومات حاصل ہوئیں۔ شہر خیال کے تمام ساتھیوں کو سلام۔ ہمارے ایک پرانے ساتھی علی حسین بھٹی آف ملتان کی کافی سالوں سے کوئی خبر نہیں ہے۔''

☆☆☆

نور محمد جمالی اوستہ محمد سے ہمارے شہر خیال میں ان خیالات کے ساتھ داخل ہوتے ہیں کہ ''السلام علیکم امید ہے کہ ایمان وصحت کی بہترین حالتوں پر ہوں گے۔ عرصہ دراز سے سرگزشت کا مستقل قاری ہوں۔ پہلی بار آنے کی جسارت کررہا ہوں۔ اس کی وجہ حکیم محمد سعید شہید پاکستان پر مضمون ہے۔ ان کی سرگزشت کی فرمائش تو کئی بار کئی قاری آپ سے کرچکے تھے مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اب بھی آپ کا کمال نہیں ہے یہ تو ہمارے بچوں کے ادیب غلام حسین سمین صاحب ہیں جنہوں نے سب کی پسندیدہ شخصیت سے ہمیں متعارف کرایا۔ سعید مرحوم سے تو بہت قریبی اور قلبی تعلق تھا۔ انہوں نے مجھے تعلیم کے حصول میں بہت مدد دی تھی۔ ان کے دیے کئی انعامات آج بھی میرے پاس ایک یادگار اثاثے کے طور پر موجود ہیں۔ بہرحال،

گل ہوگئے حکیم محمد سعید بھی۔ بدقسمتی نہ پوچھ دل ناامید کی
خاموش ہورہا ہے قلم اس دعا کے۔ ساتھ ہو مغفرت حکیم محمد سعید کی

صبح کا یہ ستارہ تاریکیوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ یہی ہماری کم ظرفی اور نالائقی ہے کہ نجانے کتنے ستارے خود اپنے ہی ہاتھوں سے بجھا دیے ذہنوں کو تحرک اور سوچ کو کھلی فضا عطا کرنے والا چراغ آگہی گل ہوگیا۔ وہ حکیم محمد سعید جن کی دانائی کو کل سورج کا نام دیا جائے گا ہم سے جدا ہوگئے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے، انسان نکلتے ہیں

☆☆☆

محمد ریاض انصاری، لاہور سے ملاقات کے لیے تشریف لارہے ہیں۔ شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی تصویر دیکھتے ہی میں نے سرگزشت مارچ 2005 کا شمارہ خرید لیا اور مجھے اپریل 1992ء کا سرگزشت یاد آگیا۔ جب میں نے پہلی مرتبہ یہ پرچہ خریدا تھا اور یہ سلسلہ مئی 1997ء میں بعض پریشانیوں کے سبب منقطع ہوگیا۔ 2005ء کا سال میرے لیے ''نجات دہندہ'' ثابت ہوا اور اللہ تعالیٰ کا مجھ پہ بے شمار فضل وکرم ہے۔ خدا سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ (آمین) سرورق شہید پاکستان کی تصویر کی وجہ سے پرکشش ہوگیا ہے۔ اس کے بعد رنگین اشتہارات دیکھے۔ جنہوں نے مزاج کو بھی رنگین کردیا۔ ''شعبدہ باز'' کی یک سطحی سرگزشت پڑھی۔ شہر خیال میں ''بے چاری حمیرا کریم کے خط میں سچائی نظر آئی اور اس پر ترس آیا۔ لہٰذا تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ایک دوسرے پر الزام تراشی نہ کیا کریں۔ یونس بلوچ صاحب تا حال شہر خیال میں شرکت فرمارہے ہیں۔ ان کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ''شہید پاکستان'' محترم حکیم محمد سعید کے حالاتِ زندگی پڑھ کر بے اختیار آنکھیں چھلک پڑیں۔ حکیم صاحب فرشتہ صفت انسان تھے۔ ایسے انسان صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ نا قابلِ فراموش بلند حوصلہ نوجوان کی کہانی ہے۔ جو کافی دلچسپ لگی۔ انوکھا جاسوس جمبر باٹھ کی فلمی کہانی محسوس ہوئی۔ جس نے قیمتی وقت ضائع کیا۔ ایسی کہانیاں جاسوسی ڈائجسٹ میں ہی اچھی لگتی ہیں۔

عیسائیت پڑھی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ منظر امام، بیوپاری میں ایک اہم مسئلہ منظر عام پر لائے۔ کہانی واقعی دلچسپ تھی۔ منظر امام کی تحریریں ہوتی ہی دلچسپ ہیں۔ سچ بیانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ سچ بیانیوں سے یاد آیا کہ میں نے بھی ایک سچ بیانی بنام ''ناجائز'' بتاریخ 20 مئی 1997ء روانہ کی تھی۔ (محمد ریاض صاحب نے ہماری بعض غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہم ان کے مشکور ہیں اور آئندہ زیادہ محتاط رہنے کی کوشش کریں گے۔ ان کی کئی سال قبل بھیجی گئی تحریر کے بارے میں اگر کچھ پتا چلا تو ضرور اطلاع دیں گے۔ ادارہ)

☆☆☆

فیض رمضان، نشتر کالونی، لاہور سے فرماتے ہیں۔ ''اس بار مارچ 2005ء کا سرگزشت 20 فروری کو ملا۔ سرورق اور پس ورق بہت شاندار اور جاندار تھے۔ ہاورڈ تھرسٹن کی ایک صفحے کی سرگزشت پڑھی اور اس کی مسلسل لگن اور محنت دیکھ کر رشک آیا۔ واقعی اگر انسان عزم مصمم کرلے تو وہ منزل مقصود تک پہنچ ہی جاتا ہے۔ حکیم محمد سعید کے حالاتِ زندگی پڑھ کر محسوس ہوا کہ وہ موجودہ وقت کے ولی تھے۔ نا قابلِ فراموش پڑھی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ انوکھا جاسوس بہت ہی دلچسپ لگی۔ پرعزم نوجوان کی کہانی خوش قسمت کا مطالعہ کیا۔ یہ کہانی بہت ہی پیاری ہے۔ فلمی الف لیلہ میں رنگین مزاج لوگوں کی کہانیاں پڑھیں۔ جو دلوں کو گرما گئیں۔ بارہ جھوٹے پڑھ کر اب جھوٹ بولنے کو دل چاہتا ہے۔ وحشی ہاتھی پڑھ کر دل پر دہشت طاری ہوگئی ہے۔ سفر ہے شرط سید سعید عالم کا سفرنامہ حسبِ دستور مزیدار ہے۔ عیسائیت پڑھ کر پتا چلا کہ عیسائیوں نے اپنی کتابوں میں کتنی تحریف کی ہے۔ مزاحیہ تحریر بیوپاری پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ مقدر کی موجودہ قسط دلچسپ ہے۔ ہندوستانی اداکار امریش پوری اور اداکارہ پروین بابی کی کہانیاں بھی لکھوائیں۔ (کوشش کریں گے) (فیض رمضان صاحب نے بعض غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جس پر ہم ان کے مشکور ہیں۔ آپ لوگ ہماری کوتاہیوں سے یونہی آگاہ کرتے رہا کریں تاکہ ہم مزید بہتری کی کوشش کریں۔ ادارہ)

☆☆☆

وزیر محمد خان، بٹل، ضلع مانسہرہ (ہزارہ) سے یہ کہتے ہوئے آرہے ہیں۔ ''سب سے پہلے میں سرگزشت ڈائجسٹ کے حصول کا ذکر کرتا چلوں کہ مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ہمارے گاؤں بٹل میں چونکہ کوئی بک اسٹال نہیں ہے اس لیے سرگزشت کی خاطر یہاں سے اسّی کلومیٹر دور مانسہرہ جانا پڑتا ہے اور اس طرح بشمول کرایہ فی شمارہ 85 پچاسی روپیہ میں پڑ جاتا ہے۔ تو اس سے ہی سرگزشت سے دلچسپی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ (آپ کی محبت واقعی بہت قابلِ قدر ہے) اور اب ماہ مارچ کے شمارے کی طرف۔ غلام حسین سمین کی تحریر شہید پاکستان ایک خوب صورت اور معلوماتی تحریر تھی۔ حکیم محمد سعید جنہوں نے اپنا گھر بار، عزیز واقارب سب چھوڑ کر ایک نئے ملک کا قصد کیا اور ایک عزم اور جذبے کے ساتھ شب و روز انسانیت کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ اسی بے لوث اور انقلابی انسان کو انسانیت کے دشمنوں نے 17 اکتوبر 1998ء کو روزے کی حالت میں شہید کردیا۔ کیا اپنے محسن کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟ باقی کہانیوں میں عدلش احتشام کی بارہ جھوٹے، لیلیٰ زبیر کی خوش قسمت اچھی تھیں۔ علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ کی باتاں ہی اور ہیں۔ سفر ہے شرط میں علی سفیان آفاقی کی کمی بری طرح محسوس ہوئی۔ سچ بیانیاں میں عبید کی پایہ استقلال خالد باری کی اپنا خون الیاس ظفر کی نکاح نامہ زبردست تھیں۔ شہر خیال میں ہمایوں دین پوری کی غیر حاضری اچھی نہیں لگتی۔'' (ارے اس بار تو وہ برابر تشریف لارہے ہیں!)

☆☆☆

محمد صدیقی عباسی، ساتھی تعلقہ پنوں عاقل سے فرماتے ہیں۔ ''آداب عرض۔ سرورق کی حسینہ شاید اپنے رشتے کی بات سن کر مسکرا رہی تھی۔ حکیم محمد سعید کی پروقار تصویر نے سرورق کو چار چاند لگا دیے اور پس ورق پر انجلینا جولی کی ہوشربا تصویر دیکھ کر دل نامراد نے بٹ صاحب والا ورد لاحول ولاقوۃ پڑھنا چاہا مگر افسوس..... نئے قارئین رابعہ بی بی اور محمد عثمان کو خوش آمدید۔ حمیرا کریم کے مقابلے میں قیصر شاہ کی رائے وزنی لگتی ہے کہ شوہز کے بجائے شہید نمبر اگلا خاص نمبر ہونا چاہیے۔ مجبور بروزگار حکیم محمد سعید کی سرگزشت نے خاصا متاثر کیا کہ آدمی کے کیسے بھی حالات ہوں، ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ فلمی الف لیلہ نے ساری ذہنی کوفت دور کردی۔ حالانکہ فلمی دنیا کے بارے میں آئے دن اخبارات اور رسائل میں پڑھتے رہتے ہیں مگر جو بات آفاقی انکل کے قلم میں ہے وہ کسی اور میں کہاں۔ بارہ جھوٹے کا عنوان تو گیارہ جھوٹے ہونا چاہیے تھا کیونکہ اسمعہ تو سچائی پر تھا۔ دلچسپی کے حساب سے آفاقی انکل کے سفرنامے اچھے ہوتے ہیں مگر معلوماتی لحاظ سے سید احتشام کو سبقت حاصل ہے۔ پایہ استقلال میں بلقیس عرف بلو کے گھر چھوڑنے والی لڑکیوں کے بارے میں خیالات بڑے وزنی تھے۔ اور مقصود کو تو سلام کرنے کو دل چاہا کہ کس طرح اس نے محبت کو نبھایا۔ بے اماں میں شیراز اور طاہرہ کی بے غیرتی پر بہت تکلیف ہوئی۔ کوٹ ادو والوں سے ایک عجیب طرح کی انسیت ہوگئی ہے اس لیے ان کے بغیر شہر خیال کی محفل پھیکی پھیکی سی لگ رہی ہے۔ دعاگو۔''

☆☆☆

زاہد علی، علی ٹاؤن، راولپنڈی سے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ رسالہ کب مارکیٹ میں آیا پر اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نے اسے 21 فروری کو خریدا اور تین چار دن میں ہی اسے ختم کردیا تاکہ تبصرہ لکھ سکوں۔ سرورق سے پوسٹ مارٹم کا آغاز کرتے ہیں جو کہ ایک کم عمر حسینہ کی وجہ سے آنکھوں کو متاثر کررہا تھا۔ حکیم محمد سعید کی تصویر کی وجہ سے ہی سرورق کو پاسنگ مارکس دیے جاسکتے ہیں ورنہ تو پورے سرورق پر حسینہ ہی قابض تھی۔ پس ورق خاصا ہوشربا تھا اور انجلینا جولی کے سامنے نیر سلطانہ اور نرگس ہلکی لگ رہی تھیں۔ اشتہارات میں بھی حسینائیں چھائی ہوئی تھیں۔ رسالے کا صفحہ اول اور فہرست کافی بہتر تھے۔ ہاورڈ تھرسٹن کے بارے میں صرف ایک صفحہ پڑھ کر تشنگی رہ گئی۔ شہر خیال میں آپ کی باتوں سے یوں لگا کہ جیسے آپ ڈپریشن کا شکار ہیں۔ لیکن باتیں اس ڈپریشن میں بھی ٹھیک کررہے ہیں۔ گزارش کرنی تھی کہ ازراہ کرم سونامی پر بھی کوئی تحقیقی مضمون شائع کریں۔ وہ کون سے عوامل ہیں جو زیر زمین ایسا عمل کرتے ہیں کہ ایسا حادثہ ہوجاتا ہے اور حضرت انسان کا اس میں کتنا عمل دخل ہے اور مستقبل میں اس سے متعلق کیا خدشات ہیں۔ اس خوب صورت شہر کے تمام باسیوں کو میرا سلام پہنچے، اور یہ شکوہ بھی کہ کسی نے مجھے پلٹ کر یاد بھی نہیں کیا۔ عدم صاحب اور میر اکریم کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خاص نمبر کے بارے میں گزارش ہے کہ آپ ادب نمبر نکالیں اور اس میں سعادت حسین منٹو، عصمت چغتائی، کنور سنگھ بیدی، امرتا پریتم جیسے لوگوں اور ان کی انمول تحریروں پر مشتمل مواد شائع کریں۔ کوشش کریں تو آپ کو اردو ہندی اور انگلش کے ادب کے بہت سے

مایہ ناز لکھاری مل جائیں گے۔ شیکسپیئر جیسے لوگوں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کا اردو ترجمہ تو گویا سرگزشت میں جان ڈال دے گا۔ شہید پاکستان اس بار سرگزشت کی سب سے جاندار تحریر تھی۔ جسے پڑھ کر آپ پر اور غلام حسین میمن پر بے ساختہ پیار آ گیا۔ تحریر میں جگہ جگہ باکس میں لگے ہوئے ٹکڑے، مضمون کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ آپ میرے خیال سے اس ملک کا ایک بہت ہی قابل قدر سرمایہ تھے پر آپ کی صحیح قدر نہ ہو سکی اور نہ ہی آپ کو وہ مقام ملا جس کے آپ حق دار تھے۔ آپ کے لگائے ہوئے کئی پودے ابھی تک پنپ رہے تھے اور ان کو آپ ہی جیسے کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت ہے۔ حکیم صاحب پر یہ تحریر تشنہ سی لگی۔ خوش قسمت ایک پرعزم نوجوان کی کتھا کو اچھے انداز میں بیان کیا۔ یعنی زبیر نے اس تحریر کا ترجمہ اچھا کیا تھا۔ فلمی الف لیلہ روز اول کی طرح آج بھی جاری و ساری ہے اور حالات بتاتے ہیں کہ ابھی اسے اور بھی چلنا ہے۔ فلمی الف لیلہ کا پہلا حصہ تو بندے کے پاس کتابی شکل میں موجود ہے اس کے بقایا حصے کب شائع کرنے کا پروگرام ہے؟ آفاقی صاحب پرانے تھیز اور اب کے تھیز کا تقابلی جائزہ بھی آپ کسی قسط میں پیش کر دیں تو مہربانی ہوگی نیز آپ نے اپنا جو وقت انڈیا میں گزارا ہے، اس کے بارے میں بھی مزید تحریر کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم جیسی نسل کو بتائیں کہ پہلے کی اور اب کی نسل میں کیا فرق ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ آپ کو اتنی ساری باتیں کیسے یاد رہ جاتی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ذرا سی بات بھول جاتے ہیں اور پھر تنگ آ کر کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزوں پر چھوٹے چھوٹے کام لکھ لیتے ہیں۔ اگر آپ کبھی ہمارے پرس کو دیکھیں تو اس میں نوٹوں سے زیادہ آپ کو یہ چھوٹے چھوٹے پرزے نظر آئیں گے۔ بارہ جھوٹے بھی رسالے میں ایک اچھا اضافہ تھا۔ کہانی اچھی تھی اور آخر تک اپنی گرفت میں رکھے رکھا۔ وحشی ہاتھی میں ہاتھی کے شکار کا قصہ مزے دار تھا۔ کہانی میں سنسنی خیزی پائی جاتی تھی۔ سفر بہ شرط کا شمار رسالے کے ایک اہم سلسلے میں ہوتا ہے۔ ہر سفرنامے کی ہر قسط میں بہت کچھ جاننے کو ملتا ہے اور ہماری معلومات میں کافی سے زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ عیسائیت میں عیسائیت کی ابتدا سے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کیا گیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ انبیائے کرام کے حالاتِ زندگی کو بھی سرگزشت میں ایک مستقل سلسلے کی حیثیت دے دیں۔ بیوپاری میں استاد کی ایک اور کارگزاری دیکھی۔ استاد جی کی زبان سن کر اگر مظہر امام صاحب کے سر میں درد نہیں ہوتا تو یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔ استاد صاحب کی شخصیت ایک دلچسپ شخصیت ہے بس گزارہ کرنا مشکل ہے۔ پر بڑے دل والے لوگ یہ بھی کر جاتے ہیں۔ مقدر کے بارے میں سچ یہ ہے کہ میرے خیال میں یہ کہانی سرگزشت کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتی اس لیے بہتر ہے کہ اسے بند کر کے اس کی جگہ کوئی نیا سلسلہ شروع کیا جائے۔ پایہ استقلال پہلے نمبر پر ہے۔ بلقیس کی کہانی واقعی دردبھری ہے۔ شوکت اور صاعقہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ دونوں نے بلو کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ شوکت جیسے لوگوں کی وجہ سے ہر عورت کا ہر مرد پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ مگر ہر مرد شوکت یا عنیف جیسا نہیں ہوتا۔ اپنا خون کو دوسرا نمبر دیا ہے۔ سائرہ منیر کی کہانی میں کافی اتار چڑھاؤ آئے پر ہر موقع پر اس کا اور ہمارا خدا اس کے کام آتا رہا۔ کہانی میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ محشر کے ساتھ بعد میں کیا ہوا۔ کیا اسے اپنے گناہوں کی سزا ملی یا نہیں۔ نکاح نامہ کو تیسرا نمبر دیا ہے۔ آپ یقین کریں کہ کہانی کو پڑھتے ہوئے میرا دل بہت زیادہ اداس ہو گیا۔ خصوصاً کہانی کا آخری پیراپڑھ کر تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔"

☆☆☆

عمران خان، لطیف آباد، حیدر آباد سے۔ "سرگزشت کے تازہ شمارے کے سرورق پر حکیم محمد سعید صاحب کی تصویر دیکھ کر دل خوش ہو گیا اور برسوں پہلے کی گئی فرمائش کو آپ نے پورا کر دیا۔ حکیم صاحب کے بارے میں پہلے بھی پڑھ رکھا ہے مگر غلام حسین صاحب کی یہ تحریر اپنے آپ میں خاصے کی چیز تھی۔ یک منفی سرگزشت شعبدہ باز اور ڈھرسٹن کے بارے میں پڑھا۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کی طرح ان حضرات کا بھی بچپن مفلوک الحالی سے دوچار تھا مگر بعد میں اپنی شعبدہ بازی سے بڑا نام اور پیسہ کمایا۔ پھر گڑی کو شہر خیال سے بچاتے ہوئے سیدھا سفرنامے کی طرف موڑا۔ سید احتشام صاحب نے بچپن کے سفر کی روداد کو خوب تحریر کیا ہے۔ کاشف زبیر میرے پسندیدہ لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی پچھلی تحریروں کی طرح شکاریات پر مبنی تحریر وحشی ہاتھی بھی پسند آئی۔ آخر میں استاد نامہ مزا دے گیا لگتا ہے استاد صاحب فارسی زبان میں پی ایچ ڈی ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ موجود نہیں تھے ان کی کمی محسوس ہوئی۔ کیا ڈاکٹر صاحب نے مشہور شعرا حیدر علی آتش اور خواجہ میر درد کے بارے میں لکھا ہے۔" (ان شعرا پر بھی تفصیلی نہیں لکھا گیا)

☆☆☆

عبدالستار اعوان، رحیم آباد بھکر سے کہتے ہیں۔ "ماہنامہ آپ کی سرگزشت کا مستقل قاری ہوں جس جانفشانی اور محنت و لگن سے آپ سرگزشت کو بہتر سے بہتر بنا رہے ہیں قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب منظر امام محی الدین نواب صاحب آپ کے پرچے کا سرمایہ ہیں۔ میری گزارش ہے کہ آپ منظر امام صاحب کے استاد صاحب کو ہر شمارے میں ضرور لایا کریں۔ (بھئی استاد نرالے عالم تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ اب منظر صاحب اپنی یادداشتوں سے ان کی کہانیاں بیان کر رہے ہیں) دوسرا آپ کا سچ بیانیوں کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ میں بھی ایک تحریر آپ کو بھیج رہا ہوں۔ امید ہے آپ ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ (آپ کی تحریر بہت مختصر ہے اور اس میں مزید بہتری کی گنجائش ہے)

☆☆☆

حامد علی، گوٹھ غلام محمد سے ان خیالات کے ساتھ ملتے ہیں۔ "شہادت حسین کے دنوں میں سرگزشت ہاتھ لگا۔ خوشی ہوئی مگر ہلکی سی۔ اب کی بار طویل عرصے بعد ایک شرمیلی "نینا" کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ نینا کے میکانی منظر سے لگتا ہے کہ "نینا" قصے کی دلہن بنے گی شہر کی لڑکی گاؤں کی دلہن بھی بنی تو نہیں۔ خیر۔ شعبدہ باز پڑھنے سے قبل ہم نے بھی یہ جادوگری سیکھنی چاہیے مگر ایک کتاب میں پڑھا کہ یہ گناہ ہے تو تائب ہو گئے۔ آپ حسینؓ کے ساتھیوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ واقعی امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں نے حق کا علم ہمیشہ کے لیے بلند کر دیا۔ حمیرا جی کا مشورہ کہ شوبز نمبر نکالیے تو درست نہیں۔ اسے میں ہی رد کر دیتا ہوں کہ ہر شمارہ ہی تقریباً شوبز نمبر ہوتا ہے۔ قیصر شاہ گمبٹ والے کا شہید نمبر شائع کرنے کا مشورہ لاجواب ہے۔ یہ دو حصوں میں بھی شائع کروایا جا سکتا ہے صفحات 500 اور قیمت 50 روپے رکھ سکتے ہیں۔ تحریروں میں شہید پاکستان اول مقدر دوم اور فلمی الف لیلہ سوم رہے اور یہ سنیان انکل کو ہو کیا گیا ہے۔ ذاتیات پر اتر آئے اب کی بار۔ بھئی کسی کا گلا کرنا انہیں شوبھا نہیں دیتا (یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں سے اتنی قرابت اور بے تکلفی کے سبب ان کی کوئی بات زیادہ محسوس ہوتی ہو) کہانیوں میں دو رائے، قابل یقین نہیں۔ میرے خیال میں یہ کسی فلم کا پلاٹ تو ہو سکتا ہے حقیقی نہیں۔ آخر میں یہ گزارش ہے کہ سفر بہ شرط بند کر کے مستنصر تارڑ، یونس صاحب یا دیگر کے سفرنامے شائع کریں۔ یہ ہر دم فرنگیوں کے پیچھے اور چینیوں کا تذکرہ چھوڑ دیں۔"

☆☆☆

محمد عثمان علی، راولپنڈی سے۔ "اس دفعہ رسالہ خلاف توقع اتنی دیر سے ملا کہ ہم دکان کے چکر لگا لگا کر تھک گئے۔ آخر کیوں (پرچہ حسب معمول 15 تاریخ کو شائع ہو چکا تھا۔ آپ کے علاقے میں تاخیر سے پہنچا ہوگا) اس دفعہ کا سرورق نہایت شاندار ہے مگر پس ورق بالکل پور کیونکہ آپ نے جتنے فنکاروں کی تصویریں پس ورق پر چھاپ دی ہیں ان میں سے ایک بھی ہمیں پسند نہیں۔ سرورق کی حسینہ اچھی بھی مگر حکیم محمد سعید صاحب کی وجہ سے اسے چار چاند لگ گئے۔ یک منفی سرگزشت میں شعبدہ باز پڑھی اور ڈھرسٹن کے بارے میں قیمتی معلومات پڑھنے کو ملیں۔ اس سے پہلے ہم اس کا نام تک نہ جانتے تھے۔ آپ سے گزارش ہے کہ مشاہیر اسلام کو یک منفی سرگزشت میں جگہ دیا کریں (بیشتر مشاہیر پر لکھا جا چکا ہے) شہر خیال میں پہنچے جہاں آپ کی باتیں پڑھیں اور خطوط سے لطف اندوز ہوئے۔ شہید پاکستان کے بارے میں پہلی بار کوئی تحریر پڑھنے کو ملی۔ غلام حسین میمن کا بہت شکریہ۔ انہوں نے ہمیں پہلی مرتبہ حکیم صاحب کی زندگی کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ مگر تشنگی برقرار ہے۔ ہم بھی جون ایلیا کے ہی اشعار ان کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

ہم جو یار ہیں کہاں جائیں جب مسیحائے روزگار گیا
ہو گئی بارگاہ طلب ویران آخری بار لٹ گیا یونان

نام القابات بھی بڑے معلوماتی تھے۔ مشاہیر کے شہر جو ملک ریاض احمد صاحب نے بھیجا تھا، اس کے بارے میں ایک نشاندہی کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ نقشبندیہ سلسلے کے بانی حضرت مجدد الف ثانیؒ تھے۔ آخر میں دعا کے ساتھ اجازت کہ اللہ آپ کو اور شہر خیال کے تمام باسیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہر مشکل دور فرمائے! آمین (ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں)۔

☆☆☆

ایم شاہ علی ابوبکر، الفاظ سعودی عرب سے سفر کر کے آ رہے ہیں۔ "تمام سرگزشت میگزین والوں کو السلام علیکم۔ (وعلیکم السلام) میں تقریباً دس سال سے سرگزشت باقاعدگی سے پڑھ رہا ہوں۔ میں عرصہ تین سال سے سعودی عرب میں کام کر رہا ہوں اور باقاعدگی سے سبھی رسالے پڑھتا ہوں لیکن آپ کو خط لکھنے کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ دراصل جہاں میں کام کرتا ہوں وہاں رسالے بہت دیر سے آتے ہیں یعنی جنوری کا شمارہ فروری میں ملتا ہے اس لیے میں کہانیوں پر تبصرے نہیں لکھ سکتا۔ لیکن انکل ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانیاں واقعی بہت معلوماتی ہوتی ہیں اور واقعی تحقیقی مقالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ البتہ مقدر کا ٹیپو تھوڑا سلو ہے۔ اسے تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلہ بھی دلچسپ ہے اور سفر بہ شرط بھی گزارے لائق ہے۔ منظر امام سے درخواست ہے کہ استاد محبوب نرالے عالم کو باقاعدگی سے شاملِ رکھیں۔ باقی تمام کہانیاں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ میری ایک تجویز یہ ہے کہ آپ بھی سسپنس ڈائجسٹ کی طرز پر دو صفحے اشعار کے لیے رکھیں جس سے پرچہ اور بھی خوب صورت ہو جائے گا۔ (دراصل ہر پرچے کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ بہرحال آپ کی تجویز کا شکریہ۔ سوچیں گے اس کے بارے میں) شہر خیال میں ہمایوں دین پوری کا سالانہ آڈٹ بہت اچھا تھا۔ اور بڑی محنت سے انہوں نے یہ رپورٹ لکھی تھی۔ آخر میں میری طرف سے تمام لکھنے پڑھنے والوں کو سلام۔"

☆☆☆

حسن اکبر پٹلاں، ضلع میانوالی سے فرماتے ہیں۔ "سرورق پر کوئی عیب جویا نہ تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ شعبدہ باز صاحب کوئی ایسی ہمہ جہت شخصیت نہ تھے جن کے بارے میں ہمارا پہلے سے جاننا ضروری ہوتا لیکن اب جان گئے ہیں تو ہماری محدود معلومات میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے۔ شہر خیال میں عدم بھائی کی واپسی پر میں نے باجماعت بھنگڑا ڈالا۔ اب یہ بچ کے نہ جانے پائیں۔ حمیرا کریم کا شکوہ بے جا اور بناوٹی سا لگا۔ بی بی ادھر جو کچھ ساتھی حضرات خواتین کو یا خواتین حضرات کو کہتی ہیں ایک معصومانہ سی بے تکلفی ہوتی ہے۔ ورنہ اس شہر میں شاید ہی کوئی ساتھی ہو جس کے دل میں صنفِ مخالف کے لیے حقیقی بغض یا عناد ہو۔ نور بھائی شہنا ندیم کو بھوتنی کہہ کر آپ نے حمیرا کریم کے خیالات کو تقویت پہنچائی ہے۔ بھائی میرے بے تکلفی اور مذاق میں بھی کچھ پابندیوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ نور بھائی..... نوعمدہ..... نونارا فحگی..... کیوٹ برادر۔ چوہدری صاحب آپ کا فقرہ "اپنے بغیر محفل پھیکی سی محسوس ہوئی" لطف دے گیا اور آپ کے ذوق مزاح اور بذلہ سنجی کا بھی عکاس اور یہ رویہ آپی کی بابت آپ کیا فرما رہے تھے..... شادی اور ان کی اور وہ بھی بغیر اطلاع (بھئی اب وہ خود میدان میں آ گئی ہیں اس لیے قیاس آرائیاں ختم!) قیصر بھیا، اگر صرف انگریزی لفظوں کا استعمال بندہ کو تعلیم یافتہ کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے تو نصاب میں صرف ڈکشنری ہی ہوتی..... ویسے آئندہ محتاط رہوں گا۔ نشاندہی کا شکریہ۔ شکاریات میں اس بار ہاتھی کی دھشتوں نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ویسے اگر سیل کو ہاتھی نے مار دیا تھا تو اس نے بعد میں شکاری انکل کو ساموکی موت کی اطلاع کیسے دی؟ (ساموتو آخر تک شکاری کے ساتھ رہا تھا) انکل، یہ بتاتے ہوئے مجھے شرم تو آ رہی ہے کہ میں تقریباً بے حس سا انسان ہوں، پر پھر بھی کبھی کچھ ایسا ہو جاتا ہے جس سے اپنے حساس ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس بار جس کہانی نے یہ احساس دلایا وہ یعنی احمد کی تحریر کردہ بے اماں تھی۔ سدرہ کے نصیب میں گویا خوشی لکھی ہی نہیں تھی۔ کاش اتنے ظلم سہنے کے بعد جب اسے عدیل کی صورت میں پیار ملا تھا تو وہ زندہ رہتی۔ پر یہی بے اختیاری تو ہمارے انسان ہونے کی علامت ہے۔ اللہ حافظ۔"

☆☆☆

اور آخر میں اب ان محبت کرنے والوں کے نام جن کے خطوط اس ماہ شاملِ محفل نہ ہو سکے۔

اورنگ زیب عالمگیر، فوجیاں والا۔ (رسالہ خورد)۔ امجد خان (نامعلوم جگہ)۔ وہیب شہباز، ملتان۔ آئی۔ کے۔ بلوچ، خاران۔ آشا مظہر، میلسی۔ شان احمد کشکوری، محمد پور دیوان۔ شہناز ندیم جونیجو، کراچی۔ نور خان، اوستہ محمد۔ چوہدری شفقت علی، جتوئی (ضلع مظفر گڑھ)۔ خالد حسن چیمہ، پنڈی بھٹیاں۔ وسیم حسن حسرت، باگڑیاں (ضلع نانسہرہ)۔ ایک خطا ای میل۔ "بزمِ گروپ" کے نام سے جو پڑھا نہیں جا سکا۔

نوٹ: تمام قارئین سے دوبارہ درخواست ہے کہ خطوں اور کہانیوں میں اپنا پورا پتا ضرور لکھیں۔ شکریہ۔

●●●●

مزدور تراش

ڈاکٹر ساجد امجد

اسے نہ مذہب سے کوئی لگاؤ تھا، نہ ہی روایتی تعلیم و تربیت سے کوئی دلچسپی۔ بچپن ہی سے اس کی فطرت میں غور و فکر، تنقید و تجسس اور کسی حد تک بغاوت کے جراثیم موجود تھے۔ اور جب اسے موقع ملا تو یہ تمام خوبیاں ابھر کر سامنے آگئیں۔ شہنشاہیت اور مطلق العنانی کے دور میں ایک فردِ واحد کی مسلسل جدوجہد کی کہانی جس نے ذاتی عیش و آرام کو تج کر پسے ہوئے اور مجبور طبقوں کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اپنے ملک کو عالمی انقلاب کی تحریک کا مرکز بنادیا۔ اس کی مسلسل کوششوں نے تختِ شاہی کے پایوں کو لرزا دیا اور بے زبان، مجبور، مظلوم اور معصوم کسانوں اور مزدوروں کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ وہ تیس سال تک اپنی کوششوں میں مصروف رہا اور کوئی آسانی سے یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی جان کیوں ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔

وہ عظیم انقلابی جس کی موت پر صرف پانچ منٹ کام بند کیا گیا

سولہ سال کے اس نوجوان نے اپنے گلے سے صلیب نوچ کر زمین پر پھینکی، حقارت بھری اک نظر مہمانوں پر ڈالی، صحن پار کیا اور لکڑی کے زینے پر چڑھتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''دیکھا۔ دیکھا آپ لوگوں نے۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ گرجا گھر نہیں جاتا ہے۔ اب آپ نے خود دیکھ لیا کہ اس کے دل میں مذہب کی طرف سے کیسا زہر بھرا ہوا ہے۔'' نوجوان کے والد ایلیا نکولائی وچ نے کہا۔

''آپ نے بھی تو سب کے سامنے اسے ڈانٹ دیا۔ جوان لڑکا ہے، کچھ تو خیال کرتے۔'' نوجوان کی والدہ نے کہا۔

''ایسے سرپھروں کا یہی علاج ہونا چاہیے۔ کوئی اس سے بات نہ کرے۔''

ایلیا نکولائی وچ غصے میں بھرے ہوئے مہمانوں کو لے کر باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی نوجوان کی والدہ کو تشویش ہوئی۔ وہ کہیں غصے میں کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھالے۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے بڑے بیٹے الیکساندر کی طرف دیکھا۔

''تمہاری بات وہ بہت مانتا ہے۔ اسے جا کر سمجھاؤ کہ باپ سے اس طرح بات نہیں کرتے۔ اس نے بدتمیزی کی ہے۔ اسے چاہیے کہ باپ سے معافی مانگے۔''

الیکساندر کو خود بھی دکھ ہوا تھا کہ مہمانوں کے سامنے یہ تکلیف دہ واقعہ پیش آگیا۔ اب ماں نے مشورہ دیا تو اس نے بہتر سمجھا کہ وہ اسے سمجھائے۔ الیکساندر نے لکڑی کا زینہ عبور کیا اور اس کے کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''لینن'' الیکساندر نے آواز دی۔ نوجوان کا نام ولادیمیر ایلیچ اولیانوف تھا لیکن گھر میں سب اسے لینن کہہ کر پکارتے تھے۔ بھائی کی آواز سن کر لینن نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پھر گھٹنوں میں سر دے لیا۔ اب اس کی سسکیوں کی آواز بھی آنے لگی تھی۔

''لینن! تم رو کیوں رہے ہو؟''

''اس لیے رو رہا ہوں کہ تم بھی ان لوگوں کی حمایت میں مجھے ڈانٹنے آئے ہوگے۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا۔ میں تو تمہیں مبارک باد دینے آیا ہوں۔ ویسے ماں سے یہی کہوں گا کہ میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے۔''

''مبارک باد کس بات کی؟'' لینن نے چونک کر بھائی کی طرف دیکھا۔

''مبارک باد اس بات کی کہ ابھی کچھ دیر پہلے تمہارا طرزِ عمل بالکل ایک انقلابی کا سا تھا۔ میں جس راستے پر چل رہا ہوں، تم اس راستے پر چلنے کے لائق ہوگئے ہو۔ یہ راستہ روس کی شہنشاہیت سے ٹکرانے اور مزدوروں کو ان کے حقوق دلانے کی طرف جاتا ہے۔ میرے بھائی یہ آسان راستہ نہیں ہے۔ یوں روتے رہو گے تو کیسے کام چلے گا۔ تم نے مجھے کبھی روتے ہوئے دیکھا؟ تم تو کہتے ہو تم وہ کرو گے جو میں کرتا

ہوں۔ میں تو کبھی نہیں روتا۔"

"تمہاری بھی ایسی بے عزتی بھی نہیں ہوئی ہوگی۔ انہوں نے مہمانوں کا بھی خیال نہیں کیا۔ اب میں نے مذہب کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ میرا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تم مجھے مجبور نہیں کرو گے۔"

"نہیں میں ہرگز مجبور نہیں کروں گا' لیکن یہ مجبور ضرور کروں گا کہ اب تمہیں انقلابی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔"

"تم بھی عجیب بات کرتے ہو۔ روس میں ایسا لٹریچر ملتا ہے جو پڑھوں گا؟"

"پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن یہاں ایسے حلقے بنے ہوئے ہیں جو خفیہ طور پر زار روس (بادشاہت) کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ بہت جلد یہاں مزدوروں کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ ان ہی حلقوں کے ذریعے مجھے کارل مارکس کی تعلیمات پر مبنی لٹریچر ملنے لگا ہے۔ تمہیں بھی پڑھواؤں گا۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔"

"مارکس کا فلسفہ کیا ہے؟"

"وہ تو تم پڑھ کر ہی سمجھ سکو گے۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لو کہ اس کی تعلیم کی منزل یہ ہے کہ مزدور طبقہ' سرمایہ داروں کا تختہ الٹ کر محنت کش لوگوں کے مفاد میں مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ یعنی اپنی حکومت قائم کر لے گا۔ اس کے لیے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی مزاحمت کو دبانا ہوگا اور کسانوں کو اپنے ساتھ ملا کر نئے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کرنی ہوگی۔"

"اس کے لیے تو مزدوروں کی اپنی انقلابی پارٹی ہونی چاہیے جو مزدور طبقے کو اس کا مقصد صحیح انداز میں دکھا سکے اور سوشلزم کی جدوجہد میں اس کی سربراہی کرے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا لیکن ابھی یہاں حالات سازگار نہیں۔ مطلق العنان زارشاہی ایسی کسی تحریک کو پھلنے پھولنے نہیں دیں گے۔ ہمارے ہم قوم روسیوں نے "محنت کی نجات" کے نام سے جنیوا میں ایک مارکسی گروپ قائم کیا ہے' جو مارکس کی کتابوں کا ترجمہ کرا کے روس بھیجتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہاں بھی مارکسی حلقے کام کرنے لگیں گے۔"

"میں نے پوشکن اور ٹالسٹائی کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بھی تو انقلابی جمہوریت پسند ہیں۔"

"بے شک! لیکن ان میں اور مارکس میں فرق یہ ہے کہ یہ مصنفین صرف انقلاب کے حق میں لکھتے ہیں جبکہ مارکس نے ایک باقاعدہ نظام دیا ہے کہ کس طرح انقلاب برپا کرنا ہے اور پھر کن اصولوں کے تحت نئے سماج کی تعمیر کرنی ہے۔"

"تم نے تو میرا اشتیاق بڑھا دیا۔"

"میں ماں سے جا کر کہتا ہوں کہ میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے۔ اب میں رات کے وقت تمہارے پاس لٹریچر لے کر آؤں گا۔ ایسا لٹریچر چھپ کر پڑھنے کی عادت ڈالو ورنہ برے پھنسو گے۔"

لینن کی ماں اور تینوں بہنیں خوش تھیں کہ الیکساندر اب تک واپس نہیں آیا' خوب جی بھر کے لینن کو سمجھا رہا ہوگا۔ اس نے واپس آ کر بھی سب کو یہی بتایا کہ وہ لینن کو سمجھانے بیٹھ گیا تھا۔

رات کو جب لیمپ روشن ہو گئے تو الیکساندر نے ایک مرتبہ پھر لکڑی کا زینہ عبور کیا اور لینن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس میں کچھ کتابیں تھیں۔ لینن بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ آگے بڑھ کر تھیلا اس کے ہاتھ سے چھینا اور ایک کتاب باہر نکال لی۔

"تم اسے پڑھو۔ کل اس پر بات ہوگی۔" الیکساندر نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

لینن بڑی توجہ سے مارکسی ادب کے مطالعے میں غرق تھا۔ وہ جیسے جیسے سوشلسٹ نظریات سے واقف ہوتا جاتا تھا' مزدوروں اور کسانوں سے اس کی ہمدردیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ سرمایہ داروں کے خلاف نفرت اس کے دل میں جگہ بناتی جا رہی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے نئے خیالات کی بدولت اسے اسکول کے ڈائرکٹر کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ ڈائرکٹر نے اس کا لکھا ہوا ایک مضمون اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا "یہ مظلوم طبقے کون ہیں جن کے بارے میں تم نے لکھا ہے۔ یہی خیالات رہے تو تم اس اسکول میں نہیں رہو گے۔"

ڈائرکٹر کے کمرے سے نکل کر اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ خطروں سے کھیلنے لگا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر طمانیت بھی ہوئی کہ وہ ایسے طبقے کی حمایت پر کمربستہ ہے جس کی طرف داری کرنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

وہ اسی نشے میں سرشار گھر پہنچا تو یہ خبر اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ والد پہلے ہی اس کی مذہب بیزاری سے ناخوش تھے' اس خبر نے انہیں اس کی طرف سے بالکل ہی مایوس کر دیا۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اس پر ہاتھ اٹھایا لیکن الیکساندر بیچ میں آ گیا۔ لینن کی جان بخشی ہو گئی۔

باپ کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ ابھی یہ قصہ مزید سر اٹھاتا لیکن وہ بیمار پڑ گئے۔ لینن کو تیمارداری کا موقع بھی نہ مل سکا۔ ایک رات وہ اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ اس کے والد ہمیشہ کے لیے اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

کچھ دنوں سے وہ اپنے والد سے ناخوش تھا لیکن اس

حادثے نے اسے سراسیمہ کر دیا۔ اسے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے غصے پر قابو پا لیتا۔ گلے میں لٹکی ہوئی صلیب نوچ کر نہ پھینکتا تو اس کے والد اتنے برہم نہ ہوئے ہوتے۔ وہ ان کی موت کو اپنی بے راہ روی سے تعبیر کر رہا تھا لیکن جلد ہی یہ سوچ کر اس کا حوصلہ مزید جوان ہو گیا کہ جس راستے پر چلتے ہوئے اس نے باپ جیسی نعمت کو گنوا دیا اب اسے اس راستے پر مزید تیزی سے چلنا چاہیے۔

لینن کا خاندان ابھی سربراہ کی موت کے صدمے سے سنبھلا نہیں تھا کہ ایک اور حادثے نے گھر کے در و دیوار ہلا دیے۔ زار سوئم کے قتل کی تیاری میں حصہ لینے کے الزام میں اس کے بڑے بھائی الیکساندر اولیانوف کو گرفتار کر لیا گیا اور اسی سال اسے پھانسی دے دی گئی۔

اسے باپ کے مرنے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا تھا جتنا بھائی کے بچھڑنے کا دکھ ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ کہا تھا' میں وہ کروں گا جو میرا بھائی کرے گا۔ اب بھائی مر گیا تھا۔ وہ مر نہیں سکتا تھا لیکن موت کی راہ پر تو چل سکتا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنی پوری زندگی انقلابی جدوجہد کے لیے وقف کر دے گا۔

وہ کئی دن تک اپنے کمرے میں بند ہو کر حالات پر غور کرتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ انقلاب کا راستہ تو اختیار کرے گا لیکن اپنے بھائی کے ایثار کے لیے سر عقیدت خم کرنے کے باوجود مختلف انداز اختیار کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ انفرادی طور پر زارشاہی کے نمائندوں اور خود زار کو قتل کر کے مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد کرنا غلط ہے اور اس سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ذہنوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ محنت کشوں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ ان کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔ مزدوروں کو یہ احساس ہوتے ہی ایسا سیلاب امڈے گا کہ محلاتِ شاہی کے در و دیوار ہل جائیں گے۔

وہ ایک عزم کے ساتھ اٹھا اور خود کو تیار کرنے میں مشغول ہو گیا۔ اب وہ تنہائی تھی اور کتابیں۔ سماجی علوم کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا۔ مارکس کے فلسفے کو چھان ڈالا۔ اس مطالعے نے اس کی تعلیمی حالت پر بھی نہایت خوشگوار اثر ڈالا۔ چنانچہ جب اس نے اسکول کی تعلیم ختم کی تو وہ سونے کے تمغے کا اہل سمجھا گیا۔ اس کے دل میں اٹھنے والے طوفان سے بے خبر اساتذہ نے اسے مبارک باد کے پھولوں میں تول کر اسکول سے رخصت کیا۔

اسکول سے نکلنے کے بعد اس کے سامنے دو راستے تھے۔ وہ یا تو عملی جدوجہد میں حصہ لے یا اپنی تعلیم کو جاری رکھے۔ اس نے دیکھا کہ عملی جدوجہد کے لیے ابھی حالات سازگار

سوانحی خاکہ

نام.....ولادیمیر ایلیچ اولیانوف (لینن)
والد.....ایلیا نکولائی وچ اولیانوف
والدہ.....ماریا الیکساندرونا
بیوی.....نادیژدا کروپسکایا
بھائی.....الیکساندر
بہنیں.....آنا' اولگا' دمتیری' ماریا
پیدائش.....اپریل 1870ء
وفات.....21 جنوری 1924ء
تدفین.....ماسکو۔

نہیں۔ وہ موت کا طلب گار تھا خودکشی کا نہیں۔ اپنے بھائی کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اس نے مناسب وقت کا انتظار کیا اور قازان یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ سال تھی۔

قازان یونیورسٹی کا ماحول اسکول سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس پر انکشاف ہوا کہ یہاں ایسے لڑکے بڑی تعداد میں موجود ہیں جو انقلابی خیالات رکھتے ہیں' بادشاہت کے خلاف ہیں' زارشاہی کے مظالم سے آگاہ ہیں لیکن ان کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔

"وہ سماجی نظام جس میں سرمایہ دار' محنت کشوں کے بل بوتے پر مزے اڑاتے ہیں ہمیشہ قائم نہیں رہے گا۔ سرمایہ دارانہ جبر و تشدد سے انسانیت کو نجات دلانے کے لیے ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو اقتدارِ شاہی کا تختہ الٹ کر سوشلسٹ سماج کی تعمیر کر سکے۔"

اس کے ساتھی طلبہ اس کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہے تھے لیکن ان کے ذہنوں میں ایک سوال بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ بالآخر ایک ساتھی نے یہ سوال اس کی طرف اچھال ہی دیا۔

"لینن تمہارے خیالات بڑے دلچسپ ہیں لیکن یہ تو بتاؤ یہ کام کرے گا کون؟ اقتدار کا تختہ الٹنے کے لیے فوج کہاں سے آئے گی!"

"یہ طاقت ہے اجرت پر کام کرنے والا مزدور طبقہ۔" لینن نے کہنا شروع کیا "یہ طبقہ سب سے زیادہ تشدد کا شکار بھی ہے' سب سے زیادہ منظم بھی اور سب سے زیادہ انقلابی بھی۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"مارکس بھی یہی کہتا ہے اور میرا اپنا مشاہدہ بھی یہی ہے۔"

"اگر مزدور اٹھ کھڑے ہوئے تو کیا نتیجہ سامنے آئے

گا؟''

''مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان جدوجہد کا نتیجہ سوشلسٹ انقلاب ہوگا، یعنی مزدوروں کی حکومت۔''

''یہ کیسے ہوگا۔ ہمارا مطلب ہے یہ جدوجہد کس طرح عمل میں آسکتی ہے؟''

''ایک انقلابی پارٹی ہونی چاہیے جو مزدور طبقے کی رہنمائی کرے۔''

''ہمیں کیا کرنا چاہیے، ساتھی؟''

''ہم سوشلزم کا مطالعہ کریں۔ یہ نظریہ مغربی یورپ میں پھیل چکا ہے۔ ہمیں اسے روس میں پھیلانا ہے اور یہ کام ہم نوجوان طلبہ ہی کرسکتے ہیں۔''

وہ اتنے اعتماد سے باتیں کررہا تھا کہ ساتھی طالب علموں کے دلوں میں بھی یقین کی شمع روشن ہوگئی۔ ان کے سامنے ایک ایسا طالب علم بیٹھا تھا جو ان کا ہم جماعت تھا لیکن اس کا مطالعہ ان سے بہت زیادہ تھا۔ وہ اس راہ میں ان کی رہنمائی کرسکتا تھا۔ انہوں نے اسی وقت اسے اپنا رہنما تسلیم کرلیا۔

لینن اپنے بڑے بھائی کی غیر موجودگی میں، گھر کا واحد مرد تھا۔ اس لیے اب اس کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کی بہنیں خود اس کی طرح روشن خیال اور انقلاب پسند تھیں لہٰذا اس نے بے فکر ہوکر نوجوان طلبہ کو اپنے گھر بلانا شروع کردیا جہاں وہ انہیں سوشلسٹ نظریات پر لیکچرز دے سکتا تھا۔

وہ ان سرگرمیوں کو نہایت خفیہ رکھے ہوئے تھا۔ لیکن زار شاہی کے جاسوس گھر گھر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان سرگرمیوں کی بھنک ان کے کانوں تک پہنچ گئی اور ایک دن ایک پولیس افسر چند سپاہیوں کے ساتھ اس کے گھر تک پہنچ گیا۔

''ارے نوجوان! ہنگامہ کیوں کرتے ہو۔'' پولیس افسر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا ''دیکھتے نہیں ہو تم دیوار سے ٹکرا رہے ہو۔''

''جس دیوار کی طرف آپ اشارہ کررہے ہیں وہ دیوار تو ہے لیکن بوسیدہ ہوچکی ہے۔ ایک دھکے میں گر جائے گی۔''

''نوجوان اگر اب بھی مصالحت کا راستہ اختیار کرو تو میں تمہیں گرفتاری سے بچا سکتا ہوں۔''

''گرفتاری بھی انقلاب کی جدوجہد کا حصہ ہے۔ آپ بے شک مجھے گرفتار کرلیں۔''

''نوجوان جیسے تمہاری مرضی۔''

پولیس افسر مجبور ہوگیا اور اسے گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا اور چند ہی روز بعد اسے جلاوطن کرکے قازان صوبے کے ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا۔ اس گاؤں میں قدم رکھتے ہی مناظر فطرت کی دل فریبی نے اس کے دل و دماغ کو جیسے خرید لیا۔ لکڑی کا ایک مکان جس کی چھت پر گھاس پھونس کا چھپر پڑا ہوا تھا، اسے رہائش کے لیے ملا لیکن اس گاؤں کی تنہائی میں یہ معمولی سا مکان اسے محل معلوم ہوتا تھا۔ وہ کچھ دیر اس مکان کے اردگرد گھوم پھر کر جائزہ لیتا رہا اور پھر ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اپنا دہرے پیندے والا سوٹ کیس کھولنے بیٹھ گیا جس میں وہ کتابیں اور ضروری کاغذات چھپا کر لایا تھا۔ پولیس والوں نے ہر طرح سے جانچ پڑتال کرلی تھی لیکن وہ اس سوٹ کیس کے پیندے میں چھپی ہوئی کتابوں کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور ان کتابوں کو نہایت احتیاط سے ایک جگہ چھپا دیا۔

اس گاؤں میں وہ سب کے لیے اجنبی تھا۔ لوگ اگر جانتے تھے تو اتنا کہ کوئی خطرناک لڑکا ہے جو حکومت کے خلاف کام کررہا تھا لہٰذا اسے یہاں لاکر قید کردیا گیا ہے۔ لینن سوچ کر خوش تھا کہ اسے یہاں کے مفلوک الحال لوگوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔

وہ اپنے ساتھ جتنی کتابیں لایا تھا اس کے لیے ناکافی ہوگئیں۔ یہاں فرصت اتنی تھی کہ چند ہی روز میں اس نے ان کتابوں کو پڑھ ڈالا۔ وہ دن نکلتے ہی پڑھنے بیٹھ جاتا اور رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو سیر کے لیے نکل جاتا۔ کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو دیکھتا رہتا۔ پھر ان میں سے کئی اس کے دوست بن گئے جنہیں وہ ان مظالم سے واقف کرتا رہا جو جاگیرداران پر کرتے تھے۔ ان کسانوں کے لیے یہ بالکل نئی باتیں تھیں لیکن تھیں دلچسپ۔ اس لیے کہ ان کے مفاد میں تھیں۔

ان کسانوں ہی کے ذریعے اس نے قازان سے اپنے لیے نئی کتابیں منگوالیں۔ مارکس اور اینگلز کی کتابوں کے مطالعے اور شدید غور و فکر کے بعد اسے پختہ یقین ہوگیا کہ مارکس ازم ہی کے ذریعے وہ فتح کے نشان تک پہنچ سکتا ہے۔

ایک سال بعد اس کی نظربندی ختم ہوگئی اور اسے قازان آنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے یونیورسٹی میں دوبارہ داخلے کی کوشش کی لیکن یونیورسٹی کے دروازے اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہوچکے تھے۔ اس طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد اس نے تعلیم کے حصول کے لیے ملک سے باہر جانے کی اجازت طلب کی لیکن اس کوشش میں بھی اسے ناکامی ہوئی۔

زار کی حکومت نے اس کا نام مشتبہ لوگوں کی فہرست میں

شامل کرلیا تھا۔ اس کی دن رات نگرانی کی جارہی تھی۔ یہ دن اس پر بہت بھاری تھے۔ ایک طرف اسے تعلیم حاصل کرنے سے روکا جارہا تھا دوسری طرف ایسی کڑی نگرانی تھی کہ وہ اپنے دوستوں سے ملتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ مجبور ہوکر اس نے قازان چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور ایک روز وہ اپنی والدہ اور بہنوں کو لے کر سمارا کے صوبے میں منتقل ہوگیا۔

یہاں پہنچ کر اس نے جمگھٹ کی چادر اتاری اور اجنبیت کی گرد جھاڑ کر باہر نکلا۔ چند ہی روز میں اسے اندازہ ہوگیا کہ یہاں کے انقلابی نوجوانوں پر نرودنیکوں کے نظریات کا بہت اثر ہے۔ یہ ایک انقلابی حلقہ تھا لیکن مارکس کے نظریات سے بالکل مختلف۔ نرودنیکوں کا خیال تھا کہ روس میں رہ کر ہمیں سرمایہ داری سے گزرنا نہیں ہے۔ اسی لیے وہ مزدوروں کی اہمیت کے قائل نہیں تھے، صرف کسانوں کو انقلابی طاقت قرار دے رہے تھے اور دہشت گردی کو انقلاب کا ذریعہ سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس دہشت گردی سے ڈر کر حکومت اپنی پالیسیوں میں تبدیلی پیدا کرے گی۔

لینن نے بہت غور کیا تو نرودنیکوں کے خیالات اسے حماقت آمیز نظر آئے۔ حکومتیں اس طرح نہیں ڈرا کرتیں۔ آندھیوں سے کچے مکان گرتے ہیں، محل مسمار نہیں ہوتے۔ اس کے لیے تو بنیادوں کو ہلانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قتل و غارت گری سے لوگ پھانسیوں پر چڑھیں گے۔ اس ایثار کے باوجود بھی نتائج خاطر خواہ نہیں نکل سکتے۔ اس نے ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد نرودنیکوں سے محاذ آرائی کی ٹھان لی تاکہ نوجوانوں کو راہِ راست پر لایا جائے۔ اس نے نرودنیکوں کے خلاف اعلانیہ تقریریں شروع کردیں۔ وہ جلد ہی ان لوگوں کی نظروں میں آگیا۔ اس پارٹی کے معتبر لوگ خود چل کر اس کے پاس آئے۔

''تم ابھی نوجوان ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ انقلاب کا راستہ کیسے طے کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے خون کا دریا پار کرنا پڑتا ہے۔''

''میرا خود بھی یہی خیال ہے لیکن ایک دو آدمیوں کے خون سے دریا نہیں بنتا۔ اس کے لیے یلغار کی ضرورت پڑتی ہے اور یلغار کے لیے آدمیوں کی۔ ایسے آدمیوں کی جن کے پاس کوئی واضح نظریہ ہو۔ پہلے اپنے اندر انقلاب لانا ہوتا ہے۔ آپ لوگ زار کے ایک آدمی کو قتل کرتے ہیں اور سب کو روپوش ہونا پڑتا ہے۔ جو پکڑا جاتا ہے اسے پھانسی دے دی جاتی ہے۔ اس طرح کب تک چلتا رہے گا۔ آپ کا طرزِ عمل نامعقول ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو مل کر تحریک چلانی

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
آپ کی دلچسپی کے مضامین سے مزین ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
میں ملاحظہ فرمائیں
ماہِ اپریل کے شمارے کی ایک جھلک
حضرت موسیٰ علیہ السلام
ضیا تسنیم بلگرامی
اس اولوالعزم پیغمبر کی زندگی کے حالات و واقعات جنھوں نے اپنی قوم کو کئی ہزار سال کی غلامی سے نجات دلائی، ایک ایمان افروز سلسلہ
اسمائے ربانی
کاشف زبیر
ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن دوشیزہ کا قصہ دلگداز، شیطان اسے اپنے جال میں جکڑنا چاہتا تھا۔ سسپنس کے آخری صفحات پر انوکھے جذبات و احساسات کی ترجمان ایک طویل داستان
تازہ شمارہ آپ کے نزدیکی بک اسٹال پر دستیاب ہے

ہوگی۔ جب فیکٹریوں میں ہڑتال ہوگی اس وقت سرمایہ داروں کو ہوش آئے گا۔ روس میں صرف مارکس کی تعلیم ہی انقلاب لاسکتی ہے۔''

اس وقت تو یہ لوگ اٹھ کر چلے گئے لیکن بعد میں اسے دھمکیاں ملنے لگیں۔ وہ ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے والا نہیں تھا۔ مارکس کا فلسفہ اس پر واضح ہو چکا تھا۔ جوانی کا خون رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ رفتہ رفتہ وہ سارا کے نوجوانوں کو راغب کرنے میں کامیاب ہوگیا اور ایک اچھا خاصا حلقہ اپنے گرد جمع کرلیا۔

ان مصروفیات کے باوجود وہ اپنی تعلیم سے غافل نہیں ہوا۔ 1891 میں اس نے پیٹرسبرگ یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں امتحان دے کر اول درجے کا ڈپلوما حاصل کیا اور سارا ضلع کی عدالت میں وکالت شروع کردی۔ لیکن اس پر یہ بھید جلد ہی کھل گیا کہ وہ عدالت میں مقدمہ لڑنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ہے۔

ایک سال بعد اس نے وکالت ترک کی اور انقلابی سرگرمیوں میں مشغول ہوگیا۔ اس کے نزدیک انقلاب کی پہلی تیاری یہ تھی کہ نوجوانوں کو مارکس کی تعلیم سے آشنا کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے سارا میں پہلا مارکسی حلقہ منظم کیا۔ انقلابی خیالات کے نوجوان جوق در جوق اس حلقے میں شامل ہونے لگے۔ وہ خود ابھی صرف بائیس سال کا تھا لہٰذا نوجوانوں میں تیزی سے مقبول ہونے لگا۔

اس حلقے کے ممبروں کے لیے لازم تھا کہ وہ باقاعدگی سے لینن کے لکچروں کو سنیں اور سرگرمی سے اس کا پروپیگنڈا کریں۔ ہر ملنے والے کے سامنے مارکس کے خیالات کو وضاحت سے بیان کریں اور ممکن ہو تو مزدوروں کے قریب جا کر ان کی زندگی کا مشاہدہ کریں۔ مسائل دریافت کریں اور اپنی یادداشتوں میں شامل کرلیں۔

بہت جلد اس کی یہ سرگرمیاں سارا تک محدود نہیں رہیں۔ قازان، سارا توف اور سیزران وغیرہ شہروں کے نوجوانوں سے روابط بڑھتے چلے گئے اور ان شہروں میں اس کے ہم خیالوں کی بڑی تعداد جمع ہوگئی۔

سارا کی تنگ گلیاں اس کے لامحدود خیالات کے لیے بہت محدود تھیں۔ اب وہ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا جو صنعتی مرکز ہو اور جہاں بڑی تعداد میں مزدور جمع ہوں۔ لہٰذا وہ 1892 میں پیٹرسبرگ آگیا۔

پیٹرسبرگ نہ صرف روس کا دارالحکومت تھا بلکہ مزدور تحریک کا بہت بڑا مرکز بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے محسوس ہوا جیسے وہ روس کے قلب پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا ہے۔

پیٹرسبرگ میں کئی ایسے خفیہ حلقے کام کر رہے تھے جن کے شرکا مزدوروں کے درمیان رہ کر مارکس کی تعلیمات کا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ لینن نے سارا میں رہ کر ان حلقوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرلی تھیں۔ وہ اپنے غیر معمولی مطالعے کے ساتھ ان مارکسٹوں کے سامنے نمودار ہوا تو انہیں بجا طور پر محسوس ہوا کہ لینن ان سب سے زیادہ مارکس کی تعلیمات کو سمجھتا ہے۔

اس نے اپنے فلسفے کو کچھ اس ڈھنگ سے پھیلایا کہ ہر دل پر اس کی قابلیت اور خلوص کا سکہ جم گیا۔ ان حلقوں نے بہت جلد اسے اپنا رہنما تسلیم کرلیا۔ یہ اس کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ مزدور طبقہ قطعی عزم کے ساتھ سرمایہ داروں سے جدوجہد کرنے لگا۔

اب وقت آگیا تھا کہ مزدوروں کی ایک خودمختار انقلابی پارٹی کا ڈول ڈالا جائے۔ مزدور پارٹی قائم کرنے میں ''نرودنیک'' حائل ہو رہے تھے جو عوام دوست کہلاتے تھے۔ ان کا زور بہت کچھ ٹوٹ چکا تھا لیکن کانٹے کی طرح کھٹک ضرور رہا تھا۔ مزدور تو لینن کی مٹھی میں آچکے تھے لیکن کسان ابھی تک نرودنیکوں کے ساتھ تھے اور لینن کا خیال تھا کہ مزدور اور کسان مل کر ہی تحریک کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔

لینن نے ان عوام دوستوں کا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک کتاب ''عوام کے دوست کیسے ہیں'' لکھی اور خفیہ طور پر چھاپ کر عوام میں تقسیم کردی گئی ''زردکاپیوں'' کے نام سے یہ کتاب لوگوں تک پہنچی تو بحث مباحثے کا بازار گرم ہوگیا۔

لینن نے اس کتاب میں ثابت کر کے دکھایا کہ نرودنیک عوام کے جھوٹے دوست ہیں جو امیر کسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ محنت کشوں کے اصل نمائندے مارکسٹ ہیں نہ کہ نرودنیک۔ اس نے زور دے کر لکھا کہ زار شاہی کا تختہ الٹنے کے لیے مزدوروں اور کسانوں کو مل کر تحریک چلانی ہوگی۔

اس کتاب کا چھپنا تھا کہ لینن کی مقبولیت کو پر وازمل گئی۔ مزدوروں اور مارکس کے نظریات پر چلنے والوں کو یقین آگیا کہ لینن کی صورت میں ان کو زبردست سیاسی اور نظریاتی طاقت مل گئی ہے۔

نرودنیکوں کی قوت کو اس نے سانپ کے پھن کی طرح کچل دیا۔ اسے جب یقین ہوگیا کہ مخالفوں کی قوت ٹوٹ گئی اور لوگ اس کے نظریات سے متفق ہونے لگے ہیں تو اسے ایک مرتبہ پھر انقلابی مارکسی پارٹی قائم کرنے کا خیال آیا۔ وہ

اپنے خوابوں کو۔ تعبیر دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے بڑے بڑے کارخانوں کے مزدوروں سے روابط قائم کیے۔ مزدوروں کی یونین کے نمائندوں نے لینن کا ساتھ دینے کا عہد کیا اور پارٹی قائم ہوگئی۔

یہ تمام کام خفیہ رکھا جارہا تھا اس لیے پارٹی کا کوئی مستقل دفتر قائم نہیں کیا گیا۔ مزدوروں کے محلے ہی پارٹی کے دفتر بن گئے۔ ہر کارخانے کا مزدور نمائندہ تمام مزدوروں کو اپنے گھر جمع کرلیتا تھا اور لینن کو اطلاع کردی جاتی تھی۔ لینن وقت پر وہاں پہنچ جاتا تھا۔ اکثر بھیس بدل کر جانا پڑتا تھا۔

ان نشستوں میں اس نے مارکسی تعلیم کے پیچیدہ مسائل کی وضاحت بار بار اس لیے کی تاکہ یہ فلسفہ مزدوروں کی سمجھ میں آسکے۔ چند نشستوں کے بعد ہی اس نے محسوس کیا کہ یہ محنت کش مارکسی افکار کو سمجھنے لگے ہیں اور خود اس کی عقیدت مزدوروں کے دلوں میں گھر کرتی جارہی ہے۔

ایسے ہی ایک لیکچر کے دوران اس کی ملاقات نادیژدا کروپسکایا نامی ایک استانی سے ہوئی جو مزدوروں کے شبینہ اتوار کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ لینن ہرگز صاحب دل نہیں تھا اور نہ کسی معاشقے کی اسے اب تک فرصت مل سکی تھی لیکن اس لڑکی کے اداس چہرے، ستواں ناک اور بڑی بڑی روشن آنکھوں نے اسے بے حد متاثر کیا۔ دوسری طرف وہ لڑکی بھی لینن کی وسیع معلومات اور انتظامی صلاحیتوں کی معترف تھی۔ لیکچر کے بعد جب وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے تو دونوں نے محسوس کیا کہ ان کے درمیان پارٹی کے رکن کے علاوہ بھی کوئی رشتہ ہے۔ عقیدت اور خلوص کا رشتہ جو آگے چل کر شاید گہری دوستی میں بدل جائے۔

''آپ سے مل کر اور مارکس ازم سے آپ کی عقیدت کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہورہی ہے۔'' لینن نے کہا۔

''اور مجھے یہ خوشی ہورہی ہے کہ آپ مجھ سے ہم کلام ہیں۔''

''آپ تو استانی ہیں۔ اپنے شاگردوں کے دلوں میں بڑی جلدی شمع روشن کرسکتی ہیں۔''

''میں اپنے طور پر پہلے ہی یہ کام کرتی رہی ہوں۔ میرے شاگرد اس حلقے میں آنے کے لیے بے تاب ہیں۔''

''کسی دن آپ میرے گھر تشریف لائیں۔ میری بہنوں سے مل کر آپ کو خوشی ہوگی۔ وہ سب بھی مارکس ازم کی دیوانی ہیں۔''

''میں ضرور آؤں گی۔''

اس نے دوسرے ہی دن اپنا وعدہ پورا کردیا۔ وہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ لینن کہیں گیا ہوا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو کروپسکایا اس کی بہن آنا کے کمرے میں گپ شپ کر رہی تھی۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ اس کی بہن کی کوئی دوست آئی ہوگی لیکن جب اس کی چھوٹی بہن اسے بلانے آئی تو اسے معلوم ہوا کہ کروپسکایا آئی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلا گیا۔

''میں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔'' کروپسکایا نے کہا۔

''میں نے پہلے ہی محسوس کرلیا تھا کہ آپ وعدہ پورا کرنے والی ہیں۔''

''آپ کی بہن تو مارکس ازم کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔''

''صرف جانتی نہیں ہیں، انہوں نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے۔''

''جہاں اتنے انقلابی ہوں اس گھر کا ماحول کتنا خوبصورت ہوگا۔''

''اب ایک انقلابی کا اضافہ اور ہوگیا۔'' لینن کے بولنے سے پہلے آنا بول پڑی۔

''مارکس کے فلسفے میں بہت سی ایسی پیچیدگیاں ہیں جنہیں میرے لیے سمجھنا دشوار ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں کبھی کبھی آپ کے گھر آجایا کروں؟'' کروپسکایا نے اجازت طلب کی۔

''میں یہ کہنے سے بچ گیا کہ کبھی کبھی آتی رہا کرو۔''

کروپسکایا کی شمولیت کے بعد لینن کی جدوجہد روز بہ روز رنگ لانے لگی۔ کروپسکایا کے بہت سے شاگرد ان حلقوں میں آگئے جن کی رہنمائی لینن کر رہے تھے۔

اب تک پیٹرسبرگ کے مارکسٹ چھوٹے حلقوں میں خفیہ طور پر پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ جب لینن نے اپنے لیکچروں سے مزدوروں کے ذہن تبدیل کردیے تو اس نے اپنی تبلیغ کا دائرہ وسیع کرنے کی ٹھانی۔ اس نے انگاروں پر چلنے کی مشق کی اور ایسے پمفلٹ اور اشتہار لکھنے بیٹھ گیا جنہیں پڑھ کر مزدوروں کے علاوہ عام لوگ بھی ایجی ٹیشن کے لیے کمر کس لیں۔ ان اشتہاروں کے ذریعے وہ ان مظالم سے واقف ہوجائیں جو سرمایہ دار، محنت کشوں پر ڈھاتے ہیں۔ سرمایہ دار کو شیر سے تشبیہ دیتے ہوئے اس نے ایک اشتہار تیار کیا۔

''پہلا حصہ شیر نے اپنے حق کے مطابق لیا۔ دوسرا حصہ اس لیے لیا کہ وہ درندوں کا بادشاہ ہے۔ تیسرا حصہ اس لیے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے اور چوتھا حصہ؟ جو بھی اپنا پنجہ اس کی طرف بڑھائے گا اپنی جگہ سے زندہ نہ اٹھے گا۔ یہی ہے

سرمایہ داروں کا رویہ جو مزدوروں کا بے رحمی سے استحصال کرتے ہیں اور ان کو لوٹتے ہیں۔''

اسی طرح کے دوسرے اشتہار نہایت قابلِ فہم عبارت میں جب عوام کے ہاتھوں تک پہنچنے شروع ہوئے تو ہلچل مچ گئی۔ یہ گم نام اشتہار حکومت کے لیے پریشانی اور عوام کے لیے طمانیت کا باعث تھے۔ کوئی تو ہے جو اس بہادری سے بات کر رہا ہے۔

ان اشتہاروں کا مقصد مزدوروں کو ایجی ٹیشن اور ہڑتالوں پر اکسانا تھا لیکن اس سے پہلے پیٹرسبرگ کے مارکسسٹوں نے لینن کو مشورہ دیا کہ وہ روس سے باہر نکلیں اور خاص طور پر ''محنت کی نجات'' نامی جماعت سے روابط استوار کریں اور مغربی یورپ کی مزدور تحریکوں سے واقفیت حاصل کر کے روسی مزدوروں کو منظم کریں۔

1895 کے موسم بہار میں وہ سوئٹزرلینڈ پہنچ گیا۔ اس کا نام اور کام ''محنت کی نجات'' نامی جماعت کے خاص خاص ممبروں تک پہنچ چکا تھا۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ روس کی شاہی حکومت کے سامنے مزدوروں کا سرخ پرچم بلند کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ان ممبروں نے اس کے استقبال کے لیے آنکھیں بچھا دیں اور اس کی بے خوفی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کی دانش مندی، ولولے اور یقین کو دیکھ کر سب نے یک زبان ہو کر کہا اب روسی عوام اپنی آنکھوں سے انقلاب کو برپا ہوتے ہوئے دیکھیں گے۔

سوئٹزرلینڈ میں رہ کر اس نے بہت کچھ سیکھا۔ یہاں کی لائبریریوں میں بیٹھ کر اس نے ان کتابوں تک رسائی حاصل کی جو روس میں نہیں مل سکتی تھیں۔ وہ سوئٹزرلینڈ سے لیے آیا تھا کہ مارکسسٹوں سے تعارف حاصل کرے گا لیکن جب یہاں سے رخصت ہونے لگا تو یہاں کے مارکسسٹ روسیوں سے تو قعات وابستہ کرنے لگے کہ لینن کی سربراہی میں روسیوں کو ضرور فتح حاصل ہوگی۔

سوئٹزرلینڈ سے روانہ ہو کر وہ پیرس گیا۔ خوش قسمتی سے وہ جس دن پیرس پہنچا اسی دن مزدوروں کا ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ اسے اس جلسے میں نہ صرف شرکت کا موقع ملا بلکہ تقریر کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس جلسے میں اس کی ملاقات مزدور تحریک کے ایک رکن پال لافارگ سے ہوئی۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مارکس کے داماد ہیں۔ اس رشتے نے اسے پال لافارگ کا اسیر بنا دیا۔ وہ جتنے دن پیرس میں رہا ان کا مہمان بنا رہا۔ انہی کے ذریعے اسے موقع ملا کہ مزدوروں کے محلوں اور گھروں میں جا کر ان کی زندگی اور رہن سہن کے بارے میں معلومات جمع کر سکے۔ یہ ایسا تجربہ تھا جو کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں تھا۔

پیرس کے بعد وہ جرمنی گیا اور پھر دوسرے کئی ممالک سے ہوتا ہوا روس واپس آیا۔ اس کے دہرے پیندے والے سوٹ کیس میں مارکسی ادب کی ایسی کتابیں چھپی ہوئی تھیں جو روس میں نہیں مل سکتی تھیں۔

کسٹم کے عملے کے سامنے اس نے اپنا سوٹ کیس جانچ پڑتال کے لیے رکھا تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور جب کسٹم آفیسر نے سوٹ کیس کو الٹ کر پیندے کو ٹھونک بجا کر دیکھنا شروع کیا تو اسے اپنی گرفتاری کا پختہ یقین ہو گیا۔ کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ کسٹم کا عملہ اس قسم کے دہرے پیندوں کا پتا لگا لیتا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کا سراغ نہیں لگ سکا اور وہ بخیر و خوبی نکل گیا۔

پولیس اس کی برابر نگرانی کر رہی تھی لیکن وہ ہر جگہ انہیں چھانسا دے کر نکل جاتا اور اپنے ساتھ نئی نئی کتابوں کی فوٹو کاپیاں مختلف شہروں میں تقسیم کرتا رہا۔

اسی سال یعنی 1895 کے آخر میں لینن نے ایک اور انقلاب آفریں قدم اٹھایا۔ اب تک مارکسی حلقے الگ الگ کام کر رہے تھے اور ان کا رابطہ مزدوروں تک محدود تھا۔ لینن نے پہلی سربراہی میں پیٹرسبرگ کے مارکسی حلقوں کو واحد سیاسی تنظیم میں متحد کر دیا اور اس کا نام ''مزدور طبقے کی نجات کے لیے جدوجہد کی تنظیم'' تجویز کیا اور اس انجمن نے عوام میں سیاسی ایجی ٹیشن کو فروغ دیا اور ہڑتالوں کی جدوجہد کی رہنمائی شروع کی۔ ایسے اشتہار شائع کیے جنہوں نے مزدوروں کے سیاسی شعور میں اضافہ کیا۔ ان اشتہاروں کا اثر یہ ہوا کہ پیٹرسبرگ کے مزدوروں نے اپنے مطالبات کے حق میں ہڑتال کر دی جس میں تیس ہزار سے زیادہ مزدوروں نے حصہ لیا، جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔

زار کی حکومت، جو ''انجمن'' کی سرگرمیوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ اس ہڑتال سے چونک اٹھی۔ انجمن کے بہت سے کارکن لینن سمیت گرفتار کر لیے گئے اور لینن کو پیٹرسبرگ کی جیل میں قید کر دیا گیا۔

جیل کی سلاخیں بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ اسے قید تنہائی میں رکھا گیا لیکن اس نے اپنے رفیقوں سے رابطے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی جو اس کی اپنی ایجاد تھی۔ اس نے ڈبل روٹی سے چھوٹی چھوٹی دواتیں بنائیں اور انہیں دودھ سے بھر لیا۔ کتابوں اور رسالوں کی سطروں کے درمیان اس نے دودھ سے انقلابی پیغام یا ضروری ہدایات لکھیں۔ یہ

تحریریں ویسے نہیں پڑھی جاسکتی تھی لیکن کاغذ کو گرم کرنے پر صاف پڑھی جاتی تھیں۔ یہ کتابیں کسی نہ کسی طرح باہر سے اندر اور اندر سے باہر جاتی رہیں۔

جیل میں رہتے ہوئے اس نے اپنی تصنیف ''روس میں سرمایہ داری کا ارتقا'' شروع کی۔ ابھی وہ اس تصنیف کو مکمل نہیں کر سکا تھا کہ جیل کا بڑا افسر اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک حکم نامہ تھا جس کی تعمیل لینن سے کرانی تھی۔

''اس کاغذ میں کیا لکھا ہے؟'' لینن نے پوچھا۔

''آپ خود پڑھ لکھے ہیں۔ اسے پڑھ لیجئے۔''

''مجھے معلوم ہے' مجھے وہی کرنا ہوگا جو اس میں لکھا ہے اس لیے آپ صرف یہ بتا دیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

''آپ کو مشرقی سائبیریا میں جلاوطنی کے تین سال گزارنے ہوں گے۔''

''سائبیریا میں مجھے کہاں جانا ہوگا؟''

''ایک گاؤں شوشینسکوئے میں آپ کو یہ دن گزارنے ہوں گے۔''

لینن نے حکم نامے پر دستخط کیے اور گاؤں پہنچ گیا۔ یہ ایک بھولا بسرا سائبیریائی گاؤں تھا جو ریلوے لائن سے سیکڑوں میل دور واقع تھا۔ وہ ریل سے اتر کر گھوڑا گاڑی کے ذریعے دن رات سفر کر کے شوشینسکوئے پہنچا تو یہاں کھیتوں میں کام کرنے والوں کے سوا کسی کو بھی نہیں دیکھا۔ اسے تعجب ہوتا تھا کہ یہ جفاکش لوگ کس طرح اپنی محدود دنیا سے باہر نکلتے ہوں گے۔

زار کی حکومت نے اسے بظاہر انقلابی سرگرمیوں سے الگ کر دیا تھا لیکن اس کا جوش خروش کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ وہ دوسرے دن صبح نکلنے سے پہلے ہی بھیجے والا ہیٹ لگا کر اپنی رہائش گاہ سے نکل کھڑا ہوا۔ کسان اپنے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ کسانوں نے ایک اجنبی کو اپنے درمیان دیکھا تو سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔

''جانتے ہو میں کون ہوں۔ میں ولادیمیر ایلیچ اولیانوف لینن ہوں۔''

''ہم نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔ پھر بھی تم بتاؤ اس دور افتادہ گاؤں میں سردی سے ٹھٹھرنے کیوں آئے ہو؟''

''میں خود نہیں آیا ہوں۔ مجھے یہاں بھیجا گیا ہے۔''

''تم حکومت کے جاسوس تو نہیں ہو؟''

''میں جاسوس نہیں تمہارا دوست ہوں۔''

''سارے جاسوس یہی کہتے ہیں۔''

''تم یقین کرو۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ سارے محنت کشوں کا دوست ہوں۔ تم خود دیکھو۔ تم کتنی محنت کرتے ہو مگر تمہیں کیا ملتا ہے۔ دو وقت کی روٹی بھی بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ محنت تم کرتے ہو عیش کوئی اور کرتا ہے۔ میں یہی بات کرتا ہوں۔ تمہارے لیے جنگ کر رہا ہوں۔ ملک میں انقلاب لانا چاہتا ہوں۔ اسی جرم کی سزا دینے کے لیے حکومت نے مجھے یہاں بھیج دیا ہے۔''

''تم تو بڑے خطرناک ہو۔ تم سے تو حکومت بھی ڈرتی ہے۔''

''تم لوگ اگر میرا ساتھ دو تو حکومت اور بھی زیادہ ڈرنے لگے۔''

''تم ہمیں حکومت سے لڑانا چاہتے ہو؟''

''لڑے بغیر کام نہیں چلے گا۔ شہروں میں پوری تیاری ہو چکی ہے۔ تم لوگ بھی ساتھ دو۔ میں جب تک یہاں رہوں گا تمہیں سکھاتا رہوں گا کہ کس طرح یہ لڑائی لڑنی ہے۔''

''اپنی لڑائی میں ہمیں مت گھسیٹو' جاؤ اپنا کام کرو۔''

کئی دن تک اسے یہی باتیں سننے کو ملتی رہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ لوگ اس سے مانوس ہونے لگے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی ان کے درمیان تھا لہٰذا آئے دن اس سے کوئی نہ کوئی کام پڑتا تھا۔ اس سے پہلے شاید چھوٹے سے چھوٹے مشورے کے لیے بھی ان لوگوں کو طویل سفر طے کرنا پڑتا ہوگا' اب ہر مشورہ مفت میں ملنے لگا تھا۔ لہٰذا یہ کسان اس کے پاس آنے جانے لگے اور ان کا خوف دور ہو گیا۔ ان لوگوں کی زندگیوں کو اسے بہت قریب سے دیکھنے کو موقع ملا جو اس کی تصنیفات کے لیے بہت مفید ثابت ہوا۔

اس طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس نے اپنی ادھوری تصنیف ''روس میں سرمایہ داری کا ارتقا'' مکمل کی۔ کئی غیر ملکی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ گاؤں کی تاریکی میں اس کے کمرے کی کھڑکی رات بھر روشن رہتی تھی۔ گاؤں والے حیران تھے کہ یہ شخص رات کو سوتا بھی ہے یا نہیں۔

وہ سیر کے لیے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اس کی زمین کسی نے ہتھیالی تھی اور اب اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے اپنی روئیداد لینن کو سنائی۔

''آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور کوئی کہہ رہا تھا وکیل بھی ہیں۔ آپ میرا مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں جلاوطنی کی سزا کاٹ رہا ہوں۔ اس لیے یہ مقدمہ نہیں لڑ سکتا۔''

''تو میں مایوس ہو جاؤں؟''

''نہیں' میں یہاں بیٹھے بیٹھے تمہیں مشورے دیتا رہوں

گا۔ لکھنے پڑھنے کا کام بھی تمہاری طرف سے کرتا رہوں گا۔ تم اگر مرمت کرو۔''

لینن نے اس کی وکالت کی اور زمین اسے مل گئی۔ اس واقعے کے بعد گاؤں بھر کے لوگ اسے احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔ لینن کو اب یہ سہولت ہو گئی کہ کسان اس کی بات سننے لگے۔ اس کا گھر باقاعدہ اسکول بن گیا جہاں وہ کسانوں کو مارکسی فلسفے کی تعلیم دینے لگا۔

اس دور افتادہ گاؤں میں رہتے ہوئے اسے ایک سال ہو گیا تھا کہ تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور اسے نہال کر گیا۔ ایک صبح اس کی دوست کروپسکایا نے اس گاؤں میں قدم رکھا اور اس کی رہائش گاہ پہنچ گئی۔ وہ اس وقت دھوپ میں کرسی ڈالے دھوپ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے ایک گھوڑا گاڑی کو رکتے ہوئے دیکھا پھر ایک لڑکی کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا۔ اور پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ کوئی اور نہیں کروپسکایا ہے۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔

''کروپسکایا! تم یہاں کیسے آ گئیں۔ مجھ سے ملنے پر تو پابندی ہے پھر ان لوگوں نے تمہیں کیوں نہیں روکا؟''

''وہ مجھے کیا روکتے۔ انہوں نے ہی تو مجھے یہاں بھیجا ہے۔''

''یہاں؟ میرے پاس؟ اس میں کیا چال ہے؟''

''کوئی چال نہیں بلکہ میں تمہاری طرح جلاوطن کر دی گئی ہوں۔ ان لوگوں نے تمہاری دوست ہونے کی حیثیت سے اتنی مہربانی کی کہ میں جلاوطنی کی مدت تمہارے گاؤں میں گزار سکتی ہوں۔''

''اب میں یہاں تمام زندگی رہ سکتا ہوں۔ لیکن میرے بغیر میری پارٹی کا کیا ہوگا' یہ سوچتا ہوں۔ اور اب تو تم بھی یہاں آ گئیں۔''

''ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اندھیرے جلد چھٹ جائیں گے۔'' کروپسکایا نے اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''پیٹرسبرگ کے حالات کی طرف سے میں سخت فکرمند ہوں۔ مزدور تحریک کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''حالات بہت امید افزا ہیں لیکن بعض معاملات پر مجھے تشویش ہے۔ شاید تمہیں بھی ہو، تمہاری غیر موجودگی میں کئی کامیاب ہڑتالیں ہوئیں۔ مزدوروں کے کئی مطالبات پورے ہو گئے۔ بس یہ وقتی کامیابی ہی ہمارے حق میں نقصان دہ ثابت ہوئی۔ روسی سوشل ڈیموکریٹوں کا ایک حصہ مزدوروں کو یہ تلقین دینے لگا ہے کہ ہمیں محض معاشی جدوجہد کرنا چاہیے۔ سیاسی جدوجہد اور انقلاب وغیرہ کی باتیں ہمارا کام نہیں۔''

''تم اسے تشویش کہہ رہی تھیں' یہ تو سخت خطرے کی بات ہے۔ یہ معاشیات پرست تو مزدور طبقے کو سمجھوتے کی طرف لے جائیں گے۔ حکومت کے ہوشیار کارندے ان مزدوروں کو بہت سستے دام خرید لیں گے۔ انقلاب کا تمام کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ ہماری جدوجہد کا کیا ہوگا؟'' وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کروپسکایا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''خیر کوئی بات نہیں۔ ایسے موقع پرستوں کا سامنا ہر تحریک کو کرنا پڑتا ہے۔ میں ان سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔'' لینن نے ایک عزم کے ساتھ کہا اور کروپسکایا کو لے کر اپنے لکھنے کے کمرے میں چلا گیا ''یہ موقع پرست کیا سمجھتے ہیں' میں مر گیا ہوں؟ میں ان کے خلاف مورچہ بند ہو کر لڑوں گا۔ جلاوطن رہ کر بھی مزدوروں کو متحد کروں گا۔''

کروپسکایا اس گاؤں میں پہلی مرتبہ اس کی مہمان بنی تھی اور گفتگو بہت تلخ ہو گئی تھی اس لیے اس نے موضوع بدلنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس نے کروپسکایا سے کہا کہ وہ فریش ہو جائے پھر وہ اسے اپنے دوستوں سے ملوانے لے چلے گا۔

کروپسکایا لباس تبدیل کر کے آئی تو لینن تیار ہو چکا تھا۔ وہ اسے لے کر قریب کے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ کام کرنے والے کسانوں نے اسے دیکھتے ہی خوشی سے نعرے لگائے اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ آنے والی لڑکی ان کے محبوب لینن کی منگیتر ہے تو ان کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ کروپسکایا کو لے کر ان محنت کشوں کے گھروں میں بھی گیا۔ کروپسکایا کو پہلی مرتبہ ان کسانوں کی حالتِ زار دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ خوشی اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان گھروں میں گھومتی پھر رہی تھی۔ کسی بڑے انقلاب کی آرزو اس سے پہلے اس کے دل میں کبھی اتنی شدت سے بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے پیٹرسبرگ کے مزدوروں کو بھی دیکھا تھا لیکن ان دیہاتیوں کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔

وہ لینن کی ہمراہی میں گھر واپس لوٹی تو سخت افسردہ تھی۔ کسانوں کی حالتِ زار دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔ تھکی ہوئی تو تھی ہی لباس تبدیل کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ لینن لکھنے کے کمرے میں چلا گیا۔ کروپسکایا کی زبانی پیٹرسبرگ کے حالات سن کر وہ سخت بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے کاغذ کا دستہ اٹھایا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ مضمون کی سرخی بنائی ''روسی سوشل ڈیموکریٹوں کا احتجاج'' صبح ہوئی تو وہ اپنی

تصنیف مکمل کر چکا تھا۔ اس میں لینن نے مزدوروں کے کاز کے لیے معاشیات پرستوں کے گمراہ کن اور مضر رساں خیالات کا پردہ چاک کیا اور روسی سوشل ڈیموکریٹوں کے بنیادی فریضوں کا تعین کیا۔ اس نے کہا ''صرف خودمختار مزدور پارٹی مطلق العنانی کے خلاف جدوجہد میں ڈٹ کر مورچہ لگا سکتی ہے۔''

صبح ہوئی تو وہ پھر کروپسکایا کو لے کر نکل گیا اور پھر روز کا یہی معمول بن گیا۔ رات کے پچھلے پہر تک اپنی تصانیف کی تکمیل کے لیے جاگتے رہنا اس کے معمولات کا حصہ تھا۔

وہ اور کروپسکایا تنہا رہ رہے تھے۔ وہ اچھے دوست ضرور تھے لیکن اس طرح اکیلے کب تک رہتے جبکہ جلاوطنی کے عذاب دن سامنے تھے۔ لینن نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ کروپسکایا سے شادی کر لے۔ اس نے تجویز کروپسکایا کے سامنے رکھی اس کی رضامندی ملتے ہی اس نے کسانوں کو مدعو کرلیا اور گاؤں والوں نے روایتی جوش وخروش سے ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔

شادی کے بعد اطمینان نصیب ہوا تو وہ انقلابی مارکسی پارٹی بنانے کا منصوبہ بنانے بیٹھ گیا۔ اس پارٹی کو بہت ہی خفیہ طریقے پر بنانا تھا تاکہ مطلق العنان بادشاہت کے عتاب سے محفوظ رہ سکے۔ وہ کئی دن تک اس منصوبے پر غور کرتا رہا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے ایک سیاسی اخبار شائع کیا جائے۔ یہ اخبار محض ایجی ٹیشن تک محدود نہ رہے بلکہ پارٹی کی طاقت کا ناظم ہونا چاہیے۔

اس اخبار کی اشاعت پر عمل درآمد اسی وقت ممکن ہوسکتا تھا۔ جب جلاوطنی کی مدت پوری ہوجائے۔ وہ اس مدت کے ختم ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس انتظار نے اس کی نیندیں اڑا دیں۔ رات رات بھر جاگ جاگ کر اپنے منصوبے پر غور کرنے سے اس کی صحت پر بہت برا اثر پڑا اور پھر اچانک زارشاہی کے سپاہی اس کے گھر میں گھس آئے اور تلاشی لینا شروع کردی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں یہ جلاوطنی کی مدت میں توسیع کرنے کی تمہید تو نہیں ہے لیکن شکر ہے سب کچھ بخیر وخوبی گزر گیا۔ 29 جنوری 1900ء کو جلاوطنی کی مدت ختم ہوتے ہی اسے آزادی مل گئی۔

تین سال کی طویل جلاوطنی کے بعد جب وہ شوشینسکوئے سے روانہ ہوا تو شدید سردی کا موسم تھا۔ اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی اتنی جلدی تھی کہ اس نے موسم بدلنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور دن رات سفر جاری رکھا۔ گھوڑا گاڑی کے پہیے برف میں دھنسے ہوئے چل رہے تھے۔ دور دور تک برف پھیلی ہوئی تھی اور وہ چل رہا تھا۔

زار کی حکومت نے دارالحکومت اور روس کے صنعتی شہروں میں اس کے قیام کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ پیٹرسبرگ سے قریب رہنے کے لیے اس نے پسکوف میں قیام کا فیصلہ کیا۔

اس کے سامنے اب صرف ایک ہی مقصد تھا کہ کسی نہ کسی طرح اخبار کا اجرا ہوجائے۔ مزدوروں کے کئی خفیہ اجلاسوں کے بعد اسے اندازہ ہوگیا کہ انقلابی اخبار کی اشاعت تقریباً ناممکن ہے۔ قدم قدم پر نگرانی کی جارہی تھی۔ چپے چپے پر پولیس کا پہرا تھا۔ کئی خفیہ اجلاسوں کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اس اخبار کو بیرون ملک شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ممانعت کے باوجود اس نے کئی شہروں کا خفیہ دورہ کیا۔ ہر جگہ بھیس بدل کر جاتا رہا۔ اخبار کی حمایت کا قول وقرار ہوا اور آئندہ کے لیے کارکنوں اور نامہ نگاروں کی نامزدگی کی گئی۔

مئی 1900ء میں وہ خفیہ دورے پر پیٹرسبرگ گیا ہوا تھا کہ اسے گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے پاس اس کے غیر ملکی ساتھیوں کے پتوں کی فہرست تھی جو ایک بل پر لکھی ہوئی تھی۔ پولیس نے اس کی تلاشی لی۔ وہ بل بھی دیکھا لیکن وہ یہ نہیں جان سکی کہ اس پر پتے لکھے ہوئے ہیں ورنہ اس کے ساتھ بہت سے لوگ گرفتار ہوجاتے۔ وہ غیر قانونی طور پر پیٹرسبرگ میں داخل ہوا تھا لہٰذا صرف اتنا کہا گیا کہ اسے پیٹرسبرگ سے نکال دیا گیا۔

لینن کو اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ پولیس نے اپنے افسران بالا کو رپورٹ تحریر کی ہے کہ اس وقت لینن سے زیادہ خطرناک کوئی اور انقلابی نہیں۔ اور یہ تجویز بھی دی ہے کہ لینن کو جان سے مارنے کا بندوبست کیا جائے۔

ان معلومات کے بعد اب اس کا روس میں رہنا خطرناک ہوگیا تھا۔ اس نے روس چھوڑنے کا ارادہ کرلیا اور ایک رات دہقان کا بھیس بدل کر وہ روس سے نکل کر جرمنی چلا گیا۔ یہاں وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہوسکتا تھا۔

اس اخبار کی اشاعت میں کئی مشکلات درپیش تھیں۔ چھاپے خانے کے لیے وسائل اور جگہ کی ضرورت تھی۔ روسی زبان کا ٹائپ فراہم کرنا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے اتنی رازداری سے چھاپنا تھا کہ زارشاہی کے جاسوس اس خفیہ جگہ کا پتا نہ تلاش کرسکیں۔

لینن نے جرمن سوشل ڈیموکریٹوں سے مسلسل رابطے

رکھے اور بالآخر ایک سال کی تگ ودو کے بعد اس اخبار کا پہلا شمارہ شائع ہوگیا۔ اس اخبار کا نام اس نے ''اسکرا'' تجویز کیا۔ یعنی ''چنگاری''۔

روس میں مزدور طبقے کی رہنمائی میں انقلابی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ آئے دن ہڑتالیں ہورہی تھیں۔ کسان' زمینداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور نوجوان طالب علموں میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ ایسے میں لینن کے اخبار ''اسکرا'' کی پہلی اشاعت روس پہنچ گئی جس کی پیشانی پر لکھا تھا ''چنگاری ہی بھڑک کر شعلہ بنتی ہے۔''

لینن نے اپنے معاونوں کے گروہ اس طرح پھیلا دیے تھے کہ اخبار ہاتھوں ہاتھ تقسیم ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایجنٹوں کا جال بچھ گیا۔ یہ ایجنٹ مزدوروں کی خبریں' خطوط' مضامین اور مالی وسائل فراہم کرنے میں مصروف ہوگئے۔ روس میں اخبار پہنچانا اور خفیہ اداروں سے بچانا بہت ہی مشکل کام تھا۔ اس کو باریک اور مضبوط کاغذ پر چھاپا جاتا تھا۔ دہرے پیندے والے سوٹ کیسوں یا کتابوں کی جلدوں میں چھپا کر بھیجا جاتا تھا یا کپڑوں میں سی کر بھیج دیا جاتا۔

اتنی احتیاط کے باوجود یہ اخبار خفیہ اداروں سے چھپا نہ رہ سکا۔ اب تک کئی مرتبہ بڑی تعداد میں یہ اخبار پکڑ لیے گئے تو لینن کے مشورے سے اس کی نقلیں چھاپنے کے لیے خفیہ چھاپے خانے قائم ہوگئے اور یہ کام انتہائی خفیہ انداز میں انجام دیا گیا چند کاپیاں کسی نہ کسی طرح روس پہنچادی جاتیں اور پھر ان کی نقلیں چھاپ کر فیکٹریوں اور کارخانوں کے مزدوروں تک پہنچادی جاتیں۔ یہ کام نہایت خطرناک تھا لیکن لینن کے جاں نثار ساتھی نہایت ہوشیاری سے اس کام کو انجام دیتے رہے۔

اب اس اخبار کے ذریعے لینن کو ایسا ذہن تیار کرنا تھا' ایسے لوگ بنانے تھے جو انقلابی رول ادا کرسکیں۔ اس کے لیے اس نے منصوبہ بنایا کہ انقلابی پارٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہو جو خود کو انقلاب کے لیے پوری طرح وقف کردیں۔ دوسرے حصے میں پارٹی ممبروں کی کثیر تعداد ہو۔

اس اخبار کے ذریعے اس نے انقلابیوں کی تربیت کا فریضہ انجام دیا اور اپنی تصنیف ''کیا کیا جائے'' میں اپنے پروگرام کو وضاحت کے ساتھ بیان کر کے مزدوروں اور عوام تک پہنچایا۔

1902 کی ابتدا میں پولیس کے جاسوسوں نے ''اسکرا'' کا پتا لگالیا۔ جب ایک رات پولیس نے چھاپے خانے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اخباروں کی کاپیاں' کاغذ اور مشینیں اپنے قبضے میں لے لیں اور ایڈیٹوریل بورڈ کی گرفتاریوں کے لیے چھاپے مارے جانے لگے تو لینن کا میونخ میں رہنا مشکل ہوگیا۔ اب لینن نے اخبار کی اشاعت کے لیے لندن کا انتخاب کیا۔

گہرے آسمانی رنگ کی روسی قمیص پہنے ہوئے' پستہ قد اور گٹھے ہوئے جسم والا ایک آدمی لندن کے ایک کتب خانے میں بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا۔ اس کا حلیہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ روسی ہے پھر کسی نے اسے مزدوروں کے ایک جلسے میں دیکھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا خاموشی سے تقریریں سن رہا تھا۔ بہت جلد لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ کوئی اور نہیں مشہور انقلابی لینن ہے جو روس میں انقلاب لانے کی تحریک چلا رہا ہے۔

اس کی شخصیت میں کچھ ایسی دلکشی تھی کہ بہت جلد مزدور رہنما اس کے گرد جمع ہوگئے۔ لینن کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ انگریز مزدوروں کی زندگی سے واقفیت حاصل کرے۔

اس کا اخبار ''اسکرا'' جنیوا سے شائع ہونے لگا تھا لہٰذا وہ اپنی بیوی کے ساتھ جنیوا آگیا اور اس کے مضافات میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہنے لگا۔ اب اس کے دو کام تھے۔ روس سے فرار یا جلاوطن ہونے والوں کو زندگی کے وسائل فراہم کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا اور لیبر پارٹی کا ایک اجلاس بلانا جس میں انقلابی مارکسی پارٹی کے قیام کو حتمی شکل دینا تھا۔ وہ ان دونوں منصوبوں میں کامیابی سے ہمکنار ہوا۔

اس نے مزدوروں کو ''موت یا آزادی'' کا نعرہ دیا جو پورے روس میں گونجنے لگا۔ اس نعرے کی گونج اس وقت ایک عظیم الشان طوفان میں بدل گئی جب پیٹرسبرگ میں زار کے حکم سے ان مزدوروں پر گولی چلائی گئی جو اپنی بیویوں اور بچوں سمیت اس کے پاس پرامن طریقے سے جارہے تھے تاکہ اپنی ناداری کے بارے میں بتائیں۔

زارشاہی کے اہل کار اسے معمولی واقعہ سمجھ رہے تھے لیکن لینن کی تحریک نے مزدوروں کو بیدار کردیا تھا۔ اب وہ کسی ظلم کو برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ شام آئی نہیں تھی کہ شہر کی مزدور بستیوں میں مورچے کھڑے کیے جانے لگے۔

زارشاہی کے خلاف یہ پہلا عوامی احتجاج تھا جسے لینن نے انقلاب کی ابتدا قرار دیا۔ وہ پیٹرسبرگ سے دور جنیوا میں تھا لیکن روس میں ہونے والے واقعات کا بغور مطالعہ کررہا

تھا۔ اس کی پارٹی کا کوئی نہ کوئی ممبر جنیوا پہنچ کر اسے حالات سے باخبر کرتا تھا اور واپس آ کر اس کی ہدایات تمام کامریڈوں کو بتاتا تھا۔

لینن کی ساری توجہ روس پر مرکوز تھی۔ اس کے خیال میں چنگاری بھڑک کر شعلہ بننے ہی والی تھی۔ اس نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگانے کی ٹھانی اور اپریل 1905 میں لندن میں لیبر پارٹی کی تیسری کانگریس طلب کرلی تاکہ ممکنہ انقلاب کے لیے تجاویز پر بحث کی جاسکے۔ لینن کو اس کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔

اس نے اس کانگریس میں کئی رپورٹیں پیش کیں' تقاریر کیں۔ مسلح بغاوت کو پارٹی کا بڑا اور فوری فریضہ مانتے ہوئے کانگریس نے تمام پارٹی تنظیموں کو ہدایت کی کہ وہ مزدوروں کو مسلح کرنے' بغاوت کا منصوبہ مرتب کرنے اور براہِ راست اس کی رہنمائی کرنے کے لیے مخصوص اقدامات کریں۔

کانگریس کے خاتمے پر لینن جنیوا پلٹ آیا اور اپنی لاجواب تصنیف ''جمہوری انقلاب میں سوشل ڈیموکریسی کے دو طریقہ کار'' نامی کتاب لکھنے بیٹھ گیا۔ اس تصنیف میں اس نے انقلاب کے سارے مسائل پر روشنی ڈالی جو شروع ہو چکا تھا۔ اس کے خیال میں روس میں جو انقلاب شروع ہوا ہے وہ جمہوری انقلاب ہے۔ اس کا فریضہ ہے کسان غلامی کی باقیات کو ختم کرنا' زارشاہی کا تختہ الٹنا اور جمہوری آزادیاں حاصل کرنا۔ اس نے وضاحت کی کہ مسلح بغاوت زار کی مطلق العنانی ختم کرنے کے لیے فیصلہ کن ذریعہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو سوشلسٹ انقلاب کی فتح تک جاتا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد انقلابی تحریک تیزی سے بڑھی۔ پیٹرسبرگ' وارسا اور دوسرے صنعتی مرکزوں میں ہڑتالوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ کسان تحریک کی لہر روس کے سارے اضلاع میں پھیل گئی۔ لینن نے نہایت برق رفتاری سے پیٹرسبرگ میں ایک جنگی کمیٹی تشکیل دینے کا حکم دیا اور ہدایت کی ''نوجوانوں کے پاس جاؤ۔ ہر جگہ مجاہد دستے بناؤ۔ انہیں فوجی تربیت دو اور اس کے ساتھ ہی لینن نے ملک سے باہر ہتھیار خرید کر روس بھیجنے کے انتظامات شروع کر دیے۔

جب مزدوروں کی ایک بڑی تعداد ہتھیاروں سے لیس ہوگئی تو لینن نے مصلحت اور خوف کا پردہ چاک کر کے پیٹرسبرگ واپس آنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اس نے خود ساختہ جلاوطنی کو ختم کر کے روس کی سرحد میں قدم رکھا اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیٹرسبرگ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں میں سے ایک کے گھر میں اتر گیا۔ لیکن جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ وہ وقت سے پہلے یہاں آ گیا ہے۔ انقلاب کی لہریں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کی موجودگی نے گویا جلتے ہوئے شعلوں پر تیل چھڑک دیا تھا۔ خون آشام شہنشاہیت کو یہ کیسے برداشت ہوسکتا تھا کہ لینن اس انقلابی جدوجہد کی براہِ راست رہنمائی کرے۔ اس کی گرفتاری کے پروانے جاری ہوگئے۔ پارٹی رہنماؤں کے گھروں کی تلاشی لی جانے لگی۔ کئی جگہوں پر مزاحمت بھی کی گئی لیکن ریاستی طاقت کا پلڑا بھاری رہا۔ اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی رہائش گاہیں تبدیل کرتا رہا اور پھر فن لینڈ چلا گیا۔

دسمبر 1905ء میں ماسکو کے مزدوروں نے حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کا آغاز کر دیا۔ دو بجے دن کا وقت تھا کہ توپیں گرجنے لگیں۔ زار کی فوج اور پیٹرسبرگ سے آئی ہوئی پولیس نے مزدوروں پر ہلّہ بول دیا تھا۔ مزدوروں کا رویہ حیرت انگیز تھا۔ گھمسان کی اس لڑائی میں ریلوے اسٹیشن اور بازار خاص طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ سڑکوں پر فصیلیں کھنچتا کیا جا رہا تھا۔

جنگ کے یہ شعلے ماسکو سے نکل کر دوسرے شہروں تک پھیل گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اس طوفان کے سامنے زارشاہی کے محلات زمیں بوس ہوجائیں گے لیکن یہ سرگرمیاں اتنی غیر منظم ثابت ہوئیں کہ اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد زار کے فوجیوں نے اس بغاوت کو کچل دیا۔

توپوں کی گرج تھمی تو لینن کی آواز گونجی۔ اس نے مزدوروں کی اس مسلح بغاوت کو بہت سراہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس بغاوت کی خامیوں کی طرف بھی توجہ دی۔

''اس لڑائی کو حفاظتی نہیں بلکہ حملہ کرنے والا ہونا چاہیے تھا۔ فوجیوں کے اعتماد کو جیتنا تھا اور اس جدوجہد میں کسانوں کی شرکت کو بھی لازمی بنانا چاہیے تھا۔''

لینن نے ''جنگی کمیٹی'' پر تنقید کرنے کے بعد باشعور مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ ان سے سیکھیں اور نئی لڑائی کی تیاری کریں۔ آئندہ لڑائی ایسی ہو جسے فتح سے ہمکنار ہونا چاہیے۔

اس جدوجہد کے مجموعی تجربے کو سامنے رکھ کر لینن نے مارچ 1906ء میں ایک کتابچہ ''کیڈٹوں کی فتح اور مزدور پارٹی کے فریضے'' لکھا جس میں اس نے اس لڑائی کو مزدور طبقے کی عالمی تاریخی جدوجہد میں انتہائی اہم قدم قرار دیا۔

انقلاب کی فتح کے لیے زیادہ کامیاب جدوجہد کی غرض سے پارٹی کے بہت سے ممبروں نے مطالبہ کیا کہ پارٹی کو مزید مربوط اور متحد کیا جائے۔ اس کی پارٹی میں دو دھڑے بن گئے

تھے۔ ایک دھڑا بالشویک کہلاتا تھا دوسرا منشویک۔ منشویک مسلح بغاوت کے حق میں نہیں تھے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ ان سے اتحاد کیا جائے۔ زار شاہی کے خلاف جدوجہد کے مفادات کا تقاضا یہ تھا کہ روس کی تمام قوموں اور سارے ملک کے مزدوروں کو متحد کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے چوتھی پارٹی کانگریس کی ضرورت محسوس کی۔

10 اپریل 1906ء کو کانگریس کا افتتاح ''عوامی گھر'' میں ہوا جو سویڈن کے سوشل ڈیموکریٹوں نے فراہم کیا تھا۔ اس کانگریس میں شرکت کے لیے وہ اسٹاک ہوم (سویڈن) گیا جہاں مزدوروں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔

کانگریس کی کارروائیاں بالشویکوں اور منشویکوں کے درمیان سخت جدوجہد کی حالت میں ہوتی رہیں۔ لینن اور دوسرے بالشویک اس مطالبے پر اڑے ہوئے تھے کہ زمینداروں کی زمینیں ضبط کرلی جائیں اور ساری زمین کو قومی ملکیت قرار دیا جائے۔ زمین کو قومی بنانا صرف مطلق العنانی کا تختہ الٹ دینے ہی کی صورت میں ممکن تھا۔ جبکہ منشویک زمین کو قومی ملکیت بنانے کے خلاف تھے۔

لینن نے منشویکوں کے پروگرام پر سخت نکتہ چینی کی' کیونکہ اس کا مطلب زمینداروں سے سودے بازی کرنا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زمینداروں کا تختہ الٹے بغیر زرعی مسئلے کا حل ممکن ہی نہیں۔

لینن کی تنقید صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ کانگریس نے اپنی اکثریت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منشویکوں نے سارے بنیادی مسائل پر اپنے فیصلے منوالیے۔ انہوں نے اخبار ''سوشل ڈیموکریٹ'' کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کانگریس میں اپنی ناکامی کے بعد وہ اپنی کارکردگی سے مایوس ہونے کے بجائے زیادہ سرگرمی سے مصروفِ عمل ہوگیا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ روس کی تمام سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں واحد روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی میں..... متحد ہوجائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے ملاقاتوں کے دائرے کو وسیع کر دیا۔ دانش وروں' ملازم پیشہ لوگوں اور طالب علموں سے ملاقاتیں کر کے منشویکوں کو بے نقاب کرنے کے مواقع تلاش کرتا رہا۔

9 مئی 1906ء کو اس نے پیٹرسبرگ میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے میں وہ حلیہ بدل کر اسٹیج پر آیا۔ سامعین کے سامنے اس کا تعارف کارپوف کے فرضی نام سے کرایا گیا۔ وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو مجمع پر سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن جب تقریر ختم ہوئی تو جلسے کے شرکا میں غیر معمولی جوش کی لہر دوڑ چکی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے شرکا آنے والے انقلاب کو اسی لمحے آخری حد تک لے جائیں گے۔

اس نے اس قسم کے جلسوں کے جال پھیلا دیے۔ ہر جگہ اس کی بات غور سے سنی جا رہی تھی۔ اس کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور وہ مختلف پارٹیوں کو بالشویکوں کے گرد متحد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اپریل 1907ء میں لیبر پارٹی کی پانچویں کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں منشویکوں پر اسے فتح حاصل ہوگئی۔ اب روس کی قسمت کا فیصلہ صرف اس کے اور اس کی پارٹی کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس عظیم کامیابی کے بعد وہ لندن سے روس آ گیا اور فن لینڈ میں رہائش اختیار کرلی۔ پیٹرسبرگ صوبے کی پولیس کے خاص محکمے کے خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ کو ہدایت کی کہ وہ لینن کے بارے میں اطلاعات حاصل کرے اور فن لینڈ سے انہیں ہمارے حوالے کرنے کا سوال اٹھائے۔

زارشاہی کے جاسوس ہر طرف مزدور طبقے کے لیڈروں کی تلاش کرنے لگے۔ لینن نے ایک مرتبہ پھر اپنا حلیہ تبدیل کیا اور فن لینڈ کے مضافات میں چلا گیا۔ وہ یہاں کسان کا روپ دھار کے کھیتوں میں کام کر رہا تھا لیکن پیٹرسبرگ سے اس کا برابر رابطہ تھا۔ پل پل کی خبریں اسے مل رہی تھیں۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بالشویکوں کے مرکز نے یہ فیصلہ کیا لینن بیرونِ ملک چلے جائیں۔ یہ پیغام اسے مل بھی گیا لیکن فن لینڈ سے باہر جانا آسان نہیں تھا۔ جاسوسوں کی ہر جگہ موجودگی اس کے فرار میں مانع تھی۔ بندرگاہ کا رخ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں بندرگاہ کو چھوڑتا ہوا ایک جزیرے تک پہنچ گیا جہاں سے اسے خلیج فن لینڈ کو پار کرنا تھا۔ اس خلیج کو دیکھ کر اس کی ہمت پست ہوگئی۔ برف ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی۔ کون سا پاؤں برف کو توڑتا ہوا اندر دھنس جائے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اس احمقانہ موت کے لیے تیار کیا اور برف پر پاؤں رکھ دیا۔ کئی مرتبہ اس کے پیروں نے برف کو توڑا اور وہ ڈوبتے ڈوبتے بچا۔

1908ء میں وہ ایک مرتبہ پھر جنیوا' سوئٹزرلینڈ واپس آ گیا۔ انقلابی روس کی گہما گہمی سے نکل کر اس پرسکون شہر میں آ کر وہ اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا۔ وہ یہاں کی پُرسکون سڑکوں پر اپنی محنت کو قتل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں مزدوروں کے کئی جلسوں سے خطاب کر چکا تھا۔ روس کے بے کس مزدور اسے یاد آ رہے تھے لیکن وہ جلاوطنی پر

مجبور تھا۔

☆☆☆

روس میں اٹھنے والا انقلاب ناکام ہو چکا تھا لیکن مطلق العنان نظام میں کچھ نہ کچھ دراڑیں ضرور ڈال گیا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ روس عالمی انقلاب کی تحریک کا مرکز بن گیا۔ پوری دنیا میں لینن کا نام محنت کش عوام کے ممتاز رہنما کی حیثیت سے نمایاں ہو گیا۔

لینن کی تمام توجہ انقلاب پر لگی ہوئی تھی۔ اسے اس کی کوششوں میں شکست ہوئی تھی' اس کے حوصلوں کو شکست نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی پوری توانائی کے ساتھ دوبارہ انقلاب کی لڑائی لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی آواز برابر گونج رہی تھی۔

''سوشل ڈیموکریٹوں نے ایسی پرولتاری پارٹی بنالی ہے جو پہلے جنگی حملے کی ناکامی سے ہمت نہیں ہار بیٹھے گی' بدحواس نہیں ہوگی۔ ہماری پارٹی فتح کی طرف جا رہی ہے۔''

روس میں قیامت آئی ہوئی تھی۔ عوام کو انقلاب برپا کرنے کی سخت سزا مل رہی تھی۔ لاکھوں انقلابیوں کو انتقام کا نشانہ بننا پڑا۔ بامشقت قید کی سزا ملی یا جلاوطن کر دیے گئے۔ بعض ایسے بدنصیب تھے جنہیں پھانسی کے تختے کی زینت بنا دیا گیا۔ پارٹی کے ممبروں کی تعداد بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ جو تھے وہ منتشر ہو گئے تھے۔ تنظیموں کے درمیان روابط کمزور پڑ گئے تھے۔ ان واقعات سے عام ذہنوں میں انقلاب ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ ایسا اندھیرا تھا جس میں آندھیوں کے شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

ان حالات میں ایک مرتبہ پھر ذہنوں کی تبدیلی کا سوال سامنے آیا۔ یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بالشویک ابھی زندہ ہیں۔ لینن نے ''پرولتاری'' اخبار دوبارہ شائع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس نے اخبار کی معاونت کے لیے میکسم گورکی' لونا چارسکی اور دوسرے ترقی پسند صحافیوں کو آمادہ کیا۔

اخبار کی اشاعت کا کام زبردست محنت طلب تھا۔ اس سے بھی زیادہ مشکل کام' اخبار کو روس کے اندر پہنچانا تھا۔ مطلق العنان بادشاہت اب پوری طرح حاوی ہو چکی تھی۔ جان کا خوف ہر جاندار کو تھا۔ لینن کے جاں نثار ساتھی یا تو مارے جا چکے تھے یا اب روس میں نہیں تھے۔ وہ تقریباً ایک سال تک اخبار کی اشاعت اور اس کی ترسیل کے سوالوں پر غور کرتا رہا بالآخر 1908ء کے آخر میں اخبار ''پرولتاریہ'' کی اشاعت پیرس سے ہونے لگی جو اس وقت روسی تارکینِ وطن کا مرکز بنا ہوا تھا۔

لینن نے اپنی بیوی کروپسکایا کو ساتھ لیا اور پیرس میں شہر سے دور ایک سستے سے کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ اس کے پاس ایک سائیکل تھی جو اسے قومی کتب خانے تک لے جانے کا واحد ذریعہ تھی۔ وہ جس شہر میں بھی جاتا تھا وہاں کے کتب خانوں میں وقت گزارنا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا تھا۔ پیرس پہنچتے ہی اس نے سائیکل اٹھائی اور سارے شہر کا چکر لگا کر وہ کتب خانے پہنچ گیا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ اس کا فلیٹ' کتب خانے سے بہت دور ہے اور اس کا اچھا خاصا وقت سفر میں گزر جاتا ہے لیکن سستا فلیٹ شہر سے دور ہی مل سکتا تھا۔

روس کے تارکینِ وطن جو پیرس آ گئے تھے ان کی حالت بہت خراب تھی۔ اب لینن کو اخبار کی ایڈیٹری کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان تارکینِ وطن کی ابتر حالت کی بھی فکر ستا رہی تھی جو اپنے رہنما کو اپنے قریب دیکھ کر اسے گھیرے ہوئے تھے اور اس کی طرف امید افزا نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان کی مدد کے لیے جگہ جگہ تقریروں کا سلسلہ شروع کیا تاکہ اس کی آمدنی سے حاجت مند رفیقوں کی حاجتوں کو پورا کیا جا سکے۔

وہ محنت کے ایسے پل صراط کو پار کر رہا تھا جو انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اجتماع کے سامنے پیش کرنے کے لیے تفصیلی رپورٹیں تیار کرنا' اخبار کے لیے مضامین لکھنا' خطوط کے جواب دینا اور پارٹی کے مخالفین کے خلاف مستقل تصانیف لکھنے میں مشغول رہنا۔ اتنا وقت بھی نکالنا اس کی ذمے داریوں میں شامل تھا کہ وہ فرانس کے محنت کشوں سے ملاقاتیں کر کے ان کی زندگی کا مطالعہ کرے اور ان کے جلسوں میں شریک ہو۔

ان مصروفیات کے باوجود اس کی خوش اخلاقی اور ملنساری میں کوئی فرق نہ آنے پایا۔ وہ ڈرامے دیکھنے' میوزیموں میں جانے اور دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے لیے وقت نکال ہی لیتا۔

اس کی اس سخت محنت و جانفشانی نے اثر دکھایا۔ 1910ء میں پھر سے روس میں مزدور تحریک میں جان پڑنے لگی۔ پیٹرسبرگ، ماسکو اور دوسرے بڑے شہروں میں فیکٹریوں اور کارخانوں میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بالشویک پارٹی ایک مرتبہ پھر متحرک ہو گئی اور ان ہڑتالوں کی رہنمائی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہاں تک ہوا کہ دسمبر 1910ء میں بالشویکوں نے پیٹرسبرگ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''زویزدا'' کی اشاعت کا انتظام کر لیا اور دیکھتے ہی

دیکھتے یہ اخبار مجاہد مارکسی اخبار بن گیا۔

لینن بڑی خوشی سے اس منظر کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پارٹی کارکنوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب اسے ان کی سیاسی تربیت کی فکر تھی۔ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے پیرس کے قریب لون زیومو کے مقام پر پارٹی کا اسکول قائم کیا۔ بڑی بڑی تنظیموں کے خفیہ کارکن مزدور تربیت کے لیے پہنچنے لگے۔ لینن نے ان مزدوروں کو سیاسی معیشت' زرعی مسئلے اور سوشلزم کے نظریے پر عام فہم لیکچر دیے' پارٹی کے کام کی صورتِ حال پر مضامین پڑھے۔

ایک طرف تربیت کا کام جاری تھا دوسری جانب سیاسی حالات نے پارٹی کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت پیدا کر دی۔ اس نے اپنے اسکول کے تربیت یافتہ مزدوروں کو روس بھیجا۔ ان لوگوں کی کوششوں سے چار سال کے انتشار کے بعد پہلی بار روسی پارٹی مرکز قائم ہوا۔ لینن کی تجویز پر' پراگ میں پارٹی کانفرنس منعقد کرنا طے پایا اور سخت خفیہ حالت میں کل روس کانفرنس ہوئی۔ اس کی تجویز پر کانفرنس نے اعلان کیا وہ پارٹی کا اعلیٰ ادارہ ہے جس کا مقصد مرکزی ادارے قائم کرنا اور پارٹی کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔

پراگ کانفرنس نے بالشویکوں کی پارٹی کی تعمیر میں فیصلہ کن رول ادا کیا۔ اس کانفرنس نے ایک مرکزی کمیٹی منتخب کی جس کے سربراہ لینن تھے۔ اس کمیٹی میں جری' اور غیر قانونی کام کے آزمودہ لوگ تھے۔ زار شاہی سے نمٹنے کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت تھی۔

کانفرنس کے بعد بالشویکوں نے لینن کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ کانفرنس کی بنیادی قراردادوں کو اشتہاری پرچوں کی صورت میں چھپوا کر عوام میں تقسیم کیا گیا۔ پارٹی تنظیموں سے خفیہ رابطے شروع کیے۔

1912ء میں پیٹرسبرگ کے مزدوروں کی تحریک پر بالشویکوں کا قانونی روزنامہ ''پراودا'' جاری کیا گیا۔ دریائے نیفن کی سونے کی کانوں کے مزدوروں پر زار کے سپاہیوں کو گولی چلائے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ''پراودا'' منظرِ عام پر آ گیا۔ لینن ابھی تک جلاوطن تھا۔ وہ روس سے قریب رہنے کے لیے پیرس سے پولینڈ کے شہر اکوف آ گیا۔ یہاں سے روس کی پارٹی تنظیموں سے خط و کتابت کرنا اور براہِ راست روابط قائم کرنا زیادہ آسان ہو گیا۔ ''پراودا'' کی رہنمائی بھی اس کی ذمے داریوں میں شامل تھی۔

''پراودا'' مزدوروں کے جمع کردہ وسائل سے شائع ہو رہا تھا اس لیے ہر مزدور اسے اپنا سمجھ کر باقاعدگی سے خرید رہا تھا۔ لینن کے مضامین تقریباً روزانہ ہی شائع ہوتے تھے اور مزدوروں کی تربیت میں اہم رول ادا کر رہے تھے۔

چپکے چپکے عوام کی سیاسی تربیت ہو رہی تھی۔ اس اخبار کے ذریعے صرف مزدور ہی نہیں عوام بھی بالشویک پارٹی کے مقاصد سے واقف ہوتے جا رہے تھے۔

1912ء میں چوتھی ریاستی دوما (پارلیمنٹ) کے انتخابات ہوئے تھے۔ لینن کا خیال تھا کہ بالشویکوں کو ان انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔ انتخابی مہم میں حصے لینے سے پارٹی کو یہ موقع ملے گا کہ عوام سے اپنا رابطہ مضبوط کر سکے۔ اگر انتخابات میں کامیابی نہیں بھی ملی تو عوام تک اپنی بات پہنچانے کا موقع مل جائے گا۔

اس کی ہدایت ملتے ہی پارٹی نے انتخابی مہم شروع کر دی۔ لینن نے اپنی پارٹی کے لیے منشور لکھ کر اشتہاری پرچوں کے ذریعے عوام میں تقسیم کرا دیا۔

اس منشور میں تین بنیادی مطالبے رکھے گئے تھے اور تینوں مطالبات کو اس نے ''تین بنیادی ستون'' کا نام دیا تھا۔

1۔ ملک کو جمہوری ری پبلک کا درجہ دیا جائے۔

2۔ مزدوروں کے لیے کام کے اوقات آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوں۔

3۔ زمینداروں کی ساری زمین کی ضبطی۔

اس مہم میں مزدوروں کے روزنامے ''پراودا'' نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اس کی رہنمائی میں نکلنے والے اس اخبار نے مزدوروں میں ایسا جوش و خروش پیدا کر دیا کہ عوام کی فتح صاف نظر آنے لگی۔

انتخابات کے نتائج سامنے آئے تو نتیجہ توقع سے بڑھ کر نکلا۔ تمام صنعتی صوبوں میں جہاں روس کے اسّی فیصد مزدور رہتے تھے' بالشویک نمائندے منتخب ہو گئے۔

یہ تمام انتخابی مہم لینن کے بل بوتے پر چلائی گئی تھی۔ بالشویک ممبروں کے لیے اس نے نہ صرف تقریریں لکھیں بلکہ ان کو سکھایا بھی کہ کس لفظ میں کس طرح اثر پیدا کیا جائے گا۔ کس سوال کا انہیں کیا جواب دینا ہے۔ شائع ہونے والے پوسٹروں اور اشتہاروں کی عبارت تک اسی کے قلم کے مرہونِ منت ہوتی تھی۔

اس کا اصل کام اس وقت شروع ہوا جب بالشویکوں کو دوما میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ اس نے فتح کے فوراً بعد تمام ڈیموکریٹ ممبروں کو ہدایت کی وہ دوما کے پلیٹ فارم کو پارٹی پروپیگنڈے کے لیے استعمال کریں۔ اپنی پہلی ہی تقریر میں واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیں کہ روسی سوشل ڈیموکریسی

عظیم بین الاقوامی فوج کا ایک دستہ ہے۔ وہ وقت قریب آرہا ہے جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کردیا جائے گا۔ جب لاکھوں کی تعداد میں مزدور سوشلسٹ سماج قائم کردیں گے۔ جس میں غربت عام نہ ہوگی اور ایک آدمی دوسرے کا استحصال نہیں کرے گا۔

بالشویک ممبران نے اس کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا۔ انہوں نے ایک سے زائد مرتبہ حکومت کو باور کرایا کہ مزدور طبقہ طاقتور اور زبردست ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب پھر انقلاب برپا ہوگا جو تمام وزرا اور حکومت کو صاف کردے گا۔

ان مزدور ممبروں نے اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فیکٹریوں اور کارخانوں میں تقریریں شروع کردیں۔ اگر کہیں ہڑتال ہوتی تو وہ ہڑتالیوں کی مدد کرتے۔ غرض ہر طرح سے مزدور پارٹی کا جھنڈا بلند رکھا۔

لینن کی بیوی کروپسکایا کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ وہ کتنے ارمانوں سے اسے بیاہ کر لایا تھا لیکن پارٹی کے کاموں میں ایسا پھنسا کہ وہ اس کی صحت کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔

''مجھے معاف کردو کروپسکایا۔ میں خود بھی مصروف رہا' تمہیں بھی آرام کا موقع نہ دے سکا۔''

''تو کیا ہوا۔'' کروپسکایا نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا ''مجھ سے زیادہ مزدور عورتوں کی صحت خراب ہے۔ مجھے کم از کم یہ خوشی تو ہے کہ میرا مالک مہربان ہے۔'' کروپسکایا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس مہربان مالک کی ایک بات بھی مان لو۔''

''آپ کی باتیں تو پوری دنیا سن رہی ہے۔''

''میری بات غور سے سنو اور مذاق چھوڑو۔'' لینن نے کہا۔

''ہم کچھ دنوں کے لیے پہاڑوں پر چلتے ہیں۔ تمہاری صحت کے لیے بہت اچھا ہوگا۔''

''ابھی ہمیں اپنے مشن میں کامیابی نہیں ہوئی ہے سیر وتفریح کے لیے بہت دن پڑے ہیں۔''

''پارٹی کا کام میں وہاں رہ کر بھی کرسکتا ہوں۔ ہم ہمیشہ کے لیے نہیں جارہے ہیں۔''

بہت ضد کرنے کے بعد کروپسکایا تیار ہوگئی۔ لینن اسے لے کر ایک پہاڑ پر چلا گیا۔ وہ ایک ایسے مکان میں ٹھہرا جو بلندی پر واقع تھا۔ وہاں سے نظر آنے والا منظر بڑا خوبصورت تھا۔ کروپسکایا یہاں آکر بہت خوش ہوئی۔ وہ دونوں اس پُر فضا مقام پر گھومتے رہتے یا پھر مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر اس منظر سے لطف اندوز ہوتے۔

لینن کو یقین تھا کہ یہاں کی آب وہوا کا کروپسکایا کی صحت پر بہت اچھا اثر پڑے گا لیکن اس کی صحت برابر گرتی جارہی تھی۔ وہ سخت تشویش کے عالم میں اسے لے کر سوئزرلینڈ آگیا۔

دنیا کے دروازے پر پہلی عالمی جنگ دستک دے رہی تھی۔ روس اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جاگیرداروں نے قومی عداوت کی آگ پھیلانی شروع کردی تھی تاکہ مزدور طبقے میں پھوٹ پڑجائے۔ زار کی حکومت نے قومی آزادی سلب کرلی۔ تمام تنظیموں پر غیر اعلانیہ پابندی لگ گئی۔

لینن نے سوئزرلینڈ کو جلسہ گاہ بنالیا۔ وہ ایک ایک شہر میں گیا اور قومی مسئلے پر تقریریں کرکے بالشویک پروگرام اور اپنی قومی پالیسی کی وضاحت کرتا پھرا۔ اس نے بتایا کہ وہ قوموں کی مکمل مساوات کے حق میں ہے۔ تمام قوموں کو حقِ خود اختیاری دلانے کے حق میں ہے اور تمام قومیتوں کے مزدوروں کا مستحکم اتحاد چاہتا ہے۔

''صرف بالشویک پارٹی ہی تمام مظلوم قوموں کے حقوق اور مفادات کی اصل محافظ ہے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد میں قوموں کا اتحاد ناقابلِ تسخیر طاقت بن جاتا ہے۔''

اس کی ان کوششوں نے جاگیرداروں کے حربے ناکام بنادیے۔ انقلابی تحریک وسیع پیمانے پر پھیلتی جارہی تھی۔ ہڑتالیں روزمرہ کا معمول بن گئی تھیں۔

بالشویکوں نے غم وغصے کی اس لہر سے فائدہ اٹھانے کے لیے تجاویز جمع کرنے کی خاطر پارٹی کانگریس بلانے کی تیاریاں شروع کردیں لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔ عالمی جنگ نے حالات کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا۔

1914ء کی گرمیوں میں عالمی جنگ چھڑ گئی۔ ایک طرف جرمنی، آسٹریلیا اور ہنگری تھے تو دوسری طرف برطانیہ' فرانس۔ اور روس' امریکا' جاپان اور دوسری ریاستیں تماشا دیکھ رہی تھیں' بعد میں وہ بھی اس جنگ میں کود پڑیں۔

لینن سوئزرلینڈ سے واپس پہاڑی مقام پورونین چلا گیا کیونکہ کروپسکایا کی صحت ابھی تک سنبھلی نہیں تھی۔ وہ ابھی جنگ کے اونٹ کو کسی کروٹ بیٹھتے دیکھنے کا منتظر تھا کہ حکومت آسٹریا کے سپاہی ایک رات اس کے گھر میں داخل ہوگئے۔ اس پر الزام تھا کہ وہ زار کی حکومت کے لیے جاسوسی کرتا رہا ہے۔ اس کے انکار پر ان سپاہیوں کی تشفی نہ ہوسکی۔ انہوں نے

مکان کی تلاشی پر اصرار کیا۔ لینن نے انہیں بہ خوشی اجازت دے دی۔

''خوب اچھی طرح تلاشی لے لیجئے۔ یہاں آپ کے مطلب کی کوئی چیز نہیں ملے گی۔ میں زار کا بدترین دشمن ہوں اور آپ کہتے ہیں میں اس کے لیے جاسوسی کر رہا ہوں۔''

''کسی جاسوس نے اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالے ہیں جو تم مان لوگے؟'' پولیس والوں نے کہا اور تلاشی شروع کر دی۔

تلاشی کے دوران پولیس کو وہ مسوّدے ملے جو لینن نے زرعی مسئلے پر لکھے تھے۔ ان مسوّدوں میں اعداد و شمار لکھے ہوئے تھے۔ پولیس نے ان مسوّدوں کو خفیہ رسم الخط میں لکھی ہوئی دستاویزیں سمجھا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ یہ شخص ضرور جاسوسی کرتا ہے۔ اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ لینن کی جان کو سخت خطرہ پیش آگیا۔ اس الزام میں اسے گولی بھی ماری جاسکتی تھی۔ کروپسکایا نے اس وقت نہایت جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے فوراً پولینڈ اور آسٹریا کے ترقی پسند سماجی کارکنوں سے رابطہ کیا۔ سماجی کارکنوں نے لینن کی حمایت کی' بڑے پیمانے پر احتجاج کیا اور ثابت کر دیا کہ یہ الزام غلط ہے۔ بالآخر دو ہفتے جیل میں رہنے کے بعد اسے رہائی نصیب ہوگئی۔

جیل سے نکلنے کے بعد اس نے زار شاہی اور سامراجی جنگ کے خلاف اپنی جدوجہد کو مزید تیز کر دیا۔ لیکن آسٹریا جیسے ملک میں، جو جنگ میں بھی شریک تھا' یہ کام انتہائی مشکل ہوگیا تھا اس لیے اس نے سوئزرلینڈ جانے کی اجازت طلب کرلی جو اسے مل بھی گئی۔

سوئزرلینڈ پہنچتے ہی لینن کی زوردار اپیل گونجی:

''اے محنت کش بھائیو! دوسرے ملکوں کے کرائے کے غلاموں کے خلاف اسلحہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو رجعت پرست حکومتوں کے خلاف استعمال کرنا چاہیے۔''

اس کی دوسری اپیل بلند ہوئی!

''سامراجی جنگ کو خانہ جنگی میں بدل دو۔ اپنے اپنے ملک کے سرمایہ داروں کے خلاف مزدور طبقے اور محنت کش عوام کی جنگ میں۔''

لینن کے یہ الفاظ بالشویک پارٹی کا اہم نعرہ بن گیا۔ انہوں نے تمام دنیا کے مزدوروں کو وضاحت کے ساتھ بتایا ''تمام ترقی یافتہ ملکوں میں جنگ نے سوشلسٹ انقلاب کا سوال درپیش کر دیا ہے۔ سوشلسٹوں اور باشعور مزدوروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک طرف جنگ جو قوم پرستی کے خلاف کاری ضرب لگائیں تو دوسری طرف طبقاتی اتحاد، اپنے سوشلسٹ عقائد اور بین الاقوامیت پر ڈٹے رہیں۔ محنت کش عوام کو چاہیے کہ وہ خانہ جنگی کے لیے منظم اور تیار ہوں۔''

لینن نے نعرہ دیا ''جنگ میں اپنی حکومت کی شکست'' یعنی محاذ پر شکست حکمرانوں کی طاقت کو کمزور کر دے گی اور عوام کی فتح کو آسان بنا دے گی۔

یہ وہ نعرے تھے جنہوں نے بالشویکوں کی پارٹی کے بنیادی طریقہ کار کو متعین کیا۔ لینن نے روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا منشور ''جنگ اور روسی سوشل ڈیموکریسی'' لکھا اور اس کا ترجمہ غیر ملکی زبانوں میں کرا کے اس کی نقلیں مختلف ممالک کے اخباروں کو بھیجیں۔

لینن کی رہنمائی میں بالشویکوں کی پارٹی نے جنگ کے خلاف فیصلہ کن جدوجہد شروع کر دی۔ انقلابی سرگرمیاں بڑھانے اور متحد ہو کر زار شاہی کے خلاف جدوجہد کے نعروں نے زار شاہی کو بوکھلا دیا۔ وہ باہر کے دشمنوں سے نبرد آزما تھے کہ اندرونی طاقتوں نے ان کا محاصرہ کرلیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ پوری طاقت سے مزدور تحریک کا خاتمہ کر دے۔

زار شاہی نے ریاستی دوما کے تمام بالشویک ممبروں کو سائبیریا کی طرف دھکیل دیا۔

روسی مظالم کے سامنے مزدور تنظیمیں بے بس ہو کر رہ گئیں۔ لینن جانتا تھا کہ وہ سخت مشکل میں گھر گیا ہے۔ مزدوروں کی بے دریغ قربانیاں بھی زار شاہی کے مظالم کا سامنا نہیں کر سکتیں۔ پھر بھی اس نے نہایت استقلال کے ساتھ مغربی یورپ کی پارٹیوں میں بین الاقوامیت کے حامیوں کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ''ہنگاریہ' ہالینڈ' سویڈن' ناروے اور دوسرے ملکوں کے سوشلسٹوں سے خط و کتابت کا آغاز کیا۔

''آپ لوگ موقع پرستوں اور جنگ کی حمایت کرنے والوں سے قطع تعلق کرلیں اور دوسری انٹرنیشنل کی جگہ جو منتشر ہوگئی ہے، تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل قائم کریں۔

اس زبردست کام کی تکمیل کے لیے غیر معمولی طاقت اور استقامت کی ضرورت تھی جبکہ اس کے ذاتی حالات بار بار اس کے قدموں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتے تھے۔ زمانہ جنگ کی مہنگائی نے اسے اور اس کے خاندان کو نڈھال کر دیا تھا۔ اس کے خاندان کی گزر بسر کے لیے بنیادی ذریعہ اس کی تحریریں تھیں لیکن اب سیاسی اور جنگ کے خلاف مضامین شائع کرانا مشکل ہوگیا تھا۔ کتابوں کو معاوضوں پر شائع کرانا تقریباً

ناممکن تھا۔ گرانی کا عفریت سامنے کھڑا تھا اور زندہ رہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک تنگ گلی کے پرانے تاریک سے مکان میں رہ رہا تھا، لیکن کم از کم اس کا کرایہ تو ادا کرنا ہی تھا۔ ان دقتوں کے باوجود وہ جنگ کی مخالفت کرتا رہا اور سوشلسٹ نظریات کا دفاع کرتا رہا۔ وہ اس نئے سماج کی تصویریں دکھاتا رہا جو سوشلسٹ نظام آنے کے بعد ظہور میں آئے گا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سماج ضرور تعمیر ہوگا کیونکہ سامراجی طاقتیں انسانیت کو سوشلسٹ انقلاب کی طرف دھکیل رہی ہیں۔

☆☆☆

جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا تو اس سے پیدا ہونے والے نتائج نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ انسانی جانوں کی قربانی نے دنیا کی آنکھیں کھول دیں۔ دولت پانی کی طرح خرچ ہو رہی تھی۔ اخراجات کا تمام بوجھ مزدوروں اور کسانوں پر آپڑا۔

ان حالات میں رائے عامہ کا جنگ کے خلاف ہو جانا فطری تھا۔ انقلابی تحریکوں میں جان پڑ گئی۔ ہڑتالوں' مظاہروں اور احتجاجوں میں تیزی آگئی۔ اس جدوجہد میں روس کے انقلابی مزدور سب سے آگے تھے جن کی رہنمائی لینن کر رہا تھا۔ جنگی محاذوں پر پسپائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ظاہر ہوگیا کہ زار شاہی فرسودہ ہو چکی ہے اور ملک کا انتظام کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ آبادی کے تمام حصوں میں زار شاہی کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ لینن کا کہا سچ نظر آنے لگا۔ اس نے پیش گوئی کی تھی کہ روس میں انقلاب قریب آرہا ہے اور وہ وقت واقعی قریب آگیا تھا۔

سب سے پہلے پیٹرسبرگ کے مزدوروں نے بغاوت کی۔ 9 جنوری 1917ء کو زبردست مظاہرہ ہوا۔ مزدوروں نے جنگ کے خلاف نعرے لگائے۔ پھر اسی طرح کے مظاہرے ماسکو اور دوسرے شہروں میں بھی ہوئے۔ اگلے ہی مہینے میں دو لاکھ سے زیادہ مرد اور عورتوں نے ایک عام سیاسی ہڑتال منظم کی۔ یہ ہڑتال بڑھ کر ایک زبردست سیاسی مظاہرہ بن گئی۔

زار شاہی کو گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ مظاہرہ حکومت کا تختہ الٹنے کا بہانہ بن جائے گا۔ شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ فیکٹریاں اور کارخانے بند تھے۔ ایسی ہڑتالیں پہلے بھی ہو چکی تھیں لیکن دوسرے دن پھر کام شروع ہو جاتا تھا۔ یہی تحریر اس دن کی پیشانی پر بھی لکھی ہوئی تھی لیکن اچانک ہڑتال کے سناٹے میں مظاہرین کی آواز گونجی۔

''مطلق العنانی مردہ باد۔''

''جنگ مردہ باد۔''

''روٹی!''

ان نعروں کے ساتھ غصے میں بپھرے' جوش میں بھرے مزدور دارالحکومت کی سڑکوں پر آگئے۔ یہ مظاہرے دوسرے دن بھی جاری رہے۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ایک اپیل شائع کی۔

''مطلق العنانی کا تختہ الٹ دو۔ عارضی انقلابی حکومت بناؤ' جمہوری ری پبلک قائم کرو۔ آٹھ گھنٹے کام کا دن رائج کرو۔ جاگیرداروں کی زمینیں ضبط ہوں اور جنگ بندی کی جائے۔''

زار کی حکومت نے پرانا حربہ استعمال کیا کہ طاقت کے استعمال سے ان مظاہروں کو دبا دیا جائے۔ لیکن اب یہ اس کی طاقت سے باہر تھا۔ سرکاری اہلکار اور سپاہی' مزدوروں کے ساتھ مل گئے۔ اب ان کی بندوقوں کا رخ اہل اقتدار کی طرف ہوگیا۔ پیٹرسبرگ میں ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ سرکاری عمارتوں کو نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ پیٹرسبرگ کے مزدوروں اور سپاہیوں کی انقلابی پیش قدمی کی پیروی ماسکو اور دوسرے شہروں میں بھی کی گئی۔ انہوں نے زار شاہی کے حاکموں کو نکال باہر کیا اور شاہی نظام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

حقیقی انقلابی مارکسی پارٹی کی قیادت میں مزدوروں اور کسانوں کی فتح ہوئی۔ مطلق العنانی کا تختہ الٹ گیا۔ روس کی قوموں پر صدیوں سے محیط جبر و تشدد کا بادل پارہ پارہ ہو کر بکھر گیا۔

انقلاب رونما ہوتے ہی بالشویک پارٹی نے روپوشی ختم کی اور منظر عام پر آگئی۔ بکھرے ہوئے نکتوں کو جمع کرنا شروع کر دیا۔ جو لوگ جلاوطن تھے وہ بھی واپس آگئے اور اقتدار کے حصول کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

منشویک طبقہ' جس کا بالشویکوں سے نظریاتی اختلاف تھا' سرگرم ہوگیا۔ منشویکوں کا جھکاؤ زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرف تھا لہٰذا انہوں نے مزدوروں کے مفاد کو بالائے طاق رکھ کر جاگیرداروں کو عارضی حکومت بنانے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس طرح دہرا اقتدار قائم ہوگیا۔ عارضی حکومت کا اقتدار اور مزدوروں' کسانوں کی جمہوری ڈکٹیٹری۔ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ مطلق العنانی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوگیا۔ تقریر' تحریر' تنظیم اور اجتماع وغیرہ کی آزادی حاصل ہوگئی۔

اس نئی صورتِ حال میں مزدوروں اور سپاہیوں نے یہ عزم کرلیا کہ وہ ان مطالبات کو عملی جامہ پہنائیں گے جن کا انہوں نے دورانِ انقلاب عوام سے وعدہ کیا ہے۔ اس مقصد

کے لیے مزدوروں نے اپنا اخبار ''پراودا'' پھر سے جاری کردیا۔

لینن ابھی تک سوئٹزرلینڈ میں تھا اور انقلابی واقعات کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے ''دور دراز سے خطوط'' کے عنوان سے بالشویکوں کو خطوط تحریر کیے۔ ان خطوط میں اس نے ایسے سوالوں کے تفصیلی جوابات دیے جو انقلاب کے بعد پارٹی کے سامنے تھے۔

''ابھی انقلاب کی پہلی منزل طے ہوئی ہے جس میں اقتدار جاگیرداروں کے ہاتھوں میں آ گیا ہے۔ بے شک! یہ ایک عارضی حکومت ہے لیکن اس عارضی حکومت پر ہرگز بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ اس حکومت کو مضبوط ہونے کا موقع نہ دیا جائے اور پوری قوت سے اس کے لیے جدوجہد کی جائے تاکہ سارا اقتدار سوویتوں کو منتقل ہوجائے۔ رجعت پرست طاقتوں کو دبایا جائے اور سوشلسٹ انقلاب کی تیاری کی جائے۔''

''کل آپ نے زارشاہی کا تختہ الٹ کر بہادری کا معجزہ دکھایا ہے۔ آپ کو قطعی طور پر مستقبل قریب میں بہت جلد یا ذرا دیر سے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا تختہ الٹنے کے لیے یہی معجزہ دکھانا ہوگا۔''

''عوام کے درمیان وسیع پیمانے پر اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کا کام کیا جائے اور ان کے سامنے یہ ثابت کیا جائے کہ صرف محنت کشوں کا اقتدار ہی جنگ کو ختم کر کے حقیقی جمہوری امن قائم ہوسکتا ہے۔''

ان عبارتوں پر مشتمل لینن کے خطوط مسلسل آ رہے تھے۔ ان خطوط کی روشنی میں بالشویکوں نے اپنی جدوجہد کو آگے بڑھایا لیکن وہ اپنے اقتدار سے زیادہ اس پر زور دیتے رہے کہ عارضی حکومت کی سرگرمیوں پر عوامی کنٹرول رکھا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح انہیں مظاہروں' احتجاج اور اعلانات منظم کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس سے عوام کو یہ تاثر ملا کہ عارضی حکومت عوام کو امن اور روٹی فراہم کرسکتی ہے۔

بالشویکوں کو اب احساس ہوا کہ انہوں نے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا۔ لینن کے لیے اب ضروری ہوگیا تھا کہ وہ وطن واپس جا کر بالشویکوں کی رہنمائی کرے۔

عارضی حکومت کے نمائندے یہ کب گوارا کرسکتے تھے کہ لینن روس واپس آ کر پارٹی کمان اپنے ہاتھوں میں لے لے۔ انہوں نے دوسرے ملکوں میں ''سیاہ فہرستیں'' بھیج دیں جن میں لینن اور دوسرے بہت سے بالشویکوں کے نام تھے' ان پر روس میں داخلہ بند کردیا گیا تھا۔

لینن کے اضطراب میں اضافہ ہوگیا۔ قانون کا ہر دروازہ کھٹ کھٹا کر دیکھ لیا اور پھر بالآخر غیر قانونی راستہ اختیار کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ کچھ تارکینِ وطن کے جتھے میں شامل ہو کر روس پہنچ گیا۔

پارٹی کے مزدوروں کو اطلاع ہوگئی تھی کہ ان تارکین وطن میں لینن بھی شامل ہے۔ اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہزاروں مزدور' لال جھنڈے اٹھا کر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ سپاہیوں کے دستے نے اسے گارڈ آف آنر پیش کیا۔ تالیوں کے طوفان میں اسے ایک بکتر بند گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ اس نے تقریر کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اسی اپیل کو دُہرایا کہ نئے سوشلسٹ انقلاب میں مزدوروں کے اقتدار کے لیے جدوجہد کی جائے۔

وہ دس سال کی طویل جلاوطنی کے بعد وطن واپس آیا تھا۔ اس کی بیوی کروپسکایا اس کے ساتھ تھی جو اب کمزور ہوگئی تھی۔ جلاوطنی کی سختیوں نے اسے نڈھال کردیا تھا لیکن وہ خوش تھی کہ دوبارہ اپنوں میں آ گئی ہے اور ایسے وقت کہ منزل بہت قریب ہوگئی ہے۔

لینن پیٹرسبرگ آتے ہی انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ وہ پہلے زارشاہی سے نبرد آزما تھا' اب سرمایہ داروں سے مصروفِ جنگ تھا۔ اس نے نیا پروگرام دینے کے لیے بالشویکوں کے جلسے منعقد کیے اور پرولتاریوں (مزدوروں) کے فریضوں کے بارے میں اپنے خیالات پیش کیے جو ''اپریل کے مقالات'' سے موسوم ہوئے۔ اس نے نئے تاریخی حالات میں پارٹی کی صحیح لائن متعین کرنے میں فیصلہ کن رول ادا کرنا تھا۔ یہ مقالے اسی ضرورت کو پورا کررہے تھے۔

لینن نے ان مقالوں میں وضاحت کی کہ عارضی حکومت سرمایہ داروں کے مفادات کی حفاظت کررہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ صرف مزدوروں کا اقتدار ہی لوگوں کو امن' کسانوں کو زمین اور بھوکوں کو روٹی دے سکتا ہے۔ ابھی حکومت کا تختہ الٹنے کی منزل دور ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اکثریت کی حمایت حاصل کی جائے اور انہیں بالشویک بنایا جائے۔ ان حالات میں ممکن ہے اقتدار پُرامن طریقے سے مزدور اور غریب کسانوں کے مستحکم اتحاد پر قائم رہے۔

لینن نے معاشی شعبے میں بھی پارٹی کے فریضوں کا تعین کیا۔ جاگیرداروں کی جائدادیں بلامعاوضہ ضبط کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ تمام فیکٹریوں' کارخانوں میں تیار ہونے والی اشیا کی تقسیم پر مزدوروں کا کنٹرول قائم کرنا چاہیے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ملک کے تمام بینکوں کو

واحد قومی بینک میں ضم کرلیا جائے۔

یہ تجویز بھی پیش کی کہ پارٹی کا نام بدل کر کمیونسٹ پارٹی رکھا جائے۔ پارٹی کے پروگرام پر نظرِ ثانی کی جائے جس میں سے اس وقت تک بہت کچھ پورا کیا جاچکا ہے۔ پارٹی کی کانگریس بلائی جائے۔

ان مقالوں کے ذریعے اس نے پارٹی ممبروں کو ایک واضح پروگرام دے دیا۔ اس پروگرام کی رہنمائی میں بالشویکوں نے مزدوروں' سپاہیوں اور کسانوں میں پارٹی پالیسی کی وضاحت اور عوام کی سیاسی تربیت و تنظیم کی جدوجہد شروع کردی۔ لینن اس تمام جدوجہد کی رہنمائی کررہا تھا۔ مجمعوں اور جلوسوں میں تقریریں کر کے مزدوروں میں جوش و جذبے کی نئی لہر پیدا کررہا تھا۔

اسے پوتیلوف کارخانے میں تقریر کرنے کے لیے پہنچنا تھا۔ اس کا استقبال کرنے کے لیے پلیٹ فارم پر پہنچنے والے مزدور ابھی واپس بھی نہیں آئے تھے کہ کارخانے میں خبر پھیل گئی ''لینن آ گئے۔''

کارخانے کے سامنے والا میدان دیکھتے ہی دیکھتے بھر گیا۔ پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع میدان کی زینت بنا ہوا تھا۔ میدان بھر گیا تو لوگ کارخانے کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ لینن نے تقریر شروع کیا۔ لوگ اس کے ایک ایک لفظ کو اس توجہ سے سن رہے تھے جیسے انہیں ڈر ہو کہ کہیں کوئی لفظ چھوٹ نہ جائے۔

اس وقت تک جنگ جاری تھی۔ کارخانوں میں ایندھن نہیں تھا اور کھانے پینے کے سامان کی کمی تھی۔ مزدوروں کے بہت سے مسائل تھے جن کے وہ جواب سننے کے مشتاق تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سوال کریں گے اور لینن سے ان کے جواب جانیں گے لیکن انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ لینن کو ان کے ہر مسئلے سے واقفیت تھی۔ وہ بغیر سوال کیے ہر مسئلے کا جواب دے رہا تھا۔

تقریر ختم ہوئی تو ہر مزدور کو اس کے سوال کا جواب مل چکا تھا اور اس خوبی سے کہ ایک ایک لفظ محنت کشوں کے دلوں کی گہرائیوں تک اتر چکا تھا اور یہ الفاظ ان میں نئی روح پھونک رہے تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو یہ مزدور لینن کے الفاظ کے ہتھیاروں سے لیس ہوچکے تھے۔ ہر شخص جدوجہد کی خواہش سے بے تاب تھا۔

کسانوں کے نمائندوں کی پہلی کُل روس کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے لینن نے اپیل کی کہ جاگیرداروں کی زمینیں فوراً ضبط کی جائیں اور زرعی زمینیں کسانوں میں تقسیم کی جائیں۔

اس اعلان کے بعد کسان اور مزدور لینن کے خیالات کی طرف کھنچنے لگے اور بالشویکوں کی طرف آنے لگے۔ وہ ایسے ہزاروں خطوط روزانہ وصول کرتا تھا جن میں اس سے وفاداری کا اظہار کیا جاتا تھا۔

''کامریڈ اور دوست لینن! یقین کرو کہ ہم سب ایک ہو کر تمہارے پیچھے ہر جگہ جانے کو تیار ہیں۔ تمہارے خیالات کسانوں اور مزدوروں کی مرضی کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔''

عبوری حکومت' بالشویکوں کی سرگرمیوں کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر لینن اسی طرح رائے عامہ کو ہموار کرتا رہا تو سرمایہ داروں کا اقتدار بھی اسی طرح ختم ہوجائے گا جس طرح زارشاہی کی جڑیں اکھڑ گئیں۔

عالمی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ عبوری حکومت' سپاہیوں کی کثیر تعداد میدانِ جنگ میں جھونکتی رہی۔ جو مزدور جنگی محاذوں پر اپنا خون بہا رہے تھے' ان کے خاندان سخت مصیبت میں مبتلا تھے۔ حکومت انہیں فراموش کرچکی تھی لہٰذا عارضی حکومت کی پالیسیوں کے خلاف غم و غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ یہ نفرت اتنی بڑھی کہ مزدور اور سپاہی پیٹرسبرگ کی سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ اقتدار مزدوروں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔

عارضی حکومت نے اس پُرامن مظاہرے کے لیے طاقت استعمال کی۔ پیٹرسبرگ کی سڑکیں خون سے رنگین ہوگئیں۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ دو دن کی مسلسل جھڑپوں کے بعد حکومت حاوی ہوگئی۔ رات کی تاریکی میں ''پراودا'' کے دفتر پر چھاپا مارا گیا۔ مخبری یہ تھی کہ لینن وہاں موجود ہے لیکن اتفاق سے وہ آدھا گھنٹا پہلے ہی وہاں سے نکلا تھا اس لیے گرفتاری سے بچ گیا۔

وہ بچ گیا لیکن وہاں موجود تمام لوگ گرفتار کرلیے گئے ''پراودا'' کے دفتر پر تالا پڑ گیا۔ بالشویک ایک مرتبہ پھر روپوش ہونے پر مجبور ہوگئے۔ عارضی حکومت مستقل حکومت میں تبدیل ہوگئی۔ بالشویکوں کا اقتدار بالکل ہی ختم ہوگیا۔

عارضی حکومت سرگرمی سے لینن کو تلاش کررہی تھی۔ اس نے لینن کو قانون کا بھگوڑا قرار دیا۔ اس کو پکڑنے یا قتل کردینے کے نہ صرف احکامات جاری کردیے بلکہ اس شخص کو بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا جو لینن کو حکومتِ وقت کے سپرد کردے۔

لینن کے جاں نثار اسے پوشیدہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ

پیٹرسبرگ ہی میں ایک مزدور کے گھر چھپا ہوا تھا۔ چند بالشویکوں کو اس کی موجودگی کا علم تھا جو اس سے برابر ہدایات لے رہے تھے۔

پیٹرسبرگ میں ہر طرف جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ہر وقت گرفتاری کا خطرہ تھا اور جب گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان ہوا تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ گیا۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ لینن کو پیٹرسبرگ سے ہٹا دیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد ایک مزدور ایمیلیانوف اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ پیٹرسبرگ کے قریب رازلیف جھیل کے کنارے ایک جھونپڑی پہلے ہی تیار کرلی گئی تھی۔ یہاں اسے فن لینڈ کا گھاس کاٹنے والا بن کر رہنا تھا۔ اسے درانتی، کلہاڑی اور وہ ساری چیزیں دے دی گئیں جو گھسیاروں کے پاس ہوتی ہیں۔ اس کی بیوی کروپسکایا زیادہ تر جھونپڑی کے اندر ہی رہتی تھی۔

لینن نے گھسیارے کا روپ دھار کے واقعی جھاڑیوں کو کاٹنا شروع کردیا تاکہ اسے درانتی چلانے کی مشق ہوجائے۔ کوئی اجنبی اگر اس طرف آنکلے تو وہ اس کے سامنے چابک دستی سے درانتی چلائے۔ جھونپڑی کے قریب ہی اس نے جھاڑیوں کو کاٹ کر چھوٹا سا قطعہ صاف کرلیا۔ اسی حصے میں اس نے لکڑی کے تختے رکھ کر میز، کرسی بنالی۔ یہ اس کی مطالعہ گاہ تھی۔ یہیں بیٹھ کر وہ خطوط لکھتا، مضامین رقم کرتا حتیٰ کہ اسی مطالعہ گاہ میں اس نے اپنی کتاب ''ریاست اور انقلاب'' مرتب کی۔ کچھ قابلِ اعتبار رہنما اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے جن سے وہ واقعات معلوم کرتا اور انہیں ہدایات جاری کرتا۔ اسے یقین تھا کہ مزدور طبقے کی فتح قریب ہے۔ جلد ہی اقتدار بالشویکوں کے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ وہ پورے عزم کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھا۔

اپنی کتاب ''ریاست اور انقلاب'' میں اس نے لکھا کہ چاہے جیسی بھی سرمایہ دار حکومت ہو۔ ظاہر طور پر اس میں چاہے جس قسم کی جمہوریت ہو لیکن عملی طور پر وہ ڈکٹیٹرشپ ہی ہوتی ہے۔ ایسی حکومت کا تختہ الٹ کر پرولتاریہ (مزدور) کو اپنی حکومت قائم کرنی چاہیے۔ ایسی حکومت واقعی جمہوری ہوتی ہے کیونکہ وہ عوام کی بڑی اکثریت کے مفادات کا اظہار کرتی ہے۔

''پرولتاریہ کو ضرورت ہے اقتدار کی، طاقت کی مرکوز تنظیم کی، تشدد کرنے والے تنظیم کی، استحصال کرنے والوں کی مزاحمت کو کچلنے کے لیے اور سوشلسٹ معیشت کے انتظام کے کام میں آبادی کی کثیر تعداد، کسانوں وغیرہ کی رہنمائی کے لیے۔''

مارکس اور اینگلس کے خیالات کو فروغ دیتے ہوئے اس نے لکھا کہ سوشلزم ناگزیر طور پر بڑھ کر کمیونزم بن جائے گا۔ اس کتاب میں اس نے کمیونسٹ پارٹی کے رول کے بارے میں بھی اہم خیالات کا اظہار کیا۔ اس کی اس کتاب نے مزدور طبقے کو اس بات کی سوجھ بوجھ دی کہ مزدوروں اور کسانوں کی ریاست کو کیسا ہونا چاہیے؟

پارٹی کے تمام بڑے بڑے نام روپوش تھے لیکن اس کے باوجود پارٹی کی چھٹی کانگریس پیٹرسبرگ میں خفیہ طور پر منعقد کی گئی تاکہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔

اسی کانگریس میں سب سے پہلے یہ مسئلہ اٹھایا گیا کہ لینن کو عارضی حکومت کی عدالت میں حاضر ہونا چاہیے یا نہیں؟ کچھ مندوبین سرے سے اس بات کے حق میں نہیں تھے۔ کچھ نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر ان کی ضمانت دی جائے تو وہ عدالت کے سامنے حاضر ہوسکتے ہیں۔ بحث و تکرار کے بعد سب اس نتیجے پر پہنچے کہ عدالت انصاف نہیں کرسکتی اور یہ کہ لینن عدالت کے سامنے حاضر نہ ہوں۔

کانگریس نے پارٹی سے اپیل کی کہ پُرامن طریقے سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی اب کوئی امید نہیں لہٰذا بغاوت کے ذریعے انقلاب دشمن اقتدار کا تختہ الٹنے کی جدوجہد کی جائے۔ کانگریس کے اس فیصلے کے بعد پارٹی نے اپنے لیڈر کی رہنمائی میں مزدوروں، سپاہیوں، ملاحوں اور کسانوں میں، کارخانوں، فوج اور دیہات میں انقلاب کا پرچار شروع کردیا۔ سرخ گارڈز کے دستے قائم کیے۔ مزدوروں کو اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت دی جانے لگی۔

صورتِ حال روز بہ روز کشیدہ ہوتی جارہی تھی۔ معاشی ابتری بڑھ گئی، ایندھن کی کمی کی وجہ سے ذرائع ٹرانسپورٹ بند ہوگئے۔ شہروں میں غذائی سامان کی سپلائی رک جانے کی وجہ سے مہنگائی بڑھ گئی۔ سرمایہ داروں نے فیکٹریاں اور کارخانے بند کردیے۔ ہزاروں مزدور بے روزگار ہوگئے۔ جب بھوک اور بے روزگاری کا یہ عالم ہو تو انقلابی سرگرمیوں کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ معاشی بدحالی کے شکار مزدوروں کو اپنے پیٹ کی پڑی ہوئی تھی۔

لینن کو اس صورتِ حال کا شدت سے احساس تھا۔ وہ اپنی موجودہ کمیں گاہ میں رہ کر ان حالات سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اسے اپنی کچھار سے باہر نکلنا تھا تاکہ آزادانہ طور پر مزدوروں کی رہنمائی کرسکے۔ اس نے ریلوے انجن کے فائرمین کا روپ دھارا اور فن لینڈ چلا گیا۔ اس کا مضمون ''سرپر منڈلاتی ہوئی آفت اور اس سے لڑنے کے طریقے'' شائع ہوا۔

اس نے لکھا ''برسرِ اقتدار سرمایہ دار اور جاگیردار ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ملک کو محض سوشلزم کی تعمیر کے ذریعے بچایا جاسکتا ہے اور سوشلزم کی طرف گئے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ زمین اور بینکوں کو قومی ملکیت بنائے بغیر اور پیداوار کی تقسیم پر مزدوروں کا کنٹرول قائم کیے بغیر معیشت بحال نہیں ہوسکتی۔ موجودہ جنگ بے رحمانہ شدت کے ساتھ یہ سوال پیش کررہی ہے کہ تباہ ہوجایا جائے یا پورے زوروں کے ساتھ آگے کی طرف بڑھا جائے۔''

اس نے عوام اور پارٹی کو آگاہ کیا کہ سرمایہ دار اور جاگیردار انقلاب کے خلاف سازش کررہے ہیں اور اپیل کی کہ وہ چوکس ہوں اور ان پر کاری ضرب لگانے کے لیے تیار رہیں۔

اس کی یہ پیش گوئی اس وقت حرف بہ حرف سچ ثابت ہوگئی جب کچھ ہی دن بعد ایک روسی جنرل کورنیلوف فوج لے کر پیٹرسبرگ پر حملہ آور ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انقلاب کا گلا گھونٹ کر ڈکٹیٹر بن جائے گا۔ اس کی یہ حرکت فوجی بغاوت تھی۔ اگر اسے کامیابی ہوجاتی اور فوج ملک پر قابض ہوجاتی تو انقلاب کی ہر کوشش بندوق کی سنگینوں کے سپرد ہوجاتی۔

عوام نے اس ڈکٹیٹر کا راستہ روکا اور کمیونسٹ پارٹی نے عوام کی قیادت کی۔ فوج سے مقابلہ کیا اور اس بغاوت کو ختم کردیا۔ اب عوام بے دام غلام تھے۔ انہیں تجربے نے بتادیا کہ صرف بالشویک پارٹی ہی ان کے مفادات کی حفاظت کرسکتی ہے۔ عوام کی اکثریت بڑی تیزی سے بالشویکوں کی طرف آنے لگی۔

روسی دوما کے دوبارہ الیکشن ہوئے تو ماسکو سوویتیں بالشویکوں کے ہاتھ میں آگئیں۔ یہ حالت دیکھ کر انقلاب دشمنوں نے بالشویکوں کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع کردی۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ بالشویک' اقتدار اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے اور اگر اقتدار انہیں مل بھی گیا تو وہ اسے چلا نہیں سکتے۔

لینن فن لینڈ میں روپوشی کے دن گزار رہا تھا لیکن ملک کی صورتِ حال کے بارے میں اسے تفصیل کے ساتھ مطلع رکھا جاتا تھا۔ مارکس ازم کی گہری معلومات کی وجہ سے وہ بہت جلد واقعات کے نچوڑ کو پالیتا تھا اور پارٹی کے کام کے لیے صحیح راستہ تجویز کرلیتا تھا۔ انقلاب دشمنوں کے اس پروپیگنڈے کے بارے میں بھی اس نے ایک تفصیلی مضمون لکھ کر عوام کی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دلیلوں سے ثابت کیا کہ بالشویک اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں اور ملک کی معیشت کی سوشلسٹ بنیادوں پر تعمیرِ نو کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس مضمون کے ساتھ ہی اس نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے یہ فیصلہ کن فریضہ رکھا کہ مزدور طبقے اور غریب کسانوں کے اقتدار کے حصول کے لیے عملی تیاری کی جائے' مسلح بغاوت کی تیاری کی جائے۔

اس نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور پیٹرسبرگ اور ماسکو کی پارٹی کمیٹیوں کو دو تاریخی خط ''بالشویکوں کو اقتدار پر قبضہ کرلینا چاہیے'' اور ''مارکس ازم اور بغاوت'' بھیجے جن میں مسلح بغاوت کی فوری عملی تیاری کا حکم دیا گیا تھا۔

وہ حالات سے نتائج اخذ کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اندازہ لگالیا کہ بہترین موقع یہی ہے۔ اس نے نہ صرف بغاوت کا حکم دیا بلکہ اپنے منصوبے سے بھی آگاہ کیا۔

باغی دستوں کا ہیڈ کوارٹر فوراً منظم کیا جائے' اپنی قوت کو مختلف حصوں میں منظم طور پر تقسیم کیا جائے اور سب سے زیادہ معتبر دستوں کو اہم جگہوں پر متعین کیا جائے۔ مثلاً سرکاری عمارتوں کو گھیرے میں لینے' ٹیلی فون اور تار گھروں پر قبضہ کرنے جیسے فرائض ہر انجام دینے کے لیے اس نے سفارش کی کہ ایسے مضبوط جنگی دستے بنائے جائیں جو انقلاب دشمن فوجوں کو پیٹرسبرگ میں نہ آنے دیں اور شہر کا دفاع مناسب طور پر کرسکیں۔

مرکزی کمیٹی نے لینن کے خطوط کو عوامی پارٹی تنظیموں میں رہنمائی کے لیے بھجوایا۔ اس خط کے جواب میں پارٹی تنظیموں نے مستعدی سے مسلح بغاوت کی تیاری شروع کردی۔

اس تیاری کے نتیجے میں سرخ گارڈوں (ریڈ گارڈز) کو مضبوط بنایا گیا۔ فوجی کاموں کے کمانڈروں کے لیے کورس قائم کیے گئے۔ ملاحوں کو بغاوت کے لیے آمادہ کیا گیا۔ محاذِ جنگ کے بالشویک فوجی بالشویکوں کے وفادار تھے' مزدوروں کو مدد دینے کے لیے انہوں نے فوجی دستے ترتیب دے لیے۔

یہ سب تیاریاں مکمل ہوتے ہی لینن خفیہ طور پر پیٹرسبرگ پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے ملک بھر کی پارٹی تنظیموں کو خطوط روانہ کیے۔ ان خطوط میں زور دے کر کہا گیا تھا کہ فیصلہ کُن اقدامات کا وقت آگیا ہے' تاخیر جان لیوا ہوگی۔

1917ء میں اکتوبر کے مہینے میں مرکزی کمیٹی کی نشست ہوئی جس میں ان خطوط پر بحث کی گئی۔ لینن نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں اس نے ایک مرتبہ پھر ثابت کیا کہ وہ

وقت آگیا ہے جب مزدور اور کسانوں کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ مرکزی کمیٹی نے لینن کی تجویز کو منظور کرلیا۔

اس تجویز کے صرف چھ دن بعد ایک اور وسیع نشست ہوئی۔ لینن نے سخت ترین الفاظ میں خبردار کیا کہ اگر بغاوت کرنے میں اب دیر کی گئی تو وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔

زیادہ تر لوگوں نے لینن کی حمایت کی اور اسی نشست میں ایک جنگی انقلابی مرکز قائم کردیا گیا۔ تمام علاقوں میں باقاعدگی کے ساتھ بغاوت کی تیاری ہونے لگی۔ خفیہ الفاظ میں خفیہ ہدایات ہر جگہ بھیجی جارہی تھیں۔ مرکزی کمیٹی کے نمائندے مختلف علاقوں کے دورے کررہے تھے۔ لینن کے مضبوط اعصاب کام کررہے تھے۔ وہ آرام اور نیند کی پروا کیے بغیر پارٹی کے دستوں کو متحد کررہا تھا۔ وہ بالآخر اس نے مزدوروں' کسانوں اور سپاہیوں کو انقلاب کی واحد فوج میں متحد کرلیا۔

24 اکتوبر کی صبح کو عارضی حکومت نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ترجمان ''رابوچی پوت'' کو بند کرنے کی کوشش کی تو بغاوت کا آغاز ہوگیا۔ سرخ گارڈ والوں اور سپاہیوں کو مرکزی کمیٹی کا حکم ملا کہ اخبار کی عمارت کو اپنی حفاظت میں لے لیں۔ یہ بغاوت ہی کا اعلان تھا۔ اسمولنی انسٹی ٹیوٹ کا انتظام سرخ گارڈ والوں نے سنبھال لیا جہاں بغاوت کا صدر مقام تھا۔

پیٹرسبرگ کی سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ زارشاہی کے زمانے کے خونخوار فوجی پہرا دے رہے تھے۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ لینن نے فیصلہ کیا کہ بغاوت کے صدر مقام اسمولنی جاکر براہِ راست بغاوت کی رہنمائی کرے گا۔ گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے جان کا خطرہ مول لیا اور پیٹرسبرگ کی سنسان سڑکوں سے گزرتا ہوا اسمولنی پہنچ گیا۔

اسمولنی میں روشنیوں کا سیلاب تھا۔ کارخانوں کے نمائندے اور سرخ گارڈ والے ہدایات لینے پہنچ گئے تھے۔ لینن نے اپنے منصوبے سے انہیں آگاہ کیا۔ کارخانوں' فیکٹریوں اور محلہ کمیٹیوں کو حملہ شروع کرنے کے احکام بھیجے گئے۔

''شہر کے اندرونی حلقے کی جگہوں کی حفاظت بالٹک بیڑے کے ملاح اور انقلابی دستے کریں گے اور کارخانوں کی حفاظت سرخ گارڈوں کی ذمے داری ہوگی۔''

یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہوگیا۔ رات کے اندھیرے میں یہ دستے آگے بڑھے اور صبح ہوتے ہی لینن کی ہدایت کے مطابق' ٹیلی فون اسٹیشن' ریڈیو اسٹیشن' پلوں' ریلوے اسٹیشنوں اور دارالحکومت کے اہم اداروں پر باغی سپاہیوں اور ملاحوں کا قبضہ ہوچکا تھا۔

صبح کے دس بجے پیٹرسبرگ کی فوجی انقلابی کمیٹی نے لینن کی لکھی ہوئی اپیل روس کے شہریوں کے نام شائع کی۔ اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ عبوری حکومت کا خاتمہ کردیا گیا ہے اور اقتدار مزدوروں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔ جس مقصد کے لیے عوام لڑ رہے تھے' وہ حاصل ہوگیا ہے۔

گیارہ بجے صبح کو پیٹرسبرگ سوویت کی تاریخی نشست ہوئی۔ لینن ہال میں داخل ہوا تو شرکا نے کھڑے ہوکر تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ تالیوں کا طوفان تھما تو لینن نے اپنی نشست سنبھالی۔

''روس میں سوشلزم کامیاب و کامران ہوگا۔ اب سے روس میں تاریخ کی ایک نئی منزل شروع ہورہی ہے اور روس کے اس تیسرے انقلاب کو انجامِ کار سوشلزم کی فتح تک پہنچنا چاہیے۔''

اس نے نہایت جوشیلی تقریر کی جس میں انقلاب کی فتح اور مزدوروں کی سوویت حکومت کے فریضوں کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا۔ پوری تقریر تالیوں کی گونج میں جاری رہی۔

25 اور 26 اکتوبر کی درمیانی رات کو لینن نے سرمائل پر بلاتاخیر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس محل میں عارضی حکومت کے وزرا رہتے تھے۔

جنگی جہاز ''اورورا'' سے گولوں کی باڑھ داغی گئی جن کا رخ محل کی طرف تھا۔ یہ حملے کا سگنل تھا۔ گولوں کی گونج سنتے ہی انقلابی دستوں نے دھاوا بول دیا۔ پہرے داروں نے معمولی سی مزاحمت کی اور محل پر قبضہ ہوگیا۔ جاگیرداریت کا آخری گڑھ ڈھا دیا گیا۔

لینن کی جنگ جو اس کے تحریر کردہ مضامین سے شروع ہوئی تھی' فتح میں بدل گئی۔ اس نے ثابت کردکھایا کہ مزدور طبقہ اور غریب کسان کتنی عظیم طاقت بن سکتے ہیں۔

یہ جنگ لینن کی رہنمائی میں لڑی گئی تھی۔ بے شک! مزدور طبقہ بہت طاقتور تھا لیکن انہیں آمادۂ جنگ کرنے والا لینن تھا۔ اس نے مارکس کے نظریات کو اس طرح مزدوروں کے سامنے پیش کیا کہ وہ ان کی عملی جدوجہد کا حصہ بن گیا۔ اس کامیابی میں لینن کے فولادی عزم کا بڑا ہاتھ تھا۔ کامیابی کے بعد اسے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اسمولنی میں ایک کانگریس کا اہتمام کیا گیا۔ ملک کے ہر کونے سے مندوبین اپنے رہنما کو خراجِ تحسین پیش کرنے آئے ہوئے تھے۔ اب

کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی سے خطرہ نہیں تھا۔ اب اقتدار بالشویکوں کے ہاتھ میں تھا۔ کانگریس نے بڑے فخر کے ساتھ سارا اقتدار مزدوروں کے ہاتھ میں آجانے کا اعلان کیا۔

اس سے اگلے دن لینن کامریڈوں کے مخصوص لباس میں تقریر کرنے کے لیے آیا۔ جب وہ ڈائس پر آیا تو عجیب روح پرور منظر تھا۔ ہال میں جتنے لوگ تھے' سب کھڑے ہوگئے۔ لینن زندہ باد کے نعرے لگنے شروع ہوئے۔ وہ دیر تک اپنی تقریر شروع نہ کرسکا۔ نعرے تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ لوگ کھڑکیوں' ستونوں اور کرسیوں پر کھڑے تھے کہ کسی طرح اپنے محبوب لیڈر کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ لوگ خوشی سے اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال رہے تھے۔ سپاہی اپنی سنگینوں کو ہوا میں بلند کرکے اپنی خوشی کا اظہار کررہے تھے۔

لینن نے تقریر کا آغاز کیا۔ اس نے اپنے ابتدائی الفاظ میں دنیا کے سامنے امن کی اپیل پیش کی اور اپنی پارٹی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ جنگ میں حصہ لینے والی تمام قوموں اور حکومتوں کے نام ایک اپیل منظور کی جائے کہ وہ محاذوں پر فوراً صلح کرلیں۔

اس کے بعد اس نے زمین کے بارے میں رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ کے مطابق جاگیرداروں کی ملکیت کا ہمیشہ کے لیے اور بلا معاوضہ خاتمہ کرکے اس کو عوام کو دے دیا۔ اس فرمان کے مطابق زمین پر نجی ملکیت کی جگہ عوامی' ریاستی ملکیت نے لے لی۔ کانگریس کے نمائندوں نے طوفانی تالیوں میں اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔

دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست کا بانی لینن کانگریس سے باہر نکلا تو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ اسے احساس تھا کہ فتح حاصل کرنے سے زیادہ فتح قائم رکھنا مشکل ہے۔ دشمنوں کی مزاحمت توڑنے' شہروں کے لیے غذا کی فراہمی کا انتظام کرنے' کارخانوں اور فیکٹریوں کو چالو کرنے اور نئی سوویت ریاست کو تعمیر کرنے کی ضرورت تھی اور یہ کام آسان نہیں تھا۔

سوشلسٹ انقلاب کو صرف ایک ملک میں فتح حاصل ہوئی تھی جو معاشی لحاظ سے پسماندہ تھا۔ غریب کسان ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جنگ کا عفریت ابھی تک وسائل اور انسانی جانوں کو نگل رہا تھا۔ ان سب کے علاوہ انقلاب دشمن طاقتیں سازشوں میں مصروف تھیں۔ خود پارٹی میں ایسے لوگ تھے جو لینن سے اختلاف کرکے الگ ہوگئے تھے۔

لینن نے اسمولنی کو صدر مقام کا درجہ دیا۔ ہر فرمان اسمولنی سے جاری ہوتا تھا اور ہر فرمان کا ذہنی مرکز لینن تھا۔ وہ بادشاہ نہیں ابھی تک ایک عوامی لیڈر تھا۔ مزدور' کسان اور ملاح اس سے ملنے کے لیے دارالحکومت پہنچتے رہے۔ وہ ہر ایک سے ملتا' ان کی باتیں توجہ سے سنتا' انہیں مشورے دیتا۔ اس کی اس دلچسپی اور کام کی لگن نے نہایت مختصر مدت میں ملک میں بنیادی معاشی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ پیداوار اور تقسیم پر مزدوروں کے کنٹرول کی تجویز پر عمل شروع ہوگیا۔ مزدوروں کے منتخب شدہ نمائندوں کو اپنے اپنے اداروں کے تمام کاموں کی نگرانی کرنے اور خلل اندازی کو روکنے کا اختیار دیا گیا۔ پرانی فوج کو سبک دوش کردیا گیا اور صاحب جائداد طبقوں کے خصوصی حقوق منسوخ کرنے کے لیے فرمان جاری کیے گئے۔ ریلوے' تجارتی بحری بیڑے اور بینکوں کو عوامی ملکیت قرار دیا گیا۔ ساری بیرونی تجارت ریاست کے ہاتھ میں آگئی۔ جلد ہی بڑے بڑے سرمایہ داروں کے کارخانے ضبط کرلیے گئے۔

لینن نے محنت کشوں اور استحصال کے شکار لوگوں کے لیے ایک اعلان نامہ لکھا۔ اس میں روس کی تمام قوموں کے لیے مکمل مساوی حقوق کا اعلان کیا گیا۔ تمام قوموں کو حق خود اختیاری کی ضمانت' علیحدگی اور اپنی خودمختار ریاست کی تشکیل کرنے کی حد تک آزادی دی گئی یہی اعلان نامہ روس کا ابتدائی آئین تھا۔

انتظامی محکموں کے قیام اور ان کی کارکردگی سے مطمئن ہونے کے بعد اس کی تمام توجہ جنگ کے خاتمے کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کے پیغام امن کا تقاضا بھی یہی تھا۔ خستہ حال سپاہی اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے بے تاب تھے خصوصاً ان حالات میں کہ ملک میں ان کی اپنی حکومت قائم ہوچکی تھی۔

لینن نے انگلینڈ' فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کی حکومتوں سے جرمنی سے صلح کے لیے رابطہ کیا لیکن بار بار کی اپیلوں کے باوجود ان حکومتوں نے جرمنی سے صلح کی بات چیت کرنے سے انکار کردیا۔ اب لینن کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ تنہا جرمنی سے صلح کرلے۔ اپنے ملک کو تباہ حالی سے بچانے کا ایک یہی ذریعہ تھا۔ اس نے صلح کی کوششیں شروع کردیں۔

جرمن ذرائع صلح کے لیے تیار ہوگئے لیکن کچھ شرطوں کے ساتھ۔ یہ شرطیں بھی ایسی سفاکانہ تھیں کہ ان پر عمل کرنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انہیں سوویت علاقے کا ایک بڑا حصہ دے دیا جائے۔

اب لینن کی پارٹی کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس شرط کو

مان لیا جائے یا جنگ جاری رکھی جائے؟ یہ سوال ہی ایسا تھا کہ پارٹی میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس شرم ناک شرط کو ماننے کے بجائے جنگ جاری رکھی جائے۔ بہت تھوڑے ممبر لینن کے ہم خیال تھے۔

پارٹی اختلافات سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔ ابھی اقتدار کا رنگ میلا نہیں ہوا تھا کہ اتنے بڑے اختلافات سامنے آگئے۔ لینن پریشان تھا۔ وہ کئی راتوں سے سو نہیں سکا تھا۔ ایک طرف ملک کو تباہی سے بچانا تھا' دوسری طرف پارٹی کو انتشار سے۔ اسے ملک بھی عزیز تھا اور پارٹی بھی۔ اس نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے پریس کا سہارا لیا۔ پے در پے کئی مضامین شائع کرائے جن میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ ملک کو برقرار رکھنا اور مضبوط کرنا ہی محنت کشوں کی عالمی آزادی کی تحریک کی بہترین حمایت ہے۔ اس نے سمجھایا کہ ملک بچانے کے لیے قربانی کی ضرورت ہے تاکہ اقتدار کو مضبوط بنایا جائے اور فتوحات کو برقرار رکھا جائے۔

پارٹی کے اندر گرما گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ ان اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صلح کی گفتگو کے بجائے جرمن فوج نے فروری 1918ء میں روس پر حملہ کردیا۔

لینن کی اپیل شائع ہوئی۔

"روس کے مزدوروں اور کسانوں کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ ملک کی بھلائی کے ساتھ جرمن فوج سے اپنے وطن کی حفاظت کریں۔ ساری طاقتیں اور وسائل دفاع کے کام میں لگا دیے جائیں۔"

محنت کشوں نے اپنے لیڈر کی اپیل کا مثبت جواب دیا۔ بڑے بڑے شہروں اور بستیوں میں جلسے آراستہ ہونے لگے۔ ان جلسوں میں ہونے والی تقریروں نے انقلابی لہر دوڑا دی۔ جاں نثاری اور قربانی کی ہوائیں چلنے لگیں۔ لاکھوں مزدور اور کسان وطن کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوج اور دستے منظم ہونے لگے۔ لینن بذات خود تمام کاموں کی نگرانی کررہا تھا۔ اس کی تقریریں مزدوروں کے دلوں میں آگ لگا رہی تھیں۔

ان منظم فوجی دستوں نے حملہ آور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بڑھتے ہوئے خطرے نے دم توڑ دیا۔ دشمن اس مزدور اتحاد کا مقابلہ نہ کرسکا اور اسے واپس لوٹنا پڑا۔

اس حملے کے بعد صلح کا سوال اور بھی زیادہ اہم ہوگیا۔ اس موضوع پر لینن کے مضامین مسلسل شائع ہورہے تھے۔ پارٹی کی ساتویں کانگریس منعقد ہوئی تو اس کا واحد موضوع معاہدۂ امن تھا۔ لینن نے دھواں دار تقریر سے معاہدۂ امن کو ثابت کیا اور پارٹی کو اس کی رائے کی تصدیق کرنی پڑی۔ اس کی تجویز کثرت رائے سے منظور ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ سوویت روس اور جرمنی کے درمیان صلح ضروری ہے۔

3 مارچ 1918ء کو امن معاہدے پر دستخط ہوگئے۔ یہ لینن کا بڑا کارنامہ تھا۔ محنت کشوں کو اقتدار مضبوط کرنے کا موقع ملا جو سوشلسٹ انقلاب کی آئندہ ترقی کے لیے بہت ضروری تھا۔ لینن کا کہنا یہ تھا کہ وقت حاصل کرلیا جائے تاکہ آنے والی لڑائیوں کے لیے طاقت جمع کی جائے۔ اس کو یہ فکر بھی تھی کہ سوشلسٹ اقتدار کا پہلا تجربہ ہی ناکام ہوگیا تو دنیا میں کہیں بھی سوشلسٹ حکومت قائم نہیں ہوسکے گی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے اقتدار کو بچانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے پسپائی اختیار کی اور صلح کرلی۔

لینن بڑی تیزی سے سوویت روس کو سوشلزم سے کمیونزم کی طرف لے جارہا تھا۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے اور اس کی پارٹی کو غیر معمولی جدوجہد سے کام لینا پڑ رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے حریف ممالک مزدوروں اور کسانوں کی فتح کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ انقلاب کی یہ چنگاری شعلہ بن کر ان کے ملکوں میں بھی پھیل سکتی ہے۔ وہ اس پودے کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی کچل دینا چاہتے تھے چنانچہ پہلے انگلستان اور فرانس کی فوجوں نے اور بعد میں جاپان' انگلستان اور امریکا نے روس کے بعض علاقے ہتھیا لیے۔ یہی نہیں بلکہ جو انقلاب دشمن روس میں موجود تھے' ان کی مدد سے ملک کو خانہ جنگی کا شکار کردیا۔

کمیونسٹ پارٹی اور لاکھوں عوام روس کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوگئے۔ لینن کریملن میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا لیکن اس کا ذہن رساہر مورچے پر موجود تھا۔ کمانڈروں کی تربیت و تنظیم کیسے کی جائے؟ فوج کو کمک پہنچانے کا انتظام کیسے کیا جائے؟ پرانے فوجی ماہروں سے کس طرح کام لیا جائے۔ اپنے دفتر کے کمرے سے وہ ملک کے کونے کونے کو احکامات اور ہدایات بھیج رہا تھا۔ اس دوران میں اسے کسی نے گھر جاتے یا پلک جھپکتے نہیں دیکھا۔ اس کی بہن کبھی کبھی اس سے ملنے آجایا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس سے باتیں کرتا رہتا اور کام میں مشغول رہتا۔

دشمنوں کو معلوم تھا کہ جب تک لینن زندہ ہے' سوشلسٹ انقلاب کا گلا نہیں گھونٹا جاسکتا۔ اسے قتل کرنا ضروری ہے۔ ایسے لوگ تو ہر جگہ مل جاتے ہیں جو پیسوں کے لیے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگ یہاں بھی مل گئے۔

30 اگست 1918ء کو وہ ایک جلسے میں شرکت کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ ایک عورت نے اس پر ریوالور سے پے در پے دو گولیاں چلائیں۔ اس وقت کچھ اور لوگ بھی اس کے اردگرد تھے۔ اس لیے نشانہ چوک گیا اور وہ محض زخمی ہوا۔ اسے اٹھا کر اندر لایا گیا۔

وہ زخمی ضرور ہوا تھا لیکن یہ گولیاں زہر میں بجھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ پورا ملک سوگوار ہوگیا۔ پراودا میں خبر شائع ہوئی۔

''لینن بیماری سے جدوجہد کررہے ہیں۔ وہ اس پر فتح حاصل کرلیں گے۔ پرولتاریہ یہی چاہتا ہے۔ یہی اس کی مرضی ہے۔ قسمت کے لیے اس کا یہی فرمان ہے۔''

کسانوں نے لکھا ''کامریڈ لینن! ہم آپ کو اپنی برادرانہ تہنیت بھیج رہے ہیں۔ ہماری خوشی اور سامراجیوں کو جلانے کے لیے جلد صحت یاب ہوجایئے۔''

مقبوضہ علاقوں کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد جاری تھی۔ وہ موت وزیست کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ ایک علاقہ چھین لیا گیا۔ پہلی فوج کے سپاہیوں نے تار بھیجا۔ عزیز لینن! آپ کے شہر کو چھین کر ہم نے آپ کے ایک زخم کا جواب دیا ہے اور دوسرے زخم کے لیے شہر سارا لیں گے۔''

لاکھوں دعاؤں اور ڈاکٹروں کی دن رات کی دیکھ بھال نے اس کے مہلک زخم مندمل کردیے۔ وہ اسپتال سے اپنے گھر منتقل ہوچکا تھا کہ اسے یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ متحدہ امریکا' انگلستان اور فرانس اور جاپان نے متحد ہوکر دس لاکھ فوجیوں کے ساتھ روس کو گھیر لیا ہے۔ وہ شدید کمزوری کے باوجود اٹھ کھڑا ہوا۔

''مشرقی محاذ کی مدد کرو'' لینن نے نعرہ لگایا۔

کمیونسٹ پارٹی کی پکار پر بیس ہزار کمیونسٹ' کئی ہزار نوجوان اور ساٹھ ہزار سے زیادہ ٹریڈ یونینوں کے ممبر مزدور محاذِ جنگ کے لیے روانہ ہوگئے۔

غیر ملکی حملہ آوروں کی یورشیں جاری تھیں کہ پارٹی کی آٹھویں کانگریس منعقد ہوئی۔ لینن اس کانگریس سے بہت پُرامید تھا۔ اس نے مختلف رپورٹیں پیش کرنے کے بعد کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''سوویت روس متواتر امن کی پالیسی پر گامزن ہے لیکن سامراجی ریاستیں اس کے خلاف جدوجہد کررہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں دفاعی طاقت کو مضبوط کرنا چاہیے۔ اب وقت آگیا ہے' جب ہم کو اوسط درجے کے کسانوں کے ساتھ مضبوط اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ اس اتحاد کے بغیر ہم سوشلزم قائم نہیں کرسکتے۔''

مزدوروں نے لینن کی اپیل کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ سارے ملک کے مزدوروں نے کام کا دن ختم ہونے کے بعد فاضل وقت میں اپنی ریاست کے لیے مفت کام کرنے کا فیصلہ کیا۔

لینن نے جنگی کمیونزم کے نام سے ایک معاشی پالیسی وضع کی۔ اس پالیسی کے تحت محنت کو لازمی قرار دیا گیا اور غذائی سامان صرف ان لوگوں کو ملتا تھا جو کام کرتے تھے۔ یہ ایک وقتی اقدام تھا جس کا مقصد اناج کا کوٹا مقرر کرنا تھا تاکہ جنگ کے دنوں میں ملک کو معاشی تباہی سے بچایا جائے۔

اس کی ہر تجویز پر پوری تن دہی سے عمل ہوتا رہا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مزدور طبقہ اس پر اعتماد بھی کررہا تھا اور محبت بھی۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کسی بدحالی کا شکار نہ ہوسکا۔

سوویت اقتدار کو مضبوط بنانے اور عوام کو کمیونسٹ سیاست دینے میں اس نے ایسی مشاقی دکھائی کہ دوسرے ملکوں کی مزدور تنظیموں نے اس کے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جرمنی' آسٹریا اور پولینڈ میں کمیونسٹ پارٹیاں نمودار ہونے لگیں۔

1919ء کی گرمیوں میں غیر ملکی حملہ آور اور سفید گارڈوں نے روس پر زوردار حملہ کردیا۔ اس حملے کی وجہ سے ہزاروں شہر اور بستیاں تباہ ہوگئیں۔ ملک کی معاشی حالت ابتر ہونے لگی۔ لینن کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی کے دشمنوں کو پھر منہ توڑ جواب دینے کے لیے عوام کو تیار کرلیا گیا۔ وہ باشعور مزدوروں کی کثیر تعداد کا اضافہ کرتا رہا۔ اس نے یہ اعلان کیا۔

''محنت کش عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ یہی ہماری طاقت ہے۔ اسی میں عالمی کمیونزم کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا سرچشمہ ہے۔''

اس کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور 1919ء کے آخر میں سرخ فوج نے تمام محاذوں پر فتح حاصل کرلی۔ اب اجڑے ہوئے روس کی تعمیر کے لیے نئی معاشی تعمیر کی ضرورت تھی۔ جنگی محاذوں سے ہٹ کر عوامی معیشت کی بحالی کی فکر کرنی تھی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ سوویت نظام میں جنگی فتوحات کی طرح سوشلسٹ تعمیر کا بھی لامحدود سرچشمہ موجود ہے۔ اس نے بتایا کہ سوشلزم اور کمیونزم کی تعمیر کے لیے بھاری صنعتوں کو ترقی دینا اور ملک میں بجلی کی ترویج کرنا ضروری ہے۔ اگر روس میں بجلی گھروں اور تیکنیکی آلات کا جال پھیلا دیا جائے تو ہماری

کمیونسٹ معاشی تعمیر مستقبل کے سوشلسٹ یورپ اور ایشیا کے لیے مثال بن جائے گی۔ سائنسی ترقی کے بغیر سوشلزم ممکن نہیں۔

1920ء میں لینن کی تحریک پر بڑے بڑے سائنس دانوں اور انجینئروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ کٹھن حالات کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے اپنے لیڈر کی رہنمائی میں بجلی کو عام کرنے کی بنیاد پر پیداواری طاقت بڑھانے کا پروگرام بنایا۔

اسی منصوبے نے سائنسی بنیاد پر ہمہ گیر معاشی ترقی کی تاریخ کی ابتدا کی۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں بجلی کے قمقموں سے جگمگانے لگے۔ زراعت میں پیداوار کئی گنا بڑھ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر یہ تاریخی الفاظ ادا کیے۔

''اس قوم پر کبھی فتح حاصل نہیں کی جاسکتی جس کے مزدوروں اور کسانوں کی اکثریت خوش محسوس کرتی ہو' محسوس کرتی ہو اور یقین رکھتی ہو کہ وہ اپنے سوویت اقتدار' محنت کشوں کے اقتدار کی حفاظت کررہی ہے۔''

جنگ کا آخری بادل تک تباہی برسا کر گزر چکا تھا۔ تمام تر منصوبوں کے باوجود جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد کے حالات کا موازنہ تکلیف دہ تھا۔ کارخانوں کو بے حد نقصان پہنچا تھا۔ ریلوے' ٹرانسپورٹ ابتری کی حالت میں تھی۔ زراعت تباہ حال تھی۔ کسان عدم اطمینان کا شکار تھے۔ اس صورتِ حال سے نئے نظام کے دشمنوں نے فائدہ اٹھانا شروع کردیا۔ انہوں نے کسانوں کو سوویت اقتدار کے خلاف اکسایا اور یہ عناصر کئی مقامات پر امیر کسانوں کو بغاوتوں پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مارچ 1921ء میں انقلاب دشمن بغاوت پھوٹ پڑی۔

اس خطرناک لمحے میں لینن کی دانائی ایک نئے انداز سے ظاہر ہوئی۔ اس نے کتابوں کے بنے بنائے نظریات سے ہٹ کر زمینی حقائق کا جائزہ لے کر اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کرنے کا جرأت آمیز فیصلہ کیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ عوامی معیشت کی بحالی کی ابتدا زراعت سے کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ صنعتی مرکزوں کے لیے اناج اور خام اشیا کی مانگ کو بالکل پورا نہیں کررہی ہے اور اس کے بغیر صنعت کو ترقی دینا ممکن نہیں۔ ہمارے ملک میں چھوٹے کسانوں کی معیشت حاوی ہے۔ مزدور طبقے کو چاہیے کہ وہ لاکھوں کسانوں کے ساتھ مل جل کے رہے۔ اس کے لیے نئی پالیسی بنانے کی ضرورت ہے۔

اس پالیسی کے تحت اس نے تجویز پیش کی کہ فاضل اناج کا کوٹا وصول کرنے کی جگہ جنس کی شکل میں ٹیکس لگایا جائے اور فاضل اناج اور دوسری چیزوں کی نجی فروخت کی اجازت دے دی جائے۔ پارٹی کے سامنے کوآپریٹو سوسائٹیوں کی تعمیر نو کرنے کا فریضہ پیش کیا۔ کانگریس نے نئی معاشی پالیسی اختیار کرنے کے لیے اس کی تجویز منظور کرلی۔

ان تجویزوں اور عملی کوششوں کے باوجود ملک جن دشواریوں سے گزر رہا تھا' کمیونسٹ پارٹی کی اندرونی صورتِ حال پر بھی اس کا اثر پڑا۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس پالیسی کی دبے لفظوں میں مخالفت سنائی دی۔ لینن کی بصیرت نے اس خطرے کو دیکھ لیا۔ اگر پارٹی میں پھوٹ پڑتی تو اس کا اثر لازمی طور پر مزدور طبقے اور کسانوں کے اتحاد پر پڑتا۔ اس نے فوراً ایکشن لیا اور اعلان کیا کہ گروپ بندی کی کوشش کرنے والے ہر ممبر حتیٰ کہ مرکزی کمیٹی کے ممبروں کو بھی پارٹی سے خارج کردیا جائے گا۔ اس اعلان کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور پارٹی کا اتحاد ٹوٹنے سے بچ گیا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر قلم کا سہارا لیا۔ پمفلٹوں اور مضامین کے ذریعے مزدوروں اور کسانوں کو تفصیل کے ساتھ نئی معاشی پالیسی اور اس کو زندگی میں رائج کرنے کے طریقے سمجھانے شروع کیے۔ وہ رات رات بھر بیٹھ کر مضامین لکھتا اور دن میں ریاست کے کاموں میں مشغول ہوجاتا۔ اس کی سرگرمیاں نوع بہ نوع تھیں۔ کبھی تیل کی صنعت اور دھات سازی کے کام کے لیے عملی ہدایات دیتا نظر آتا تھا کبھی بجلی کے پاور اسٹیشن کی تیاری کی نگرانی کرتا دکھائی دیتا تھا۔ مزدوروں سے ملاقات کے لیے وقت بھی نکال لیتا تھا۔ ملک میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی تبدیلی بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں تھی۔ محنت کشوں میں شعور بڑھانے اور ان میں احساسِ ذمّے داری پیدا کرنے کی کوششوں میں بھی لگا رہتا تھا۔ اس کی اپنی زندگی کسی مزدور کی زندگی سے زیادہ شاندار نہیں تھی۔ اس کے اپنے کمرے میں آتش دان تک نہیں تھا جو اسے سردی سے بچا سکتا۔ شاید اتنی مصروفیات میں اسے خیال تک نہیں آیا تھا کہ اسے اپنے لیے کیا کرنا ہے؟

ایک کسان اس سے ملنے اس کے گھر آیا۔ لینن حسبِ معمول اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے میں مشغول تھا لیکن کسانوں اور مزدوروں سے ملنا اس کی سب سے بڑی ترجیح تھی۔ اس نے کتابیں ایک طرف رکھیں اور کسان کو اندر بلوالیا۔ کسان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سخت سردی کے باوجود وہ شخص کھڑکی دروازے بند کرکے سردی کو روکے بیٹھے ہیں۔ اس کے باوجود کمرا ٹھنڈا ہورہا ہے۔

وہ کسان کچھ دیر بیٹھ کر رخصت ہوگیا لیکن راستے بھر سوچتا رہا کہ اس طرح ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے سے لینن کی صحت خراب ہوسکتی ہے۔ اس نے مقامی سوویت کی انتظامیہ کمیٹی کو رپورٹ دیتے ہوئے نہایت دردمندی سے لکھا کہ لینن ٹھنڈے کمرے میں کام کرتے ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ لینن کو انتظامیہ کمیٹی کے خرچ سے ایک ویگن لکڑی بھیجی جائے اور لوہار بھیجا جائے جو وہاں جا کر آہنی آتش دان لگادے۔ دوسرے دن جب اس کی رہائش گاہ پر لوہار اور لکڑی سے بھری ویگن پہنچی تو لینن پریشان ہوگیا۔

''یہ انتظامیہ کمیٹی اور مزدوروں کی طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔''

''میں یہ تحفہ اس وقت تو قبول کرلیتا ہوں لیکن ایک بات بتادوں کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ کوئی مجھے تحفہ بھیجے۔''

''یہ تحفہ آپ کے لیے نہیں' اس لینن کے لیے ہے جو مزدوروں کے دکھ بانٹتے بانٹتے اپنے دکھ بھول گیا ہے۔''

''وہی لینن آپ سے کہہ رہا ہے کہ ابھی ہر مزدور کے گھر میں آتش دان نہیں ہے۔''

''اس گھر سے ابتدا ہورہی ہے۔ اب ہر مزدور کے گھر میں آتش دان ہوگا۔''

لینن مسکرا کر چپ ہوگیا۔ لوہار اور مزدوروں کو راستہ دے دیا جو ویگن کے ساتھ آئے تھے۔ مزدوروں نے لکڑی اتاری اور لوہار نے آتش دان لگا کر آگ روشن کردی۔

وہ اس رات سکون سے سونے کے بجائے بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ کتنے مزدور اس وقت سردی سے ٹھٹھر رہے ہوں گے۔ ان کے کمروں کے ٹھنڈے فرش' گرمی کو ترس رہے ہوں گے۔ کیا کسی انتظامیہ کمیٹی نے ان کے گھر ویگن بھر کے لکڑیاں بھیجی ہوں گی؟ کیا یہ سوشلسٹ ریاست کی ذمے داری نہیں کہ وہ سب کی ضرورتوں کا خیال رکھے؟ ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں اپنی عورتوں کو آگے بڑھانا ہے۔ نوجوانوں کو سوشلزم کی تعلیم دینی ہے۔ سوشلزم صرف مزدوروں ہی کے لیے تو نہیں۔

لینن کے مشورے پر پارٹی نے اچھے اچھے کمیونسٹوں کو نوجوان لڑکے لڑکیوں کی سیاسی تعلیم کے لیے بھیجا۔ ان کمیونسٹوں کی رہنمائی میں نوجوانوں کی کمیونسٹ لیگ قائم کی گئی۔

نوجوان کمیونسٹوں کی تعداد بڑھتی گئی اور جب ان کی تیسری کانگریس منعقد ہوئی تو لینن خود اس میں شرکت کے لیے آیا۔ یہ نوجوانوں کے لیے بڑے اعزاز اور حوصلہ افزائی کی بات تھی۔ جب وہ تقریر کرنے کے لیے ڈائس پر آیا تو سب یہ توقع کررہے تھے کہ وہ نوجوانوں کے سامنے سیاسی صورتِ حال کا نقشہ پیش کرے گا اور ان کو بتائے گا کہ سفید گارڈوں سے کس طرح لڑا جائے لیکن اس نے توقع کے خلاف ان نوجوانوں سے پڑھنے' پڑھنے اور پڑھنے کی اپیل کی۔ انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ نوجوانوں کو کمیونزم کی تعمیر کے لیے تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔

''کمیونزم کی تعمیر صرف اس سائنس اور علم کا سہارا لے کر کی جاسکتی ہے جو انسانیت نے جستہ جستہ جمع کیا ہے اور اس علم کا اطلاق صنعت اور زراعت میں کارآمد محنت کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بغیر کمیونزم کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ نوجوانوں کی یونین کا ممبر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عوامی کاز کے لیے اپنی طاقتوں کو وقف کردیا جائے۔ ہر روز ہر شہر اور ہر دیہات میں نوجوانوں کو مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ مل کر عام محنت کے کسی نہ کسی فریضے کو عملی طور پر طے کرنا چاہیے خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔''

اس نے اپنے ملک کے عوام کو ایک لڑی میں پرونے کے بعد تمام ملکوں کے مزدوروں اور کمیونسٹ پارٹیوں کے اتحاد و اتفاق پر خاص طور سے زور دیا اور کمیونزم کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کی تعلیم دی۔ ان ملاقاتوں اور باتوں نے برادر ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کے رہنماؤں کی زندگی میں نمایاں رول ادا کیا۔ وہ اب کمیونزم کے عظیم معلم کی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ اسے تمام ملکوں میں فتح سوشلسٹ ڈیموکریسی کی فتح پر گہرا یقین تھا۔

مختلف ملکوں کی نوخیز کمیونسٹ پارٹیوں کو روسی کمیونسٹوں کے تجربے سے واقف کرنے اور اس تجربے کو ان تک پہنچانے کے لیے اس نے اپنی کتاب ''بائیں بازو کا کمیونزم' بچکانہ بیماری'' تحریر کی جس میں اس نے بالشویک پارٹی کے قیام' ترقی' جدوجہد اور فتح پر روشنی ڈالی۔

اس کا ملک خانہ جنگی کی کیفیات سے بخیر و خوبی گزر آیا تھا۔ اب اس نئے روس کی تعمیر کرنی تھی۔ اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے پارٹی کی کانگریس طلب کی۔ یہ کانفرنس آٹھ دن تک چلتی رہی۔ لینن نے پارٹی کے سامنے ملک کی معیشت کو نئی زندگی دینے کا فریضہ رکھا۔

یہ دور اس کی زندگی کا سب سے مصروف دور تھا۔ وہ ہر منصوبے کی بذاتِ خود نگرانی کررہا تھا۔ اس انتھک محنت نے اس کی صحت کو نقصان پہنچانا شروع کردیا۔ 1922ء میں اس کی صحت بالکل ہی جواب دے گئی لیکن ڈاکٹروں کے مشوروں

کے برخلاف وہ ریاستی کاموں میں مشغول رہا۔

وہ سخت بیمار تھا۔ پارٹی کی گیارھویں کانگریس منعقد ہوئی تو اسے چلنے میں بھی دقت محسوس ہورہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کانگریس میں شریک ہوا۔ مندوبین نے اس کی طرف تشویش سے دیکھا۔ اس کا پستہ قد اور چھوٹا لگنے لگا تھا۔ گال اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے البتہ آنکھوں میں وہی چمک تھی جو بھی ہوا کرتی تھی۔

اسے سہارا دے کر ڈائس پر لایا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کمزوری کے باعث زیادہ دیر تک بول نہیں سکے گا اور شاید شکریہ ادا کرکے بیٹھ جائے لیکن یہ کہہ کر اس نے سب کو حیران کردیا کہ وہ نئی معاشی پالیسی کے پہلے سال کا جائزہ پیش کرنے والا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے سخت بیماری کی حالت میں یہ طویل رپورٹ بھی تیار کی ہے۔

اس نے نہایت خوشی سے بتایا کہ عوامی معیشت کے سارے شعبوں میں ترقی شروع ہوگئی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کا اتحاد مضبوط ہوا ہے۔

اس کی آواز میں وہی دم خم تھا۔ وہ کسی شیر کی طرح گونج رہا تھا ''سپاہی کی مدت ختم ہوچکی ہے اور اب سرمایہ دار عناصر پر دھاوا منظم کرنے کی ضرورت ہے۔''

اس کی آواز ڈوبنے سے پہلے کانگریس ختم ہوگئی لیکن اس کے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ کسی صحت مند مقام پر کچھ دن آرام کرنے کے لیے چلا جائے۔ اس کی صحت اب اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہ اس مشورے کو ٹال نہ سکا۔

''کروپسکایا! میرے ڈاکٹر شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ مجھے اب آرام کرنا چاہیے۔''

''اب پارٹی میں ایسے لوگ تیار ہوچکے ہیں جو آپ کی چند دنوں کی غیر حاضری کو محسوس نہیں ہونے دیں گے۔ ریاست کا کام چلتا رہے گا۔ آپ کو آرام ضرور کرنا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت بھی سوشلسٹ انقلاب کی حاصلات کو نہیں چھین سکتی۔''

''تو پھر کیا سوچا' ہمیں کہاں جانا چاہیے؟''

''دیہات کی کھلی فضا میرے اعصاب کو بہت آرام دے گی۔ میں کچھ دن ''گورکی'' میں گزارنا چاہتا ہوں۔ ایسے کچھ دن جہاں ہماری تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو۔ میں نے آج تک تمہارے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں گزارا۔ اب کچھ دن تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

''تم ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہو لینن!''

''پارٹی کے کاموں نے تو مجھے اپنے ساتھ نہیں رہنے دیا۔ تمہیں کوئی سکون کہاں پہنچا سکا۔''

''میرا سکون یہی ہے کہ تاریخ تمہارا نام ہمیشہ فخر کے ساتھ دُہرائے گی۔ تم نے نظریے کو عمل بنانے کا عظیم کام انجام دیا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔''

''کاش! میں پوری دنیا کے مزدوروں کو بیدار کرسکتا۔ کاش! میرے پاس اتنا وقت ہوتا۔''

''اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ تمہاری زندگی بہت ضروری ہے۔''

''اسی لیے تو میں نے بھی ڈاکٹروں کی بات مان لی ہے۔ ہم گرمیاں شروع ہوتے ہی گورکی منتقل ہوجائیں گے۔''

1922ء کی گرمیوں میں وہ گورکی منتقل ہوگیا۔ یہ ایک پُرفضا مقام تھا۔ ہر طرف کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ دیہاتیوں کی سادہ زندگی' خاموشی میں سکون کا رس گھول رہی تھی۔ لینن نے یہاں پہنچتے ہی کئی گہرے گہرے سانس لیے۔

''یہ ہے سوشلسٹ انقلاب کے بعد کا ایک گاؤں۔ کتنا اطمینان ہے یہاں۔ اب کسی کسان کو یہ فکر نہیں ہے کہ زمیندار اس کی کمائی چھین سکے گا۔ زارشاہی کے کارندے اسے ڈرا دھمکا سکیں گے۔''

رات ہوئی اور گاؤں والوں کے کچے پکے مکانات بجلی کے قمقموں سے جگمگا اٹھے تو وہ خوشی سے جھومنے لگا ''دیکھا کروپسکایا! اب ان کسانوں کی زندگی میں بھی روشنی ہوگئی ہے۔ اب سے پہلے کسی نے ان کا حق تسلیم کیا تھا؟ یہ ہے سوشلسٹ انقلاب کی برکت۔''

وہ یہاں آرام کی غرض سے آیا تھا لیکن گاؤں کے سادہ لوح لوگ اور آس پاس کے عوام اتنا صبر کیسے کرسکتے تھے کہ ان کا محبوب لیڈر ان سے اتنا قریب ہو اور وہ اس سے ملنے نہ آئیں۔ لینن کو بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ لوگ اس سے ملنے آئیں اور وہ ملنے سے انکار کردے۔ بیماری کے باوجود وہ بستر پر لیٹے لیٹے لوگوں سے ملتا رہا۔

اس کی صحت ابتدا میں کچھ بحال ہوگئی تھی لیکن دو مہینے بعد جب وہ گورکی سے واپسی کا ارادہ کررہا تھا اچانک بیماری کا سخت دورہ پڑا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ زندگی بھر کی سخت ذہنی محنت نے اس کے دماغ پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔

اس کی تشویش ناک حالت کی خبریں اخباروں میں آئیں تو ہر طرف زلزلہ سا آگیا۔ وہ محض اقتدار کا پرزا نہیں تھا جس سے صرف ریاستی مشینری متاثر ہوتی۔ وہ تو عوام کے دلوں میں دھڑک رہا تھا۔ ہر دھڑکن نے اسے آواز دی۔

''ولادیمیر الیچ (لینن) کو تین مہینے کی رخصت دی

جائے اور ان سے ڈاکٹروں کی ہدایات پر فوری عمل اور محنت کشوں کے لیے اپنی قوت بحال کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔''

''ہم تحصیل کانگریس کے مندوبین پندرہ ہزار کسانوں کی طرف سے یہ تمنا کرتے ہیں کہ آپ جلد از جلد پوری طرح صحت یاب ہو جائیں۔ ہمارے ہم وطن یہ پوچھتے ہیں کہ کب آپ پھر ہماری بہبودی کے لیے فرمانوں پر دستخط کرنے لگیں گے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ مکمل صحت یابی سے قبل آپ بستر سے نہ اٹھیں۔ ہم آپ کے لیے مکمل آرام اور صحت یابی کی تمنا کرتے ہیں۔''

ملک کے کونے کونے سے مزدوروں کے خطوط آ رہے تھے۔ دعاؤں کے تحفے موصول ہو رہے تھے۔ یہی دعائیں اس کے کام آ گئیں اور اس کی طبیعت سنبھل گئی۔

''بہت دن ہو گئے ہیں' میں نے اخبار تک نہیں دیکھا۔ مطالعے کے لیے آنکھیں ترس گئی ہیں۔ اب میں کچھ پڑھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کتابوں کی فہرست بنائی۔ ان میں سے کچھ کتابیں اسے فوراً مہیا کر دی گئیں۔ اس نے گرمجوشی سے مطالعہ شروع کر دیا۔ فارغ اوقات میں دوستوں سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔

صحت بحال ہوتے ہی وہ ماسکو لوٹ آیا۔ کریملن کی رہائش گاہ پھر سے آباد ہو گئی۔ وہ پھر سے ریاستی کاموں میں مشغول ہو گیا۔ انہی دنوں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی کانگریس منعقد ہوئی۔ اس نے کمزوری کے باوجود اس کانگریس میں دیر تک بیٹھنا قبول کر لیا۔ وہ ڈائس آیا۔ زبردست تالیوں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ حاضرین نے کھڑے ہو کر انٹرنیشنل ترانہ گایا۔ طوفان تھما تو لینن نے لبوں کو جنبش دی۔

''ساتھیو! فہرست میں میرا نام خاص طور پر رپورٹ پیش کرنے والے کی حیثیت سے ہے لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ طویل بیماری کے بعد میں کوئی بڑی رپورٹ پیش کرنے سے معذور ہوں۔ میں انتہائی سوالوں پر کچھ ابتدائی باتیں تو کر سکتا ہوں۔ میرا موضوع بہت محدود ہو گا۔ یہ موضوع ہے ''روسی انقلاب کے پانچ سال اور عالمی انقلاب کے امکانات''۔ یہ موضوع ایک مقرر کے لیے بہت وسیع ہے۔ اسی لیے میں اس موضوع کا ایک چھوٹا سا حصہ لوں گا یعنی نئی معاشی پالیسی کا سوال۔''

اس کے بعد لینن نے مندوبین کو بتایا کہ نئی معاشی پالیسی کی بنیاد پر سوویت حکومت نے کیا حاصل کیا ہے۔ اس نے بتایا معیشت میں اضافہ ہوا ہے۔ مالیاتی سسٹم میں استحکام پیدا ہوا ہے اور تجارت بحال ہوئی ہے۔ کسانوں کی معیشت بحال ہو گئی ہے۔ ملکی صنعت کی بحالی کے لیے قدم اٹھایا گیا ہے اور بھاری صنعت کی حالت نے نمایاں موڑ اختیار کیا ہے۔ مزدوروں کی حالت بہتر ہو گئی ہے اور تہذیبی تعمیرات میں بھی بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔

اس نے اپنی تقریر اس اپیل پر ختم کی ''بالشویک پارٹی کے تجربے' روسی انقلاب کے اسباق کو اندھا دھند عقیدے کی طرح نہیں بلکہ تخلیقی طور پر سمجھنا چاہیے اور اس کے لیے سخت مطالعے کی ضرورت ہے۔ ہمارا سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ ہم مطالعہ کریں اور زور دوں سے مطالعہ کریں۔''

زوردار تالیوں کی گونج میں وہ ڈائس سے ہٹ گیا ''ہمارے کامریڈ لینن زندہ باد'' کے نعرے دیر تک گونجتے رہے۔ وہ اپنی مقبولیت سے زیادہ اپنی کچھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ اب مزدوروں کو اس کی بات سمجھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس کی قوم اگر اسی طرح اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی رہی تو وہ بہت جلد ترقی یافتہ قوموں میں شمار ہو گی۔

اس تقریر کے ٹھیک ایک ہفتے بعد اس نے ماسکو سوویت کے عام اجلاس میں تقریر کرنی پڑی۔ ڈھیلے ڈھالے کوٹ میں وہ بہت دبلا لگ رہا تھا لیکن اس کا آہنی عزم اسے پھر تیلا بنائے ہوئے تھا۔ یہ اس کی قوتِ ارادی ہی تھی کہ وہ بیماری سے لڑ رہا تھا۔ ڈاکٹروں کے مشوروں کے باوجود ریاستی کاموں میں مشغول تھا۔ اس کے چاہنے والوں نے اس کی بیماری اور لاغری کو محسوس کیا اور اس کے خلوص کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے زوردار تالیاں بجائیں۔ بڑی دیر تک تالیوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ پھر لینن کی آواز گونجی۔

''ساتھیو! مجھے بہت افسوس ہے اور میں اس بات کے لیے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے اجلاس میں اس سے پہلے شرکت نہ کر سکا کیونکہ بیماری کے بعد دسمبر کی ابتدا سے مجھ میں کافی طویل عرصے کے لیے کام کی اہلیت نہیں رہی۔ اس کمی کی وجہ سے مجھے ہفتے در ہفتے اپنی تقریر ملتوی کرنی پڑی۔ میں نے اپنے کام کے کافی حصے کا بوجھ جیسا کہ آپ کو یاد ہو گا دوسرے کامریڈوں کے کندھوں پر ڈالا۔ جہاں تک میرا سوال ہے' میری کام کی اہلیت بھی کم ہونے کی وجہ سے مجھے معاملات سے نمٹنے پر اپنی مرضی سے زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا۔''

ان ابتدائی کلمات کے بعد اس نے ان فریضوں کے بارے میں بتایا جو عوام کے سامنے ہیں۔ ان کو پورا کرنے کے راستے اور طریقے بتائے اور اپیل کی کہ معیشت میں کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔ اس نے واضح لفظوں میں کہا ''نئی معاشی پالیسی والے روس سے سوشلسٹ روس بنے گا۔''

اس اجلاس میں شرکت کے بعد اس کی حالت اچانک بگڑ گئی۔ وہ پھر سے صاحبِ فراش ہوگیا۔ تبدیلی کے کئی خواب اس کی آنکھوں میں گردش کررہے تھے۔ سب سے اہم خواب قوموں کے درمیان دوستی تھا۔ وہ اس دوستی کو سوویت ریاست کی مضبوطی سمجھتا تھا۔ تمام سوویت ری پبلکوں کو واحد یونین ریاست میں متحد کرنے کا خواب تازہ تھا لیکن ان کو کیسے متحد کیا جائے؟ اب اس کے پاس وقت نہیں تھا لیکن اس کی سابقہ کوششیں سفر میں تھیں۔ دسمبر کے مہینے میں جب وہ بیمار تھا۔ سوویتوں کی پہلی یونین کانگریس نے سوویت سوشلسٹ ری پبلکوں کی یونین کے قیام کا فیصلہ کرلیا۔ کونسل کا صدر لینن کو مقرر کیا گیا۔

دسمبر میں اس پر بیماری کا حملہ ہوا تھا اور فروری میں اس کی حالت کچھ بہتر ہوگئی۔ وہ پھر لکھنے بیٹھ گیا۔ اسے اپنے مضامین کے ذریعے اپنی قوم کو بہت کچھ سمجھانا تھا۔ اس نے ڈیڑھ مہینے کی مدت میں کئی قابلِ ذکر مضامین لکھ ڈالے۔

مارچ 1923ء میں لینن کی صحت بہت زیادہ خراب ہوگئی۔ دو مہینے تک بیماری سے جنگ کرنے کے بعد مئی میں وہ مجبور ہوگیا کہ سکون کی تلاش میں کسی طرف جا نکلے۔ وہ پھر گورکی چلا گیا۔ سال کے وسط تک اس کی صحت پھر کچھ بہتر ہوئی۔

وہ لکھنے کی میز پر بیٹھا تھا۔ لاتعداد خطوط اس کے اردگرد بکھرے ہوئے تھے۔ کروپسکایا اس کی سنبھلی ہوئی حالت کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ وہ بہت دن بعد لکھنے کی میز پر آیا تھا۔

''آج آپ بہت دن بعد لکھنے کی میز پر آئے ہیں۔ کتنی خوشی کا دن ہے میرے لیے۔''

''ہاں دیکھو تو، کتنا کام جمع ہوگیا ہے۔ صرف خطوں کا جواب لکھنے بیٹھوں تو کئی دن لگ جائیں گے۔''

''زیادہ محنت کی ضرورت نہیں۔ خطوں کے جواب آہستہ آہستہ دیجیے گا۔''

''اب میرے پاس بہت کم وقت رہ گیا ہے، مجھے شدید محنت کرنی ہوگی۔''

کروپسکایا اس کے لیے کتابیں لینے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو وہ اپنی کرسی پر نہیں تھا۔ گیراج سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی تو وہ گیراج میں پہنچ گئی۔ لینن کار میں بیٹھا اس کا انتظار کررہا تھا۔

''چلو، ماسکو چلتے ہیں۔''

''یہ اچانک ماسکو چلنے کی کیا سوجھی؟'' کروپسکایا کو ہنسی آگئی۔

''آج مجھے ماسکو بہت یاد آرہا ہے۔ کریملن کی رہائش گاہ یاد آرہی ہے۔ جہاں میں نے ڈھیر سارا وقت گزارا ہے۔ بہت کام کیا ہے وہاں۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا، ہم کسی اور دن چلیں؟''

''تم جانتی ہو میں نے آج کا کام کبھی کل پر نہیں ٹالا۔''

''ہاں، یہ تو ہے'' کروپسکایا نے کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔

وہ ماسکو پہنچتے ہی سیدھا کریملن پہنچا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت جلدی میں ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہر کمرے میں گیا اور پھر مطالعے کے کمرے میں گیا۔ سلیقے سے رکھی ہوئی کتابوں کو حسرت سے دیکھتا رہا۔ کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر اس کرسی پر بیٹھ گیا جس پر بیٹھ کر وہ لکھا کرتا تھا۔

''دیکھو، میں نہیں ہوں تو یہ کرسی کیسی سونی لگ رہی ہے؟''

''اب آپ ٹھیک ہوگئے ہیں۔ ہم یہیں آکر رہتے ہیں، یہ کرسی پھر سے آباد ہوجائے گی۔''

''کیا خبر کب آنا ہو۔ چلو شہر کی سیر کرنے چلتے ہیں۔''

وہ پورے شہر میں اس طرح گھومتا رہا جیسے کوئی نووارد پہلی مرتبہ ماسکو آیا ہو۔ شام تک اسی طرح گھومتا رہا۔ پھر کریملن واپس آگیا۔ اس کی حالت اس بچے کی طرح تھی جو اپنے گم شدہ کھلونوں کو دوبارہ پاکر خوش ہورہا ہو۔ کروپسکایا مختلف اندیشوں کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا شوہر کیا سوچ رہا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے؟ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کریملن میں کب تک رہنے کے ارادے سے آیا ہے؟

لینن نے یہ رات کریملن میں گزاری اور دوسرے دن کی صبح ہوتے ہی گورکی واپس جانے کی اس طرح جلدی کرنے لگا جیسی جلدی اسے ماسکو آنے کی تھی۔

ماسکو میں اس کے دو پرانے کامریڈ ریاستی مشینری کو سنبھالے ہوئے تھے۔ گورکی سے مسلسل ہدایات آرہی تھیں۔ ان دوستوں کو تعجب ہوتا تھا کہ وہ ایک دیہات میں بیٹھ کر اس قدر باخبر کس طرح ہے؟

''گورکی'' کے قیام نے اس کی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ اب وہ تیزی سے صحت یاب ہورہا تھا۔ ٹریڈ یونینوں کو پل پل کی خبریں موصول ہورہی تھیں۔ مزدوروں میں یہ خبریں بڑی خوشی سے سنی جارہی تھیں کہ ان کا محبوب لیڈر تیزی سے صحت یاب ہورہا ہے۔ مختلف وفود اس کی خیریت دریافت کرنے گورکی پہنچ رہے تھے۔

پہلا پہلا

☆ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والے سب سے پہلے شخص نیوزی لینڈ کے جناب ایڈمنڈ ہیلری ہیں جو اپنے نیپالی گائیڈ شرپا تنزنگ کے ساتھ 29 مئی 1953ء کو چوٹی پر پہنچے۔

☆ خلا میں سب سے پہلا آدمی روس کا یوری گگارن 12 اپریل 1961ء کو خلائی جہاز ''وسٹک I'' کے ذریعے پہنچا۔

☆ قطب شمالی پر بیٹھنے والا سب سے پہلا شخص امریکا کا رابرٹ ایڈون پیری ہے جو 16 اپریل 1909ء کو وہاں پہنچا تھا۔

☆ قطب جنوبی پر جانے والا سب سے پہلا شخص ناروے کا آمنڈسن ہے جو 16 دسمبر 1911ء کو وہاں پہنچا۔

☆ چاند پر اترنے والا سب سے پہلا شخص امریکا کا نیل آرمسٹرانگ ہے جو 31 جولائی 1969ء کو امریکی خلائی جہاز ''اپالو II'' کے ذریعے وہاں پہنچا۔

☆ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والا پہلا پاکستانی نذیر صابر ہے۔

☆ خلا میں جانے والا سب سے پہلا مسلمان آدمی سعودی عرب کا شہزادہ سلطان سلمان السعود ہے۔ جو جون 1985ء میں امریکی خلائی شٹل ''ڈسکوری'' میں سوار ہوکر خلا میں پہنچا۔ دورانِ سفر شہزادہ سلطان نے پورے قرآن مجید کی تلاوت بھی کی۔

☆ خلا میں سب سے پہلی خاتون روس کی جونیئر لیفٹیننٹ (اب لیفٹیننٹ کرنل) ویلنٹینا ولادی میروفنا ٹریشکو فا 12 تا 19 جون 1963ء کو ووسٹک شٹل کی خلائی جہاز کے ذریعے پہنچی۔

ڈوگزر عالمی معلومات سے ماخوذ

نومبر 1923ء کی ابتدا میں گلوخوف فیکٹری کے مزدوروں کا ایک وفد اس سے ملنے کے لیے گورکی آیا۔ وفد کے تمام ممبران کو نہایت احترام کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں بٹھادیا گیا۔

لینن مطالعے کے کمرے میں تھا کہ اسے وفد کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے جگنو جگمگانے لگے۔ ان مزدوروں کو اس کی صحت کی کتنی فکر ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور کتابیں ایک طرف رکھ کر ملاقاتیوں سے ملنے پہنچ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر پُرعزم اور امید افزا مسکراہٹ تھی۔ مزدوروں کا محبوب چاق وچوبند نظر آرہا تھا۔

''ہم آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ ہم تو آپ کو صرف ایک نظر دیکھنے آئے تھے۔''

''آپ لوگ میری فکر نہ کریں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ان دنوں میرے پاس وقت بھی بہت ہے۔ آپ لوگ آرام سے باتیں کریں۔''

''پہلے ہمارے پاس شکایتوں کے دفتر ہوتے تھے۔ کرنے کے لیے بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ اب تو کرنے کے لیے صرف کام رہ گیا ہے۔ آپ نے ہماری زندگیوں میں انقلاب پیدا کردیا ہے، عظیم انقلاب۔''

''آپ لوگوں کو معلوم ہے، میں اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتا، وہ باتیں کیجیے جو مجھے پسند ہیں۔''

''ہم آپ سے یہ کہنے آئے ہیں کہ آپ وہی کیجیے جو آپ کے ڈاکٹر کہتے ہیں۔ روس اب اتنا مضبوط ہوگیا ہے کہ اب آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''یہ سب آپ لوگوں کے اتحاد کی بدولت ہوا ہے۔ اس اتحاد کو قائم رکھیے گا۔''

''ہم اسی طرح متحد رہیں گے۔''

وفد کے ممبروں نے بہ یک آواز کہا اور اس عہد کے ساتھ ہی روانگی کی اجازت چاہی۔ ایک بوڑھا مزدور آگے بڑھا اور لینن سے بغل گیر ہوگیا۔ مزدور کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''ولادیمیر ایلیچ! میں مزدور ہوں۔ لوہار ہوں، لوہا پگھلا کر طرح طرح کی چیزیں ڈھالتا ہوں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے ہمارے سپرد کیا ہے، وہ سب ہم ڈھالیں گے۔'' اس بوڑھے مزدور نے لینن کی پیشانی کو بوسہ دیا اور وفد کے دوسرے ممبروں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ دیر تک کروپسکایا سے ان مزدوروں اور خاص طور پر بوڑھے لوہار کی باتیں کرتا رہا۔ ان لوگوں کی آہنی عزم کی تعریفیں کرتا رہا۔

''یہ ان لوگوں کا آہنی عزم ہی تھا کہ انہوں نے پرانی دنیا کو تباہ کردیا۔ استحصال کرنے والے طبقوں کی مزاحمت کو کچل دیا۔ میری تمام کامیابی ان مزدوروں ہی کی مرہونِ منت ہے۔''

ان وفود نے اس کے حوصلے کو مزید بیدار کردیا۔ وہ گورکی میں تھا لیکن اپنے ساتھیوں کو برابر ہدایات بھیج رہا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے بولتا رہتا اور کروپسکایا اسے تحریر کرتی جاتی۔

''تمام شکایتوں کی رپورٹ جو تحریری شکل میں آتی ہیں، چوبیس گھنٹوں کے اندر میرے پاس آجانا چاہیے اور زبانی شکایتوں کی اڑتالیس گھنٹوں کے اندر۔ اور اس بات کی اچھی

طرح جانچ کی جائے کہ شکایتوں کے بارے میں جو فیصلے کیے جاتے ہیں ان پر عمل ہو رہا ہے۔''

''ملک کے دفاع کو مضبوط کیا جائے اور سرخ فوج (ریڈ آرمی) کو آنکھ کا تارا سمجھا جائے۔''

''مرکزی کمیٹی کو مضبوط کیا جائے اور اس کے ممبروں کی تعداد کو بڑھایا جائے۔''

لاتعداد ہدایات تھیں جو گورکی سے جاری ہو رہی تھیں اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ پر عمل ہو رہا تھا۔ اس کی ہدایتوں کو پورا کرتے ہوئے محنت کشوں نے عظیم اور شاندار راستہ طے کیا۔ انقلاب سے پہلے بیشتر آبادی ناخواندہ تھی' انقلاب کے بعد تعلیم تیزی سے پھیلنا شروع ہوئی۔ صنعتی انقلاب برپا ہوا۔ عورتوں تک کو سیاسی اور معاشی مساوات حاصل ہو سکی۔

لینن کی حالت سنبھلنے لگی تھی اور یہ امید ہو چلی تھی کہ وہ جلد ہی گورکی سے ماسکو لوٹ جائے گا کہ اچانک 21 جنوری 1924ء کی شام کو اس کی حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں کے آنے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ دماغ کی کوئی رگ تھی جو زیادہ بوجھ نہ اٹھا سکی۔ اس نے جتنی ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی' اتنی ہی خاموشی سے اس کا انتقال ہو گیا۔

پارٹی کی انتظامیہ کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اجلاس کے بعد عوام کے نام ایک اپیل شائع کی گئی۔ یہ اپیل گویا لینن کی موت کا سرکاری اعلان تھا۔ اس اپیل میں کہا گیا تھا۔

''وہ انسان مر گیا جس کی قیادت میں ہماری بارود کے دھوئیں میں لپٹی ہوئی پارٹی نے مضبوط ہاتھ سے سارے ملک میں اکتوبر انقلاب کا سرخ پرچم لہرایا' بہادری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کیا اور سابق زار شاہی روس میں محنت کشوں کا مضبوط اقتدار قائم کیا۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل کا بانی' عالمی کمیونزم کا لیڈر' بین الاقوامی پرولتاریہ کا پیارا اور اس کے لیے باعثِ فخر' مشرق کے مظلوموں کا علم بردار اور روس میں مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ کا سربراہ مر گیا۔''

اس اپیل کے شائع ہوتے ہی لینن کی موت کی خبر سارے ملک اور دنیا بھر میں پھیل گئی۔ خبر سنتے ہی ماسکو کے شہری سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ہر زبان پر کامریڈ لینن زندہ باد کا نعرہ تھا۔

ابھی لینن کی لاش ماسکو نہیں پہنچی تھی کہ دیدار کرنے والوں سے سڑکیں بھر گئیں۔ شہریوں نے پوری رات سخت ترین سردی میں سڑکوں پر گزاری۔ اگلے دن (23 جنوری) اس کی لاش ماسکو لائی گئی اور ٹریڈ یونینوں کی عمارت کے ستونوں والے ہال میں رکھ دی گئی۔

موسم شدید سرد تھا۔ سخت برف باری ہو رہی تھی۔ موسم کی شدت کے باوجود لاکھوں مزدور' کسان' سرخ فوج کے سپاہی اور ملازمین' ستونوں والے ہال میں چار دن تک لینن کا دیدار کرتے رہے۔

26 جنوری کو بالشوئی تھیٹر میں سوویتوں کی دوسری کل یونین کانگریس ہوئی جو لینن سے منسوب تھی۔ سوویت یونین کی مرکزی انتظامیہ کمیٹی کے صدر نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''سوویت حکومت اپنی ساری سیاست میں خواہ اندرونی ہو یا بیرونی' لینن کی ہدایات پر ثابت قدمی سے عمل کرے گی۔''

اس کے بعد غم زدہ کروپسکایا نے محنت کشوں سے اپیل کی ''لینن کے جھنڈے' کمیونزم کے جھنڈے تلے متحد ہو جائیں۔''

اس کانگریس میں یہ فیصلہ بھی کیا کہ لینن کی یاد کو تازہ کیا جائے گی اور اس کی تصانیف کو دسیع پیمانے پر عوام میں پھیلایا جائے گا جو دنیا بھر میں کمیونزم کے خیالات پھیلانے کا باعث ہوں گی۔

اس کانگریس میں مزدوروں کی درخواست پر کانگریس نے سینٹ پیٹرسبرگ کا نام بدل کر لینن گراد رکھنے کا فیصلہ کیا۔

27 جنوری کو چار بجے دن کے وقت لینن کے تابوت کو لاکھوں سوگواروں کے ساتھ لال چوک لایا گیا۔ یہاں مقبرہ تیار تھا۔ سوویت لوگوں نے اسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہا اور اس کے جسم کو اس مقبرے کے حوالے کر دیا گیا۔

لینن نے زندگی بھر محنت اور کام کی تلقین کی تھی۔ مزدوروں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کے سوگ میں صرف پانچ منٹ کے لیے کام چھوڑنے کا اعلان کیا۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام بند رہا۔

لینن کی موت مزدور طبقے کے لیے بھاری نقصان تھا۔ اس نقصان کا ازالہ اسی طرح کیا جا سکتا تھا کہ اس کے پروگرام کو آگے بڑھایا جائے۔ اس کی پارٹی کو مضبوط کیا جائے۔ لاکھوں غیر پارٹی مزدور لینن کی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ چند ہی ہفتوں میں لاکھوں مزدور پارٹی میں آ گئے۔

تیس سال کی سیاسی سرگرمیوں کے دوران میں لینن نے سیکڑوں کتابیں اور پمفلٹ' ہزاروں مضامین اور خطوط لکھے اور اجتماعات میں بے شمار تقریریں کیں۔ اس کی یہ تصانیف کتابی صورتوں میں شائع ہوتی رہیں جو اس کی یادگار ہیں۔

برے سائڈ پلیس، گلاسگو میں واقع ہونے کے باوجود کسی اور شہر کا حصہ لگتا تھا۔ یہ مزدوروں کی آبادی پر مشتمل متوسط طبقے کے ماحول کا ایک ننھا سا جزیرہ ہے۔ ہر بلاک کی داخلی گزرگاہ کے دائیں اور بائیں ننھے باغات ہیں جو بے توجہی کا شکار ہیں۔

یکم اکتوبر 1982ء کو مزآئرین فرگوسن نامی ایک خاتون اپنے تین منزلہ فلیٹ میں کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھی ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی لہٰذا وہ گاہے گاہے کھڑکی سے نیچے سڑک کا جائزہ لے لیتی تھی۔ رات کے آٹھ بجے کسی ٹیکسی کی مخصوص آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس نے دیکھا ایک ٹیکسی مڑ کر برے سائڈ پلیس میں داخل ہوئی اور اس کی کھڑکی کے بالکل نیچے، فٹ پاتھ سے تقریباً چار فٹ کے فاصلے پر رکی۔ تاہم اس کا انجن اب بھی چل رہا تھا۔ ٹیکسی کی اندرونی روشنی کوئی دس سیکنڈ تک جلتی رہی اور پھر بند ہو گئی پھر بھی اندر سے کوئی برآمد نہیں ہوا۔

آئرین ٹیکسی پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی لیکن پندرہ منٹ گزر گئے اندر سے کوئی بھی برآمد نہیں ہوا۔ ''عجیب بات ہے۔ اس نے سوچا۔ ٹیکسی رک چکی تھی، تاریکی میں کھڑی تھی اور اس کے میٹر کی لائٹ اب بھی آن تھی۔ رفتہ رفتہ مسز آئرین کی دلچسپی

شامتِ اعمال

سیّد جاذب احتشام

بعض اوقات لوگ غیر اضطراری طور پر ایسے کام کر جاتے ہیں جن کی کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ انسانی فطرت کو سمجھنا آسان نہیں۔ لیکن پھر قدرت ہی کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا کردیتی ہے جس سے ہر معمّا حل ہوتا چلا جاتا ہے۔

''لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا'' لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا

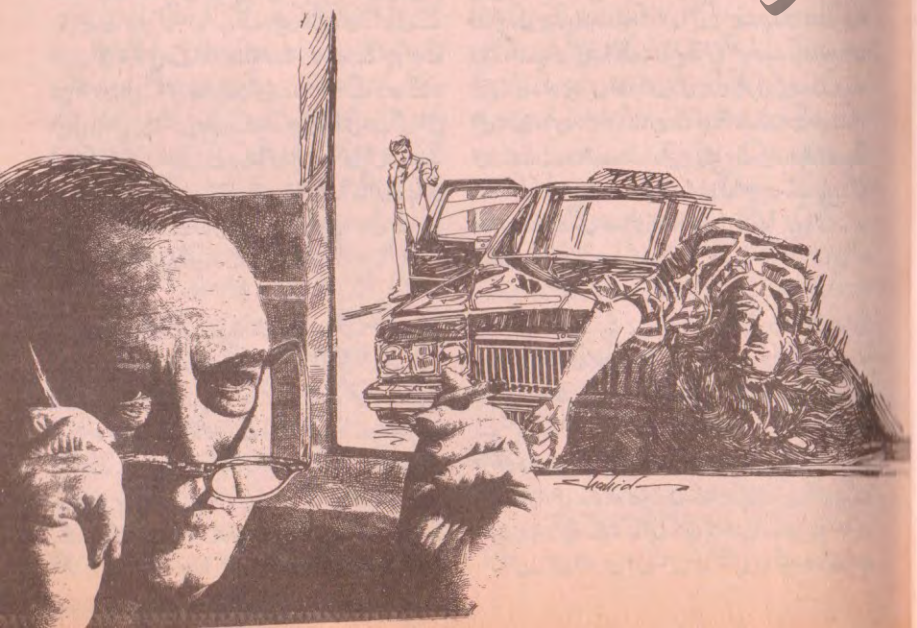

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

ختم ہوگئی اور وہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہوگئی لیکن اس کا اندازِ نشست ایسا تھا کہ وہ ٹیکسی کے آس پاس ہونے والی حرکات وسکنات سے آگاہ ہوسکتی تھی۔

آٹھ بج کر چالیس منٹ پر اچانک ٹیکسی کی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھلا، ایک کشیدہ قامت نوجوان برآمد ہوا اور چند سیکنڈ تک کھڑے رہ کر گہری نظروں سے آس پاس کا جائزہ لیتا رہا۔ ایسے میں آئرن کا شوہر بھی کھڑکی کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ نوجوان گھبراہٹ بھرے انداز میں بدستور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر ناگاہ اس نے نظر اٹھا کر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا اور چند سیکنڈ تک انہیں گھورتا رہا پھر تیزی سے مڑا اور سامنے والے فلیٹ کی داخلی گزرگاہ کی جانب بڑھ گیا۔ آئرن اور اس کے شوہر نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی اور دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ان کے تجسس کی تکمیل ہوگئی تھی۔

رات کے دس اور ساڑھے دس بجے کے درمیان مسٹر فرگوسن ایک بار پھر کھڑکی کے پاس گئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ٹیکسی اب تک وہیں کھڑی تھی اور پھر انہوں نے ٹیکسی مالکان ایسوسی ایشن، ٹی، او، اے کو ٹیلی فون پر مطلع کردیا اور سونے چلے گئے لیکن رات کا ایک بج گیا انہیں نیند نہیں آئی۔ انہیں سگریٹ کی طلب ہورہی تھی اور سگریٹ ختم ہوگئے تھے۔ چنانچہ وہ اسٹور سے سگریٹ خریدنے کی غرض سے گھر سے نکل گئے۔ انہوں نے جونہی فٹ پاتھ پر قدم رکھا، انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ٹیکسی اب تک وہیں کھڑی تھی۔ انہوں نے قریب پہنچ کر ٹیکسی کے اندر جھانکا اور پھر سامنے کے کمپارٹمنٹ میں نظر دوڑائی۔ ٹیکسی بظاہر خالی تھی۔ وہ مڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ان کی واپسی پینتالیس منٹ کے بعد ہوئی۔ ٹیکسی اب بھی اسی طرح کھڑی تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ میٹر اب بھی چل رہا ہے۔ ایکسی پاؤنڈ کرایہ ظاہر کررہا تھا۔ انہیں خیال گزرا کہ ممکن ہے کوئی اس ٹیکسی کو اغوا کرکے وہاں چھوڑ گیا ہو چنانچہ انہوں نے رتھر گلین پولیس اسٹیشن کو فون کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

اس دوران وہاں سے دو میل دور کار مائل ڈسٹرکٹ میں ایک گم شدہ ٹیکسی کی ڈرامائی تحقیق نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ایڈی نامی ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی بارہ گھنٹے کی شفٹ ختم کرکے سیدھا اپنے گھر روانہ ہوگیا تھا جو ''نے اسمتھ ڈرائیو'' میں واقع تھا۔ ایڈی کے پاس دو ٹیکسیاں تھیں۔ ایک وہ چلاتا تھا اور دوسری اس کی بیوی چلاتی تھی۔ دونوں کی ڈرائیونگ کے اوقات یکساں تھے۔ وہ بھی ایڈی کی طرح رات کے نو بجے اپنی شفٹ ختم کرکے گھر چلی جاتی تھی۔ ایڈی اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ ایک بڑے شہر میں کسی جوان عورت کے ٹیکسی چلانے میں کتنے خطرات پوشیدہ تھے چنانچہ اس نے اپنی چھتیس سالہ جوان اور پرکشش بیوی کیتھی کو سختی سے تاکید کررکھی تھی کہ حالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ ہرصورت میں رات کے نو بجے کے اندر اندر اپنی شفٹ ختم کرکے گھر آجایا کرے لیکن اس رات وہ گھر پہنچا تو کیتھی خلافِ توقع موجود نہیں تھی۔ وہ ساڑھے نو بجے تک نہایت بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اس کا انتظار کرتا رہا اور پھر اپنی ایسوسی ایشن کے کنٹرول روم سے رابطہ قائم کرکے کہا کہ وہ کیتھی کی ٹیکسی سے رابطہ قائم کرکے اس کا اتا پتا معلوم کرے۔ ڈسپیچر نے فوری عمل کیا اور پھر ہر پانچ منٹ کے بعد رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن کیتھی کی ٹیکسی سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ کسی دوسرے ڈرائیور کو بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے شام میں کیتھی کو دیکھا تھا یا نہیں۔ رات کے دس بجے تک ایڈی کی پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ وہ اس امکان پر غور کرنے لگا کہ کیتھی کو کوئی حادثہ پیش آگیا ہے اور تب اس نے پولیس کو فون کردیا۔

☆☆☆

مسٹر فرگوسن کے فون کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک گشتی پولیس کار، برے سائڈ پلیس میں داخل ہوئی اور اس مشکوک ٹیکسی کے پاس آ کر رک گئی۔ ایک کانسٹیبل کار سے اتر کر ٹیکسی کے پاس گیا۔ اس نے پہلے اگلے اور پھر پچھلے کمپارٹمنٹ کو چیک کیا۔ پھر ڈرائیور کی سیٹ والا دروازہ کھولا۔ اس کی سیٹ پر رکھی ہوئی ایک زنانہ وگ پڑی تھی۔ ڈیش بورڈ، گلائو کمپارٹمنٹ، قلم، نوٹ بک اور اسی طرح کی دیگر چیزیں قطار میں رکھی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے اپنی ٹارچ روشن کرلی اور سامان کے کمپارٹمنٹ میں جھانکا۔ اگلے ہی لمحے مارے دہشت کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہاں بوٹے سے قد کی کوئی عورت منہ کے بل گٹھری کی صورت میں پڑی تھی اور اس کے سر کا عقبی حصہ اس کا بلاؤز اور اس کے آس پاس کی ہر شے خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

صبح کے چار بجے برے سائڈ کی خوابیدہ فضا میں سراغ رسانوں کی بھرّائی ہوئی آوازیں، پولیس ریڈیو کی کھڑکھڑاہٹ اور ان کی کاروں کے انجن کا شور در آیا۔ ایسے میں پولیس سرجن نے کیتھی کے خون آلود جسم کا معائنہ کیا اور تصدیق کردی کہ وہ مرچکی تھی۔ اسے قتل کیا گیا تھا۔ پھر لاش مردہ خانے بھیج دی گئی۔ اس کے چند ہی لمحے بعد لیبارٹری کے ماہرین اور ایک فنگر پرنٹس کا ماہر وہاں پہنچ گئے تاکہ اس ٹیکسی کا اندر اور باہر سے معائنہ کرسکیں۔ تین افسران اس کیس کی تفتیش کی قیادت کررہے

تھے۔ چیف سپرنٹنڈنٹ موریسن، سپرنٹنڈنٹ اسمتھ اور چیف انسپکٹر جیک..... اس ٹیکسی کے بازیافت ہونے تک پولیس کو ایڈی کی یہ رپورٹ مل چکی تھی کہ اس کی بیوی لاپتا ہے۔ اگرچہ اس ٹیکسی میں پائی جانے والی مردہ عورت کا حلیہ، گم شدہ کیتھی کے حلیے سے ملتا جلتا تھا اور اس ٹیکسی کا نمبر بھی وہی تھا جو ایڈی نے بتایا تھا، ٹیکسی کے اندر پائی جانے والی چیزیں بھی وہی تھیں جن کے بارے میں ایڈی نے پولیس کو آگاہ کیا تھا اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ مقتولہ کیتھی ہی تھی پھر بھی پولیس نے کیتھی کے دوشتے داروں کو اس کی شناخت کے لیے طلب کرلیا اور انہوں نے کیتھی کو شناخت کرلیا۔ اس طرف سے مطمئن ہوکر پولیس نے بدنصیب شوہر کو اس سانحے سے مطلع کردیا۔

قاتل نے مقتولہ کی پیٹھ پر ایک اور سینے پر چار وار کیے تھے اور ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل نے ہر وار میں چاقو دستے تک اتار دیا تھا۔ حملہ عقب سے کیا گیا تھا پھر قاتل نے مقتولہ کو کٹھری کی شکل میں سامان کے کمپارٹمنٹ میں ٹھونس دیا تھا۔ کوئی شے غائب نہیں ہوئی تھی لہٰذا قتل کا بظاہر کوئی محرک نظر نہیں آتا تھا۔ تفتیش کا آغاز برے سائڈ پلیس کے باشندوں سے پوچھ گچھ سے ہوا۔

سب سے پہلے مسٹر اور مسز فرگوسن سے پوچھ گچھ کی گئی۔ انہوں نے نہ صرف قتل کے وقت کا تعین کیا بلکہ نہایت اعتماد سے یہ بھی کہا کہ اگر وہ شخص انہیں دوبارہ نظر آجائے جسے انہوں نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا تو وہ اسے پہچان لیں گے۔ انہوں نے اس شخص کا جو حلیہ بتایا وہ قدرے مبہم تھا۔ تاہم وہ اس بات پر متفق تھے کہ اس کی عمر پچیس سے اٹھائیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کا قد آٹھ انچ سے لے کر پانچ فٹ دس انچ تک رہا ہوگا۔ وہ چھریرے جسم کا مالک تھا۔ بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔ اس کے جسم پر گہری نیلی اور سیاہ رنگ کی پتلون اور گہرے رنگ کی جیکٹ تھی۔

گھر گھر کی تفتیش کے دوران پولیس یہ جان کر حیرت زدہ رہ گئی کہ اس قتل کا ایک عینی گواہ بھی تھا اور وہ ایک گیارہ سالہ لڑکا تھا جو گراؤنڈ فلور کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ وہ ٹیکسی اس کے فلیٹ کے سامنے رکی تھی۔

''میں اپنی خواب گاہ کی کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔'' اس نے کہا ''مجھے ایسا لگا کہ ٹیکسی کے اندر ڈرائیور اور مسافر کے درمیان زبردست ہاتھا پائی ہورہی ہو۔''

اگرچہ اس کے والدین بھی اس وقت گھر پر موجود تھے مگر اس نے بہ وجوہ ان کا ذکر نہیں کیا۔

''یہ واقعہ کس وقت پیش آیا؟'' ایک سراغ رساں نے پوچھا۔

''تقریباً آٹھ بجے۔'' لڑکے نے جواب دیا۔

اس کا یہ بیان دو اعتبار سے نہایت اہمیت اختیار کرگیا۔ ایک تو یہ کہ اس سے کیتھی کی موت کے وقت کا تعین ہوجاتا تھا اور یہ بھی ثابت ہوجاتا تھا کہ جس شخص کو مسٹر اور مسز فرگوسن نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا، وہی قاتل تھا لیکن جو یات سراغ رسانوں کو پریشان کررہی تھی وہ یہ تھی کہ قاتل کیتھی کو قتل کرنے کے بعد اتنی دیر تک ٹیکسی میں کیوں بیٹھا رہا؟ کہیں وہ پاگل تو نہیں تھا جو قتل کے بعد چالیس منٹ تک مقتولہ کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا رہا جبکہ وہ زبردست خطرات میں گھرا ہوا تھا؟ اس خیال کے تحت ایک درجن ذہنی اسپتالوں کو چیک کیا گیا۔ وہ لوگ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ یکم اکتوبر کی رات کوئی مریض وہاں سے فرار تو نہیں ہوا تھا یا کسی کام سے باہر تو نہیں گیا تھا؟ ساتھ ہی وہ ماہر نفسیات سے اس شخص کی ذہنی کیفیت کے بارے میں سوال وجواب بھی کرنا چاہتے تھے جو پولیس کو مطلوب تھا۔ ڈاکٹروں کے بیان کے مطابق قاتل نے جس بربریت کا ثبوت دیا تھا اور جسطرح وہ مقتولہ کے ساتھ بیٹھا رہا تھا، اس سے اس کی شدید جنسی خواہش اور بے راہ روی کا اظہار ہوتا تھا۔ ایسا مریض صنفِ نازک کے جسم کے کسی بھی مخصوص حصے کو اپنی بربریت کا نشانہ بنا کر تسکین حاصل کرتا ہے۔ انہوں نے جیک کو خبردار کیا کہ اگر یہ جنونی گرفتار نہ ہوا تو وہ دوبارہ کسی کو اپنا نشانہ بنائے گا۔

پولیس کی نگاہ میں وہ ٹیکسی نہایت اہمیت کی حامل تھی کیونکہ کیتھی اپنی ٹیکسی کو بالکل بے داغ رکھتی تھی۔ پولیس کا خیال تھا کہ قاتل اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا ہوگا جس کا پتا چلانا آسان ہوگا لیکن انہیں سخت ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ فنگر پرنٹ کا عملہ انگلیوں کا ایک بھی نشان حاصل نہ کرسکا۔ لیبارٹری کے ماہرین کو بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ انہوں نے ٹیکسی کے اندرونی حصے کا ایک ایک انچ کا معائنہ کرنے کے علاوہ ایش ٹرے اور دیگر چیزوں کا بھی معائنہ کیا تھا۔ سگریٹ کے ٹکڑوں، گرد اور ریشے وغیرہ کی بھی جانچ پڑتال کی تھی۔ مقتولہ کے کپڑوں کا بھی معائنہ کیا تھا لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

گھر گھر تفتیش کے دوران پولیس کے علم میں یہ بات آئی کہ قتل کے وقت کئی خواتین اپنے گھروں میں ''مہمانوں کی تواضع'' کرنے میں مصروف تھیں لہٰذا پولیس یہ غور کرنے پر مجبور ہوگئی کہ ممکن ہے ان ''مہمانوں'' نے کچھ دیکھا ہو جس سے اس قتل کی تفتیش میں کچھ مدد ملے۔ ابھی ان مردوں کو ڈھونڈنا اور شاملِ تفتیش کرنا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ یکم اکتوبر کی اس شب کئی گھروں میں تقریبات ہورہی تھیں اور ایک گھر میں کم سے کم بیس مہمان تھے۔ انہیں بھی ڈھونڈنا اور شاملِ تفتیش کرنا

تھا۔ تفتیش کے پہلے چار روز نہایت مایوس کن ثابت ہوئے۔ قاتل کے جسم، حلیے کے سوا کوئی سراپولیس کے ہاتھ نہ آیا۔ دن ہفتے اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے۔ پولیس جہاں تھی، وہیں رہی۔ حالانکہ وہ روزِ اول کی طرح اس کیس کو حل کرنے کی کوشش کررہی تھی تاہم اب انسران میں مایوسی اور بددلی پھیلنے لگی تھی اور سراغ رسانوں کو یہ فکر لاحق ہوتی جارہی تھی کہ کہیں قاتل ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ مقتولہ کے شوہر اور ٹیکسی ڈرائیور نے چار ہزار پاؤنڈ کی خطیر رقم قاتل کو پکڑنے یا اس کی گرفتاری پر پولیس کی مدد کرنے والوں کے لیے مقرر کردی تھی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

☆☆☆

3 دسمبر کی صبح سراغ رساں جیک پولیس اسٹیشن سے اپنی کار میں سوار ہوا۔ اسے ایک پولیس کانج میں لیکچر دینا تھا۔ اس کا رخ شمال کی طرف تھا۔ راستے میں اس کے ریڈیو سے کسی گم شدہ فرد کی رپورٹ نشر ہونے لگی۔ اس نے سنا، وہ رپورٹ ایک اڑتالیس سالہ نرس الزبتھ والٹن کے بارے میں تھی جو گزشتہ شب تقریباً گیارہ بجے لاپتا ہوگئی تھی۔ وہ ''اسٹیو آرٹن ڈرائیو'' کی رہنے والی تھی۔ جیک اس عورت سے قطعی واقف نہیں تھا مگر اس کا پتا اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔ اسٹیو آرٹن ڈرائیو..... اسٹیو آرٹن ڈرائیو..... اس نے یہ نام پہلے کہاں سنا تھا یہ پتا کچھ دیر تک اس کے دماغ میں کھلبلی مچاتا رہا اور پھر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور لیکچر کے بارے میں سوچنے لگا جو اسے کانج میں دینا تھا۔ پھر بھی وہ بتابار بار اس کے ذہن میں ابھرتا چلا آرہا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا۔ اسٹیو آرٹن ڈرائیو برے سائڈ سے صرف ایک چوتھائی میل پر، کیمبس لنگ کے علاقے میں واقع تھا۔ برے سائڈ بھی اسی علاقے میں واقع تھا اور تب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ پتا اس کے ذہن میں کیوں کھٹک رہا تھا اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے..... ماہرینِ نفسیات نے اسے خبردار کیا تھا کہ قاتل پھر کسی کو نشانہ بنا سکتا ہے اور وہ گمشدہ عورت اس علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شاید ماہرینِ نفسیات کے خدشات درست ثابت ہوئے تھے لیکن وہ دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ یہ بات درست نہ ہو۔

گلاسگو واپس آنے کے بعد بھی وہ یہی سوچتا رہا تھا۔ اسی روز دن کے گیارہ بجے ایک دس سالہ بچہ گیند کی تلاش میں اپنے اسکول کی دیوار پر چڑھا۔ گیند اس کے احاطے سے باہر چلی گئی تھی جہاں اونچی اونچی گھاس اگی ہوئی تھی اور قریب ہی ریلوے لائن گزرتی تھی۔ دوسرے دس سالہ بچے نے بھی پہلے بچے کی تقلید کی اور دونوں گھاس میں کود کر گیند ڈھونڈنے لگے۔ انہیں ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک بچہ اچانک دہشت سے چیخ اٹھا اور اسکول کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ساتھی بھی کچھ سمجھے بغیر اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔ دونوں اسکول کے ایک ٹیچر کے پاس پہنچ گئے۔ ''وہاں جھاڑیوں میں ایک عورت پڑی ہے۔'' پہلا بچہ دہشت سے کانپتا ہوا چیخا ''ایک برہنہ عورت پڑی ہے۔'' وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

☆☆☆

آرتھر گلمین پولیس اسٹیشن کے افسران یہ اطلاع پاتے ہی چوکنے ہوگئے۔ انہوں نے فوراً یہ اطلاع اسٹیو آرٹن ڈرائیو کے سراغ رسانوں کو بھیج دی جو پہلے گم شدہ الزبتھ والٹن کا سراغ لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ فوراً وہاں پہنچ گئے جہاں لمبی لمبی گھاس اور خودرو جھاڑیوں نے ان کا استقبال کیا۔ لیکن وہ ذہنی طور پر کسی ایسے منظر کو دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ان جھاڑیوں میں ایک ادھیڑ عمر مردہ عورت بالکل برہنہ حالت میں پشت کے بل پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم میں ایک ڈوری لپٹی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں پر کپڑے سے کاٹے گئے لاتعداد گہرے زخم تھے۔ جسم کے آس پاس اس کے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک نہایت سفاکانہ اور بہیمانہ قتل تھا۔

بعد میں وہ عورت الزبتھ والٹن کی حیثیت سے شناخت کرلی گئی۔ سراغ رساں جیک نے اس امر سے اتفاق کیا کہ نرس الزبتھ والٹن کو جس طرح چیر پھاڑا گیا تھا، وہ کسی جنونی کی کارستانی ہوسکتی تھی۔ اس کا ان کا منظر اس بات کا گواہ تھا کہ کیتھی کی طرح الزبتھ والٹن کو بھی اسی جنونی قاتل کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

شروع شروع میں ان دونوں وارداتوں کا آپس میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن وسیع زاویے سے دیکھنے پر جیک کو کئی باتیں مشترک نظر آئیں۔ مثال کے طور پر دونوں قتل ایک ہی علاقے میں ہوئے تھے۔ دونوں عورتیں بوٹے قد اور چھریرے جسم کی مالک تھیں۔ دونوں وارداتیں رات میں ہوئی تھیں۔ دونوں عورتوں پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا۔ ان کی آبروریزی کی گئی تھی اور قتل کا بظاہر کوئی محرک نظر نہیں آتا تھا۔

الزبتھ والٹن کے قتل کو قدرت کی ستم ظریفی ہی کہا جاسکتا تھا۔ کیونکہ وہ حال ہی میں ایک طویل علالت سے صحت یاب ہوئی تھی اور اپنے ڈاکٹر کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ مکمل طور پر صحت یاب ہوگئی ہے، اس نے 3 دسمبر کی رات اپنی ایک سہیلی کے ساتھ سیر و تفریح کا پروگرام بنایا تھا۔ ان دونوں سہیلیوں نے وہ شام گلاسگو کے ایک ریستوران میں گزاری تھی جہاں انہوں نے کھانا کھایا تھا اور ڈرنک کیا تھا۔ دونوں سہیلیاں تقریباً

ساڑھے سات بجے ریستوران پہنچی تھیں اور تقریباً سوا دس بجے تک وہاں بیٹھی رہی تھیں لیکن ریستوران سے نکل کر گھر پہنچنے کے لیے ٹرین پکڑنے سے پہلے الزبتھ نے اپنی بیٹی کو فون کرنا چاہا تھا تاکہ وہ کیمبس لنگ اسٹیشن آکر اسے وہاں سے پک کرلے لیکن ریستوران کا فون خراب تھا لہٰذا وہ فون کرنے سے قاصر رہی۔ اس کی سہیلی نے گلاسگو سینٹرل اسٹیشن سے رات کے ساڑھے دس بجے ٹرین پکڑی اور وہ گیارہ بج کر دو منٹ پر کیمبس لنگ پہنچ گئی تھی۔ دونوں سہیلیاں اسٹیشن ہی پر ایک دوسرے سے جدا ہوگئی تھیں۔ الزبتھ نے اپنے گھر کا رخ کیا تھا اور نارتھ ایونیو کی طرف مڑ گئی تھی اور پھر ویسٹ کورٹس روڈ پر گامزن ہوگئی تھی۔ یہ سڑک دور تک سنسان تھی۔ الزبتھ تنہا تھی۔ اسٹیو آرٹن ڈرائیو وہاں سے صرف 80 گز کے فاصلے پر تھا اور اس مقام پر کسی نے لفٹ مانگنے کے لیے اس کا ہاتھ پرے اسے گھنی جھاڑیوں میں کھینچ لیا تھا جس کا سلسلہ نشیب میں پھیلتا ہوا، ریلوے لائن تک چلا گیا تھا۔

جب وہ رات کے ساڑھے بارہ بجے تک گھر نہیں لوٹی تو اس کے شوہر کو تشویش ہوئی۔ الزبتھ شاذونادر ہی گھر سے نکلتی تھی اور کبھی دیر سے نہیں لوٹتی تھی۔ اس کا شوہر کھلی کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا اور نہایت بے چینی سے اسٹیو آرٹن ڈرائیو کی جانب دیکھنے لگا۔ بالآخر وہ اپنی کار میں سوار ہوکر کیمبس لنگ اسٹیشن پہنچ گیا جہاں یہ تصدیق ہوگئی کہ آخری ٹرین جا چکی تھی۔ گھر واپس جاتے ہوئے اس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ وہ کسی سہیلی یا پڑوسی سے لفٹ لے کر گھر پہنچ جائے یا پھر ممکن ہے، اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی گئی ہو لیکن سوال یہ تھا کہ اس نے فون کیوں نہیں کیا؟

اسی پریشانی کے عالم میں صبح کے چار بج گئے۔ تب اس نے الزبتھ کی اس سہیلی کو فون کیا جس کے ساتھ وہ باہر گئی تھی۔ اسے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ الزبتھ گیارہ بج کر دو منٹ پر کیمبس لنگ اسٹیشن پہنچ گئی تھی۔ شوہر نے فوراً آرتھر گلمین پولیس کو فون پر اس واقعہ سے مطلع کیا۔ ''نتیجہ ان تینوں سراغ رسانوں، موریسن، اسمتھ اور جیک نے جو کیتھی کے قتل کی تفتیش کررہے تھے اس کیس کی تفتیش بھی اپنے سر لے لی اور سوا فسران کو تحقیق پر مامور کردیا گیا۔

☆☆☆

پہلے کی طرح انہوں نے متوفیہ کے دوستوں اور رشتے داروں سے پوچھ گچھ شروع کی اور پھر ویسٹ کورٹس روڈ پر پھیلے ہوئے سیکڑوں گھروں کی طرف اپنی تفتیش کا رخ موڑ دیا۔ وہ ہر گھر سے پوچھ رہے تھے کہ کیا انہوں نے رات گیارہ بجے کے قریب کسی کو اسکول کے پاس دیکھا تھا یا کوئی آواز سنی تھی؟ انہوں نے علاقے کے سارے نوجوانوں کو موقع واردات سے اپنی عدم موجودگی کا ثبوت اور اس کی تفصیل پیش کرنے کو کہا کہ وہ اس وقت کہاں تھے؟ اس کیس میں بھی ٹیکسی ڈرائیوروں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ممکن ہے ان میں سے کسی نے سینٹرل اسٹیشن سے سواری اٹھائی یا اتاری ہو اور مسز الزبتھ کو دیکھا ہو۔ اس کے علاوہ گلاسگو کے اس ریستوران کے اسٹاف، محافظوں اور اس رات گلاسگو سینٹرل اسٹیشن پر شبینہ ڈیوٹی پر موجود کلرکوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی۔ اس ٹرین میں سفر کرنے والے درجنوں مسافروں کا بھی پتا چلا لیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ یہ بیان داخل کریں کہ انہوں نے دورانِ سفر کیا دیکھا تھا؟ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ سامنے آئیں اور قاتل کا سراغ لگانے میں پولیس کی مدد کرنے کے خیال سے کوئی اطلاع خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم اور معمولی کیوں نہ ہو، فراہم کریں۔ ویسٹ کورٹس روڈ پر ایک پولیس چوکی قائم کردی گئی اور دو کانسٹیبل بٹھا دیے گئے جو چوبیس گھنٹے عوام کی طرف سے موصول ہونے والی اطلاع کو نوٹ کررہے تھے لیکن تین دن گزر جانے کے باوجود کوئی کام کی بات سامنے نہیں آئی۔ پولیس اب تک دو ہزار سے زیادہ افراد سے پوچھ گچھ کرچکی تھی لیکن درجنوں گواہان کے بیانات مبہم اور اسکول کے آس پاس نظر آنے والے درمیانی عمر کے کسی شخص کا بیان کردہ حلیہ یا تو نامکمل تھا یا پھر ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لیکن 6 دسمبر کی شام سیاہ بالوں کا مالک ایک کشیدہ قامت جوان شخص پولیس چوکی میں داخل ہوا۔

''میرے پاس کچھ اطلاعات ہیں۔'' وہ بولا ''ممکن ہے، ان کی روشنی میں قاتل کا سراغ لگ سکے۔''

''وہ کیا؟'' ایک کانسٹیبل نے پوچھا۔

''میں 3 دسمبر کی رات کو تقریباً پونے گیارہ بجے فنڈلے بار سے نکل کر ویسٹ کورٹس روڈ کے نشیب میں پیدل چلتا ہوا، کرک ہل بار کی طرف جارہا تھا۔'' وہ بولا ''ایسے میں، میں نے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر براؤن سائڈ روڈ اور ڈگلس ڈرائیو کی طرف سے ایک شخص کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ شخص اتنا مشکوک اور خطرناک قسم کا لگ رہا تھا کہ میں اس سے بچنے کے لیے سڑک عبور کرنے پر مجبور ہوگیا۔''

''تمہارا نام۔'' دوسرے کانسٹیبل نے پوچھا۔

''آئن اسکاڈلر۔'' اس نے بتایا ''میں ایک فورک لفٹ ڈرائیور ہوں میں کرک ہل بار پہنچا تو سہی مگر مجھے اتنی دیر ہوگئی تھی کہ پینے کو کچھ نہ مل سکا اور میں وہاں سے سیدھے اپنے گھر چلا گیا جو وہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر کرکٹن روڈ پر واقع ہے۔ وہ اجنبی پھر مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔''

''اس کا حلیہ بتاؤ۔''

''قد پانچ فٹ دس انچ، جسمانی ساخت درمیانہ، جسم پر گہرے رنگ کا جیکٹ، سیاہ بال، عمر تقریباً 25 سال۔''

''تمہارے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ۔'' ایک کانسٹیبل نے کہا جو اس کا بیان نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ پھر وہ بیان ایک فائل میں موجود دیگر وں افراد کے بیان کے درمیان رکھ دیا گیا۔

اگلے روز سراغ رساں حضرات گزشتہ روز کی رپورٹ کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کی توجہ اچانک آئن کے بیان کی طرف مبذول ہوگئی۔ انہوں نے اس کے بیان کو نہایت دلچسپی سے پڑھا اور تئیس سالہ نوجوان سے مزید پوچھ گچھ کا فیصلہ کرلیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پوچھ گچھ کارآمد ہوسکتی تھی۔ اگر اس سے براہِ راست سوال و جواب کیا جاتا تو ممکن ہے وہ اور بھی باتیں بتاتا جو مدد گار ثابت ہوسکتیں۔ چنانچہ کانسٹیبل میک اور ہڈسن 70 کرکٹن روڈ پہنچ گئے جہاں اسکاؤلر اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ لیکن وہ کام پر گیا ہوا تھا چنانچہ وہ دونوں کانسٹیبل اس کی ماں سے باتیں کرنے لگے۔ اس عورت کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ قتل کی ان وارداتوں کے بارے میں بہت فکرمند تھی۔ انہوں نے اسے بتایا کہ اس کے بیٹے سے ایک بیان کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو اس نے گزشتہ شام فلم بند کرایا تھا۔ وہ اس سے صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اسے اس اجنبی کے متعلق کچھ اور یاد ہے جسے اس نے 3 دسمبر کی رات دیکھا تھا۔ ان کے یہ پوچھنے کا انداز بالکل دوستانہ تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ مسز اسکاؤلر کے منہ سے اپنے بیٹے کی اس رات کی سرگرمیوں کے بارے میں ایک غیر متوقع بات نکل گئی۔ اس نے قدرِ ناراض ہوتے ہوئے کہا کہ 3 دسمبر کی رات اس کا بیٹا دیر سے گھر لوٹا تھا۔ وہ بہت بے چینی سے اس کا انتظار کرتی رہی تھی لیکن جب رات کا ایک بج گیا اور وہ گھر نہیں لوٹا تو وہ کار میں سوار ہو کر اسے ڈھونڈنے نکل پڑی لیکن ابھی وہ سوگز ہی گئی ہوگی کہ اسے آئن گھر کی طرف آتا ہوا نظر آ گیا۔

میک اور ہڈسن نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کر کے یہ یاد دہانی کراتے ہوئے نکل گئے کہ وہ اپنے بیٹے کو مقامی پولیس اسٹیشن پہنچنے یا فون کرنے کے لیے کہہ دے۔

☆☆☆

دوسرے دن آئن پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ میک اور ہڈسن نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنا وہی بیان دہراؤ۔'' میک نے کہا۔ ''ممکن ہے تمہیں کوئی ایسی بات یاد آ جائے جو تم کل بتانا بھول گئے تھے۔''

آئن نے اس کے جواب میں اپنا بیان کسی اضافے یا ترمیم کے بغیر لفظ بہ لفظ دہرا دیا۔

''تمہارا گھر کرک ہل بار سے کتنی دور ہے؟'' ہڈسن نے پوچھا۔

''تقریباً دو سو پچاس گز۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تم نے ڈرنک نہ ملنے پر بار سے نکل کر سیدھے گھر کی راہ لی تھی؟'' ہڈسن نے دوسرا سوال کیا۔

''ہاں۔'' وہ بولا۔

''اس میں کتنا وقت لگا ہوگا؟'' میک نے پوچھا۔

''دس یا پندرہ منٹ۔''

''یعنی تم گیارہ بیس یا ساڑھے گیارہ بجے کے قریب گھر پہنچ گئے تھے؟''

''ہاں تقریباً اتنے ہی بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن تمہاری ماں کا کہنا ہے کہ تم رات کے ایک بجے گھر پہنچے تھے؟'' ہڈسن بول پڑا۔

''کیا کہا؟ ایک بجے؟'' وہ تضحیک آمیز لہجے میں بولا ''نہیں، یہ درست نہیں۔''

''تمہاری ماں کو یہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔'' ہڈسن نے کہا ''جب تم ایک بجے تک گھر نہیں لوٹے تو وہ پریشان ہو کر تمہیں ڈھونڈنے نکل پڑی تھی۔''

آئن تیس سیکنڈ تک بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پھر گویا اچانک اسے یاد آ گیا اور اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ ''تمہارا کہنا درست ہے۔'' وہ بولا ''اسی رات میں اپنے ایک دوست کے یہاں ویڈیو دیکھنے چلا گیا تھا۔ اب مجھے یاد آیا اسی وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے اس رات ڈرنک بھی کیا تھا۔''

''اور وہ 3 دسمبر کی رات تھی..... وہی رات جب تمہیں وہ شخص ریسٹ کورٹس روڈ پر نظر آیا تھا؟ تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں۔ یقین ہے!''

اس کا دوسرا بیان پہلے بیان سے مختلف تھا لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ بقول اس کے وہ اس رات پیتا رہا تھا اور عام آدمی ایسے وقت کا حساب نہیں رکھ سکتا۔ تاہم پولیس کو اس کا بیان چیک کرنا تھا کہ وہ ویڈیو دیکھنے اپنے کسی دوست کے ہاں گیا تھا یا نہیں۔

جب پولیس اس دوست کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ وہ دوست لندن نقلِ مکانی کر چکا تھا۔ پولیس کو اس کے بارے میں اتنا معلوم ہوسکا کہ وہ ہیرو HARROW گیٹ کے علاقے

میں کہیں رہائش پذیر تھا۔ یہاں اس گھر میں ایسا کوئی آدمی نہیں تھا جو آئن کے بیان کی تصدیق کرسکتا۔ پولیس نے بھی اس کی مزید تفتیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ابھی بہت سی اہم باتوں کی تفتیش کرنا باقی تھی۔

23 دسمبر کو پولیس پھر آئن کے گھر پہنچ گئی اور اس کے کئی کپڑے اٹھا لائی۔ یہ کپڑے لیبارٹری کے حوالے کر دیے گئے جہاں ڈاکٹر بل راجر کی قیادت میں سائنس دانوں کی ایک ٹیم موجود تھی جو پورے یورپ میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر بدطولیٰ رکھتی تھی۔ پولیس جو کپڑے لے کر آئی تھی۔ اس میں دو پتلونیں، جوتے، دو جیکٹ، دستانے اور قمیص شامل تھی لیکن پولیس نے آئن کے وارڈروب سے جو شے سب سے پہلے نکالی وہ نیلے رنگ کی ایک جیکٹ تھی اور سائنس داں حضرات اس جیکٹ کا معائنہ کرنے کے لیے بے چین تھے۔

سراغ رسانوں کو مقتولہ الزبتھ کے گلے میں ایک ڈوری لپٹی ہوئی ملی تھی اور چونکہ یہ طے ہو چکا تھا کہ وہ ڈوری مقتولہ کی نہیں تھی بلکہ یقیناً اس کا تعلق قاتل سے تھا۔ پہلی ہی نگاہ میں وہ ڈوری کسی جیکٹ کے نیچے کمر کے گرد کھینچی جانے والی ڈوری لگی تھی۔ پولیس 4 دسمبر سے کسی ایسی جیکٹ کی تلاش میں شہر کی دکانیں چھان رہی تھی جس میں کمر کے گرد دیسی ہی ڈوری ہو لیکن ایسی جیکٹ کی بات تھی کہ انہیں ایسی کوئی جیکٹ نہیں مل سکی تھی۔

24 دسمبر کو جب پولیس نے آئن کے وارڈروب سے نیلے رنگ کی وہ جیکٹیں نکالیں تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جیکٹ اگرچہ خاصی نئی تھی لیکن اس کے گلے اور کمر کی ڈوری ندارد تھی۔ گلے کی ڈوری ان کے لیے بے حد اہم تھی کیونکہ کمر کی ڈوری ان کے پاس تھی جو مقتولہ کے گلے میں لپٹی ہوئی ملی تھی اور وہ اس ڈوری کو گلے کی ڈوری سے ملا کر اس نتیجے پر پہنچ سکتے تھے کہ وہ دونوں ایک ہی جیکٹ کی تھیں۔ اب ان کے لیے اس قسم کی جیکٹ کا حصول ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس کے دیگر کپڑوں میں پولیس کو ایسی کوئی شے نہیں ملی جو مشکوک تصور کی جاسکتی۔

☆☆☆

یہ جنوری 1983ء کا ذکر ہے۔ اس وقت تک پولیس بالآخر آئن کے اس دوست کا سراغ لگا چکی تھی جو نقلِ مکانی کر کے انگلینڈ چلا گیا تھا۔ سراغ رسانوں نے اس سے 3 دسمبر کی رات کو اس کی سرگرمیوں کے بارے میں سوالات کیے۔ اس نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا لیکن اس کے بیان میں آئن کا کوئی ذکر نہ تھا۔

''تمہارے ایک دوست آئن کا کہنا ہے کہ وہ اس رات تمہارے یہاں وڈیو دیکھتا رہا تھا۔'' ایک سراغ رساں نے کہا۔

''اس میں کوئی صداقت نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ جھوٹ بولتا ہے۔''

اب سراغ رسانوں نے یہ معاملہ صاف کرنے کے لیے کہ آئن کو 3 اور 4 دسمبر کی درمیانی رات کو گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان کہاں تھا، اس سے تیسری مرتبہ انٹرویو لینے کا اہتمام کیا۔ اس انٹرویو میں آئن نے تسلیم کیا کہ اس نے وڈیو دیکھنے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ اس نے اپنے اس بیان میں دعویٰ کیا کہ وہ اصل میں یمبس لنگ پارک میں تنہا بیٹھا اپنی محبوبہ کے بارے میں سوچتا رہا اور پریشان ہوتا رہا تھا جس سے اس کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔

''پھر تم نے پہلے جھوٹ کیوں بولا تھا؟'' ایک سراغ رساں پوچھ بیٹھا۔

''اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ماں یہ جان کر پریشان ہو۔'' اس نے جواب دیا۔

سراغ رسانوں کا خیال تھا کہ بہانے بنانا الگ بات ہے لیکن جب کوئی شخص جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوتی ہے۔ آئن کی بہانے بازی مشکوک تھی اور کوئی مشکل ہی سے قائل ہوسکتا تھا۔ انہوں نے یہ بھی غور کیا کہ ایک شخص جس نے خود یہ تسلیم کیا ہو کہ وہ ایک اجنبی کو دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہوگیا تھا کہ اس نے اس سے بچنے کے لیے سڑک عبور کرلی تھی، کیا بعد میں تنہا کسی تاریک پارک میں بیٹھ سکتا تھا۔

سراغ رسانوں نے اس سے بار بار سوالات کیے کیونکہ وہ ان پانچ یا چھ افراد میں سے تھا جسے وہ لوگ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے لیکن آئن اپنے بیان پر سختی سے ڈٹا رہا۔ سراغ رسانوں نے فنڈلے بار کے اسٹاف سے بھی پوچھ گچھ کی۔ ان کے بیان کے مطابق آئن اس رات بار میں آیا ضرور تھا لیکن انہیں یہ یاد نہیں کہ وہ کس وقت وہاں سے رخصت ہوا تھا جبکہ کرک ہل بار میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں تھا کہ وہ وہاں نظر آیا تھا۔

☆☆☆

پولیس نے اپنی پیش رفت سے مایوس ہو کر جنوری کے وسط میں اپنی تفتیش کا دائرہ وسیع کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس فیصلے کے تحت مزید کئی افراد سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ اس تفتیش کے دوران کچھ نمایاں حقائق سامنے آئے۔ ایک شخص نے جو آئن کو اسکول کے زمانے سے جانتا تھا پولیس کو بتایا کہ اس نے آئن کو 3 دسمبر کی شب کے تقریباً پونے گیارہ بجے ویسٹ کورٹس کے علاقے میں دیکھا تھا۔ اس بیان سے خود آئن کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی لیکن اس شخص نے دعویٰ کیا کہ اس نے آئن کو ویسٹ کورٹس روڈ پر پرائمری اسکول کی طرف جاتے ہوئے دیکھا

تھا، کرک ہل بار کی طرف نہیں جو مخالف سمت میں واقع تھا۔ یہ بیان نہ صرف بے حد اہم تھا بلکہ آئن کے بیان کی تردید کرتا تھا۔ سراغ رسانوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ کیا آئن نے ان سے جھوٹ بولا تھا؟

سراغ رساں میک اور ہڈسن فوراً آئن کے گھر جا دھمکے۔

''ایک شخص کا کہنا ہے کہ اس نے تمہیں 3 دسمبر کی شب کو پونے گیارہ بجے کرک ہل بار کی طرف نہیں بلکہ پرائمری اسکول کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ کہاں تک درست ہے؟'' میک نے پوچھا۔

''یہ بالکل غلط ہے۔'' آئن نے پُرزور تردید کی اور اپنا پچھلا بیان دہرایا۔

دونوں سراغ رساں اس نئے گواہ کے پاس لوٹ آئے۔

''تم اچھی طرح سوچ کر تم نے ہمیں کیا بتایا ہے؟'' ہڈسن نے کہا۔ ''کیا اس کا امکان ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو؟''

''میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میرا ایک ایک لفظ سچ ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

اس کیس نے سراغ رسانوں کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ وہ سارے گلاسگو میں تفتیش کرنے کے بعد اپنا دائرہ مانچسٹر تک بڑھا چکے تھے کہ اچانک ایک روز کامیابی نے ان کے در پر دستک دی۔ انہیں کپڑوں کے سپلائر کے ایک اسٹور میں ویسا ہی جیکٹ مل گیا جس کی انہیں تلاش تھی۔ یہ جیکٹ فوراً معائنے کی لیے لیبارٹری بھیج دی گئی۔ معائنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ ڈوری جس سے الزبتھ کو قتل کیا گیا تھا، آئن کے جیکٹ کی تھی۔ اس حقیقت نے آئن کو پولیس کی نگاہ میں زیادہ مشکوک بنا دیا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد پولیس کو یہ سوچ کر حیرت ہونے لگی کہ آئن کے دوسرے کسی بھی کپڑے پر ایسا کوئی داغ یا دھبا نہیں پایا گیا جو مشکوک تصور کیا جاتا۔ چنانچہ وہ ایک بار پھر آئن کے گھر پہنچ گئی اور دوبارہ اس کے کمرے کی تلاشی لینے لگی۔ اسی تلاش کے دوران سراغ رسانوں کو اس کے وارڈ روب میں بھورے رنگ کی ایک پتلون لٹکی ہوئی نظر آئی۔ یہ پتلون پہلی مرتبہ تلاشی لینے کے دوران وہاں نظر نہیں آئی تھی۔ اس کمرے میں انہیں لانگ پلے ریکارڈ کے ڈھیر میں خس رسالے بھی ملے۔ وہ پتلون اسی وقت لیبارٹری بھیج دی گئی جس کے معائنے کے بعد سائنس دان ہملٹن نے اپنی رپورٹ میں کہا ''ہم نے اس پتلون کا پہلا ٹیسٹ جو کیا، اس کا مقصد اس کے دائیں پائنچے پر پائے جانے والے خون کے دو ننھے دھبوں کا تجربہ کرنا تھا۔ خون کے ایک دھبے کا گروپ ''اے'' تھا جو کہ آئن کے خون کا گروپ تھا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اس پتلون کی سطح پر آٹھ نفیس روئیں ملے۔ یہ روئیں شمالی امریکا میں پائے جانے والے جانور کے تھے جس کے فر کے کوٹ بنائے جاتے ہیں۔ مقتولہ الزبتھ اس رات فر کا کوٹ پہنے ہوئے تھی۔''

''ہم نے شک دور کرنے کے لیے اس کوٹ کے روئیں اور آئن کی پتلون پر پائے جانے والے روئیں لے کر ان کا معائنہ کیا۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہمیں اس پتلون پر سے گھاس کے ننھے ننھے ریشے بھی ملے۔ ہم نے جائے واردات پر سے گھاس کے جو نمونے حاصل کیے تھے ان میں اور ان ریشوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس پتلون کی ایک جیب کے کونے سے ہمیں نائیلون کے ریشے بھی ملے۔ یہ مقتولہ کے کپڑوں سے مطابقت رکھتے تھے جو وہ اس رات پہنے ہوئے تھی۔

اس رپورٹ کی روشنی میں آئن کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا گیا اور 28 جنوری 1983ء کو سراغ رساں جیک نے صبح نو بجے اس کے گھر پہنچ کر اسے حراست میں لے لیا۔ جیک کے ہمراہ اس کے تین سراغ رساں بھی تھے۔ آئن کو ہتھکیں پہنا کر پولیس اسٹیشن پہنچا دیا گیا۔ وہاں اسمتھ نے اسے آگاہ کیا کہ اس پر الزبتھ والٹن کے قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ آئن نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

27 فروری کو برے سائڈ کے مسٹر اور مسز فرگوسن کو شناختی پریڈ میں ملزم کو شناخت کرنے کے لیے طلب کیا گیا اور دونوں نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر آئن کو اس نوجوان کی حیثیت سے شناخت کر لیا جسے انہوں نے 3 دسمبر کی رات کو ٹیکسی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ لہٰذا اس پر الزبتھ کے قتل کا الزام بھی عائد کر دیا گیا۔

''کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم خوش قسمت ہیں کہ مجرم خود اپنے پیروں پر چل کر ہمارے پاس آ گیا۔'' سراغ رساں جیک نے رپورٹر حضرات کے ایک سوال کے جواب میں کہا ''لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہم جلد یا بدیر اس تک پہنچ ہی جاتے اور جب وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا گیا تو.....!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر شانے اچکائے ''لیکن اگر وہ جھوٹ نہ بولتا تو کیا کرتا؟'' اس نے اضافہ کیا۔

مئی 1983ء میں آئن پر کیتھی اور الزبتھ کے قتل کا مقدمہ چلا۔ واقعاتی ثبوتوں اور سرکاری وکیل کے دلائل کی مطابق وہ ایک جنسی مریض بھی تھا اور اس کا مرض فحاش اور عریاں جرائد رسائل اور فلموں کے سبب اور بھی بڑھ گیا تھا۔ 6 جون کو ارکانِ جیوری کی اکثریت نے اس پر فردِ جرم عائد کر دی۔ چنانچہ عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنا دی۔

ہر کام میں یکسوئی اور استقامت ضروری ہے اور اس کے لئے جذبے اور لگن کی بے انتہا ضرورت ہوتی ہے۔ کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جسے لوگ ''کرکٹ بائی چانس'' بھی کہتے ہیں۔ کسی حد تک یہ درست بھی ہے لیکن ''چانس'' تو ہر طرح کا ہوسکتا ہے۔ آپ اسی ایک چانس یا موقعے سے فائدہ اٹھالیں تو ایک نئی تاریخ لکھ سکتے ہیں ورنہ گنوائے گئے مواقع آپ کو گمنامی کے اندھیروں میں بھی پھنچا سکتے ہیں۔ کرکٹ کی تاریخ میں جتنے بھی اہم واقعات رونما ہوئے یا ریکارڈ بنے ان میں لٹل ماسٹر حنیف محمد کا ویسٹ انڈیز کے خلاف طویل ترین اننگ کا ریکارڈ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

پُراستقامت

کاشف زبیر

کسی مضبوط ٹیم کے خلاف اسی کے ملک میں یہ کارنامہ معمولی بات نہیں

آج کے دور میں کرکٹ میڈیا کا کھیل بن گیا ہے۔ دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں کرکٹ جاری رہتی ہے اور سال کے محدود سے چند دن ہوتے ہیں جب دنیا میں کہیں کوئی ٹیسٹ یا ون ڈے میچ نہیں کھیلا جا رہا ہوتا۔ اس کھیل میں کئی ایسی انفرادی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی دوسرے کھیل کو نصیب نہیں ہیں۔ اول اس کا طویل دورانیہ۔ دنیا میں اگرچہ گھنٹوں جاری رہنے والے کئی کھیل ہیں جیسے گالف یا شطرنج، لیکن ان کے شائقین کا حلقہ محدود ہے۔ بعض کھیل کئی دنوں بھی جاری رہتے ہیں جیسے طویل فاصلے کی ریس۔ سائیکلنگ اور کار ریس وغیرہ مگر انہیں مسلسل میڈیا پر نشر کرنا دشوار ہوتا ہے۔ پھر ان میں ہر ایک کو دلچسپی بھی نہیں ہوتی اور یہ کھیل گلیمر سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ طویل دورانیے کے کھیلوں میں کرکٹ وہ واحد کھیل ہے جو دلچسپ بھی ہے اور اسے عوام الناس کی توجہ بھی حاصل ہے اور سب سے بڑھ کر اس میں گلیمر بھی جیسے جنوبی امریکا میں فٹ بال اور شمالی امریکا میں بیس بال کو لوگوں کی جنون کی حد تک دلچسپی حاصل ہے۔ یہی دلچسپی کرکٹ کو برصغیر کے خطے میں حاصل ہے جہاں دنیا کی بائیس فیصد آبادی رہتی ہے۔ دنیا کے پانچ براعظموں میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔

طویل دورانیے اور عوامی دلچسپی نے دنیا کی تقریباً تمام ہی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے اشتہاری بجٹ کا

ایک بڑا حصہ ان اسپورٹس چینلز کے لیے مختص کر دیں جو کرکٹ میچوں کو باقاعدگی سے نشر کرتے ہیں۔ میڈیا نے کھیل کے میدان کو اٹھا کر آپ کے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا ہے۔ کھلاڑیوں کی ایک ایک حرکت' ہر گیند کی متعدد زاویوں سے لی گئی مووی' آوازیں' تاثرات اور میدان میں ہونے والی ہر حرکت آپ اپنے ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ناظرین سو فیصد درستگی سے جان لیتے ہیں کہ امپائر نے جو فیصلہ دیا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ نہ صرف ناظرین بلکہ ٹی وی امپائر کے لیے بھی جدید ٹیکنالوجی نے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کرکٹ شائقین اب اسٹیڈیم جانے کے بجائے گھر میں بیٹھ کر میچ دیکھنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ اس طرح وہ سکون سے اور زیادہ بہتر انداز میں اپنے پسندیدہ اسٹارز کو ایکشن میں دیکھ سکتے ہیں جو کہ میدان میں ممکن نہیں ہے۔ اس چیز نے کرکٹ کو میڈیا کا کھیل بنا دیا ہے۔

آج جب برائن لارا چار سو رنز کا تاریخی سنگ میل عبور کرتا ہے تو ٹی وی کے کروڑوں ناظرین اس کا ایک ایک شاٹ پوری تفصیل سے ملاحظہ کر سکتے ہیں اور ایک ایک رن کی داد دے سکتے ہیں لیکن آج سے تقریباً نصف صدی پہلے جب حنیف محمد نے چار دن تک وکٹ پر کھڑے رہ کر ٹین سوسینتیس رنز بنانے کا کارنامہ انجام دیا تو پاکستان کے لوگوں کو ایک دن بعد یہ خبر ملی تھی۔ ستم ظریفی دیکھیے' آج اس تاریخ ساز اور ریکارڈ ساز اننگ کی چند ایک تصاویر ہی دستیاب ہیں۔ جن چند ہزار افراد نے اس اننگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا' ان میں سے بھی بیشتر افراد اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس لیے اس اننگ کی تفصیلات بھی ہم تک پوری نہیں پہنچی ہیں۔ بس اتنا معلوم ہے کہ حنیف محمد نے تقریباً ایک ہزار منٹ تک کریز پر کھڑے ہو کر یہ اسکور بنایا۔ اس اننگ کے دوران میں انہیں کتنے اعصابی دباؤ سے گزرنا پڑا۔ برق رفتار ویسٹ انڈین بالرز نے انہیں آؤٹ کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے' اس اننگ کے دوران میں وہ کتنے صبر آزما مراحل سے گزرے' کتنی بار جب گیند ان کے پیڈز سے ٹکرائی یا ان کے بلے کے پاس سے گزری اور فیلڈرز نے گلا پھاڑ کر امپائرز سے اپیل کی (جنہوں نے اس اننگ میں حنیف کے ہر ساتھی کو غلط آؤٹ دیا تھا) تو جب تک امپائر کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں آیا اس وقت تک حنیف محمد کے دل پر کیا گزرتی رہی تھی اور جب وہ ٹرپل سنچری بنا کر بریڈ مین اور لین ہٹن کے ریکارڈز کی طرف بڑھ رہے تھے' تو ان کی کیا حالت تھی؟

1952ء میں جب پاکستان نے ٹیسٹ کھیلنے والے ملک کی حیثیت حاصل کی تو اس کے اولین ٹیسٹ اسکواڈ میں کمسن حنیف محمد بھی شامل تھے جن کی عمر محض سترہ سال تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کرکٹ کو معمر افراد کا کھیل کہا جاتا تھا۔ چالیس سال کی عمر کے کھلاڑی ہر ٹیم میں عام ملتے تھے اور فرسٹ کلاس کرکٹ میں تو بے شمار کرکٹرز ایسے تھے جو پچاس برس سے بھی اوپر کے تھے۔ رنجیت سنجھی جیسے عظیم کرکٹر نے ستر سال کی عمر تک کرکٹ کھیلی تھی۔

ایسے میں حنیف محمد اور ان جیسے دوسرے کم عمر کھلاڑیوں کے ساتھ پاکستانی ٹیم تازہ ہوا کے تازہ جھونکے کی طرح وارد ہوئی تھی۔ اس میں شامل زیادہ تر کھلاڑیوں کی عمریں بیس سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ ٹیم کے سب سے معمر رکن خود کپتان عبدالحفیظ کاردار تھے۔ اس وقت کرکٹ پر آسٹریلیا اور انگلینڈ کی طاقت ور ٹیمیں چھائی ہوئی تھیں۔ ان کے بعد ویسٹ انڈیز اور جنوبی افریقہ کا نمبر آتا تھا جبکہ نیوزی لینڈ اور انڈیا کی ٹیمیں سب سے کمزور مانی جاتی تھیں۔ عام طور سے ان کی ہر سیریز کا انجام عبرت ناک شکست ہوتا تھا۔ پاکستان تو ویسے ہی آف کرکٹ تھا اس لیے کرکٹ ماہرین کا خیال تھا کہ اسے اپنی پہلی فتح حاصل کرنے کے لیے ایک عشرے تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

مگر پاکستان نے اپنی پہلی ہی ٹیسٹ سیریز اور دوسرے ہی ٹیسٹ میں انڈیا کی خود سے کہیں زیادہ طاقت ور ٹیم کو اننگ سے شکست دے کر سب کو حیران کر دیا۔ اگرچہ اس فتح میں کلیدی کردار فضل محمود کی شاندار بالنگ اور نذر محمد کی ناقابلِ شکست سنچری نے ادا کیا تھا لیکن حنیف محمد نے بھی نصف سنچری بنا کر اپنے آنے والے روشن دنوں کی جھلک دکھا دی تھی۔ اس فتح نے جہاں ساری دنیائے کرکٹ کو ششدر کر دیا تھا' وہاں ماہرین کرکٹ کو بھی اپنے اندازوں پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انڈیا کے بعد پاکستان کی ٹیم انگلینڈ کے دورے پر گئی۔ یہ سن 1954ء کا ذکر ہے یعنی پاکستان نے اپنی دوسری سیریز اپنی پہلی سیریز کے دو سال بعد کھیلی تھی۔ اس زمانے میں کرکٹ خاصی محدود تھی اور ون ڈے کرکٹ کا تو سرے سے وجود ہی نہیں تھا اس لیے کھلاڑیوں کے پاس کھیلنے کے محدود مواقع ہوا کرتے تھے اور ان کی کارکردگی میں تسلسل حیران کن ہی کہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے جب دو تین سال بعد ایک سیریز کھیلنے کو ملے تو تسلسل کہاں قائم رہتا ہے۔ جب پاکستانی ٹیم پہلی بار انگلینڈ پہنچی تو انگلش کرکٹرز نے اسے وہ اہمیت نہیں دی جو وہ آسٹریلیا یا ویسٹ انڈیز کی ٹیموں کو دیتے تھے۔ حالانکہ

پاکستان نے اپنے دوسرے ہی ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کی تھی جس کے لیے سوائے آسٹریلیا کے ساری ہی ٹیموں کو خاصے عرصے تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ نیوزی لینڈ نے اٹھائیس سال بعد اور ویسٹ انڈیز اور بھارت نے بیس سال بعد ٹیسٹ کرکٹ میں اپنی اولین فتح حاصل کی تھی۔ میچوں کی تعداد کے اعتبار سے یہ ریکارڈ زمبابوے کے پاس ہے اور امید ہے کہ بنگلہ دیش کی ٹیم بھی یہ ریکارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اپنے پچیس کے لگ بھگ میچوں میں اس نے صرف دو ٹیسٹ ڈرا کرائے ہیں باقی سب میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

اس لحاظ سے انگریز کرکٹرز اور انگلش ماہرین کا رویہ پاکستانی ٹیم کے ساتھ منصفانہ نہیں تھا۔ انگریز کپتان سر لین ہٹن نے پریس کے سامنے شکوہ کیا کہ اسے ایک کمزور ٹیم کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ پھر ماہرین بھی پاکستانی ٹیم کو معیار میں کم تر اور آسان حریف قرار دے رہے تھے۔ مگر پہلے تو پاکستانی ٹیم نے فرسٹ کلاس میچوں میں اپنی کارکردگی سے ماہرین اور تماشائیوں کو چونکانا شروع کیا۔ یکے بعد دیگرے کئی مضبوط کاؤنٹی ٹیموں کو شکست دی۔ انگلینڈ اور آسٹریلیا میں ٹیسٹ کا حامل کرکٹ کھیلنے والی علاقائی ٹیمیں کسی طرح ٹیسٹ ٹیموں سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سارے ٹیسٹ کھلاڑی باقاعدگی سے اپنی ڈومیسٹک کرکٹ میں حصہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کاؤنٹی ٹیمیں معیار کے لحاظ سے ٹیسٹ کھیلنے والی ٹیم کے برابر ہی ہوتی ہیں۔ خاص طور سے ایسیکس جیسی مضبوط ٹیم کے خلاف پاکستان نے حیران کن فتح حاصل کی تھی۔ کھیل کے آخری دن چائے کے وقفے پر اپنی دوسری اننگ میں ایسیکس کی محض دو وکٹیں گری تھیں اور میچ بہ ظاہر ڈرا کی طرف گامزن تھا۔ مگر فضل محمود نے صحافیوں کے سامنے اعتماد سے کہا کہ ہم اب بھی یہ میچ جیت سکتے ہیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ پرانی ہو جانے والی گیند سے فضل محمود اور خان محمد نے سوئنگ بالنگ کا جادو جگایا اور ایسیکس کے بلے باز یکے بعد دیگرے ان کی سحر انگیز بالنگ کا شکار ہوتے چلے گئے اور مقررہ وقت سے پہلے ہی ساری ٹیم آؤٹ ہو گئی۔ پاکستان نے حیرت انگیز انداز میں یہ میچ جیت لیا تھا۔ اگلے دن کے اخبارات اس فتح کے تذکروں سے بھرے ہوئے تھے۔

اس کے باوجود جب پاکستانی ٹیم اوول کے میدان میں اتری تو سب کو یقین تھا کہ انگلینڈ کی مضبوط ٹیم با آسانی بے بی آف کرکٹ کو آؤٹ کلاس کر دے گی۔ مگر پاکستان کے حوصلہ مند کھلاڑیوں نے ایک بار پھر انگریزوں کے اندازوں کو غلط ثابت کر دیا۔ گراسی اور بالنگ کے لیے سازگار اس وکٹ پر بلے بازی دشوار ترین کام تھا۔ لیکن حنیف محمد نے میچ کی دونوں اننگز میں نصف سنچریاں اسکور کر کے اپنے بالروں کو موقع دیا کہ وہ انگلینڈ پر جوابی حملہ کر سکیں۔ فضل محمود اور خان محمد نے یہ کام بہ خوبی انجام دیا اور دونوں اننگز میں انگلینڈ کو کم اسکور پر آؤٹ کر کے اوول ٹیسٹ تاریخی انداز میں جیت لیا۔ جہاں اس میچ میں فضل محمود کی بارہ وکٹیں فتح گر تھیں وہیں حنیف محمد نے بھی اپنا حصہ بہ خوبی ادا کیا تھا۔ اس پورے اگنش دورے میں حنیف محمد کا بلا رنز اگلتا رہا تھا۔ انہوں نے کئی سنچریاں اور کئی نصف سنچریاں اسکور کی تھیں۔ ٹیسٹ میچوں میں وہ چار نصف سنچریاں بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ اس کے بعد پاکستان نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی ٹیموں کو اپنی سرزمین پر ٹیسٹ سیریز میں شکست دی۔ خاص طور سے آسٹریلیا کی مضبوط ترین ٹیم جو رچی بینو کی قیادت میں پاکستان آئی تھی۔ کراچی کے واحد ٹیسٹ میں اسے ایک اننگ اور چھیاسی رنز کی بھاری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مرد میدان ایک بار پھر فضل محمود تھے۔

کاردار' وزیر محمد اور امتیاز احمد جیسے بلے بازوں کی

آپ خواہ
مرد ہوں یا عورت اپنے
پستہ قد میں مزید اضافہ کر کے
اپنی شخصیت کو خوبصورت اور
پُروقار بنانے کے لئے ہمیں
اپنے موجودہ قد کی پیمائش اور
عمر کی تفصیل ہمراہ جوابی لفافے کے
لکھیں اور مفید معلومات حاصل کریں
نوٹ: بیرونِ ملک سے لکھنے
والے خط رجسٹرڈ پوسٹ
سے روانہ فرمائیں۔
KAYBEE HOME
پوسٹ بکس نمبر 2535 - کراچی 74600

موجودگی میں حنیف محمد کی کارکردگی اچھی ضرور تھی مگر اتنی نمایاں نہیں تھی کہ ماہرین کو چونکا سکتی۔ اب تک وہ حنیف محمد کو ایسا نوجوان کھلاڑی سمجھتے تھے جو اسٹیمنا اور توجہ تو کمال درجے کی رکھتا ہے لیکن اس کے پاس اسٹروکس کی کمی ہے۔ وہ اب تک ٹیسٹ کرکٹ میں کوئی بڑی اننگ کھیلنے میں ناکام رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زیادہ تر پیچ تیز وکٹوں پر ہوتے تھے اور پاکستان کا مقابلہ بھی عالمی معیار کی ٹیموں سے تھا جن کے پاس اعلیٰ درجے کے بالرز تھے۔ میچوں کے درمیان طویل وقفہ بھی حنیف محمد کی کارکردگی پر اثر انداز ہو رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حنیف محمد کو اب تک ان کی پسند کی جگہ یعنی اوپنر کی پوزیشن نہیں ملی تھی۔ ان عوامل نے مل کر ان کی بلے بازی کو ذرا بجھا سا دیا تھا۔

1957ء میں جب پاکستان کی ٹیم ویسٹ انڈیز کے دورے پر روانہ ہوئی تو سلیکٹرز نے پہلی بار حنیف محمد کو مستقل اوپنر کے طور پر کھلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ عارضی طور پر اوپنر کی حیثیت سے کھیلتے رہے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ حنیف محمد کی پاکستانی ٹیم میں شمولیت ایک وکٹ کیپر کے طور پر ہوئی تھی۔ وہ ایک ماہر بلے باز کے طور پر اپنی جگہ بعد میں بنانے میں کامیاب ہوئے تھے' جب امتیاز احمد ٹیم میں مستقل وکٹ کیپر کے طور پر شامل ہوئے۔ ایسے عجوبے ہماری کرکٹ میں عام ہیں۔ مثال کے طور پر عظیم بلے باز ماجد خان فاسٹ بالر کے طور پر پاکستانی ٹیم میں شامل ہوئے تھے اور بہترین بلے باز مشتاق محمد کو لیگ اسپنر کی حیثیت سے اولین ٹیسٹ کھلایا گیا تھا اور تازہ ترین مثال شاہد آفریدی کی ہے۔ ایک لیگ اسپنر کو بلے باز اور اوپنر کی حیثیت سے کھلایا جاتا ہے اور اس کا کیریئر برباد کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ راقم کی رائے میں شاہد آفریدی میں ایک اچھا اور فتح گر لیگ اسپنر بننے کی تمام خوبیاں ہیں۔ بے حد تیز بالنگ ایکشن کے ساتھ اسے گیند پر اچھا کنٹرول اور اسپن پر عبور حاصل ہے۔ اس کی تیز رفتار گیند جو کسی فاسٹ بالر کی بال سے کم تیز نہیں ہوتی' اس کا بہترین خفیہ ہتھیار ہے۔ لیکن افسوس' بورڈ' ٹیم کے کوچز اور خود شاہد آفریدی نے بلے باز بننے کی کوشش میں خود کو بین الاقوامی کرکٹ میں بہت نمایاں نہیں کیا۔ حالانکہ بنا کسی مناسب کوچنگ کے اس کا بین الاقوامی کرکٹ میں آنا' اس کی بہترین خداداد صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی حنیف محمد کی۔ ان کی ساری تربیت ایک اچھے بلے باز کے طور پر ہوئی تھی۔ ان کے اسکول کے کوچ نے ان کی خامیاں دور کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی اور حنیف محمد نے بھی ان کی محنت کا پاس رکھا اور اپنی ساری توجہ بلے بازی پر مرکوز رکھی۔ اس کے باوجود جب پاکستان کو ٹیسٹ اسٹیٹس ملا تو کچھ حلقے حنیف محمد کی فرسٹ کلاس کرکٹ کی کارکردگی نظر انداز کر کے ٹیم میں ان کی شمولیت کی مخالفت کر رہے تھے۔ بہانہ ان کی کم عمری کو بنایا گیا اور مجبوراً سلیکٹرز کو ایک اچھے بلے باز کو وکٹ کیپر کی حیثیت سے کھلانا پڑا تھا۔ کیونکہ وہ بہرصورت حنیف کو ٹیم میں شامل کرنا چاہتے تھے اور مخالفت کرنے والوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

چند سیریز میں حنیف نے اپنی صلاحیتوں کو منوا لیا تھا اور پھر اب ان کی کم عمری بھی جواز نہیں رہی تھی۔ اکیس سال کی عمر میں وہ میچور بلے باز کا روپ دھار چکے تھے۔ 20 دسمبر 1957ء کو جب پاکستانی ٹیم بحری جہاز کے ذریعے ایک طویل سفر پر ایک نئی سرزمین کی طرف روانہ ہوئی تو حنیف محمد اس کے لازمی رکن تھے۔ بحرِ اوقیانوس کے طوفانی سمندر میں چھوٹے چھوٹے بے شمار جزائر ہیں۔ ایک زمانے میں یہ جزائر برطانیہ کی عملداری میں تھے۔ ان جزائر پر صدیوں سے آباد مقامی باشندوں کو اپنی جملہ آور پہلے ہی ختم کر چکے تھے یا ان کی آبادی اتنی کم ہو چکی تھی کہ وہ ان جزائر کی ترقی کے لیے کسی قسم کا کردار ادا کرنے سے قاصر تھے۔ لہٰذا برطانوی تجار نے افریقہ کے ساحلوں سے جفاکش سیاہ فاموں کو اتنی بڑی تعداد میں لا کر یہاں پر آباد کیا کہ ان جزائر کی غالب آبادی سیاہ فاموں پر مشتمل ہو گئی۔ جب دنیا سے برطانوی استعمار کا خاتمہ ہوا تو انہوں نے روایتی مکاری سے کام لیتے ہوئے ان جزائر کو کسی ایک ملک کی صورت میں آزاد کرنے کے بجائے الگ الگ ملکوں کی صورت میں آزاد کیا۔ حالانکہ چند مربع میل پر پھیلے اور چند لاکھ نفوس کی آبادی پر مشتمل یہ جزائر آزاد ملک سے زیادہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر ملک کا الگ پرچم اور الگ حکومت ہے۔ یہ ہیں ویسٹ انڈیز یا جزائر غرب الہند۔

لیکن ایک معاملے میں ان ممالک نے اتحاد کیا اور ایسا اتحاد کیا جو مثالی بن گیا۔ ان میں سے ہر ملک کرکٹ کھیلتا ہے لیکن کم آبادی کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ ہر ملک الگ الگ کرکٹ کھیلنے کے لیے ٹیسٹ ٹیم کا درجہ حاصل کر سکے چنانچہ انہوں نے مل کر ایک ٹیم بنائی جس کا نام اپنے جزائر کے مجموعہ کے نام پر ویسٹ انڈیز رکھا گیا اور یہ اتحاد صرف کرکٹ کے معاملے میں ہے ورنہ باقی کھیلوں میں ان ممالک کی الگ الگ ٹیمیں بین الاقوامی مقابلوں میں حصہ لیتی ہیں۔

اس وقت پاکستانی کھلاڑیوں کو ویسٹ انڈیز کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ ایک ملک ہے یا الگ الگ ممالک ہیں اور کس براعظم میں شامل ہیں' وہاں کا موسم کیسا ہے اور وکٹیں کیسی ہوتی ہیں۔ ان سب باتوں سے ہمارے کھلاڑی تقریباً ناواقف تھے۔ انگلینڈ کے تجربے کے پیشِ نظر تقریباً سب ہی کھلاڑیوں نے سوئٹر اور گرم کپڑے ساتھ لیے تھے۔ مگر جب وہ جزائر ویسٹ انڈیز کے پاس پہنچے تو گرمی کی شدت نے انہیں بوکھلا دیا تھا۔ خط استوا سے نزدیک ہونے کی وجہ سے یہاں سارے سال ہی گرمی پڑتی ہے۔ بارشیں بے پناہ ہوتی ہیں اور بارش کے بعد موسم کی قدر خوشگوار ہو جاتا ہے لیکن جیسے ہی دھوپ نکلتی ہے' دوبارہ شدت کی گرمی پڑنے لگتی ہے۔ اس طویل دورے میں پاکستانی ٹیم کو چھ ٹیسٹ میچز اور درجن بھر سائیڈ میچز کھیلنا تھے۔ دورے کا آغاز غیر روایت فرسٹ کلاس میچوں سے ہوا۔

اپنے اولین فرسٹ کلاس میچ میں حنیف کوئی بڑی اننگ کھیلنے میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن اپنے سپرامنٹ اور تکنیک سے سب کو متاثر کیا۔ اسی وقت ویسٹ انڈین ماہرین نے بھانپ لیا کہ ان کی ٹیم کی فتح میں سب سے بڑی رکاوٹ حنیف ثابت ہوں گے۔ انہوں نے حنیف محمد کو ایورٹن ویکس' سر فرینک وورل اور سر لین ہٹن کے پائے کا کھلاڑی قرار دیا تھا۔

17 جنوری کو پہلا ٹیسٹ بارباڈوس کے دارالحکومت بریج ٹاؤن کے اوول پارک میدان پر کھیلا گیا۔ اپنی فاسٹ بالنگ کی بیٹری' خاص طور سے ''رفتار کا طوفان'' کلکلر اسٹ کی موجودگی کی وجہ سے ویسٹ انڈین بورڈ نے اوول پارک پر بلے بازی کے لیے موزوں پیچ کا انتخاب کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے بلے باز اس وکٹ میں پوشیدہ رنز کے خزانے کھود نکالیں گے اور ان کے بالرز پاکستان کی ناتجربے کار بیٹنگ لائن کو تہس نہس کر دیں گے۔ میچ کے پہلے ڈھائی دن ان کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ جس ٹیم میں ایورٹن ویکس' فرینک وورل اور الیگزینڈر جیسے بلے باز ہوں اسے بڑا اسکور بنانے سے کون روک سکتا تھا۔ وکٹ کی سطح شیشے کی طرح ہموار اور ایسی چمک دار تھی کہ ذرا سی کوشش سے اس میں اپنی صورت بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

کارداراس روز چونتیس برس کے ہو گئے تھے اور سالگرہ والے دن وہ ویسٹ انڈین کپتان الیگزینڈر سے ٹاس ہار گئے جس نے فوری طور پر پہلے بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے بلے بازوں نے فضل محمود' محمود حسین اور نسیم الغنی پر مشتمل معیاری بالنگ اٹیک کو دھن کر رکھ دیا۔ کونرڈ ہنٹ اور ایورٹن ویکس نے سنچریاں بنا ڈالیں اور محض پانچ سیشن اور ایک گھنٹے کے کھیل میں ویسٹ انڈین بلے بازوں نے 579 رنز کا پہاڑ سا ہدف کھڑا کر دیا۔ پاکستانی بالروں نے وکٹیں ضرور گرائیں لیکن وہ رنز کی رفتار روکنے میں ناکام رہے۔ اس میں ایک حد تک قصور وکٹ کا بھی تھا' جو بلے بازی کے لیے مادر مہربان تھی تو بالروں کے لیے اس کا رویہ سوتیلی ماں سے کم نہیں تھا۔

مگر جب ویسٹ انڈین ٹیم کے بعد پاکستان کی باری آئی تو یک لخت مادر مہربان کا رویہ بدل گیا اور اس میں زیادہ قصور پاکستانی بلے بازوں کی جلد بازی کا تھا۔ انہوں نے سکون سے ٹک کر بلے بازی کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور یکے بعد دیگرے آؤٹ ہوتے چلے گئے۔ کلکلر اسٹ نے بہت اچھی فاسٹ بالنگ کی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور پوری پاکستانی ٹیم ایک سو چھ رنز کے معمولی اسکور پر آؤٹ ہو گئی یعنی ویسٹ انڈین اسکور سے چار سو تہتر رنز پیچھے تھی اور ابھی اسے اننگ کی شکست سے بچنے کے لیے اتنے رنز کی ضرورت تھی اور پورے ساڑھے تین دن کا کھیل باقی تھا۔ ماہرین نے شکست کو پاکستان کا مقدر قرار دے دیا تھا۔

جب کسی ٹیم کو اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہو اور حالات اتنے ناموافق ہوں تو عام طور سے شکست ہی مقدر بنتی ہے۔ پاکستانی ڈریسنگ روم پر ایک مایوسی سی طاری تھی۔ ایک سو چھ رنز کے معمولی اسکور پر آؤٹ ہونا ان کے لیے باعث شرم تھا۔ حنیف محمد سر جھکائے دوسری اننگ کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر غور و فکر کے آثار تھے۔ امتیاز احمد کسی قدر غصے میں نظر آ رہے تھے۔ پہلی اننگ میں جہاں پاکستانی بلے بازوں کی جلد بازی اور ویسٹ انڈین بالرز کی نپی تلی بالنگ نے پاکستان کو ہزیمت سے دوچار کیا تھا' وہیں امپائرز کے بعض فیصلے بھی پاکستان کے خلاف گئے تھے۔ امتیاز احمد ایسے ہی ایک فیصلے کا شکار ہو گئے تھے اور ان کے ارادے دوسری اننگ کے لیے جارحانہ نظر آ رہے تھے۔

''ساتھیو!'' اچانک کاردار نے کہا ''اس طرح منہ لٹکا کر کیوں بیٹھے ہو۔ کرکٹ میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اگر ہم ہمت سے کام لیں تو میچ بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اگر ہاریں بھی تو مقابلہ کر کے ہاریں گے۔''

''ہاں' ہم میچ تھالی میں سجا کر انہیں نہیں دیں گے'' سعید احمد نے کہا۔

''بہ شرطیکہ امپائرز ہاتھ نہ دکھائیں'' فضل محمود بھی ناقص امپائرنگ سے نالاں تھے۔ ویسٹ انڈین اننگ کے دوران

میں انکی کئی زوردار اپیلوں کو امپائرز نے مسترد کردیا تھا۔

''امپائرز اور ویسٹ انڈین کھلاڑی کچھ نہیں کرسکتے'' کاردار نے اعتماد سے کہا تھا۔ ''بشرطیکہ ہم محنت سے کھیلیں۔ وکٹ پر رکیں اور کوئی غیر ضروری شاٹ نہ کھیلیں۔ ہمیں ایک کھلاڑی کی طرف سے بھرپور اسٹینڈ کی ضرورت ہے جو وکٹ پر کار ہے اور ٹیم کو سہارا دے۔''

سب کی نظریں حنیف محمد کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ ٹیم میں وہی ایک ایسے کھلاڑی تھے جو پوری ثابت قدمی سے وکٹ پر رکنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ آہستہ سے مسکرائے ''میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

کاردار کا شمار پاکستان کے بہترین کپتانوں میں ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ان کی قیادت تھی کہ پاکستان کی ناتجربے کار ٹیم نے ہر ٹیسٹ ٹیم کو اولین سیریز میں کم سے کم ایک ٹیسٹ ضرور ہرایا۔ بلکہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے خلاف وہ اولین سیریز جیتنے میں بھی کامیاب رہے تھے۔ بھارت اور ویسٹ انڈیز سے سیریز میں ان کے ملک میں شکست کھائی تھی اور انگلینڈ سے سیریز برابر رہی تھی۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ بھارت اور ویسٹ انڈیز میں امپائرنگ کا معیار کیا ہے۔ کاردار اپنے ساتھیوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کا فن جانتے تھے۔ ساتھ ہی وہ میچ میں مقابلے کی اسپرٹ برقرار رکھتے تھے۔ ان کا عزم ہمیشہ فتح کے لیے ہوتا تھا۔ ان کی قیادت میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کے اولین دس سال بلاشبہ سنہرے سالوں میں سے تھے۔ اس دوران میں پاکستان نے 23 ٹیسٹ میچز کھیلے اور ان میں سے چھ جیتے' اتنے ہی ہارے اور باقی میچز ڈرا ہوئے۔ ان میں سے بھی اکثر موسم کی خرابی یا حد سے زیادہ بیٹنگ وکٹ کی وجہ سے ڈرا ہوئے تھے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کاردار مثبت کرکٹ کے قائل تھے۔ وہ میچ کو فتح کے لیے کھیلا کرتے تھے۔ ان کے بعد آنے والے کپتانوں میں سے اکثر اس جارحانہ اسپرٹ سے محروم پائے گئے اور یہی چیز پاکستانی کرکٹ کے زوال کا باعث بنی۔ کسی حد تک عمران خان کے دور میں پاکستانی ٹیم میں یہ اسپرٹ دیکھنے میں آئی تھی۔ کاردار کی ولولہ انگیز باتوں نے ڈریسنگ روم سے مایوسی کے بادل چھانٹ دیے تھے۔ اور اوپنرز اس عزم کے ساتھ وکٹ کی طرف روانہ ہوئے کہ وہ فتح تحفے میں نہیں پیش کریں گے۔

ویسٹ انڈین تماشائی اور کھلاڑی متوقع فتح کے نشے سے سرشار تھے۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ شاید وہ پہلی اننگ کا ایکشن ری پلے کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور تیسرے دن ہی میچ کا فیصلہ ہوجائے گا۔ انہوں نے پاکستانی کھلاڑیوں کے رویے پر غور ہی نہیں کیا جو قطعی بدلا ہوا تھا۔ حنیف محمد غضب کے پُرسکون تھے تو امتیاز احمد کچھ کر دکھانے کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے جاتے ہی گلکرائسٹ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اب تک ویسٹ انڈین تماشائی اپنے ہی کھلاڑیوں کو جارحانہ بلے بازی کرتے دیکھتے رہے تھے مگر امتیاز احمد کی جارحانہ بلے بازی نے انہیں ششدر کردیا۔ گلکرائسٹ اپنے دور کا تیز ترین بالر تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی غیر ملکی کھلاڑی اسے یوں بھی کھیل سکتا ہے۔ اس وقت ہیلمٹ نہیں ہوتے تھے۔ دستانے اور پیڈز بھی بس گزارے لائق ہوا کرتے تھے۔ ان حالات میں فاسٹ بالرز کو کھیلنا ہی بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ امتیاز نے اپنے مخصوص انداز میں زوردار اسٹروکس کھیلے اور تماشائیوں کا دل جیت لیا میچ کو ختم سمجھ رہے تھے۔

20 جنوری کی سہ پہر ڈھائی بجے پاکستان نے اپنی دوسری اننگ کا آغاز کیا تھا اور ابھی نصف دن کا کھیل باقی تھا۔ میچ بھی روز اول جیسی نہیں رہی تھی اور اس میں کئی موڑ گڑھے پڑ گئے تھے۔ خاص طور سے جہاں زیادہ گیندیں کرنی تھیں اور جہاں بالروں کے پیروں کے نشان بنتے تھے' وہاں سے پچ خاصی خراب ہوگئی تھی۔ فاسٹ بالرز کے لیے اس میں اب بھی کچھ نہیں تھا لیکن اسپنرز کے لیے وکٹ میں تھوڑی جان پیدا ہوگئی تھی۔ ویسٹ انڈین کپتان مطمئن تھا کہ جب اس کے فاسٹ بالرز اپنا کام کرلیں گے تو اس کا مستند اسپنر ایرک پاکستانی کھلاڑیوں کو اپنی پرفریب اسپن بالنگ کا نشانہ بنا سکے گا۔ وہ محض دو قدم کے اسٹارٹ سے بڑی اچھی بالنگ کرتا تھا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے فرینک وورل تھا۔

مگر حنیف محمد اور بالخصوص امتیاز احمد نے سب کو حیران کردیا۔ کہاں تو پوری ٹیم ہی ایک سو چھ کے معمولی اسکور پر آؤٹ ہوگئی تھی اور کہاں ایک سو بادن رنز تک ویسٹ انڈین بالرز دونوں اوپنرز میں سے کسی ایک کو بھی آؤٹ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ امتیاز نے گلکرائسٹ سے اپنی پہلی اننگ کی ناانصافی کا بھرپور بدلہ لیا۔ وکٹ پر ان کے اسٹروکس دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی امتیاز احمد کو صحیح معنوں میں جارحانہ انداز میں کھیلنے والے پہلے پاکستانی بلے باز ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ نیوزی لینڈ کے خلاف وہ آٹھویں نمبر پر کھیلتے ہوئے تیز رفتار ڈبل سنچری بنا چکے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اوپنرز تیسرا دن بنا کسی نقصان کے گزار دیں گے۔ حنیف اور امتیاز کی کارکردگی نے شائقین کو

بھی ان کا گرویدہ کردیا تھا۔ یقینی شکست کے دباؤ میں ایسا کھیل انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گیند بلے سے ٹکرا کر باؤنڈری کا رخ کررہی تھی۔ امتیاز کی جارحیت کے مقابلے میں حنیف سکون سے کھیل رہے تھے۔ جو گیندوں سے باہر ہوتی اسے چھوڑ دیتے۔ وکٹوں میں آتی گیند کو وہ ہر ممکن احتیاط سے کھیلا کرتے تھے اور جو گیند شاٹ کھیلنے کے لائق ملتی اس پر اتنی خوبصورتی سے شاٹ کھیلتے کہ تماشائی بے اختیار داد دینے پر مجبور ہوجاتے تھے۔ گلکرائسٹ اور ڈینس ایمبکن کی خطرناک تیز گیندیں انہیں متاثر کرنے میں قطعی ناکام رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کا جوش و خروش اور فوری جیت کا یقین ماند پڑنے لگا۔ انہیں جیتا ہوا میچ ڈرا کی طرف جاتا نظر آنے لگا تھا۔ ایسے میں امپائر ایک بار پھر بالر کی مدد کے لیے آگے آئے۔ پہلی اننگ کی طرح گلکرائسٹ کی ایک بال امتیاز احمد کے پیڈز سے ٹکرائی۔ گیند لیگ اسٹمپ سے خاصی باہر تھی' اس کے باوجود گلکرائسٹ نے چلا کر اپیل کی۔ اتنی دیر سے وکٹ پر موجود امتیاز احمد خاصی حد تک مطمئن تھے اور انہیں امپائرنگ پر بھی اعتماد ہوچلا تھا اس لیے جب ویسٹ انڈین امپائر نے انگلی فضا میں بلند کی تو وہ ششدر رہ گئے۔ خود بالر بھی اس طرح آؤٹ دیے جانے پر حیران ہوا تھا' اس نے تو مایوسی کے عالم میں اضطراری طور پر اپیل کی تھی۔ امپائر نے گویا موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس زمانے میں ٹی وی تو تھا نہیں کہ ایکشن ری پلے کا سوال پیدا ہوتا۔ اس کے باوجود تماشائیوں نے صاف محسوس کیا کہ امتیاز کو غلط آؤٹ دیا گیا ہے اور اس پر بار باؤنڈز کے عوام نے برملا ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ حالانکہ وہاں کے عوام جنون کی حد تک اپنی ٹیم کو فاتح دیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

امتیاز کے پویلین سے لوٹ آنے پر سارے ہی پاکستانی کھلاڑی تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے گویا ان کا مقابلہ ایک ایسی ٹیم سے تھا جس میں گیارہ کے بجائے تیرہ کھلاڑی کھیل رہے تھے۔ امتیاز احمد اپنی سنچری سے صرف نو رنز کے فاصلے پر تھے اور 91 رنز پر امپائر کے ناانصافہ فیصلے نے ایک خوب صورت اننگ کو قبل از وقت ختم کردیا تھا۔ اگلے آنے والے بلے باز علیم الدین تھے۔ انہوں نے حنیف محمد کے ساتھ مل کر وہ دن پوری احتیاط سے گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی چند منٹ کا کھیل باقی رہ گیا تھا۔ دونوں سر جھکا کر ہر بال کو اس کے میرٹ پر کھیلتے رہے اور جب اس دن کا کھیل ختم ہوا تو پاکستان کا اسکور ایک وکٹ کے نقصان پر ایک سو باسٹھ رنز تھا۔

ابھی تین دن کا کھیل باقی تھا اور کرکٹ میں تو چند اوورز میں پانسا پلٹ جاتا ہے۔ گویا پاکستانی ٹیم کو شکست سے بچنے کے لیے ابھی خاصا طویل سفر طے کرنا تھا۔ میچ کھیل کر جب پاکستانی ٹیم واپس ہوٹل جارہی تھی تو عوام سڑکوں پر جمع ہوکر اس دن کے کھیل پر تبصرہ کررہے تھے۔ تقریباً ہر شخص نے پاکستانی ٹیم کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اگلے روز مزید محتاط ہوکر کھیلنے کا مشورہ دیا۔ اس روز ایسا لگ رہا تھا جیسے پاکستانی ٹیم اپنے ہی ملک میں کھیل رہی ہے۔ عوام کا رویہ اپنے امپائروں کے مقابلے میں کہیں سپورٹنگ اور منصفانہ تھا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اوول پارک کا اسٹیڈیم زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں تماشائیوں کے بیٹھنے کی محدود گنجائش تھی اور میچ دیکھنے کے خواہش مندوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ جن لوگوں کو اندر جانے کے لیے ٹکٹ نہیں ملا انہوں نے میچ دیکھنے کے لیے میدان سے باہر اونچی جگہیں تلاش کیں۔ اسٹیڈیم کے چاروں طرف بلند درخت شاید اسی مقصد کے لیے تھے کہ لوگ ان پر چڑھ کر میچ دیکھ سکیں۔ درخت تو بے شمار تھے مگر دیکھنے والوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ تھی کہ ان کے لیے درخت کم پڑ جاتے تھے۔ ایک ویسٹ انڈین تماشائی یہ مشکل ایک درخت پر جگہ حاصل کرسکا تھا۔ یہ شاخ خاصی پتلی سی تھی اور اس پر بیٹھنے کے لیے خاصی احتیاط کی ضرورت تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے درخت کی دوسری شاخ تھام رکھی تھی۔ یہ تماشائی صرف حنیف محمد کی بلے بازی دیکھنے کے لیے اس خطرناک جگہ بیٹھا تھا۔ ایک بار حنیف محمد نے کسی بالر کو کور ڈرائیو کیا۔ شاٹ اتنا خوب صورت تھا کہ اس تماشائی نے بے اختیار ہاتھ شاخ سے ہٹا کر تالی بجا کر داد دی۔ نتیجہ ظاہر ہے' وہ سر کے بل زمین پر آرہا اور گرتے ہی بے ہوش ہوگیا۔

اس تماشائی کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے اس کے سر کی مرہم پٹی کردی تھی مگر اسے ہوش نہیں آیا۔ اسے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا۔ اسے پورے چوبیس گھنٹے بعد ہوش آیا اور اس نے ہوش میں آتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا کہ حنیف محمد کھیل رہے ہیں یا آؤٹ ہوگئے؟ جب اسے بتایا گیا کہ وہ ابھی کھیل رہے ہیں تو تماشائی دوبارہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے حادثہ کھیل کے تیسرے دن شام کے وقت پیش آیا تھا اور اسے چوتھے دن شام کے وقت ہوش آیا تھا۔ دوبارہ بے ہوش ہونے کے بعد اسے پھر چوبیس گھنٹے تک ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹرز حیران تھے کہ یہ کس قسم کی بے ہوشی ہے۔ کیونکہ تماشائی کو بہ ظاہر کوئی سنگین چوٹ نہیں

آئی تھی۔ اسے دوسری بار میچ کے پانچویں دن ہوش آیا اور اس نے دوبارہ وہی سوال کیا اور جب اسے پہلے والا جواب ملا تو وہ دوبارہ غشی کی حالت میں چلا گیا۔ صورت حال ایسی دلچسپ تھی کہ بات اخبارات تک جا پہنچی اور لوگ کرکٹ اور حنیف کے اس دیوانے کو دیکھنے کے لیے اسپتال آنے لگے۔ بالآخر جب اسے میچ کے چھٹے دن ہوش آیا اور اسے بتایا گیا کہ حنیف محمد آؤٹ ہوگئے ہیں تب کہیں جا کر اس کے حواس پوری طرح بحال ہوئے تھے۔ پتا نہیں وہ حنیف کا دیوانہ تھا یا بار بار صدمے سے بے ہوش ہو رہا تھا۔ بہرحال میچ کے بعد حنیف محمد بھی اس کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال گئے تھے۔

چوتھے دن کھیل کے آغاز پر ویسٹ انڈین بالرز پرامید تھے۔ انہیں علیم الدین سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ زیادہ دیر تک کریز پر بلے بازی کر سکیں گے۔ پچھلی اننگ میں بھی وہ ایک غیر ذمے دارانہ شاٹ کھیلتے ہوئے آؤٹ ہوئے تھے۔ جب اسکور رفتہ رفتہ آگے بڑھا اور علیم بھی پچھلی اننگ کے برعکس صبر و سکون سے کھیلتے رہے تو ویسٹ انڈین بالرز پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ علیم اور حنیف کی جوڑی کسی قدر سست روی سے لیکن مستقل مزاجی کے ساتھ اننگ آگے بڑھا رہی تھی۔ امتیاز احمد کے آؤٹ ہونے کے بعد رنز بنانے کا کام حنیف نے سنبھال لیا تھا۔ ان کے اسٹروکس اور فیلڈرز کے درمیان سے بال نکالنا قابل دید منظر ہوا کرتا تھا۔ عجیب بات تھی' وہ غیر ملکی کھلاڑی تھے اور ابھی ان کی اننگ بھی زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی لیکن تماشائی ان کے ہر اسٹروک پر کھل کر داد دے رہے تھے۔ رنز بنے نہ بنے انہیں حنیف کی بلے بازی سے غرض تھی۔

چوتھے دن پاکستان کی اننگ سست رہی لیکن ویسٹ انڈین بالروں کے حصے میں وکٹ بھی صرف ایک ہی آئی تھی۔ علیم الدین لنچ کے فوراً بعد دوسو چونسٹھ کے اسکور پر آؤٹ ہوگئے۔ انہوں نے حالانکہ.... ذاتی طور پر صرف سینتیس (37) رنز ہی بنائے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف تین گھنٹے تک حنیف محمد کا ساتھ دیا اور ان کی سنچری بنوانے میں مدد دی بلکہ پاکستان کے لیے ایک اور سنچری کی شراکت قائم کی۔ حنیف اور علیم کی شراکت میں ایک سو بارہ رنز کا اضافہ ہوا تھا۔ حنیف نے اپنی سنچری لنچ سے ذرا پہلے مکمل تھی۔ اس میچ میں پہلے بھی دو سنچریاں بن چکی تھیں لیکن تماشائیوں اور خود ویسٹ انڈین کھلاڑیوں نے اس سنچری کی دل کھول کر داد دی۔ یہ داد سنچری سے زیادہ حنیف کے صبر و استقامت پر تھی۔ وہ گزشتہ پانچ گھنٹے سے کریز پر تھے اور ابھی انہیں مزید لمبا سفر طے کرنا تھا۔ تیسرے دن کے کھیل میں پاکستان نے 167 رنز کا اضافہ کیا۔ امتیاز احمد کے آؤٹ ہونے کے بعد رنز بنانے کی رفتار پر واضح برا اثر پڑا تھا۔ پہلے ایک سو ساٹھ رنز صرف آدھے دن کے کھیل میں بن گئے تھے جبکہ اگلے نصف رنز اس سے دوگنے وقت میں بنے مگر اس وقت اہمیت رنز کی نہیں بلکہ وکٹ پر کھڑے رہنے کی تھی اور یہ کام پاکستانی بلے بازوں نے بہ خوبی انجام دیا تھا۔ انہوں نے بالروں کے ساتھ امپائروں کو بھی کوئی موقع نہیں دیا تھا۔

اب بھی ویسٹ انڈیز کی پہلی اننگ کی برتری ختم کرنے کے لیے سوا سو سے زیادہ رنز کی ضرورت تھی۔ اطمینان بخش بات' جس نے پاکستانیوں کا حوصلہ بلند رکھا تھا وہ حنیف محمد کی وکٹ پر موجودگی تھی۔ اس وقت تک وہ کوئی ساڑھے چار سو منٹ تک بلے بازی کر کے ایک سو اکسٹھ رنز 161 رنز بنا چکے تھے۔ بال پرانی ہونے کے سبب گلکرائسٹ اس مردہ وکٹ پر کوئی خاص تاثر چھوڑنے میں ناکام رہے تھے لیکن ہیپر ایرک ایکلنسن اور اسپنر ڈینس نے خاصی اچھی بالنگ کرائی اور وکٹ سے اسپن حاصل کیا تھا۔ مگر وہ حنیف اور پھر سعید احمد کے اعتماد کو متزلزل کرنے میں ناکام رہے جو علیم الدین کے آؤٹ ہونے کے بعد کھیلنے آئے تھے۔ سعید احمد بعد کے سالوں میں پاکستان کے ایک اچھے مڈل آرڈر بلے باز ثابت ہوئے۔ اس وقت وہ بھی بالکل نوجوان تھے اور پہلی بار کوئی ٹیسٹ سیریز کھیل رہے تھے۔

حنیف محمد کتابی بلے بازی کا بہترین مظاہرہ کر رہے تھے۔ چھوڑنے والی بال کو چھوڑ دیتے' روکنے والی بات روک لیتے اور جو بال اسٹروک کی مستحق ہوتی تھی اسے ضرور اسٹروک سے نوازتے۔ ان کا نٹ ورک لاجواب تھا اور توجہ مثالی۔ چوتھے دن کھیل کے اختتام تک وہ اسٹیڈیم میں موجود ہر فرد کے ہیرو بن چکے تھے اور جب تماشائی واپس اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو وہ یہ ارادہ پہلے ہی کر چکے تھے کہ اگلے دن حنیف محمد کی بیٹنگ دیکھنے آئیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ پانچویں دن کا کھیل شروع ہوا تو اسٹیڈیم تو اپنی گنجائش سے کچھ زیادہ بھرا ہوا تھا ہی، اردگرد دستیاب ہر ایسی جگہ پر لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے جہاں سے میدان نہ سہی اس کے وسط میں وکٹ ہی نظر آتی ہو۔

پانچویں دن جب کھلاڑی میدان میں آئے تو وکٹ بدستور بلے بازوں پر مہربان تھی۔ اگرچہ اب اس پر رنز اسکور کرنا ذرا مشکل ہو رہا تھا یعنی اگر کوئی کھلاڑی رکنے کا ارادہ کر لے تو کسی بھی بالر کے لیے اسے آؤٹ کرنا دشوار ترین کام ثابت ہو سکتا تھا۔ کھیل کا آغاز ہی سست روی سے ہوا۔ حنیف

اور سعید پوری توجہ وکٹ پر ٹھہرنے پر مرکوز کیے ہوئے تھے۔ حنیف خاص طور سے اب اتنے سیٹ ہو چکے تھے کہ انہیں کسی بالر سے ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہاں امپائرز کا خوف ضرور تھا۔ اب تک وہ چار فیصلے پاکستانی بلے بازوں کے خلاف دے چکے تھے اور تقریباً اتنی ہی بار ویسٹ انڈین بلے بازوں کو آؤٹ نہیں دیا گیا تھا۔

بیٹ اور بال کی اس کش مکش سے بور ہونے کے بجائے تماشائی پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ وکٹ نہیں گر رہی ہے اور رنز بھی سستی سے بن رہے ہیں۔ وہ دونوں ٹیموں میں کرکٹ کی اعصابی سنسنی خیزی کو محسوس کر رہے تھے۔ ہر اچھی بال پر داد دیتے تھے تو ہر اچھے اسٹروک کو بھی دل کھول کر سراہتے تھے۔ تیسری وکٹ کی شراکت میں پاکستان کا اسکور 118 تک جا پہنچا تھا۔ اس موقع پر عمدگی سے کھیلنے والے سعید احمد اسمتھ کی ایک پرفریب آؤٹ سوئنگر پر وکٹ کیپر و کپتان الیگزینڈر کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہوگئے۔ لنچ سے ذرا پہلے کرنے والی اس وکٹ نے پاکستان کے اسکور میں ایک سو چون رنز کا اضافہ کیا تھا۔ یہ مسلسل تیسری سنچری پارٹنر شپ تھی۔ عجیب بات ہے کہ جارحانہ کھیل کے لیے مشہور سعید نے اتنی بڑی شراکت میں صرف 65 رنز اسکور کیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بالرز کا زیادہ سامنا خود حنیف محمد کر رہے تھے۔

عام طور پر پورا دن وکٹ پر گزارنے والے بلے باز کا تھکن سے ایسا برا حال ہو جاتا ہے کہ وہ بس جا کر بستر پر آرام کرنا چاہتا ہے۔ حنیف کو تو وکٹ پر کھڑے ڈھائی دن ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جب وہ واپس ہوٹل جاتے تو ان کے انداز سے تھکن کے بجائے ایک قسم کی تازگی جھلک رہی ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اعصاب شکن ماحول میں پر مشقت بلے بازی کے بجائے کہیں تفریح کر کے آ رہے ہیں۔ ہوٹل آنے کے بعد رات کا کھانا کھا کر بعض اوقات وہ باہر ٹہلنے بھی چلے جاتے تھے۔ دوسروں کو حیرت ہوتی تھی کہ اس نارمل سی جسامت والے نوجوان کے جسم میں کتنی توانائی بھری ہوئی ہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ حنیف محمد نے اسکول کے زمانے میں ماسٹر عزیز سے کتنی کڑی ٹریننگ لی تھی۔ انہوں نے کم عمری سے حنیف کو سخت ورزشیں کرائی تھیں جو بلے بازی کی مشق کے علاوہ ہوا کرتی تھیں۔ ان ہی مشقوں سے حنیف محمد کا اسٹیمنا اسی لائق ہوا تھا کہ بے حد طویل اننگ کھیلنے کے باوجود نہیں تھکتے تھے۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ وہ خاصی دیر تک وکٹ پر رہے' پاکستان کی ڈومیسٹک کرکٹ کے فرسٹ کلاس میچوں میں بھی وہ کئی بار طویل اننگز کھیل چکے تھے۔

پانچویں دن وہ آہستگی سے لیکن مستقل مزاجی سے اپنی اننگ آگے بڑھاتے رہے۔ وہ اتنی درست بلے بازی کر رہے تھے کہ اب تک انہوں نے ایک چانس بھی نہیں دیا تھا۔ ڈینس کی اسپن ہوتی بالوں پر کئی بار ان کے خلاف ایل بی ڈبلیو کی زوردار اپیل ہوئی تھی مگر امپائرز نے انہیں ناٹ آؤٹ قرار دیا۔ درحقیقت ان اپیلوں میں کوئی جان نہیں تھی۔ گیند ہر بار وکٹوں سے خاصی دور جا رہی ہوتی تھی۔ پانچویں دن لنچ کے وقفے کے بعد وکٹ میں ٹوٹ پھوٹ کے آثار اب نمایاں ہونے لگے تھے اور اس سے اسپنرز کو بال گھمانے میں خاصی مدد مل رہی تھی۔ اس وجہ سے حنیف اور ان کے ساتھ نئے آنے والے ان کے بڑے بھائی وزیر محمد کو خاصی محتاط بلے بازی کرنا پڑ رہی تھی۔ سعید کو آؤٹ کرنے کے بعد ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کی یہ امید کہ وہ جلد باقی پاکستانی بلے بازوں کو پویلین بھیج کر میچ پر اپنی گرفت دوبارہ مضبوط کر لیں گے' وزیر اور حنیف کی جوڑی نے خاک میں ملا دی۔ دونوں بھائی مثالی ہم آہنگی سے بلے بازی کرتے رہے اور وہ رفتہ رفتہ پاکستانی ٹیم کو اننگ کی شکست کے خطرے سے دور لے جا رہے تھے۔

کپتان الیگزینڈر نے مایوس ہو کر آخری حربے کے طور پر نئی گیند لے لی۔ گلکرائسٹ نے بے حد تیز گیندیں پھینکیں مگر حنیف اور وزیر کو متاثر کرنے میں ناکام رہے۔ پانچویں دن جب کھیل ختم ہوا تو پاکستان نے پانچ سو پچیس رنز بنا لیے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ اس سارے دن میں جان مارنے کے بعد ویسٹ انڈین بالرز صرف ایک وکٹ حاصل کر سکے تھے۔ اس دن پاکستان نے گزشتہ دن کے مقابلے میں نسبتاً بہتر کارکردگی دکھاتے ہوئے 186 رنز بنائے تھے۔ حنیف محمد نے گزشتہ روز کے اسکور 161 میں مزید 109 رنز کا اضافہ کیا اور دن کے خاتمے پر 270 رنز پر کھیل رہے تھے۔ جب وہ دوسو رنز تک پہنچے تو پہلی بار انہوں نے اپنے اسکور پر غور کیا تھا ورنہ اب تک حنیف محمد کی ساری توجہ صرف وکٹ پر کھڑے رہنے پر مرکوز تھی۔ دوسو کا ہندسہ عبور کرنے اور ویسٹ انڈیز کی پہلی اننگ کے اسکور کا بوجھ اتارنے کے بعد حنیف محمد نے پہلی بار سنجیدگی سے اپنی اس اننگ کو لینا شروع کیا۔ جب وہ واپس ڈریسنگ روم کی طرف آ رہے تھے تو ان کے ذہن میں تین سو کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ ڈریسنگ روم میں آ کر انہیں پتا چلا کہ ان کے سارے ساتھی بھی ان کی ٹرپل سنچری کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ سب اپنی اپنی بولیاں بولنے لگے۔

''یار حنیف! کل شیر کی طرح کھیلنا'' امتیاز احمد نے اپنے مزاج کے مطابق مشورہ دیا ''ان کالوں کی ٹھیک سے پٹائی لگانا۔''

''بالکل۔ اب حنیف بھائی کو ان سے دب کر کھیلنے کی ضرورت نہیں ہے'' سعید احمد نے لقمہ دیا۔

''نہیں یار! کل حنیف کو اور زیادہ محتاط ہونا ہوگا'' کاردار سنجیدگی سے بولے ''بات اتنے بڑے اعزاز کی ہے' یہ صرف حنیف کا ہی نہیں بلکہ پاکستان کا اعزاز بھی ہوگا۔''

حنیف خاموشی سے مسکراتے ہوئے پسینے میں شرابور پیڈز اور دستانے اتار رہے تھے۔

☆☆☆

صرف حنیف محمد اور پاکستانی ٹیم ہی نہیں بلکہ سارے بارباڈوز کے ذہن میں یہی سوال تھا کہ کل حنیف محمد اپنی ٹرپل سنچری مکمل کرسکیں گے یا نہیں؟ اس رات حنیف کو اس وجہ سے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آئی تھی لیکن اگلے روز وہ اٹھے تو حسب معمول تر و تازہ تھے۔ بچپن سے انہیں سحر خیزی کی عادت تھی۔ رات کو کتنی ہی دیر سے سوئیں' صبح جلدی بیدار ہوجاتے تھے۔ حسب معمول ناشتے سے فارغ ہوکر پاکستانی ٹیم جلد اسٹیڈیم پہنچ گئی تھی تاکہ خود کو وارم اپ کرسکے اور کھلاڑی حیران رہ گئے جب انہوں نے صبح کے وقت ہی بے شمار لوگوں کو پہلے سے اسٹیڈیم میں براجمان پایا۔ صرف حنیف اور ان کے ساتھیوں کو ہی نہیں بلکہ تماشائیوں کو بھی حنیف محمد کی اس اننگ کا انتظار تھا۔

وارم اپ سے فارغ ہوکر حنیف اور ان کے ساتھی اخبارات دیکھنے لگے تقریباً تمام اخبارات کی شہ سرخی حنیف کے بارے میں تھی۔ ایک اخبار نے انہیں ''اسٹیمنا کا شاہ'' قرار دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا ''آج کے دور میں کسی بھی شخص کے لیے ساڑھے سات سو منٹ وکٹ پر کھڑے رہنا باعث فخر ہوسکتا ہے لیکن حنیف کے لیے نہیں' کیونکہ اس کے لیے یہ عام سی بات لگتی ہے۔''

ایک اور اخبار نے لکھا ''اوول پارک کے میدان پر آج تک کسی بلے باز نے اتنی استقامت سے وکٹ پر قیام نہیں کیا۔ جب حنیف محمد کھیل رہے ہوتے ہیں تو لگتا ہے انہیں وکٹ سے ہٹانے کے لیے کسی بالر کی نہیں بلکہ پولیس کے ایک دستے کی ضرورت پڑے گی۔''

باقی اخبارات نے بھی شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ ان الفاظ نے حنیف کو متاثر کیا تھا مگر اتنا نہیں کہ ان کی توجہ اپنی اننگ سے ہٹ جاتی۔ وہ جانتے تھے کہ اس ساری تعریف اور توصیف کے وہ اس وقت حقدار ہوں گے جب اپنی اننگ کو... واقعی کارنامہ بنادیں گے۔ ان کی نظریں لین ہٹن کے 364 رنز کے ریکارڈ پر مرکوز تھیں (واضح رہے' اس وقت تک گیری سوبرز نے 365 رنز بنانے کا کارنامہ انجام نہیں دیا تھا اور یہ موقع انہیں 1958ء کی اس سیریز کے دوران میں ہی مل گیا تھا) اس وقت تک صرف چار افراد نے ٹرپل سنچری بنانے کا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ان میں سے تین کا تعلق انگلینڈ سے تھا اور ایک یعنی بریڈمین آسٹریلیا سے تعلق رکھتے تھے۔ بریڈمین کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل تھا کہ انہوں نے دو بار ٹرپل سنچری بنائی۔ (پچھلے دنوں ویسٹ انڈیز کے برائن لارا نے بھی اس فہرست میں اپنا نام درج کروالیا ہے۔ وہ 375 اور 400 رنز کی اننگز کھیل کر دو ٹرپل سنچریاں بنانے والے دوسرے کرکٹر بن گئے ہیں)

حنیف کا اولین ہدف تو ٹرپل سنچری مکمل کرنا تھا۔ اس کے بعد ان کے آگے اینڈی سینڈہم کے تین سو پچیس رنز تھے پھر سر والٹر ہیمنڈ کے 336 رنز اور سب سے آخر میں سر لین ہٹن کا تین سو سو چونسٹھ رنز کا عالمی ریکارڈ تھا۔ یہ تمام اہداف ان کی منزل تھے۔ ایک ایک کرکے انہیں ان اہداف کو حاصل کرنا تھا مگر پانچ دن کے کھیل کے بعد وکٹ خستہ ہوچکی تھی۔ اس پر شکست و ریخت کے آثار نمایاں تھے۔ خاص طور پر فاسٹ بالرز کے لیے اس پر گیند اٹھانا محال ہوگیا تھا۔ یہ اصول ہے کہ جن وکٹوں پر گیند اٹھ کر نہ آئے' وہ نہ صرف بالروں بلکہ بلے بازوں کے لیے بھی مشکل ہوجاتی ہیں۔ ان پر رنز آسان ہوتا ہے لیکن رنز بنانا بے حد دشوار ہوجاتا ہے۔ انہیں عام طور سے مٹی رو یے والی وکٹیں کہا جاتا ہے جو کھیل کو سست اور بور کردیتی ہیں۔ پاکستان' انڈیا اور سری لنکا میں عام طور سے اسی قسم کی وکٹیں ملتی ہیں۔ اگر ان وکٹوں پر فی اوور رنز اور فی وکٹ گیندوں کا تناسب نکالا جائے تو یہ آسٹریلیا اور انگلینڈ کی وکٹوں سے مختلف نکلے گا۔ خاص طور سے آسٹریلیا میں نہ صرف فی اوور رنز زیادہ بنتے ہیں بلکہ وہاں فی وکٹ گیندوں کا تناسب بھی کم ہے۔ اس کی وجہ وہاں کی زیادہ اچھال والی وکٹیں ہیں جو بلے بازوں اور بالروں کو یکساں مدد دیتی ہیں۔

خوابوں میں آسان نظر آنے والا ہدف حقیقت میں بے حد دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ ایک ایک بال کو بے حد احتیاط سے کھیلنا پڑ رہا تھا۔ خاص طور سے ڈینس کی گیندیں نہ صرف تیز اسپن لے رہی تھیں بلکہ وہ بیٹھ کر بھی آرہی تھیں۔ نیچی گیندوں کے پیڈز پر لگنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور ویسٹ انڈین امپائرز ذرا سے شبے پر فیصلہ اپنے بالر کے حق میں دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے لہٰذا ایسی گیندوں پر رنز بنانا اور بھی دشوار کام تھا۔

انہوں نے ہی پہلی کامیابی حاصل کی۔ وزیر محمد جو گزشتہ روز 30 کے اسکور پر کھیل رہے تھے' اپنے اسکور میں صرف پانچ رنز کا اضافہ کرکے 35 رنز پر آؤٹ ہوگئے۔ اس وقت ٹیم اسکور 539 رنز تھا۔ معمولی اسکور کے باوجود وزیر نے نہ صرف چار گھنٹے وکٹ پر گزارے بلکہ حنیف کے ساتھ مل کر اسکور میں 121 رنز کا اضافہ بھی کیا تھا۔ یہ پاکستان کی جانب سے مسلسل چوتھی سنچری شراکت تھی۔ اس وقت تک ایک اننگ میں مسلسل تین سنچریوں کی شراکت کا ریکارڈ انگلینڈ کے پاس تھا اور اسی اننگ میں سر لین ہٹن نے ریکارڈ 364 رنز بنائے تھے اور انگلینڈ نے اس اننگ میں ریکارڈ 903 رنز بنائے تھے۔ (بعد میں یہ ریکارڈ سری لنکا کی ٹیم نے انڈیا کے خلاف 952 رنز بنا کر توڑ دیا)۔

وزیر محمد امپائر کے غلط فیصلے کا نشانہ بنے تھے۔ جس گیند پر وہ آؤٹ قرار دیا گیا تھا وہ ان کے بلے کو چھوئے بغیر گئی تھی۔ اس کے باوجود امپائر کی انگلی فضا میں بلند ہوچکی تھی اور وزیر کو واپس جانا پڑا تھا۔ وزیر کے بعد ویلس میتھائس کھیلنے آئے لیکن وہ زیادہ دیر حنیف کا ساتھ نہ دے سکے۔ ایرک کی ایک ''ان سوئنگر'' ان کے پیڈز سے ٹکرائی اور امپائر نے بالر کی اپیل پر اپنی انگلی اٹھانے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اب پاکستان کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہوچکے تھے اور صرف کپتان کاردار ہی ایک ایسے کھلاڑی رہ گئے تھے جن سے کچھ دیر وکٹ پر رہنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

چنانچہ میتھائس کے بعد کپتان کاردار کریز پر آئے اور انہوں نے آتے ہی حنیف سے کہا ''ڈٹے رہنا حنیف! یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ انشاء اللہ تم لین ہٹن کا ریکارڈ ضرور توڑو گے۔''

کاردار اگرچہ مستند بلے باز نہیں تھے لیکن وکٹ پر کھڑے رہنا جانتے تھے۔ اس موقع پر حنیف نے فیصلہ کیا کہ انہیں اب زیادہ تر بالرز کا خود سامنا کرنا ہے اور رنز بنانے کی رفتار بھی تیز کرنی ہے۔ کیونکہ کاردار کے بعد کوئی ایسا بلے باز نہیں تھا جو وکٹ پر کھڑا رہ کر ان کا ساتھ دیتا۔ وکٹ اس قدر سست ہوگئی تھی کہ ایک ایک رن کے لیے خاصی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لنچ تک حنیف اپنی ٹرپل سنچری مکمل نہیں کرسکے تھے۔ مگر ان کے مسلسل سامنے رہنے کی وجہ سے ویسٹ انڈین بالرز بھی مزید کوئی وکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے تھے۔

لنچ تک پاکستان' ویسٹ انڈیز پر سو رنز سے زائد کی برتری حاصل کرچکا تھا اور اگر پاکستانی چائے کے وقفے تک کھیل جاتے تو بیچ بچ سکتا تھا۔

اس کے برعکس ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کا خیال تھا۔ اگر انہوں نے پاکستان کے باقی ماندہ کھلاڑیوں کو چائے کے وقفے تک آؤٹ کردیا تو ان کے بلے باز تیز رفتاری سے کھیل کر باآسانی یہ ٹیسٹ جیت سکتے تھے۔ مگر کاردار اور حنیف نے ان کا یہ آخری خواب بھی چکنا چور کردیا۔ لنچ کے بعد جب حنیف واپس کریز پر آئے تو اننگ میں پہلی بار ان پر اضطرابی کیفیت نظر آئی۔ لنچ کے بعد تیسرے اوور میں انہوں نے اس تاریخی سنگ میل کو عبور کرلیا جو ان کے علاوہ مشکل سے درجن بھر کھلاڑیوں کے حصے میں آیا ہے۔ وہ ٹرپل سنچری بنانے والے دنیا کے پانچویں کھلاڑی تھے۔ کاردار نے انہیں گلے لگا کر اس اعزاز پر مبارک باد دی۔ اسٹیڈیم میں موجود ہر شخص نے انہیں کھڑے ہوکر داد دی تھی۔ حتیٰ کہ انہیں تین دن سے آؤٹ کرنے میں ناکام ویسٹ انڈین کھلاڑی بھی تالیاں بجا رہے تھے۔ حنیف محمد ایک خواب کی سی کیفیت میں کھڑے تھے۔ گزشتہ تین دن میں وہ کتنے ہی جاں گسل مراحل سے گزر کر اس کامیابی تک پہنچے تھے۔

ٹرپل سنچری کے بعد حنیف کے بلے میں تیزی آگئی اور کچھ دیر بعد انہوں نے سینڈہم کے 325 رنز کے ریکارڈ کو بھی توڑ دیا۔ ویسٹ انڈین کھلاڑیوں کی بجھتی امیدوں نے ابھی دم نہیں توڑا تھا۔ ابھی چائے کے وقفے میں پون گھنٹا تھا اور کاردار آخری کھلاڑی تھے جو ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ کسی طرح باقی کھلاڑیوں کو آؤٹ کرکے فتح کی راہ ہموار کی جاسکتی تھی۔ کاردار نے حنیف کے پاس آکر کہا۔

''حنیف! بس ذرا سا ہی فاصلہ رہ گیا ہے' پوری احتیاط سے کھیلو۔''

حنیف اس معاملے میں پہلے ہی فیصلہ کرچکے تھے۔ بے شک انہیں لین ہٹن کا ریکارڈ توڑنے میں پورا دن لگ جائے مگر انہیں کوئی غلط شاٹ نہیں کھیلنا تھا۔ چائے کے وقفے تک کھیل کر کاردار اور حنیف نے ویسٹ انڈیز والوں کی رہی سہی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پاکستان کا اسکور 623 رنز ہوچکا تھا اور اس کی صرف پانچ وکٹیں گری تھیں۔ گویا اسے ویسٹ انڈیز پر ڈیڑھ سو سے زائد رنز کی برتری حاصل ہوچکی تھی۔ حنیف اس وقت 331 رنز پر کھیل رہے تھے یعنی بریڈمین کے ریکارڈ سے 3 رنز والی ہیمنڈ کے ریکارڈ سے 15 رنز اور لین ہٹن کے ریکارڈ سے چونتیس رنز دور تھے۔ اس وقت تک انہیں کھیلتے

ہوئے سولہ گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔

ڈریسنگ روم میں تقریباً ہر فرد نے گلے لگا کر حنیف کو مبارک باد دی اور ساتھ ہی تلقین کی کہ پوری احتیاط سے کھیلیں۔ کوئی غلط شاٹ نہ ماریں کیونکہ ابھی پورے دو گھنٹے کا کھیل باقی تھا' جس میں تینتیس رنز آسانی سے بنائے جاسکتے تھے۔ حنیف حسب عادت خاموش سے سب کی سنتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ تین دن کی تھکن اب ان کی پور پور میں بس گئی تھی لیکن وہ اپنی قوت ارادی اور کڑی ورزش کی وجہ سے کھڑے ہوئے تھے۔ باربادوز کے عوام پہلے ہی انہیں جن تسلیم کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں اتنی دیر تک وکٹ پر کھڑے ہو کر بالروں کا مقابلہ کرنا کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا ہے۔

چائے کے وقفے کے بعد دھڑکتے دل اور آنے والے وقت کے خیال سے امید و یاس میں ڈوبتے ابھرتے حنیف محمد وکٹ پر پہنچے۔ تماشائیوں نے پرجوش تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ کاردار مسلسل ان کی ہمت بندھا رہے تھے۔ کھیل شروع ہونے کے کچھ دیر بعد ہی حنیف محمد بریڈمین کے ریکارڈ سے آگے نکل چکے تھے اور اب ان سے آگے دو ہی نام تھے' سر لین ہٹن اور والی ہیمنڈ۔ اسے عبور کر کے وہ کرکٹ میں سب سے بڑی اننگ کھیلنے کا اعزاز حاصل کر سکتے تھے لیکن

قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی ان کا اسکور 337 رنز ہوا تھا یعنی ہیمنڈ سے ایک رن آگے کہ ایک گیند ان کے بلے کے کنارے پر لگی اور سیدھی وکٹ کیپر الیگزینڈر کے ہاتھوں میں جا کر محفوظ ہوگئی۔ یہ واقعہ اتنا اچانک پیش آیا کہ خود بالر اور وکٹ کیپر بھی ششدر رہ گئے تھے۔ سارا اسٹیڈیم سکتے میں تھا' کسی کو حنیف محمد کے آؤٹ ہونے کا یقین نہیں آرہا تھا۔ خود حنیف محمد بھی کتنی دیر سکتے کے عالم میں کھڑے رہے پھر انہوں نے دھیرے دھیرے ڈریسنگ روم کی طرف چلنا شروع کر دیا اور پھر سکتہ ٹوٹا تو اسٹیڈیم تالیوں کے شور سے گونج اٹھا تھا۔ ہر شخص پوری شدت سے تالیاں بجا رہا تھا۔ حنیف کو ان کی اس مراثھن اننگ پر خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔ ویسٹ انڈیز کے سارے کھلاڑی حنیف کو باؤنڈری لائن تک چھوڑنے کے لیے آئے۔ ڈریسنگ روم میں ان کے ساتھی بیک وقت خوش بھی تھے اور ان کے عالمی ریکارڈ کو نہ توڑنے پر افسردہ بھی۔

حنیف کے اس کارنامے کی خبر ساری دنیا میں پھیل چکی تھی اور انہیں ہر جگہ سے مبارک باد کے تار اور پیغامات آرہے تھے۔ باربادوز کی عوام نے اسی شام ایک ریلی نکال کر انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ حنیف اگرچہ لین ہٹن کا 364 رنز عالمی ریکارڈ نہیں توڑ سکے تھے لیکن انہوں نے اس اننگ میں تقریباً ایک ہزار منٹ وکٹ پر کھڑے رہ کر ایسا عالمی ریکارڈ قائم کیا جس کے ٹوٹنے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ ریکارڈز کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں مگر حنیف کے اس ریکارڈ کے بارے میں جاسکتا ہے کہ یہ کرکٹ کی رہتی تاریخ تک ناقابل شکست رہے گا۔

اس اننگ میں حنیف نے مزید کئی ریکارڈز میں اپنا درج کرائے۔ اس اننگ میں انہوں نے ریکارڈ کھیلیں۔ مسلسل چار وکٹ کی سنچری پارٹنر شپ قائم پاکستان نے 657 رنز بنائے۔ دوسری اننگ میں کسی بھی کا ریکارڈ ہے۔ حنیف نے مسلسل چار دن تک وکٹ پر منفرد اعزاز بھی حاصل کیا جو ان کے علاوہ کسی اور حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ پاکستان نے اس میچ میں یہ ریکارڈ بنایا کہ اس کی دونوں اننگز میں 551 رنز کا فرق تھا۔ آج ٹیسٹ کھیلنے والی کسی ٹیم کی ایک میچ کی دو اننگز میں اتنا بڑا فرق نہیں آیا۔ (یہ تمام ریکارڈز چالیس سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود آج تک قائم ہیں) حنیف محمد نے ٹیسٹ کی دونوں اننگز میں 349 رنز بنائے جو پاکستان کی طرف سے ریکارڈ ہے۔ حنیف محمد اولین کھلاڑی تھے جنہوں نے اپنی پہلی ہی سنچری ٹرپل سنچری کی صورت میں بنائی۔

اگرچہ رنز کے لحاظ سے حنیف محمد کا 337 رنز کا ریکارڈ اب خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور کئی کھلاڑیوں کے نام ان سے آگے جا چکے ہیں لیکن ٹرپل سنچری بنانے والے کسی بلے باز نے اننگ کی شکست کے دباؤ' غیر ملکی سرزمین اور جانب دار امپائروں کے ہوتے یہ کارنامہ انجام نہیں دیا۔ بریڈمین اور آسٹریلیا کے ہی مارک ٹیلر نے بھی غیر ملکی سرزمین پر ٹرپل سنچریاں بنائیں لیکن انہیں ماحول سازگار ملا تھا اور انہیں امپائروں سے بھی کوئی خوف نہیں تھا اور پھر حنیف کی طرح طویل ترین وقت تک وکٹ پر کھڑے رہنے کا اعزاز تو کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ صرف یہی ایک اننگ حنیف محمد کا زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

''میں نے فیکٹری کی پیداوار میں اضافے کے لیے ایک نئی حکمتِ عملی وضع کی ہے۔'' باب نے پُرجوش لہجے میں ہلڈا کو بتایا۔ ''میں نے کارکنوں کے ہاتھ روم جانے کا اوسط وقت نوٹ کیا اور پھر تیار شدہ پرزے لے جانے والے کنویئر بیلٹ کے خالی ہو کر دوبارہ لوڈ ہونے کا وقفہ!'' ہلڈا کو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے شوہر کی بات پر توجہ دینا پڑ رہی تھی۔ ''اور پھر انتظامی حکم نامے کے ذریعے کارکنوں کو پابند کر دیا کہ وہ صرف متحرک پٹے کے خالی اور لوڈ ہونے کے درمیانی وقفے یعنی دو منٹ اور پچپن سیکنڈ کے دوران ہی باتھ روم استعمال کیا کریں، تیسرا منٹ شروع ہوتے ہی جرمانہ عائد ہو جائے گا۔'' باب نے داد طلب نظروں سے ہلڈا کو دیکھتے ہوئے بتایا۔ ''پتا ہے میری اس حکمتِ عملی سے فیکٹری کی مجموعی پیداوار میں دو اعشاریہ

اس کو لمحے شمار کرنے کا خبط تھا۔ وہ دوسروں کی تمام حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتا تھا اور ہر کام میں وقت کی اہمیت کو اولیت دیتا تھا۔ مگر اس قدر اہمیت کہ دوسروں کے لئے تکلیف دہ ہوجاتی تھی۔ یہ بیماری بہت سے لوگوں میں ہوتی ہے، خواہ عادتاً ہو یا ضرورتاً۔ لیکن کیا کوئی بھی شخص اپنے ''وقت'' کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہے؟

ایک ایسے شخص کی کہانی جس نے اپنی لمحہ شماری کی عادت اپنی بیوی میں بھی منتقل کر دی تھی

لمحہ شمار

محمد عباس ثاقب

چار فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔'' اس کے لہجے میں فخر نمایاں تھا۔

''لعنت ہو، اب تو ان بے چاروں کے ہاتھ روم جانے پر بھی پابندی لگ گئی۔'' ہلڈا نے تلخی سے سوچا۔

وہ ہزارویں مرتبہ باب کی ایسی لن ترانیاں سن چکی تھی جب اس نے اپنی باریک بینی، حساب دانی اور لمحہ شماری کی بدولت فیکٹری کی پیداوار میں بہتری پیدا کی تھی۔ اس کی نظر میں کسی بھی پروڈکشن منیجر کی کامیابی کا انحصار ایک ہی بات پر ہوتا ہے۔ وہ ہے وقت کا بہترین استعمال۔ ہلڈا نے اپنی بیزاری کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

باب نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ناشتے کے لیے مقرر کردہ وقت پورا ہو رہا تھا، لہٰذا وہ میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی پلیٹ سنک میں رکھ دی۔ اس نے انڈے اور سادہ توس کو محض چکھنے پر اکتفا کیا تھا کیونکہ وہ ان دنوں اپنے وزن میں ایک اعشاریہ تین پاؤنڈ اضافے سے خاصا فکرمند تھا۔ باب کے ماہرانہ تجزیے کے مطابق ہر اضافی پاؤنڈ عمر کا ایک سال گھٹنے کی علامت تھا۔ وہ دو پاؤنڈ اضافی وزن کے نشان سے ہراساں تھا۔

''آج تمہارا تلا ہوا انڈا اچونسٹھ فیصد کچا تھا۔ ایسے انڈے میں کولیسٹرول کا تناسب انیس اعشاریہ پینتالیس فیصد زیادہ ہوتا ہے۔ آئندہ میرا انڈا پینتالیس فیصد سے زائد کچا نہیں رہنے پائے۔'' باب کے لہجے میں تیکھا پن نمایاں تھا، تاہم ہلڈا نے پھر بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

اسے بخوبی علم تھا کہ انڈے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ یہ بالکل انہی ہزاروں انڈوں جیسا تھا جو وہ شادی سے اب تک باب کو کھلا چکی تھی۔

ہلڈا کی طرف سے جواب نہ ملنے پر باب نے کوئی دسویں مرتبہ اپنی گھڑی دیکھی ''میرا خیال ہے مجھے اب کام پر چلے جانا چاہیے۔ تاخیر مناسب نہیں۔ گزشتہ ہفتے بھی میں دو مرتبہ تین اور ساڑھے چار منٹ دیر سے فیکٹری پہنچا تھا۔''

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ براہِ راست ہلڈا کی جانب دیکھنے سے قاصر ہے۔ وہ اضطرابی کیفیت میں کچن میں موجود اشیا پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ بالآخر اس کی نگاہ ہلڈا پر ٹھہری تو اس کی آنکھیں کسی بھی جذبے یا تاثر سے عاری تھیں۔

باب کی یہی بے حسی اور بیگانگی ہلڈا کو سب سے زیادہ دکھی کرتی تھی۔ اس کی نظر میں ہلڈا کی اتنی ہی اہمیت تھی، اسے اس سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی ریفریجریٹر یا کچن کی درجنوں اشیا سے ہو سکتی ہے۔ البتہ ٹی وی کا مقام اور حیثیت جدا تھی۔ ہلڈا اس شے سے باقاعدہ حسد اور رقابت محسوس کر سکتی تھی۔ وہ باب کا منظورِ نظر جو تھا۔

''کچھ سنا تم نے؟'' باب نے ترشی سے کہا۔ وہ ہلڈا کو نظر انداز کرتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن اگر وہ ایسا کرتی تو یہ توہین باب ہرگز گوارہ نہیں کر سکتا تھا۔

''ہاں ڈیئر۔'' ہلڈا نے اپنے لہجے میں حلاوت لانے کی ہر ممکن سعی کی ''تمہیں لیٹ ہو کر اپنا ریکارڈ داغ دار نہیں کرنا چاہیے، جلدی کرو۔'' وہ خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ باب کو تاخیر ہو، کم از کم اس روز تو ہرگز نہیں۔

ہلڈا باب کا پلیٹ میں بچا کھچا کھانا ڈسٹ بن میں پھینکنے لگی تو اسے لگا کہ کوئی چیز اس کے حلق میں اٹک رہی ہے۔ وہ گزشتہ کچھ عرصے کے واقعات ذہن میں تازہ کر رہی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ باب کا کھانے سے غائب رہنا ابتدائی علامت تھی۔

باب نے اپنی زندگی میں کبھی کھانے کی میز پر پہنچنے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ درحقیقت اس کی ہر عادت پکی تھی اور گھڑی کی سوئیوں کی پابند تھی۔ اس نے بچپن سے ہی انتہائی منظم اور مربوط زندگی اپنائی تھی۔ اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی کے معمولات وقت کی پابندی کی مثال تھے پھر اس نے پیشہ ورانہ زندگی میں کامیابی کا گر سیکھا اور اب وقت کا صحیح استعمال ہی اس کی زندگی کا محور و مقصد تھا۔

ہلڈا نے ابتدائی کچھ دنوں تک خود کو تسلی دی کہ باب کے کھانے پینے کی عادت میں تبدیلی عمر کے وسطی دور میں داخل ہونے کا شاخسانہ ہے لیکن وہ خود کو دیر تک بہلاوے میں نہ رکھ سکی۔ اس سے بہتر کسے معلوم تھا کہ باب اپنی ازدواجی زندگی کے پورے بیس برسوں میں ہر صبح یہی ناشتا کرتا آیا تھا لیکن اب وہ اچانک کولیسٹرول اور کاربوہائیڈریٹس جیسے الفاظ استعمال کرنے لگا تھا۔ آخر وہ کسے بے وقوف بنانا چاہتا ہے؟

دروازہ بند ہونے کے دھماکے نے باب کی رخصتی کا اعلان کیا۔ عین اسی وقت کچن میں موجود چھوٹے ٹی وی سیٹ کی اسکرین پر ولرڈ اسکاٹ کا چہرہ نمودار ہوا، ہلڈا نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی، باب دو سیکنڈ تاخیر سے روانہ ہوا تھا، ہلڈا کو اب اس کے مطابق اپنی مصروفیات میں تبدیلی لانا تھی۔

جہاں تک لگے بندھے معمولات کی غلامی کا تعلق ہے ہلڈا جانتی تھی باب تنہا نہیں ہے، اسے معلوم تھا کہ عین اس وقت کونے والے گھر سے جیمز ولکنز بھی کام پر روانہ ہو رہا ہوگا۔ اسے کام کی فکر ہے، کسی کے جذبات کی نہیں۔ وہ ٹی وی اناؤنسر ولرڈ اسکاٹ سے بھی خار کھاتا تھا۔ ہلڈا نے برتن دھوتے ہوئے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ ہاں وہ جا رہا ہے۔

ہلڈا، اپنے معینہ وقت پر۔ حالانکہ اسے اپنی نوجوان بیوی پر زیادہ توجہ دینا چاہیے! ہلڈا نے سوچا۔

ٹی وی پر اب ایک اشتہار آ رہا تھا، اس کا مطلب، گلی کے دوسری طرف رہنے والی بوڑھی مسز رسل اپنے غلیظ بلے پیسکی کو گھر سے باہر نکال رہی ہوگی۔ اب پیسکی کا رخ سیدھا ہلڈا کے لان کی طرف ہوگا۔

''لو آ گیا منحوس۔ بڑھیا کو قطعاً پروا نہیں کہ پیسکی پڑوس میں کیا گندگی پھیلاتا ہے..... اور اک ذرا میرا کتا پی نٹ اس کے لان میں چلا جائے تو.....''

ہلڈا چراغ پا اپنے پڑوسیوں کی تمام لگی بندھی حرکات سے واقف تھی، وہاں وہ خود کو ان جیسا کبھی نہیں سمجھتی تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ باب کے ساتھ رہتے رہتے اردگرد کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھنا اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ہلڈا کو اس پر کوئی تشویش بھی نہیں تھی، وہ خود بھی روز مرہ کے معمولات کے تابع رہنے میں عافیت محسوس کرتی تھی۔

باب کی عادات میں تغیر نہ صرف اس کے لیے حیران کن تھا، بلکہ وہ کچھ پریشان بھی ہو گئی تھی۔ اس روز تو اس تحیر میں خوف بھی شامل ہو گیا جب باب بال رنگوا کر گھر آیا۔ اس کے روپہلی سیاہی پر نظر پڑی تو ہلڈا کے ہاتھ سے طشتری گرتے گرتے بچی۔ تب اسے یقین ہو چلا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے..... اپنے شک کی تصدیق میں اسے ذرا بھی مشکل نہ ہوئی۔ اب وہ جان چکی تھی کہ یہ گھر کسی بھی وقت اس سے چھن سکتا ہے۔ اتنی بڑی تبدیلی سہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ہلڈا نے اپنے ہاتھ خشک کیے اور تولیہ دوبارہ ریفریجریٹر کے ہینڈل پر لٹکا دیا۔ ٹھیک آٹھ بج کر چودہ منٹ اور پینتالیس سیکنڈ ہوئے تھے، وہ چہل قدمی کے انداز میں گھر کے داخلی دروازے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔ اخبار والے کی پرانی گاڑی کے ٹائروں کی چیخیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں جو حسبِ معمول طوفانی رفتار سے گاڑی دوڑا رہا تھا، اس کی یہ جلد بازی ہلڈا کے لیے اتنی ہی مانوس اور متوقع تھی جتنا کہ شہد کا میٹھا پن۔ اسے اسکول پہنچنے کی بے پناہ جلدی ہوا کرتی تھی۔

اخبار والے لڑکے نے کونے سے اس تیزی میں گاڑی موڑی کہ ایک طرف کے دو پہیے ہوا میں معلق دکھائی دیے لیکن ہلڈا کو راستے میں کھڑا دیکھ کر اسے پوری قوت سے بریک لگانا پڑے۔ ہلڈا نے انتہاء کے انداز میں لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی ''اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں لڑکے، گاڑی کی رفتار حد میں رکھو۔ ایسا نہ ہو تم کسی کو گاڑی سے کچل دو۔''

''راستہ چھوڑ دو خاتون!'' لڑکا چلایا اور اپنی گھڑی کی طرف اشارہ کیا ''اب تو میرا لیٹ ہونا یقینی ہے!''

ہلڈا نے بھی اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور مسکرا دی ''نہیں، تم لیٹ نہیں ہو، عین وقت پر آئے ہو۔'' اس نے سوچا پھر وہ گاڑی کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لڑکے نے مارنے کے انداز میں اخبار ہلڈا کی طرف پھینکا اور پھر پوری قوت سے ایکسی لریٹر دباتا چلا گیا، گاڑی توپ سے نکلے گولے کی طرح آگے بڑھی اور دھویں کی گہری چادر اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔ گاڑی جیسے ہی گلی کے کونے پر پہنچی، ہلڈا کو اپنا شوہر برق رفتاری سے گلی پار کرتا نظر آیا، اسے اپنی خفیہ محبوبہ مسز ولکنز سے ملاقات کی جلدی تھی، اس کی آنکھیں حسین ارمانوں کی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔

''ہاں..... عین وقت پر.....'' ہلڈا نے سوچا۔ تبھی بریکوں کی کریہہ چیخ اس کے کانوں میں گونجی، فضا میں ربر جلنے کی بو پھیل گئی، ساتھ ہی دھاتی بمپر کے زور سے کسی بھاری چیز سے ٹکرانے کی آواز ایک دھماکے کی طرح سنائی دی۔

ہلڈا نے مطمئن انداز میں سر کو جنبش دی۔ بیس سالہ ازدواجی زندگی نے اسے بھی اپنے شوہر کی طرح لمحوں کی پیمائش کا ماہر بنا دیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اس کی نظر بلے پر پڑی جو اس کے لان کی کیاریوں میں رفعِ حاجت میں مشغول تھا ''اب سوچنا یہ ہے۔'' ہلڈا نے با آوازِ بلند سوچا کہ..... ''اس خبیث بلے سے کیسے نمٹا جائے؟''

☆

بزرگ

21 ویں صدی کے آغاز پر تمام دنیا میں بزرگ شہریوں کے اعداد و شمار کچھ اس طرح تھے۔

☆ 65 سے 84 برس کی عمر تک کے بوڑھے افراد کی تعداد 40 کروڑ۔

☆ 85 تا 99 برس کی عمر تک کے بزرگوں کی تعداد 2 کروڑ 85 لاکھ۔

☆ 100 برس یا اس سے زائد عمر کے بزرگ پوری دنیا میں ایک لاکھ 35 ہزار تھے۔

مرسلہ: ہمایوں دین پوری۔ خان پور کٹورا۔

شخصیات کے حوالے سے قارئین کے لئے گذشتہ سالوں کی ایک جھلک

(ماہ اپریل میں شاملِ اشاعت شخصیات پر مبنی تحریروں کی فہرست)

اپنے اجراء کے ساتھ ھی سرگزشت نے مختلف شعبہ ھائے زندگی سے متعلق اھم اور نامور شخصیات کی سوانح اور حالاتِ زندگی کی اشاعت کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ جنوری 1991ء سے اب تک جن شخصیات کو ھم آپ تک پہنچا چکے ھیں ان کی فہرست ماہ بہ ماہ آپ کی یادوں کو تازہ کرنے کیلئے شائع کی جارھی ھے۔ اس شمارے میں اپریل 1991ء سے لے کر اپریل 2004ء تک کی شخصیات کی فہرست دی جارھی ھے۔ آئندہ بھی انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رھے گا۔

سال	عنوان	شخصیت	قلم کار	صفحات
۱۹۹۱	مردِ سرحد	اجمل خٹک	مجاہد بریلوی	16
	ہیرو	وحید مراد	علی سفیان آفاقی	19
۱۹۹۲	خوش قسمت	کرکٹر کپیل دیو	غلام قادر	16
	مصورِ فطرت	مبلغ علی حسن	ساجد امجد	13
	داستانِ بہار	فلم اسٹار بہار	علی سفیان آفاقی	31
۱۹۹۳	شعلہ نوا	آغا حشر کاشمیری	علی سفیان آفاقی	46
	سیّد الاحرار	مولانا حسرت موہانی	ساجد امجد	24
	قیدی شہنشاہ	بہادر شاہ ظفر	ساجد امجد	15
	دیو دل	رستم ہند بوٹا لاہوری (پہلوان)	اختر حسین شیخ	25
۱۹۹۴	داستانِ دامن	شاعر جمہور استاد دامن	اختر حسین شیخ	24
	بھولو برادران	پہلوان بھولو برادران	اختر حسین شیخ	28
	مردِ درویش	الیاس رشیدی	علی سفیان آفاقی	28
۱۹۹۵	ساغر کا دور	ساغر نظامی	ساجد امجد	18
	اندھیرے کی شہزادی	ہیلن کیلر	احمد صغیر صدیقی	9

سال	عنوان	شخصیت	قلم کار	صفحات
۱۹۹۶	باغی شہزادی	لیڈی ڈیانا	علی سفیان آفاقی	53
۱۹۹۷	مدر ٹریسا	مدر ٹریسا	اخلاق احمد	19
۱۹۹۸	دل پھینک	بل کلنٹن	روبینہ رشید	26
۱۹۹۹	داستان ریگانہ	ریگانہ چنگیزی	ساجد امجد	29
	کرشمہ ساز	فلم ساز اسپیل برگ	کاشف زبیر	16
۲۰۰۰	حساب داں	ڈاکٹر سر ضیاء الدین	ساجد امجد	36
	داستانِ نوشاد	موسیقار نوشاد علی	ظہیر ناصر	20
۲۰۰۳	انشاء پرداز	محمد حسین آزاد	ساجد امجد	39
	جانِ عالم	میڈونا	علی سفیان آفاقی	21
۲۰۰۲	شاعرِ مزدور	احسان دانش	ساجد امجد	52
۲۰۰۳	سرتاجِ تاریخ	ابنِ خلدون	ساجد امجد	28

وقار یادگار پاکستانی پوائنٹ

چلتی پھرتی آفاقی کہانیوں کا دلآویز شمارہ

فلمی میلہ

قسط: 126

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرورش میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی تمام تر حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انھیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں در داستاں سرگزشت

بعض موسیقار اس لحاظ سے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ ان کے نام زندگی میں اور اس کے بعد بھی آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگاتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موسیقار کی حیثیت سے ان کا کام بھی قابلِ قدر اور یادگار ہوتا ہے۔ مثلاً انیل بسواس، نوشاد، ایس ڈی برمن، شنکر جے کشن اور سجاد وغیرہ۔ لیکن کچھ موسیقار ناقابلِ فراموش نغمات پیش کرنے کے باوجود شہرت کے معاملے میں اتنے خوش نصیب نہیں ہوتے۔ ان کی موسیقی اور ان کے گیت تو ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں لیکن ان تخلیق کاروں کے نام فراموش کردیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی موسیقاروں میں ایک نام غلام محمد کا بھی ہے۔ پاکیزہ، مرزا غالب، کندن اور فلم ''دل ناداں'' کے گیت کون بھول سکتا ہے۔ لیکن کتنے لوگوں کو یہ یاد ہے کہ اس دلکش اور روح میں اتر جانے والی موسیقی کا خالق ایک ایسا موسیقار تھا جس نے گوشہ نشینی اور قریب قریب گمنامی میں ساری زندگی گزاری۔ انہیں زندگی میں وہ شہرت اور مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے حالانکہ انہوں نے دلوں میں اتر جانے والی موسیقی مرتب کی تھی۔ وہ شہرت اور چمک دمک کی زندگی کے قائل نہ تھے۔ بس چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہتے تھے اور حسین دھنیں مرتب کرکے فضاؤں میں بکھیرتے رہتے تھے۔

اس موسیقار کا نام غلام محمد ہے۔ غلام محمد نے زیادہ فلموں کی موسیقی مرتب نہیں کی، نہ ہی فلم سازوں کے دفاتر کے چکر لگائے۔ جس کسی نے ان سے خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی انہوں نے صرف اسی سے کام کیا۔ اور ایسا کام کیا جو سننے والوں کے دلوں پر نقش بن کر رہ گیا۔ غلام محمد ایک سادہ دل اور درویش صفت انسان تھے۔ ان میں غرور یا احساسِ برتری کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نہ ہی وہ ''انا'' کے گنبد میں بند رہتے تھے۔ ان کی سادگی اور نیک فطرت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب فلم ساز و ہدایت کار راج کپور نے اپنی فلم ''برسات'' کا آغاز کیا تو اس کے موسیقار نو وارد موسیقار شنکر جے کشن تھے۔ راج کپور نے اس فلم کے یونٹ میں بہت سے نئے فن کاروں کو پہلی بار موقع دیا تھا۔ نمی اس فلم میں پہلی بار سائڈ ہیروئن کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئی تھی۔ نغمہ نگار حسرت جے پوری کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ نغمہ نگار شیلندر کو بھی پہلی مرتبہ فلمی نغمات لکھنے کا موقع ملا تھا۔ شنکر جے کشن کی جوڑی کے لیے موسیقار کی حیثیت سے یہ پہلی فلم تھی۔ راج کپور کی یہ ٹیم انہوں نے آخر دم تک اپنے ساتھ ہی رکھی اور اسی کی مدد سے بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راج کپور بذاتِ خود موسیقی کے بہت دلدادہ تھے اور اگر وہ اداکار و ہدایت کار نہ ہوتے تو یقیناً ایک بہت اچھے موسیقار ہوتے۔ اپنی فلموں کی موسیقی پر وہ بہت زیادہ محنت کرتے تھے۔ ان میں خود اعتمادی کی بھی کمی نہ تھی۔ اکثر دیکھا ہے کہ انہوں نے اس عہد کے کامیاب اور معروف ترین موسیقاروں کے بجائے دو نئے نوجوان لڑکوں کو اپنی فلم کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے منتخب کیا۔ فلم ''برسات'' نہ صرف سپرہٹ ثابت ہوئی بلکہ اس کے سارے گانے ہٹ ہوگئے جو آج تک سننے والوں کے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ برسات کی بے مثال کامیابی نے راج کپور کو بطور فلم ساز و ہدایت کار شہرت دی ہی تھی، نرگس پہلے ہی ایک مقبول و معروف اداکارہ تھیں۔ اس فلم سے تعلق رکھنے والے دوسرے فن کار اور تکنیک کار بھی لازوال شہرت سے ہم کنار ہوئے تھے۔ پریم ناتھ، حسرت جے پوری، شیلندر، شنکر جے کشن، ان سب نے بھارت کی فلمی صنعت میں اپنے اپنے شعبوں میں بلند ترین مقام حاصل کیا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ ''برسات'' اور اس کی ٹیم کے ساتھ موسیقار غلام محمد کا تذکرہ کیوں کیا جارہا ہے؟ اس لیے کہ غلام محمد نے اس فلم میں ایک ممتاز کردار ادا کیا تھا اور سب سے پہلے انہوں نے اپنی اداکاری کی ایک ایسی مثال قائم کی جس کو پھر شاید دہرایا نہیں گیا۔

جب ''برسات'' کے گانے

ہم سے ملے تم سجن تم سے ملے ہم

برسات میں

کی دھن کمپوز کرلی گئی تو شنکر جے کشن کو محسوس ہوا کہ سازندوں میں جو ڈھولک بجانے والا یہ فرض ادا کررہا تھا وہ اپنے کام کے ساتھ انصاف نہیں کررہا تھا۔ شنکر جے کشن نے راج کپور سے کہا کہ اس گانے کے لیے صرف ایک ہی طبلہ نواز اور ڈھولک بجانے والا موزوں ترین ہے۔ اگر وہ مل جائے تو اس گانے میں چار چاند لگ جائیں گے۔

''وہ کون ہے؟'' راج کپور نے پوچھا۔

''غلام محمد صاحب!''

''غلام محمد صاحب؟'' راج کپور نے حیران ہوکر کہا ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ وہ نئے موسیقاروں کے لیے ڈھولک بجانے پر کیسے تیار ہوسکتے ہیں؟''

راج کپور نے سچ ہی کہا تھا۔ اس وقت غلام محمد ایک قابلِ ذکر موسیقار بن چکے تھے اور ان کے کئی نغمات بے حد مقبول ہوئے تھے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

شنکر جے کشن نے اصرار کیا ''راج جی! آپ ان سے بات تو کریں۔ وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔''

''مگر ایک مشہور موسیقار سے میں یہ درخواست کرتا ہوا اچھا لگوں گا کہ وہ میری فلم کے ایک گانے کی ریکارڈنگ میں ڈھولک بجائے؟''

شنکر جے کشن کے اصرار پر راج کپور ڈرتے ڈرتے غلام محمد کے پاس گئے اور ان کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا۔

غلام محمد نے بلا جھجک پوچھا ''ریہرسل اور ریکارڈنگ کب ہے؟''

راج کپور کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے انہیں ریہرسل اور صدابندی کی تاریخوں سے مطلع کیا۔ انہوں نے آنے کا وعدہ کرلیا اور گانے کی صدابندی کے وقت وہ ریکارڈنگ ہال میں موجود تھے۔ شنکر جے کشن نے ان کے پیر چھو کر اظہارِ تشکر کیا اور پھر انہیں گانے کی دھن اور ساز ینے کی ترتیب سے آگاہ کیا۔ غلام محمد صاحب ایک عام سازندے کی طرح مقررہ جگہ پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس گانے میں ایسی ڈھولک بجائی جس نے گانے کے حسن میں چار چاند لگا دیے۔ فلم ''برسات'' 1949ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اپنے وقت کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی تھی۔ غلام محمد صاحب نے اس واقعے کا کسی سے تذکرہ بھی نہیں کیا لیکن اپنی سادگی اور انکساری کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ ایسے ہی درویش منش آدمی تھے۔ شاید اسی لیے شہرت اور دولت کے معاملے میں پیچھے رہ گئے اور انہیں وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ حق دار تھے۔

جب نوشاد علی موسیقار بنے تو انہوں نے طبلہ بجانے کے لیے غلام محمد صاحب کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد وہ موسیقار بن جانے کے بعد بھی نوشاد صاحب کو اپنا استاد ہی مانتے رہے اور جب بھی انہوں نے طلب کیا، بلا پس وپیش ان کے گانوں کی صدابندی کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ نوشاد صاحب نے اپنی خودنوشت میں ان کا تذکرہ بہت خلوص، محبت اور تعریف کے ساتھ کیا ہے۔ وہ سپرہٹ فلموں کی موسیقی بھی بناتے رہے مگر نوشاد صاحب کے گانوں کی ریکارڈنگ میں ڈھولک اور طبلہ بجانے سے انہوں نے بھی انکار نہیں کیا۔

نوشاد بھی ایک نیک دل، مخلص اور فرشتہ صفت انسان ہیں۔ دوسروں کی تعریف وہ کھلے دل سے کرتے ہیں۔ غلام محمد صاحب کی خوبیوں کے وہ معترف تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنی تحریر میں بھی کیا ہے۔

نوشاد اور غلام محمد کے تعلقات اور محبت کا ایک واقعہ سن لیجیے۔

فلم ساز، مصنف و ہدایت کار کمال امروہوی نے اپنی فلم ''پاکیزہ'' کا آغاز کیا تو اس وقت وہ بھی فلمی صنعت میں ایک بہت بڑا نام بن چکے تھے۔ اس فلم کا پس منظر لکھنؤ کا تھا اس لیے انہوں نے اس کی موسیقی بنانے کے لیے نوشاد صاحب کا انتخاب کیا اور ان کے پاس جا کر فلم کی موسیقی مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

نوشاد صاحب ہمیشہ سے ایک وقت میں ایک ہی فلم کی موسیقی بنانے کے قائل ہیں۔ انہوں نے کہا ''مجھے آپ کے ساتھ کام کر کے بہت خوشی ہوگی لیکن بدقسمتی سے میں ان دنوں ایک فلم کی موسیقی بنانے میں مصروف ہوں۔''

کمال صاحب فلم کی کہانی نوشاد صاحب کو سنا چکے تھے۔ انہوں نے کہا ''پاکیزہ'' کی کہانی، کرداروں اور ماحول سے آپ آگاہ ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے سوا کوئی دوسرا موسیقار اس کے ساتھ انصاف کر سکے گا۔''

''بمبئی میں ایک سے ایک بڑا موسیقار موجود ہے آپ کے ساتھ کام کرنا کون نہیں چاہے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے'' کمال امروہوی نے کہا ''میں چاہتا ہوں کہ موسیقار ایسا ہو جو فلم کے موضوع اور موسیقی کے ساتھ انصاف کر سکے گا۔''

''نام میں بتا دیتا ہوں۔ پھر آپ خود فیصلہ کرلیں۔'' انہوں نے غلام محمد کا نام تجویز کیا۔

کمال صاحب نے کہا ''نوشاد صاحب! یہ فلم آپ ہی کی محتاج ہے۔ اس کی موسیقی کے ساتھ کوئی دوسرا کیسے انصاف کر پائے گا؟''

نوشاد نے کہا ''آپ میری بات مان کر تو دیکھیے۔ غلام محمد آپ کو مطمئن کر دیں گے۔ یہ میری ضمانت ہے۔''

''لیکن میں تو آپ کو.....''

''میں مجبور ہوں لیکن آپ کو بہت اچھا نعم البدل دے رہا ہوں۔ آپ غلام محمد کو موقع تو دیجیے۔ وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو پھر بھی میری ضرورت پڑ جائے تو میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

غلام محمد اس سے پہلے فلم ''شمع'' میں اپنی موسیقی کی دھومیں مچا چکے تھے۔ ''شمع'' کی موسیقی بہت زیادہ پسند کی گئی تھی۔ کمال امروہوی کو بھی ''شمع'' کی موسیقی پسند آئی تھی۔ نوشاد صاحب کی یقین دہانی پر انہوں نے غلام محمد صاحب کو ''پاکیزہ'' کے موسیقار کی حیثیت سے سائن کرلیا۔

''پاکیزہ'' شروع تو ہوگئی لیکن اس کی تیاری اور تکمیل میں بہت زیادہ وقت لگ گیا۔ فلم کی ہیروئن مینا کماری کی بیماری۔ ان کے اور کمال امروہوی کے اختلافات (اس وقت وہ کمال امروہوی کی دوسری بیگم تھیں)۔ یہ فلم خدا خدا کر کے مکمل ہوئی مگر اس طرح کہ مینا کماری بے حد بیمار تھیں مگر انہوں نے پوری کوشش کر کے فلم کے باقی ماندہ حصوں کی فلم بندی کرائی۔ فلم کے بعض مناظر میں وہ بیمار نظر بھی آتی ہیں۔ بعض جگہ ان کا ڈپلی کیٹ بھی استعمال کیا گیا۔ سب کا خیال تھا کہ یہ فلم اس قدر پرانی ہو چکی ہے کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ فلم کے آخری مناظر جیسے تیسے فلمبند کرانے کے بعد مینا کماری کا انتقال ہوگیا۔ غلام محمد بھی فلم کی ریلیز سے قبل ہی انتقال کر گئے تھے۔ کمال امروہوی نورا نوشاد صاحب کے پاس گئے اور انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔ اس فلم کی پس منظر موسیقی اور دو گانوں کی طرزیں نوشاد صاحب ہی نے بنائی ہیں مگر ان کا معاوضہ غلام محمد صاحب کے گھر والوں کو دلایا۔ نوشاد صاحب نے اپنی یادداشتوں میں تحریر کیا ہے کہ جب کمال صاحب نے انہیں اپنی فلم دکھائی تو یہ ساڑھے آٹھ گھنٹے کی طویل تھی اور فلم کے بعض حصے بے حد سست رفتار اور بور کن تھے۔ نوشاد صاحب نے اسے لاجواب پس منظر موسیقی اور خصوصی ساؤنڈ ایفیکٹس سے سجایا اور جب یہ فلم ریویو کے لیے پیش ہوئی تو سب کی توقعات کے برعکس بے حد کامیاب ہوئی۔ اس فلم کی ایک نمایاں خوبی اس کی موسیقی بھی تھی۔ ذرا ''پاکیزہ'' کے نغمات کو یاد کیجیے۔

1۔ ان ہی لوگوں نے
ان ہی لوگوں نے
لے لینا دوپٹا میرا

اس کے گیت نگار مجروح سلطان پوری تھے۔ گلوکارہ لتا منگیشکر تھیں۔

2۔ چلتے چلتے۔ یوں ہی کوئی مل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے۔
یہ نغمہ کیفی اعظمی نے لکھا تھا۔ گلوکارہ لتا تھیں۔

3۔ ٹھاڑے رہیو بانکے یار رے۔
راجستھان کے لوک گیتوں سے اخذ کیا گیا تھا۔ مجروح سلطان پوری اس کے گیت نگار اور لتا گلوکارہ تھیں۔

4۔ چلو دلدار چلو، چاند کے پار چلو۔
ہم ہیں تیار چلو۔
کیفی بھوپالی نے لکھا تھا اور لتا نے گایا تھا۔

5۔ موسم ہے عاشقانہ۔ اے دل کہیں سے ان کو
ایسے میں ڈھونڈ لانا۔
خود کمال امروہوی کا تحریر کردہ تھا۔ لتا گلوکارہ تھیں۔

6۔ آج ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھیں گے۔
یہ گیت کیفی بھوپالی نے لکھا تھا۔ اسے بھی لتا نے گایا تھا۔

ان نغمات نے ''پاکیزہ'' کو ایک ناقابلِ فراموش فلم بنانے میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ افسوس کہ غلام محمد اس فلم کی کامیابی اور اپنی موسیقی کی مقبولیت دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہے مگر ان کی موسیقی ہمیشہ زندہ رہے گی۔

غلام محمد درحقیقت ایک اعلیٰ درجے کے موسیقار تھے۔ قسمت نے ناموری کے سلسلے میں ان کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اپنے ہم عصر موسیقاروں جیسی شہرت حاصل نہ کر سکے لیکن ان کی موسیقی خود بولتی ہے اور سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اپنی درویش صفت طبیعت کے باعث انہوں نے نام ونمود، پبلسٹی اور سفارش اور خوشامد کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت اچھی موسیقی ترتیب دینے کے باوجود بہت کم لوگ ان کی عظمت سے واقف ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ غلام محمد عمر میں نوشاد صاحب سے بڑے تھے مگر چونکہ نوشاد ان سے پہلے موسیقار کی حیثیت سے نام ومقام پیدا کر چکے تھے اور غلام محمد طبلہ نواز اور ڈھولک بجانے والے کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کر چکے تھے اس لیے انہوں نے نوشاد صاحب کو ہمیشہ استاد کا درجہ دیا اور ان کی کسی بات کو نہیں ٹالا۔ طبعاً وہ کسی کو مایوس کرنے یا صاف جواب دینے کی صلاحیت ہی سے محروم تھے۔

غلام محمد صاحب طبلہ نواز کی حیثیت سے بہت اونچی شہرت کے مالک تھے لیکن دھنیں بنانے کا بھی انہیں شوق تھا۔ راگ راگنیوں اور موسیقی کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں موسیقار بننے کا موقع ملا تو انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرلیا۔

موسیقار کی حیثیت سے ان کی پہلی فلم ''میرا خواب'' تھی جو 1944ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اسی سال ایک اور فلم ''میرا گیت'' بھی ریلیز ہوئی تھی جس میں غلام محمد نے صرف دو گانوں کی طرزیں بنائی تھیں۔ اس فلم میں ان کے علاوہ چار اور موسیقاروں نے بھی گانوں کی طرزیں بنائی تھیں جو کہ اس دور کی روایات کے مطابق نہ تھا۔ اس زمانے میں عموماً ایک فلم کے لیے ایک ہی موسیقار کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ خواہ فلم میں بارہ گانے ہوں یا تیرہ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موسیقی فلموں کی روح تصور کی جاتی تھی اور فلم بین فلم میں اچھی موسیقی کی توقع لے کر سنیما جاتے تھے۔ جس فلم کی موسیقی دلکش ہوتی تھی وہ زیادہ کامیابی حاصل کرتی تھی۔ بہت سے لوگ محض اپنے پسندیدہ گانوں کی خاطر درجنوں بار فلم دیکھا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہ رجحان قائم رہا۔ ہم

نے لاہور اور کراچی میں بذاتِ خود ایسے فلم بین دیکھے ہیں جو پسندیدہ موسیقی سننے کے لیے درجنوں بار فلم دیکھا کرتے تھے اور اپنی پسند کے گانے سن کر اٹھ جاتے تھے۔

مذکورہ بالا دونوں فلمیں غلام محمد صاحب کا ''وارم اپ'' کہی جاسکتی ہیں۔ جس طرح کھلاڑی کھیل شروع ہونے سے پہلے ''ورزش'' اور مشق کرتے ہیں تاکہ پوری طرح کھیل کے ساتھ انصاف کرسکیں یہی معاملہ غلام محمد صاحب کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ انہیں اصل شہرت فلم ''ڈولی'' سے ملی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار ایس کے اوجھا تھے۔ فلم ساز آل انڈیا پکچرز نامی ادارہ تھا۔

''ڈولی'' ایک کامیاب فلم تھی جس میں موسیقی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ یہ فلم 1947ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس فلم نے انہیں قابلِ ذکر موسیقاروں کی صف میں لاکھڑا کیا تھا۔

اس کے بعد انہوں نے فلم ''ٹائیگر کوئن'' کی موسیقی بنائی تھی۔ یہ بھی 1947ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اب وہ نامور اور جانے پہچانے موسیقار بن چکے تھے لہٰذا اگلے سال 1948ء میں ان کی چار فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ ان میں ایس ایم یوسف کی سپرہٹ معاشرتی فلم ''گرہستی'' ایم صادق کی ''کاجل'' ہدایت کار نجم نقوی کی ''پرائی آگ'' اور انصر ٹھاکر کی فلم ''پگڑی'' شامل تھیں۔ ان فلموں کی موسیقی کو بہت پسند کیا گیا، خصوصاً یہ نغمات۔

1۔ دن پہ دن بیتے جائیں۔ (فلم ''کاجل'' گلوکارہ ثریا)

2۔ تاروں بھری رات ہے پر تو نہیں (فلم کاجل۔ گلوکار محمد رفیع، ثریا)

3۔ ترے ناز اٹھانے کو دل چاہتا ہے (فلم گرہستی، گلوکار شمشاد بیگم، کمیش)

4۔ دل کی لگی زبان پہ آئے تو کیا کروں (فلم پگڑی، گلوکارہ ستارہ کانپوری)

1949ء میں ان کی فلموں ''دل کی بستی'' ''پارس'' اور ''شاعر'' کی نمائش ہوئی۔ شکیل بدایونی کے نغمات کی غلام محمد نے بہت خوبصورت طرزیں بنائی تھیں۔

''پارس'' موسیقی کے اعتبار سے سب سے زیادہ مقبول فلم تھی۔ یہ گانے آج بھی سننے والوں کو یاد ہیں۔

1۔ یہ دنیا ہے یہاں دل کا لگانا کس کو آتا ہے
ہزاروں پیار کرتے ہیں، نبھانا کس کو آتا ہے

2۔ تم ہم کو بھلا بیٹھے ہو
ہم تم کو بھلائیں کیسے (گلوکارہ ثریا)

3۔ تو دور ہے آنکھوں سے (گلوکارہ لتا)

1950ء میں ان کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں جن کی موسیقی دل لبھانے والی تھی۔ ان میں ایم صادق کی ''پردیس'' کے بی لال کی ''ہنستے آنسو''۔ صغیر عثمانی کی ''مانگ''۔ چوتھی فلم ''رشید دلہن'' تاخیر سے مکمل ہوئی اور سلیقے سے تمام ملک میں ریلیز بھی نہ ہوسکی۔ ''پردیس'' صحیح معنوں میں ایک میوزیکل فلم تھی جس کے سبھی گانے ہٹ ہوئے تھے۔

''امبر'' اور ''نازنین'' میں بھی ان کی موسیقی بہت پسند کی گئی ہے۔ ''بکھرے موتی'' اور ''شیشہ'' کی موسیقی کو بھی بہت پسند کی گئی تھی۔

1953ء میں ان کی چھ فلموں کی نمائش ہوئی۔ ان میں اے آر کاردار کی ''دل ناداں''۔ انچ ایف حسن کی ''گوہر''۔ امر ناتھ کی ''لیلیٰ مجنوں'' اروڑہ کی ''ریل کا ڈبا'' شامل ہیں۔ مذکورہ بالا فلموں کے کچھ مشہور نغمات ذرا یاد کیجیے۔

1۔ چاندنی راتوں میں جس دم یاد آجاتے ہو تم (فلم نازنین گلوکار طلعت محمود)

2۔ قسمت بنانے والے تیرا جواب نہیں
میں تجھ کو یہ بتاؤں کہ دنیا تری ہے کیا (فلم پردیس، گلوکارہ لتا)

3۔ میرے گھونگھر والے بال اور راجا گھونگھر والے بال (فلم پردیس، گلوکارہ لتا)

4۔ ہم ان کو سمجھتے ہیں امید کا ستارہ (فلم نازنین، گلوکارہ لتا)

5۔ خوشی کل سے ہنسی ہونٹوں سے رخصت ہوتی جاتی ہے (فلم شیشہ، گلوکارہ لتا)

6۔ ٹوٹے گی نہ پیار کی ڈور۔
دنیا چاہے لگالے زور (فلم امبر۔ گلوکارہ لتا)

7۔ ہم پیار تم ہی سے کرتے ہیں (فلم امبر۔ گلوکارہ لتا)

''دل ناداں'' موسیقی کے اعتبار سے سپرہٹ فلم تھی۔ اس کے نغمات (اور غلام محمد صاحب کی اکثر فلموں کے نغمات) شکیل بدایونی نے لکھے تھے۔ بات یہ تھی کہ شکیل بدایونی نوشاد صاحب کے مستقل گیت نگار تھے۔ یہی روایت غلام محمد صاحب نے بھی اپنائی تھی۔ اس فلم کے یہ گانے بے حد مقبول ہوئے تھے۔

1۔ جو خوشی سے چوٹ کھائے وہ جگر کہاں سے لاؤں (گلوکار طلعت محمود)

2۔ یہ رات سہانی رات نہیں (گلوکار طلعت محمود)

3۔ زندگی دینے والے سن۔ تیری دنیا سے دل بھر گیا
میں یہاں جیتے جی مر گیا..... (گلوکار طلعت محمود)

4۔ خاموش زندگی کو اک افسانہ مل گیا (گلوکار جگجیت کور)

5۔ محبت کی دھن بے قراروں سے پوچھو (طلعت محمود، [illegible])

فلم لیلیٰ مجنوں میں غلام محمد کا ایک نغمہ ناقابلِ فراموش

آسماں والے تری دنیا سے دل گھبرا گیا (گلوکار طلعت محمود)

اس کے علاوہ۔

1۔ مری زندگی پہ نہ تم مسکرانا (فلم ہزار راتیں، گلوکارہ [illegible])

2۔ تری یاد آرہی ہے۔ (گلوکار محمد رفیع فلم ہزار [illegible])

1951ء میں غلام محمد کی یادگار فلم ''مرزا غالب'' کی [illegible] ہوئی۔ مرزا غالب اس عظیم اردو شاعر کی زندگی پر بنائی جانے والی پہلی فلم تھی (دوسری اور آخری فلم اس کا چربہ تھی جو پاکستان میں اسی نام سے بنائی گئی تھی۔ غالب کی غزلیں بھی فلموں کی تبدیلی کے ساتھ وہی تھیں۔ بھارتی مرزا غالب کی [illegible] ثریا تھیں۔ پاکستان میں یہ کردار نور جہاں نے ادا کیا تھا۔ دونوں نے ایک ہی غزل گائی تھی اور یہ غزلیں سننے کے قابل اور ناقابلِ فراموش ہیں۔

''مرزا غالب'' کے فلم ساز و ہدایت کار سہراب مودی [illegible] پارسی تھے۔ اردو زبان سے نابلد تھے لیکن انہوں نے اردو کے عظیم ترین شاعر کے بارے میں ایک صد ابہار فلم بنائی۔ اس کے لیے بڑی چھان بین اور تحقیق کی۔ درحقیقت اس فلم میں اس دور کی دہلی کا صحیح ماحول اور مرزا غالب کی شخصیت کا [illegible] حد تک صحیح نقشہ پیش کیا گیا تھا جبکہ پاکستانی مرزا غالب میں یہ خوبیاں نہ تھیں۔ بیسویں صدی کے آخری حصے میں گلزار نے ''مرزا غالب'' کے نام سے ایک ٹی وی سیریل بنائی تھی۔ اس کا بہت شہرہ ہوا تھا لیکن گلزار تو دہلی کا معاشرہ اور مرزا غالب کا صحیح حلیہ تک نہ پیش کرسکے۔ پاکستانی مرزا غالب میں سدھیر غالب کے روپ میں تھے۔ گلزار کی ٹی وی سیریل میں نصیر الدین شاہ نے غالب کا روپ دھارا تھا۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ بھارت بھوشن اس کردار میں سب سے زیادہ جچے اور سجے تھے۔ ان کی اداکاری بھی بہت اچھی تھی۔ (اسی سال ایس ایم یوسف کی فلم ''گزارہ'' بھی ریلیز

ہوئی تھی جس کی موسیقی غلام محمد نے بنائی تھی لیکن ''مرزا غالب'' کے نغمات کے سامنے یہ موسیقی ماند پڑ گئی تھی)

مرزا غالب کی غزلیں، غلام محمد کی سادہ لیکن پراثر طرزیں اور ثریا کی آوازوں نے اس فلم کی موسیقی کو لازوال بنادیا۔ یہ غزلیں آج بھی ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس فلم کے نغمات نے سارے برصغیر میں دھومیں مچادی تھیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے دور دراز اردو نہ سمجھنے والے علاقوں میں بھی اس فلم کے نغمات بھی بے حد پسند کیے گئے اور آج بھی دلوں پر نقش ہیں۔

مرزا غالب میں غالب کی یہ غزلیں شامل تھیں۔

1۔ دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے (گلوکار۔ طلعت محمود، ثریا)

2۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا (گلوکار طلعت محمود)

3۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو (گلوکارہ ثریا)

4۔ نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کہا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے (ثریا)

5۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا (گلوکار ثریا، طلعت محمود)

غالب کو مشکل پسند شاعر کہا جاتا ہے جس کے اشعار کی لاتعداد شرحیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایسے شاعر کے کلام کو مقبول عام کر دینا سہراب مودی اور غلام محمد ہی کا کارنامہ ہے، ورنہ کہاں مرزا غالب کی غزلیں اور کہاں فلموں کی موسیقی۔ یہ بھاری پتھر ہے جسے کسی نے اس سے پہلے چھونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔ یہ سعادت سہراب مودی کے حصے میں آنی تھی۔ غالب کو برصغیر کے بچے بچے سے متعارف کرانا سہراب مودی اور غلام محمد کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔ سہراب مودی کو اللہ نے اس کام کا صلہ یہ دیا کہ مرزا غالب کاروباری اعتبار سے بھی بے حد کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ غلام محمد کو بھی اس فلم نے کافی شہرت اور عزت بخشی۔

سہراب مودی کی فلم ''کندن'' بھی ایک سپرہٹ فلم تھی۔ اس کے موسیقار بھی غلام محمد ہی تھے۔ نغمہ نگار شکیل بدایونی تھے۔

1957ء میں ایس ایم یوسف کی فلم ''پاک دامن'' میں غلام محمد نے موسیقی مرتب کی۔ حیرت کی بات ہے کہ مرزا غالب اور کندن جیسی فلموں کا موسیقار ایک سال تک بے کار بیٹھا رہا۔ ''پاک دامن'' ایک سوشل فلم تھی۔ عورتوں نے اسے بہت پسند کیا لیکن اس کی نمایاں خصوصیت اس کی موسیقی تھی۔ اس کے اگلے برس غلام محمد نے ایس ایم یوسف کی فلم ''مالک'' کی بہت اچھی موسیقی بنائی۔ ایسے تخلیق کار اور فن کار کو بمبئی کے دوسرے بڑے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے موسیقی بنانے کے لیے منتخب نہیں کیا۔ اس کا سبب کیا تھا؟ غلام محمد کی قناعت پسندی، فلم سازوں کی پارٹی بازی یا موسیقاروں کا غلام محمد کے خلاف اتحاد؟ بہرحال یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ غلام محمد کو ان کی صلاحیتوں اور کارکردگی کے مساوی مقام اور کام نہ ملا۔

اس کے بعد غلام محمد کی جو فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں ان میں صرف ''دوغنڈے'' تھی۔ ایک سال تک غلام محمد پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے لیکن 1961ء میں ان کی فلم ''شیخ'' نے غلام محمد کی موسیقی کا ایک بار پھر ڈنکا بجادیا۔ اس فلم کے گیت نگار ساحر لدھیانوی تھے۔ ''شیخ'' بہت کامیاب فلم تھی مگر اس کی موسیقی کا بھی اس کی کامیابی میں بہت بڑا حصہ تھا۔

1961ء کے بعد غلام محمد کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی۔ صرف کمال امروہوی نے انہیں اپنی فلم ''پاکیزہ'' کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ فلم مختلف وجوہات کی بنا پر بہت تاخیر سے 1971ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کی موسیقی نے تہلکہ مچادیا لیکن غلام محمد اپنی یہ آخری کامیابی دیکھنے کے لیے اس دنیا میں نہیں تھے۔ ان کی وفات کو اب لگ بھگ 36 سال گزر چکے ہیں۔ زندگی ہی میں وہ کون سے مصروف رہے تھے۔ آئندہ برسوں میں تو فلموں کے انداز ہی بدل گئے۔ نوشاد جیسا موسیقار گوشہ نشین ہو گیا تو پھر غلام محمد کی کیا قدر ہوتی اور کون کرتا؟ لیکن موسیقی کے دلدادہ غلام محمد.... کو کبھی نہ بھلا پائیں گے۔

غلام محمد کی کہانی سے موسیقار ناشاد کی کہانی بھی یاد آجاتی ہے۔ ان دونوں میں بہت سی چیزیں مشترک تھیں۔ دونوں نے طبلہ نواز کی حیثیت سے آغاز کیا تھا۔ دونوں ہی کو جب موسیقی مرتب کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ بمبئی میں ناشاد کی فلمیں ''نغمہ'' ''رفتار'' اور ''بارہ دری'' کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ ان فلموں کے سبھی گانے سپرہٹ تھے لیکن ناشاد کی پذیرائی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مایوس ہو کر وہ پاکستان چلے آئے۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم ہی نے ان کو نمایاں کر دیا تھا۔ اس کے بعد ناشاد نے بہت سی فلموں میں بے حد دلکش اور یادگار نغمات تخلیق کیے۔ غلام محمد کی طرح وہ بھی سادہ اور دل میں اتر جانے والی دھنیں بنانے میں ماہر تھے۔ یہ تفصیل ناشاد کے تذکرے میں بیان کی جا چکی ہے۔ ایک آخری بات جو کہ ان دونوں عظیم موسیقاروں میں مشترک ہے، یہ ہے کہ دونوں ہی کو اپنے عہد کے ممتاز موسیقاروں کی صف میں جگہ نہ مل سکی۔ بھارت ہو یا پاکستان۔ دونوں جگہ غلام محمد اور ناشاد کا تذکرہ بہت کم کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں ناشاد کی موسیقی نے غضب ڈھا دیا تھا مگر جب پاکستان کے ممتاز اور نامور موسیقاروں کا ذکر ہوتا ہے تو ناشاد کا نام گول کر دیا جاتا ہے ورنہ جہاں تک میٹھی اور دل نواز دھنیں بنانے کا تعلق ہے، ناشاد کے سپرہٹ گانوں کی تعداد بھی ماسٹر عنایت، خواجہ خورشید انور، نثار بزمی سے کم نہیں ان سب موسیقاروں کی صفات اور انداز مختلف تھے لیکن جہاں تک خوبصورت دھنیں بنانے کا تعلق ہے اس سلسلے میں ناشاد بھی کسی سے کم نہیں ہیں اور یہی معاملہ بھارت میں غلام محمد کا بھی ہے۔

☆☆☆

ابھی کل کی بات لگتی ہے جب مارلین مونرو اور ڈراما کوئین آرتھر ملر کی شادی ہوئی تھی۔ وقت بھی عجیب چیز ہے۔ کس وقت یہ گزرتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا، ہر لمحہ طویل اور قیامت کی طرح گزرتا ہے بالخصوص جبکہ حالات تکلیف دہ اور خراب ہوں۔ اگر حالات سازگار ہوں اور انسان خوش اور آسودہ ہو تو پھر وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ ہوا کی طرح اڑتا جاتا ہے۔ برسبیلِ تذکرہ سائنس دانوں کی جدید ترین تحقیق یہ ہے کہ وقت بھی پلاسٹک کی طرح ہوتا ہے۔ اگر آپ حالات سے مطمئن نہیں ہیں یا کسی وقت ایسی جگہ بیٹھے ہیں جہاں آپ بیزار ہو رہے ہیں تو وقت جیسے تھم جاتا ہے۔ بار بار گھڑی دیکھیے، سوئی ہے کہ آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتی لیکن اگر خوش قسمتی کا عالم ہے، آپ کسی پسندیدہ جگہ بیٹھے ہیں تو وقت کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ سائنس دان اب اس بارے میں مزید تحقیقات کر رہے ہیں کہ کیا وقت کو ناپا جا سکتا ہے اور اس میں کمی بیشی (احساس کی حد تک) کی جا سکتی ہے۔

سائنس دانوں کی تو دنیا ہی الگ ہوتی ہے لیکن ایک عام آدمی کا بھی یہ روزمرہ کا تجربہ ہے اور اچھا وقت پل بھر میں گزر جاتا ہے۔ لیکن عجب بات یہ ہے کہ خواہ وقت اچھا گزرے یا برا۔ کافی عرصہ گزر جانے کے بعد وقت سرے سے ناقابلِ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اچھی گزرے یا بری۔ گزشتہ دنوں کی

یادیں کل کی باتیں لگتی ہیں۔ اداکارہ مارلین مونرو اور آرتھر ملر کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یہ دونوں اپنی اپنی اقلیم کے تاجدار تھے۔ مارلین مونرو فلمی دنیا اور کروڑوں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی تھیں۔ انہیں بیسویں صدی کی حسن کی دیوی کہا جاتا ہے۔ کوئی انہیں ماڈرن وینس کہتا ہے اور کوئی نسوانی حسن اور کشش کا مرقع۔ وہ اداکارہ بھی تھیں اور بعض فلموں میں انہوں نے بہت اچھی اداکاری کی تھی لیکن ان کی سب سے بڑی صفت ان کا حسین و معصوم چہرہ اور ہوشربا سراپا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک ایسی کشش تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ نہ صرف حقیقی زندگی میں بے پناہ حسین و دلربا تھیں بلکہ ان کا چہرہ بھی کیمرے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ اس پر ان کے ناز و انداز۔ ان سب چیزوں نے مل کر مارلین مونرو کو ایک غیر فانی حسینہ بنا دیا تھا۔ ان جیسی فن کارہ نہ اس سے پہلے دنیا نے دیکھی اور نہ ہی اس کے بعد ان کی جگہ لینے والی کوئی فن کارہ سامنے آئی۔

آرتھر ملر کو ادب اور ڈراما نویسی میں وہی مقام حاصل ہے۔ جو فن کاروں میں مارلین مونرو کو حاصل ہے۔

آرتھر ملر امریکی ڈراما نویسوں کی اس صنف کا تعلق رکھتے تھے جو امریکی معاشرے کی خرابیوں اور ناہمواریوں پر نالہ کناں رہتا تھا۔ 1929ء میں جب امریکا کے معاشی حالات انتہائی ابتر ہوگئے تو غریبوں پر آفت نازل ہوگئی۔ وہ انتہائی مشکلات سے دوچار ہوئے۔ آرتھر ملر کا ڈراما ''ڈیتھ آف اے سیلز مین'' ان ہی حالات کی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ ایک غریب سیلز مین کی کہانی ہے۔ اس نے ساری زندگی اپنی کمپنی کی خدمت کی۔ جب ملکی حالات بگڑے تو لاکھوں دوسرے غریب کارکنوں کی طرح اس کو بھی کوئی وجہ بتائے بغیر نوکری سے جواب دے دیا گیا۔ 1949ء میں اس ڈرامے کو پلٹزر پرائز دیا گیا تھا اور یہ امریکی ڈراما نویسی کے شاہکاروں میں شامل ہے۔ آرتھر ملر نے ساری زندگی کچلے ہوئے انسانوں کے بارے میں ہی ڈرامے لکھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے ملک کی طرح امریکا میں بھی سنجیدہ موضوعات پر فکر انگیز ڈرامے کامیاب نہیں ہوتے۔ صرف تفریحی ڈرامے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ معروف اور مایہ ناز امریکی ڈراما نویسوں کے بیشتر سنجیدہ ڈرامے لندن میں نمائش کے لیے پیش کیے جاتے تھے چونکہ براڈوے ایسے ڈراموں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ آرتھر ملر کا یہ موقف تھا کہ اچھے اور معیاری ڈراموں کو حکومت مالی امداد فراہم کرے، اس کی دلیل وہ یہ دیتے تھے کہ یونانی ڈراموں کو بھی حکومت وقت امداد دیا کرتی تھی۔ ان کا دوسرا مشہور ڈراما ''کروسیبل'' ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی کو امتحان میں ڈالنا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی مشکلات میں پھنسے ہوئے غریب کرداروں کی کہانی ہے۔ ''اے ویو فرام دی برج'' ''آل مائی سنز'' یہ سب ڈرامے عام انسانوں کی پریشانیوں کا مظہر ہیں۔ ''دی پرائس'' ''دی امریکن کلوک'' اور ''بروکن'' بھی انگلستان ہی میں اسٹیج کیے گئے تھے۔ اندازہ لگایئے کہ امریکا کے عظیم ترین ڈراما نویس کے ڈرامے اس کے اپنے ملک میں نہ تو اچھے تھیٹر پیش کرتے تھے اور نہ ہی انہیں کامیابی حاصل ہوسکتی تھی۔ یہ بھی سوچیے کہ اگر لندن کے تھیٹر ہال نہ ہوتے تو کیا آرتھر ملر جیسا مایہ ناز ڈراما نویس ناکامی، گمنامی اور مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب کر رہ جاتا؟

آخری دنوں میں وہ اہل قلم کے ترجمان اور نمائندہ بن چکے تھے۔ کمیونزم کے خلاف انہوں نے کبھی قلم نہیں اٹھایا جو کہ اس زمانے میں امریکا کا معمول اور ماحول تھا۔ ان کی تین شادیوں میں سب سے زیادہ عرصہ انہوں نے تیسری بیوی مورائتھ کے ساتھ گزارا۔ ان دونوں کا ساتھ چالیس برس قائم رہا۔ موراتھ ان کی مزاج شناس اور ہم خیال تھیں۔ وہ بعض اوقات ان کے تخلیقی کاموں میں ان کا ہاتھ بھی بٹایا کرتی تھیں۔ سب سے زیادہ شاکی وہ مارلین مونرو سے رہے جس کی اصلاح کرنے میں وہ ناکام رہے اور دونوں کا ساتھ چھوٹ گیا۔ مارلین مونرو کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ ''وہ کبھی نہیں سدھر سکتی۔ وہ خود کو برباد کرنے میں ماہر ہے۔'' اس فقرے سے میرا جی کے بارے میں کہا ہوا سعادت حسن منٹو کا فقرہ یاد آگیا کہ ''اس خرابے میں مزید خرابی کی گنجائش نہ تھی۔''

آرتھر ملر ایک سنجیدہ اور باوقار انسان تھے۔ وہ روایات اور تہذیبی اقدار پر یقین رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں معاشرے کی خرابیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی ہے کہ آرتھر ملر نے مارلن مونرو سے اور مونرو نے آرتھر ملر سے شادی کیوں کی تھی چونکہ وہ دونوں بالکل متضاد اور مختلف مزاجوں کے حامل تھے۔ آرتھر ملر کے ڈراموں نے امریکی معاشرے کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ امریکی کامیابیوں کے ساتھ مختلف شعبوں، خصوصاً معاشرے میں ناکامیوں کا بھی تذکرہ کرتے رہے۔ ان کے تصورات کے مطابق امریکا میں جو بھی قابل اعتراض کام ہوتا تھا وہ اس پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ انہوں نے مضامین اور خودنوشت سوانح بھی لکھی ہے مگر وہ اپنے ڈراموں کے حوالے سے یاد رکھے جائیں گے۔

اب مارلین مونرو پر نظر ڈالیں تو وہ نوعمری سے ہی ایک بگڑی ہوئی، بے لگام اور بے باک لڑکی تھی جو شہرت اور دولت کی خاطر سب کچھ کرسکتی تھی۔ قدرت نے اسے بے پناہ حسن و کشش سے نوازا تھا۔ اس کی زندگی ایک بے چین، مضطرب اور ناآسودہ زندگی تھی۔ وہ اپنی آرزوؤں اور حسرتوں کے پیچھے تمام عمر دوڑتی رہی۔ اسے جو کچھ حاصل ہوچکا تھا وہ اس کے لیے کافی نہ تھا۔ وہ اس سے بھی بہت زیادہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مثال کے طور پر شہرت کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد اس کی خواہش تھی کہ وہ صدر کینیڈی کی بیوی اور امریکا کی فرسٹ لیڈی بنے۔ اس مقصد کے لیے اس نے جان کینیڈی سے راہ و رسم بڑھائی مگر کینیڈی اپنا الّو سیدھا کرنے کے بعد اس سے علیحدہ ہوگئے۔ ایک شادی شدہ سیاست داں اور صدر کی حیثیت سے مارلین مونرو سے ان کے تعلقات ان کے مستقبل کے لیے زہر قاتل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صدر کا عہدہ سنبھالنے کے بعد مارلین مونرو سے قطع تعلق کرلیا۔ صدر کینیڈی کی رنگین مزاجی اور بے شمار خواتین سے تعلقات کی داستانیں، جو کہ ان کی زندگی میں چھپادی گئی تھیں، اب عام ہوچکی ہیں تو پھر مارلین مونرو سے تعلقات برقرار رکھنے میں کیا قباحت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مارلین مونرو کبھی کھلونا بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ اہم تقریبات میں صدر سے تعلقات کی بنا پر اہمیت اور ان کی رفاقت چاہتی تھی۔ وہ بے حد حساس اور جذباتی تھی۔ صدر کینیڈی کی بے وفائی نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ دیسی فلموں کی کہانیوں کے عین مطابق صدر کینیڈی نے اس ''مصیبت'' سے جان چھڑانے کے لیے اپنے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی کو مارلین کو معاملات سمجھانے کے لیے بھیجا مگر رابرٹ کینیڈی بھی مونرو کے عشق میں گرفتار ہوگئے۔ مارلین مونرو کے لیے اور امریکی معاشرے کے مطابق دونوں بھائیوں سے بیک وقت مراسم رکھنا کوئی انوکھی بات یا عیب نہ تھا۔ مارلین مونرو نے وہی مطالبات رابرٹ کینیڈی سے کرنے شروع کردیے جو وہ جان کینیڈی سے کرتی رہی تھی۔ رابرٹ کینیڈی امریکا کے اٹارنی جنرل اور ملک کے سب سے ممتاز اور اہم خاندان کے رکن اور مستقبل میں صدارت کے امیدوار تھے۔ جب مونرو کمبل بن کر ان سے لپٹ گئی تو انہوں نے اس کا منہ بند کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اس موضوع پر امریکا میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں مارلین مونرو کے قتل کے یہ اسباب بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن اس ''جرم'' کے سلسلے میں امریکی مافیا کا نام بھی آتا ہے۔ ایک کتاب میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ مافیا کے ایک بڑے سربراہ بھی مارلین مونرو پر مہربان تھے۔ امریکی مافیا صدر کینیڈی کے انتخاب میں بہت سرمایہ صرف کرچکا تھا جس کا تذکرہ کتابوں میں بھی ہے۔ مارلین کی موت کا سبب باہمی رقابت تھی یا کینیڈی خاندان کی خودغرضی اور مصلحت پرستی؟ اس بارے میں حتمی فیصلہ آج تک نہیں ہوسکا ہے۔

کہاں فلموں کی چمک دمک اور شہرت و دولت کے انبار اور کہاں ایک سنجیدہ مزاج کم آمیز ڈراما نویس جو شکل و صورت کے اعتبار سے بھی محض گزارہ ہی تھا۔ یہ بھی معما ہے کہ مارلین مونرو نے یہ فیصلہ کیوں کیا تھا؟

ان دونوں کی شادی پانچ سال تک قائم رہی۔ آرتھر ملر نے کہا کہ مونرو ایک ایسی لڑکی تھی جو خود کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے سدھارنے اور راہِ راست پر لانے کی بہت کوشش کی۔ اس نے بھی بہت کوشش کی مگر اس کی فطرت اور پرانی عادتوں کے باعث وہ خود کو تبدیل نہ کرسکی۔ ملر کا کہنا ہے کہ جب تک ہماری شادی قائم رہی میری تمام کوشش، صلاحیت، توجہ اور انرجی مارلین مونرو کو سدھارنے پر لگی رہی لیکن بدقسمتی سے میں اس کے مسائل حل نہ کرسکا۔

مارلین مونرو سے پہلے ملر اپنے بچپن کی دوست میری سلیٹری سے شادی کرچکا تھا۔ 1956ء میں ان کی طلاق ہوگئی جس کے بعد آرتھر ملر نے مارلین مونرو سے دوسری شادی کرلی۔ پانچ سال کے بعد بالآخر یہ شادی بھی ختم ہوگئی۔ 1962ء میں آرتھر ملر نے ایک فوٹوگرافر انگ موراتھ سے تیسری شادی کی تھی۔ اسی سال مارلین مونرو نے خودکشی کرکے جان دے دی اور دنیا بھر میں ہلچل مچ گئی۔ مگر خیال رہے، آرتھر ملر کی تیسری شادی کا مارلین مونرو کی خودکشی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ طلاق کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کو فراموش کردیا تھا۔

آرتھر ملر 1915ء میں ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد خواتین کے کوٹ بناتا تھا۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہوگیا اور آرتھر ملر کو کالج کی تعلیم نہ دلا سکا۔ آرتھر ملر نے قلی، مزدور اور کلرک کی حیثیت سے کام کرکے کالج کی تعلیم کے اخراجات پورے کیے اور 1938ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس نے اپنا پہلا ڈراما کالج کے زمانے میں لکھا تھا جسے بہت سے انعامات ملے تھے۔ اس نے کئی ناول اور مختصر کہانیاں بھی لکھیں۔ آرتھر ملر نے ''مِس فٹ'' کا اسکرین پلے لکھا تھا۔ یہ اسکرپٹ اس نے خاص طور پر مارلین مونرو کو سامنے رکھ کر لکھا تھا۔ کلارک گیبل اس میں ہیرو تھے۔ یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ آرتھر ملر نے ایک اور اسکرپٹ

''پلے انگ فار ٹائم'' بھی لکھا۔ یہ ٹی وی سیریل تھا۔ ڈراما نویس کی حیثیت سے آرتھر ملر کا شمار یوجین اونیل اور ٹینیسی ولیمز کے ساتھ کیا جاتا ہے جنہیں بیسویں صدی کے امریکی تھیٹر کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

آرتھر ملر اور مارلین مونرو اپنے طرز زندگی اور انداز فکر کے اعتبار سے دریا کے دو کنارے تھے۔ حیرت یہ ہے کہ یہ دو کنارے پانچ سال تک ایک ساتھ کیسے رہے؟ اگر آرتھر ملر کو ڈراما نویسی کا بادشاہ کہا جاتا ہے تو مارلین مونرو کو حسن کی دیوی اور فلم کی دنیا کی ایک ناقابل فراموش ہستی قرار دیا جاتا ہے۔

یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ جن دنوں آرتھر ملر کا انتقال ہوا اسی زمانے میں نیویارک کے بروکلین میوزیم میں مارلین مونرو کی دو سو کے قریب معروف تصویریں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ یہ تصاویر 39 مختلف معروف فوٹوگرافرز کی اتاری ہوئی تھیں۔ ان میں اس وقت کی تصویریں بھی شامل ہیں جب وہ ایک غریب بے آسرا اور نوعمر لڑکی نورما جین بیکر تھی اور نیویارک میں اس کے پاس رہنے کا ٹھکانا تک نہ تھا۔ ایک فوٹوگرافر نے اسے اپنے فلیٹ میں پناہ دی اور اس کی تصاویر بنا کر فلم اسٹوڈیوز اور ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں سے رابطہ کیا۔ ان میں مارلین مونرو کی وہ عریاں تصویر بھی شامل ہے جو ''پلے بوائے'' میگزین کے پہلے شمارے میں سینٹر سپریڈ کے دو صفحات پر شائع ہوئی تھی اور درحقیقت یہی تصویر بعد میں مارلین مونرو کے تعارف اور ترقی کا ذریعہ بنی۔ اس کے بعد اس کی فلموں کی ہر یادگار تصویر اور کچھ نجی تصاویر بھی اس نمائش کا حصہ ہیں۔

جب مارلین مونرو نے صدر کینیڈی کی صدارت کی افتتاحی تقریب میں سرخ چمک دار گون میں ملبوس ہو کر ''پیپی برتھ ڈے'' گایا تھا، وہ تصویر بھی نمائش میں آویزاں ہے۔

1945ء سے لے کر مارلین کی خودکشی سے ایک سال پہلے تک کی منتخب تصاویر یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مارلین مونرو کی ایک منفرد خصوصیت یہ تھی کہ اس کا چہرہ اور آواز معصوم تھا جبکہ جسم ہوشربا، فتنہ انگیز اور اس کی چال ایک مست ناگن کے مانند تھی۔ نقادوں کا کہنا ہے کہ مارلین مونرو حقیقی زندگی میں جس قدر دلکش اور حسین تھی، یہ تصاویر اس کے ساتھ انصاف نہیں کرسکی ہیں۔ مارلین مونرو اپنے زمانے میں عریانی، بے باکی اور جسم کی نمائش کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور تھی لیکن آج کل کے مغربی معاشرے کے مقابلے میں مارلین مونرو کی تصاویر اور حرکتیں انتہائی بے ضرر سی نظر آتی ہیں۔ اس نے ایک گمنام بے سہارا لڑکی کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا تھا مگر پھر دنیا کی سب سے مشہور، مقبول اور اعلیٰ ترین طبقوں کی محبوب ہستی بن گئی۔ اس کو آپ اس کی صلاحیتیں کہیں گے یا تقدیر کی جلوہ گری؟

☆☆☆

بھارتی فلمی صنعت کی ایک نامور ہستی اور قدیم دور کی نامور اداکارہ وحیدہ رحمان کے بارے میں پچھلے دنوں یہ افواہ سنی گئی کہ وہ انتقال کر گئیں۔ وحیدہ رحمان، وجنتی مالا، نوتن، نرگس، مدھوبالا وغیرہ کی ہم عصر رہی ہیں اور ان کا تعلق جنوبی ہندوستان (مدراس) سے ہے۔ وہاں ہر لڑکی رقص ضرور سیکھتی ہے۔ بھارتی فلموں کی بیشتر رقص کرنے والی معروف ہیروئنوں کا تعلق جنوبی ہندوستان ہی سے رہا ہے۔ راگنی، پدمنی، وجنتی مالا، ہیما مالنی، سری دیوی ان میں نمایاں ہیں۔ ان ہی میں ایک وحیدہ رحمان کا نام بھی شامل کر لیجیے۔ وحیدہ رحمان صرف لاجواب رقاصہ ہی نہیں ایک بے مثال اداکارہ بھی تھیں۔ ان کی بعض فلمیں ان کی اداکاری کے اعتبار سے یادگار بھی جاتی ہیں۔

وحیدہ رحمان نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے وہ ایک مسلم گھرانے کی فرد تھیں۔ اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں اپنی ایک سہیلی کے توسط سے انہوں نے رقص سکھانے والے ایک اسکول میں داخلہ لے لیا اور کلاسیکی رقص کی تربیت وہیں سے حاصل کی۔ ان کے ماحول میں رقص ہر لڑکی کے لیے ایک لازمی خوبی سمجھی جاتی ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو۔

رقص میں مہارت حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اسٹیج پر رقص کے مظاہرے کیے اور اسی دوران میں فلم سازوں کی نظروں میں آگئیں۔ مدراس کی فلمی صنعت ہمیشہ ایک منظم اور مالدار فلمی صنعت رہی ہے۔ وہاں تامل فلمیں بے حد کامیاب ہوتی ہیں۔ فلم ساز ہی اسٹوڈیوز کے مالک، سنیما گھروں کے مالک اور بذات خود تقسیم کار ہوتے ہیں اس لیے بمبئی کے فلم سازوں کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ دولت مند، باوسائل اور تعلیم یافتہ بھی تھے۔

وحیدہ رحمان کو جب فلم سازوں نے اداکاری کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے والدین کی رضامندی سے اداکاری کا آغاز کر دیا۔ وہ علاقائی تامل اور تیلگو فلموں میں کام کرتی تھیں۔ اسی زمانے میں بمبئی کے ہدایت کار اور فلم ساز گورودت نے ان کی ایک فلم دیکھی اور اپنی فلم ''سی آئی ڈی'' میں کام کرنے کی پیش کش کی۔ اس کی ہدایت کاری گورودت کے شاگرد راج کھوسلہ کر رہے تھے۔ دیو آنند اس فلم کے ہیرو تھے۔ وہ اس وقت سپر اسٹار تھے۔ گورودت بھی فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے بہت نامور تھے۔

وحیدہ رحمان اور گورودت دونوں کی زندگیوں کو اس فلم نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ وحیدہ رحمان کو اس طرح کہ وہ ''سی آئی ڈی'' کی نمائش کے بعد راتوں رات صفِ اول کی ہیروئن بن گئیں۔ ان کی اداکاری نے سب کا دل موہ لیا تھا۔ ادھر گورودت اس سانولی سلونی المیلی لڑکی کو دل دے بیٹھے تھے۔ یہ محبت کی داستان طویل عرصے تک چلتی رہی۔ وحیدہ رحمان نے گورودت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو ان کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ ہر چیز سے بیگانہ ہو کر خود فراموشی کے لیے شراب میں ڈوب گئے۔ اپنی بیوی گیتادت سے ان کے تعلقات خراب ہو گئے تھے اور وہ ان سے الگ ایک فلیٹ میں تنہا رہتے تھے۔ انہیں دنیا کی ہر نعمت میسر تھی۔ شہرت، عزت، دولت، مقبولیت، کیا تھا جو انہیں حاصل نہ تھا۔ وہ محبت میں محرومی نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ آخر ایک دن خواب آور گولیاں کھا کر انہوں نے خودکشی کر لی۔

دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

وحیدہ رحمان یوں تو ایک فن کارہ اور اداکارہ ہیں۔ سی آئی ڈی کی بے مثال کامیابی کے بعد وہ بمبئی منتقل ہو گئی تھیں۔ فلم ساز ان کے اردگرد منڈلاتے رہتے تھے۔ دل پھینک فلم ساز کی بھی کمی نہ تھی لیکن بمبئی کی فلمی صنعت اس بات کی گواہ ہے کہ وحیدہ رحمان کامیاب اور معروف اداکارہ اور رقاصہ ہونے کے باوجود ایک مشرقی لڑکی ہیں۔ ان میں بے باکی اور بے حیائی موجود نہیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ اور لیے دیے رہتی ہیں۔ وہ فلمی دنیا کی جگمگاتی تقاریب میں ضرورت کے بغیر شریک نہیں ہوتیں۔ وہ بمبئی کے فلمی ماحول سے متاثر نہیں ہوئی تھیں اور ایک سادہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں۔ انہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں بھی جسم کی نمائش نہیں کی جو کہ اس زمانے کے لحاظ سے بھی ایک انوکھی بات تھی۔ رقص کے ملبوسات کے علاوہ عموماً ان کا لباس ساڑھی ہوتا ہے۔ فلموں میں بھی انہوں نے زیادہ تر یہی لباس پہنا اور عریانی سے پرہیز کیا۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ انہوں نے اکثر فلموں میں ایسے کردار ادا کیے جو مشرقی اقدار کے حامل تھے۔ شروع میں ان کی آنکھوں میں بھی حجاب نظر آتا تھا۔ ان کا چہرہ کیمرے کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ فلمی دنیا میں وہ ان فن کاراؤں میں شامل رہیں جن پر کیمرا بہت زیادہ مہربان ہوتا ہے۔ جوانی میں تو ان کے چہرے کا ہر زاویہ اور بھی خوبصورت اور دلکش تھا۔ قدرت نے بھی انہیں نوازا تھا۔ بوٹا سا قد، دلکش نقش و نگار، بڑی بڑی جذبات و تاثر کا اظہار کرنے والی آنکھیں جنہیں وہ اداکاری کے وقت بہت خوبی سے استعمال کرتی تھیں۔ سانولی سلونی رنگت، انتہائی متناسب جسم اور اس پر ان کا رقص۔ ان تمام خوبیوں نے انہیں دیکھتے ہی دیکھتے نامی گرامی ہیروئنوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک بڑی فن کارہ بنا دیا تھا۔

وحیدہ رحمان کے والد رحمان صاحب سرکاری ملازم تھے لیکن ابھی وحیدہ کمسن ہی تھیں کہ وہ وفات پا گئے۔ وحیدہ کو ان کی والدہ نے پالا اور تعلیم و تربیت دی۔ انہوں نے رقص کے اسکول میں داخلہ لیا اور بھارت ناٹیم میں مہارت حاصل کر لی۔

گھریلو حالات کی بنا پر وحیدہ رحمان کو نوعمری ہی میں کام کرنا پڑا۔ رقص کی تربیت اور دلکش صورت شکل کی وجہ سے تیلگو فلمسازوں نے انہیں فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی جو کہ ان کی والدہ نے حالات کے پیشِ نظر قبول کر لی۔ وحیدہ رحمان کی پہلی فلم تیلگو زبان میں تھی جس کا نام ''روجیلو ماری'' تھا۔ یہ فلم 1949ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ تیلگو اور تامل فلموں میں کام کرتی رہیں یہاں تک کہ گورودت کی ستارہ شناس نظروں نے انہیں پرکھا اور اپنی فلم ''سی آئی ڈی'' کے لیے ان کا انتخاب کر لیا۔ اس فلم کے لیے وہ اپنی والدہ کے ساتھ بمبئی آگئیں۔ اس وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بمبئی میں رہائش ان کے لیے ناگزیر اور مستقل ہو جائے گی۔ انہوں نے یا ان کی والدہ نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ پہلی فلم کی نمائش کے بعد ہی وہ مقبول اسٹار بن جائیں گی۔ گورودت کے ساتھ ان کا کئی فلموں کے لیے معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کی رو سے وہ پابند تھیں کہ گورودت کی فلموں کے سوا کسی دوسرے فلم ساز کی فلم میں کام نہیں کریں گی۔ لیکن گورودت ایک ہمدرد اور نیک طبیعت انسان تھے۔ اور پھر ویسے بھی وحیدہ رحمان کے ساتھ انہیں رومانی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے انہوں نے ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننا پسند نہیں کیا اور انہیں کسی اور فلم ساز کی فلم میں کام نہ کرنے کی پابندی سے آزاد کر دیا۔

گورودت چاہتے تھے کہ وہ فلمی دنیا میں بلند ترین مقام حاصل کریں۔ ان کی یہ خواہش وحیدہ رحمان کی اداکارانہ صلاحیتوں اور خوبصورتی کے باعث بہت جلد پوری ہو گئی۔ ''سی آئی ڈی'' کے بعد وہ ایک کامیاب اور مقبول ہیروئن بن گئی تھیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ گورودت کی فلموں نے بھی ابتدائی دور میں ان کی کامیابیوں میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

بمبئی منتقل ہونے کے چند سال بعد ہی ان کی والدہ بھی

ان کا ساتھ چھوڑ گئیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وحیدہ رحمان اپنے کردار کی بلندی اور رکھ رکھاؤ کے باعث ہمیشہ اسکینڈلز سے محفوظ رہیں۔ ان کا تعلق ایک شریف اور وضع دار گھرانے سے تھا۔ ماں کی تربیت ان کے لیے مشعل راہ تھی۔ فلمی صنعت میں بہت کم ایکٹریسوں نے مقبولیت اور کامیابیوں کے باوجود ذاتی زندگی میں اتنی احتیاط پسندی اور شرافت کا نمونہ پیش کیا ہے جیسا کہ وحیدہ رحمان نے پیش کیا۔

وحیدہ رحمان نے بہت جلد کامیابی اور شہرت حاصل کرلی۔ اپنی اداکاری کے باعث بہت جلد وہ صحیح معنوں میں ایک ممتاز اور نمایاں اداکارہ تسلیم کرلی گئیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کو نکھارنے اور منظر عام پر لانے کے سلسلے میں گورودت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

وحیدہ رحمان نے بمبئی کی فلمی دنیا میں 1956ء میں قدم رکھا تھا اور ''سی آئی ڈی'' میں کام کرکے شہرت اور کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے پلٹ کر نہ دیکھا اور مزید کامیابیاں حاصل کرتی رہیں۔ 1957ء میں انہوں نے گورودت کی فلم ''پیاسا'' میں اداکاری کا بے مثال مظاہرہ کرکے اپنا شمار ہندوستان کی بہترین اداکاراؤں میں کرالیا۔ ''پیاسا'' آج بھی ایک کلاسیکی فلم سمجھی جاتی ہے۔ یہ گورودت کا خواب تھا جس کو حقیقت کا رنگ دینے میں ساحر لدھیانوی کے نغمات اور وحیدہ رحمان اور خود گورودت کی اداکاری نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ ''پیاسا'' میں ہیرو کے لیے گورودت نے دلیپ کمار کا انتخاب کیا تھا مگر وہ اپنی مصروفیات کے باعث دستیاب نہ ہوسکے۔ کبھی سچ ہے کہ دلیپ کمار کو ''پیاسا'' کی کہانی بھی پسند نہیں آئی تھی۔ دلیپ کے انکار کردینے کے بعد اس کردار کے ساتھ انصاف کرنے والا کوئی دوسرا اداکار گورودت کو نظر نہ آیا اس لیے انہوں نے بذات خود یہ کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور واقعی اس کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا۔ اس فلم سے ایک نئی فلمی جوڑی سامنے آئی۔ یہ وحیدہ رحمان اور گورودت کی جوڑی تھی۔ اس فلم میں ان دونوں کی اداکاری اپنے عروج پر تھی۔ یہی وہ فلم ہے جس میں کام کرتے ہوئے گورودت وحیدہ رحمان کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ شادی شدہ تھے، معروف گلوکارہ گیتا رائے کے شوہر تھے جو کہ اب گیتا دت بن کر فلمی دنیا چھوڑ چکی تھیں۔ ان کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار تھی مگر جیسے ہی وحیدہ رحمان نے گورودت کی فلموں اور پھر ان کی زندگی میں قدم رکھا، گورودت کی گھریلو زندگی میں ایک انقلاب رونما ہوگیا۔ وہ وحیدہ رحمان کی محبت میں گیتا دت سے دور ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ دونوں کے تعلقات بے حد کشیدہ ہوگئے۔

''پیاسا'' نے باکس آفس پر ریکارڈ نہیں توڑے مگر نقادوں اور قدردانوں نے اسے بہترین فلم قرار دیا۔ یہاں تک کہ جب دلیپ کمار نے یہ فلم دیکھی تو برملا یہ اعتراف کیا کہ انہوں نے پیاسا میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کرکے غلطی کی تھی۔ اگر ''پیاسا'' میں دلیپ کمار کام کرتے تو یقیناً یہ ایک سپرہٹ فلم ہوتی۔ پھر بھی یہ ایک یادگار اور کلاسیکی فلم کی حیثیت سے بھارتی فلمی صنعت میں ایک ممتاز اہمیت کی حامل ہے اور ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں اس کا نام ہمیشہ نمایاں طور پر شامل رہے گا۔

اسی زمانے میں وحیدہ رحمان نے ''بارہ بجے'' اور ''سولہواں سال'' میں کام کیا۔ یہ دونوں بھی اوسط درجے کی کامیاب فلمیں تھیں مگر ایک اور بڑی فلم ان کی منتظر تھی۔ یہ فلم ''چودھویں کا چاند'' تھی۔ اس فلم کے لیے گورودت نے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کردی تھیں۔ پہلی بار انہوں نے شکیل بدایونی سے نغمات لکھوائے تھے اور انہوں نے بھی اپنے حسین نغموں سے اس فلم کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو

محمد رفیع کی آواز میں گائی ہوئی شکیل بدایونی کی اس غزل نے فلم کو چار چاند لگا دیے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فلم ''کاغذ کے پھول'' میں ہمہ تن مصروف رہنے کے باعث گورودت نے اس فلم کی ہدایت کاری اپنے اسکرپٹ رائٹر ابرار کے سپرد کردی تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ''کاغذ کے پھول'' بہت بڑے پیمانے پر بنائے جانے کے باوجود کاروباری لحاظ سے گھاٹے کا سودا ثابت ہوئی جبکہ ''چودھویں کا چاند'' نے دھومیں مچادیں اور بے حد کامیاب ثابت ہوئی۔

کاغذ کے پھول کی 1960ء میں نمائش ہوئی تھی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد وحیدہ رحمان شہرت اور مقبولیت کے عروج پر تھیں۔ یہ سدابہار فلم ہمیشہ اپنے نغمات اور وحیدہ رحمان کے حسن و جمال اور اداکاری کے حوالے سے یاد رکھی جائے گی۔ اس کے بعد وحیدہ رحمان کی جو فلمیں ریلیز ہوئیں ان میں ''ایک پھول چار کانٹے'' ''کالا بازار'' اور ''گرل فرینڈ'' شامل ہیں۔ وحیدہ رحمان کی کامیابیوں میں اضافہ ہورہا تھا، ادھر گورودت کے دل میں بھی ان کی محبت ایک تناور درخت بن چکی تھی۔

وحیدہ رحمان اور گورودت کی داستان بھی عجیب ہے۔

گورودت کے پاس کیا نہ تھا، شہرت، عزت، مقبولیت، دولت..... وہ ملک کا نامور اور ذہین ترین ہدایت کار سمجھا جاتا تھا۔ کوئی اور ہیروئن ہوتی تو ایسے شخص کی محبت کو کبھی نہ ٹھکراتی۔ گورودت کے ہوش وحواس پر وحیدہ رحمان چھائی ہوئی تھی۔ وہ اس کی خاطر مسلمان ہونے کو بھی تیار تھا۔ صورت شکل، تعلیم اور شائستگی کے اعتبار سے بھی وہ ایک ممتاز شخصیت تھا۔ مگر وحیدہ رحمان نے اس کی ہر درخواست کو مسترد کردیا۔ اس کے ہر انکار کے ساتھ گورودت کی دیوانگی میں اضافہ ہورہا تھا۔ آخر اس کا کیا سبب تھا؟ اس بارے میں دونوں ہی مہر بہ لب تھے اور بہترین دوستوں کو بھی انہوں نے دل کا حال نہ بتایا تھا۔ یہ ایک خاموش عشق تھا۔ جس کی گہرائی تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ وحیدہ رحمان نے اس کا سبب یہ بتایا کہ وہ گورودت کو اپنا استاد اور قابلِ احترام تسلیم کرتی تھی۔ پھر یہ کہ وہ ایک شادی شدہ آدمی تھا اور وہ اس کی گھریلو زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن گورودت کی گھریلو زندگی تو بہرحال برباد ہوچکی تھی۔ میاں بیوی کے درمیان میں ایک ایسا فاصلہ پیدا ہوچکا تھا جو وقت کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ وہ دونوں عملاً ایک دوسرے سے علیحدہ اور بے تعلق ہوچکے تھے۔ ان دونوں کے جھگڑے بہت بڑھ چکے تھے۔ گیتادت بچوں کو لے کر گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ خود گورودت بھی گھر چھوڑ کر ایک علیحدہ فلیٹ میں تنہا رہنے لگا تھا، جہاں صرف شراب اس کی ساتھی تھی یا کبھی کبھی قریبی دوست اور ہمدرد آجاتے تھے۔ اسی فلیٹ میں اس نے تنہائی اور مایوسی کے عالم میں خودکشی کرکے جان دے دی تھی۔ ایک عظیم تخلیق کار اور فن کار کا یہ انجام اور وہ بھی ایک لڑکی کی خاطر۔ بہت سے لوگوں نے اس کے لیے وحیدہ رحمان کو ذمے دار ٹھہرایا اور برا بھلا کہا۔ گورودت عشق میں مبتلا ہوکر دنیا کی ہر چیز سے بیگانہ ہوچکا تھا۔ اس کو اپنے کاروبار اور نام کی فکر تھی، نہ ہی بیوی بچوں کی پروا۔ ان دنوں وہ کے آصف کی عظیم فلم ''خدا اور محبت'' میں اداکاری کررہا تھا اور یہ فلم کافی بن چکی تھی۔

گورودت کے انتقال نے کے آصف کی اس فلم کو بھی دھچکا پہنچایا لیکن جس شخص نے دنیا ہی چھوڑ دینے کا ارادہ کرلیا ہو وہ کے آصف کی فلم کا کیا خیال کرتا۔ کے آصف کی عظمت دیکھیے کہ اس قدر بھاری جذباتی اور کاروباری صدمے کے باوجود اس کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ گورودت کی آخری رسومات میں کے آصف سب سے پیش پیش تھا حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ''خدا اور محبت'' کو ''مغلِ اعظم'' سے بھی بڑا شاہکار بنانا چاہتا تھا۔ قسمت دیکھیے کہ کچھ عرصے بعد خود کے آصف بھی ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے دنیا سے رخصت ہوگئے اور ''خدا اور محبت'' کی تکمیل نہ دیکھ سکے۔ بعد میں فلم کو جیسے تیسے مکمل کرنے کی کوشش کی گئی مگر کے آصف کا خواب بکھر کر رہ گیا تھا۔

کیا وحیدہ رحمان کو گورودت سے ذرا سی بھی انسیت اس کا جواب نفی میں ہے۔ گورودت کی خودکشی کا سبب جانتے تھے۔ خود وحیدہ رحمان بھی اس سے بخوبی واقف لیکن اس کی خاطر اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان تک دینے والے کے بارے میں وحیدہ رحمان نے ایک لفظ زبان سے نہ نکالا، نہ ہی اس کی مصروفیات اور روز مرہ زندگی پر اس المیے کا کوئی اثر دیکھنے میں آیا۔

گورودت دنیا سے رخصت ہوگیا مگر اس کی متاثر کرائی ہوئی اداکارہ وحیدہ رحمان شہرت، مقبولیت اور علم کے زینوں پر اوپر ہی اوپر چڑھتی رہی۔

1961ء میں وحیدہ رحمان کی فلم ''رو... چوروں کا راجہ'' نے بہت کامیابی حاصل کی۔ اس کے ''بات ایک رات کی''، ''ایک دل سو افسانے''، ''کون اپنا پرایا''، ''مجھے جینے دو'' جیسی فلموں نے اس کی شہرت میں اضافہ کیا۔ 1964ء میں مجبور، شگن اور کہرا کی نمائش کے اگلے سال وحیدہ رحمان کی ایک یادگار فلم ''گائیڈ'' نمائش کے لیے پیش ہوئی جس میں دیو آنند پھر اس کا ہیرو تھا۔ اس کی موسیقی اور کہانی و ہدایت کاری کے علاوہ اداکاری کے معیار نے سارے ملک میں دھنڈورے گاڑ دیے تھے۔

وحیدہ رحمان ملک کے سپر اسٹارز کے ساتھ کام کر تھی۔ راج کپور، اشوک کمار، دیو آنند کے بعد اب صرف بھاری پتھر رہ گیا تھا۔ یہ دلیپ کمار تھا جس کے ساتھ کام کی تمنا اور حسرت ہندوستان کی ہر ہیروئن کے دل میں تھی۔ وحیدہ رحمان بھی اس کے ساتھ کام کرنے کی تمنا مگر ان دنوں وجنتی مالا، دلیپ کمار کی اجارہ دار اور کامیاب فلمی جوڑی بنی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ رومانی طور پر دلیپ کمار میں دلچسپی لینے لگی تھی اور اس سے شادی کرنے خواہش مند تھی۔ دلیپ کمار نے محبت کا ڈراما تو خوب لیکن شادی کے سوال پر گول کرگیا۔ جس کے بعد وجنتی مالا کی طرف سے مایوس ہوگئی۔ ان ہی دنوں دلیپ کمار کے دوست لیکن پرانے رقیب نے وجنتی مالا کو دلیپ کمار چھین لینے کا پروگرام بنایا اور فلم ''سنگم'' میں اس کو ایک اچھا کردار دے کر دلیپ کمار سے اچک لیا۔ لیکن یہ اس خوش فہمی تھی۔ دلیپ کمار نے وجنتی مالا کے ساتھ سب

وحیدہ رحمان کو سپر اسٹارز کی صف میں شامل کردیا۔ وہ اپنے عروج کی انتہا پر تھیں۔ اب وہ دلیپ کمار کی سند یافتہ ہیروئن کہلائی جاسکتی تھیں۔ اس لیے انہیں فلم ''آدمی'' میں دلیپ کمار کے ساتھ کاسٹ کرلیا گیا۔ اس فلم میں منوج کمار بھی تھے۔ مگر مرکزی کردار دلیپ کمار اور وحیدہ رحمان ہی تھے۔

''آدمی'' ایک اوسط درجے کی فلم ثابت ہوئی لیکن اس وقت تک وحیدہ رحمان، دلیپ کمار کی زندگی میں اتنی جگہ بنا چکی تھیں کہ فلمی حلقوں میں ان دونوں کی شادی کی افواہیں بھی گرم ہونے لگیں۔ وحیدہ رحمان بہت پُرامید اور خوش تھیں لیکن قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ وقت نے اچانک ایک ایسی چال چلی کہ ان ہونی، ہونی ہوگئی اور ایک دن سب یہ سن کر حیران رہ گئے کہ دلیپ کمار سائرہ بانو سے شادی کررہے ہیں۔

وحیدہ رحمان کے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔

اس دوران میں وحیدہ رحمان کی کچھ اور قابلِ ذکر فلمیں بھی نمائش کے لیے پیش کی جاچکی تھیں۔ 1969ء میں ''خاموشی''، ''شطرنج'' اور ''میری بھابی'' کی نمائش ہوئی تھی۔ اس سے اگلے سال ''من کی آنکھیں''، ''دھرتی''، ''پریم پجاری'' اور ''درپن'' کی نمائش ہوئی۔

سائرہ بانو سے دلیپ کمار کی شادی نے وحیدہ رحمان کے خوابوں کو بکھیر کر رکھ دیا۔ وحیدہ رحمان کی فلمی اداکاری کے سب معترف تھے۔ اس کی جو فلمیں بہت زیادہ کامیاب ہوئی تھیں ان میں بھی اس کی اداکاری کو سراہا جاتا تھا۔ اب نقاد مینا کماری، نرگس اور نوتن جیسی اعلیٰ پائے کی فنکاراؤں کے ساتھ اس کا نام لیتے تھے۔

لیکن وحیدہ رحمان کو ان چیزوں میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ وحیدہ رحمان نے گورودت کا دل توڑا تھا۔ اس کو ہجر اور جدائی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی سرد مہری کا یہ عالم تھا کہ گورودت کی اچانک اور غیر طبعی موت پر سب سوگوار تھے۔ فلمی صنعت میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ فلمی دنیا ایک عظیم تخلیق کار اور ہدایت کار سے محروم ہوگئی تھی۔ اور اب تو گورودت پیاسا، کاغذ کے پھول اور صاحب بی بی اور غلام میں اداکاری کرنے کے بعد بہت اچھا اداکار بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی خودکشی بھارتی فلمی صنعت کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ اور نقصانِ عظیم کی حیثیت رکھتی تھی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ وحیدہ رحمان نے اس کی موت پر کسی گہرے رنج وغم کا اظہار نہیں کیا۔ اخبارات کے لیے رسمی بیانات جاری کرنے

والے فلموں میں کام کیا تھا جن کی تعداد سات تھی۔ اب وہ ... بھی چاہتا تھا۔ خاص طور پر وجنتی مالا کے جذباتی اور رومانی ... سے وہ تنگ آچکا تھا۔ راج کپور نے اپنی دانست میں ... کمار کو زک پہنچائی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے دلیپ ... کا کام آسان کردیا تھا۔ دلیپ کمار کبھی بھی ہیروئنوں کا ... نہ رہا تھا اور نہ ہی اس کی فلموں میں کسی ہیروئن کی آمد یا ... سے اسے کوئی فرق پڑتا تھا۔ دلیپ کمار کی فلم لوگ محض ... کمار کی خاطر دیکھنے جاتے تھے۔ اسے ہیروئن کے ... کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر راج کپور ہمیشہ اسی ٹوہ میں لگے رہے ... دلیپ کمار کی ہیروئنوں کو اپنے حلقۂ اثر میں شامل کرلیں۔

اسی وجنتی مالا دلیپ کمار کی فلموں کی ہیروئن تھی لیکن ... فلم کے دوران میں ان دونوں کے تعلقات میں پہلے ... گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ وجنتی مالا مایوس تھی اور دلیپ ... اکتائے ہوئے اور بیزار۔ ان ہی دنوں میں وحیدہ رحمان ... جالب شہنشاہ رومان نے نظر ڈالی اور مہربانی کا اظہار کیا۔ ... رحمان کے لیے یہ ان کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ وحیدہ ... اور دلیپ کمار کے مابین ایک رابطہ قائم ہوچکا تھا اور ... کے قریبی لوگوں کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ اب ان کی اگلی ... وحیدہ رحمان ہی ہوں گی۔ وحیدہ رحمان اس وقت ... اول کی ہیروئنوں میں شامل ہوچکی تھیں۔ ان کی بہت ... تھی لیکن وہ اپنی پسند کے ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنا ... کرتی تھیں یہی وجہ ہے کہ مقبولیت کے باوجود ان کی ... کی تعداد بہت کم تھی۔

1965ء میں وحیدہ رحمان کی معرکہ خیز فلم ''گائیڈ'' ... کے لیے پیش کی گئی اور اسی سال فلم ''دل دیا درد لیا'' ... وحیدہ رحمان کو دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل ... ''دل دیا درد لیا'' بہت اعلیٰ معیار کی فلم ہونے کے باوجود ... یابی سے ہم کنار نہ ہوسکی۔ یہ فلم 1966ء میں ریلیز ہوئی ... اسی سال وحیدہ رحمان اور راج کپور کی فلم ''تیری قسم'' ... ریلیز ہوئی تھی۔ ''دل دیا درد لیا'' ہٹ نہ ہوسکی مگر وحیدہ ... کو دلیپ کمار کے نزدیک آنے کا موقع مل گیا تھا۔ وحیدہ ... دلیپ کمار کے ساتھ مدراس میں بنائی جانے والی فلم ''رام ... شیام'' کے لیے بھی منتخب کرلیا گیا تھا۔ اس فلم میں دلیپ ... ڈبل رول میں تھے۔ ایک کردار کے ساتھ ہیروئن وحیدہ ... تھیں اور دوسرے کے ساتھ ممتاز۔

1967ء میں وحیدہ رحمان کی جو فلمیں ریلیز ہوئیں ... میں ''پالکی''، ''پتھر کے صنم''، ''گھر کے چراغ'' شامل ہیں ... اس سال کی سپر ہٹ فلم ''رام اور شیام'' تھی۔ اس فلم نے

کے علاوہ نجی زندگی میں اور بہت قریبی لوگوں کی محفل میں بھی اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی اس بے [illegible] فلمی حلقے اور فلم بین حیران رہ گئے تھے۔

جب دلیپ کمار کی اچانک سائرہ بانو سے شادی کرنے کی خبر آئی تو وحیدہ رحمان دل تھام کر رہ گئیں دلیپ کمار سے ان کا لگاؤ عشق کی حد تک تو نہیں تھا لیکن وہ اس کے ساتھ ایک حسین زندگی کے خواب دیکھنے لگی تھیں۔ دلیپ کمار کی شادی نے اس کے خوابوں کا یہ تاج محل چکنا چور کر کے رکھ دیا۔

وحیدہ رحمان اس صدمے اور غم کا دنیا کے سامنے اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ دلیپ کمار کے ساتھ بندھن اس کی آرزو اور دنیا سے پوشیدہ خواہش تھی۔ دراصل دلیپ کمار کے دو عشق ہی بہت زیادہ مشہور ہوئے ہیں۔ ایک کامنی کوشل کے ساتھ جو کہ ایک شادی شدہ عورت ہونے کی وجہ سے اس سے چھین لی گئی۔ دلیپ کمار کے قریبی اور ہمراز دوستوں کا کہنا ہے کہ دلیپ کمار نے اگر صحیح معنوں میں کسی سے عشق کیا تو وہ کامنی کوشل تھی۔ اس سے علیحدگی کا داغ وہ کبھی اپنے دل سے نہ مٹا سکا۔

مدھو بالا کے ساتھ دلیپ کمار کا رومانس تھا جو محبت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ مدھو بالا ایک حسین وجمیل اور شوخ وشریر اداکارہ تھی اور دلیپ کمار کے ساتھ محبت کے بعد تو وہ کچھ اور زیادہ چنچل اور خود اعتماد ہو چکی تھی۔ لیکن حالات اور خاص کر مدھو بالا کے والد خان عطا کے رویے نے ان دونوں کے درمیان خلیج حائل کر دی جو رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔ دلیپ کمار کو یہ غصہ اور قلق تھا کہ مدھو بالا اپنے باپ کے اشاروں پر رقص کر رہی ہے۔ دلیپ کمار کی محبت اور جذبات کا اسے کوئی احساس نہیں ہے۔ ایک ناکام محبت پٹھان کا غصہ بالآخر رنگ لایا اور دنیا نے دیکھا کہ بھری عدالت میں دلیپ کمار نے مدھو بالا کے خلاف گواہی دی اور اس کو فلم ''نیا دور'' کی کاسٹ سے خارج کر کے وجنتی مالا کو اس کی جگہ دے دی۔ مدھو بالا کے لیے دلیپ کمار کا یہ رویہ بے وفائی اور سنگدلی کا مظہر تھا جس نے اس کا دل توڑ دیا۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے شاکی تھے اور وفا کے وعدے نہ نبھانے کا الزام دے رہے تھے۔ بہر حال، مدھو بالا دلیپ کمار کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گئی۔ اس کے بعد پھر کسی نے بے تکلف اور قریبی دوستوں کی محفلوں میں بھی دلیپ کمار کی زبان سے مدھو بالا کا نام نہیں سنا۔ اس نے اپنے دوستوں کو تاکید کر دی تھی کہ اس کے سامنے کبھی مدھو بالا کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

یہ ایک زخم خوردہ پٹھان کا شدید ترین ردِعمل تھا اس کے بعد دلیپ کمار کی زندگی میں اور بہت قریبی لوگوں کی محفل میں بھی [illegible] پری تھی۔ دلیپ کمار نے دراصل کامنی کوشل کے بعد کسی [illegible] عشق نہیں کیا۔ وہی اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ کبھی صحافی نے دلیپ کمار اور کامنی کوشل سے اس موضوع پر [illegible] کرنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ وہ سب ان دونوں کے مزاج اور دلی کرب سے آگاہ تھے۔ لوگ آج بھی یہ کہتے ہیں سائرہ بانو سے دلیپ کمار کی شادی ایک سمجھوتا ہے۔ اس شادی کے بعد ایک ذمے دار اور وفادار شوہر کا فرض بڑی [illegible] سے نبھایا۔ عاصمہ سے پوشیدہ شادی کے علاوہ اس کا کو [illegible] اسکینڈل یا کسی ہیروئن سے جذباتی تعلق قائم نہیں ہوا۔ اس ایک اچھے شوہر کی طرح سائرہ بانو کے ساتھ زندگی بسر کی رہی عاصمہ سے شادی تو اس میں جذبات یا محبت سے زیا اولاد کی تمنا کا حصہ تھا۔ دلیپ کمار نے صرف اولاد کی خاطر خفیہ شادی کی تھی۔ لیکن عاصمہ ایک مختلف قسم کی عورت تھی جس نے یہ راز فاش کر کے دلیپ کمار کی [illegible] زندگی اذیت کا سامان فراہم کر دیا۔ بعد میں [illegible] پتا چل گیا کہ شادی محض دولت اور لالچ کے باعث کی گئی تھی اور [illegible] میں عاصمہ کا شوہر بھی شامل تھا جس سے اس نے دلیپ [illegible] محبت کا یقین دلانے کے لیے محض اس کی خاطر طلاق حاصل کی تھی۔ یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ دلیپ کمار سے طلا حاصل کرنے کے بعد عاصمہ نے دوبارہ اپنے پہلے شوہر سے شادی کر لی تھی۔

اس داستان کو دہرانے کا کوئی فائدہ ہے نہ ضرورت اس سے پہلے بہت تفصیل کے ساتھ یہ واقعات بیان کیے جا چکے ہیں۔ یہ تذکرہ وحیدہ رحمان کی داستان کے ضمن میں بر نہیں تذکرہ آ گیا۔

وحیدہ رحمان نے کچھ عرصے بعد اداکار کمل جیت سے شادی کر لی تھی۔ ہم نے ایک بار ان کے شوہر کا نام بسوا جیت لکھ دیا تھا۔ یہ بے خیالی میں لکھا گیا تھا۔ سعودی عرب سے لقمان خوشی صاحب نے انگریزی میں ایک مختصر خط لکھ کر ہماری غلطی کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ وحیدہ رحمان کے شوہر کا نام کمل جیت تھا جنہوں نے وحیدہ رحمان کے ساتھ ایک فلم میں کام بھی کیا تھا۔ لقمان خوشی صاحب کے مطابق شادی سے پہلے کمل جیت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ دونوں عمرہ اور [illegible] ادا کرنے کے لیے حجاز مقدس بھی گئے تھے۔ لقمان صاحب نے لکھا تھا کہ اب جبکہ بھارتی فلمی صنعت کے بادشاہ ''خان'' لوگ بھی ہندو عورتوں سے شادیاں کر رہے ہیں اور مسلمان اداکارائیں ہندوؤں سے شادی کر رہی ہیں تو کیا یہ افسوس

بات نہیں ہے؟ عام طور پر فلم بین اپنے پسندیدہ اداکاروں کی تقلید کرتے ہیں۔ اس طرزِ عمل سے نوجوان مسلمانوں کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا۔

ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات اور میڈیا کی یلغار کے باعث دنیا ایک گاؤں بن کر رہ گئی ہے۔ مغربی اثرات اور روشن خیالی کی وجہ سے شادیوں کے معاملے میں اب مذہب ایک خاص طبقے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہا ہے۔ تہذیب نے مغرب کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ مذہب، پرانی تہذیب واقدار اب قصۂ پارینہ ہو چکی ہیں۔ بھارت میں تو اب حالات کے جبر کی وجہ سے اور مغرب زدگی کے باعث مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادیاں کر رہی ہیں۔ یہ سلسلہ قیامِ پاکستان کے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا اور کئی مسلم لڑکیوں نے ہندوؤں سے شادی کر لی تھی جیسے چندر کی بیگم بھی ایک مسلمان تھیں۔ وقت کا سیلاب پرانی قدروں کو بہا کر لے جا رہا ہے اور انسان اس کے سامنے تنکوں کی طرح بہے جا رہے ہیں۔

وحیدہ رحمان اور کمل جیت کی شادی 1973ء میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وحیدہ رحمان کی جو فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھیں ان میں من مندر، ریشماں اور شیرا، زندگی، [illegible] راجہ، وغیرہ شامل ہیں۔ 76-1975ء میں وحیدہ رحمان نے ہیروئن کے کرداروں سے ہٹ کر بڑی عمر کے کردار ادا کرنے شروع کر دیے جن میں نوان بمبئی، کبھی کبھی، ترشول اور عدالت قابلِ ذکر ہیں۔ وہ ماں، بیوی اور بھابی کے کرداروں میں بھی بہت پسند کی گئیں۔ اس کی اس دور کی فلموں میں جوالا مکھی، نمک حلال، کملین اور سوال شامل ہیں۔ 1980ء میں اس نے ''چاندنی'' میں ایک اہم کردار ادا کیا لیکن 1991ء میں اس کی فلم ''لمحے'' نے ایک بار پھر وحیدہ رحمان کی اداکاری کا سکہ جما دیا۔ اس فلم میں سری دیوی اور انیل کپور نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ وحیدہ رحمان سری دیوی کی ماں کی موت کے بعد اس کی دایہ کے کردار میں نظر آئی اور اس نے بے مثال جذباتی اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد اس کی اور بھی فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔

وحیدہ رحمان نے لگ بھگ تیس بتیس سال تک فلموں میں اداکاری کی۔ اس کو فلموں کی دنیا میں لانے والا گورودت تھا جس نے اس کو تراش کر ہیرا بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی بے پناہ صلاحیتوں اور دلکش شکل وصورت کی مالک تھی۔ رقص میں بھی مہارت رکھتی تھی اور ہر طرح کے کرداروں کے ساتھ انصاف کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور کی بہترین فنکاراؤں کی صف میں شمار کی جاتی ہے۔ اس کا نام مدھو بالا، مینا کماری، نرگس، کامنی کوشل، نوتن، نمی اور وجنتی مالا جیسی فنکاراؤں کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس نے زیادہ فلموں میں کام نہیں کیا مگر جس فلم میں بھی اداکاری کی اس میں اپنے کردار کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا۔ وہ آج بھی اداکاری کر رہی ہے لیکن صرف موزوں اور منتخب کردار ہی قبول کرتی۔ وحیدہ رحمان نے اس دور کے سپر اسٹارز کے ساتھ کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ وہ دلیپ کمار، دیو آنند اور راجیکپور کی ہیروئن کی حیثیت سے جلوہ گر ہو چکی ہے۔ اس نے سب سے زیادہ فلمیں دیو آنند کے ساتھ کی ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ دلیپ کمار کے ساتھ اس نے تین فلموں اور راج کپور کے ساتھ دو فلموں میں کام کیا۔ وہ اس دور کے دوسرے ممتاز فنکاروں کی بھی ہیروئن بن چکی ہے۔ اس کی اداکاری کا ایک مخصوص اور حقیقت پسندانہ انداز تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس نے مشرقی روایات کا ہمیشہ پاس کیا۔ اس نے عریانی اور فحاشی سے مکمل طور پر پرہیز کیا اور ہر زمانے میں ان اقدار کی پاسداری کرتی رہی۔ شادی کے بعد اس نے ایک پرسکون اور مطمئن گھریلو زندگی گزاری ہے اور حقیقی زندگی میں بھی اپنا یہ کردار بہت خوبی سے ادا کیا ہے۔

وحیدہ رحمان نے ایک چوٹی کی ہیروئن کی حیثیت سے کافی عرصے فلم بینوں کے دلوں پر راج کیا ہے لیکن جس شخص نے اس سے صحیح معنوں میں عشق کیا وہ گورودت تھا جو اس کی خاطر دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھکرا کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ ایک جگ بیت جانے کے بعد کیا کبھی اس نے اس المیے کو یاد کر کے خود کو مورد الزام ٹھہرایا۔ انسان بھی عجیب گورکھ دھندا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں جانتا، پہچانتا۔

☆☆☆

پاکستان کی سب سے پہلی فلم کون سی تھی؟ اس بارے میں بظاہر تو کوئی ابہام اور جھگڑا نہیں ہے لیکن ہمارے محترم دوست ہدایت کار وفلم ساز لقمان مرتے دم تک یہ ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے کہ پاکستان کی پہلی فلم ''شاہدہ'' تھی جس کے وہ ہدایت کار تھے۔ انہوں نے اخبارات میں مہم چلائی، مضامین لکھے۔ انٹرویو دیے۔ اخبارات کے تراشوں اور فلمی ریکارڈ کا ایک پلندہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہمارے بہت قریبی اور بزرگ لیکن بے تکلف دوست بھی تھے جن کے بارے میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ ہم سے انہیں ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ایک صحافی اور ان کا قریبی

دوست ہونے کے باوجود ہم پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں پہلی فلم کے ہدایت کار کی حیثیت سے ان کا نام شامل نہیں کرا سکے۔

انتقال سے تین دن قبل بھی وہ ہمارے پاس آئے تھے۔ ڈان، ایسٹرن فلمز اور دیگر فلمی وغیر فلمی اخبارات کا ایک ذخیرہ ان کے ہمراہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ آفاقی، ان شبوتوں کے بعد اس میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا کہ میری فلم ''شاہدہ'' ہی پاکستان کی پہلی فلم تھی۔

ادھر پچھلے دنوں (جنوری 2005ء) دیوان سرداری لال کے صاحب زادے اور فلم ساز رام دیال بمبئی سے لاہور آئے۔ وہ یہ فریاد کرتے ہوئے آئے تھے کہ ان کے آنجہانی والد دیوان سرداری لال نے پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' بنائی تھی لیکن اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ انہیں یہ بھی شکوہ تھا کہ پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے دفتر میں پاکستان کے پہلے فلم ساز کی حیثیت سے ان کے والد کی تصویر آویزاں نہیں کی گئی جو کہ سخت ناانصافی ہے۔ پاکستان فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے موجودہ صدر اور دیگر عہدے داروں نے ان کی اس شکایت کا ازالہ کرنے کا وعدہ کیا۔ رام دیال صاحب جو خوبصورت تصویر اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے، اسے ایسوسی ایشن کے دفتر میں آویزاں کرنے کے لیے ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا گیا لیکن بدقسمتی سے دیگر معاملات پر بحث اتنی تلخ ہوگئی کہ اجلاس ملتوی کرنا پڑا۔ رام دیال صاحب کو واپس بمبئی جانا تھا اس لیے وہ بے نیل و مرام چلے گئے مگر اس امید کے ساتھ کہ اگلی بار ان کی شنوائی ضرور ہوگی اور پاکستان کے اولین فلم ساز کی حیثیت سے ان کے آنجہانی والد دیوان سرداری لال کی تصویر فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے دفتر میں اپنا جائز مقام حاصل کرلے گی۔

آج کی نسل کے نزدیک یہ بحث بے معنی ہے کہ پاکستان کی پہلی فلم کون سی تھی۔ سچ پوچھیے تو اب لوگوں کو پاکستانی فلموں ہی میں دلچسپی باقی نہیں رہی ہے جس کے مجرم خود فلم ساز ہیں، وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے محض دولت کے بل بوتے پر ایک پھلتی پھولتی فلمی صنعت پر قبضہ جمالیا اور پھر ان پڑھ، جاہل اور فلمی تکنیک سے ناواقف لوگوں کو فلمی صنعت کے سر پر سوار کردیا۔ یہ لوگ جنہیں فلم یا ذوقِ لطیف سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا، اور مطلق کوئی دلچسپی نہ تھی، تیس پینتیس سال تک غنڈوں، بدمعاشوں کی غیر معیاری فلمیں بناتے رہے جس کی وجہ سے پہلے خواتین نے اور پھر گھرانوں نے سینما گھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ خون خرابے اور تشدد سے بھرپور فلمیں دیکھنے والا ایک مخصوص طبقہ باقی رہ گیا تھا جو کہ خود اپنی خواتین کو بھی یہ فلمیں دکھانے کا قائل نہ تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ سینما گھر سنسان اور اجاڑ ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کاروبار ٹھپ ہوکر رہ گیا۔ بے شمار سینما مسمار کرکے پلازہ بنالیے گئے۔ اب رہے سہے سینما گھروں کے مالکوں کا رونا ہے کہ ہم فلموں سے محروم بیٹھے نقصان اٹھا رہے ہیں۔ پاکستان کی فلمی صنعت ہماری ضروریات اور تقاضے پورے نہیں کرسکتی اس لیے بھارتی فلموں کی نمائش کی اجازت دی جائے ورنہ رہے سہے سینما گھر بھی منہدم ہوجائیں گے۔

موجودہ صورتِ حال کا ذمے دار کون ہے؟ حکومت، فلم ساز، فلم تقسیم کار، سینما گھروں کے مالک یا خود فلمی صنعت سے وابستہ فن کار اور تکنیک کار؟ یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔ مختصراً یہ کہ ہمارے نزدیک یہ سب شعبے درجہ بہ درجہ موجودہ صورتِ حال کے ذمے دار بلکہ مجرم ہیں۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ ہماری فلمی صنعت، جسے بے شمار لوگوں نے خونِ جگر پلا کر پالا پوسا اور پروان چڑھایا تھا، اب آخری سانس لے رہی ہے۔ دنیا میں فلمی صنعت اور سینما گھروں کا بزنس ترقی کررہا ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت میں فلمی صنعت ایک نمایاں صنعت بن چکی ہے جس میں اربوں روپے کی سرمایہ کاری ہوتی ہے اور اب ان کی فلمیں ساری دنیا میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد ہر شعبے میں چھائے ہوئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہاں فلم والے بدستور کام کررہے ہیں بلکہ ان کی اولادیں بھی اسی صنعت سے وابستہ ہوچکی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں فلم والے عرصۂ دراز سے اس صنعت سے دور ہوچکے ہیں۔ بیشتر مرکھپ گئے ہیں۔ جو باقی رہ گئے ہیں، ان میں سکھانے یا فلم بنانے کی سکت نہیں ہے۔ اس لیے یہ تصور کہ پاکستان کی فلمی صنعت از سرِ نو جنم لے گی، ترقی کرے گی خیالِ خام سے زیادہ کچھ نہیں ہے بقول شاعر

ڈھونڈ اب اس کو چراغِ رخِ زیبا لے کر
لیکن اب رخِ زیبا کے چراغوں میں بھی روشنی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے یہ تلاش بے سود ہی سمجھیے۔

جہاں تک پاکستان کی پہلی فلم کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کے بعد جو فلم ملک میں نمائش کے لیے پیش کی گئی وہ ''تیری یاد'' تھی۔ اس کے فلم ساز دیوان سرداری لال تھے۔ دراصل دیوان سرداری لال کو اس امید پر سیٹھ دلسکھ پنچولی نے پاکستان میں چھوڑا تھا کہ وہ ان کے اثاثوں کی حفاظت کریں اور جب تک سیٹھ صاحب دوبارہ لاہور

واپس نہ آجائیں وہ ان کے سینما گھروں، نگار خانوں اور دیگر جائدادوں کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ تقسیم کے فوراً بعد جب لاہور اور مشرقی پنجاب میں خونریز فسادات شروع ہوئے تھے تو یہاں سے رخصت ہونے والے بہت سے غیر مسلموں کا یہ خیال تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد جب فضا بہتر ہوگی اور حالات معمول پر آئیں گے تو وہ دوبارہ واپس آکر اپنے اثاثوں کو سنبھال لیں گے۔ ہندوستان خصوصاً یوپی سے آنے والے بہت سے مسلمانوں کو بھی یہی گمان تھا۔ لیکن بعد میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اتنا خون بہا کہ جس کی انسانی تاریخ میں کسی جنگ کے بغیر مثال ملنی مشکل ہے۔ ہزاروں، لاکھوں افراد، زخمی اور بے گھر ہوگئے۔ سیکڑوں ہزاروں عورتیں اغوا کرلی گئیں۔ نتیجتاً جیسے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بقول غالب

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

جو کوئی اپنی سرزمین اور وطن چھوڑ کر آیا وہ یا تو راستے ہی میں رہ گیا یا پھر دوبارہ پلٹ کر واپس نہ گیا۔

سیٹھ دلسکھ پنچولی بھی ان ہی لوگوں میں تھے، جو تقسیم ملک سے قبل لاہور کی فلمی صنعت کے ستون تھے۔ انہوں نے پنجابی اور اردو کی بہت سی معیاری فلمیں بنائیں۔ بڑے بڑے فن کاروں اور ہنرمندوں کو گمنامی کے اندھیروں سے نکال کر ناموری کی چکاچوند سے آشنا کیا۔ انہیں بھی گھبراہٹ کے عالم میں لاہور سے رخصت ہونا پڑا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہیں خوف زدہ کرکے لاہور سے رخصت کرنے میں ان کے منیجر دیوان سرداری لال کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو ایک بار چلا گیا دوبارہ پلٹ کر نہیں آئے گا۔ چنانچہ سیٹھ صاحب کے جانے کے بعد وہ ان کے اثاثوں کے نگراں اور ان کے جانشین بن کر بیٹھ گئے۔ سیٹھ صاحب کی نیک فطرت کے برعکس وہ راجا اندر بننا پسند کرتے تھے۔ وہ طبعاً بہت رنگین مزاج انسان تھے۔ فلم تیری یاد کی ہیروئن آشا پوسلے تھیں۔ اداکاروں میں ان کی بڑی بہن رانی کرن بھی شامل تھیں۔ یہ دونوں بہنیں آل انڈیا ریڈیو سے گلوکاری بھی کرتی رہی تھیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت یہ لاہور میں تھیں۔ اس زمانے میں جبکہ فلمی اسکینڈلز نہ ہونے کے برابر مشہور ہوتے تھے، یہ اسکینڈل بہت مشہور ہوا تھا کہ دیوان سرداری لال اور آشا پوسلے انتہائی نزدیک ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جاتا تھا کہ آشا پوسلے نے دیوان سرداری لال سے شادی کرلی تھی۔ لیکن اس کی تصدیق کبھی بادوثوق ذرائع سے نہ ہوسکی۔ اس فلم سے جو دوسرے فن کار اور ہنرمند وابستہ رہے تھے ان میں کیمرامین رضا میر، ساؤنڈ ریکارڈسٹ اے زیڈ بیگ، لیبارٹری انچارج پیارے خاں، مصنف خادم محی الدین (جو اس زمانے میں اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھتے تھے) ہدایت کار داؤد چاند اور موسیقار ماسٹر ناتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ماسٹر ناتھ کا اصل نام دراصل عنایت علی تھا۔ یہ آشا پوسلے، رانی کرن اور گلوکارہ کوثر پروین کے والد تھے۔

''تیری یاد'' کیوں بنائی گئی اور کیسی بنائی گئی تھی، یہ بھی ایک سربستہ راز ہی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فلم تیری یاد پاکستان میں ریلیز ہونے والی پہلی پاکستانی فلم تھی لیکن وہ زمانہ بہت پُرآشوب تھا۔ لوگ لٹ لٹا کر آئے تھے، اجنبی اور غیر مانوس ماحول سے مانوس ہونے اور زندہ رہنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مقامی لوگ اتنی بڑی تعداد میں آنے والے مہاجروں کی خاطر داری اور آبادکاری کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ملکی معیشت تباہ برباد ہوچکی تھی۔ پیسا کسی کے پاس نہ تھا۔ عام لوگ اپنے اپنے مسائل میں گرفتار تھے۔ ان حالات میں فلم دیکھنے کا وقت، ہوش اور سکت کس میں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس فلم کے اداکار وغیرہ بالکل گمنام تھے۔ ناصر خاں اس فلم کے ہیرو تھے۔ (شاہدہ کے ہیرو بھی یہی تھے) ان کے سوا ہر فنکار اور ہنرمند فلم بینوں کے لیے ایک نیا نام تھا۔ اس لیے یہ فلم کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرسکی۔ اللہ جانے کن اور کتنے لوگوں نے اس فلم کو دیکھا۔ ہم پاکستان آنے کے بعد اس فلم کے بارے میں بہت کچھ پڑھتے اور سنتے رہے ہیں لیکن ہمیں ایک بھی ایسا شخص آج تک نہیں مل سکا ہے جس نے یہ فلم بذاتِ خود دیکھی ہو۔ ہمارے خیال میں تو اس فلم سے وابستہ لوگوں نے خود بھی یہ فلم نہ دیکھی ہوگی یا پھر جس کسی سے ہم نے پوچھا اس نے ہنس کر ٹال دیا کہ بس آفاقی صاحب، یہ تذکرہ رہنے دیجیے۔

اس فلم کو بنانے کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ دیوان سرداری لال اپنا نام پاکستانی فلم سازوں کی فہرست میں سب سے اوپر درج کرانے کے سیٹھ دلسکھ پنچولی کے اسٹوڈیوز اور دوسرے اثاثوں کے مالک بننا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس فلم کو آبادھابی میں کم سے کم وقت میں بنا کر ریلیز کردیا۔ اس کی نمائش بھی کسی معقول پبلسٹی کے بغیر کی گئی تھی۔ فلم سے وابستہ ناموں کو کوئی جانتا نہ تھا۔ لوگوں کو فلم دیکھنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ ان سب باتوں کی آمیزش نے پاکستان کی پہلی فلم ''تیری یاد'' کو ایک پُراسرار معما بنادیا۔ ''تیری یاد'' کی کہانی قیامِ پاکستان سے پہلے لکھی گئی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ

یہ کہانی سرتاپا ہندو ماحول اور ہندو کرداروں سے تعلق رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والی اسلامی مملکت میں کوئی صحیح الدماغ شخص ہندو ماحول پیش کرنے والی فلم بنانے کا تصور تک نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن دیوان سرداری لال نے یہ کارنامہ بھی کر دکھایا۔ اس فلم کا کوئی پرنٹ اس وقت دستیاب نہیں ہے اور نہ ہی کوئی دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے یہ فلم دیکھی ہے۔ اتنا سب جانتے ہیں کہ اس کے اداکار اور ہنرمند کون تھے۔ اس فلم کے چند گانے تنویر نقوی نے، کچھ سیف الدین سیف نے اور ایک گیت قتیل شفائی نے لکھا تھا۔ یہ قتیل شفائی کا سب سے پہلا فلمی نغمہ تھا۔ فلم میں دس گانے تھے جو کوثر پروین اور آشا پوسلے نے گائے تھے۔ ان گانوں کے بول ایک پرانے پمفلٹ میں ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ ایسے اچھے شاعروں نے ایسے گیت لکھے ہوں گے۔ مثلاً چند گانوں کے بول ملاحظہ کیجیے۔

1۔ دکھ کی ماری برسوں اپنے بھاگ کو روئی
آنکھوں سے پی پی کے آنسو اپنے سہاگ کو روئی

2۔ میں تلی بن کر آئی
جوبن نے لی انگڑائی۔ نیند نہ آئی جوانی پھرتی ہے اترائی

3۔ ہمیں چھوڑ نہ جانا جی
منہ موڑ نہ جانا جی

4۔ محبت کا مارا چلا جا رہا ہے
نہ راہوں کو جانے نہ منزل کو جانے

5۔ چھلکی جوانی ہائے جیا مورا ڈولے
ہاں جیا مورا ڈولے۔ پریم کہانی پنچھی بولے

6۔ لو تیری یاد آئے، تری یاد آئے
بیتی باتوں کے فسانے دہرائے
دل بیکل کو کل نہ آئے
روکلپ کلپ کلپائے

7۔ کیا آئی ہے یاد سہانی
من کرے ہے من مانی

8۔ سنو سنو جی
گئی تھی بہار میں
لینے گئی تھی کوبھی

9۔ بول بول ری
دو بول بول ری

یہ تو اس فلم کے گیت ہیں۔ اب ذرا کہانی کا خلاصا بھی سن لیجیے۔

یہ ایک خیالی ریاست کی کہانی ہے، جس کے راجا صاحب اچانک مرجاتے ہیں۔ رانی اس صدمے سے نڈھال ہوجاتی ہے۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل نہیں سکی ہے کہ اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس کی اکلوتی بیٹی آشا کو دلن خود اس کی ماں کے ہاتھوں زہر دلا کر ہلاک کردیتا ہے۔ دلن نے یہ ظلم اس لیے کیا کہ راجا کی وصیت کے مطابق راجا کی بیٹی ہی تخت وتاج کی وارث اور اس کی جانشین تھی لیکن بیٹی کے بعد دلن اس ریاست کا وارث تھا چنانچہ دلن اپنا راستہ صاف کرنے کی غرض سے رانی کی بیٹی کو ہلاک کر کے خود تخت وتاج کا وارث بن گیا۔

رانی کے لیے یہ صدمہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ وہ دادرسی کے لیے عدالت سے رجوع کرنا چاہتی تھی۔ ان کے خاندانی ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ عدالت سے انہیں انصاف نہ مل سکے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ صبر وشکر سے کام لیں اور اپنی ممتا کی تسکین کے لیے کسی یتیم ویسیر بچی کو گود لے کر اپنی روح کو سکون پہنچائیں، یہ فرض کرلیں کہ یہی ان کی بیٹی آشا ہے۔ رانی نے ایک یتیم لڑکی کو گود لے کر اس کا نام آشا رکھ دیا اور اس طرح اپنی کوکھ سے جنم لینے والی حقیقی بیٹی کی جگہ اس نے اپنی بیٹی بنالیا۔

زمانہ گزرتا گیا اور یہ یتیم لڑکی جوان ہوگئی۔ اس موقع پر رانی کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے دنیا کو خیرباد کہہ کر پہاڑوں کی یاترا شروع کردی تاکہ اس کی بے چین روح کو سکون مل سکے۔ گویا وہ اپنی بیٹی اور شوہر کی یاد میں مختلف مقامات پر بھٹکتی پھریں۔ اس کے بعد کیا ہوا، یہ بتانا مشکل ہے لیکن اس کہانی کے تمام کردار ہندو تھے۔ اس کا ماحول ہندو تھا۔ کہانی قطعی بے مقصد اور بے سروپا تھی۔

اس فلم کے ہدایت کار داؤد چاند اور مصنف خادم محی الدین تھے۔ ان دونوں حضرات سے ہمیں زیادہ حاصل رہا ہے۔ داؤد چاند قیام پاکستان سے پہلے بھی ہدایت کار تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے فلم ''دستی'' سے بہت شہرت پائی۔ گجراتی انداز میں اردو بولتے تھے۔ گہرا سانولا رنگ، مختصر قد اور بھاری جسم کے مالک تھے۔ ہم اس زمانے میں صحافی تھے۔ داؤد چاند صاحب سے نگارخانوں یا فلمی دفاتر میں ملاقات ہوجاتی تھی۔ وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ یا روشن خیال نہ تھے۔ ان کی کامیاب ترین فلموں میں صرف ''دستی'' کا نام لیا جاسکتا ہے۔

فلم کے مصنف خادم محی الدین صاحب ایک تعلیم یافتہ اور انتہائی شریف النفس اور شائستہ انسان تھے۔ ان کی شہرت ہم نے یہی سنی کہ وہ قیام پاکستان سے پہلے بھی کہانی اور

ڈرامے لکھا کرتے تھے اور بہت اچھا اسکرین پلے لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے ان کی یہ صلاحیتیں کسی فلم میں نہیں دیکھیں۔ بعد میں انہوں نے ہدایت کاری کی طرف آکر فلم ''خزاں کے بعد'' بنائی تھی اور کچھ فلموں کا اسکرین پلے تحریر کیا تھا۔ لیکن کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ آخر میں وہ اعجاز درانی کے ادارے سے منسلک ہوگئے تھے۔ وہ اردو فلموں کے انگریزی اسکرپٹ بھی تیار کردیا کرتے تھے۔ ہم نے انہیں شائستہ، بلند اخلاق اور حلیم الطبع انسان پایا۔ جب ہم نے فلمی مصنف کی حیثیت سے کام شروع کیا تو وہ بھی اس شعبے سے وابستہ تھے لیکن کامیابی نے کبھی ان کے قدم نہیں چومے۔ وہ درمیانے درجے کے پتلے، سانولے رنگ کے نرم گفتار انسان تھے۔ کبھی ہم نے ان کی زبان سے زمانے یا فلمی صنعت کی شکایت نہیں سنی۔ نووارد لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ہمارے ساتھ بھی انہوں نے ہمیشہ شفقت آمیز برتاؤ روا رکھا۔

سیف الدین سیف صاحب سے ابتدائی دنوں میں ہماری صرف سلام دعا تھی۔ بعد میں ان کے ساتھ کچھ مراسم ہوگئے۔ وہ بہت اچھے شاعر تھے، ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے تو سننے والے مسحور ہوجاتے۔ فلمی کہانیاں اور نغمے لکھنے کے بعد انہوں نے فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے بھی بہت نام پیدا کیا۔ ان کی فلم ''سات لاکھ'' اپنے وقت کی بہت کامیاب اور خوبصورت فلم تھی جس کے مرکزی کردار سنتوش کمار اور صبیحہ خانم نے بہت عمدگی سے ادا کیے تھے۔ موسیقی رشید عطرے نے بنائی تھی۔ یہ فلم 1957ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس وقت پاکستان میں سماجی فلمیں بننے لگی تھیں۔ اسی سال ڈبلیو زیڈ احمد صاحب کی فلم ''وعدہ'' اور سبطین فضلی کی ایک فلم ''آنکھ کا نشہ'' بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس میں صبیحہ خانم، مسرت نذیر اور سدھیر نے مرکزی کردار کیے تھے۔ وعدہ کے ہیرو سنتوش کمار اور ہیروئن صبیحہ خانم تھیں۔ مصنف، فلم ساز... اور ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد تھے۔ یہ تینوں فلمیں اعلیٰ معیار کی حامل اور بے حد کامیاب فلمیں تھیں۔ اس سال بہترین فلم کا نگار ایوارڈ وعدہ کو ملا تھا۔ موسیقی کے اعتبار سے تینوں فلمیں بہت کامیاب اور یادگار تھیں۔

تنویر نقوی صاحب بے بدل شاعر اور گیت نگار تھے۔ ملکہ نور جہاں کے بہنوئی تھے۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان میں نغمہ نگار کی حیثیت سے بہت نام پیدا کیا تھا۔ ایوب صاحب کی فلم ''انمول گھڑی'' کے گانے ان ہی کے تحریر کردہ ہیں۔ بے حد معصوم، سادہ دل، فیاض اور دل پھینک انسان تھے۔ لیکن ان کی یہ رنگین مزاجی یک طرفہ ہی ہوتی تھی۔ یہ عالم تھا کہ جہاں کوئی حسین چہرہ نظر آیا انہوں نے ''سبحان اللہ'' کہا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ کار چلا رہے ہیں اچانک خوبصورت لڑکی کو دیکھا تو بے ساختہ ''سبحان اللہ'' کہہ کر گردن گھما کر دیکھنے لگے۔ ساتھ بیٹھنے والے شور مچاتے اور فریاد کرتے تھے۔ ''ارے ارے تنویر صاحب! کیا غضب کر رہے ہیں، خدا کے لیے سامنے دیکھیے۔''

اس زمانے میں سڑکوں پر ٹریفک بہت کم ہوتا تھا۔ اگر آج کا زمانہ ہوتا تو تنویر صاحب یقیناً حادثات کا شکار ہوتے اور اپنے ساتھ بیٹھنے والوں کو بھی اسی صورتِ حال سے دوچار کرتے۔ تنویر نقوی کے ساتھ ہماری بہت ملاقاتیں اور مراسم رہے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں وہ ہدایت کار لقمان اور اداکار علاؤالدین پرانے مسلم ٹاؤن میں برابر برابر تین کوٹھیوں میں رہتے تھے۔ سامنے سنتوش صاحب اور درپن کا گھر تھا۔ آس پاس بھی کئی فلم والے رہا کرتے تھے۔ ہم لقمان صاحب کے ساتھ کام کے سلسلے میں یا گپ شپ کے لیے اکثر شام کو وہاں چلے جاتے تھے۔ لان میں سب لوگ اکٹھے ہوجاتے۔ علاؤالدین صاحب، ریاض شاہد، موسیقار حسن لطیف ملک، رشید عطرے، ماسٹر عنایت حسین، مصنف سکے دار اور بہت سے فلمی حضرات اس محفل میں شامل ہوجاتے تھے۔ تنویر صاحب اگر کسی فلم کی موسیقی پر کام کررہے ہیں تو چارپائی پر گاؤ تکیے پر اوندھے نیم دراز ہیں۔ موسیقار طرز سنا رہا ہے اور وہ فکر سخن میں مصروف ہیں۔ ان کے کئی شاہکار نغمات اسی طرح لکھے گئے۔ انارکلی میں ماسٹر عنایت حسین اور رشید عطرے صاحب دونوں نے طرزیں بنائی تھیں۔ اس فلم کے تمام نغمات تنویر صاحب کی کوٹھی کے لان ہی میں لکھے گئے۔ تنویر صاحب اور موسیقار تو کام میں مصروف ہوجاتے تھے اور دوسرے یار دوست خوش گپیوں میں لگ جاتے۔ کئی اور مصنف، شاعر اور ہدایت کار اور اداکار بھی آجاتے تھے۔ گلوکاروں کا آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ ہر وقت قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے پر ہوٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے۔

تنویر صاحب کا تذکرہ ہم بہت تفصیل سے کرچکے ہیں۔ انہوں نے فلمی نغمہ نگاری کا آغاز کرتے ہی بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ خوب کمایا مگر بے دردی سے لٹایا۔ انہیں تو اخراجات کی خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ جو کماتے اپنی بیگم عیدن کے حوالے کردیتے۔ مستحق دوستوں کی مدد بے دریغ کیا کرتے

تھے۔ کئی لوگوں نے ان کی سادگی اور خلوص سے فائدہ اٹھا کر انہیں خوب لوٹا۔ جب تک پیسا آتا رہا، انہیں کوئی غم تھا نہ افسوس مگر جب فالج کا حملہ ہونے کے بعد کام سے معذور ہو گئے تو حالات بدل گئے۔ انتقال سے چند سال قبل انہوں نے عیدن بائی کو طلاق دے دی تھی۔ ان دونوں کی کوئی اولاد نہ تھی۔ جبکہ تنویر صاحب کو اولاد کی تمنا تھی۔ بیوی کی فضول خرچی اور دولت لٹانے کی عادت سے بھی وہ تنگ آ چکے تھے۔ بہرحال دوسری شادی ایک گھریلو خاتون سے کی اور بہت خوش وخرم نظر آنے لگے۔ اللہ نے جلد ہی اولاد سے بھی نواز دیا۔ تنویر صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ کام کرنے سے معذور ہو گئے۔ کئی فلم سازوں نے ان کے واجبات ادا نہیں کیے۔ فلمی روایات کے مطابق فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی منہ موڑ لیا۔ کہاں تو یہ تھا کہ ان کا منہ مانگا معاوضہ ادا کرتے اور خوشامد میں لگے رہتے مگر دن پھرے تو سب نے آنکھیں پھیر لیں۔ تنویر صاحب کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ کام کی تلاش اور واجبات کی وصولی کے لیے فلمی دفاتر کے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ جب فلمی صنعت میں محض چند بڑے اداکار ہی کاروں کے مالک تھے، اس وقت تنویر صاحب آسٹن کار میں گھومتے تھے۔ اب سڑک سوار ہو گئے تھے۔ ہم نے ایک دن لکشمی چوک کی سڑک پر چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بمشکل چل رہے تھے۔ ایک ہاتھ نوعمر بیٹے کے کاندھے پر تھا۔ یہ وہی بیٹا تھا جس کے لیے وہ ترسا کرتے تھے۔ اللہ کسی کو اچھے وقت کے بعد برا وقت نہ دکھائے۔ تنویر صاحب بہت نیک دل اور سخی انسان تھے۔ کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی۔ وہ تو کسی کے لیے برا سوچنے کے اہل بھی نہ تھے لیکن اپنے زمانہ عروج میں اچانک ایسے معذور اور لاچار ہوئے کہ عبرت کا نشان بن کر رہ گئے۔ مالی پریشانیوں اور بیماری کے عالم میں ہی انہوں نے وفات پائی۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جب اولاد کی دولت دی تو دنیاوی دولت واپس لے لی۔

وہ بے حد نفیس، حاضر جواب اور شائستہ انسان تھے، ان کی شاعری اور گیت نگاری کا تو ایک زمانہ لوہا مانتا ہے۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے مگر زندگی کے آخری دنوں میں خود بھی روئے اور دوستوں کو بھی رلا کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

فلم ''تیری یاد'' کے لیے تنویر صاحب کے نام سے جو نغمات منسوب ہیں یقین نہیں آتا کہ وہ ان ہی کی تخلیق ہیں۔ سیف الدین سیف بھی مایۂ ناز اور قادر الکلام شاعر تھے۔ تیری یاد کے نغمات کیا واقعی ان ہی شاعروں نے لکھے تھے، یقین نہیں آتا۔

اس فلم کے عکاس رضا میر تھے۔ بہت ہنرمند اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ بعد میں ہدایت کاری بھی کی اور ''لاکھوں میں ایک'' ''ناگ منی'' اور ''آسرا'' جیسی فلمیں بنا کر اپنی دھاک بٹھادی۔ شائستہ اور سنجیدہ مزاج انسان تھے۔ ہمارے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے۔ گھروں میں آنا جانا تھا۔ یہ اعزاز انہوں نے صرف ہم کو بخشا کہ ہمیں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک طویل انٹرویو دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اور مینا شوری کے بارے میں ہمیں بتایا حالانکہ اس موضوع پر انہوں نے کبھی زبان نہیں کھولی تھی۔ ہم نے تو ''تیری یاد'' دیکھی نہیں۔ نہ ہی کوئی ایسا ملا جس نے یہ فلم دیکھی ہو۔ اس لیے کہہ نہیں سکتے کہ اس کی عکاسی کیسی ہوگی۔ رضا میر نے بعد میں پاکستان کی فلمی صنعت کو بہت اچھے کیمرامین دیے۔

''تیری یاد'' کی کہانی کا خلاصہ اور موضوع آپ سن چکے ہیں۔ نغمات کے بول بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔ عنایت علی عرف ماسٹر ناتھ نے اس فلم کی جیسی موسیقی بنائی ہوگی اس کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک قطعی ناکارہ اور بے سرو پا فلم ہوگی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیٹھ دلسکھ پنچولی تو بمبئی چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اس فلم میں سرمایہ کس نے لگایا تھا؟ اس زمانے میں اس فلم کی تکمیل پر بمشکل چالیس پچاس ہزار روپے کی لاگت آئی ہوگی لیکن اس وقت یہ بھی بہت بڑی رقم تھی۔ خاص طور پر پاکستان کی نوزائیدہ اور مفلوک الحال فلمی صنعت کے لیے۔

یہ فلم 'دیوان پکچرز' کے تحت بنائی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس فلم کے لیے سرمایہ ڈی پی سنگھ صاحب نے فراہم کیا تھا۔ وہ لاہور کے کسی کالج میں پرنسپل یا پروفیسر تھے۔

فلم ساز کے طور پر دیوان سرداری لال کا نام دیا گیا تھا۔ ڈی پی سنگھ صاحب کو ایسوسی ایٹ پروڈیوسر کا درجہ دیا گیا تھا۔ اس فلم کو بنانے کا ایک مقصد تو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دیوان سرداری لال فلم ساز بن کر پاکستان میں رہنا اور پنچولی سیٹھ کے اثاثوں پر قبضہ جمانا چاہتے تھے جو وہ ان کی تحویل میں منیجر کے طور پر سونپ کر گئے تھے۔ دوسرا مقصد عیش وعشرت تھا جو کہ صاف ظاہر تھا۔ آشا پوسلے اس زمانے میں بہت دلکش اور پرکشش ہستی تھیں۔ ان کی بہن رانی کرن بھی خوش شکل تھیں۔

بہرا فنکار

1824ء کی ایک رات ویانا کے شہریوں کے سامنے ایک عظیم موسیقار اپنے فن کا جادو جگا رہا تھا۔ اس کی تخلیق نویں سمفنی ایوان نغمہ میں گونج رہی تھی۔ یہ نئی طرز ترنم سب کے لیے حیران کن تھی۔ آزمودہ سازوں کی ترکیب وترتیب سے تخلیق پانے والے راگ نے سامعین سے ان کا اختیار چھین لیا تھا۔ لگتا تھا ہر شخص ایوان میں گونجنے والے سروں کے سحر کا اسیر تھا۔ موسیقار ان سب سے بے نیاز اپنے سازندوں کو مخصوص انداز میں ہدایات دے رہا تھا اور پھر ساز خاموش ہوئے تو ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ سامعین کو اس ہیجان انگیز کیفیت سے باہر آنے میں کچھ وقت درکار تھا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد تحسین وآفرین کا شور بلند ہوا اور ایوان دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ آج کی طرح کل بھی یہ دستور تھا کہ اختتام نغمہ پر داد تحسین کے جواب میں موسیقار سامعین کی طرف منہ کر کے تعظیماً سر جھکا کے شکریہ ادا کرتے تھے مگر اس رات اس شائستگی کی پیروی میں موسیقار کو خاصی دیر لگ گئی — پھر اسے خیال آیا تو اس نے سر جھکا کر اپنے بے قرار سننے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیسی والہانہ صدائیں بلند ہو رہی تھیں' وہ تھماتے چہروں اور تالیاں بجانے کی حرکات سے ہی سامعین کے جوش وتحسین کی شدت کا اندازہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ سماعت سے محروم تھا۔

وہ دنیا کا ایک عہد ساز موسیقار تھا اور اس کا نام اپنے زمانے کے سحر کاروں ہی میں نہیں' آج دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی معتبر ومحترم سمجھا جاتا ہے۔ وہ دنیائے موسیقی میں جس مقام اور اعزاز کا مستحق ہے۔ اس کا اصل نام لڈوگ فان تھا اور وہ بیتھوین کے خاندانی نام سے مشہور ہوا۔ بیتھوین دسمبر 1770ء کو جرمنی کے شہر بون میں پیدا ہوا' اس کا آبائی پیشہ موسیقی ہی تھا۔ دادا پیانو نواز' گلوکار اور ایک ذہین' آسودہ حال شخص تھا۔ باپ جوہان بھی اچھا گلوکار تھا اور موسیقی میں اچھا درک رکھتا تھا۔ کم عمری ہی میں بیتھوین نے باپ سے پیانو اور وائلن بجانا سیکھ لیا تھا اور پھر روزی کا بھی یہی سلسلہ ٹھہرا۔ باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا نامور موسیقار موزارٹ کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر حاوی ہو جائے لیکن وہ شروع ہی سے خود سر نظر آتا تھا۔ اس کے وائلن پکڑنے کا انداز بھی روایتی نہ تھا۔ روایت سے انحراف اور صبح وشام سخت ریاضت اور نئی نئی طرزیں وضع کرنا اس کا شیوہ تھا۔ 12 سال کی عمر میں وہ بون کے مشہور آرگن نواز کرسچن گوٹلوب نی فے کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر 17 سال کی عمر میں وہ اپنی منزل مقصود یعنی ویانا کے سفر میں کامیاب ہوا۔ ویانا اس زمانے میں مغربی موسیقی کا بڑا مرکز تھا۔ وہاں اس نے شہرۂ آفاق موسیقار موزارٹ کے دروازے کا رخ کیا۔ موزارٹ نے موسیقی سے اس کی وابستگی اور جنون کو دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ اس نوجوان میں عظیم موسیقار بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔

اس نے ویانا کے مشہور موسیقاروں کی خدمت میں حاضری دی تاکہ اس کی بے بہا طبیعت مزید جوہر حاصل کر سکے۔

26 سال کی عمر میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے کانوں میں بھنبھناہٹ سی ہونے لگی ہے۔ ڈاکٹروں نے شور سے اجتناب کا مشورہ دیا مگر موسیقی تو اس کی زندگی تھی لہٰذا وہ نو بہ نو طرزیں تخلیق کرتا رہا اور اپنا مرض وہ ایسی خوش اسلوبی سے چھپاتا رہا کہ اس کے قریبی احباب بھی اس کی گراں گوشی سے بے خبر رہے۔ 32 سال کی عمر میں وہ سماعت سے یکسر محروم ہو گیا اور خود اپنی آواز' اپنی ترتیب دی ہوئی دھنیں سننے سے بھی محروم ہو گیا۔

بنیادی طور پر وہ ایک رومانی کلاسیکی موسیقار تھا۔ اس نے بہت سی سحر انگیز دھنیں دنیا کو دی ہیں مگر ترنم سے عاشقانہ کیفیت پیدا کر دینے والے اس موسیقار کی اپنی زندگی رومان سے عاری تھی۔ بے شمار عورتیں اس کے قریب آئیں لیکن کوئی بھی اس کی نہ بن سکی۔ طرح طرح کی روایتیں اس باب میں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں وہ ایک نہایت تنہا' قنوطی' اپنے آپ میں گم' ضدی اور کسی حد تک برگشتہ برگشتہ۔ قوت سماعت سے محرومی نے اسے اور بھی تنہا کر دیا تھا۔ اس کا مشہور زمانہ طربیہ راگ ''چاندنی رات'' گلیلیا می ایک دوشیزہ سے منسوب ہے۔ یہ اطالوی نواب زادی حسن وجمال میں یکتا تھی۔ بیتھوین کی آنکھوں میں بھی یہ دل جگر اور رخ بسی ہوئی تھی۔ اس کے فن کی مداح اور ممدوح سے شادی سے گریز ان دوشیزاؤں کے برعکس' نواب زادی گلیلیا مستقل طور پر اپنے محبوب سے وابستگی کی آرزومند تھی لیکن بیتھوین نے خود پر جبر کیا۔ اس کا عذر تھا کہ کسی تشنۂ سماعت شخص کو ایک اتنی حسین لڑکی کا شوہر نہیں ہونا چاہیے۔ بیتھوین اپنے ہم عصر عظیم المرتبت جرمن سخن کار گوئٹے کی تحریروں کا فدائی تھا۔ اس نے گوئٹے کا کلام اپنے فن میں سمویا۔ گو دونوں ایک دوسرے کے فن کے شدت سے قائل تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کو متاثر نہ کر سکے کیونکہ دونوں کے مزاجوں میں بڑا فرق تھا۔ ایک نہایت شائستہ یعنی گوئٹے اور دوسرا اکھڑ مزاج۔ وہ 26 مارچ 1827ء کو 57 سال کی عمر میں نمونیا اور یرقان کا شکار ہو کر اس دنیا سے چل بسا۔ وہ آخری وقت تک بے تکان کام کرتا رہا تھا اور زندہ رہتا تو مزید جدت طرازیاں اس کے حصے میں آتیں۔

ایک انتخاب: فوزیہ دین پوری' خان پور کٹورا

دیوان سرداری لال کی محبوبہ کی حیثیت سے آشا پوسلے بعد میں بھی مشہور رہیں۔ اب آشا پوسلے اس دنیا میں ہیں نہ ان کے والد اور بہن۔ لیکن ریکارڈ کے لیے اصل حالات کا سامنے لانا ضروری ہے۔ دیوان سرداری لال اس خاندان پر بہت مہربان تھے شاید اسی لیے اس فلم میں اس خاندان کے سبھی افراد شامل تھے۔ فلم کا معیار کیا ہوگا اس سے غالباً دیوان صاحب کو کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ راجا اندر بنے ہوئے تھے۔ حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں رنگین دن اور رنگین راتیں گزارتے تھے۔ اس عیش وعشرت پر ان کے پلے سے ایک پیسا بھی نہیں لگتا تھا۔ اس لیے انہوں نے فلم کی کاسٹ اور معیار کے بارے میں کوئی پروا نہیں کی۔ بقول غالب۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

انہیں بھی فلم سازی سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اک گونہ بے خودی کے طالب تھے لہٰذا خوب دل کے ارمان نکالے۔ آشا پوسلے پاکستانی فلموں میں ویمپ اور کامیڈین کی حیثیت سے کافی عرصے تک کام کرتی رہی ہیں۔ ہم نے ان کے ساتھ کبھی کام نہیں کیا لیکن فلمی صنعت اس وقت اتنی مختصر تھی کہ ہر ایک سے آمنا سامنا ہوتا رہتا تھا۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے ہم سے بھی ان کی علیک سلیک تھی۔ پے تکلفی کی نوبت کبھی نہ آئی۔ وہ بے حد بے باک اور منہ پھٹ تھیں۔ ان کی باتیں، ان کے اطوار سبھی بے باکی اور شوخی لیے ہوئے تھے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اگر وہ خود کو سنبھال کر رکھتیں، سنجیدگی سے اداکاری پر توجہ دیتیں اور باوقار طور طریقے اپناتیں تو شکل وصورت اور سراپا کے باعث کم از کم پنجابی فلموں کی ہیروئن ضرور بن سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے خود کو بہت سستا کر دیا تھا۔ اب تو ان کی مغفرت ہی کی دعا کی جاسکتی ہے۔ چند سال قبل (بیسویں صدی کے آخر میں) بڑھاپے اور بے کاری سے تنگ آکر اپنے بھتیجے کو فلموں پاٹی دی میں اداکار بنانے کے لیے فلمی دفاتر کے چکر لگاتی رہتی تھیں۔ دو تین بار ''فیملی میگزین'' کے دفتر آکر ہم سے بھی ملاقات کی اور بھتیجے کے لیے سفارش کی۔ اس سے پہلے ان کے کسی بھائی بھتیجے کا نام ہم نے نہیں سنا تھا۔ وہ خود اولاد سے محروم تھیں۔ سب سے چھوٹی بہن پروین کوثر جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ وقت جب بدلتا ہے تو سبھی کچھ بدل جاتا ہے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ دنیا سرائے عبرت ہے۔ اگر کوئی عبرت حاصل کرنا چاہے تو اس کے لیے ہر قدم پر جیتے جاگتے ثبوت موجود ہیں مگر انسان کو اب ان کاموں کی طرف دھیان دینے کی فرصت کہاں ہے؟ افسوس کہ دیوان سرداری لال کے ساتھ آشا پوسلے نے کوئی حد فاصل قائم نہیں رکھی تھی۔ اس زمانے میں وہ آشا پوسلے ہی کے گھر میں رہتے تھے۔ یہ داستان بے حد تکلیف دہ اور شرمناک ہے۔

پچھلے دنوں جب دیوان سرداری لال کے صاحب زادے دین دیال لاہور آئے تھے تو ایک صحافی نے ان سے پوچھا ''یہ بتائیے کیا آشا پوسلے واقعی آپ کے والد کی داشتہ تھیں؟''

ان کا جواب سنیے ''ہم کبھی بھی یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ دیوان صاحب آشا پوسلے سے زیادہ محبت کرتے تھے یا رانی کرن سے۔ البتہ وہ تھے بہت رنگین مزاج!''

اپنے باپ کے بارے میں ایک بیٹے کا یہ جواب دیوان سرداری لال کا بیٹا ہی دے سکتا ہے۔ اس واقعے نے بے حد شرمندہ اور آزردہ کر دیا۔ افسوس کہ انسان تھوڑے سے دنیاوی عیش وآرام کے لیے انسانیت کے درجے سے بھی گر جاتا ہے، اللہ معاف کرے۔

''تیری یاد'' میں آشا پوسلے اور رانی کرن کے علاوہ ناصر خاں، غلام محمد، نذر، شعلہ اور ماسٹر غلام قادر بھی شامل تھے۔ اب اس فلم سے وابستہ کوئی ہستی بقید حیات نہیں ہے۔ ایک رضا میر صاحب رہ گئے تھے، وہ اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کر گئے اس لیے ان واقعات کی تصدیق یا تردید کرنے والا بھی کوئی نہ رہا۔ سچ پوچھیے تو ہم نے ''تیری یاد'' کے بارے میں جاننے کی کبھی کوشش نہیں کی ورنہ ایک زمانے میں اس سے وابستہ سبھی لوگ زندہ سلامت تھے۔ اگر کریدتے تو بہت سے حالات وواقعات معلوم ہو سکتے تھے۔ اب یہ سب بعد از وقت ہے۔

کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

یہ تفصیل تو لقمان صاحب نے بھی کبھی ہمیں نہیں بتائی تھی۔ مرحوم کو محض اس بات سے سروکار تھا کہ ان کی فلم ''شاہدہ'' کو پاکستان کی پہلی فلم تسلیم کر لیا جائے مگر وہ یہ حسرت ہی لے کر دنیا سے گئے۔

☆☆☆

جیمز بانڈ 007 کہنے کو ایک خیالی کردار ہے لیکن ناول نگار آئین فلیمنگ کے اس کردار کو فلم ساز البرٹ کوبلی نے جس خوبصورتی اور مہارت سے فلم کے سانچے میں ڈھالا اس کی وجہ سے دنیا بھر میں کروڑوں فلم بینوں کے لیے یہ ایک جیتے جاگتے کردار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ جیمز بانڈ کی فلمیں تفریح کا شاہکار ہوتی ہیں اور فلم دیکھنے والوں کو ایک طلسماتی دنیا میں

لے جاتی ہیں۔ جدید ترین تکنیک، خوبصورت نظاروں، حسین عورتوں اور حیرت انگیز واقعات کی مدد سے جیمز بانڈ کی فلمیں دوسری فلموں سے یکسر مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں ہر لمحے ایک نیا واقعہ، حادثہ اور نیا منظر سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی فلم سے نہیں ہٹنے پاتی۔ گزشتہ 42 سالوں میں جیمز بانڈ کے متعلق 22 فلمیں بن چکی ہیں اور ہر فلم محض حیرت انگیز واقعات اور پیش کش کے انوکھے انداز کی وجہ سے منفرد اور مقبول حیثیت اختیار کر گئی۔ پیئرس برانسن آخری ریلیز ہونے والی فلم میں جیمز بانڈ کے روپ میں نمودار ہوئے تھے۔ ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن صورت شکل اور جسمانی چستی ومستعدی کی وجہ سے دیکھنے والوں کو کبھی ان کی عمر کا احساس نہ ہوا لیکن فلم سازوں کی مجبوری ہے کہ اب ایک نیا اور تازہ دم جیمز بانڈ فلم بینوں کے سامنے پیش کیا جائے جو پھرتی اور چلت پھرت میں پیئرس برانسن سے بڑھ کر ہو۔ اس سے پہلے مختلف اداکار جیمز بانڈ کا کردار ادا کر چکے ہیں۔ سب سے پہلے جیمز بانڈ شان کونری تھے۔ انہیں جب لوگوں نے فلم ''ڈاکٹر نو'' میں دیکھا تو حیرت سے نکلتے رہ گئے۔ وہ صورت شکل، جسم اور پھرتی وچالاکی کے شاہکار ایک اچھلا وہ نظر آتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی فلم ہی میں اپنا سکہ جما دیا تھا۔ آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ جیمز بانڈ کا کردار شان کونری سے زیادہ کسی اور کو سوٹ نہیں دیا۔ وہ سر ایا جیمز بانڈ نظر آتے ہیں۔ خوبصورتی، وجاہت، عقابی آنکھیں، چیتے جیسی چال اور نقل وحرکت۔ ان سب خوبیوں نے مل کر انہیں ایک مثالی جیمز بانڈ بنا دیا تھا۔ انہوں نے ان فلموں کے حوالے سے بہت شہرت اور دولت کمائی لیکن وہ صحیح معنوں میں ایک فن کار اور اداکار ہیں اس لیے یہ مقبولیت، دولت اور شہرت پا کر بھی وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ ان کے اندر ایک بے قرار فنکار کی روح تھی جو کہ ان سے مسلسل مطالبہ کر رہی تھی کہ بھائی یہ اچھل کود اور مار دھاڑ کب تک کرتے رہو گے۔ اب اپنے فن کا بھی مظاہرہ کرو۔ شان کونری نے فلم سازوں اور فلم بینوں کے اصرار کے باوجود جیمز بانڈ کے کردار کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ ثابت میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ درحقیقت ایک بہت عظیم اداکار ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ بڑھاپے میں بھی وہ فلم سازوں کی ضرورت بنے ہوئے ہیں اور منہ مانگے معاوضے پر اپنے من پسند کردار ادا کرتے ہیں۔ نقاد ان کی اداکاری کے گن گاتے ہیں۔ اداکاروں کے اعلیٰ حلقوں میں انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اب انہیں فنی اطمینان بھی حاصل ہے اور ہر کوئی انہیں ایک اعلیٰ پائے کا اداکار تسلیم کرتا ہے۔

پیئرس برانسن ابھی ایک دو فلموں میں مزید یہ کردار کر سکتے تھے مگر فلم سازوں نے ان کی توقعات پر پانی پھیر دیا اور ایک نئے جیمز بانڈ کی تلاش شروع کر دی۔ کافی جستجو اور تلاش کے بعد بالآخر ایک نوعمر اداکار کلائیو اورون کو پانچواں جیمز بانڈ منتخب کر لیا گیا ہے۔ وہ اس کردار کے ساتھ کتنا انصاف کرتے ہیں اور اپنے پیشرو فن کاروں کی جگہ کس حد تک پوری کرتے ہیں، اس کا اندازہ تو ان کی فلم ریلیز ہونے کے بعد ہی لگایا جا سکے گا۔ جیمز بانڈ کی فلموں میں ایک خاص اور منفرد بات یہ ہے کہ ان میں ہیروئن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کوئی بھی خوبصورت، دلکش اور اسمارٹ لڑکی اس فلم کی ہیروئن منتخب کی جا سکتی ہے چونکہ کہانی کا اصل مرکز خود جیمز بانڈ ہوتا ہے اور اسی کے گرد کہانی کا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔

سچ پوچھیے تو ان فلموں میں ہیروئن سے زیادہ اہمیت نئے نئے ڈیزائن کی کاروں کی ہوتی ہے جو نرالے کرتب دکھاتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان فلموں میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے پورا استفادہ کیا جاتا ہے۔ دراصل اس کردار کے خالق آئین فلیمنگ کو بذاتِ خود کاروں سے بہت دلچسپی تھی اس لیے انہوں نے اپنے ناولوں میں بھی نت نئے کرتب دکھانے والی کاروں کو بہت اہمیت دی تھی۔

شان کونری نے جیمز بانڈ کے کردار کو زندگی دی تھی۔ ان کے بعد راجر مور اس کردار میں جلوہ گر ہوئے۔ وہ نوجوان تو نہ تھے لیکن کہانی کے زور پر چلتے رہے۔ انہوں نے کئی فلموں میں یہ کردار نبھایا مگر پھر تھک گئے لہٰذا ایک نئے اداکار جارج لیزن بائی کو موقع دیا گیا مگر انہیں فلم بینوں نے پسند کیا نہ ہی وہ فلم ساز وہدایت کار کے معیار پر پورے اترے۔ پیئرس برانسن خاصے مقبول ہوئے اور پے در پے کئی فلموں میں انہوں نے یہ کردار نبھایا لیکن جب وہ تھکے تھکے نظر آنے لگے تو فلم ساز وہدایت کار کو ایک نئے جیمز بانڈ کی ضرورت پیش آئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ نیا جیمز بانڈ سب کی توقعات پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ دراصل ان سے پہلے ٹموتھی ڈالٹن کو بھی ایک فلم میں جیمز بانڈ کا کردار دیا گیا لیکن انہیں بھی زیادہ پسند نہیں کیا گیا تھا۔

جیمز بانڈ کے خالق آئین فلیمنگ کے بارے میں ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، یہ کردار ان کا تخلیق کردہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سراسر فرضی کردار نہیں ہے بلکہ اس میں فلیمنگ کے ذاتی تجربات ومشاہدات کو بھی دخل ہے۔

فلیمنگ کی کہانی یہ ہے کہ پہلے وہ ایک صحافی تھا۔ اس کو

آپ تحقیقاتی رپورٹز بھی کہہ سکتے ہیں۔ رپورٹرز میں یہ ایک علیحدہ صنف تصور کی جاتی ہے۔ 1933 میں آئین فلیمنگ کو ماسکو بھیجا گیا جہاں وہ جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہونے والے چھ انجینئروں پر چلائے جانے والے مقدمے کی کارروائی رپورٹ کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم کے بعد تمام بڑے ممالک خفیہ ایجنسیوں اور جاسوسوں کو بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ ہر ملک میں جاسوسی کا نظام قائم تھا اور سب ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

بالآخر دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی اور جاسوسوں کو جان پر کھیل کر دوسرے ملکوں کے بارے میں خفیہ راز اور معلومات حاصل کرنے پر مامور کردیا گیا۔ آئین فلیمنگ نے برطانیہ کی سیکرٹ سروس میں ملازمت کرلی اور بہت کامیاب سراغ رساں ثابت ہوا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں اسے مختلف ملکوں میں گھومنے اور جاسوسی کے گُر سمجھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے کام میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ برطانوی سیکرٹ سروس کا ایک ممتاز رکن بن گیا۔ اس ملازمت کو ترک کرنے کے بعد اس نے اتفاقیہ طور پر ناول نگاری شروع کی تو اپنے تجربات کو بھی استعمال کیا۔ اس نے 007 کا کردار تخلیق کیا اور اس کے اردگرد بہت جاندار اور خوبصورت کرداروں کا جال پھیلا دیا۔

اس کا پہلا ناول ہی بے پناہ مقبول ہوا تو اس نے اس کو اپنا پیشہ بنالیا۔ یہ ناول بہت حد تک خیالی واقعات و کرداروں پر مشتمل تھے لیکن ایک منجھلے اور دل جلے فلم ساز نے اس کردار کو فلم کے پردے پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا جو کہ بظاہر بہت مشکل کام تھا۔ اس فلم ساز کا نام البرٹ کوبلی بروکولی تھا۔ پہلی ہی فلم میں اس نے اپنی مہارت اور صلاحیتوں کا ایسا مظاہرہ کیا کہ فلیمنگ کے ناولوں سے بھی زیادہ پُراثر اور حیرت انگیز کردار اور واقعات فلم بینوں کے سامنے پیش کردیے جو کہ ان کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ فلیمنگ کا پہلا ناول ''ڈاکٹر نو'' تھا۔ اس کے لیے شان کونری کا انتخاب کیا گیا۔ کہانی کی پیشکش کا انداز اتنا اچھوتا اور حسین تھا کہ فلم بین اس پہلی فلم ہی میں جیمز بانڈ کے دلدادہ ہوگئے۔ فلم ساز بروکولی نے فلیمنگ کے خیالات کو فلم کے سانچے میں اتنی خوبصورتی سے ڈھالا تھا کہ خود فلیمنگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ عام طور پر مصنف اپنے ناولوں کی فلم بندی سے مطمئن نہیں ہوتے لیکن یہاں مصنف پوری طرح اس فلم سے متفق اور مطمئن تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ بروکولی نے فلم کے اسکرین پلے لکھنے کے کام میں فلیمنگ کو بھی شامل کرلیا۔ اس کے بعد جب جیمز بانڈ کے کردار کے لیے اداکار کے انتخاب کا وقت آیا تو اس میں بھی فلیمنگ کی رائے شامل تھی۔ شان کونری کو مکمل جیمز بانڈ بنانے اور انہیں اپنا تصور سمجھانے کے لیے فلیمنگ نے مہینوں شان کونری کے ساتھ گزارے اور انہیں اس کردار کی ضرورت اور تقاضے اس انداز میں سمجھائے کہ جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو دیکھنے والے بے اختیار کہہ اٹھے کہ ''صاحب، جیمز بانڈ واقعی ایسا ہی ہوگا۔''

بعد میں فلیمنگ کے دوسرے ناول بھی فلمائے گئے جن میں اس کا مشورہ اور نگرانی شامل تھی۔ فلیمنگ 1964ء میں دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے ناول بھی ختم ہوگئے لیکن اس کے مرکزی کردار اور مرکزی خیال کو پیشِ نظر رکھ کر یار لوگوں نے من گھڑت کہانیاں بنائیں اور انہیں قبولیت عام بھی حاصل ہوئی۔ جیمز بانڈ کی فلموں میں تیز رفتار کاریں، ہیجان خیز اور سانس روک دینے والے مناظر پیش کیے گئے۔ یہ کاریں اپنی رفتاری میں بے مثال تھیں۔ یہ ہوائی جہاز کی طرح ہوا میں بھی کرسکتی تھیں اور بحری کشتی کی طرح سمندر میں بھی سفر کرسکتی تھیں۔ ان پر گولی وغیرہ اثر نہیں کرتی تھی۔ بعض کاریں آٹومیٹک آلات کی مدد سے ڈرائیور کے بغیر ہی چلتی تھیں جو ایسے حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیتی تھیں کہ دیکھنے والے مسحور اور مبہوت رہ جاتے تھے۔

ان فلموں میں ہیروئن ایک ثانوی حیثیت کی مالک ہوتی ہے چونکہ کہانی اور فلم کی بنیاد دوسری چیزوں پر رکھی جاتی ہے۔ واحد ضرورت یہ ہے کہ ہیروئن اسمارٹ، سیکسی، پرکشش اور انتہائی دلکش اور بے باک ہو۔ آئین فلیمنگ بذاتِ خود بھی کاروں اور حسینوں کا عاشق اور بے حد دل پھینک انسان تھا۔ اس نے ان تمام تجربات کا نچوڑ اپنے ناولوں اور فلموں میں پیش کردیا۔ ان فلموں میں ہیروئن سے اداکاری کی توقع نہیں رکھی جاتی۔ بس اس کا حسین و جمیل ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آخری جیمز بانڈ فلم ''ڈائی این ادر ڈے'' کی ہیروئن ہال بیری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس فلم سے پہلے ہی اس نے بہترین اداکارہ کے طور پر آسکر ایوارڈ کے لیے منتخب کیا جاچکا تھا۔ یہ ایک سیاہ فام نسل سے تعلق رکھنے والی اسمارٹ لڑکی ہے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں ان خاتون کی اداکاری یا شکل وصورت میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی مگر نقادوں اور فلم بینوں نے انہیں بہت سراہا اور اب وہ ایک مہنگی اور نخرے والی اداکارہ بن چکی ہیں۔ مردوں کی طرح ترشے ہوئے بال، دبلا پتلا جسم، سیاہ رنگت لیکن روشن آنکھیں اور پھر تیلا پن۔ یہ ہے آخری جیمز بانڈ گرل کا حلیہ۔ یہ بھی لطیفہ ہے کہ جیمز بانڈ

فلموں کی ہیروئن کو فلم بین اس کے نام سے نہیں جانتے صرف جیمز بانڈ گرل کے حوالے سے پہچانتے ہیں اور ہر فلم میں انہیں نئے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صرف ایک اداکارہ نے جیمز بانڈ کی دو فلموں میں کام کیا تھا۔

جیمز بانڈ فلموں کے خالق بروکولی اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا نام فلمی حلقوں میں زندہ ہے۔ پہلی فلم کی ہیروئن ارسلا اینڈرس تھی۔ اس بانڈ گرل کا تعارف دیکھنے والوں کو آج بھی یاد ہے، جب وہ پوری حشر سامانیوں کے ساتھ سمندر کے اندر سے ابھرتی ہے اور لہراتی ہوئی چال کے ساتھ جیمز بانڈ کی جانب بڑھتی ہے۔ یہ منظر یادگار حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ دراصل جیمز بانڈ سلسلے کی پہلی فلم ہی اس قدر مقبول اور بھرپور تھی کہ دیکھنے والے دیوانے ہوگئے۔ ارسلا اینڈرس ایک معروف اداکارہ تھیں لیکن اس فلم کے حوالے سے انہیں ایک یادگار حیثیت حاصل ہوگئی۔ دیکھا جائے تو شان کونری اور ارسلا اینڈرس نے روایت ساز کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے اداکاری کا جو نمونہ پیش کیا بعد میں پھر سب نے اس کی پیروی کی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایک سے بڑھ کر ایک حسین و دلنواز ہیروئن جیمز بانڈ کی محبوبہ کے طور پر ان فلموں میں جلوہ گر ہوئیں مگر ارسلا نے جو سحر طاری کیا تھا وہ کوئی نہ توڑ سکی۔ شان کونری نے پھرتی، چالاکی اور جانبازی کا ایک نادر نمونہ پیش کیا جو کہ اس سے پہلے فلم بینوں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر نو جیمز بانڈ کے موضوع پر پہلی فلم تھی لیکن ایک ناقابلِ فراموش فلم بن گئی۔

جیمز بانڈ کے کردار کو جنم دے کر دنیا کے سامنے پیش کرنے والے فلم ساز البرٹ کوبلی بروکولی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اب ان کی بیٹی باربرا کرولی اور بیٹا ولسن یہ فرض ادا کررہے ہیں۔ جیمز بانڈ کی فلموں میں، جب وہ فلیمنگ کے ناولوں سے ہٹ کر بنائی گئیں، تو فلم ساز نے سارے مسالے ڈال کر انہیں بارہ مسالے کی چاٹ بنادیا لیکن درحقیقت اب ان کا وہ پہلے جیسا معیار نہیں رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کہانی کے موضوع ختم ہوگئے ہیں اس لیے اب سنسنی خیزی، ایکشن، دلکش چہروں اور نت نئی سائنسی ایجادوں کی مدد سے ان فلموں کی دلچسپی قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سسپنس فلمیں تو ہر دور میں مختلف ہدایت کاروں نے بنائی ہیں اور بے حد خوب صورت فلمیں بنائی ہیں۔ لیکن سسپنس فلم بنانے والوں میں الفریڈ ہچکاک کو ایک منفرد اور

دفاعی قلعہ

امریکی محکمۂ دفاع کا صدر دفتر اور امریکا و موجودہ دنیا کا سب سے بڑا دفاعی انتظامی قلعہ پینٹاگون (PENTAGON) اپنے مخصوص طرزِ تعمیر کی بنا پر ناقابلِ تسخیر اور محفوظ ترین عمارت تصور کیا جاتا ہے، 11 ستمبر کے حملوں میں جزوی طور پر تباہ ہوا۔

عمارت کا نقشہ ''پنج کونہ'' ہونے کی بنا پر اسے ''پینٹاگون'' کا نام دیا گیا۔ اس کی منزلیں بھی پانچ ہیں اور یہ واشنگٹن کے نواح میں آرلنگٹن (ریاست ورجینیا) میں واقع ہے۔ اسے جارج برگ اسٹارم نے ڈیزائن کیا۔ یہ دفاعی قلعہ 83 ملین ڈالر کی لاگت سے 15 جنوری 1943ء کو 16 ماہ کی مختصر مدت میں مکمل ہوا اور اب تک اربوں ڈالر اسے جدید و حساس ترین آلات اور سہولیات سے آراستہ کرنے پر خرچ ہوچکے ہیں۔

پینٹاگون اپنے اندر ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ عمارت شکاگو کی مرچنڈائز مارٹ سے دوگنی اور رقبے کے اعتبار سے نیویارک کی ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے فلور اسپیس سے تین گنا زیادہ گنجائش رکھتی ہے۔ یہاں روزانہ کم و بیش 23 ہزار فوجی و سول اہلکار خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

پینٹاگون میں 8770 کاریں سولہ پارکنگ مقامات پر کھڑی کی جاتی ہیں۔ چھوٹی بڑی مختلف 131 سیڑھیاں، 4200 والکاک۔ 691 آبی فوارے، 284 ریسٹ روم، 2 کیفے ٹیریا، 6 اسنیک بار اور ایک آؤٹ ڈور اسنیک بار کا اہتمام ہے۔ یہاں دو لاکھ کے قریب ٹیلی فون کالیں روزانہ موصول ہوتی ہیں۔ اہلکاروں کی ریسرچ میں معاونت کے لیے فوج کی لائبریری تین لاکھ مطبوعات اور مختلف زبانوں میں سترہ سو جرائد مہیا کرتی ہے۔ عمارت کی راہ داریاں 17.5 میل لمبی ہیں۔ لیکن پنج پہلو ساخت کی بدولت ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے میں صرف سات منٹ لگتے ہیں۔

مرسلہ: ہمایوں دین پوری۔ خان پور کٹورا

ممتاز مقام حاصل ہے۔ ان کے پائے کو کبھی کوئی دوسرا ہدایت کار نہ پہنچ سکا۔ وہ اپنے انداز کے بادشاہ تھے۔ ان کی سسپنس فلموں کو بھی کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ ہچکاک فلم بینوں کو اچانک چونکا دینے میں ماہر تھے۔ ان کا کیمرا جس طرح حرکت کرتا تھا، کسی دوسرے ڈائریکٹر نے کیمرے اور چویشن اور لوکیشن کا ایسا استعمال نہیں کیا۔

جیمز بانڈ کے فلم ساز البرٹ بروکولی کو جاسوسی فلمیں بنانے والوں میں کم وبیش وہی حیثیت حاصل ہے جو سسپنس فلموں میں ہچکاک کو حاصل ہوئی۔ اگرچہ ہچکاک سے ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہچکاک ہدایت کار تھے جبکہ کروکولی فلم ساز تھے۔ ہچکاک کی فلموں میں سنجیدگی، ڈراما اور چونکا دینے والا عنصر نمایاں ہے جبکہ جیمز بانڈ فلمیں خالص تفریحی فلمیں ہیں لیکن یہ فلمیں اس نوعیت کی دوسری فلموں سے بہت مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جیمز بانڈ کی آمد نے جاسوسی فلمیں بنانے والوں کی صف میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ ایسی فلمیں نہ تو پہلے کسی نے بنائی تھیں اور نہ ہی بعد میں کسی اور نے بنائیں۔ ان فلموں میں بعض کردار مستقل حیثیت کے مالک ہیں۔ جیمز بانڈ، سیکریٹ سروس کا باس اور اس کی سیکریٹری ان فلموں کے بنیادی اور لازمی کردار ہیں۔ باقی دوسرے کردار تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور کہانی کے تقاضوں کے مطابق انہیں بھی ڈھال لیا جاتا ہے۔ جیمز بانڈ کی فلموں میں سائنس اور جدید ٹیکنالوجی سے بھی بہت مدد لی جاتی ہے۔ اس فلم کے لیے مخصوص قسم کی کاریں ایک ہی کار ساز کمپنی بناتی رہی ہے۔ پھر جیمز بانڈ جو مخصوص قسم کے آلات استعمال کرتا ہے، وہ بھی بالکل انوکھے اور اَن دیکھے ہوتے ہیں۔ انہیں جس طرح استعمال کیا جاتا ہے، وہ حیران کن ہیں لیکن فلم کے پردے پر یہ سب اصلی اور حقیقی نظر آتے ہیں۔ مثلاً نت نئے قسم کا اسلحہ اور ایسے آلات جنہیں صرف جیمز بانڈ ہی نے استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کسی اور ہیرو کو ایسے عجیب وغریب حیران کردینے والے آلات استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مختصر یہ کہ یہ فلمیں ایک عجوبہ ہیں جن میں انوکھے واقعات اور سائنس کے بالکل انوکھے آلات سے مدد لی جاتی ہے۔ فلم ساز بروکولی کو یہ کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ انہوں نے ان فلموں پر اندھا دھند پیسا خرچ کیا۔ دنیا کے انوکھے اور ان جانے مقامات پر جاکر شوٹنگ کی۔ پیسا پانی کی طرح بہایا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے خوب کمایا بھی۔ ان کی ہر فلم سپرہٹ ہوتی اور ان کی تجوریاں بھر دیتی۔ انہیں اپنی پہلی فلم کی کامیابی پر ہی اتنا یقین تھا کہ پیسا خرچ کرنے میں انہوں نے ذرا بھی کنجوسی یا پس وپیش سے کام نہیں لیا۔ دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے رہے۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو ان پر دولت کی بارش ہوگئی۔ بعض فلمیں ایسی ہوتی ہیں جن کے شروع ہوتے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ایک سپرہٹ فلم ہوگی۔ اگرچہ فلم کی کامیابی کا کوئی پیمانہ نہیں ہے اور نہ ہی بڑے سے بڑا فلم ساز وہدایت کار اور نقاد کسی فلم کے بارے میں وثوق کے ساتھ کامیابی کی پیش گوئی کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے تجربہ کار ہدایت کاروں کی وہ فلمیں جن سے انہیں بہت زیادہ توقعات وابستہ ہوتی ہیں بالکل فلاپ ہوجاتی ہیں۔ ایسی بے شمار مثالیں ہالی ووڈ، بھارت اور پاکستان کی فلمی صنعت میں موجود ہیں۔ کئی کامیاب ہدایت کار اور فلم ساز تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے عرصۂ دراز تک کامیابی کے جھنڈے گاڑے لیکن جب ان کی فلمیں فلاپ ہونا شروع ہوئیں تو پھر کوئی فلم نہ چلی یہاں تک کہ وہ فلمی صنعت سے باہر ہوگئے۔ پاکستان میں ایور کمال پاشا اس کی نمایاں مثال ہیں۔ انہوں نے مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے قابلِ رشک حیثیت حاصل کرلی تھی۔ پے درپے کامیابیوں کے بعد تو انہیں کامیاب فلم بنانے کا گُر بہت اچھی طرح جان لینا چاہیے تھا لیکن جب ان کی فلمیں ناکام ہونے لگیں تو پھر ناکام فلموں کی قطار لگ گئی اور ان کی کوئی ایک فلم بھی کامیابی سے ہم کنار نہ ہوسکی۔ وہ شخص جو فلمی صنعت کا بادشاہ کہلاتا تھا دوسرے فلم سازوں کے لیے ہدایت کاری کرنے پر مجبور ہوگیا مگر بدقسمتی دیکھئے کہ یہ فلم بھی کامیاب نہ ہوئی۔ انہوں نے اردو کے بعد زمانے کے تقاضوں کے مطابق پنجابی فلم بھی بنائی مگر ناکامی ان کا مقدر ہوچکی تھی۔ اسے کیا کہنا چاہیے؟ ان کی کوتاہی یا کم فہمی یا قسمت کی خرابی؟

لیکن جیمز بانڈ کے فلم سازوں کے پاس کامیابی کا ایک ایسا نسخہ آگیا ہے جو آج تک ناکام نہیں ہوا اور نہ ہی مستقبل میں ان فلموں کے فلاپ ہونے کا کوئی اندیشہ ہے۔ دنیا بھر کے فلم بینوں کو آئین فلیمنگ کا مرہونِ منت ہونا چاہیے جنہوں نے تفریحی فلموں کے دلدادہ لوگوں کو ایک محبوب اور ناقابلِ فراموش کردار کا تحفہ بخشا۔ شاید انہوں نے خود بھی کبھی یہ نہ سوچا ہوگا کہ وہ اچانک غیر ارادی طور پر ایک ایسا کردار تخلیق کردیں گے جو رہتی دنیا تک فلم بینوں کو یاد رہے گا۔

فلم نگری کی یہ الف لیلہ ابھی جاری ہے اس داستان ہزار رنگ کے مزید واقعات کے لئے آیندہ ماہ کا شمارہ دیکھنا نہ بھولیں

ناکام سفر

میاں فاروق (امریکا)

شکار کے شوقین حضرات کو جب اور جہاں موقع ملے وہ اپنی جبلّت کی بنا پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسے ہی شکاری کے سفر کی روداد ہے۔ جس میں محض ایک امید پر طویل اور تھکا دینے والا سفر ہی اختیار نہیں کیا گیا بلکہ اچھے خاصے خطرات مول لئے گئے۔ نتیجہ کیا نکلا؟ آپ خود دیکھ لیں۔

ایک مخصوص ریچھ کے شکار کی خاطر الاسکا کا سفر

اس دن مجھے نیوآرک کے لبرٹی انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ایک کیس کی چھان بین کے لیے جانا پڑا۔ نیویارک کے کینیڈی ائرپورٹ سے نیوآرک کے لبرٹی ائرپورٹ کا راستہ تقریباً 42 میل کا ہے۔ نیوآرک ریاست نیوجرسی کا انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔

سرکاری کام تھا اور میں پوری یونیفارم میں تھا۔ میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ جولائی کے آخری ہفتے میں جس شدید ہوجاتا ہے اور مجھے آج بھی سارے یونیفارم کے لوازمات اپنے اوپر لادنے پڑے تھے۔ کام کی نوعیت ایسی تھی کہ ایک ائرپورٹ سے دوسرے تک پوری یونیفارم میں جانا

ضروری تھا۔ 2 بجے کے قریب کام سے فارغ ہوا تو بھوک نے ایک دم برا حال کردیا۔ اوپر سے گرمی اور حبس۔ اتنے میں میرے سیل فون کا بزر گونج اٹھا۔

دوسری طرف میرا دوست زاہد تھا۔ زاہد نیو جرسی سٹی میں ایک ''انارکلی'' نامی ریسٹورنٹ بڑی خوبی سے چلا رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد زاہد نے پوچھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے اس کو بتایا کہ اسی کے شہر کے قریب ہوں تو اس نے دعوت دے دی کہ دوپہر کا کھانا اس کے ہوٹل میں آ کر کھاؤں۔ آدھے گھنٹے بعد..... انارکلی ریسٹورنٹ کے سامنے اپنی گاڑی پارک کرتے ہوئے میری نظر عمران کی گاڑی پر پڑی تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ آج زاہد کے ہوٹل میں ہم شکاریوں کی ضرور کوئی اہم میٹنگ ہے۔ ریستوران میں داخل ہوا تو سب ہی جمع تھے اور ایک نیا چہرہ بھی تھا۔

سلام دعا کے بعد زاہد نے نئے مہمان سے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یوسف خان الاسکا میں شکاری گائیڈ ہے اور دعوت دے رہا ہے کہ ہم الاسکا آ کر شکار کھیلیں۔

میں نے یوسف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا..... ''ہم سب کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ زندگی میں ایک بار شکار کے لیے الاسکا ضرور جائیں۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ ذرا تفصیل سے بتائیں کہ کس کس جانور کا شکار آپ وہاں کروا سکتے ہیں۔''

یوسف خان نے بتایا کہ وہ پچھلے 15 سالوں سے الاسکا میں شکاری گائیڈ ہے۔ موز' کیری بو' ماؤنٹین گوٹ' (پہاڑی بکرا) گرزلی بیئر (GRISLY BEAR) کا شکار کرواتا ہے۔

ہم سب دوستوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ واہ واہ.....!

موز کا دھڑ گائے جیسا منہ اور ٹانگیں گھوڑے جیسی ہوتی ہیں اور اس کا وزن 8 سو سے 12 سو پونڈ تک ہوتا ہے گوشت کھا تو پھر بار بار کھانے کو دل چاہتا ہے۔ موز نامی یہ جانور نارتھ امریکا اور کینیڈا میں پایا جاتا ہے میں اور عمران ایک دفعہ مین اسٹیٹ میں موز کا شکار کھیل چکے تھے لیکن دل میں حسرت تھی کہ ایک ٹرافی کے طور پر موز کا سر (ہمہ سینگوں کے) بھی ہونا چاہیے۔

امریکا میں شکار باقاعدہ ایک گیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ضابطے اصول اور قانون کے مطابق شکار کھیلنا پڑتا ہے اور پھر شدید محنت اور جدوجہد کے بعد کہیں جا کر کوئی ٹرافی ہاتھ لگتی ہے۔ شکار کا شوق بہت مہنگا اور دقت طلب ہے۔ ہر کاؤنٹی کے اپنے رولز ہیں۔ کس کاؤنٹی میں شکار کھیلنا ہے' اس کا فیصلہ پہلے سے ہی کرنا پڑتا ہے۔ جب آپ شکار کا لائسنس لیتے ہیں پھر اس کاؤنٹی کا پرمٹ۔ مثال کے طور پر اگر آپ نیویارک اسٹیٹ میں ہرن کا شکار کھیلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے شکار کی کلاس لینی پڑے گی پھر امتحان ہوگا۔ اگر آپ پاس ہوگئے تو پھر لائسنس حاصل کرسکیں گے اور لائسنس کی فیس ادا کرنے کے بعد آپ ایک کالا ریچھ اور ایک نر سفید دم والا ہرن مار سکتے ہیں۔ نیویارک کی ریاست دو زون (حصوں) میں ہوتی ہے۔ ساؤتھ زون اور نارتھ زون۔ نارتھ زون میں ہرن کا شکار اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں شروع ہوتا ہے اور ساؤتھ زون میں نومبر کے دوسرے ہفتے میں..... ساؤتھ زون میں کاؤنٹی کے اپنے رولز ہیں۔ ایک کاؤنٹی میں آپ 12 بور کی بندوق میں SG یا LG کے کارتوس استعمال کرسکتے ہیں تو دوسری کاؤنٹی میں آپ کی 12 بور میں رائفل والے کارتوس ہونے چاہئیں اور گن پر اسکوپ نہیں ہونی چاہیے۔ اگلی کاؤنٹی میں آپ ہرن کا شکار صرف رائفل کے ساتھ کھیل سکتے ہیں اور گن پر ٹیلی اسکوپ ضرور ہونی چاہیے۔

سفید دم والے مادہ ہرن کے لیے آپ کو الگ سے پرمٹ لینا پڑے گا اور آپ کو پہلے سے فیصلہ کرنا ہوگا کہ آپ کس زون اور کاؤنٹی میں سفید دم والے مادہ ہرن کا شکار کھیلنا چاہتے ہیں پھر مختلف قسم کی بندوقوں کے ساتھ شکار۔ تیر کمان کے ساتھ شکار۔ غرض کہ بے شمار مسائل اور پھر جاؤ جنگلوں میں خاک چھانو۔ قسمت سے اگر کچھ ہاتھ لگ گیا تو سبحان اللہ۔ ورنہ سردی اور برف میں ٹھٹھرتے بیمار ہو کر گھر واپس جاؤ۔ صرف نیویارک کی ریاست میں ہرن کا شکار کھیلنے کے لیے میرے پاس 4 رائفلیں 5 شاٹ گن ہیں پھر..... ضابطے کے شکار کے لیے الگ سے شاٹ گن۔

پاکستان سے کئی دوست شکاریوں کے حوالے کر آئے کہ ہمیں بھی ساتھ لے کر کبھی شکار کے لیے ساتھ لے جاؤ لیکن یہ تفصیلات سن کر پیچھے ہٹ گئے۔ ہمارے گروپ میں تقریباً 9 ساتھی ہیں۔ ان میں عمران' زاہد' انجم اور میں پرانے ہیں۔ باقی سب سیزن کے سیزن آ ملتے ہیں۔ PIA کے حوالے سے کچھ دوست احباب بس ساتھ دے دیتے ہیں۔ البتہ سارا انتظام ہمیں ہی کرنا پڑتا ہے۔ گروپ لیڈر عمران سید ہے۔ زاہد اور میں پاکستان میں بھی کئی شکار کھیل چکے ہیں۔ زاہد کا اور میرا لاہور کے مشہور شکاری گروپ سے تعلق تھا۔ عمران اور انجم امریکا میں ہمارے شکاری دوست بنے۔ عمران ایک لیب میں سیلز ریپ ہے اور انجم الیکٹریکل انجینئر ہے۔ انجم الٹے ہاتھ سے رائفل چلاتا ہے' اور کہیں بھی جنگل میں پھسل کر گر پڑتا اس

کی ایسی عادت ہے جس سے ہم سب ہی نالاں تھے۔ خاص طور سے بھری ہوئی رائفل کے ساتھ گرنا کوئی اچھا عمل نہیں ہوتا۔

بات ہو رہی تھی الاسکا میں شکار کی۔ یوسف خان نے کہا کہ وہ ہمیں ماؤنٹین گوٹ یعنی پہاڑی بکرے اور موز کا شکار کروائے گا۔ باتوں باتوں میں ریچھ گرزلی (GRISLY) کا ذکر بھی نکل آیا۔ یہ براؤن ریچھ بہت خطرناک قسم کا درندہ ہے۔ یہ امریکا کی چند مغربی ریاستوں اور یلوسٹون کے جنگلوں کے علاوہ الاسکا میں پایا جاتا ہے۔ عام لوگوں کے علاوہ یہ شکاریوں پر بھی حملے کر کے یا تو شدید زخمی کر دیتا ہے یا جان سے مار دیتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال تقریباً 20 افراد گرزلی ریچھ کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہیں۔ یلوسٹون کے براؤن ریچھ آٹھ سو سے 1200 پونڈ وزنی اور تقریباً دس یا گیارہ فٹ لمبے ہوتے ہیں لیکن الاسکا کے براؤن ریچھ 14 فٹ لمبے ہوتے ہیں اور وزن 15 سو پونڈ تک ہو جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک اور خطرناک کوڈیک سے گزری بیئر ہوتے ہیں۔ کوڈیک الاسکا کا ایک جزیرہ ہے۔

الاسکا کے جنگلوں میں شکار پر جانے والے شکاریوں کے پاس اضافی اسلحہ ضرور ہوتا ہے۔ یوسف خان نے ہمارا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا کہ میاں صاحب آپ موز کے لیے کون سی رائفل استعمال کریں گے اور گوٹ کے لیے کون سی۔ میں سمجھ گیا کہ خان میرے شکار کے بارے میں شد بد جاننا چاہتا ہے۔

میں نے اپنی معلومات اس کو بتانی شروع کیں۔ میں نے بتایا کہ موز..... کے لیے امریکا اور نارتھ امریکا میں شکاری 270 اعشاریہ سے لے کر 375' ہالینڈ اینڈ ہالینڈ کے بور کی رائفل استعمال کرتے ہیں لیکن میں اعشاریہ 300۔ ویدر۔ بی۔ کی رائفل اور 3X9X40 کی ٹیلی اسکوپ اور 200 گرام کی گولی استعمال کرنا پسند کرتا ہوں۔ ماؤنٹین گوٹ کیلئے اعشاریہ 300 وچسٹر میگنم کی رائفل استعمال کروں گا اور گوٹ کیلئے عمران اعشاریہ 270 کے بور کی رائفل پسند کرے گا۔ زاہد اور انجم نے بھی اپنی پسندیدہ رائفلوں کا ذکر کر دیا۔

ہماری باتیں سن کر خان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی کہ واقعی وہ شکاریوں کے درمیان ہے۔ ورنہ لوگ دعوے تو کر دیتے ہیں کہ ہم نے پہلے بھی بہت شکار کھیلا ہے۔ بڑے تیتر مرغابیاں مارے ہیں لیکن صرف شاٹ گن سے رائفل کے بارے میں بہت لوگوں کو ذرا بھی علم نہیں۔ پاکستان میں بڑی رائفل 7MM موزر ہی ہے۔ لاہور میں، میں نے بعض شوقین حضرات کے پاس اچھی رائفلوں کی بیٹری دیکھی ہے۔ ایک اور صاحب جو پرانے شکاری ہیں۔ ان کے پاس ونچسٹر کی 3030 بور کی لیور ایکشن رائفل تھی ہے۔ جو کہ فلموں میں کاؤبوائے استعمال کرتے ہیں۔ یہ رائفل شارٹ رینج کی ہے اور گھنے جنگلوں میں ہرن کے شکار کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لانگ رینج اعشاریہ 270' اعشاریہ 308۔ اعشاریہ 223 اعشاریہ 243۔ کے بور کی رائفلیں درمیانہ قسم کے جانور کے شکار میں استعمال ہوتی ہیں۔

لانگ رینج اور بڑے جانوروں کے لیے 7MM میگنم۔ 300 اعشاریہ اور اعشاریہ 300 وچسٹر میگنم اعشاریہ 300 ویدر B میگنم کی رائفلوں استعمال ہوتی ہیں۔ ایک اور بور ہے ٹوٹو۔ یہ چھوٹی سی گولی بڑی خطرناک ہے۔ دیکھنے میں یہ معمولی سی بے ضرر لگنے والی گولی انتہائی خوفناک نتائج کی مالک ہے۔ بات حیرت کی ہے لیکن میں نے خود اعشاریہ 22 بور کی رائفل سے سفید دم والے ہرن گرتے دیکھے ہیں۔ اعشاریہ 22 بور میں ٹوٹو میگنم بھی ہے۔ یہ اور خطرناک بور ہے۔ امریکا کی آرمی کی مشہور زمانہ M16 رائفل کا بور بھی اعشاریہ 223 ہے۔

یوسف خان سے باقی تفصیلات طے پا گئیں تو ہم نے اس کو موز کے دو پرمٹ پہاڑی بکرے کے دو پرمٹ اور لینڈ پرمٹ کی فیس کا چیک دیا (جو 11 ہزار 3 سو 40 ڈالر تھا) باقی کے اخراجات تو بعد میں ہی ادا کرنے ہوتے ہیں۔ خان نے ہمیں اپنے ضروری سامان کی ایک لمبی فہرست بھی تھما دی تھی جو ہمیں الاسکا میں درکار ہوتا تھا اور ساتھ میں اس نے ہمیں خود کو جسمانی طور پر بھی فٹ رکھنے کی تاکید کی۔ اس کام کے لیے ہمارے پاس ڈھائی ماہ کا وقت تھا۔

اگلے ہفتے انجم' میں اور عمران شاپنگ کے لیے نکلے۔ میں نے ایک اچھی قسم کی دوربین خریدی۔ انجم کو رائفل اور ٹیلی اسکوپ درکار تھی۔ میں نے جرمنی کی بنی ہوئی LICA کمپنی کی 10X42 دوربین خریدی۔ جس کی بات ہی اور ہے۔

انجم نے RUGER کی الٹے ہاتھ کے بولٹ ایکشن والی 7MM۔ میگنم رائفل اور LUPULID کی ٹیلی اسکوپ خریدی اور اسی دن ہم نے رینج میں جا کر انجم کی رائفل پر ٹیلی اسکوپ فٹ کی اور رائفل کو 200 گز پر زیرو کیا۔

میں اور عمران روز 40 پونڈ کا بیک پیک اپنی کمر پر باندھ کر کم از کم 5 میل پیدل چلتے۔ ہر ویک اینڈ پر شوٹنگ رینج جا کر ٹارگٹ کی پریکٹس کرتے۔ ہم نے رائفلیں تو 200 گز پر زیرو کی تھیں لیکن شکار میں یہ تو نہیں ہوگا کہ جانور کتنی رینج پر ملے گا اور پھر ایک یا دو سیکنڈ ہی تو ملتے ہیں رائفل کو کندھے پر لگا

کراسکوپ کے کراس کو ٹارگٹ پر رکھ کر لبلبی دبانے کے لیے اور پھر بلٹ کا گوشت سے ٹکرانے کا ہلکا سا دھماکا سننا اور اطمینان کر لینا کہ گولی اپنے صحیح نشانے پر لگی ہے۔

پھر ایک دن ہم سب یعنی زاہد عمران انجم اور میں نیویارک کے کینیڈی ائرپورٹ پر اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے۔ پہلے ہمیں نیویارک سے لاس اینجلس کی فلائٹ پکڑنی تھی پھر لاس اینجلس سے اینکر (ANCHOR) الاسکا کے لیے فلائٹ لینی تھی۔ ساڑھے پانچ گھنٹے کی فلائٹ تو نیویارک سے لاس اینجلس کی تھی اور پھر آگے اینکر (ANCHOR) کی فلائٹ 3 گھنٹے کی۔

اینکر (ANCHOR) ائرپورٹ پر اترے تو تھکن سے برا حال تھا۔ ائرپورٹ کے باہر یوسف خان موجود تھا۔ سارا سامان ایک وین میں لوڈ کرتے ہوئے خان نے بتایا کہ اس نے ہمارے کھانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ وین کو ایک پارک میں روک کر اس نے کھانا نکالا تو ہم سب خوش ہو گئے۔ یوسف نے دیسی کھانا بنایا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم ایک جھیل کے کنارے پہنچے۔ جہاں سے ہمیں فلائنگ بوٹ میں سوار ہونا تھا۔ یہ فلائنگ بوٹ ایک چھوٹا ہوائی جہاز جو کہ پانی میں اترتا اور چڑھتا ہے۔ سامان جہاز میں لوڈ کرنے کے بعد ہم سب جہاز میں سوار ہوئے اور پائلٹ نے انجن اسٹارٹ کیا تو انجن کی آواز بالکل کسی ٹریکٹر کی طرح تھی۔ زاہد نے بے ساختہ کہا کہ بھئی یہ اڑے گا بھی یا پانی پر پھسلے گا۔ انجم نے بھی برا سا منہ بنایا کہ یہ خطرناک ہوائی سفر کیا ضروری تھا۔

خان نے ہنس کر بتایا کہ اس کے کیبن تک کوئی سڑک نہیں اور کوئی آبی راستہ بھی نہیں ہے۔ آمد و رفت کا بس ایک یہی ذریعہ ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ جہاز اڑا تو تھوڑا اطمینان ہوا۔ پونے دو گھنٹے کی فلائٹ کے دوران ایسے جھٹکے لگے کہ ہم چاروں کی طبیعت بوجھل ہو گئی۔ فلائٹ کے دوران خان ہمیں شکار کی تفصیلات اور علاقے کا حدود اربعہ بتاتا رہا۔ خان نے فضا سے ہمیں اپنا کیبن بھی دکھایا جو کہ ایک خوب صورت سی جھیل کے کنارے تھا۔ خدا خدا کر کے وہ جہاز لینڈ کر گیا تو ہم سب نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ جہاز ڈیک پر لگا تو میری نظر ایک مقامی ریڈ انڈین لڑکے پر پڑی۔ میں نے خان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا مگر جونہی ہم جہاز سے باہر نکلے تو وہ ریڈ انڈین لڑکا ہماری طرف بڑھا اور بڑے تپاک سے اس نے ہاتھ ملایا اور جب اس نے اردو میں السلام علیکم کہا تو ہم سب بڑے حیران ہوئے۔ خان نے اس لڑکے کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ اس کا نام ہینک ہے، اس کی بیوی اور والدہ یہاں خان کے ساتھ رہتے ہیں اور خان کے معاون اور مددگار ہیں۔

جہاز سے سامان اتارنے کے بعد ہم خان کے کیبن میں داخل ہوئے۔ کیبن کیا اچھا خاصا بڑا گھر تھا۔ گھر کے ساتھ ایک شیڈ بھی بنا ہوا تھا۔ گھر کے اندر ہر چیز بڑے سلیقے کے ساتھ رکھی تھی۔ سامان وغیرہ رکھنے کے بعد ہم لکڑی اور بانس سے بنی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک نوجوان اور خوب صورت ریڈ انڈین لڑکی نے آ کر ہمیں عربی میں سلام کرنے کے بعد ہمارے آگے کافی کے مگ رکھ دیئے اور بڑے ادب کے ساتھ خان سے مخاطب ہوئی ''یوسف بھائی کھانا چار بجے تک تیار ہو جائے گا۔''

لڑکی نے یہ سب اردو میں کہا تو ہمارے منہ حیرت سے کھل گئے۔ خان نے بتایا کہ یہ ہینک کی بیوی ہے..... اور اس کو اردو سیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ اتنے میں ہینک کی والدہ بھی آ گئی۔ وہ تقریباً چالیس کی ہو گی لیکن دیکھنے میں 20-25 سال کی لگ رہی تھی۔

کافی سے فارغ ہوئے تو خان نے کہا کہ اگر غسل وغیرہ کرنا ہے تو پانی گرم کروا دیتا ہوں۔ کیونکہ کل سے نہانا وغیرہ بالکل بند ہے۔

غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے تو اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ حالانکہ ابھی صرف چار ہی بجے تھے اور سردی بھی ایک دم سے ہر طرف سے اپنی محسوس ہوئی۔

کھانے میں تلی ہوئی ٹراؤٹ مچھلی تھی۔ ایسی لذیذ اور خستہ مچھلی زندگی میں پہلی بار کھائی۔ کھانے کے دوران خان نے پروگرام بتایا کہ اگلی صبح رائفلیں وغیرہ رینج میں چیک کریں گے کہ کہیں دورانِ سفر کہیں کوئی جھٹکا وغیرہ لگنے سے اسکوپ ہل گئی ہو۔ احتیاطاً چیک کر لیں پھر بعد دوپہر کو کھانے کے بعد ہم خچروں پر سوار ہو کر یہاں سے 10 میل دور کیمپ لگائیں گے۔ اس رات کو ہم سب جلدی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ بجلی وغیرہ تو تھی نہیں لہٰذا 8 بجے ہی لگ رہا تھا کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔

دوسری صبح میری آنکھ 6 بجے کھلی۔ کمرے میں شدید سردی تھی۔ آگ جلانے والی لکڑیاں تقریباً بجھ چکی تھیں اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھ کر لالٹین کی بتی اوپر کی اور دو چار لکڑیاں آتش دان میں ڈالیں۔ اتنے میں خان کمرے میں داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا ''فاروق بھائی نماز کا ارادہ ہے؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں

سبحان اللہ!'' اس نے میرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کو بھی پوچھ لیں۔

زاہد نے آواز لگائی کہ وہ جاگ رہا ہے۔ عمران بھی اٹھ گیا۔ البتہ انجم کو دو چار کک لگا کر جگایا گیا۔

ٹھنڈے اور برفیلے پانی سے وضو کرتے ہوئے انجم نے برا سا منہ بنا کر کہا کہ ہم الاسکا کے جنگلوں میں شکار کے لیے آئے ہیں یا برف میں نہانے کے لیے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو ہینک کی والدہ کیکی کے آٹے اور شہد کی چھوٹی چھوٹی روٹیاں اور سیاہ کافی لے آئی۔ سات بجے کے قریب ذرا اجالا ہوا تو ہم نے اپنے اپنے جوتوں کے تسمے کسے، رائفلیں اٹھائیں اور باہر کو چل دیئے۔ درجۂ حرارت 22 فارن ہائٹ تھا۔ ہر شے پر برف جمی ہوئی تھی۔ کیبن سے تھوڑی دور پہنچ کر خان نے دو سو گز دور ٹین کے ٹارگٹ کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ سب باری باری شروع ہو جائیں۔ میں نے پہلے اپنی 300WSM کی رائفل سے تین فائر کیے۔ تینوں گولیاں ڈیڑھ انچ کے گروپ میں لگیں۔ دوسری رائفل بھی بالکل زیرو تھی۔ عمران اور انجم کی رائفلیں بھی ٹھیک زیرو پر تھیں۔ صرف زاہد کی رائفل کا گروپ چار انچ میں لگ رہا تھا؟ میں نے زاہد کی رائفل لے کر اس کی اسکوپ کو چھیڑنا چاہا تو خان نے مجھے منع کر دیا۔ اس نے کہا کہ پہلے میں اس رائفل سے فائر کر کے دیکھ لوں۔

میں نے خان کی ہدایت پر ایک چٹان سے ٹیک لگا کر تین فائر کیے تو تینوں گولیاں دو انچ کے گروپ میں لگیں۔ اس کے بعد خان نے رائفل کی بیرل اچھی طرح صاف کر کے ایک فائر کیا اور زاہد سے کہا کہ اب وہ تین فائر کرے۔ زاہد نے فائر کیے تو گروپ 2 انچ کا بنا۔ خان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ درجۂ حرارت کم ہونے سے بھی گن کی کارکردگی پر فرق پڑ جاتا ہے۔ دوسرے زاہد کا قد 6 فٹ ہے اور یہ کھڑے ہو کر فائر کر رہا تھا۔ اس لیے بھی لانگ رینج میں گروپ ہی نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال 15 منٹ کے بعد خان نے زاہد کو تین اور فائر کرنے کا کہا اور اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد ہم واپس ہوئے تو دس بج رہے تھے۔

ہینک خچروں پر سامان لاد رہا تھا کہ اتنے میں ایک گھڑ سوار رینجر دور سے آتا دکھائی دیا۔ وہ الاسکا گیم فارسٹ کا آفیسر تھا۔ بہت معقولیت سے ملا اور ہمارے پرمٹ وغیرہ چیک کیے۔ رائفلیں بھی دیکھیں۔ میرے ہولسٹر میں لگے ہوئے ریوالور 44 میگنم کی طرف اشارہ کر کے بولا ''اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟'' میں نے اپنی جیکٹ سے اپنا فیڈرل ایجنٹ کا بیج نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''او..... تو تم فیڈرل آفیسر ہو!'' اس نے مسکرا کر کہا ''پھر بھی کیا تم مجھے اپنا شاندار ریوالور دکھانا پسند کرو گے؟''

''کیوں نہیں..... ضرور۔'' میں نے اپنا سرکاری ریوالور اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ گیم رینجر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور یوسف خان سے کچھ دیر اکیلے میں بات کرنے کے بعد چلا گیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر ہم قافلے کی صورت میں روانہ ہوئے۔ میں نے اور عمران نے تو باقاعدہ گھڑ سواری سیکھی تھی اس لیے ہم دونوں تو نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آرام سے خچروں پر براجمان تھے۔ انجم اور زاہد کا برا حال تھا۔ ایسے اکڑے بیٹھے تھے کہ جیسے ابھی گر جائیں گے۔ خان تو میرے برابر ہی تھا۔ ہینک سب سے پیچھے سامان کے ساتھ تھا۔

ہم اونچی نیچی گھاٹیوں میں سفر کرتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک میں نے اپنا خچر روک کر دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی۔ عمران نے جلدی سے سرگوشی کی سی آواز میں پوچھا ''کیا ہے؟'' میں نے شمال کی طرف اشارہ کیا۔ دور ایک مادہ گرزلی اپنے دو بچوں کے ساتھ کھڑی ہمارے قافلے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً 6 سات سو گز دور ہو گی۔ سب نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگائی پھر خان نے تھوڑی دیر بعد چلنے کے لیے اشارہ کیا اور قافلہ چل پڑا۔

انجم نے پوچھا ''میاں تم سب سے پہلے کیسے جانور دیکھ لیتے ہو؟'' یوسف خان ہنس پڑا اور بولا کہ یہ ایک خاص قسم کی حس ہوتی ہے۔ جو جنگل میں داخل ہوتے ہی شکاری میں جاگ اٹھتی ہے۔ یہ حس خاص کر نئے شکاریوں میں نہیں ہوتی۔ خان کی بات کافی حد تک درست تھی۔

ہم لوگ تقریباً تین گھنٹے کے سفر کے بعد ایک نالے کے قریب پہنچے تو خان نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خان اور ہینک نے خیمے لگا دیئے اور آگ جلانے کا انتظام بھی کر ڈالا۔ خان اور ہینک جس پھرتی سے سب کام کر رہے تھے۔ اس طرح صرف پروفیشنل لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ انہیں واقعی اس جنگل کی زندگی کا تجربہ تھا۔

خان نے شمال کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ان پہاڑیوں میں پہاڑی بکرے ملیں گے اور مشرق کی طرف ایک بہت بڑی جھیل ہے اس طرف ہمیں موز ملے گا۔

رات کو سونے سے پہلے سارے کھانے اچھی طرح بند کر کے رکھ دیئے گئے۔ خان نے بتایا تھا کہ ان کھانوں کی

خوشبو دور تک پھیلی ہے اور یہ علاقہ براؤن ریچھوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس لیے احتیاط بہت ضروری ہے۔ رات کو پروگرام بنا۔ صبح دو پارٹیاں بنیں گی ایک پارٹی پہاڑی بکرے کے لیے اور دوسری موز کے لیے روانہ ہوگی۔ فیصلہ ہم کو کرنا تھا کون کس طرف جائے گا۔

طے یہ پایا کہ صبح میں اور عمران یوسف خان کے ساتھ پہاڑی بکرے کے شکار کے لیے جائیں گے اور انجم اور زاہد ہینک کے ساتھ موز کے لیے جائیں گے۔ وہ ساری رات تقریباً تیاری میں ہی کٹی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ صبح ہم کسی بہت اہم مشن پر جانے والے ہیں۔ دس بجے کے قریب خان تو سو گیا لیکن ہمیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ ایک تو اندھیرا اتنا گہرا تھا دوسرے شدید سردی۔ درجۂ حرارت تقریباً زیرو ہو گیا تھا۔

دوسری صبح 5 بجے ہی خان نے سب کو جگا دیا۔ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد منہ اندھیرے ہی خان نے چلنے کا کہا۔ کمر پر بیک پیک' کندھے پر رائفل اور ایک ہاتھ میں ٹارچ۔ اندھیرا اور شدید سردی۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ خان نے کہا کہ ہم کوشش کریں کہ سنسناہٹ آواز اور خاموشی سے کیا جائے۔

خان جس پھرتی سے اونچی نیچی گھاٹیوں پر چل رہا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ یہ سب علاقہ اس کا دیکھا بھالا ہے پھر جب سفر چڑھائی کی طرف شروع ہوا تو میری اور عمران کی سانس تو کچھ دیر بعد ہی پھول گئی اور پسینے سے برا حال ہو گیا۔ ایک جگہ رک کر میں نے اور عمران نے اپنی جیکٹیں اتار کر کمر پر باندھ لیں۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد ہم ایک چٹان پر بیٹھے تو تھکن سے برا حال ہو چکا تھا۔

خان نے کہا کہ دس منٹ آرام کرنے کے بعد دوبارہ سفر شروع کریں گے۔ پانی کی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا تو سکون ملا۔ خان نے بیک پیک سے کافی کا تھرماس نکال کر کپ میں انڈیل کر ہمیں پیش کی۔ اس نے کہا کہ کچھ کھا بھی لو۔ چنانچہ کچھ بسکٹ وغیرہ کافی کے ساتھ کھا لیے۔

اب اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ آدھا گھنٹا مزید چڑھائی چڑھنے کے بعد ایک قدرے ہموار جگہ پر ہم لوگ بیٹھ گئے۔ خان نے کہا کہ اب ہم اپنی اپنی دوربین آنکھوں سے لگائیں اور سامنے والی پہاڑی اور ادھر کی گھاٹی کی طرف نظر دوڑائیں۔

خان نے اپنی واکی ٹاکی نکال کر ہینک سے بھی پوچھا کہ وہ لوگ بھی اپنی شکارگاہ پہنچے یا راستے ہی میں ہیں۔

دو گھنٹے بعد دوربین سے دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔

خان نے بتایا کہ جوں جوں دھوپ پھیلتی جاتی ہے بکرے بلندی کی طرف چڑھنے لگتے ہیں۔ ہم نے وہ جگہ چھوڑ دی اور مزید چڑھائی کی طرف چڑھنے لگے۔ پون گھنٹے بعد ٹانگوں نے جواب دے دیا تو پہاڑی کے اوپر ایک پلیٹ فارم نما جگہ پر پہنچ کر ابھی میں اور عمران اپنی ناہموار سانسیں درست کر رہے تھے کہ خان نے انگلی منہ پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے بھی اپنی دوربین سے اس طرف دیکھنا شروع کیا جس طرف خان دیکھ رہا تھا۔ بڑے غور سے دیکھا تو ایک بکرا ایک بڑی چٹان کی اوٹ میں چر رہا تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے صرف اس کا سر اور اگلی ٹانگیں نظر آ رہی تھیں۔ ہمارے دل تو اچھل کر حلق میں آ گئے۔ سانسیں پہلے ہی پھولی ہوئی تھیں۔ خان نے سرگوشی کی کہ چانس لینا ہے۔ وہ بکرا تقریباً ڈھائی سو گز دور تھا۔ عمران نے رائفل کندھے سے لگا کر تقریباً 20 سیکنڈ تک دیکھا اور رائفل ہٹالی۔ میرے کان دھماکے کے منتظر تھے اور آنکھیں دوربین میں سے بکرے پر مرکوز تھیں۔

عمران نے سرگوشی کی کہ ''فاروق شکار پوری کملی میرے نشانے پر نہیں آ رہا۔ تم ٹرائی کرو۔'' خان نے بڑے غصے سے ہماری طرف دیکھا کہ جلدی کرو۔ ورنہ یہ بدک گیا دوبارہ نظر نہیں آئے گا۔

میں نے ایک چٹان کا سہارا لے کر رائفل کی اسکوپ کے کراس کو بکرے پر زیرو کیا۔ شاٹ واقعی مشکل تھا۔ بکرے کا صرف سر گردن اور اگلی ٹانگیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ چند سیکنڈ تک میں اسکوپ میں بکرے کو دیکھتا رہا۔ خان نے سرگوشی کی کہ آواز میں کہا فاروق بھائی' اگر چھلانگ لگا کر کندھے پر شاٹ نہیں بن رہا تو گردن پر فائر کر دو — میں نے اپنی سانس روک کر دل میں تکبیر پڑھی اور گردن پر نشانہ باندھ کر رائفل کا گھوڑا دبا دیا۔ فائر کے ہوتے ہی بکرا اپنی اگلی ٹانگوں پر اچھلا اور چٹان کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ خان نے تو مجھے مبارک باد بھی دے ڈالی لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔

عمران بھی میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ہم لمبا چکر کاٹ کر اس جگہ پہنچے جہاں بکرا کھڑا تھا۔ چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا مگر بکرا وہاں نہیں تھا۔ خان اس بڑی چٹان پر چڑھ گیا۔ میں اور عمران اس چٹان کے اردگرد گھوم کر دیکھنے لگے۔ خان نے چٹان کے اوپر سے آواز لگائی ''یہ اس طرف پڑا ہے۔'' اور ہم سب کودتے پھاندتے اپنے شکار تک جا پہنچے اسے ذبح کیا۔ وہ بکرا ایک بڑی ٹرافی تھی۔ بکرے کا وزن اندازاً 160 پونڈ ہوگا۔ گولی بکرے کی گردن میں آر پار ہو گئی تھی۔ عمران نے تو مجھے گلے لگا کر مبارک باد دی اور بیک پیک سے کیمرا نکال کر تصویریں بنانے لگا۔

خان نے اپنا چاقو نکال کر بڑی مہارت سے بکرے کی کھال اتاری۔ بکرے کا سر' کھال اور گوشت سنبھالتے سنبھالتے ہمیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگا۔ خان نے بکرے کا گوشت وغیرہ اپنے بیک پیک میں اچھی طرح سے پیک کیا۔ کھال اس نے عمران کے حوالے کی اور سر میرے پیک میں رکھوایا۔

ہم واپس کیمپ پہنچے تو دوپہر ہو رہے تھے۔ تھکن اور بھوک سے برا حال تھا مگر انتہائی خوشی بھی تھی۔ خان تو لگتا تھا بالکل تر و تازہ ہی تھا۔ جلدی جلدی اس نے آگ جلا کر کھانا گرم کر ڈالا اور بکرے کے گوشت سے انصاف لینے لگا۔

اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر بعد دوسری پارٹی بھی آ گئی۔ زاہد اور انجم بے انتہا تھکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں لگا تھا۔ رات کو آگ کے اردگرد بیٹھ کر بکرے کے گوشت کے تکوے آگ پر بھون کر کھاتے ہوئے دوسری صبح کا پروگرام بنایا کہ میں اور انجم اور ہینک صبح موز کے لیے جائیں گے اور عمران اور زاہد یوسف خان کے ساتھ بکرے کے لیے۔

دوسری صبح میں نے اپنی دوسری رائفل اعشاریہ 300 ایچ اینڈ ایچ میگنم نکالی۔ گولیاں وغیرہ چیک کیں اور انجم اور ہینک کے ساتھ موز کے شکار کے لیے روانہ ہو گیا۔

ایک گھنٹے اندھیرے میں چلنے کے بعد ہم نے ایک جگہ رک کر کچھ دیر سانس لی۔ انجم نے بتایا کہ کل انہوں نے دو مادہ موز دیکھیں لیکن کوئی بیل موز ابھی تک نظر نہیں آیا تھا۔

اب سورج نکل آیا تھا اور صبح کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ ہم سیاہ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے موسم اور الاسکا کے جنگل کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اچانک وہ عظیم ایک بڑی سی جھاڑی کی اوٹ سے نکل کر ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ 14 فٹ اونچے اس دیوہیکل براؤن ریچھ کو اپنے سروں پر دیکھ کر میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سردی کی لہر سی دوڑ گئی اور میں بالکل ساکت ہو گیا۔

انجم بالکل اس کے قریب تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم کوئی حرکت کرتے اس ریچھ نے بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھ کر انجم کے شانے پر اپنا پنجہ مارا اور انجم اچھل کر تقریباً 6 فٹ دور جا گرا۔

ہینک ایک دم گلا پھاڑ کر عجیب سی آوازیں نکالنے لگا۔ اس کی رائفلیں اور بیک پیک ہم سے تھوڑی دور پڑے تھے۔ ریچھ کو اس قدر قریب دیکھ کر مجھے جو بھی آیتیں یاد تھیں میں ان منہ میں پڑھنے لگا۔ وہ بپھرا ہوا پاگل ریچھ ہینک کی طرف ایک ٹینک کی طرح بڑھا۔ دھان پان سا ہینک اس کے سامنے کسی بچے کی طرح لگ رہا تھا۔ پتا نہیں موت کا ڈر تھا یا خدا تعالیٰ کی طرف سے زندگی باقی تھی کہ میں نے رائفل کی طرف چھلانگ لگائی۔ میرے رائفل کو پکڑنے اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹانے تک اس ریچھ نے ہینک کے سر پر اس کے کان کے قریب اپنا ڈیڑھ فٹ کا پنجہ مارا۔ ہینک جس طرح الٹ کر گرا تھا اس سے تو مجھے لگا کہ وہ زندہ نہیں بچا ہوگا۔

میں نے رائفل کو کندھے سے لگائے بغیر ہی فائر کر دیا۔ پتا نہیں گولی کس طرف گئی۔ میرے دوبارہ رائفل کو لوڈ کرنے سے پہلے ہی وہ خوفناک دیو مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ کانپ گئے اور رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ پتا نہیں کس کی دعا تھی کہ مجھے ایک دم اپنے ہولسٹر میں لگے ریوالور کا خیال آیا۔ میں نے پھرتی سے ریوالور نکال کر اس پہاڑ جیسے پاگل ریچھ کے دل کا نشانہ لے کر ایک' دو' تین' چار فائر کر دیے۔ اعشاریہ 44 میگنم کی پاور فل گولیوں نے اپنا کام دکھایا۔ وہ دیوانہ ریچھ چنگھاڑتا ہوا کسی بڑے درخت کی طرح زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ میں نے اس کے سر کے قریب جا کر 44 بور کے ریوالور کی دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں اتار دیں۔ سر میں گولیاں لگتے ہی وہ ایک دم خاموش اور ساکت ہو گیا۔

میں دوڑ کر انجم کے پاس پہنچا۔ انجم کے شانے کی کھال ادھڑی ہوئی تھی اور خون ابل رہا تھا۔ ریچھ کے پنجے نے انجم کی جیکٹ اور نیچے کے کپڑے پھاڑ کر اس کے جسم کی کھال کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ میں نے انجم کو سہارا دے کر بٹھایا تو وہ درد سے کراہنے لگا۔ میں بھاگ کر ہینک کے قریب پہنچا۔ وہ بے ہوش پڑا تھا اور اس کا کان اور گال خون سے بھرے ہوئے تھے لیکن اس کی سانس چل رہی تھی۔ میرا اپنا سانس پھولا ہوا تھا۔ لگ رہا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں میں بالکل جان نہ ہو۔ انجم نے کراہتے ہوئے ہینک کا پوچھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور پانی کی بوتل انجم کے منہ سے لگا دی۔

انجم نے مجھے یاد دلایا کہ ہینک کے بیک پیک میں واکی ٹاکی ہے۔ میں نے پہلے اپنے پیک سے فرسٹ ایڈ کٹ نکال کر انجم کے شانے کا خون بند کیا۔ ہینک ابھی تک بے ہوش تھا۔

میں نے واکی ٹاکی سے یوسف خان سے رابطہ کیا۔ یوسف خان نے پوچھا کہ ''خیریت تو ہے ہم نے سات فائروں کی آواز سنی ہے۔'' میں نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے اسے بتایا کہ ہم پر ایک گرزلی نے اچانک حملہ کر دیا تھا۔

انجم شدید زخمی ہے اور ہینک بھی زخمی ہونے کے بعد بے ہوش پڑا ہے۔

خان نے ہماری لوکیشن پوچھی اور کہا کہ وہ جلدی پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ہینک کو ہوش میں لانے کے لیے کچھ ہدایات بھی دیں۔

میں نے ایک کپڑا پانی میں بھگو کر ہینک کے چہرے پر پھیرا تو وہ درد سے کراہنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس دوران انجم کافی حد تک سنبھل گیا تھا لیکن درد اور تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ اتار کر انجم کو اوڑھا دی۔

اور کافی کے فلاسک سے کافی انڈیل کر اس کو دی۔ ہینک بھی پوری طرح ہوش میں آ گیا تو میں نے اس کو بھی سہارا دے کر ایک چٹان کے ساتھ بٹھا دیا اور اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ اپنے پیک سے ایمرجنسی کمبل نکال کر ان دونوں کو اوڑھائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہینک کے حواس پوری طرح بحال ہو گئے تو اس نے بھی واکی ٹاکی سے یوسف خان سے رابطہ کر کے اپنی لوکیشن دوبارہ سمجھائی۔ اب سردی نے اپنا کام دکھانا شروع کیا تو انجم پر نیم بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ وہ دو گھنٹے کسی قیامت کی طرح گزرے۔

گو ہینک اب پورے ہوش و حواس میں تھا لیکن تکلیف اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

خدا خدا کر کے دو گھنٹے بعد یوسف خان، عمران اور زاہد خچروں پر سوار وہاں پہنچے۔ خان نے آتے ہی بڑی احتیاط سے انجم اور ہینک کی دوبارہ مرہم پٹی کی۔ عمران کو بھی تھوڑا بہت تجربہ تھا۔ وہ بھی خان کی پوری مدد کر رہا تھا لیکن انجم اور ہینک کو فوری طبی امداد اور سہارے کی ضرورت تھی۔ انجم کی کھال تو شانے سے لے کر کمر تک کٹی ہوئی تھی۔ ہینک کا کان اور رخسار کی جلد لٹک رہی تھی۔ زاہد نے مجھے تسلی دی کہ یوسف خان نے اپنے سیٹلائٹ فون سے قریب والی چیک پوسٹ پر اطلاع دے دی ہے اور جلد ہی مدد پہنچنے والی ہے۔

بڑی احتیاط کے ساتھ انجم اور ہینک کو خچروں پر سوار کروا کر ہم تیزی سے واپس کیمپ کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی ہم کیمپ سے تھوڑی دور ہی تھے کہ ایک ہیلی کاپٹر ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا اور ہمارے کیمپ تک پہنچنے تک ہیلی کاپٹر لینڈ کر چکا تھا۔

اس ہیلی کاپٹر میں دو رینجرز تھے۔ ایک تو ہمارے پاس ہی رک گیا۔ دوسرا پائلٹ کے ساتھ انجم اور ہینک کو لے کر چلا گیا۔

وہ رینجر خان کے ساتھ دوبارہ وہاں گیا جہاں حادثہ ہوا تھا۔ وہاں سے واپس آ کر اس نے مجھ سے ساری تفصیلات بار بار پوچھیں۔ میرے سارے کاغذات چیک کیے۔ میرا ریوالور لے کر چیک کیا ایسی پوچھ تاچھ کی اس نے کہ اللہ کی پناہ۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں نے کسی انسان کو قتل کر دیا ہو۔

تفتیش سے فارغ ہو کر ہم سب دوبارہ وہاں آئے وہ دیو ہیکل ریچھ مردہ پڑا تھا۔ اس رینجر نے کچھ تصویریں اتاریں اور مجھے اس ریچھ کا پرمٹ دے دیا۔ اس نے کہا کہ افسوس... اگر میں اس کی کھوپڑی پر فائر نہ کرتا تو اس کا ہیڈ میرے گھر میں ایک ٹرافی کی صورت میں ہمیشہ لگا رہتا۔ 44 بور کی گولیوں نے ریچھ کی کھوپڑی اڑا کر رکھ دی تھی۔

یوسف خان اور ہم نے مل کر اس کی کھال اتاری۔ اس مردہ ریچھ کی لاش کو ہلانا بہت مشکل تھا۔ ایک دو آدمی تو یہ کام ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ بقول اس رینجر کے وہ ریچھ تقریباً 12 سو پونڈ وزنی تھا۔ اس کی لمبائی 14 فٹ اور اس کی عمر کا اندازہ 15 سال لگایا گیا۔ اس کا پنجہ 14 انچ کا تھا جو اس نے انجم اور ہینک کو مارا تھا۔ اس کی کھال آج بھی عمران کے گھر ایک پوسٹر کی دیوار پر پھیلی ہوئی ہے۔

شام کو ہم واپس کیمپ پہنچے۔ دوسری صبح واپس خان کے کیمپ پر پہنچ کر واپسی کا پروگرام بنا لیا۔

انجم اور ہینک ANCHOR کے اسپتال میں تھے۔

اسی روز خان نے اپنے سیٹلائٹ فون سے رابطہ کر کے پائلٹ کو کہا کہ اگلے دن آ کر وہ ہمیں بھی لے جائے۔

اگلے دن صبح ہی صبح جہاز آ کر کیمپ میں لینڈ کر گیا۔ سارا سامان وغیرہ لاد کر خان سے بہت سارے وعدے کر کے میں عمران اور زاہد جہاز میں سوار ہو گئے۔

ہمارا سارا پروگرام غارت ہو گیا تھا۔ کیا سوچ کر آئے تھے اور کیا کر کے واپس جا رہے تھے۔

اپنے ساتھی کے زخمی ہو جانے کی وجہ سے سارا مزہ کرکرا ہو گیا تھا۔

خان بھی کافی اداس اور کچھ پریشان سا تھا لیکن ہم نے وعدہ کیا کہ ہم اگلے سال پھر آئیں گے۔ ANCHOR پہنچ کر ہم نے سب سے پہلے تو انجم کی خبر گیری کی۔ خدا کا شکر کہ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ بس 32 ٹانکے ایک زخم پر اور 24 ٹانکے دوسرے زخم پر لگے تھے۔ اگلے دن ہم نے واپس نیویارک کا رخ کیا۔

ٹو ڈبلیوز

ایم شاھد علی (باجوڑ)

پاکستان کے کئی کھلاڑیوں نے اپنے اپنے شعبے میں ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ وہ خود ایک یادگار (لیجنڈ) کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ان میں اسکواش کے جہانگیر اور جان شیر ھوں یا ھاکی کے شھباز (دونوں) سمیع اللہ، کلیم اللہ، اصلاح الدین، قاسم ضیا اور شاھد یا پھر میدان کرکٹ کے فضل، نذر، امتیاز، ماجد، آصف اقبال، جاوید میاں داد، سرفراز نواز، مدثر نذر، عمران خان، سعید انور اور مشتاق (دونوں)۔ مگر وقار اور وسیم کی جوڑی نے "ٹو ڈبلیوز" کے طور پر جو شھرت پائی اس کا اپنا مقام ھے۔

ان دونوں کی موجودگی بڑے بڑے بلے بازوں کے پیر لڑکھڑا دیتی تھی

کرکٹ دنیا کے مقبول ترین کھیلوں میں سے ایک ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ کھیل مشہور ہو تو اس کے کھلاڑی بھی مشہور ہوں گے۔ اس کھیل میں کئی نام ایسے ہیں جنہوں نے آسمان جیسی بلندی حاصل کی اور ان کے نام رہتی دنیا تک کرکٹ کی تاریخ میں چمکتے رہیں گے۔ بالنگ اور بیٹنگ میں کئی ایک جوڑیاں بھی آئیں اور کرکٹ کے افق پر چھا گئیں۔ لیکن ٹو ڈبلیوز نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آئی اور نہ آنے کی امید ہے۔

کسی زمانے میں ویسٹ انڈیز کے تین بیٹسمینوں نے "تھری ڈبلیوز" کی نام سے دنیا بھر میں شہرت حاصل کی تھی۔

موجودہ دور میں برسوں تک کرکٹ میں بالنگ کے شعبے میں راج کرنے والے ''ٹو ڈبلیوز'' یعنی فاسٹ بالرز وسیم اور وقار کا تعلق پاکستان سے ہے۔ یہ دونوں بالرز پاکستان کرکٹ کے اہم ستون تھے۔ وقار نے بہترین اوسط سے بالنگ کی جبکہ وسیم میڈیم فاسٹ بالر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمدہ آل راؤنڈر بھی تھے۔ یہ دونوں اٹیکنگ بالرز تھے اور ان دونوں نے کئی فتوحات پاکستان کی جھولی میں ڈالیں۔ ان دونوں کی ٹیم میں موجودگی مخالف ٹیم کے لیے آزمائشوں کا پیغام ہوتی تھی۔ ان کا بالنگ اٹیک خطرے کی علامت سمجھا جاتا تھا اور اس بالنگ سائڈ کا سامنا کرنا مخالف بلے بازوں کے لیے بہت بڑا چیلنج ہوتا تھا۔ دنیائے کرکٹ کا کوئی بیٹسمین ایسا نہیں تھا جو ان دونوں کا سامنا کرنے سے گھبراتا نہ ہو۔ ان دونوں نے ہمیشہ مخالف بلے بازوں کو اپنے دباؤ میں رکھا اور کسی بھی بلے باز کو کھل کر کھیلنے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیائے کرکٹ کے عظیم اور عالمی ریکارڈ یافتہ بیٹسمین اور بالرز ان دونوں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان دونوں کے درمیان کبھی کبھی اختلافات بھی پیدا ہوئے لیکن یہ تو ایک وقتی صورت حال ہوتی ہے۔

''ٹو ڈبلیوز'' کی مشترکہ کارکردگی

ایک روزہ میچز

بمقابلہ	وسیم میچز	وکٹیں	وقار میچز	وکٹیں	وسیم رنز	وقار رنز	کل میچز	کل وکٹیں	اوسط رنز
آسٹریلیا	49	67	30	29	806	202	79	96	1008
بنگلہ دیش	6	9	4	3	59	12	10	12	71
انگلینڈ	32	32	14	30	222	26	46	62	248
بھارت	48	60	26	37	425	67	74	97	492
کینیا	2	5	3	5	0	0	5	10	0
نمیبیا	1	5	1	0	20	8	2	5	28
ہالینڈ	2	3	3	7	1	1	5	10	2
نیوزی لینڈ	38	64	37	79	459	52	75	143	511
جنوبی افریقہ	24	35	32	58	345	204	56	93	549
سری لنکا	59	92	51	84	674	174	110	176	848
یو اے ای	2	5	1	1	0	0	3	6	0
ویسٹ انڈیز	64	89	43	60	498	171	107	149	669
زمبابوے	28	33	17	23	171	52	45	56	223
اسکاٹ لینڈ	1	03	0	0	37	0	1	3	37
مجموعی	356	502	262	416	3717	969	618	918	4686

ان دونوں ہی بالرز نے کپتانی جیسا مشکل کام بھی بڑی عمدگی سے انجام دیا۔ ان دونوں کے اپنے اپنے کپتانی کے ادوار میں پاکستانی ٹیم کئی اہم میچز اور ٹورنامنٹس میں سرخرو ہوئی۔ بطور کپتان وسیم اکرم نسبتاً زیادہ کامیاب تصور کیے جاتے تھے۔

ٹو ڈبلیوز عظیم کرکٹرز تھے اور ان دونوں نے کرکٹ میں ہر چیلنج کو قبول کیا اور ہر طوفان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اپنے ہر مخالف کو کبھی بھی اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ان دونوں کی موجودگی پاکستانی ٹیم میں ریڑھ کی ہڈی کی سی تھی اور انہوں نے اپنی قومی ٹیم کو کئی فاتح بنا دیا تھا۔

جہاں کسی کو بہت شہرت ملتی ہے، وہاں مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وسیم اور وقار کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کچھ سابق کھلاڑیوں اور الزامات نے ان دونوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ کیریئر کے دوران میں ان دونوں پر طرح طرح کے الزامات لگے۔ خاص کر وسیم اکرم کو 99ء ورلڈ کپ کے بعد بہت تنقید کا نشانہ بنایا گیا مگر ان الزامات کی حقیقت سے عام لوگ اب بھی واقف ہیں۔ اپنے اپنے کیریئر کے آخری ادوار میں ان دونوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ ایسا سلوک تو وہاں اور بہت سے نمایاں کھلاڑیوں کے ساتھ بھی ہوا اس میں حالیہ برسوں میں ہم مشتاق احمد، ثقلین مشتاق اور سعید انور کا بھی نام لے سکتے ہیں۔ ہمارے ان کرکٹ ہیروز کی کھیل کے میدان سے رخصتی کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوئی۔

ٹو ڈبلیوز میں سے ایک وسیم اکرم 3 جون 1966ء کو لاہور میں چوہدری محمد اکرم کے گھر پیدا ہوئے۔ 1984ء میں اپنے کرکٹ کیریئر کا آغاز نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے کیا اور ان کے کیریئر کا اختتام 3 مارچ 2003ء کو زمبابوے کے خلاف کھیل پر ہوا۔ وسیم اکرم نے سب سے زیادہ ون ڈے میچز (64) ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلے۔ ان 64 میچوں میں وسیم نے 89 ویسٹ انڈین بلے بازوں کو آؤٹ کیا۔ یہ وسیم اکرم کا کسی ایک ملک کے خلاف زیادہ سے زیادہ کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے کا ریکارڈ ہے۔

وسیم اکرم کا کسی ایک ملک کے خلاف کھیلے گئے میچوں میں زیادہ سے زیادہ اسکور 806 ہے، جو اس نے آسٹریلیا کے خلاف 49 میچز میں اسکور کیا۔ ون ڈے کرکٹ میں وسیم اکرم نے زیادہ سے زیادہ انفرادی اسکور آسٹریلیا کے خلاف 86 رنز کسی میچ میں بہترین بالنگ 15 رنز کے عوض 5 وکٹیں، زمبابوے کے خلاف ہے۔ کسی ایک میچ میں 5 یا زائد کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے کا کارنامہ وسیم اکرم نے 6 بار انجام دیا۔ وسیم اکرم نے ون ڈے کرکٹ میں ہیٹ ٹرک کرنے کا کارنامہ دوبار انجام دیا۔ پہلی بار ویسٹ انڈیز کے خلاف 1989ء میں اور دوسری بار آسٹریلیا کے خلاف 1990 میں۔ 14 اکتوبر 1989ء کو شارجہ میں ہونے والے ایک میچ میں اکرم نے 4 ویسٹ انڈین بلے بازوں کو کلین بولڈ کیا تھا۔

وسیم اکرم نے سب سے زیادہ ٹیسٹ میچز (19) سری لنکا کے خلاف کھیلے۔ ان میچوں میں انہوں نے مجموعی طور پر 545 رنز بنائے۔ سری لنکا کے خلاف ان کا بہترین اسکور 100 رنز تھا۔ بالنگ میں ایک میچ میں 43 رنز دے کر پانچ وکٹیں لینے کا اعزاز حاصل کیا اور کل 63 وکٹیں حاصل کیں۔ ٹیسٹ میں کسی ایک میچ کی ایک اننگ میں پانچ یا اس سے زیادہ کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے کا کارنامہ 25 مرتبہ انجام دیا۔ 10 یا زائد کھلاڑیوں کو آؤٹ کرنے کا کارنامہ 5 مرتبہ انجام دیا۔ وسیم اکرم کا بہترین ٹیسٹ اسکور 257 رنز زمبابوے کے خلاف ہے۔ اس اننگ میں وسیم اکرم نے 12 چھکے لگائے۔ بالنگ میں بہترین کارکردگی 119 رنز کے عوض 7 وکٹ نیوزی لینڈ کے خلاف ہے۔ انہوں نے ٹیسٹ میچوں میں دو بار ہیٹ ٹرک کی۔ انہوں نے یہ کارنامہ سری لنکا کے خلاف دو مسلسل ٹیسٹ میچوں میں انجام دیا تھا۔ اس طرح وسیم اکرم وہ واحد بالر ہے جس نے ٹیسٹ اور ون ڈے دونوں میں ہیٹ ٹرک کا کارنامہ دو دو مرتبہ انجام دیا ہے۔ وسیم اکرم کا یہ بھی ریکارڈ ہے کہ انہوں نے دونوں طرز کی کرکٹ میں 400 سے زائد وکٹیں حاصل کی ہیں۔ انہوں نے ٹیسٹ میچوں میں 414 اور ون ڈے کرکٹ میں 502 وکٹیں حاصل کیں۔ ان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انہوں نے پانچ ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنامنٹس میں حصہ لیا۔ ورلڈ کپ مقابلوں میں وسیم اکرم نے 52 وکٹیں حاصل کیں۔ اس سے پہلے جاوید میانداد نے چار مرتبہ ورلڈ کپ مقابلوں میں شرکت کی تھی۔

ٹو ڈبلیوز میں دوسرے یعنی وقار یونس 16 نومبر 1971ء کو وہاڑی (بورے والہ) میں یونس خان کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلا ون ڈے انٹرنیشنل میچ ویسٹ انڈیز کے خلاف 1989ء میں شارجہ میں کھیلا۔ جبکہ 3 مارچ 2003ء کو بلاوایو میں زمبابوے کے خلاف کھیلا گیا میچ وقار کے کیریئر کا آخری میچ ثابت ہوا۔ وقار یونس نے سب سے زیادہ ون ڈے میچ (51) سری لنکا کے خلاف کھیلے۔ ان 51 میچوں میں وقار نے 84 وکٹیں حاصل کیں۔ ان کی بہترین بالنگ اوسط 26 رنز کے عوض 6 وکٹیں لی تھیں۔ 5 یا

اس سے زائد وکٹیں انہوں نے دو مرتبہ حاصل کیں۔ وقار نے سب سے زیادہ چوراسی وکٹیں سری لنکا کے خلاف حاصل کیں۔ ون ڈے میچوں میں وقار یونس کی عمدہ کارکردگی 36 رنز کے عوض 7 وکٹیں انگلینڈ کے خلاف ہے۔ وقار نے 1994ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف ہیٹ ٹرک کا کارنامہ بھی انجام دیا۔ وقار نے نیوزی لینڈ، سری لنکا اور ویسٹ انڈیز کے خلاف 13،13 میچز کھیلے۔ ان ممالک کے خلاف بالترتیب 70`56 اور 55 وکٹیں حاصل کیں۔ وقار نے ایک اننگ میں پانچ یا زائد کھلاڑیوں کو بائیس مرتبہ آؤٹ کیا۔ وقار نے جب 1993ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف شارجہ میں بحیثیت کپتان ون ڈے میچ کھیلا تو اس وقت ان کی عمر 21 سال 354 دن تھی۔ اس طرح اُس وقت وہ ون ڈے کے کم عمر ترین کپتان تھے۔

ٹیسٹ کے کم عمر کپتان کا اعزاز وقار نے اس وقت حاصل کیا جب کراچی میں 1994ء میں وہ زمبابوے کے خلاف کھیلے۔ ون ڈے کرکٹ میں سب سے زیادہ بولڈ ی میچ ریکارڈ بھی وقار کے پاس ہے۔ جب 9 فروری 1993ء کو وقار نے 5 جنوبی افریقن بلے بازوں کو کلین بولڈ کیا تو یہ ریکارڈ بنایا۔ اس کے علاوہ وقار نے 2 مختلف میچوں میں چار چار کھلاڑی بولڈ کیے۔ یہ اعزاز انہوں نے پہلی بار 1990ء میں سری لنکا کے خلاف اور دوسری بار 1994ء میں نیوزی لینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے حاصل کیا تھا۔ 36 رنز کے عوض سات کھلاڑی آؤٹ کرنے کا کارنامہ وقار نے انگلینڈ کے خلاف انجام دیا۔ یہ پاکستان کی کسی بھی بالر کی سب سے عمدہ کارکردگی ہے۔ 1990ء میں (جو وقار کے کیریئر کا دوسرا سال تھا) وہ دنیا کا تیز ترین بالر تھا۔ اب یہ اعزاز پاکستان ہی کے شعیب اختر کے پاس ہے جس نے انگلینڈ کے خلاف 161 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گیند پھینکی تھی۔ یہ 2003ء ورلڈ کپ کا میچ تھا۔

بالنگ کے میدان میں یہ "ڈبلیوز" کی مشترکہ کارکردگی تھی۔ بیٹنگ کے شعبے میں ون ڈے کرکٹ میں وسیم اکرم نے 6 نصف سنچریاں بنائیں۔ ٹیسٹ میچز میں وسیم نے سات نصف سنچریوں کے ساتھ دو سنچریاں اور ایک ڈبل سنچری بھی بنائی۔ وسیم کا ساتھی وقار بیٹنگ میں یہ صلاحیت کارکردگی نہ دکھا سکا۔

ٹیسٹ میچوں میں مشترکہ کارکردگی

بمقابلہ	وسیم میچز	وکٹیں	وسیم رنز	وکٹیں	وقار میچز	وقار رنز	کل وکٹیں	کل رنز
آسٹریلیا	13	50	562	30	12	166	80	728
انڈیا	12	45	277	8	4	16	53	293
سری لنکا	19	63	545	56	13	143	119	688
بنگلہ دیش	2	0	0	18	3	10	18	10
نیوزی لینڈ	9	60	158	70	13	135	130	293
انگلینڈ	18	57	462	50	11	119	107	581
ویسٹ انڈیز	17	79	356	55	13	148	134	504
زمبابوے	10	47	440	62	11	107	109	547
جنوبی افریقہ	4	13	98	24	7	157	37	255
مجموعی	104	414	2898	373	87	1001	787	3899

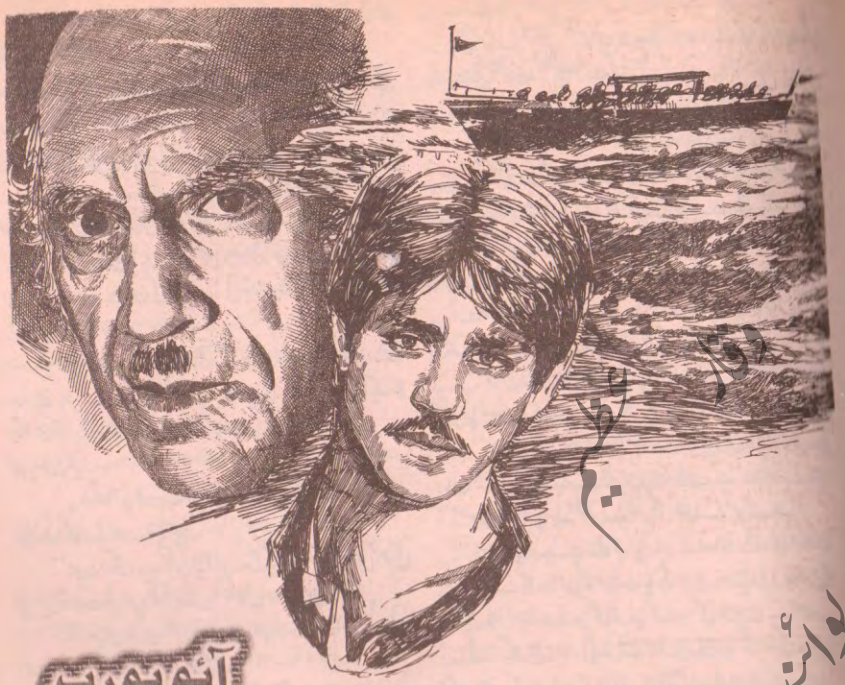

آئو یورپ چلیں

منظر امام

یوں تو استاد آسانی سے کسی کے جھانسے میں آنے والے نہیں تھے، مگر شاید ملک سے نکلنے اور یورپ دیکھنے کے شوق نے انہیں اس مشکل میں پھنسا دیا تھا، وہ تو خیر ہوئی ورنہ نہ آج ہم ہوتے نہ استاد کی کہانیاں۔ مگر افسوس ہوتا ہے ایسے لوگوں پر جو چند ٹکوں کی خاطر انسانی جانوں کی بھی پروا نہیں کرتے۔ کبھی کبھی جعلی پیروں کے کردار کیا کیا کرشمہ سازیاں دکھا جاتے ہیں۔

دعا کی قبولیت کے لئے نہ جگہ کی قید ہے، نہ وقت کی

''ابے نامعقول، ناہنجار، طفلِ مکتب، انا بحر او قیانوس۔ چشمک خوردو کلاں۔ بہ ہوش و گوش۔ یہ بحرِ مردار ید میں کس قماش کا انبائے افشار کر رہا ہے۔''

یہ آواز استاد کی تھی اور وہ اپنی پوری شان اور تمکنت کے ساتھ گرجے جا رہے تھے۔ جبکہ آس پاس کے لوگوں نے شاید اپنے سر پیٹنے شروع کر دیے ہوں گے۔

''اوئے اس کی زبان بند کراؤ نی'' ایک شخص نے مجھے جھنجوڑتے ہوئے کہا ''اگر یہ چپ نہیں ہوا تو ہم اس کو پانی میں دھکا دے دے گا نی؟''

میں نے استاد کے آگے ہاتھ جوڑ لیے ''خدا کے لیے استاذ! اس وقت چپ ہو جاؤ'' میں نے کہا ''یہ بہت نازک موقع ہے۔''

''یہ موقع نہیں اطریفل بے گمانی ہے'' استاد غصے سے بولے۔ ''میں ان نابغوں کو استوار بے جا کر دوں گا۔''

''بس استاد خاموش ہوجاؤ'' مجھے بھی غصہ آنے لگا تھا ''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

استاد شاید میری ناراضگی محسوس کرکے خاموش ہوگئے تھے۔

اس کہانی کی ابتدا ایک مہینہ پہلے سے ہوئی تھی۔ استاد سے بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ ورنہ عام طور پر وہ ہر دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آجاتے تھے اور اگر خود نہیں آپاتے تو کسی کو ضرور بھیج دیتے۔ بہرحال جب کئی دنوں سے ان کی خبر نہیں آئی تو میں خود استاد کے پاس پہنچ گیا۔

استاد اس وقت ایک عجیب عالم میں تھے۔ ان کے سامنے چمڑے کے کئی جیکٹس پڑے ہوئے تھے اور وہ ہر ایک کا معائنہ کرتے جارہے تھے۔ ''کیا ہورہا ہے استاد؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہ دیکھو یہ جریب زیتون کیسی ہے؟'' استاد نے ایک جیکٹ دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''بہت اچھی ہے لیکن یہ آپ کے کس کام کی۔ اس قسم کی چیزیں تو بہت ہی سرد ملکوں میں استعمال ہوتی ہیں۔''

''تو میاں برلن بھی تو برج النہار کے معالجے برف زارئی افشاں ہے'' استاد نے کہا۔

ان کے اس جملے میں صرف برلن سمجھ میں آیا تھا۔ اس لیے میں نے دریافت کیا ''استاد! یہ برلن سے آپ کا کیا تعلق۔ وہ تو جرمنی کا شہر ہے۔ (برلن اس زمانے میں مشرقی جرمنی کا شہر تھا اور کیمونسٹ بلاک کے تحت آتا تھا)

''استاد ہالخوف ہوگیا ہے مجھے'' استاد نے بتایا ''میں سفر ترک ارض وسما کررہا ہوں۔ جس کے لیے بندوبستِ دیوار چین ہوگیا ہے۔ دجال بے ہنراں نے وعدہ فردا فرمادیا ہے کہ ماحضر قبول لیا جائے تو شرف بالذات دبے کیش ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ سکہ رائج الوقت پیش افتادہ کردیا جائے۔''

استاد نے میرے سوال کے جواب میں ایک عدد تقریر فرمادی تھی جس کا مطلب خود وہی سمجھ سکے ہوں گے۔ میرے تو سر سے گزر گئی تھی۔

''خدا کے لیے' استاد ذرا آسان کرکے فرمائیں کہ اب آپ کو کون سا جنون ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔

استاد نے پھر ایک تقریر کی اور یہ سمجھ میں آگیا کہ وہ برلن جانا چاہتے ہیں اور کوئی ایجنٹ مل گیا ہے جو انہیں برلن پہنچانے کو تیار ہے اور اس کے عوض اس نے استاد سے پانچ ہزار روپے طلب کیے ہیں۔ (اس زمانے میں پانچ ہزار بھی بہت ہوتے تھے)

''میاں' تم بھی بقلم خود ہوجاؤ'' استاد نے کہا ''تمہاری وجہ سے وارفتگی اور خجستگی رہے گی۔''

''نہیں استاد! میرا جانا ذرا مشکل ہے۔''

''مشکل بعذر آفند'' استاد نے پتا نہیں فارسی میں کیا کہنے کی کوشش کی تھی ''جہاں تک اخراجات تائید اور عائد کا بحران ہے' میں شاہان بے زمان ہوں تمہارے لیے۔''

یعنی جہاں تک پیسوں کا تعلق ہے۔ میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔

وہ بے فکری کا زمانہ تھا۔ یعنی اتنی گھریلو پریشانیاں نہیں تھیں۔ اس لیے میں نے بھی تفریح کی خاطر ہاں کردی۔

''بہتر ہے استاد! میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں لیکن پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ کا کیا ہوگا۔''

''جہاں تک پروانہ پاسپورٹ کا سوال اندمال ہے' وہاں تک وہ ایجنٹ ذمے داران بلاکستان ہے'' استاد نے بتایا ''حصول ویزا وسیلۂ ظفر بے ظفر بھی اسی کے سپرد ہے۔''

استاد یہ کہہ رہے تھے کہ یہ سارے معاملات وہی ایجنٹ حل کردے گا۔ اس کو صرف پانچ ہزار روپے دے دیے جائیں پھر استاد نے یہ بھی فرمایا کہ وہ ابھی پیسوں کے حصول میں لگ گئے ہیں اور ایک ہفتے بعد ہماری روانگی ہوگی۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں سارے مراحل طے ہوجائیں گے۔

میں بھی اس سفر کے خیال سے پرجوش ہوتا جارہا تھا۔ پھر ایک بات ذہن میں آئی تو میں نے استاد سے پھر پوچھا۔ ''استاد۔ آخر یہ برلن جانے کی کیا سوجھی تمہیں' ہم کہیں اور بھی تو جاسکتے ہیں؟''

''معاملاتِ درون وجہ سلاسل ہیں'' استاد نے کہا ''اس ایجنٹ کا خالہ زاد یا چچازاد مقیم فردوشان برلن ہے۔''

آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے یعنی استاد یہ بتارہے تھے کہ اس ایجنٹ کا کوئی رشتے دار برلن میں ہے اسی لیے ہمیں بھی برلن جانا ہوگا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی بتادیا تھا کہ میں استاد کے ساتھ برلن جارہا ہوں۔

سب لوگوں نے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں کس کے ساتھ باہر جانے کا پروگرام بنارہا ہوں۔ وہ اول جلول سا آدمی مجھے کسی مصیبت میں پھنسادے گا۔ لیکن مجھے تو استاد پر پورا بھروسا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چاہے کچھ ہو' استاد اپنی جان پر کھیل جائیں گے لیکن مجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ پھر یہ کہ میں اکیلا استاد کو کس طرح جانے دیتا۔ ان سے تعلق ہی ایسا تھا۔

ایک ہفتے کے دوران میں استاد اپنی جغرافیائی معلومات کے دریا بہاتے رہے تھے۔ برلن کیسا ہے؟ کیا ہے' جرمنی کیسا ملک ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کی زیادہ تر معلومات ناقص تھیں' اس حد تک کہ وہ ایفل ٹاور کو برلن میں بتاتے رہے تھے اور میں نے جب صحیح بتانا چاہا تو مجھ سے ناراض ہوگئے۔

ایک ہفتے کے بعد انہوں نے مجھے بلا بھیجا کہ ایجنٹ آنے والا ہے۔ میں ان کے محل آکر اس سے ملاقات کرلوں۔ (استاد اپنی جھونپڑی کو محل کہا کرتے تھے)

بہرحال میں مقررہ وقت پر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ایجنٹ ایک موٹا تازہ انسان تھا' جس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی۔ نہ جانے استاد نے ایسے آدمی پر کیوں بھروسا کرلیا تھا۔ اس ایجنٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ کے پیسے تو استاد نے دے دیے ہیں۔ اب جانے پاسپورٹ کے لیے آپ کی تصویریں چاہئیں اور شناختی کارڈ کی کاپی۔''

''ٹھیک ہے' یہ دونوں چیزیں کل مل جائیں گی۔''

گھر والوں نے پھر سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نے تو استاد کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لیے کسی کی بات نہیں مانی اور اپنی تصویریں اور کارڈ کی کاپی ایجنٹ کے حوالے کردیں۔ اس موقع پر ایجنٹ نے مجھ سے کہا ''بھائی' یہ آپ کے استاد کیا چیز ہیں؟ ان کی کوئی بات سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ یہ کون سی زبان بولتے ہیں؟''

''بولتے تو اردو ہی ہیں'' میں نے بتایا ''لیکن ان کی اردو ذرا دوسری قسم کی ہے۔ بہرحال میں ان کے ساتھ ہوں اس لیے پریشانی کی بات نہیں ہے۔ میں ان کی باتوں کا ترجمہ کرتا رہا ہوں۔'' ایجنٹ مطمئن ہوکر چلا گیا۔

دو دن بعد ہی میرا پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ صرف پاسپورٹ ہی نہیں بلکہ اس پر ایسٹ جرمنی کا ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ ایجنٹ نے بتایا کہ ہمارے ساتھ دس اور بھی جارہے ہیں اور سب کو سولہ تاریخ رات دس بجے استاد کے گھر پر جمع ہونا ہے کیونکہ وہیں سے قافلہ روانہ ہوگا۔ میری خوشی اور جوش کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

بہرحال سولہ تاریخ کی شب میں اپنا ایک سوٹ کیس لے کر پہنچ گیا۔ جہاں دس آدمی پہلے سے جمع تھے۔ استاد نے اس رات بڑی کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار' قمیص اور شیروانی زیب تن کررکھی تھی۔ ان کی شان دیکھنے کے قابل تھی۔

استاد نے اپنی طرف سے سبھوں کے لیے چائے کا بندوبست کررکھا تھا۔ میرے پہنچنے کے بعد استاد نے مجھ سے کہا ''میاں' ابھی ان دور فتادہ لوگوں کے سامنے مجھے عرضِ حال بے عارض شمال کرنی ہے۔ تم بس فروخ آسمان اردو ہوجاؤ۔''

میں سمجھ گیا کہ استاد ان لوگوں کے سامنے تقریر فرمانے کے موڈ میں ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ میں تقریر کو آسان کرکے لوگوں کو بتاتا رہوں۔ یہ بہت بڑی ذمے داری انہوں نے میرے سپرد کردی تھی۔ بہرحال میں نے ہامی بھرلی بس پھر کیا تھا' استاد شروع ہوگئے تھے۔

''اے خانہ خرابو! دور چشمو! ارزلو۔ تم آج سفیر بگوش حلقۂ برلن سے سونف اور زعفران ہونے جارہے ہو۔ یہ مقام قہقہہ بردوش وجد آفرین ہے۔''

میں نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا میرے عزیز بھائیو! یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آج تم سب برلن کے سفر پر جارہے ہو۔''

استاد نے پھر کہا ''میں یعنی من آنم کہ من دانم گوشۂ فراق سے رہبر بے اول..... و بے بود ہوں۔ تم سب کے سب بجا آوریٔ احکاماتِ مثل اعظم اورانار کلی کرتے رہو گے۔''

یعنی اس سفر میں تمہارا لیڈر میں ہوں۔ اس لیے تم لوگوں کو میرے احکامات کی تعمیل کرنی ہوگی۔

استاد نے اس کے بعد بھی اپنی تقریر جاری رکھی اور وہی باتیں تھیں جو ان کی شان کے عین مطابق تھیں یعنی جن کا کوئی مطلب نہیں نکلتا تھا۔ ہمارے ساتھ سفر پر جانے والے استاد کی قابلیت سے اتنے مرعوب ہوچکے تھے کہ کسی میں بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ استاد نے سب کو یہ بھی بتادیا تھا کہ برلن پہنچتے ہی سب کو ایفل ٹاور پر حاضری دینی ہے۔

اس سفر پر جانے والے چونکہ سب کی معلومات استاد ہی جیسی تھیں' اس لیے کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔

رات گیارہ بجے وہ ایجنٹ ایک پرانی وین لے کر آگیا۔ ''چلو'' اس نے وین کی طرف اشارہ کیا ''جلدی جلدی اس میں بیٹھ جاؤ۔''

ہم سب جلدی جلدی اس وین میں بیٹھ گئے تھے۔ یعنی اب ہمارا اصل سفر شروع ہونے جارہا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین روانہ ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ ہم ائرپورٹ کی طرف جارہے تھے لیکن جب بجائے ائرپورٹ کے ہم ساحل کی طرف جانے لگے تو میں نے استاد سے سرگوشی کی۔ ''استاد! یہ ہمیں کہاں لے جارہا ہے۔ ائرپورٹ تو دوسری طرف ہے۔''

''عازم برلن والا باد پیما کہیں اور برا جانِ اقدس ہوتا ہے'' استاد نے بڑے وثوق سے فرمایا تھا۔ یعنی برلن جانے والا طیارہ کہیں اور کھڑا ہوا کرتا ہے۔

بہرحال میں بھی خاموش رہا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد

ہمیں اتار دیا گیا۔ یہ ساحل ہی تھا۔ اس زمانے میں ساحل اتنا بارونق نہیں تھا۔ جتنا آج ہے۔ سامنے حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر جو اندھیرے کی وجہ سے بہت بھیانک دکھائی دے رہا تھا ''یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو؟'' میں نے اسی ایجنٹ سے پوچھا۔

''ساحل پر'' اس نے اطمینان سے بتایا پھر اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کیا ''وہ دیکھو ادھر کشتی کھڑی ہے۔ تم لوگوں کو اسی میں جانا ہوگا۔''

اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ برلن یورپ میں ہے اور صرف کشتی کے ذریعے وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا اس لیے میں نے کہا ''کیا تم پاگل ہوگئے ہو۔ کیا ہم اسی کشتی کے ذریعے یورپ جائیں گے؟''

''ڈائریکٹ یورپ نہیں جانا ہے'' ایجنٹ نے کہا ''پہلے تم لوگ شارجہ جاؤ گے' وہاں سے تم کو لے جایا جائے گا۔''

پتا نہیں یہ کیسا سفر تھا لیکن اب تو آ کر پھنس چکے تھے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ استاد کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ حالانکہ اصولاً ان ہی کو سب سے زیادہ شور کرنا تھا لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔

کچھ دیر بعد ہم لوگوں کو کشتی میں بھر دیا گیا۔ اسی کشتی میں دو آدمی اور بھی تھے جنہیں آپ کشتی کے ناخدا کہہ سکتے ہیں۔ وہ دونوں بہت قوی ہیکل قسم کے مکرانی بھائی تھے۔

کھلا آسمان' اندھیرے میں ڈوبا ہوا سمندر اور کشتی کا سفر۔

استاد نے بہت برا پھنسایا تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔

اس کشتی کے ایک ناخدا نے ہم مسافروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''دیکھو جی' تم لوگوں کو زبان بند رکھنے کا ہے۔ سفر میں شور مور نہیں مچانے کا ہے اور جس نے بھی رولا مچایا ہم اس کو سمندر میں پھینک دے گا۔''

استاد نے ایسی صاف صاف زبان پہلے کہاں سنی ہوگی۔ اسی لیے وہ ایک دم سے بھڑک اٹھے۔ ایک لمحے میں ان کی مسلسل خاموشی اچانک ہی ختم ہوگئی تھی۔ انہوں نے زور زور سے گرجنا شروع کردیا ''ناکتخداؤ' آذر بائی جانو! مربیانہ بے شفقت اور بے دار ادر ستم۔ تم سب بزر مہر ہو آلام روزگار کے سیل بلا ہو' درد کش ہو۔ تم فقیرانہ بے مروتی خاک بستر ہو کم بختو! تمہیں نا بغۂ روزگار کی قدر افزوں نہیں ہے۔''

''اوئے' یہ کیا بول رہا ہے؟'' ناخدا نے پریشان ہوکر مجھ سے پوچھا۔

''پیر صاحب کو جلال آ گیا ہے'' میں نے جواب دیا ''یہ بہت جلالی بابا ہیں۔''

اس وقت نہ جانے کیسے سے میرے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ایسے لوگ بہت کمزور عقیدے کے ہوتے ہیں اور پیروں فقیروں سے بہت مرعوب ہوا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ نسخہ کام آ گیا تھا۔ ایک تو استاد کا عالی شان حلیہ' پھر ان کی اس جناتی گفتگو نے ان ناخداؤں کے ہوش اڑا دیے۔ وہ دونوں آپس میں کچھ بولنے لگے تھے۔ کبھی کبھی خوف زدہ نگاہوں سے استاد کی طرف بھی دیکھ لیا کرتے۔

میں نے استاد سے کہا ''استاد۔ ہم سب برے پھنس گئے ہیں۔ یہ لوگ فراڈ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ہمیں کہیں پھنسا کر خود بھاگ لیں گے اور ہم زندگی بھر جیل میں بند رہیں گے۔''

استاد اپنی تمام تر عظیم الشان حرکتوں کے باوجود پولیس وغیرہ سے بہت گھبرایا کرتے تھے۔ یہ سنتے ہی ان کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ ''تو اب کیا سخن دلپذیری ہو؟'' انہوں نے پریشانی ہوکر پوچھا۔

''یہ تو آپ جانیں'' میں نے کہا ''یہ لوگ ہمیں کسی جزیرے پر اتار کر بھاگ لیں گے' ہمیں تو تیرنا بھی نہیں آتا۔''

استاد اس وقت واقعی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ پریشانی تو مجھے بھی ہو رہی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کے تاثرات بھی یہی بتا رہے تھے کہ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔

پھر ان میں سے ایک نے بابا کو مخاطب کیا ''بابا۔ تم بے فکر رہو۔ ابھی ہم تم کو منزل تک پہنچا دے گا۔ بس راستے میں رولا نہیں کرنے کا ہے۔ ادھر سمندر میں نیوی والوں کے جہاز مہاز آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ ہم کو نہ دیکھ لیں۔''

''اگر کسی جہاز والے نے ہمیں دیکھ لیا تو پھر کیا ہوگا؟'' ایک مسافر نے دریافت کیا۔

''اڑے بابا! اس کو بولنے کا ہے کہ ہم لوگ مچھلیاں وچلیاں پکڑنے نکلا ہے'' اس نے کہا۔

''دیکھ لیا استاد!'' میں نے استاد سے پھر سرگوشی کی ''یہ لوگ دھوکے باز ہیں۔''

''اب مجھے دانے ہوتا تھا'' استاد نے کہا ''میں تو گرفتار سوز و برلن تھا۔''

کشتی چلتی رہی۔ نہ جانے وہ لوگ کہاں لے جا رہے تھے۔ ہم نے ساری رات اسی کشتی پر گزار دی تھی۔ صبح ہوئی تو چاروں طرف سمندر ہی سمندر دیکھ کر ہمیں ہول آنے لگا تھا۔ استاد نے بھی ایسا سماں کہاں دیکھا ہوگا۔ ان کی بھی ٹانگیں

کانپنے لگی تھیں۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگے تھے۔ شاید کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہوں گے۔ اس وقت مجھے ان کی حماقت پر بے پناہ غصہ آ رہا تھا اور اپنے آپ کو کوسنے کو دل چاہ رہا تھا۔ آخر کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ میں استاد کے اس پاگل پن میں ان کے ساتھ ہو جاؤں۔

وقت اور بیسیوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ اب تو جان بھی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

ستم بالائے ستم کہ جو سمندر اب تک پُرسکون تھا' وہ اچانک بپھر اٹھا۔ اتنی بڑی بڑی لہریں اٹھنے لگیں کہ کشتی ان کے سامنے بے حقیقت ہوتی چلی گئی۔ دونوں ناخدا کشتی کو سنبھالنے میں لگ گئے اور ہمارا یہ حال تھا کہ ادھر سے ادھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ اس طرح جیسے حلق میں آ گئی ہوں اور اس وقت استاد نے اپنی خاص زبان میں چنگھاڑنا شروع کردیا ''ابے نامعقول' ناہنجار' طفل مکتب' انا بجراد قیا کوس۔ چشم خور دو کلاں۔ بے ہوش و گوش۔ یہ بحر مروارید کس قماش کے ابنائے افشار کر رہا ہے۔''

''خدا کے لیے چپ ہو جائیں استاد'' میں اپنے پیٹ کو دباتے ہوئے بولا ''اس وقت آپ کی یہ باتیں اچھی نہیں لگ رہیں۔''

''خبردار!'' استاد چنگھاڑے ''میں آخری تاجدار اندلس بر صغیر ہوں۔ ہمیں کچھ نہیں نقصانات ازالہ ہوگا۔ ہم بہ خیر و عافیت ساحل اس قریۂ رسوا و شنڈیوا سے مبالہ جاں ہو جائیں گے۔''

''ارے' یہ بابا کیا بول رہا ہے؟'' ایک ناخدا نے پوچھا۔

''یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں کچھ نہیں ہوگا'' میں نے بتایا ''یہ کشتی کنارے پر لگ جائے گی۔''

دوسرے مسافروں نے بھی یہ بات سن لی تھی۔ وہ سب استاد کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت استاد نے ایک اور پینترا بدلا' وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اس طرح بولنے لگے تھے جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔

اور واقعی حیرت انگیز طور پر وہ بپھرا ہوا سمندر پُرسکون ہونے لگا تھا اور ذرا سی دیر میں سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ دونوں ناخدا بھی بہت حیران دکھائی دے رہے تھے۔ پھر وہ دونوں استاد کے سامنے آ کر کھڑے ہوگئے ''اڑے او بابا! ہم کو معافی دے دو'' ان میں سے ایک نے کہا ''اس ایجنٹ نے ہمارے کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ہمیں کسی بابا کو اپنے ساتھ لے جانا ہے۔ ہمارا تو بخشش بھی نہیں ہوئیں گا۔''

''کیا کہا تھا اس ایجنٹ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے بولا تھا کہ اس کھیپ کو کسی ٹاپو پر اتار کر وہاں سے بھاگ آنا ہے'' ناخدا نے بتایا۔

ہم سبھوں کا برا حال ہو رہا تھا لیکن استاد پر اس وقت بے نیازی کی کیفیت طاری تھی۔ ''اب ہم تم لوگوں کو ساحل تک واپس لے جاتا ہے'' ناخدا نے کہا ''ہم اس بابا کے ساتھ ہوشیاری نہیں کرسکتا۔ یہ تو سمندر کو بھی قابو میں کرلیتا ہے تو ہم کیا چیز ہے۔''

اور وہی ہوا' ہم سبھوں کو دوبارہ ساحل پر لا کر اتار دیا گیا تھا۔ سب کے سب استاد کے ہاتھ چوم رہے تھے اور استاد کی پھر وہی بے نیازی کی کیفیت تھی۔ دونوں ناخدا استاد سے بار بار معافیاں مانگ رہے تھے جبکہ مسافر استاد کے بے پناہ عقیدت مند ہوگئے تھے کیونکہ استاد ہی کی وجہ سے سمندر کی لہریں شانت ہوئی تھیں۔ (ان کے خیال کے مطابق)

یہ غنیمت تھا کہ ہم سبھوں کے پاسپورٹ ابھی ہمارے ہی پاس تھے ورنہ بڑی مصیبت ہو جاتی۔ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ میں نے استاد کے محل پہنچ کر ان سے دریافت کیا ''استاد ایک بات تو بتائیں' یہ آپ نے اتنا بڑا دعویٰ کیسے کردیا تھا کہ کشتی کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم احمقِ عظیم ہو'' استاد مسکرا دیے ''میاں' جب کشتی غرقِ آب ہو جاتی تو پھر کون ہمارا حساب لینے والا تھا کہ آپ نے یہ بات غلط کیوں کی؟''

استاد نے انتہائی آسان الفاظ میں یہ نکتہ سمجھا دیا تھا اور اس وقت احساس ہوا کہ استاد کی حکمتِ عملی ہمارے کام آ گئی تھی' انہوں نے بابا بن کر ایک بہت بڑا کام کر دکھایا تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقع ہوگا جب استاد کو کسی معاملے میں چوٹ ہوئی ہوگی۔ وہ تو استاد کی جعلی بزرگی ہمارے کام آ گئی ورنہ ہم کسی ویران ٹاپو پر زندگی گزار رہے ہوتے۔

اس دن کے بعد سے استاد کے سر سے باہر جانے کا بھوت اتر گیا تھا اور خاص طور پر برلن سے انہیں چڑ ہوگئی تھی۔ میں کبھی کبھی انہیں چھیڑنے کے لیے ان سے کہتا ''استاد! کیا خیال ہے' برلن کا پروگرام بنائیں؟''

''ارے دفع کرو'' استاد جل کر کہتے ''برلن کون سا مقامِ افروزہ و جاں فزا ہے۔ وہ تو نشانِ بے راہ رو دیائے عاجلانہ ہے۔'' وہ پتا نہیں کیا کیا کہتے رہتے اور ان کی تقریر کا اصل متن یہ ہوتا تھا کہ ''دنیا کی سب سے ٹھرڈ کلاس جگہ صرف برلن ہے۔''

روم کی گلیاں

علی سفیان آفاقی

کچھ لوگوں کی بے چین روحیں انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور انہیں سیر و سیاحت پر اکساتی رہتی ہیں اور وہ شہر شہر ملک ملک گھومتے پھرتے ہیں۔ علی سفیان آفاقی بھی ایسے ہی جہاں گردوں میں سے ایک ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں اور آپ ان کی دیس دیس کی آوارہ گردیوں کے قصے پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے ہم سفر خان صاحب اور بٹ صاحب بھی اب لوگوں کے لئے اجنبی نہیں اور لگتا ہے کہ خود آفاقی صاحب کو بھی ان کے بغیر سفر میں مزا نہیں آتا تھا۔ اب یہ اور بات کہ وہ روم پہنچے تو خان صاحب کے دل میں صوفیہ لورین کی یادیں تازہ ہوگئیں۔

اس سے انکار نہیں کہ صوفیہ لورین نے روم کو حیات تازہ بخشی ہے

روم کے ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی خان صاحب نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور بولے ”صوفیہ، میں آ گیا ہوں!“

بٹ صاحب جو ٹرالی پر سامان رکھے لوڈر کے فرائض سر انجام دے رہے تھے حیران ہو کر رک گئے۔ انہوں نے بہت غور سے خان صاحب کی طرف دیکھا پھر ہماری طرف نگاہ کی اور اشاروں میں دریافت کرنے لگے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟

ہم نے بھی اشاروں میں جواب دیا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں، اللہ جانتا ہے۔

خان صاحب اب تک خلا میں گھور رہے تھے۔ پھر اچانک قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

بٹ صاحب نے پریشان ہو کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آفاقی صاحب، کہیں ان کا دماغ تو نہیں چل گیا؟“

ہم نے کہا ”پہلے بھی وہ کون سے صحیح الدماغ تھے۔ لیکن اس وقت تو لگتا ہے کہ دورہ پڑ گیا ہے۔“

بٹ صاحب نے چاروں طرف دیکھا بولے ”مگر یہاں تو پانی کا تالاب، جھیل، ندی، سمندر کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ سنا ہے ان چیزوں کو دیکھ کر ہی مرگی کے مریضوں کو دورہ پڑ جاتا ہے۔“

”توبہ کرو بٹ صاحب۔ اللہ نہ کرے۔ خان صاحب کو ایسی کوئی بیماری نہیں ہے۔“

”تو پھر اسے آپ کیا کہیں گے؟“

ہم سے پہلے خان صاحب بول پڑے ”اسے عشق کہتے ہیں۔“

بٹ صاحب نے اتفاق سے بالکل برمحل اور صحیح مصرعہ پڑھ دیا ؎

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

خان صاحب نے متانت سے کہا ”عشق کرنے والوں کو لوگ دیوانہ کہتے ہیں۔ پاگل کہتے ہیں۔ انہیں پتھر مارتے ہیں۔ مجنوں، فرہاد، رانجھا، پنوں ان سب کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا گیا۔“

”جی ہاں، مگر وہ پرانا زمانہ تھا۔ اگر وہ لوگ آج کل ہوتے تو انہیں مینٹل اسپتال میں داخل کر دیا جاتا۔“

”ہم نے کہا ”آپ لوگ فضول بحث نہ کریں۔ خان صاحب آپ بتائیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ روم کے ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی آپ کو عشق کیوں ہو گیا۔ کس سے ہو گیا؟“

خان صاحب نے جواب دیا ”یہ عشق بہت پرانا ہے۔

روم پہنچنے کے بعد ہی مجھے عشق ہو گیا تھا؟“

”کس سے؟“

”صوفیہ لورین سے۔“

”لاحول ولاقوۃ۔“ بٹ صاحب نے دوبارہ سامان کی ٹرالی سنبھال لی ”چلئے باہر۔ اس شخص کا واقعی دماغ چل گیا ہے۔“

خان صاحب مسکرانے لگے۔ بولے ”آفاقی صاحب چاہے کچھ ہو جائے۔ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے مگر اس بار صوفیہ لورین سے ملے بغیر روم سے نہیں جاؤں گا۔“

ہم نے کہا ”جب وہاں جاؤ تو ہم لوگوں کو بھی ساتھ لے چلنا۔ کافی کی ایک پیالی ہم بھی پی لیں گے۔“

بٹ صاحب اب شوخ ہونے لگے تھے ”آپ صوفیہ لورین کو اپنی فلم میں کام کرنے کی دعوت بھی دیجئے گا۔ پاکستان میں وہ بہت پاپولر ہے۔“

”وہ کہاں پاپولر نہیں ہے؟“ خان صاحب نے کہا ”دنیا کے کونے کونے میں اس کے پرستار بکھرے ہوئے ہیں۔“

”صحیح کہا آپ نے۔ احمقوں کی کمی نہیں ہے دنیا میں۔“ بٹ صاحب نے کہا ”بلکہ دنیا میں احمقوں کی آبادی بہت زیادہ ہے۔“

صوفیہ لورین کی عمر اس زمانے میں پینتیس چالیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ جسے یورپ امریکا میں جوانی کی راتیں مرادوں کے دن کہا جاتا ہے۔ مغربی عورتیں کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔ وہ بچی ہوتی ہیں۔ نوجوان ہوتی ہیں اور پھر جوان ہوتی ہیں تو پھر زندگی بھر جوان ہی رہتی ہیں۔ اب خود ہی دیکھ لیجئے۔ اکتوبر 2004ء میں صوفیہ لورین نے ستر دیں سالگرہ منائی ہے لیکن آج بھی ان کے پرستار ان کے حسن و جمال کے گن گا رہے ہیں۔ ان کی خوب صورتی کے معترف ہیں۔ کچھ لوگ تو انہیں آج بھی دنیا کی حسین ترین عورت قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مداحوں میں صرف وہی لوگ شامل نہیں ہیں جنہوں نے اپنی نوعمری یا جوانی کے دنوں میں صوفیہ لورین کی فلمیں دیکھی ہیں اور ان کی دلکشی کا خمار آج بھی ان کے ذہنوں پر باقی ہے، بلکہ نئی نسل کے لوگ بھی ان کے پرستاروں میں شامل ہیں۔

صوفیہ لورین کو مشرقی معیار کے مطابق حسین تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اپنے جسمانی تناسب اور بے باکی سے اپنے جسم کی نمائش کرنے کے باعث وہ ”سیکس کوئین“ کہلائیں۔ اس اعتبار سے واقعی وہ ایک قابلِ ذکر ہستی تھیں۔ پہلے پہل تو وہ محض جسم کی نمائش کے ذریعے شہرت کماتی رہیں مگر بعد میں

جیسے ناموراداکار نے پہلی فلم کے بعد ہی اسے شادی کی پیش کش کردی تھی۔ لیکن یہ درحقیقت یہی محبت کا آغاز تھا جس کی بنا پر کارلو پونٹی اور صوفیہ لورین نے تمام مشکلات کے باوجود ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ نہایت کامیاب اور پائیدار ثابت ہوا۔

1951ء میں جبکہ صوفیہ لورین ہالی ووڈ میں تھی اسے کارلو پونٹی نے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور وہ دونوں اٹلی سے باہر میکسیکو جا کر شادی کریں گے۔

ان دونوں نے شادی تو کرلی مگر اس کی وجہ سے اٹلی میں ایک اسکینڈل کھڑا ہوگیا جو ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ پوپ نے اس شادی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اسے ناجائز قرار دے دیا۔ ان دونوں کو سزا کی دھمکی بھی دی گئی۔ صوفیہ اور کارلو نے امریکا میں رہائشی اختیار کرلی۔ وہ امریکا، سوئٹزرلینڈ اور انگلینڈ میں رہتے تھے مگر اٹلی واپس نہیں جاسکتے تھے۔ ان دنوں اٹلی کے اٹارنی شپرنی نے ان کے خلاف مقدمہ دائر کردیا کہ کارلو نے اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرکے گناہ اور جرم کیا ہے۔

یہ جھگڑے چلتے رہے مگر چونکہ صوفیہ اور کارلو اٹلی سے باہر رہتے تھے اس لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ اس دوران میں صوفیہ کی شہرت اور مقبولیت نے آسمان کو چھولیا۔ فلم "ٹو ویمن" میں اداکاری پر اسے بہترین اداکارہ کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس برس فلم ایڈی ایوارڈ اور نیویارک فلم کریٹکس کے اعزازات بھی حاصل کرلیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کو آسکر ایوارڈ بھی دیا گیا۔ یہ پہلا آسکر ایوارڈ تھا جو کسی غیر ملکی اداکارہ کو دیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی شادی کا تنازعہ بھی جاری تھا۔ اس جرم میں انہیں سزا ہوسکتی تھی۔ اس بے چینی کے لیے انہوں نے میکسیکو میں ہونے والی شادی کے غیر قانونی ہونے کا اعلان کردیا اور فرانس میں رہائشی اختیار کرلی۔ بالآخر 1965ء میں کارلو کو بیوی نے اس کو طلاق دے دی جس کے بعد ان دونوں نے فرانس کے ایک قصبے میں 1966ء میں شادی کرلی۔ دو سال کے بعد ان کے خلاف اٹلی میں بھی مقدمات خارج کردیے گئے۔

صوفیہ لورین اب نہ صرف عالمی شہرت یافتہ تھی بلکہ اسے دنیا کی بہترین اور خوب صورت ترین اداکارہ بھی تسلیم کیا جاچکا تھا۔ امریکی ناقم میگزین نے اس کی تصویر اپنے سرورق پر شائع کرتے ہوئے اس کے بارے میں لکھا تھا: "اس کے بیر بہت بڑے ہیں اس کی کمر دیو ہیکل ہے، اس کی پنڈلیاں بھی موٹی ہیں، اس کی کمر چھوٹی ہے، اس کی چیشانی تنگ ہے، اس کا دہانہ چوڑا ہے، وہ ٹف بال کی طرح بیک کے انداز میں دوڑتی ہے۔ لیکن اشد ضرورت کے وقت وہ بے حد دلکش اور پرکشش عورت ہے۔"

اس طرح کا خراج تحسین شاید ہی دنیا میں کسی اخبار نے کسی اداکارہ کو پیش کیا ہو۔

کارلو پونٹی کے پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے مگر شادی کے بعد صوفیہ لورین کو دنیا کی حد تک بچوں کی خواہش تھی۔ دو بار وہ ماں بننے نہ بننے رہ گئی۔ تب اس کو سوئٹزرلینڈ کے مشہور ڈاکٹر ہیوبرٹ سے ملنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس نے معائنے کے بعد بتایا کہ صوفیہ ماں بن سکتی ہے مگر اسے بہت زیادہ بے حد احتیاط کرنا ہوگی۔ اس نے صوفیہ کو ہفتوں اکیلے ایک ہوٹل میں رہنے کا مشورہ دیا جہاں وہ 24 گھنٹے بستر پر پڑی رہے۔ پھرنے سے پرہیز کرنی تھی۔ اس کو مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی گئی۔ سکون آور ادویات دی جاتی تھیں۔

ڈاکٹر ہیوبرٹ کا علاج اور نگرانی مؤثر ثابت ہوئی۔ 1968ء میں صوفیہ نے اپنے پہلے بیٹے کو جنم دیا جس کا نام کارلو پونٹی کے حوالے سے ہیوبرٹ لیونی رکھا گیا۔ 1973ء میں اس نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا جس کا نام یوراؤ ہے۔

اٹلی کے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں پیدا ہونے والی اس لڑکی نے بالآخر شہرت اور مقبولیت اور کامیابیوں کے آسمان کو چھولیا۔ اب اس کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہے اور وہ خود بے حد خوش قسمت خیال کرتی ہے۔ ہالی ووڈ کے تمام بڑی ستاروں کے ساتھ اس کے ہاتھ کا نقش بھی کندہ کرلیا گیا ہے۔ اس کی عمر میں بھی چست و چالاک، اسمارٹ اور دلکش ہے اور بھی اطالوی فلموں میں کام کرتی ہے۔ اسے جو کچھ ملا ہے، بقول اس کے اس کی بھی خواہ میں بھی اس کا تصور نہیں کرسکتی تھی۔ 1992ء میں اقوام متحدہ نے اسے پناہ گزینوں کا ہائی کمشنر مقرر کرنے کا اعزاز بھی دیا تھا۔

صوفیہ لورین اور کارلو پونٹی نے دو بار شادی کی رسم ادا کی۔ پہلی بار ان دونوں نے 1957ء میں میکسیکو جا کر شادی کی تھی۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اٹلی کے قانون کے مطابق ایک شادی شدہ شخص دوسری شادی نہیں کرسکتا۔ کارلو پونٹی اس وقت شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا مگر میاں بیوی میں علیحدگی ہوچکی تھی۔ اس کے باوجود اس کی بیوی نے شوہر کو طلاق نہیں دی تھی۔ اٹلی میں کیتھولک کریچن مذہب کے

طلاق عمل کیا جاتا ہے اور معاشرہ کٹر مذہبی ہے۔ لورین اور کارلو پونٹی کی شادی کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ دونوں جلاوطنی کے عالم میں ہالی ووڈ اور دوسرے ملکوں میں جا کر زندگی گزارنے رہے۔ اگرچہ اٹلی چلے جاتے تو انہیں گرفتار کرکے سزا دے دی جاتی۔ بالآخر کارلو پونٹی کی پہلی بیوی خدا خدا کرکے طلاق دینے پر رضامند ہوگئی تو ان دونوں نے دوبارہ روم جا کر میکسیکو طریقے کے مطابق شادی کی رسم ادا کی۔ دوسری شادی کی رسم بھی کٹر ڈیک 1966ء میں ادا کی گئی تھی۔ اس کے بعد ہی یہ دونوں روم میں جا کر رہنے کے قابل ہوئے تھے۔

اگرچہ صوفیہ لورین نے میں الاقوامی شہرت ہالی ووڈ کی فلموں سے حاصل کی تھی لیکن اس سے پہلے وہ اٹلی کی فلموں میں کام کرکے بھی بہت مقبول ہوچکی تھی۔ ان فلموں کو انگریزی زبان کا ڈب کرکے دوسرے ملکوں میں دکھایا جاتا تھا لیکن ان کا ڈب کرنے میں بہت بھی محنت کی جاتی تھی۔ ڈبنگ کے دوران میں کوئی کوتاہی کو ہرگز برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ ڈبنگ کے لیے جو بہت بڑے بڑے ہدایت کار منتخب کیے جاتے تھے۔ ان میں صرف اطالوی زبان میں ہدایت دینے والے ہی نہیں بلکہ انگریزی زبان میں ہدایت دینے والے بھی شامل تھے۔ آسکر ایوارڈ حاصل کرنے والی فلم "معروف ناول نگار البرٹو مورایا" جنہیں ساری دنیا عظیم مصنف تسلیم کرتی ہے۔ وہ اطالوی مصنف تھے مگر ان کے ناولوں کا ترجمہ انگریزی زبانوں میں بھی تیار کیا گیا اور وہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔

ان کے ناول لاسیوسارایا (ٹو وومین) میں کام کرنے پر صوفیہ لورین کو آسکر ایوارڈ ملا تھا۔ یہ ایک عورت اور اس کی نوعمر لڑکی کے مصائب کی کہانی ہے جو جنگ زدہ علاقے میں روح فرسا تکالیف برداشت کرتی ہیں۔ صوفیہ نے اس فلم میں ماں کا کردار ادا کیا تھا جسے ساری دنیا میں سراہا گیا۔ ڈبنگ کے دوران میں اور فلموں میں بھی صوفیہ لورین نے لاجواب اداکاری کی تھی۔ یہ دونوں فلمیں انگریزی زبان میں ڈب کرکے دنیا بھر میں ریلیز کی گئی تھیں۔ ان میں ایک "ہیٹر اے۔ ٹوڈے، ٹو مارو" (آج کل اور کل) بھی دوسری کامیاب فلم تھی جس میں اٹلی کے شادی بیاہ اور طلاق کے قوانین پر طنز کیا گیا تھا۔

ہالی ووڈ کی جن فلموں میں صوفیہ لارین نے اداکاری کی ان میں سے چند مشہور فلمیں یہ ہیں۔ گولڈن گریٹس ہی۔ اس فلم میں اس نے پیٹر سیلرز کے ساتھ کام کیا اور ایک دوگانا بھی گایا تھا۔ جارج برنارڈ شا کے ایک ڈرامے پر مبنی فلم مس کا نام THE MILLIONAIRESS تھا، میں بھی اس نے پیٹر سیلرز کے ساتھ کام کیا تھا۔

"پرائیڈ اینڈ پیشن" میں اس نے کیری گرانٹ اور کریک جنز (ایسے شخص جو اداکاروں کے ساتھ کام کیا کرتا ہے۔ یہ ہالی ووڈ میں اس کی پہلی فلم تھی اور اس فلم کی تکمیل کے دوران میں کیری گرانٹ نے اس پر خریفتہ ہوکر شادی کی پیش کش کی تھی جو اس نے مسترد کردی تھی۔ آرے کاروجس فرام بالچ کا کیمرہ "بوائے آن دا ڈولفن" "اٹ شاڑیلڈ اِن ٹینڈر" اور "آرمز" بھی اس کی مشہور فلمیں ہیں۔ آخری دو فلموں میں اس کے ہیرو کلارک گیبل اور چارلٹن ہیسٹن تھے۔

صوفیہ لورین نے بحیثیت ہیروئن اور بھی کئی ایکٹریوں سے شہرت اور کامیابی حاصل کی تھی مگر صوفیہ لورین جیسی شہرت اور مقبولیت کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کی فلم "ٹو ویمن" پہلی غیر ملکی زبان کی فلم تھی جسے آسکر ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اس سے پہلے یہ ایوارڈ صرف ہالی ووڈ کی انگریزی فلموں کو دیا جاتا رہا ہے۔

صوفیہ لورین کو بچپن سے بہت فربہ اور بدصورت میں گزارنا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر فربہ جسم نہ ہوتی تو شاید اس میں ترقی کرنے کی اتنی زبردست خواہش پیدا نہ ہوتی۔ اس نے اپنی ترقی کا ایک سبب یہ بھی بتایا کہ زندگی میں ہمیشہ مثبت سوچ اور بلند عزائم رکھنے چاہئیں۔ منفی انداز فکر اور پست ہمتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ صوفیہ اپنی ہر خوبی اور ترقی کا سہرا اپنے والد کے سر باندھتی ہے جو کہ اس وقت (2005ء میں) 91 سال کا ہوچکا ہے۔ وہ مرد میں صوفیہ میں بہت سال بڑا تھا مگر صوفیہ کی تربیت اور ترقی میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ صوفیہ اسے اپنا گرو قرار دیتی ہے۔

اپنی بے پناہ ترقی کا راز وہ یہ بتاتی ہے۔ "میرا ہدف سیکس اپیل اور پچاس فیصد محنت اور صلاحیت۔" اس کا کہنا ہے کہ "خوب صورتی قدرت کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے لیکن پھر کسی اور چیز کے ساتھ اس کے دامن کو بھی وسیع کرنا ضروری ہے، بشرطیکہ وہ آپ کے پاس موجود ہو۔"

صوفیہ لورین کے بچوں اور ان اقوال کی بھی بہت مشہور ہیں۔ ذرا سنئے۔

(1) "مجھے پیدائشی طور پر دو تحفے ملے تھے۔ ایک غربت اور دوسرا اٹلی۔ میں نے ان دونوں سے بہت کچھ سیکھا

اور حاصل کیا۔"

(2) "یہ خیال غلط ہے کہ ایک بار اسکول سے فارغ ہونے کے بعد آپ کچھ اور نہیں سیکھتے۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان ساری عمر کچھ نہ کچھ سیکھتا رہتا ہے۔"

(3) "میں آپ کو جیسی بھی نظر آتی ہوں یہ سب کچھ اسپاگھٹی (ایک سوئیوں جیسی اطالوی غذا) کی مہربانی ہے۔"

(4) "کسی بھی پیشے میں ترقی کرنے کے لیے خود اعتمادی اور اپنے آپ پر بھروسا کرنا بہت ضروری ہے۔ محنت لگن اور خود اعتمادی کی بدولت اوسط درجے کے لوگ بھی ترقی کر کے باصلاحیت لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔"

(5) "کامیاب زندگی کے لیے غلطیوں کا جرمانہ ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

اور سب سے آخر میں۔

(6) "عورت کا لباس ایک کانٹے دار تار کی مانند ہونا چاہیے جو کہ اپنا مقصد بھی ادا کرتا رہے لیکن آرپار دیکھنے میں رکاوٹ بھی نہ بنے۔"

ستر سال کی عمر میں بھی وہ جسم کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرنے والا لباس پہنتی ہے۔ اس سے ملنے والے اور تقاریب میں دیکھنے والے آج بھی اس کی سحر کار شخصیت اور حسن و جمال کے قصیدے پڑھتے ہیں۔

صوفیہ لورین کے بارے میں یہ تفصیل بتانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اٹلی کی قابلِ ذکر اور قابلِ دید چیزوں میں وہ بھی شامل ہے۔

خان صاحب اگر صوفیہ لورین کے پرستار اور اس سے ملنے کے لیے بے تاب و بے قرار تھے تو انہیں اس کے لیے مورد الزام بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ اس زمانے میں ایک عالم صوفیہ لورین کا شیدائی تھا اور آج بھی ہے۔

خان صاحب نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے فرمایا "دیکھیے، آپ لوگ کان کھول کر سن لیجیے۔ اس بار میں صوفیہ لورین سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

بٹ صاحب نے کہا "تو پھر بہتر ہے کہ آپ یہیں رہ جائیں چونکہ اس زندگی میں تو آپ کی یہ آرزو پوری ہوگی نہیں۔"

"یار تم تو ہمیشہ کالی زبان بولتے ہو۔ ہر جگہ نحوست پھیلاتے ہو۔"

"عقل کی باتوں کو آپ نحوست کہتے ہیں تو آپ کی عقل پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔"

ٹیکسی والا درمیانہ عمر کا ایک گورا چٹا موٹا سا آدمی تھا جو ٹیکسی کا میٹر گرانے کے بعد اس انتظار میں تھا کہ ہم اسے اپنی منزلِ مقصود کا پتا بتائیں مگر خان صاحب اور بٹ صاحب کے مابین گھمسان کی جنگ جاری تھی۔

آخر تنگ آ کر اپنی زبان میں بول پڑا جو ہمارے پلے نہیں پڑا۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ بلاوجہ کھڑے کھڑے تنگ آ چکا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ آخر جانا کہاں ہے؟

ہم نے اس سے پوچھا "یو اسپیک انگلش؟"

"نو۔" اس نے فوراً انگریزی میں جواب دیا۔ "دراصل یہ لوگ یس۔ نو اور گزارے کے علاوہ بہت کم انگریزی کے الفاظ جانتے اور بولتے ہیں۔

ہم نے کہا "ہوٹیل!"

"اوکے۔" اس نے مستعدی سے سر ہلایا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ نہ اس نے پوچھا کہ کون سے ہوٹل جانا ہے اور نہ ہم نے بتایا کہ کس ہوٹل میں چلو۔ ٹیکسی ائرپورٹ سے شہر جانے والی طویل سڑک پر رواں دواں ہوگئی۔ پرانے روم کی تنگ سڑکوں کے مقابلے میں یہ سڑک بہت زیادہ کشادہ اور خوب صورت تھی۔ دونوں جانب سبزہ و گل نظر آ رہا تھا۔ خوب صورت درخت، نیلا آسمان، تر و تازہ ہوا۔ ان چیزوں میں اب ٹیکسی ڈرائیور کی آواز کا بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ مسلسل ہاتھ ہلا ہلا کر اور کندھے اچکا اچکا کر اپنی تقریر کرنے میں مصروف تھا جس کا ایک لفظ بھی ہمارے پلے نہیں پڑ رہا تھا مگر اس کا جوش و جذبہ قابلِ تعریف تھا۔

روم کا ائرپورٹ شہر سے کافی دور ہے لیکن یہ سفر بے حد دلچسپ اور نظر فریب ہے۔ صاف ستھرے کشادہ سبزہ زار اور درخت۔ ہموار سڑکیں۔ روشن اندر باہر اور آس پاس کے مناظر وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دیتے۔ اس پر ٹیکسی ڈرائیور کی نان اسٹاپ تقریر بیک گراؤنڈ موسیقی کا کام دیتی رہی۔ اٹلی جانے والوں کو اس بات کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ وہاں کوئی ان سے انگریزی میں بات نہیں کرے گا بلکہ اگر آپ کچھ پوچھیں گے تو وہ بہرا اور انجانا بن جائے گا۔ بیشتر اطالوی تو واقعی انگریزی سے نابلد ہیں اور جو تھوڑے بہت جانتے بھی ہیں تو وہ انجان بن جاتے ہیں۔ یہی معاملہ جرمنی اور فرانس میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ اپنی قومی زبان سیکھنا اور اس میں بات کرنا بہت گری ہوئی حرکت سمجھتے ہیں اور جو لوگ انگریزی نہیں جانتے انہیں جاہل گردانتے ہیں، چاہے وہ دوسرے علوم میں کتنے ہی قابل اور سند یافتہ کیوں نہ ہوں۔ دراصل یہ ہمارا احساسِ کمتری ہے جسے آزادی کے بعد ہماری انگریزی خواں بیوروکریسی نے نہ

صرف قائم رکھا ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے بھی قومی زبان کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا۔ اب اردو خود اپنے ملک میں اجنبی اور خانہ بدوش بن چکی ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس کی آزادی کی جنگ اردو ہی میں لڑی گئی تھی جسے ہندوؤں نے مسلمانوں کی زبان کہہ کر اسے بھارت میں اچھوت بنا دیا ہے اور جس کو قائد اعظم پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان کہا کرتے تھے۔

ہم ان خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک ٹیکسی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ چونک کر دیکھا تو اندرونِ شہر یعنی روم کا پرانا علاقہ چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" ہم نے پوچھا "رک کیوں گئے؟"

"آپ نے سنا نہیں ٹیکسی والا کب سے ہوٹیل ہوٹیل پکار رہا ہے۔ وہ دیکھیے۔ سامنے ایک ہوٹل ہے۔"

یہ ایک مصروف اور گنجان علاقہ تھا۔ خوب رونق تھی۔ سڑک اتنی چوڑی تھی کہ بیک وقت صرف دو کاریں ہی گزر سکتی تھیں۔ ستم یہ کہ یہ ون وے نہیں تھی۔ دونوں جانب سے کاروں کا اژدھام رواں دواں تھا۔ کبھی کبھی ٹریفک رک بھی جاتا تھا تو ہارن بجنے لگتے تھے۔ ڈرائیور ایک دوسرے کو چلا چلا کر برا بھلا کہتے تھے اور بعض اوقات گھونسا بازی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔

ہم نے ٹیکسی میں سے جھانک کر ہوٹل کا جائزہ لیا۔ چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ آس پاس دکانیں۔ ریستوران، ہوٹل اور بہت کچھ تھا۔ سامنے کے حصے پر شیشے لگے ہوئے تھے جس میں سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دن ہونے کے باوجود اندر روشنیاں جل رہی تھیں۔ درمیانہ سائز کی لابی تھی۔ استقبالیہ پر ایک بڑے میاں سر سے گنجے پھولے پھولے گالوں اور بڑی سی توند والے جلوہ فرما تھے۔

"مٹی ڈالو جی۔" خان صاحب نے بیزاری سے کہا "یہ بھی کوئی ہوٹل ہے یہاں تو یوں لگے گا جیسے مچھلی بازار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہر وقت شور و غل۔ ٹریفک ہجوم، کاروں کے ہارنوں کا شور، ہرگز نہیں۔" پھر انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "کوئی اور ہوٹل دکھاؤ استاد۔"

وہ کچھ نہیں سمجھا۔ پھر بھی سمجھ گیا۔ منہ بنا کر پوچھنے لگا "نو گود؟" (اچھا نہیں ہے؟)

"نو گود۔" خان صاحب نے جواب دیا "ویری بید۔"

ڈرائیور نے دونوں شانے اچکائے۔ منہ بنایا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر اطالوی زبان میں کچھ کہا۔ مطلب یہ ہوگا کہ پھر کوئی اور ہوٹل دیکھتے ہیں۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس سے پہلے ہی اس کے پیچھے اکٹھا ہونے والا ٹریفک بہت بے چین تھا۔ ایک خاتون تو مسلسل ہارن بجا رہی تھیں مگر ٹیکسی ڈرائیور اس سے بالکل بے خبر اور بے تعلق تھا۔

ابھی ٹیکسی حرکت میں آئی ہی تھی کہ خان صاحب بے اختیار چیخے۔ "روکو روکو۔"

ڈرائیور نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

"اسٹاپ..... اسٹاپ۔"

"اوکے۔" ڈرائیور نے پھر شانے اچکائے اور بریک لگا دیا۔

"بھائیو۔ یہی ہوٹل ٹھیک ہے۔" خان صاحب نے اعلان کیا۔

ہم نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر ہوٹل کی جانب دیکھا۔ ان گنجے بڑے میاں کے برابر ایک مہ جبیں آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ سفید بغیر آستین کے بلاؤز میں وہ بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ بالوں کا اسٹائل فلم ایکٹریسوں جیسا تھا۔ چہرہ بھی ایسا تھا کہ فوراً انہیں ہیروئن کا رول پیش کرنے کو جی چاہتا تھا۔ صرف وہی نہیں، چند اور یورپین خواتین بھی لابی میں نظر آ رہی تھیں۔ دو خواتین صوفے پر بیٹھ کر باتیں کر رہی تھیں۔

"بھئی، یہ تو بہت اچھا ہوٹل ہے۔ میرے خیال میں سستا بھی ہوگا۔ چلو اندر چل کر معلوم کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ٹیکسی سے اترنے لگے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے پھر تقریر کا دریا بہا دیا۔ وہ بار بار میٹر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کافی دیر ہوگئی۔ آپ یہاں اتر جائیں اور میری جان چھوڑیں۔

خان صاحب بولے "ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ چھوڑو اس لعنتی کو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کچھ نوٹ اور سکے ڈرائیور کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے حساب لگا کر کچھ نوٹ اور چند سکے اٹھا لیے اور مسکرانے لگا۔

ہم لوگوں نے اپنا سامان اٹھا کر فٹ پاتھ پر رکھا اور ٹیکسی روانہ ہوگئی۔

بٹ صاحب ابھی تک حیرت انگیز حد تک خاموش تھے۔ ایسے موقع پر وہ اکثر خان صاحب کے خاموش پارٹنر بن جاتے تھے۔

"چلو چلو۔ ہوٹل کے اندر چلو۔" بٹ صاحب نے کہا۔

"اس ہوٹل میں کیا خوبی ہے؟ کیا آس پاس کوئی اور ہوٹل نہیں ہے؟" ہم نے کہا۔

''یار..... جب ایک ٹھیک ٹھاک ہوٹل سامنے موجود ہے تو ادھر ادھر ٹانگیں مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ چل کر تو دیکھو۔ پسند نہ آیا تو پھر کہیں اور چلیں گے۔'' خان صاحب نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہم تینوں اپنے اپنے سوٹ کیس اور بیگ اٹھا کر اندر داخل ہوگئے۔

ہوٹل اندر سے زیادہ وسیع اور کشادہ نظر آیا۔ لابی درمیانہ سائز کی تھی۔ جس کے دونوں جانب گیلریاں تھیں۔ ان میں چند کمرے تھے۔ برابر میں ایک چھوٹی سی لفٹ بھی موجود تھی جس کے ساتھ ہی سیڑھیاں بھی تھیں۔ یہ خاصی پرانی عمارت نظر آرہی تھی لیکن بہت نجی سنوری اور اچھی حالت میں تھی۔ لکڑی کی پرانی مگر چمکدار میز کے دوسری جانب استقبالیہ کے دو رکن، بڑے میاں اور ایک خاتون، تشریف فرما تھے۔ نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ خاتون پختہ عمر کی تھیں مگر ان کی دلکشی میں کوئی شک نہ تھا۔

لابی میں موجود خواتین نے اپنی باتوں کے درمیان میں ہم لوگوں کی جانب دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ لابی میں مختلف قسم کی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک جانب دیوار پر بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ دوسری طرف بڑی سی کھڑکی تھی جس کے شیشے میں سے باہر کا منظر نظر آرہا تھا۔ ایک جانب جنگلے یا پارٹیشن کے دوسری طرف چھوٹا سا ریستوران تھا جس میں چھوٹی چھوٹی میزیں اور نازک سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر سرخ اور سفید رنگ کے میز پوش بچھے ہوئے تھے۔ خاصا سلیقہ نظر آرہا تھا۔

''کیوں..... کیسا ہے؟'' خان صاحب نے فخریہ انداز میں پوچھا۔

ہم نے سر ہلا کر تائید کردی کہ ٹھیک ہے۔

خان صاحب مسکراتے ہوئے استقبالیہ کی جانب بڑھے جہاں بیٹھے ہوئے دونوں چہرے سرتاپا مسکراہٹ بنے ہوئے تھے۔

بٹ صاحب اچانک بول پڑے ''کوئی مجھ سے بھی تو پوچھے؟''

ہم دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

ہم نے پوچھا ''کیا آپ کو ہوٹل پسند نہیں آیا؟''

''کیوں نہیں آیا۔'' وہ بولے ''مگر مجھ سے رائے تو لینی چاہیے نا۔''

خان صاحب خاتون کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں بھی کشاں کشاں ان کے پیچھے جا پہنچے۔

دونوں طرف سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔

خان صاحب نے پوچھا ''یو اسپیک انگلش؟''

''ویری گوڈ انگلیس۔'' خاتون نے بڑے اعتماد سے کہا۔

خان صاحب نے ان سے بات چیت کا آغاز کردیا۔

ان کی ''ویری گوڈ انگلیس'' کا راز بہت جلد کھل گیا۔ وہ اطالوی لب و لہجے میں لیکن بڑی روانی سے انگریزی بول رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اطالوی زبان میں سوچنے کے بعد اسے انگریزی میں ترجمہ کرتی ہیں اور پھر بھی جو انگریزی لفظ یاد نہ آئے اس کی جگہ ''یونو'' کہہ کر گزارہ کرتی ہیں۔

بٹ صاحب بھی ہمارے ساتھ ہی کھڑے تھے۔ ہوٹل کے کمروں کا کرایہ معقول تھا۔

خان صاحب نے فوراً تین کمرے لینے پر آمادگی ظاہر کردی۔

ہم نے کہا ''پہلے کمرے تو دیکھ لیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آخر یہ روم ہے۔ ہوٹل کے کمرے اچھے ہی ہوں گے۔''

معلوم ہوا کہ ناشتا صبح سات بجے سے ساڑھے نو بجے تک مل سکتا ہے۔ اس کے بعد ٹوسٹ اور انڈا دستیاب نہ ہوگا۔ چائے بسکٹ وغیرہ سے کام چلانا ہوگا۔

خان صاحب نے فوراً کارڈ پُر کردیا اور ہم دونوں کے دستخط بھی کرادیے۔ خاتون نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور چابیاں ہماری طرف بڑھائیں۔

بٹ صاحب خاتون کے خلوص اور شائستگی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے خان صاحب سے فرمائش کی ''آپ نے ان کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔''

خان صاحب تو ان سے باتیں کرنے کا موقع تلاش کررہے تھے۔ فوراً ان سے پوچھا ''مے آئی نو یور گڈ نیم؟''

وہ مسکرا کر بولیں ''ویری گوڈ۔''

بھلا یہ کیا نام ہوا؟'' ہم نے کہا۔

''شاید وہ بات نہیں سمجھی۔'' بٹ صاحب نے لقمہ دیا۔

خان صاحب نے دوبارہ سادہ لفظوں میں پوچھا۔ ''وہاٹ از یور نیم پلیز۔'' وہ کچھ شرمائیں۔ کچھ مسکرائیں اور بولیں ''امیلدا۔''

دراصل یہ ان کا مختصر نام تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا نام پوری ایک سطر کا تھا جو کہ فالتو حصہ تھا۔ اس میں ان کے والد کا نام۔ خاندان وغیرہ سب کچھ شامل تھا۔ بہرحال بٹ صاحب اور خان صاحب کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔

خان صاحب نے ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا اور ہم

لوگ رخصت ہونے لگے۔

امیلدا نے پکار کر کہا ''سنئے۔''

ہم لوگ رک گئے۔

وہ مسکرا کر بولیں ''پور روم، نو باتھ روم۔'' یعنی آپ کے کمرے میں کوئی باتھ روم نہیں ہے۔

ہم گھبرا گئے۔ ''کیا مطلب۔ یہ باتھ روم کے بغیر ہوٹل ہے؟''

انہوں نے ہمیں بہت مشکل سے سمجھایا کہ ہر کمرے کے ساتھ باتھ روم نہیں ہے۔ چند کمروں کے لیے ایک باتھ روم ہے جو صبح چھ بجے سے رات کو دو بجے تک کھلا رہتا ہے اور بہت صاف ستھرا ہے۔

ہمیں یورپ کے ہوٹلوں میں یہ تجربہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔ بٹ صاحب کا کہنا تھا کہ یہ بات انہیں کمرا دینے سے پہلے بتانی چاہیے تھی۔

''اگر پہلے بتا دیتی تو آپ کیا کرتے؟''

کہنے لگے ''تو پھر میں سوچتا۔''

خان صاحب نے کہا ''تو پھر اب سوچ لو۔''

بٹ صاحب ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے پھر بولے ''سوچ لیا۔ ٹھیک ہے!''

ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ کسی اور ہوٹل میں چلنے کا مشورہ دیں گے مگر وہ صرف سوچ کر رہ گئے تھے۔ شاید ہوٹل سے زیادہ ہوٹل والے انہیں بھی پسند آگئے تھے۔ ہم تو صرف شامل تھے۔ اکثر ان کے فیصلوں کے سامنے سر جھکا دیتے تھے۔

کمروں میں جانے کے لیے مختصر سی لفٹ تھی۔ ہمارے کمرے دوسری منزل پر تھے۔

امیلدا نے کہا ''آپ چلئے، سامان بھی آجائے گا۔''

ایک لڑکا وردی میں ملبوس نمودار ہوا۔ ہمارا سامان اس نے ایک ٹرالی میں رکھا اور چلتا بنا۔

ہم لوگ اپنے کمروں میں آگئے۔ اچھے کمرے تھے۔ پچھلی جانب کی کھڑکی سے بازار اور سڑک کی گہما گہمی نظر آتی تھی۔ اچھا تماشا تھا۔

''مگر ہمارا سامان کہاں ہے؟'' بٹ صاحب کو یاد آگیا ''کہیں وہ لے کر چمپت تو نہیں ہوگیا؟''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو وہی لڑکا سامان کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اشاروں میں پوچھا کہ کون سا سامان کس کمرے میں لے جانا ہے۔

ہم نے کہا ''تم فکر نہ کرو۔ ہم خود رکھ لیں گے۔''

جب وہ واپس جانے لگا تو خان صاحب نے فوراً پانچ لیرے ٹپ کے طور پر اس کو دیے۔ وہ شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

''یار شرم کرو۔'' بٹ صاحب نے کہا ''آپ نے اسے پانچ پیسے پر ٹرخا دیا۔ اس سے اچھا تھا کہ کچھ نہ دیتے۔''

''بھائی یہ پیسے نہیں ہیں۔ لیرا ہے۔ ان کا ایک روپیہ ہوتا ہے۔''

مگر بٹ صاحب بدستور ناراض رہے کہ یہ لڑکا ہم پاکستانیوں کے بارے میں کیا سوچے گا۔

خان صاحب جھلا کر بولے ''بٹ جی، آپ ان لوگوں کے سوچنے کی فکر نہ کریں۔ اول تو یہ سوچتے ہی نہیں اور اگر سوچتے ہیں تو سوچا کریں۔ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ ہم اگر اسے ٹپ ہی نہ دیتے تو یہ کیا کرتا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' بٹ صاحب نے جواب دیا ''دل ہی دل میں گالیاں دیتا ہوا چلا جاتا۔''

ہم نے کہا ''آپ لوگ اپنا سامان کمروں میں لے جائیں۔ اگر تازہ دم ہونا ہے تو ہولیں پھر باہر جانے کا پروگرام بنائیں گے۔''

''تازہ دم ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہوائی جہاز سے نکل کر آئے ہیں۔ شہر میں دھول مٹی نام کو نہیں ہے۔ موسم بھی خوش گوار ہے۔''

''پھر بھی منہ ہاتھ تو دھولو۔''

''جب ضرورت ہوگی دھولیں گے۔ میں اپنا سامان رکھ کر آتا ہوں۔'' خان صاحب یہ کہہ کر رخصت ہوگئے۔

''سمجھے آپ۔ یہ ہاتھ کیوں نہیں دھوئیں گے؟'' بٹ صاحب نے طنزیہ انداز میں ہمیں مخاطب کیا۔

''ہم تو نہیں سمجھے۔''

''بھائی گوری سے ہاتھ ملایا ہے۔ اس کا بس چلے تو ایک ہفتے تک نہ دھوئے۔''

''بٹ صاحب، آپ بلاوجہ مشکوک ہوجاتے ہیں۔''

''بلاوجہ نہیں۔ میرے پاس وجہ بھی ہوتی ہے اور ثبوت بھی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنا سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے چلے گئے۔

ہم نے پہلے منہ ہاتھ دھونے کا ارادہ کیا مگر خیال آیا کہ کمرے سے باہر ''کیمونٹی باتھ روم'' میں جانا پڑے گا۔ اس لیے ارادہ ملتوی کردیا۔

ہم سب سے پہلے لابی میں پہنچ گئے۔ ہوٹل کے شیشوں سے تو باہر کا منظر نظر آتا ہی تھا مگر ہوٹل کے اندر بھی خاصی رونق اور بہار تھی۔ خان صاحب کا انتخاب غلط نہ تھا۔ کمرے کے ساتھ باروم نہ ہوا تو کیا ہوگیا۔

اتنی دیر میں وہ دونوں حضرات بھی آگئے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

خان صاحب نے بڑے فخریہ انداز میں لابی کا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگے ''کتنی رونق والی جگہ ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔''

''دیکھو بٹ، تم بلاوجہ جگہ بے جگہ لاحول پڑھ کر اس کی بے حرمتی نہ کرو۔ کتنی بار کہا ہے کہ دل ہی دل میں پڑھ لیا کرو۔ سب لوگ مڑمڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔''

''دیکھا کریں۔ میں اپنا فرض کیسے چھوڑ دوں۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ چاروں طرف عریانی اور بے شرمی کا بازار گرم ہے۔''

''آپ کے لاحول پڑھنے سے یہ ٹھنڈا تو نہیں ہو جائے گا۔ ان گناہ گاروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اللہ میاں خود ہی ان سے جواب طلب کر لیں گے اور فرشتے انہیں کوڑے مار مار کر حلیہ بگاڑ دیں گے۔''

اس بار روم میں ہمارا قیام مختصر ہی تھا۔ خان صاحب کے اصرار پر پاکستان جاتے ہوئے وہاں رک گئے تھے۔ روم کو پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس کو لازوال شہر کہا جاتا ہے۔ ہوگا، مگر ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ سچ پوچھئے تو پیرس کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں روم ہمیں پسند نہیں آیا۔ جن تاریخی عمارتوں اور یادگاروں کا شہرہ ہے اور جو فلموں اور تصاویر میں بہت حسین لگتی ہیں سچ مچ دیکھو تو خاصی پرانی اور بوسیدہ ہیں۔ پیرس اور لندن والی آراستگی اور معیار یہاں نظر نہیں آتا۔ البتہ یہاں کا ماحول، لوگوں کے مزاج اور عادتوں میں کافی فرق ہے۔ بہت ہنس مکھ، خوش اخلاق اور زندہ دل لوگ ہیں۔ انگریزی یا کوئی دوسری زبان قطعی نہیں جانتے مگر بے تکلف اور بے تکان اور متواتر بولتے رہتے ہیں۔ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ بڑے زندہ دل لوگ ہیں۔ ہر ایک سے خوش رہتے ہیں۔ کھانے پینے کے بھی شوقین ہیں اور سیر و تفریح کے بھی دلدادہ ہیں۔ ان کے بازار، پلازے لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ البتہ تاریخی یادگاروں پر مقامی لوگوں سے زیادہ سیاحوں کے جمگھٹے نظر آتے ہیں۔

روم میں پیدل چلنے کا بہت لطف آتا ہے لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں تو آئی نہیں کہ لوگ روم کے اتنے قصیدے کیوں پڑھتے ہیں۔

روس کے نامور کہانی اور ناول نگار گوگول کو روم اس قدر پسند آیا تھا کہ انہوں نے لکھا تھا ''جو شخص روم پہنچ جائے وہ باقی دنیا کو بھول جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت میں جا کر دنیا کے بارے میں کون سوچتا ہے۔''

یعنی گوگول صاحب کے نزدیک روم جنت نظیر ہے۔ ممکن ہے ان کے زمانے میں ایسا ہی ہو یا پھر ان کی نظروں نے روم میں کوئی ایسا حسن تلاش کر لیا ہو جو ہمیں نظر نہیں آیا۔ دراصل یہ شہر تاریخی عمارتوں اور یادگاروں سے بھرا پڑا ہے۔ چپے چپے پر کوئی قدیم عمارت نظر آ جاتی ہے۔ انہوں نے بیشتر عمارتوں کو سنبھال کر رکھا ہے لیکن بعض جگہ بے پروائی بھی نظر آتی ہے۔ ہمارے پرانے تاریخی شہر بھی قدیم یادگاروں سے آراستہ ہیں مگر اب وہ حکومت اور لوگوں کی مہربانی سے کھنڈرات یا ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ہر بار یہ سوچتے ہیں کہ اگر حکومت کے متعلقہ ادارے فرض شناس، دیانت دار اور قوم پرست ہوتے تو پاکستان میں تاریخی عمارتوں کی کیا کمی ہے۔ انہیں سجا بنا کر اتنے ستھرے ماحول میں رکھا جاتا تو ہم بھی سیاحوں سے اربوں ڈالر کماتے، مگر یہاں پروا کس کو ہے؟

روم کے لوگ اپنی قدیم یادگاروں کے نام زبانی یاد رکھتے ہیں اور سیاحوں کو بھی ان کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔ دراصل دنیا پبلسٹی کی ہے۔ انہوں نے اپنی چیزوں کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ جون کے مہینے میں روم کے نیلے آسمان کی تعریف میں ہر کسی نے بہت کچھ کہا ہے مگر نیلا آسمان تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ اپنے لاہور کا نیلا آسمان کون سا کم حسین ہے اور اگر شمالی علاقوں اور پہاڑوں پر جائیں اور بادل نہ ہوں تو وہاں کے نیلے آسمان کی خوب صورتی قابلِ دید ہے۔ لیکن اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔ گوگول صاحب کا کہنا ہے کہ نیلے آسمان تلے سان گیوانی، بین تھیون اور لیٹرانو کا حسن دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ سب قدیم رومی تہذیب کی نشانیاں ہیں۔

روم کے قابلِ دید اور مشہور مقامات کے بارے میں تو سب جانتے ہیں اور جو بھی سیاح روم میں آتا ہے وہ سب سے پہلے ان ہی مقامات کو دیکھنے کی تمنا ظاہر کرتا ہے لیکن روم میں بھی دوسرے شہروں کی طرح ایسے مقامات بھی ہیں جو دیکھنے اور لطف اندوز ہونے کے لائق ہیں مگر ان کا اتنا زیادہ شہرہ نہیں ہے۔ یہ ایسی جگہیں ہیں جن کا تذکرہ نہ تو سیاحوں کے پمفلٹ میں ملتا ہے اور نہ ہی گائیڈ ان کے بارے میں بتانا ضروری سمجھتے ہیں۔

یہ باتیں ہمیں امیلدا نے بتائیں جو خان صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی تھیں۔ امیلدا نے بتایا تھا کہ روم کے نواحی علاقوں میں اڑنے والے کیڑوں سے ہوشیار رہیں۔ یہ اڑنے والے کیڑے یا پروانے پائن کے درختوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سیاہی مائل رنگ کے ہوتے ہیں اور ہمیشہ قطاروں

میں اڑتے ہیں۔ اسی لیے روم والے ان کو پروسیشنٹی یعنی جلوس والے کہتے ہیں۔ انہیں ہاتھ سے چھونا خطرناک ہے ورنہ الرجی ہوجاتی ہے۔ یہ کیڑے پائن کے درختوں کے اوپر کے حصوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ درختوں کے بالائی حصوں کو کاٹ دیا جائے ورنہ ان کے چھونے سے کھجلی اور خارش ہوجاتی ہے۔

امیلدا بذاتِ خود روم کے نواحی علاقے میں رہتی تھی۔ پیازہ نارونو اور سینٹ پیٹرز اسکوائر جیسے علاقوں کے نواح میں رہنے والے بھلا ان چھوٹے موٹے رازوں سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں۔

ہم نے سوچا کہ روم کے بارے میں ہم اپنے سفرناموں میں سب کچھ تو لکھ چکے ہیں۔ اب کچھ ایسے پہلوؤں سے آپ کو آشنا کریں جو کہ بہت عام نہیں ہیں۔ امیلدا کو بس یا انڈر گراؤنڈ ٹرین کے ذریعے اپنے گھر جانا پڑتا تھا اور پھر پیدل چل کر ایسے علاقوں سے گزرنا پڑتا تھا جہاں ہر طرف آوارہ کتے، سانپ وغیرہ گھومتے پھرتے ہیں۔ گھاس کے سانپ زیادہ زہریلے نہیں ہوتے مگر سانپ کا تو نام ہی ڈرانے کے لیے کافی ہے۔

روم کی بسوں اور انڈر گراؤنڈ میں ہم نے بھی سفر کیا ہے۔ یہ ہر وقت کھچا کھچ بھری رہتی ہیں۔ لوگ ہماری طرح دروازوں اور پائیدانوں سے لٹک کر تو سفر نہیں کرتے مگر کھچ کھچ بھرے ہونے کی وجہ سے گرم دنوں میں بسوں کے اندر خاصا حبس اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ان سواریوں کے مسافر اکثر ایک دوسرے سے یہ سوال کرتے رہتے ہیں ''سینڈاے لا پردیسما؟'' یہ اطالوی زبان کا فقرہ ہے جس کا مطلب ہمیں یہ بتایا گیا کہ ''کیا آپ اگلے اسٹاپ پر اتریں گے؟'' مطلب یہ کہ ہر مسافر کی خواہش ہوتی ہے کہ اگلے اسٹاپ پر بہت سے لوگ اتر جائیں تاکہ اسے بیٹھنے یا اطمینان سے سانس لینے کا موقع نصیب ہوسکے۔ لیکن اگلے اسٹاپ پر جتنے مسافر اترتے ہیں اتنے ہی بلکہ ان سے زیادہ سوار ہوجاتے ہیں۔ گویا مقصد حل نہیں ہوتا۔ بسیں مسافروں سے ٹھساٹھس بھری ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اسٹاپ پر اترنا بھی ایک مرحلہ ہے۔ لیکن لوگ کسی نہ کسی طرح سمٹ کر اور سکڑ کر راستہ دے دیتے ہیں۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ روم جاکر خان صاحب بسوں میں سفر کرنے کی فرمائش کیوں کرتے ہیں۔ یہاں زنانہ حصہ الگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی خواتین کو احتراماً یا اخلاقاً اپنی سیٹ پیش کی جاتی ہے اس لیے عورت مرد سب ایک ہی صورتِ حال سے دوچار رہتے ہیں۔ عورتوں کے درمیان کھڑے رہنے اور ان کو دھکیل کر باہر نکلنے کا جو لطف خان صاحب اٹھاتے ہیں اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی اس حرکت پر بٹ صاحب نے کئی بار لاحول پڑھی مگر خان صاحب کا جواب یہ تھا کہ آپ بھی تو ان ہی بسوں میں سفر کرتے ہیں اور اسی طرح خواتین کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہیں۔ اگر اتنے ہی محتاط ہیں تو پیدل چلیں یا ٹیکسی سے سفر کریں۔ لیکن وہاں بسوں کے مسافروں کی خوبی یہ ہے کہ بلاوجہ بیزاری اور ناراضگی کا اظہار نہیں کرتے۔ جب کوئی پوچھے ''سینڈاے پردیسما'' تو اس کے جواب میں خواہ ''سی'' (جی) کہا جائے یا ''نو'' کوئی بیزار نہیں ہوتا۔ کم سے کم جگہ میں مسافروں کو آمدورفت کے لیے راستہ دینا ایک مشکل کام ہے۔ مگر ہر ایک مسکراتا رہتا ہے۔ اگر کسی کو دھکا لگ جائے تو فوراً ''سوری'' کہا جاتا ہے۔

ایک بار ایک طرحدار خاتون باہر نکلنے کی کوشش میں دھکم پیل کرتی ہوئی خان صاحب پر گر ہی گئیں۔ خان صاحب نے انہیں بہت احتیاط سے سنبھالا دیا۔ انہوں نے مسکرا کر کہا ''سوری۔''

خان صاحب فوراً بولے ''مائی پلیژر'' (مجھے بہت خوشی ہوئی)

یہ جواب سن کر ناراض ہونے کے بجائے وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

خان صاحب نے کہا ''دیکھا۔ اخلاق اس کو کہتے ہیں۔''

''یہ اخلاق نہیں بے شرمی اور بے حیائی ہے۔'' بٹ صاحب نے فوراً فلسفہ جھاڑا۔

''بٹ جی، یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔''

اسی وقت بس ایک دھچکے سے رکی اور ایک خاتون بٹ صاحب کی آغوش میں آگری۔

بٹ صاحب کی حرکت ملاحظہ کیجیے کہ ناراض ہونے اور ناک بھوں چڑھانے کے بجائے مسکرا کر اردو میں گویا ہوئے ''کوئی بات نہیں۔ ہوجاتا ہے۔''

خاتون کی سمجھ میں تو خاک بھی نہ آیا۔ وہ رخصت ہوگئیں۔

خان صاحب کو اللہ ایسا موقع دے۔ فوراً اعتراض کردا ''بٹ جی، اگر وہ بے چاری گر گئی تھی تو اسے اپنی آغوش میں لینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''فضول باتیں مت کرو۔ وہ گر رہی تھی۔ میں نے سنبھال لیا۔ کیا اسے فرش پر گر جانے دیتا؟''

''بھائی۔ یہاں تو فرش ہی نظر نہیں آتا۔ فرش پر گرنے کی گنجائش ہی کہاں ہے مگر آپ کو تو اللہ ایسا موقع دے۔''

ایسی لوک جھوک تو ان کے معمول میں شامل تھی جو ادارے لیے دلچسپی کا سبب تھی۔

اب ذرا روم کی بسوں اور انڈر گراؤنڈ ٹرینوں کا حال بھی سن لیجیے۔ گرمی اور حبس کے موسم میں مسافروں کے ہجوم میں سفر کرنا خاصا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسٹیشن پر ٹرین سے لوگوں کا ایک ریلا نکلتا ہے مگر فوراً ہی دوسرا ریلا ٹرین کے اندر داخل ہوجاتا ہے۔ عموماً لوگ قطاریں بناتے ہیں مگر کچھ دیہاتی قسم کے لوگ دھکم پیل بھی کرتے نظر آتے ہیں جنہیں دیکھ کر اپنے پیارے لاہور کی یاد یں تازہ ہوجاتی ہیں۔

اس ہجوم سے بچنے کا طریقہ کیا ہے کہ آپ ایسے اسٹیشن سے سوار ہوں جہاں زیادہ ہجوم نہیں ہوتا جیسے منٹ پیدل چلنے میں کوئی ہرج نہیں ہے مگر جان تو بچ جاتی ہے۔ مثلاً روم کا معروف علاقہ ''پیازا ڈیل پوپولو'' (کس قدر مزاحیہ نام ہے) ایسی جگہ ہے جہاں انڈر گراؤنڈ کے اسٹیشن پر بہت ہجوم ہوتا ہے۔ اس پیازا کے بیچوں بیچ ایک بادشاہ کا شاندار مقبرہ بھی ہے، جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا مگر وہ بہت مشہور رومن شہنشاہ تھا۔ ایک صاحب نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ رومن شہنشاہ کے نیچے والے اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھیے تو جگہ مل جائے گی۔ خان صاحب کو یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ انہوں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ کیا رومن شہنشاہ کے قدموں تلے اسٹیشن پر جانا ایک مسلمان کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اس مقبرے کے نزدیک ہی ایک مشہور شاپنگ اسٹریٹ بھی ہے۔ ہم نے دوپہر کے وقت دیکھا کہ بس ڈرائیور اور ٹرین ڈرائیور یہاں پہنچ کر اپنی ڈیوٹی چھوڑ کر بازار میں لنچ کے لیے چلے جاتے ہیں جو کہ عموماً سینڈوچ اور کافی پر مشتمل ہوتا ہے۔ کچھ ڈرائیور بیئر کے بھی لے آتے ہیں۔

خان صاحب نے ایک ایسے ہی ڈرائیور کی بس میں بیٹھنے سے انکار کردیا تھا کہ ''یہ تو شرابی ہے۔ یقیناً نشے میں ہوگا۔ اس پردیس میں بس کے ایکسیڈنٹ میں مرنا پسند نہیں کرتا۔''

اس مقبرے کے ساتھ ہی شہنشاہ کے نام سے موسوم ایک اور پیازا آگسٹو بھی ہے۔ لیجیے شہنشاہ کا نام بھی یاد آگیا یہ شہنشاہ آگسٹس تھے۔

یہ علاقہ اپنی تاریخی اہمیت کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ ایک تو مقبرے سے متصل ایک تاریخی میوزیم ہے۔ دوسرے یہ کہ اٹلی کے آمر مسولینی کی فاشسٹ پارٹی کا پہلا اجلاس اسی جگہ پر ہوا تھا۔ جلسے کے بعد مسولینی نے آس پاس کی تمام عمارتیں مسمار کرکے یہاں ایک بڑا چوک بنانے کا حکم دیا تھا جس پر بلاچون وچرا عمل کیا گیا۔ غالباً مسولینی روم کے سابق حکمرانوں کے ساتھ اپنا تعلق پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مقبرے کی حالت کچھ اچھی نہیں ہے۔ پیازا آگسٹو کی عمارتیں جدید انداز کی ہیں جو کہ قدیم رومن طرزِ تعمیر سے قدرے مختلف ہیں۔

مسولینی نے اپنے دورِ حکومت میں اور بھی بہت سی عمارتیں اور پیازا تعمیر کرائے تھے۔ ان سب کا طرزِ تعمیر جدید انداز کا ہے۔ مسولینی نے قدیم شہر سے ایک کشادہ سڑک مشہور زمانہ کلوزیم تک بنانے کا بھی حکم دیا تھا۔ وہ کلوزیم کے نزدیک اپنی پارٹی کے صدر دفتر کی عمارت بنانا چاہتا تھا تاکہ روم کی تاریخی یادگار کے ساتھ اس کا اور اس کی پارٹی کا نام بھی امر ہوجائے۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے عزائم پورے نہ کرسکا۔ وہی معاملہ ہے کہ ؎

سامان سو برس کا ہے، پل کی خبر نہیں

اس کی بنائی ہوئی سڑک اب دو حصوں میں تقسیم ہوچکی ہے۔ یہاں ایک بڑا سا میدان ہے جہاں میوزیکل کنسرٹ وغیرہ منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

ہم لوگ پیدل چلتے چلتے اور بسوں میں دھکے کھاتے کھاتے تھک گئے تو ایک ریستوران میں جاکر سبزی کے سینڈوچ اور بریڈ پر مکھن کے ساتھ جیم لگا کر کھایا۔ بہت مزہ آیا۔ اصلی خوراک کی بات ہی اور ہے۔

واپسی میں سوچا کہ ٹیکسی کی عیاشی کی جائے۔

ایک ٹیکسی کو دیکھ کر اشارہ کیا تو وہ فوراً رک گئی۔ ڈرائیور معقول صورت شکل کا تھا۔ وہ انگریزی بھی جانتا تھا۔ معلوم ہوا کہ کئی سال انگلینڈ میں رہ چکا ہے۔

''پھر واپس کیوں چلے آئے؟'' ہم نے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکائے اور بولا ''اس لیے کہ روم مجھے بلا رہا تھا۔ آپ خود ہی بتایئے روم چھوڑ کر لندن میں رہنے والا کوئی بے وقوف ہی ہوگا۔''

اس کا یہ جذبہ ہمیں پسند آیا مگر ایسے بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے جو روم چھوڑ کر لندن میں رہتے ہیں۔

یہ شخص خاصا باتونی تھا۔ بولا ''سنیورا! آپ کو روم کی کوئی چیز دکھاؤں؟''

پوچھا ''وہ کیا ہے؟''

کہنے لگا ''سانتا میریا میڈے لینا کا چرچ۔''

بٹ صاحب نے فوراً لاحول پڑھی۔

وہ کچھ نہ سمجھا۔ بولا ''اس کو ہم لوگ لامیڈے لینا بھی کہتے ہیں۔ یقین کیجیے، روم میں اتنی خوب صورت اور انوکھی عمارت کوئی اور نہیں ہے۔''

بٹ صاحب نے اردو میں کہا ''ہمیں عمارتوں سے کیا۔ ہم کوئی سروے کرنے آئے ہیں؟''

خان صاحب بولے ''شکل سے تو سروئیر ہی لگتے ہو۔ یہ بھی عزت کی بات ہے۔''

''یہ چرچ ہے کہاں؟'' ہم نے اس کا دل رکھنے کے لیے پوچھا۔

''پیازا ڈیلا میڈے لینا کے پاس۔''

''اور یہ پیازا کہاں ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے مگر اس علاقے میں بہت کم سیاح جاتے ہیں۔ گائیڈ لوگ تو انہیں صرف مشہور مقامات پر ہی لے جا کر بے وقوف بناتے ہیں۔''

خان صاحب بولے ''شاید یہ ہمیں بھی بے وقوف سمجھ رہا ہے۔ ہمیں کیا پڑی ہے کہ وہ چرچ دیکھنے کے لیے ٹیکسی کا زائد کرایہ خرچ کریں۔''

ہم ابھی بولنے بھی نہ پائے تھے کہ ٹیکسی ڈرائیور بول پڑا ''سنیور! آپ چرچ کی آمدورفت کا کرایہ نہ دیجئے گا۔ یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہوگا۔''

ہم اس کی حب الوطنی اور وطنی پرستی سے بہت متاثر ہوئے۔

''ٹھیک ہے۔'' خان صاحب نے مریل سی آواز نکالی۔

ڈرائیور نے ٹیکسی کا رخ موڑ دیا۔ روم کی سڑکیں خوب پُر ہجوم اور سیاحوں سے لبریز تھیں۔ خان صاحب کو یہ منظر بہت پسند آیا۔ کہنے لگے ''اس علاقے کا نام پوچھ لو۔ پھر کبھی فرصت میں آئیں گے۔''

''اور فٹ پاتھ پر عورتوں کے دھکے کھائیں گے۔'' بٹ صاحب نے لقمہ دیا۔

یہ چرچ بھی ہم نے دیکھا۔ ہمیں تو کوئی ندرت نظر نہ آئی۔ دوسری قدیم رومن عمارتوں جیسا ہی تھا۔

''آپ اندر چلیں گے؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

ہم نے کہا ''بہت تھکے ہوئے ہیں۔ پھر کسی وقت فرصت سے آئیں گے اور لطف اٹھائیں گے۔''

''بہت خوب۔'' وہ خوش ہوگیا ''سنیور آپ اسے اندر سے دیکھ کر واقعی بہت پسند کریں گے۔''

خان صاحب نے پوچھا ''کیا یہاں سیاح بھی آتے ہیں؟''

بولا ''بہت کم۔''

''تو پھر اِدھر آ کر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' خان صاحب نے اردو میں تبصرہ کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور واپسی میں ہمیں روم کے ٹریفک کے بارے میں بتاتا رہا۔ ''سنیور۔ آپ دیکھ رہے ہیں کتنا گندہ ٹریفک ہے۔ یہ اسکوٹر والیاں تو سرخ لائٹ کی پروا نہیں کرتیں۔ سارے اسکوٹر والے ''بین'' کردینے چاہئیں۔ یہ تو زیبرا کراسنگ پر بھی بریک نہیں لگاتے۔ اور وہ سامنے دیکھ رہے ہیں سڑک پر ٹریفک جام ہوگیا ہے اور کاروں والے کتنے زور زور سے ہارن بجا رہے ہیں۔ ان لوگوں میں تہذیب اور صبر ہی نہیں ہے۔''

ہم نے کہا ''سنیور! آپ لوگ ہمارے لاہور کا ٹریفک دیکھیں گے تو سب کچھ بھول جائیں گے'' مگر وہ کچھ نہیں سمجھا اس لیے کہ ہم نے یہ فقرہ اردو میں کہا تھا۔

ایک ٹریفک سگنل پر روشنی سرخ ہوگئی تو ڈرائیور کو فوراً بریک لگانا پڑا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ ٹیکسی رک گئی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور جھٹکا لگا اور ہم سب ہل کر رہ گئے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی میں سے جھانک کر پیچھے دیکھا اور پھر انگریزی میں موٹی موٹی گالیاں دیتا ہوا ٹیکسی سے باہر چلا گیا۔ خلاصہ یہ تھا کہ ان کم بختوں کو ڈھنگ سے اسکوٹر چلانا بھی نہیں آتا۔ وہ سخت غصے میں تھا۔ ہم لوگوں نے بھی کھڑکی اور پچھلے شیشے میں سے باہر جھانکا۔ ایک اسکوٹر ٹیکسی سے ٹکرانے کے بعد سڑک پر الٹا پڑا تھا۔ اسکوٹر سوار کے سر سے ہیلمٹ گر چکا تھا اور سنہری زلفیں رخِ زیبا پر بکھری ہوئی تھیں۔ یعنی یہ ایک خاتون تھیں۔ روم میں اسکوٹر پر سوار خواتین کافی تعداد میں نظر آتی ہیں۔

جس طرح غضب ناک ہو کر ٹیکسی ڈرائیور باہر نکلا تھا اس کے پیش نظر ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ بہت ڈانٹ ڈپٹ کرے گا اور ہوسکتا ہے ہاتھا پائی پر بھی اتر آئے لیکن ہم نے دیکھا کہ ایک خوبرو خاتون کو دیکھتے ہی اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ بہت ملائمت سے گفتگو کرنے لگا۔ جس طرح وہ خاتون کے شانوں کو چھو رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ یہ پوچھ رہا ہے کہ ''سنیورینا آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟''

اتنی دیر میں پولیس والا بھی کہیں سے آ ٹپکا۔ اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ غلطی یقیناً خاتون کی تھی جنہوں نے پیچھے سے آ کر ایک کھڑی ہوئی کار کو مار دیا تھا۔ یہ ٹریفک کے قوانین کے اعتبار سے بہت بڑا جرم ہے کہ کوئی پیچھے سے کسی کار یا سواری کو مار دے اور خصوصاً کھڑی ہوئی سواری کو جو کہ سگنل پر رک گئی ہو۔

پولیس والے نے دونوں سے کچھ باتیں کیں اور ٹکٹ کاٹنے کے لیے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

خان صاحب تماشا دیکھنے کے لیے فوراً اتر کر وہاں پہنچ گئے۔ بعد میں انہوں آ کر بتایا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے خاتون کے خلاف شکایت درج کرانے سے انکار کردیا۔ ٹیکسی کو برائے نام نقصان پہنچا تھا اور یہ معاملہ فریقین کی انشورنس کمپنیاں طے کرسکتی تھیں۔ اس باہمی معاہدے کے بعد پولیس والا رخصت ہوگیا۔ خاتون نے بہت محبت بھرے انداز میں ٹیکسی ڈرائیور کو گلے لگا کر پیار کیا اور سڑک پر گرا ہوا ہیلمٹ اٹھالیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً آگے بڑھ کر ان کا اسکوٹر اٹھایا اور اس کا بغور معائنہ کیا کہ کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ اس کے بعد انہوں نے اسکوٹر خاتون کے حوالے کردیا اور مسکراتے ہوئے ٹیکسی میں آ بیٹھے گئے۔ اشارہ سبز ہو چکا تھا اس لیے ٹیکسی فوراً حرکت میں آ گئی۔

''باہر کیا ہوا؟'' ہم نے خان صاحب سے پوچھا۔

''یار یہ شخص تو لڑکی کو دیکھتے ہی بکری بن گیا۔ یہاں سے تو بہت غصے میں گیا تھا مگر رعبِ حسن کی وجہ سے سارا غصہ غائب ہوگیا۔''

ہم نے ٹیکسی ڈرائیور سے بہت معصومیت سے پوچھا ''سنیور، کیا معاملہ ہوا۔ آپ نے پولیس میں رپورٹ کردی؟''

وہ مسکرایا اور کندھے اچکا کر بولا ''سنیور۔ عورتیں تو پھولوں کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔ ویسے میرا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی پورا ہو جائے گا۔''

بٹ صاحب نے ناراض ہو کر ہمیں دیکھا اور بولے۔ ''دیکھا آپ نے یہ عورت کو دیکھ کر کیسے پگھل گیا؟''

ہم نے معصومیت سے کہا ''دیکھا۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ انہوں نے خود ہی طے کرلیا۔''

''یہ قوم کس قدر زن مرید ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو یہ یقیناً اس کا سر پھوڑ دیتا۔'' ہماری گفتگو اردو میں ہو رہی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور..... درمیان میں بول پڑا ''سنیور۔ لیڈی اسکوٹر ڈرائیورز روم کا بہت بڑا پرابلم ہیں مگر.....'' اس نے کندھے اچکائے اور پھر کہا ''پولیس بھی ان سے نرمی برتتی ہے۔ ہاں اگر کوئی خاتون پولیس آفیسر ہو تو بے چاری کی کم بختی آ جاتی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ان عورتوں کی آپس میں نہیں بنتی۔''

''لیجئے قصہ ختم۔''

ہوٹل پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور نے حساب لگا کر چرچ آمدورفت کا کرایہ منہا کردیا مگر ہم نے وہ بھی ادا کردیا۔

اس نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا۔ ''سنیور۔ کیا آپ کرسچن ہیں؟''

ہم نے جواب دیا ''نہیں ہم مسلم ہیں۔''

''اوہ!'' اس نے حیرت سے کہا اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

ہوٹل واپس آ کر ہم لوگوں نے ٹوسٹ۔ مکھن اور جیم سے پیٹ بھرا۔ چائے پی کر خوش ہوگئے۔ سارے یورپ میں سب سے زیادہ اچھی چائے ہم نے روم ہی میں پی ہے۔

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت روم میں غیر ملکی آبادکار بہت کم تھے۔ جو لوگ باہر سے آتے تھے وہ محض سیاحت کی خاطر آتے تھے اور پیسے خرچ کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ آج کا روم اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ دوسرے ملکوں سے بے شمار لوگ یہاں آ کر آباد ہوگئے ہیں۔ انہوں نے شہری حقوق بھی حاصل کرلیے ہیں۔ ایک دوست بتا رہے تھے کہ روم کے بڑے ریلوے اسٹیشن کے آس پاس ایک ''چائنا ٹاؤن'' آباد ہوگیا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں پہلی اور دوسری مرتبہ روم جا کر ہم بھی مقیم ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس وقت مرکزی شہر کی سترہ فیصد آبادی غیر اطالوی ہے جس کی وجہ سے نہ صرف مکانوں کے کرائے اور قیمتوں میں اضافہ ہوگیا ہے بلکہ نواحی آبادیوں میں بھی پرانی روایات باقی نہیں رہیں چونکہ وہاں روم سے نقلِ مکانی کرنے والے لوگ جا بسے ہیں۔

روم کے نواحی علاقے ہم نے بھی دیکھے ہیں۔ روم کے بیچوں بیچ دریائے ٹائبر بہتا ہے۔ اس کی دوسری جانب پرانے نواحی علاقے ہیں۔ ایک بار ہم وہاں سیر کے لیے گئے تھے۔ کیا خواب رونق تھی۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز سڑکوں پر لگنے والے ہفتہ وار بازاروں میں سستی مل جاتی تھی اس لیے یہاں کے بہت سے لوگوں نے کبھی روم دیکھا تک نہیں تھا۔ اب معلوم ہوا کہ یہاں غیر ملکیوں نے ڈیرے جما لیے ہیں۔ یورپین اور امریکن اپنے ساتھ اپنا کلچر بھی لے آئے ہیں۔ وہ پرانے ہفتہ وار بازار اب غائب ہو چکے ہیں۔ ان کی جگہ اسٹور بن گئے ہیں۔ پرانی دکانیں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ ہر چیز نئی ہے۔ طور طریقے بھی بدل چکے ہیں۔ اب بھی ہفتہ وار بازار لگتے تو ہیں مگر ان میں وہ پہلے جیسی رونق اور چہل پہل نہیں ہوتی۔ ان علاقوں میں امریکن یونیورسٹیاں بن گئی ہیں جو روم کے پرانے لوگ پسند نہیں کرتے۔ غیر ملکی نوجوان لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں ان پرانے شہروں اور قصبوں میں آزادانہ گھومتی پھرتی ہیں اور

ناچتی گاتی نظر آتی ہیں۔

روم والے ان بستیوں کو ''اصلی روم'' کہا کرتے تھے مگر اب وہ پرانا ماحول دیکھنے میں نہیں آتا۔ باہر سے آنے والے تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگوں نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔

ایک پرانے شہری نے ہمارے دوست سے آہ بھر کر کہا ''اب تو اصلی اور خاندانی روم والے یہاں نظر ہی نہیں آتے۔ پرانے لوگ یہاں سے رخصت ہوتے وقت اپنی روایات اور طرزِ زندگی بھی ساتھ لے گئے ہیں۔ ہر طرف سپر مارکیٹوں کا راج ہے چھوٹے دکان دار، ٹھیلے والے اور چلتی پھرتی دکانوں والے پرانے روم کی پہچان تھے۔ یہ لوگ سڑک کے کنارے ہر چیز سستی بیچا کرتے تھے۔ اب یہ دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔ سپر مارکیٹ جو بن گئی ہے۔ چھوٹے دکان دار کہتے ہیں کہ اب ان کے لیے کاروبار کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ہم نے پوچھا ''مگر روم کی پرانی عمارتیں، سڑکیں، بازار اور یادگاریں تو ابھی موجود ہیں۔''

''وہ سب اسی طرح ہیں۔ حکومت کی جانب سے کسی پرانی عمارت کو گرا کر نئی عمارت بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ حکومت کہتی ہے کہ یہ ہمارا ماضی ہے۔ اسے ہم کیسے بدل دیں؟''

کاش یہ تصور ہمارے حکمرانوں اور افسر شاہی میں بھی پیدا ہو جائے جو پرانی یادگار عمارتوں کو گرا کر پلازا تعمیر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس طرح خریدنے والے بھی کماتے ہیں اور ان کی جیب بھی گرم ہوتی ہے۔

ہمیں پرانا روم یاد آ گیا جہاں نواحی علاقوں میں قصابوں کے علاوہ ہر سامان کی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بیکریاں تھیں۔ قہوہ خانے تھے۔ سبزی فروش تھے۔ جو اپنی دکانیں سجا کر بیٹھ جاتے تھے اور گاہکوں کا مسکرا کر استقبال کرتے تھے۔ سنا ہے کہ اب وہ باتیں خواب وخیال ہو گئی ہیں۔

ساری دنیا اتنی تیزی سے بدل رہی ہے تو پھر روم کیسے نہ بدلے گا۔ ایک نہ ایک دن روم کو بھی بدلنا ہوگا۔ روم کے پرانے رہنے والوں کے لیے وہ ماتم کا دن ہوگا۔

سوچتے ہیں کہ روم کتنا ہی بدل جائے ہمیں کیا۔ جب خان صاحب اور بٹ صاحب ہی نہ رہے تو روم کی سیر کا کیا لطف؟

روم میں گھومنے پھرنے کا پروگرام مکمل ہو چکا تھا۔ بہت کچھ پہلے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا اس بار دیکھا۔ بٹ صاحب کو روم کے کھانوں میں سادہ چاول اور اس کے ساتھ شوربے والی مرغی بہت پسند ہے۔ یوں تو وہ حرام وحلال کے بہت قائل ہیں لیکن روم کے چاول اور سالن انہیں اس قدر پسند ہے کہ وہ اس بارے میں سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

''بٹ صاحب۔'' خان صاحب نے کہا ''آپ جانتے ہیں کہ یہ مرغی حلال نہیں ہے چونکہ اسے ذبح کرتے وقت کلمہ نہیں پڑھا گیا تھا۔''

''بھائی۔ یہاں ذبح کرنے کا رواج نہیں ہے۔ مشین سے گردن کاٹ دیتے ہیں۔''

''مگر پھر بھی کلمہ پڑھنا ضروری ہے نا، ورنہ یہاں کے دوسرے کھانے بھی کھائے جا سکتے ہیں۔''

آخر کار بٹ صاحب تنگ کر بولے ''یار سنو، بات یہ ہے کہ چاول ہم کشمیریوں کی کمزوری ہے۔ ان کے بغیر ہماری زندگی ادھوری ہوتی ہے۔ میں نے خود باورچی خانے میں جا کر دیکھا ہے۔ وہاں کوئی حرام چیز نہیں پک رہی تھی۔''

خان صاحب نے کہا ''آپ کا مطلب ہے کہ یہاں سور پکانے کے لیے کچن الگ ہوتے ہیں؟''

''ہوتے ہوں گے۔'' بٹ صاحب بولے ''مگر جس ریستوران میں ہم چاول کھاتے ہیں وہاں ہرگز کوئی حرام چیز نہیں پکائی جاتی۔ میں نے پکانے والی عورتوں سے اچھی طرح تصدیق کر لی ہے۔''

خان صاحب نے کہا ''پھر تو گویا ایک ٹکٹ میں دو مزے۔ آپ پکانے والی عورتوں سے بھی مل لیے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' بٹ صاحب بوکھلا گئے ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ایمان سے۔ اور پھر وہ تو بہت موٹی موٹی عورتیں ہیں۔''

ہم نے کہا ''خان صاحب، اللہ تعالیٰ بھی انسانوں کے گناہ بخش دیتا ہے۔ چھوڑیے جانے دیجیے۔ چاول کھانا ان کی کمزوری ہے۔''

بٹ صاحب اتنے خوش ہوئے کہ ہمارے گلے لگ گئے۔ کہنے لگے ''اگر مجھے کوئی سمجھا ہے تو آپ سمجھے ہیں۔ خان صاحب بھی بہت پرانے دوست ہیں مگر یہ مجھے آج تک سمجھ نہیں سکے۔''

خان صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے۔

اسی شام انہوں نے معذرت کے بعد یہ اجازت طلب کی کہ وہ آج کچھ دیر تک ہمارا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ ''آپ دونوں کو جہاں بھی جانا ہے ہو آئیں۔ میں اپنے کمرے میں ہی رہوں گا۔''

داستان شیطان

ابلیس تمام فرشتوں کا سردار تھا۔ آسمانِ دنیا میں ابلیس نے ایک ہزار سال تک اللہ کی عبادت کی تو اس کا نام عابد ہوا۔ دوسرے آسمان میں ایک ہزار سال تک عبادت کی تو زاہد بنا پھر تیسرے آسمان میں عارف، چوتھے میں ولی، پانچویں میں تقی، چھٹے میں خاشع اور ساتویں میں عزازیل نام ہوا مگر لوحِ محفوظ پر اس کا نام ابلیس تھا اور وہ اپنے انجام سے بے خبر تھا۔ جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو سب فرشتوں نے کیا مگر اس نے نہ کیا اور اپنے آپ کو بڑا خیال کیا اور نفرت وتکبر کے ساتھ آدم علیہ السلام کی جانب پشت کر لی اور اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ آخر کار فرشتوں نے ایک مدت تک سجدہ کیے رکھا جب انہوں نے سر اٹھایا تو دیکھا کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا اور انہیں سجدہ کی توفیق مل گئی تو فرشتوں نے دوبارہ سجدۂ شکر ادا کیا۔ یہ بدبخت اکڑا، ان سے منہ پھیرے کھڑا تھا۔ نہ ہی اطاعت کی طرف دھیان دیا اور نہ ہی نافرمانی پر ندامت ہوا۔ تو اب اللہ تعالیٰ نے اسے چوپائے کی شکل دے دی اور خنزیر کی طرح کر دیا۔ اس کا سر اور سینہ بندر جیسا کر دیا۔ درمیان کا چہرہ بندر کی طرح ہو گیا اور آنکھیں لمبوتری، پھٹی پھٹی نظر آتی تھیں۔ اس کے نتھنے کھلے بنا دیے، اس کے ہونٹ بیل کے ہونٹوں کی طرح اور اس کی داڑھی خنزیر کے دانتوں کی طرح باہر کو نکلی ہوئی کر دی پھر داڑھی میں سات بال رکھ دیے اور اسے جنت سے اس طرح نکال دیا بلکہ آسمان اور آبادز مین سے دور کر کے ویرانوں کی طرف بھگا دیا اور قیامت تک لعنت و پھٹکار کر دی۔ وہ ملعون اور کافر ہو چکا۔ یہ حالت جب حضرت جبرائیلؑ ومیکائیلؑ نے دیکھی تو وہ رو پڑے۔ (باوجود قدرت کے کہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے) اللہ کی طرف سے یہ جواب آیا گیا ''کیوں روتے ہو؟'' کہنے لگے۔ ''ہم تیری طرف سے لعنت وبدبختی آجانے پر اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کرتے۔'' ''ارشاد ہوا'' ایسے ہی رہو اور میری طرف سے بے فکری اختیار نہ کرو۔'' اب ابلیس نے آواز دی کہ ''اے اللہ تو نے آدمؑ کی وجہ سے مجھے جنت سے نکال دیا۔ اب مجھے ان پر مسلط کر ارشاد ہوا'' تو مسلط ہے اس کی اولاد پر سوائے انبیاء کے'' ابلیس بولا'' اور تسلط دیجیے۔'' ارشاد ہوا'' ان کے ہاں ایک بچہ ہوگا تو تیرے دو بچے ہوں گے۔'' بولا'' اور تسلط دیجیے'' فرمایا'' ان کے سینے میرا مسکن ہوں گے تو خون کی طرح بدن میں پھرے گا۔'' ابلیس نے کہا'' مزید دیجیے'' ارشاد ہوا'' تو ان پر اپنے پیادوں، چیلوں اور سواروں کے ساتھ ہو جایا کرے گا اور انہیں، ہر غلط حرام اور بدعمل پر آمادہ کرتا رہے گا۔''

اب آدم علیہ السلام نے عرض کیا'' یا اللہ تو نے ابلیس کو میری اولاد پر مسلط کر دیا۔ اب تیری مدد کے بغیر اس سے کیسے بچا جائے۔'' ارشاد ہوا'' تیرے ہاں جو بچہ ہوگا، اس کے ساتھ محافظ فرشتہ بھی ہوگا۔'' عرض کیا مزید عطا کیجیے'' ارشاد ہوا'' جب تک بنی آدم کی ارواح بدن میں ہوں گی توبہ کا دروازہ ان پر بند نہیں ہوگا۔'' عرض کیا'' اور عطا کیجیے۔'' ارشاد ہوا'' میں انہیں معاف کرتا رہوں گا جتنا جس قدر گناہ ہوں۔''

حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا'' یا اللہ اب کافی ہے۔''

امام غزالیؒ کی کتاب ''مکاشفۃ القلوب'' سے حکایت
مرسلہ: قیصر شاہ، کمبٹ، کوہاٹ

''وہ کیوں۔ کوئی مراقبہ کریں گے؟''

''نہیں بھائی، بس ہے کوئی بات؟'' وہ کچھ شرما گئے۔

ہم نے کہا ''تو پھر ہم بھی باہر نہیں جاتے۔ آپ کے پاس بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔''

''نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔'' وہ گھبرا گئے۔

''آخر بات کیا ہے۔ تم بتاتے کیوں نہیں؟'' ہم نے پوچھا۔

قدرے شرما کر بولے ''آج مس امیلدا سے میرا ٹائم ہے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔'' بٹ صاحب اچھل پڑے۔ ''یہ کیا بے ہودگی اور آوارگی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یعنی اب آپ ایسی گری ہوئی حرکتوں پر اتر آئے ہیں۔ بے غیرتی اور بے شرمی کی انتہا ہے۔ میں لاہور جا کر بھابی کو بتاؤں گا۔''

''ارے نہیں یار۔ یہ بات نہیں ہے۔ قسم لے لو۔ اللہ پاک کی قسم۔''

''یہ قسمیں کھا رہا ہے۔'' بٹ صاحب نے مشکوک انداز میں کہا ''یقیناً کوئی گڑبڑ ہے۔''

"یار کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ دراصل امیلدا سے میں نے ہاتھ دیکھنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"یعنی دہرا گناہ۔ غیر محرم سے اکیلے میں ملاقات اور پھر جھوٹ۔"

ہم نے کہا "بٹ جی، شکر کرو کہ یہ ہوٹل ہی میں رہیں گے۔ ورنہ یہ تو باہر بھی چلے جاتے تھے۔ وہاں نہ جانے کیا گل کھلاتے ہوں گے۔"

بٹ صاحب نے آخری فیصلہ سنا دیا "دیکھئے خان صاحب، آپ ایک شرط پر لڑکی سے کمرے میں ملاقات کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیا ہے؟"

"آپ اپنے کمرے کے دروازے کھلے رکھیں گے۔"

"منظور ہے۔" خان صاحب فوراً آمادہ ہو گئے۔

ہم بٹ صاحب کے ساتھ مٹرگشت کو چلے گئے۔ واپسی پر خان صاحب بہت خوش تھے۔ کہنے لگے "بہت اچھی اور ضرورت مند خاتون ہے۔"

"کیا مطلب۔ ضرورت مند؟"

"ہاں یار، چار بوائے فرینڈ اور تین شوہر اس سے بے وفائی کر چکے ہیں۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تنہا رہ گئی ہے۔"

بٹ صاحب بولے "تو پھر آپ پیش کش کر دیجئے۔ بیاہ کر پاکستان لے چلئے۔ پہلے کلمے پڑھوایئے پھر نکاح کے دو بول۔ ہم دو گواہ تو موجود ہیں ہی۔"

"بکواس مت کرو۔ میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔ وہ پھر یہیں کوئی بندوبست کر لے گی۔ ان لوگوں کا یہی طرز زندگی ہے۔ خیر۔ میں نے اس کو بہت اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔"

"یعنی جھوٹی پیش گوئیاں؟" بٹ صاحب نے اعتراض کیا۔

"یار کیا ہرج ہے۔ خوش رہے گی بے چاری۔ شاید کوئی بات پوری ہو جائے تو مجھے دعا دے گی۔"

تیسرے دن ہماری روانگی تھی۔

بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ کل ہم لوگ "حوض" پر ضرور چلیں گے۔

"کون سے حوض پر؟" خان صاحب نے کہا "بھائی یہاں مسجدیں اور حوض نہیں ہوتے۔ وضو کرنا ہے تو باتھ روم ہی میں کر لو۔"

"ارے نہیں، میں اس حوض کی بات کر رہا ہوں جس میں لوگ سکّے پھینکتے ہیں اور ان کی تین دعائیں قبول جاتی ہیں۔"

"بٹ!" خان صاحب گرجے۔ "تم مشرک ہو گئے ہو۔ وہ حوض ہے کہ نعوذ باللہ خدا؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟" خان صاحب کو جوابی حملے کا موقع مل گیا تھا۔

بٹ صاحب ہنسنے لگے۔ فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ "یار میں تو یوں ہی دل لگی کے لیے کہہ رہا تھا۔ وہاں کا ماحول بہت اچھا ہے۔"

"خاک اچھا ہے۔ پرانے لاہور کی طرح گلیاں اور مکان۔ بھینسوں کے گھوڑوں کی لید کی بدبو۔ وہ بھی کوئی جانے کی جگہ ہے؟"

ہم نے کہا "خان صاحب، ایسا تو نہ کہیے۔ وہ روم کے کلچر کی علامت ہے۔ ان کا مطلب فاؤنٹین دی تری ویدی سے ہے۔ اور پھر وہاں سیاحوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوتے ہیں۔ آپ کو بھی اچھا موقع مل جائے گا۔"

خان صاحب فوراً رضامند ہو گئے۔

اگلے روز ہم ٹیکسی میں اور پھر پیدل اس فاؤنٹین پر گئے۔ گلیاں اور گھوڑوں کی لید کی بدبو بھی تھی مگر خوب رونق تھی۔ خواتین کا ہجوم تھا جن کا لباس انتہائی قابلِ اعتراض اور باعثِ لاحول تھا۔ مشہور ہے کہ اگر کوئی اس حوض میں سکّہ پھینکے تو وہ دوبارہ روم ضرور آتا ہے۔ خواہشات پوری ہوں یا نہ ہوں ہمیں علم نہیں ہے مگر ہمارا تجربہ تو یہی ہے کہ ہم نے جب بھی یہاں سکّہ پھینکا اگلی بار روم کی سیر ضرور کی۔

خان صاحب کو یہ اعتراض تھا کہ جب یہاں ہر شے بٹ صاحب کے نزدیک غیر شرعی ہے تو پھر یہ دوبارہ یہاں آنے کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟

اس کا بٹ صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سوچ سوچ کر بولے "دراصل اس پرانے شہر کو دیکھ کر مجھے پرانا لاہور یاد آ جاتا ہے۔ بس اگر تھوڑی صفائی ہو جائے، سیاحوں کی آمد ہونے لگے تو ہمارا پرانا لاہور بھی روم سے کم نہیں ہے۔"

"تو پھر تم پرانے لاہور کو ہی دیکھا کرو۔ بلاوجہ یہاں آ کر ایمان کیوں خراب کرتے ہو؟" خان صاحب بھلا کہاں باز آنے والے تھے۔

یہ ہمارا روم میں آخری دن تھا۔ اگلے روز صبح کی فلائٹ سے کراچی روانہ ہونا تھا۔ روم کو خیرباد کہہ کر ہم پاکستان روانہ ہو گئے جہاں کراچی ائرپورٹ پر کسٹم والوں کے ہاتھوں ایسی درگت بنی کہ روم یاد آ گیا۔

ترنگ

سیّد احتشام

غور کیا جائے تو ہر جرم کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ لیکن حالیہ برسوں میں تو لگتا ہے کہ بعض جرائم محض تفریحاً کئے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے جرائم کی بڑھتی ہوئی تعداد کو قانون نافذ یا اس پر عملدرآمد کرانے والے اداروں کی کوتاہی قرار دے دیا جاتا ہے مگر ترقی یافتہ ممالک میں ان "شوقیہ" جرائم کو کیا کہیں گے؟

چند نوجوانوں کا وقتی ہیجان کتنی زندگیاں تباہ کر گیا

وہ 4 جولائی 1981 کی ایک مہکتی شب تھی۔ 22 سالہ شعلہ جوالہ باربرا اور اس کا 32 سالہ منگیتر رونالڈ کنساس سٹی کے نظریکی پارک میں آتش بازی کے حیرت انگیز اور دلکش مظاہروں سے لطف اندوز ہو کر گھر لوٹتے ہوئے بے حد شادماں و فرحاں تھے۔ راستے میں رونالڈ نے اخبار خریدنے کی غرض سے کنساس سٹی کے جنوب میں واقع ایک دکان کے باہر کار روکی اور اتر کر اندر چلا گیا۔ باربرا کار میں بیٹھی رہی۔ کار کا انجن چل رہا تھا۔ اچانک باربرا نے دیکھا تین سیاہ فام ایک قریبی دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ ان کی باتیں سننے سے قاصر تھی تاہم وہ سمجھ گئی کہ وہ کس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے بازو سختی سے سینے پر باندھ لیے "کاش رون جلدی لوٹ آئے۔" وہ بڑبڑائی اور

بالکل اپنی سیدھ میں دیکھنے لگی۔

رونالڈ نے دکان کے کاؤنٹر پر چند سکے پھینکے اور اخبار اٹھا کر کار کی طرف لوٹنے لگا۔ اس نے ان تین سیاہ فاموں کو نہیں دیکھا تھا۔ پھر جونہی اس نے کار کا دروازہ کھولا خود کو گھرا ہوا پایا۔ ان میں سے ایک نے اس پر ریوالور تان لیا "چپ چاپ کار میں بیٹھ جاؤ" وہ غرایا۔

رونالڈ نے مزاحمت کرنا چاہی۔ ریوالور بدست نے ریوالور کی نال اس کے پہلو سے لگا دی "اگر تم نے ایک لفظ بھی نکالا تو شوٹ کر دوں گا" وہ سفاک لہجے میں بولا۔ اس کے ساتھی ہی اس نے رونالڈ کو عقبی سیٹ پر دھکیل دیا اور پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس نے اب بھی ریوالور رونالڈ پر تان رکھا تھا۔ اس کے بقیہ دو ساتھی اگلی سیٹ پر بار برا کے ساتھ بیٹھ گئے اور کار تیزی سے روانہ ہوگئی۔

"تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" رونالڈ لڑکھڑاتی زبان سے بولا "ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"خاموشی سے بیٹھے رہو۔" ریوالور بدست نے سرد لہجے میں جواب دیا "اور ہاں کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔"

رونالڈ بے بسی سے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ان کے اگلے اقدام کا انتظار کرنے لگا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند بلاک طے کرنے کے بعد انہوں نے کار ایک نیم تاریک سڑک پر روک دی اور رونالڈ سے اس کی دستی گھڑی اور انگوٹھی چھین لی۔ اس کے بعد اسے پستول کی نال پر کار سے اتارا اور اسے ڈگی میں بند کر کے ڈگی کا ڈھکن بند کر دیا۔ پھر ریوالور بدست نے بار برا کو اپنے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ بار برا نے حکم کی تعمیل کی اور کار ایک بار پھر روانہ ہوگئی۔ کچھ دور جانے کے بعد ریوالور بدست نے بار برا کو کپڑے اتارنے کو کہا۔

"خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔" بار برا گڑگڑائی۔

وہ سیاہ فام زور سے ہنسا اور پھر اس نے اپنا حکم دہرایا۔ بار برا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے پاس اس سیاہ فام کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اپنے بلاؤز کے بٹن کھولنے لگی۔

"جلدی کرو۔" سیاہ فام غرایا اور اس نے ریوالور کی نال بار برا کی کنپٹی سے لگا دی۔

کار تیزی سے رواں تھی اور بار برا کا ذہن اس سے کہیں تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد کار ایک جگہ رک گئی۔ وہ سیاہ فام پچھلی نشست سے اگلی نشست پر آ گیا "اب تمہاری باری ہے۔" اس نے ریوالور اپنے ایک ساتھی کو تھماتے ہوئے کہا۔

دوسرا سیاہ فام ریوالور تھام کر پچھلی نشست پر چلا گیا اور بار برا ایک بار پھر وہی عذاب جھیلنے لگی جو وہ چند منٹ پہلے سہہ چکی تھی۔ پھر تیسرا سیاہ فام پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ آخر میں انہوں نے کار کی ڈگی کھولی اور بار برا کو بھی رونالڈ کے ساتھ ہی ڈگی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ پھر وہ تینوں سیاہ فام کار کو پندرہ بیس منٹ تک بلا مقصد کنساس سٹی کے اردگرد بھگاتے رہے اور ڈگی میں بند حواس باختہ بار برا اور رونالڈ اپنی قسمت پر غور کرتے رہے۔

اچانک کار ایک جگہ رک گئی۔ ایک سیاہ فام اتر گیا۔ کار پھر روانہ ہوگئی۔

"اس سے پہلے کہ یہ درندے ہمیں ہلاک کر دیں، ہمیں فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔" رونالڈ نے سرگوشی کی اور متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پاس ہی ایک ٹائر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور اس کی مدد سے ڈگی کے ڈھکن کے ایک کونے پر قوت آزمائی کرنے لگا۔ ذرا سی کوشش سے ڈھکن اتنا کھل گیا کہ وہ نکل کر فرار ہو سکتے تھے۔ اس وقت کار کسی مئے خانے کے سامنے رک گئی اور ایک سیاہ فام اس سے اتر کر اندر چلا گیا۔

"میں جاتا ہوں اور مدد مانگتا ہوں۔" رونالڈ نے سرگوشی کی اور کسی نہ کسی طرح ڈگی سے نکل کر مشرق کی سمت بھاگنے لگا۔

معاً ڈرائیور کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے کار کو کسی چیتے کی مانند گھمایا اور بھاگتے ہوئے رونالڈ کا تعاقب کرنے لگا۔ رونالڈ زیادہ دور نہیں بھاگ سکا۔ ڈرائیور نے اسے جا لیا اور بدستور اسٹیئرنگ پر بیٹھے بیٹھے اپنے ریوالور سے اس کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو گولیاں اس کی پشت میں اتار دیں۔ رونالڈ لڑکھڑایا اور سڑک پر ڈھیر ہوگیا۔ قاتل نے کار موڑی اور اپنے ساتھی کو پک کرنے کے لیے واپس وہیں آ گیا۔ وہ ثانیے کے بعد اس کا ساتھی مئے خانے سے لوٹ آیا اور کار میں بیٹھ گیا۔

"مجھے اسے اڑانا پڑا۔" بار برا نے ڈرائیور کو اپنے ساتھی سے کہتے سنا۔ "وہ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ہمیں اس لڑکی کو بھی اڑانا پڑے گا۔" اس کے ساتھی نے کہا۔

بار برا کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوگئیں اور وہ سائیں سائیں کرنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد کار ایک بار

رکی۔ وہ دونوں سیاہ فام اتر کر ڈگی تک آئے اور کھلی ڈگی کے اندر جھانکا۔ بار برا ایک طرف سمٹی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ایک ریوالور بدست سیاہ فام نے برا اور راست بار برا کی آنکھوں میں جھانکا اور اس پر پے در پے فائر کر دیا۔ گولی بار برا کے چہرے پر لگی اور وہ منہ کے بل ڈھیر ہوگئی۔ دوسرے سیاہ فام نے تشفی کے انداز میں اپنا سر ہلایا "اسے پھر شوٹ کرو۔" وہ بولا "ممکن ہے یہ مری نہ ہو۔"

ریوالور بدست سیاہ فام نے ساکت پڑی ہوئی بار برا پر ایک نگاہ ڈالی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے ساتھی کے مشورے پر عمل کرتا اس کا ساتھی جلدی سے بول پڑا "ٹھیک ہے اب بھاگ چلو۔"

دونوں سڑک پر بھاگتے ہوئے تاریکی میں تحلیل ہوگئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بار برا کے ساکت جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ شدید کرب اور تکلیف کے باوجود کسی نہ کسی طرح رینگتی ہوئی ڈگی سے باہر نکل آئی اور بھاگتی ہوئی قریب ترین مکان تک پہنچی اور اس کا دروازہ پیٹنے لگی۔ لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ پڑوس کے مکان کا دروازہ پیٹنے لگی "بچاؤ، بچاؤ۔"

اس بار دروازہ کھل گیا۔ اس نے تیسرے مکان پر قسمت آزمائی کی۔ اس مرتبہ دروازہ کھل گیا۔ ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس کی نظر بار برا کے خون سے لتھڑے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے حواس پر قابو پا لیا اور جلدی سے بار برا کو سہارا دے کر اندر لے گئی۔ پھر اسے ایک صوفے پر لٹا کر پولیس کو فون کرنے لگی۔ ساتھ ہی اس نے ایمبولینس کو بھی فون کر دیا۔ ایمبولینس کا انتظار کرنے کے دوران بار برا نے اس خاتون کو بتایا کہ اس کے کپڑے اب تک کار میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ اس وقت بالکل برہنہ تھی "جب گولی میرے چہرے پر لگی تو میں نے اپنی سانس روک لی اور بالکل ساکت ہوگئی تاکہ حملہ آور یہ سمجھیں کہ میں مر چکی ہوں۔" وہ بولی۔

تھوڑی دیر میں ایمبولینس وہاں پہنچ گئی اور بار برا کو فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اسے فوری طبی امداد اور سرجری کے لیے ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ ریوالور کی گولی اس کے بائیں رخسار پر لگی تھی اور یہ یقیناً ایک معجزہ ہی تھا کہ وہ زندہ بچ گئی تھی۔

☆☆☆

"میں اور میرا بیٹا، ٹی وی پر ایک خوفناک فلم دیکھ رہے تھے" بار برا کی مدد کرنے والی خاتون نے پولیس کو بتایا۔ "اچانک دروازے پر دستک سنائی دی۔ پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ یہ فلم کا کوئی منظر ہوگا۔ پھر ہمیں کسی کی چیخ سنائی دی اور تب ہمیں احساس ہوا کہ دروازے پر کوئی تھا۔ جب میں نے جا کر دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک دہشت ناک اور روح فرسا منظر تھا۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ اس لڑکی کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ سرتاپا برہنہ تھی اور بری طرح کانپ رہی تھی اور شدتِ کرب سے بھیانک انداز میں چیخ رہی تھی۔ اس کے بائیں رخسار میں ایک سوراخ تھا۔"

اس سے صرف چند ہی منٹ پہلے کسی شہری نے گولیاں چلنے کی آواز سن کر اس علاقے میں پولیس طلب کر لی تھی۔ وہاں پولیس آفیسر کو سڑک پر رونالڈ خون میں لت پت پڑا ہوا ملا۔ اس کی سانس اب بھی چل رہی تھی لیکن وہ بری طرح زخمی تھا۔ اسے فوراً اسپتال بھیج دیا گیا لیکن وہاں پہنچ کر وہ ہوش میں آنے سے پہلے ہی چل بسا۔

جس شخص نے پولیس کو طلب کیا تھا اس نے پولیس کو بتایا کہ وہ ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ معاً اسے سفید فیس اور نیگرو میں ملبوس ایک شخص سڑک پر بھاگتا ہوا نظر آیا۔ ایک کار اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ پھر وہ کار اس شخص کے پہلو میں رکی۔ ڈرائیور کھڑکی سے باہر کی طرف جھکا اور اس نے بھاگنے والے شخص پر دو فائر کیے اور تیزی سے کار کو بھگا لے گیا۔ زخمی شخص لڑکھڑایا اور سڑک کے کنارے ڈھیر ہوگیا۔

"میں یہ دیکھنے کے لیے باہر بھاگا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ پھر میں بھاگتا ہوا واپس آیا تاکہ پولیس کو مطلع کر سکوں۔" اس شخص نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے

ماہ اپنا پسندیدہ ماہنامہ سرگزشت ڈائجسٹ بذریعہ رجسٹرڈ ہوائی ڈاک گھر بیٹھے حاصل کیجئے

ہوائی ڈاک سے زرسالانہ مع ڈاک خرچ

ان ملک کے لئے	450 روپے
ایشیا، یورپ اور افریقا کے لئے	2000 روپے
ریلیا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے لئے	2500 روپے

بیرون ملک کے قارئین کے ڈرافٹ یا انٹرنیشنل منی آرڈر کراچی میں واقع کسی بینک میں قابل ادائی ہونا ضروری ہیں۔ بصورت دیگر بینک کمیشن کی رقم بھی ارسال فرمائیں جو دس ڈالر تک ہو سکتی ہے۔

FOR BANK TRANSFER :
JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS, A/C No. 400094-78 HABIB BANK LTD., MANSFIELD STREET BRANCH, KARACHI, PAKISTAN.

کہا ''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کار کا ڈرائیور جس نے اس شخص کو گولی ماری تھی سیاہ فام تھا جب کہ وہ کار سفید اور نیلے رنگ کی بیوک تھی۔

''جب تم مدد کرنے کے لیے زخمی کے پاس گئے تو کیا اس نے کچھ کہا؟'' سراغ رساں طمر نے استفسار کیا۔

اس شخص نے نفی میں سر ہلایا ''وہ مشکل سے سانس لے رہا تھا۔'' وہ بولا ''وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھا۔''

ہاربرا نے اسپتال جاتے ہوئے پولیس آفیسر کو اتنی معلومات فراہم کردی تھیں کہ وہ اس امر کی تصدیق کرنے کے اہل ہوگئے کہ وہ زخمی اس کا منگیتر رونالڈ تھا۔ وہ افسران اس دکان پر پہنچ گئے جہاں سے رونالڈ نے اخبار خریدا تھا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے وہاں انہیں کوئی ایسا شخص مل جائے جو ان لوگوں کو جانتا ہو جنہوں نے اس جوڑے کو اغوا کیا تھا لیکن بدقسمتی سے دکاندار نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس واقعہ سے بھی بے خبر تھا کہ اس کے اسٹور کے عین سامنے اغوا کی وارادت ہوگئی تھی۔ لیبارٹری کے عملے نے فنگر پرنٹس حاصل کرنے کے لیے وہ بیوک اپنے قبضے میں لے لی۔

''سرجری سے ہی صحت یاب ہونے کے بعد ہمیں اس نوجوان لڑکی سے مزید معلومات حاصل ہونے کی امید ہے۔'' سراغ رساں طمر نے کہا ''اس وقت تو ہم خدا کے شکر گزار ہیں کہ وہ زندہ ہے۔ وہ موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔''

اس مجنونانہ اور بہیمانہ وارادت کے سلسلے میں پولیس افسروں نے مقتول رونالڈ کے کئی دوستوں اور شناساؤں سے پوچھ گچھ کی اور یہ دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ رونالڈ کے بارے میں ان کے خیالات نہایت عمدہ تھے۔ اس کی بے وقت جوانی کی موت پر ہر شخص افسردہ تھا۔ رونالڈ اپنے پیچھے بے شمار دوست اور غمگسار چھوڑ گیا تھا وہ ایک ہر دلعزیز نوجوان تھا۔ وہ 1980 سے ایک کمپنی میں سیلز منیجر کی حیثیت سے کام کررہا تھا اور کمپنی کا مالک اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھا۔

''وہ ہماری سیلز بڑھانے میں واقعی بہت دلچسپی لیتا تھا۔'' اس نے پولیس آفیسر کے ایک سوال کے جواب میں کہا ''وہ نہایت فرض شناس اور ذمے دار نوجوان تھا۔''

''مس ہاربرا کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' پولیس آفیسر نے سوال کیا۔

''آپ نے اتنی پیاری لڑکی شاید کبھی نہ دیکھی ہو۔'' کمپنی کے مالک نے جواب دیا ''ان کی جوڑی بہت بھلی لگتی تھی۔ دونوں مل کر سب کو ہنساتے رہتے تھے۔''

☆☆☆

اگلے روز ہاربرا' سراغ رسانوں کو اس لرزہ خیز واقعے کی مزید تفصیل بتانے کے قابل ہوگئی۔ اس کی حالت حیرت انگیز طور پر بہتر تھی۔ سراغ رسانوں نے اسے بتایا کہ اس کا منگیتر رونالڈ ہلاک ہوچکا ہے۔ وہ یہ سن کر سراسیمہ ہوگئی۔ پھر اس نے سراغ رساں کو بتایا کہ حملہ آور اس کے نیکلس اور آویزے کے علاوہ رونالڈ کی دستی گھڑی اور انگوٹھی بھی لے گئے تھے۔ انہیں مزاحمت کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں ملا تھا۔ کیونکہ حملہ آور برابر ان پر ریوالور تانے رہے تھے۔

''اگرچہ میں بے حد خوف زدہ تھی پھر بھی میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ وہ بیس سال سے زیادہ عمر کے نہیں تھے۔'' وہ اپنا بیان دیتی ہوئی مزید بولی ''مجھے یقین ہے کہ اگر میں انہیں دوبارہ دیکھوں تو پہچان لوں گی۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر گویا ہوئی ''میں جانتی تھی کہ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے میں نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ کیونکہ اس لڑکی کو بھی ہلاک کرنا پڑے گا۔ پھر جب انہوں نے میرے ڈریس کے کھلے ڈھکن سے اندر جھانکا تو میں سمجھ گئی کہ میرا وقت پورا ہوچکا ہے۔ اس ریوالور بدست سیاہ فام نے تقریباً ایک فٹ کے فاصلے سے میرے چہرے پر فائر کردیا۔ میں منہ کے بل گر گئی لیکن تکلیف کی شدت کے باوجود میں نے اپنے حواس پر قابو رکھا اور ان پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں مرچکی ہوں میں بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میں نے اپنی سانس بھی روک لی تھی تب ہی وہ مجھے مردہ سمجھ کر بھاگ گئے۔''

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ یہ جوڑا غلط وقت پر غلط جگہ پہنچ گیا تھا۔ اغوا کی وہ وارادت محض ترنگ میں آکر کی گئی تھی۔ تین سیاہ فام جن کے پاس ایک ریوالور تھا' ایک نہایت حسین اور پرکشش لڑکی کو دیکھ کر ترنگ میں آگئے تھے اور اس کے نتیجے میں لڑکی کے منگیتر کو ہلاک کرنے کے علاوہ لڑکی کی آبروریزی کے مرتکب ہوئے تھے اسے مرتا ہوا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ یہ ہر پہلو سے ایک بلاجواز اور بے معنی وارادت تھی۔ ہاربرا کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ مجرموں کو شناخت کرلے گی' سراغ رساں بے حد پُرامید نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

وہ 7 جولائی 1981 کی رات تھی۔ اس وقت ایک بج کر پینتالیس منٹ ہوئے تھے۔ کنساس سٹی کے مشرق میں واقع ایک ہوٹل میں ایک عورت محوِ خواب تھی۔ اچانک دستک کی آواز سن کر جاگ گئی ''کون ہے؟'' اس نے پکار کر پوچھا۔

''منیجر۔'' باہر سے ایک مردانہ آواز آئی۔

عورت نے جلدی سے نائٹ گاؤن پہنا اور جاکر دروازے کو تقریباً ایک انچ کھولا ہی تھا کہ اچانک اس نے خود کو ایک سیاہ ریوالور کی نال کو گھورتے ہوئے پایا۔ وہ ریوالور ایک سیاہ فام کے ہاتھ میں تھا ''دروازہ کھولو اور خاموش رہو۔'' ریوالور بدست نے کہا ''آواز نکالنے کی کوشش مت کرنا۔''

اس کے ساتھ ہی اس کے دو اور ساتھی کمرے میں گھس آئے۔ ریوالور بدست کی نظریں بستر پر خوابیدہ مرد پر پڑیں اور وہ خاتون کی طرف متوجہ ہوا ''خاموش رہو..... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' اس نے ایک بار پھر خاتون کو خبردار کیا ''بس چپ چاپ کھڑی رہو۔''

خاتون کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ایک گوشے میں کھڑی رہی جب کہ وہ تینوں کمرے میں تباہی پھیلاتے رہے۔ انہوں نے خاتون کا نیکلس چھین لیا جو پہنے ہوئے تھی اور اس کی دستی گھڑی بھی لے لی۔ ایسے میں وہ خوابیدہ مرد پر تلوار کھنچے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کے سامان کی تلاشی لی اور باتھ روم میں ٹنگی ہوئی مرد کی جینز میں سے رقم نکال لی۔ اگرچہ وہ نیند میں بڑبڑایا اور اس نے کروٹ بھی لی لیکن جاگا نہیں بلکہ بدستور سوتا رہا۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہوا۔ ان لوگوں نے ان کا پورا بٹوا لی وی اٹھایا اور رخصت ہوگئے۔

جب خاتون کو یقین ہوگیا کہ وہ لوگ جاچکے ہیں تو اس نے ہوٹل کے آفس میں فون کرکے ڈکیتی کی اطلاع دے دی۔ اس کے کچھ ہی دیر کے بعد پولیس جائے وارادت پر پہنچ گئی اور خاتون سے وارادت کی تفصیل پوچھنے لگی۔

''وہ تین تھے۔'' خاتون نے کہا ''ان میں سے دو نوعمر تھے۔ ان کی عمریں بیس سال کے آس پاس ہوں گی جب کہ تیسرا ان سے کچھ بڑا تھا۔ چھبیس' ستائیس سال کا رہا ہوگا۔ وہ کچھ بولا نہیں بس دروازے پر کھڑا رہا جب کہ وہ دونوں نوعمر لوٹ مار کرتے رہے۔

☆☆☆

اسی رات تقریباً ڈھائی بجے مرکزی سڑک پر کھڑی ہوئی ایک کار کو چیک کرنے کے لیے گشتی کار کے عملے کو بھیجا گیا۔ کار میں کوئی نہیں تھا۔ ایک پولیس آفیسر نے ٹارچ کی روشنی میں اس کے اندر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر صرف ایک پورنیبل..... (ٹی وی) رکھا ہوا نظر آیا۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس آفیسر نے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو اس کی رپورٹ کردی اور اپنے گشت پر روانہ ہوگیا۔ چند ہی منٹ کے بعد انہیں وائرلیس سے یہ اطلاع موصول ہوئی کہ نصف گھنٹا پہلے ایک ہوٹل میں ڈکیتی کی وارادت ہوئی ہے اور ڈاکو وہاں سے ایک ٹی وی لے گئے ہیں لہٰذا وہ فوراً وہاں واپس جائیں اور اس کار کی نگرانی کریں۔ یہ اطلاع موصول ہوتے ہی گشتی پولیس آفیسر نے اپنی کار موڑی لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو وہ کار جاچکی تھی۔

لیکن اس کے چند ہی منٹ کے بعد ایک دوسرے پولیس آفیسر کو جو گشت پر تھا' 1971 کی وہی فورڈ کار نظر آگئی۔ اس نے اسے روک لیا۔ اس کار میں تین سیاہ فام تھے اور وہ پورنیبل ٹی وی بدستور پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔ پولیس آفیسر نے اپنا ریوالور نکال لیا ''چلو اترو۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

تینوں خاموشی سے اتر گئے۔ آفیسر نے انہیں اپنی وین میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے چوں وچرا اس کی وین میں جا بیٹھے۔ پولیس آفیسر نے وائرلیس کے ذریعہ سراغ رساں لیری ولیم سے رابطہ قائم کیا اور چند ہی منٹ کے بعد سراغ رساں لیری ولیم اس خاتون کے ہمراہ اس جگہ پہنچ گیا۔ انہوں نے خاتون کو وہ پورنیبل ٹی وی دکھایا تو وہ اسے پہلی ہی نگاہ میں پہچان گئی ''ہاں یہ میرا ٹی وی ہے۔'' وہ بولی ''اور یہ وہی لڑکے ہیں۔''

پولیس نے ان سیاہ فام لڑکوں کی تلاشی لی اور ان کے قبضے سے خاتون کا نیکلس اور دستی گھڑی بھی برآمد ہوگئی۔ انہیں پولیس اسٹیشن لے جایا گیا جہاں وہ رابرٹ' برینڈن اور ولیم کی حیثیت سے شناخت کرلیے گئے۔ رابرٹ بائیس سال کا تھا' برینڈن انیس سال کا اور ولیم کی عمر ستائیس سال تھی۔ رابرٹ نے پولیس حکام کو بتایا کہ وہ یو ایس آرمی میں تھا اور چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔

''یہ فورڈ کار کس کی ہے؟'' پولیس حکام نے پوچھا۔

''یہ میرے انکل کی ہے۔'' اس نے جواب دیا ''جب میں چھٹیوں پر گھر آتا ہوں تو انکل مجھے اپنی کار استعمال کرنے کے لیے دے دیتے ہیں۔''

''اور اس ٹی وی سیٹ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''وہ میری ایک گرل فرینڈ کا تھا۔'' اس نے جواب دیا ''میں اور میرے دوست کسی پیڑول پمپ کی تلاش میں تھے کہ ہمیں روک لیا گیا۔''

اس کے ساتھیوں نے ڈکیتی کی وارادت کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کردیا ''ہم صرف سیر و تفریح کررہے تھے۔'' ولیم زور دے کر بولا۔

لیکن حکام نے انہیں ڈکیتی کے الزام میں بند کردیا۔ اگلے روز برینڈن کی گرل فرینڈ اس کی ذاتی چیزیں سمیٹنے

ہیڈ کوارٹرز آئی جو گرفتاری کے وقت برینڈن سے لے لی گئی تھیں لڑکی خاص طور سے دستی گھڑی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ برینڈن نے اسے اپنی چیزیں لے جانے کا اختیار دے دیا تھا۔ لیکن سراغ رساں ملر اس دستی گھڑی کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے باربرا نے مقتول رونالڈ سے چھینی جانے والی دستی گھڑی کے بارے میں بتایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ وہی گھڑی تھی۔

''تم بعد میں آ کر یہ گھڑی لے جانا۔'' اس نے لڑکی سے کہا۔

لڑکی چلی گئی۔ ملر وہ گھڑی لے کر اسپتال پہنچا اور اس نے وہ گھڑی باربرا کو دکھائی ''ہاں یہ بلاشبہ رونالڈ کی گھڑی ہے۔'' باربرا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر بولی۔ تب سراغ رساں ملر نے اسے چند تصویریں دکھائیں ''انہیں پہچانتی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

باربرا نے تصویریں اٹھائیں اور ان کا بغور جائزہ لینے لگی۔ پھر اس نے برینڈن اور رابرٹ کو پہچان لیا ''یہ وہی دو لڑکے ہیں جنہوں نے میری آبروریزی کی تھی۔'' وہ بولی پھر اس نے رابرٹ کی تصویر کی طرف اشارہ کیا ''یہ لڑکا رابرٹ..... اسی نے میرے چہرے پر گولی ماری تھی۔''

''کیا تم یقین سے کہہ رہی ہو؟'' ملر نے پوچھا۔

''میں کیسے بھول سکتی ہوں؟'' اس نے شانے اچکا کر جواب دیا ''لیکن ان تصویروں میں اس تیسرے لڑکے کی تصویر شامل نہیں ہے جس نے میری آبروریزی کی تھی۔'' وہ بولی ''مجھے اس کا بھی یقین ہے۔''

☆☆☆

''ہم اغوا کی کسی بھی واردات میں ملوث نہیں ہیں۔'' رابرٹ اور برینڈن نے پوچھ گچھ کے دوران کہا۔

''تم نے 4 جولائی کی رات کہاں گزاری تھی؟'' حکام نے برینڈن سے پوچھا۔

''میں نے وہ رات ایک بار بی کیو میں اپنے دوستوں اور گرل فرینڈ کے ساتھ گزاری تھی جو سینٹ لوئس سے میرے ہمراہ چھٹیاں گزارنے آئی ہوئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''میرے پاس کوئی ریوالور نہیں ہے۔ میں رونالڈ کے قتل اور باربرا کے زخمی ہونے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

اس موقع پر اس کی گرل فرینڈ کو اس کے بیان کی تصدیق کرنے کے لیے طلب کر لیا گیا ''ہم رات دس بجے تک ساتھ تھے۔'' وہ بولی ''پھر میں جا کر سو گئی۔ برینڈن نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہا ہے۔ میں صبح سو کر اٹھی تو برینڈن وہاں موجود تھا۔ لیکن مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ وہ رات میں کس وقت گھر لوٹا تھا۔''

اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک حد تک تو برینڈن کے بیان کی تصدیق کر سکتی تھی لیکن موقع واردات سے اس کی عدم موجودگی کی شہادت دینے سے گزار رہی تھی۔ سراغ رسانوں کو پورا یقین تھا کہ باربرا نے ان کی شناخت میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ لیکن اس نے جس تیسرے شخص کا ذکر کیا تھا اس کا کوئی پتا نہیں تھا۔ پھر یہ کہ سراغ رساں ان حملہ آوروں پر الزام عائد کیے جانے سے پہلے واردات کی تائیدی شہادتیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

اسی روز سراغ رساں ملر کو بتایا گیا کہ ولیم ہوٹل میں ہونے والی ڈکیتی کی واردات کے متعلق اس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا اور یہ کہ اس کے پاس دیگر معلومات بھی تھیں۔ جو وہ فراہم کرنا چاہتا تھا چنانچہ سراغ رساں ملر اس سے ملا۔

''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جب رونالڈ کا قتل ہوا اور جب باربرا کی عصمت دری کی گئی تھی میں وہاں موجود نہیں تھا۔'' اس نے اصرار کیا ''لیکن میں بتا سکتا ہوں کہ یہ کس کی کارگزاری تھی۔ اس واردات میں رابرٹ اور برینڈن شامل تھے اور تیسرا فرد انیس سالہ اینتھونی ڈیرنگٹن تھا۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر گویا ہوا ''جس رات ہوٹل میں ڈکیتی کی واردات ہوئی اس رات میں برینڈن اور رابرٹ کے ہمراہ تھا۔ ڈکیتی کرنے کے بعد ادھر ادھر کے سیر سپاٹے کرنے کے دوران رابرٹ 4 جولائی کی رات کا ذکر کرنے لگا۔ جب میں نے پوچھا کہ وہ کس کی باتیں کر رہا ہے تو برینڈن نے مجھے بتایا کہ اس رات اس نے رابرٹ نے اینتھونی نے ایک اسٹور کے باہر ایک نہایت حسین اور خوش اندام لڑکی دیکھی تھی جو ایک مرد کے ساتھ تھی۔ جب وہ مرد کار سے کار کی طرف لوٹنے لگا تو انہوں نے اسے گھیر لیا۔ برینڈن نے بتایا کہ اس موقع پر اس کے پاس ایک ریوالور تھا۔ اس نے ریوالور کی نال پر اس مرد کو کار کی ڈگی میں بند کر دیا۔ پھر وہ ایک پارک میں گئے جہاں انہوں نے باری باری اس لڑکی کی جبری عصمت دری کی۔ برینڈن نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا پہلے وہ گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برینڈن مجھے اپنی کارگزاری سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہی مزے لے لے کر سناتا رہا۔ لڑکی نے اس کی منتیں کی تھیں کہ وہ اسے یا اس کے منگیتر کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ بعد میں انہوں نے لڑکی کو بھی مرد کے ساتھ کار کی ڈگی میں بند کر دیا۔''

اتنا بیان کر کے ولیم سانس لینے کو رکا اور پھر گویا ہوا ''برینڈن نے مجھے بتایا کہ جب مرد نے ڈگی کھول کر فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے اس کو ہلاک کرنا پڑا۔ یہ سب کچھ سن کر میں نے اس سے کہا کہ وہ وحشی ہے۔ جس پر برینڈن نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ یہی زندگی ہے۔''

ولیم کے اس بیان پر اینتھونی کو پوچھ گچھ کے لیے اٹھا لیا گیا اور اس نے جلد ہی اقرار کر لیا کہ اس نے باربرا کی اجتماعی جبری عصمت دری میں حصہ لیا تھا۔ اس نے یہ بھی اقرار کیا کہ اس واردات میں استعمال ہونے والا ریوالور اس کا تھا لیکن میں نے وہ ریوالور برینڈن کو دے دیا تھا..... خود میں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اس نے پرزور لہجے میں کہا ''میں ان لوگوں کے خلاف گواہی دینے کو تیار ہوں۔''

☆☆☆

مورخہ 22 مارچ 1982 کو عدالت نے رابرٹ پر فرسٹ ڈگری مرڈر، جبری عصمت دری اور فرسٹ ڈگری مجرمانہ حملے کے الزام کے تحت مقدمہ چلایا۔ مقدمے کے آغاز سے پہلے اینتھونی نے جس نے پولیس کو یہ بیان دیا تھا کہ وہ بار برا کی عصمت دری کے بعد کار سے نکل گیا تھا اقرار کیا کہ وہ اجتماعی عصمت دری میں شامل تھا۔ چنانچہ جج فرنانڈو نے کہا کہ وہ اینتھونی کو بعد میں سزا سنائے گا۔

مقدمے کی کارروائی کے آغاز پر جب کہ جیوری کے ارکان پتھر کے بت کی مانند عدالتی کمرے میں خاموش بیٹھے تھے استغاثہ کے وکیل لیری شیفر نے بطور شہادت رابرٹ کا ٹیپ شدہ بیان عدالت کو سنایا۔ رابرٹ کہہ رہا تھا ''جب برینڈن نے رونالڈ کو گولی ماری تو اس وقت بھی میں شراب کے اسٹور کے اندر تھا۔ جب میں اسٹور سے باہر آیا تو برینڈن نے مجھے بتایا کہ اس نے اس شخص کو گولی ماردی ہے۔''

ٹیپ چل رہا تھا اور رابرٹ کی آواز عدالت کے کمرے میں گونج رہی تھی ''برینڈن نے مجھ سے کہا کہ ہمیں اس لڑکی کو بھی ہلاک کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں کار سے اتر پڑا اور پھر میں

ٹھہریئے اپنی ناک کا آپریشن کرانے سے پہلے
جدید ہومیو پیتھک سائنسی تحقیق اور تجربہ سے تیار کردہ انتہائی زود اثر دوا
NARICOL TABLETS
SINCE 1995
FOR SINUSITIS CURE ALL NASAL PROBLEM WITHOUT OPERATION
خشک دائمی ہو یا الرجک یا موسمی تبدیلیوں سے ناک کی ہڈی، گوشت کے بڑھنے سے ہو سر درد مستقل ہونا یا سانس لینے میں دشواری کیلئے مجرب دوا۔
نیری کول ٹیبلٹس
ایک ہفتے ضرور استعمال کر کے دیکھیں انشاء اللہ شفا ہوگی
کراچی میں معیاری ہومیو میڈیکل اسٹور پر دستیاب ہے۔
کراچی اور دوسرے شہروں میں اسٹاکسٹ درکار ہیں۔
اسٹاکسٹ:
ہزارہ ہومیو پیتھک اسٹور اینڈ کلینک 34 نکلسن روڈ لاہور 042-6369691-3
ہومیو پیتھک اسٹور اینڈ کلینک 5 عبداللطیف خان پلازہ منڈیاں ایبٹ آباد
ہومیو پیتھک اسٹور 8۔ ہسپتال بازار اوکاڑہ 0442-514666
شاہی ہومیو ڈرگ بینک سکندر پورہ پشاور۔ 091-2571776
ہومیو پیتھک اسٹور فرنیچر مارکیٹ ساہیوال۔
ایک ماہ کا کورس -/220 روپے
گھر بیٹھے V.P پارسل منگوانے کیلئے خط لکھیں۔
ہومیو ڈاکٹر شوکت علی
(پینل۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان)
DR. SHOUKAT
HOMOEO PHARMA
Shop No. 2, Mahwish Appartment Plot No. SC-19, Block 14, North Nazimabad, Karachi. Tel: 6647312 Mobile: 0300-9229413
اوپل ایونیو شاپ نمبر 2 پلاٹ SC-19 بلاک N نارتھ ناظم آباد، نزد ڈی سی آفس سینٹرل کراچی۔ ٹیلی فون نمبر: 6647312 موبائل 0300-9229413
E-mail:hdr_shoukatali@hotmail.com کلینک کے اوقات (صبح 11 سے 1 شام 6 سے 10)

نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے لڑکی کو گولی ماردی تھی یا کیا کیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس نے لڑکی کو گولی ماردی ہے؟ تو اس نے جوب دیا ''ہاں۔''

لیکن جب بار برا گواہ کے کٹہرے میں پہنچی تو اس نے جیوری سے کہا ''یہ رابرٹ ہی تھا جس نے ڈگی میں مجھ پر ریوالور تانا تھا۔ اس نے ڈگی کے خلا ہی سے براہِ راست میری طرف دیکھا تھا اور میرا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ اس گولی نے میرے بائیں طرف کے سارے دانت اور جبڑے کی ہڈی کے پرخچے اڑا دیے۔ میں منہ کے بل گر پڑی اور ساکت ہوگئی۔ میں جانتی تھی کہ میں مری نہیں تھی لیکن میں انتظار کر رہی تھی۔''

''موت کا؟'' وکیل استغاثہ لیری نے مداخلت کی۔

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

☆☆☆

اگلے روز رابرٹ پر وہ سارے الزامات ثابت ہوگئے جو اس پر عائد کیے گئے تھے۔ اور وہ مجرم قرار پا گیا۔ لہٰذا اسے دوہری عمر قید کے علاوہ ایک سو پچاس سال قید کی سزا سنادی گئی۔ رابرٹ یہ فیصلہ سن کر بھونچکا رہ گیا۔ بعد میں اس نے اخباری نمائندوں سے کہا ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا ذہن کام نہیں کر رہا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں جیل جا رہا ہوں۔ اگر میں منشیات کا عادی نہ ہوتا تو یہ سب کچھ پیش نہ آتا۔''

مورخہ 10 جون 1982 کو دوسری جیوری نے ملزم برینڈن پر عائد شدہ فرسٹ ڈگری مرڈر، زنا بالجبر اور دیگر متعلقہ الزامات کو درست پاتے ہوئے اسے مجرم قرار دے دیا اور اگرچہ وکیل استغاثہ کی سزائے موت کی درخواست منظور نہیں کی تاہم دوہری عمر قید اور ایک سو دس سال قید کی سفارش کر دی جو عمر قید کے علاوہ تھی۔

اگرچہ برینڈن نے گواہ کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر اپنی بے گناہی کا دعویٰ کیا اور اس کے کنبے کے بعض افراد نے یہ گواہی دی کہ وہ قتل کی رات پارٹی کیو میں تھا لیکن عدالت نے اس کا عذر بے گناہی تسلیم نہیں کیا اور مقدمے کی کارروائی اگلی ساعت کے لیے ملتوی کر دی۔

مورخہ 31 اگست کو برینڈن مقدمے کا فیصلہ سنائے جانے سے صرف دو دن قبل ہتھکڑی اور بیڑی پہنے ہوئے ہونے کے باوجود جیل گارڈ کی تحویل میں سے فرار ہوگیا۔ اسے کاؤنٹی جیل سے کی ایٹنگ ساز کے پاس لے جایا جا رہا تھا جہاں اس کی ایٹنگ بنی تھی اور اس سفر میں صرف ایک آفیسر کو نگہبان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچے تو برینڈن جو پچھلی سیٹ پر سفر کر رہا تھا۔ اچانک اپنی ہتھکڑی اور بیڑی ایک طرف پھینک کر اور گارڈ کو دھکا دے کر فرار ہوگیا۔ اسے ہتھکڑی اور بیڑی کی چابی کہاں سے ملی یہ ایک معما ہے جو کبھی نہ حل ہو سکا۔ جیل کے حکام کو شبہہ ہے کہ جیل سے لے جائے جانے کے موقع پر جب اس کی تلاشی لی گئی تھی تو اس نے چابی اپنے منہ میں چھپالی تھی۔ اس کے فرار کے نتیجے میں جیل کے پورے عملے کو معطل کر دیا گیا لیکن ان کی معطلی برینڈن کو واپس نہ لاسکی۔ نوجوان بھگوڑا یوں غائب ہوگیا تھا گویا اس کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔

حکام نے اس کی فیملی کے افراد اور دوستوں سے پوچھ گچھ کی لیکن ان سب کا یہی کہنا تھا کہ انہیں اس کی کوئی خبر نہیں۔ بھگوڑے نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ لہٰذا پولیس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگی۔

جنوری 1983 کی گیارہ تاریخ تھی۔ فورڈ ورتھ ٹیکساس کے ایک پولیس آفیسر کو ایک مخبر نے اطلاع دی کہ برینڈن ایک فرضی نام سے وہاں غریبوں کی ایک بستی میں روپوش ہے۔ چنانچہ افسران نے فورڈ ورتھ پہنچ کر اس کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ برینڈن نے دروازہ کھولا اور اپنے سامنے پولیس افسروں کو پا کر ہکا بکا رہ گیا۔

''ہم جانتے ہیں کہ تمہارا اصلی نام برینڈن ہے۔'' ایک پولیس آفیسر نے چھوٹتے ہی کہا ''اور تم اس وقت زیرِ حراست ہو۔''

مورخہ 18 جنوری 1983 کو کنساس سٹی لائے جانے کے صرف پانچ گھنٹے کے بعد برینڈن نے خود کو اسی عدالت میں جج فرنانڈو کے سامنے پایا اور جج نے اپنا فیصلہ سنانے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ اسے دوہری عمر قید کے علاوہ ایک سو دس سال قید کی سزا سنادی جس کی جیوری نے سفارش کی تھی۔

برینڈن جس نے فورڈ ورتھ سے کنساس سٹی کے ساڑھے سات گھنٹے کے سفر کے دوران ایک لفظ بھی منہ سے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا، جج سے مخاطب ہو کر کہا ''میں محسوس کرتا ہوں کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ میں خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑتا ہوں۔''

''تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اس کے بعد مجھ سے رحم کی درخواست کرنا مجھے پاگل پن ہی لگتا ہے۔'' جج فرنانڈو غرایا۔ ''اور کچھ نہیں تو یہ سزا تمہیں یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ تم نے دوسروں کے ساتھ اور اپنے ساتھ کیا کیا ہے۔''

باکمال لوگ

لبنیٰ زبیر

قدرتی آفات کا مقابلہ کرنا آسان نہیں، لیکن حادثات سے مایوس ہونا یا مزید تگ و دو کو ترک کر دینا باہمت لوگوں کا شیوہ نہیں۔ حادثے تو ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ انسان کے حوصلے بلند ہوں اور وہ ان کا نہ صرف مقابلہ کر سکے بلکہ ان کے تدارک کی کوششیں بھی جاری رکھے۔ اس طرح کے لوگ ہر دور میں اور ہر جگہ پیدا ہوئے تب ہی تو دنیا اپنی موجودہ شکل میں نہ صرف موجود ہے بلکہ ہر لمحہ بہتری کی طرف گامزن بھی.....

ایسے لوگوں کی حوصلہ مندی کا تذکرہ جو شکست کے قائل ہی نہ تھے

نہایت ہولناک منظر تھا۔ بے حد بلندی سے ایک لہولہان شے آگ کے شعلے برساتی نیچے سرنگ کے منصوبے پر کام کرتے لوگوں کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے آتشیں پیکر سے شعلے اسی طرح لگ رہے تھے جیسے کوئی دیو منہ سے شعلے نکالتا لپکتا چلا آ رہا ہو۔ اس آتشیں دیو کے عقب میں چھوٹے بڑے پتھر اور چٹانیں کسی لشکر کی طرح چلی آ رہی تھیں۔ نیچے کھڑے مزدور دم بہ خود سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور ابھی انہوں نے اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ آفت ان پر آ گری۔ آتشیں دیو دراصل لکڑی کا ایک کوہ پیکر ستون تھا۔ اسے سرنگ کے اوپری حصے میں ایک بہت بڑی چٹان کو سہارا دینے کے لیے لگایا گیا تھا تاکہ کام کے دوران میں یہ چٹان اچانک ہی کہیں مزدوروں پر نہ آن گرے۔

لیکن حادثہ ہمیشہ وہم و گمان سے باہر ہی ہوتا ہے۔

جو ستون سرنگ اور مزدوروں کی حفاظت کے لیے لگایا گیا تھا۔ وہی ان کی تباہی کا باعث بن گیا۔ نہ جانے کس وجہ سے لکڑی کا یہ ستون اپنی جگہ سے کھسک گیا۔ بدقسمتی سے اس کے عین نیچے سے بجلی کی انتہائی طاقتور تاریں گزر رہی تھیں۔ لکڑی کا یہ ستون تاروں سے ٹکرایا اس سے ان میں آگ بھڑک اٹھی اور اسی آگ نے ستون کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ستون آگ میں گھر گیا اور جب یہ نیچے آ رہا تھا تو اس نے راستے میں آنے والی جھاڑیوں کو بھی آگ لگانا شروع کر دی۔ موسم بے حد خشک تھا اس لیے یہ آگ انتہائی سرعت سے پھیل رہی تھی۔

ابھی مزدور سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دیو پیکر ستون ان پر آن گرا۔ کتنے ہی مزدور اس کے تلے دب کر جاں بحق ہوگئے اور باقی آگ کی نذر ہوگئے۔ بدقسمتی سے سرنگ کے اندر بھی

جا بہ جا لکڑی کے ستون تھے۔ یکے بعد دیگرے ان میں بھی آگ لگنا شروع ہوگئی۔ اندر کام کرنے والے اس آگ میں گھر گئے اور جو سرنگ کے آخری حصے میں کام کر رہے تھے' وہ بڑی بے بسی کی موت مرے تھے۔ انہیں باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وسط سرنگ سے جو مزدور کسی نہ کسی طرح آگ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے' ان پر اوپر سے چٹانوں اور پتھروں کی بارش ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ان میں پس کر رہ گئے۔

یوں پندرہ سال کی محنت کو برباد ہونے میں بمشکل دس بارہ منٹ لگے اور اس حادثے میں درجنوں مزدور مارے گئے۔ خاص بات یہ تھی کہ ہوزاک ایک بار پھر فاتح ٹھہری تھی۔ اس نے انسانی کوششوں کو ایک اور شکست فاش دے دی تھی۔ 19 اکتوبر 1867ء کا یہ دن امریکی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد کسی تعمیراتی کام میں اتنے بڑے پیمانے پر مزدور ہلاک نہیں ہوئے۔

شمالی امریکا میں کینیڈا کی سرحد کے پاس دو ریاستیں نیو انگلینڈ اور میساچوسٹس ساتھ ساتھ ہیں لیکن ان کے درمیان اس زمانے میں زمینی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں ریاستوں کے درمیان ایک ایسا پہاڑی سلسلہ حائل تھا جس پر نہ تو کوئی اچھی سڑک بنائی جا سکتی تھی اور نہ ہی ریل گاڑی گزاری جا سکتی تھی۔ میساچوسٹس ان دنوں بھی ایک ترقی یافتہ ریاست تھی۔ پورا شمال بے حد تیزی سے منظم کاروباری سرگرمیاں قائم کر رہا تھا۔ ایسے میں جبکہ بوسٹن سے نیویارک تک رسل ورسائل نے بے حد ترقی کر لی تھی، نیو انگلینڈ کے باشندے خود کو ترقی کی اس دوڑ سے الگ تھلگ محسوس کرتے تھے جو درحقیقت ان سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگر اس طرح ان پہاڑیوں میں کوئی راستہ نکل آتا تو ان لوگوں کی قسمت بھی کھل سکتی تھی۔ ان پہاڑیوں میں صرف ایک مقام ہوزاک ہی ایسی جگہ تھی جہاں سے سرنگ نکال کر نیو انگلینڈ اور میساچوسٹس کی ریاستوں کو آپس میں ملایا جا سکتا تھا۔

15 سال پہلے جب ہوزاک سرنگ کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا تو دونوں ریاستوں کے لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ منصوبہ ان کے لیے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن جائے گا جسے وہ نہ اگل سکیں گے اور نہ نگل سکیں گے۔ جب اس کی تعمیر کے لیے منصوبہ بنایا جا رہا تھا تو پرانے انجینئروں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ بہ قول ان کے گرینائٹ کی چٹانوں سے بنے ان پہاڑوں میں سرنگ نکالنا بے حد دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کام میں بہت زیادہ رقم صرف ہوگی' جس کی سکت دونوں ریاستوں کے خزانے نہیں رکھتے اور اس سے بے اندازہ جانی نقصان ہوگا۔ لیکن نئی نسل کے انجینئر اس بارے میں بے حد پُرامید تھے کہ وہ کسی نہ کسی صورت ہوزاک کی ان پہاڑیوں میں سرنگ بنا ہی لیں گے۔

لیکن کام کے آغاز کے ساتھ ہی بے پناہ مشکلات سامنے آنے لگیں۔ اول تو سرنگ کا دہانہ ایسے مقام پر تھا کہ ہلکے سے سیلاب کی صورت میں سرنگ فوراً پانی بھرنے سے ڈوب سکتی تھی اور یوں اس میں موجود ہر فرد بھی پانی کا شکار ہو جاتا۔ دوسرے یہ پہاڑیاں بے حد سخت پتھر سے بنی چٹانوں پر مشتمل تھیں۔ اول تو انہیں توڑنے میں ان کے اوزار کارآمد ثابت نہیں ہوتے تھے اور دوسرے وہ کسی نہ کسی طرح ان میں سوراخ کر بھی لیتے تھے تو جب وہ ان سوراخوں میں بارود بھر کر اسے آگ دکھاتے تھے تو چٹانیں توقع سے کم ٹوٹتی تھیں اور سرنگ میں کام کرنے والے مزدوروں کے پرخچے زیادہ اڑا کرتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ سرنگ میں کہیں بارود بھر کر دھماکا کیا گیا تو اس کے اثر سے کہیں اور کوئی چٹان مزدوروں پر آن گری یا اس نے راستہ ہی بند کر دیا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ مزدور کام کر رہے ہوتے تھے کہ سیلاب کا پانی اچانک سرنگ میں گھس آتا اور دیکھتے ہی دیکھتے کام کرنے والے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اسی لیے اسے منحوس سرنگ کہا جانے لگا تھا۔

ان پندرہ سالوں میں ریاست سیکٹر سے درجنوں کمپنیوں نے اس تعمیراتی کام میں حصہ لیا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی مگر ان کی شدید محنت کے باوجود صرف دو میل تک سرنگ مکمل ہو سکی تھی اور وہ بھی اس قدر شکستہ حالت میں کہ اسے سرنگ سے زیادہ کسی سرنگ کا کھنڈر کہا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ سال کے سال ہونے والے نت نئے حادثات نے اس کی ساکھ ویسے ہی ختم کر دی تھی، اوپر سے سرنگ کی تعمیر کے ہوشربا اخراجات۔ ان پندرہ سالوں میں ایک کروڑ ڈالرز کی خطیر رقم اس منصوبے کی نذر ہو چکی تھی اور ہنوز اس کی تکمیل کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ایسے موقع پر جب دونوں طرف کی اپوزیشن پارٹیاں اس منصوبے کی زور وشور سے مخالفت کر رہی تھیں۔ اسے انجینئرنگ کی تاریخ کی سب سے بڑی غلطی کہا جا رہا تھا 19 اکتوبر کو ہونے والے حادثے نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی اور منصوبے پر کام روک دیا گیا۔

خزانے کے علاوہ ہوزاک بڑی تعداد میں انسانی جانوں کا نذرانہ بھی لے رہی تھی اور پندرہ سال کے عرصے میں وہاں سو سے زائد مزدور مختلف حادثوں میں ہلاک ہو چکے تھے۔ اس موقع پر تعمیراتی کمپنیوں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے کام بند کر دیا۔ اس پر دونوں ریاستوں کی اپوزیشن نے خوب بغلیں بجائیں اور حکمران جماعتوں کو خوب لتاڑا جنہوں نے عوام کی کمائی سے حاصل کیا جانے والا ٹیکس ایک احمقانہ اور ناممکن منصوبے پر خرچ کر دیا تھا۔ خود حکمران جماعتوں کا غم سے برا حال تھا اور ان کا عتاب ان لوگوں پر نازل ہو رہا تھا جنہوں نے اس منصوبے کو پیش کیا تھا یا اس کی حمایت کی تھی۔ صرف ایک طبقہ ایسا تھا جسے ہوزاک سرنگ پر کام بند ہونے کا افسوس تھا اور وہ تھا مزدور طبقہ۔ بے شک اس سرنگ سے انہیں شدید جانی نقصان ہوا تھا لیکن اس کے باوجود اس سرنگ سے ہزاروں لوگوں کا روزگار وابستہ ہو گیا تھا اور مزدور کو سب سے عزیز اپنا روزگار ہوتا ہے۔

بوسٹن کے ایک اخبار ''بوسٹن ٹو یک'' کے نامہ نگار نے سرنگ کی تباہی کے بعد اس کا جو آنکھوں دیکھا حال اخبار کو روانہ کیا اسے پڑھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے لکھا ''سرنگ کے دہانے تک پانی بھرا ہے اور حادثے میں مارے جانے والے کئی مزدوروں کی لاشیں اس پانی میں موجود ہیں لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ اندر جا کر ان لاشوں کو نکال کر لائے۔ سرنگ میں پانی بھرنے کی وجہ یہاں پر پانی نکالنے کے لیے لگائے جانے والے پمپوں کا ناکارہ ہونا ہے۔ اس وقت ایک پمپ بھی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے پانی نکالنے کا کام لیا جا سکے۔ سرنگ اس بری طرح تباہ ہوئی ہے کہ اس کی بحالی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ تعمیراتی راستے پر جا بہ جا پتھر اور چٹانیں بکھری ہوئی ہیں اور لاپتا ہونے والے مزدور ان کے تلے دبے ہوئے ہیں۔ ہوزاک درحقیقت ایک بلیک ہول ہے جس نے ایک کروڑ ڈالر ہی نہیں بلکہ ایک سو انسانی جانوں کو بھی نگل لیا ہے۔ بلاشبہ اسے تعمیراتی تاریخ کی سب سے بڑی غلطی کہا جا سکتا ہے۔''

انیسویں صدی کے آغاز میں ہی بحر اوقیانوس میں دخانی جہاز چلنے لگے تھے جس کے بعد جھیل مشی گن اور اس سے ملحقہ سمندر میں جہازوں کی آمدورفت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں شمالی امریکا میں ترقی کا دور شروع ہوا۔ لہٰذا نیو انگلینڈ کے ہوش مند تاجروں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ وہ ترقی کی اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں' انہیں کسی طرح شمالی امریکا کے ریلوے نظام سے منسلک ہو جانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ہوزاک کے مقام کو منتخب کر کے وہاں ریلوے لائن کے لیے سرنگ بنانے کا کام شروع ہوا۔ آغاز سے ہی یہ کام انجینئرنگ کی نجی کمپنیوں کے ہاتھوں میں رہا' جو نہ صرف اعلیٰ انسانی مہارت رکھتی تھیں بلکہ ان کے پاس ہر قسم کے تعمیراتی مسائل سے نمٹنے کے لیے آلات اور مشینیں موجود تھیں اور اس سے پہلے بھی یہ کمپنیاں کئی بڑے منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچا چکی تھیں۔ لیکن جب ہوزاک کی سرنگ پر عملی کام شروع ہوا تو پہلے سے طے شدہ تمام تخمینے غلط ثابت ہوئے اور پندرہ سال کے بعد بھی سرنگ محض دو میل تک ہی بن سکی تھی۔ تعمیرات کی دنیا میں اتنے غلط اندازے شاید ہی کبھی لگائے گئے ہوں۔

ہوزاک سرنگ دراصل مکمل طور پر سرنگ نہیں تھی۔ بلکہ یہ سرنگوں اور پلوں کا ایک مجموعہ تھا۔ اس میں چار مقامات پر سرنگیں باہر نکلتیں اور پھر پلوں کے ذریعے دوسری سرنگوں سے مل جاتی تھیں۔ یوں چار مقامات پر پلوں اور پانچ مقامات پر سرنگوں کی ضرورت پیش آئی۔ تعمیراتی کمپنیوں نے فیصلہ کیا کہ چار مقامات پر بیک وقت سرنگ کی تعمیر کا کام شروع کیا جائے گا اور سرنگوں کو آپس میں ملا دیا جائے گا۔ پل بنانے کے لیے ان چار مقامات پر طویل عمودی ستون تعمیر کیے گئے تاکہ ان پر سے پل بنا کر ریلوے لائن گزاری جائے۔

سرنگ کی تعمیر میں سب سے بڑی رکاوٹ اس پہاڑی سلسلے کی سخت ترین چٹانیں تھیں۔ اول تو ان پر اس دور کے بہترین فولادی برمے بھی ناکام رہے تھے اور اگر کسی نہ کسی طرح سوراخ کر لیا جاتا تب بھی بارود ان چٹانوں کو اڑانے میں ناکام ثابت ہوتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کسی چٹان کو اڑانے کی کوشش کی تو اس کے نیچے سے پانی کا چشمہ نکل آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سرنگ میں پانی بھر گیا یا سیلاب آ گیا۔ کبھی چٹانیں لڑھک جاتیں اور کبھی بنائی جانے والی سرنگ کی چھت بیٹھ جاتی تھی۔ ہزار دقتوں کے بعد مشکل سے دو میل لمبی سرنگ تیار ہوئی تو اسے آتش زدگی نے برباد کر دیا۔ اتنی آفتیں نازل ہونے اور حادثات ہونے کے بعد سرنگ کی دوبارہ تعمیر کا کام شروع کرنا تو ایک طرف رہا' لوگ اس کے بارے میں سوچنے کو بھی تیار نہیں تھے۔ شہری اس منصوبے کے اس قدر خلاف ہو گئے تھے کہ اب اس کے لیے ایک پیسا بھی دینے کو تیار نہیں تھے۔

جس وقت لکڑی کے ستون کے گرنے اور سرنگ کی تباہی کا ہولناک واقعہ ہوا' اس وقت تاریخ کے دو اہم فرد وہاں موجود تھے۔ ان میں ایک بے حد منحنی سے جسم کا مالک پروفیسر چارج مورڈے مورے تھا۔ اس نے اپنی جسامت سے دوگنا

بڑا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے مختصر سے جسم میں بڑا ذہین دماغ تھا اور اس نے نائٹروگلیسرین نامی دھماکا خیز مادہ ایجاد کر کے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ لیکن فی الوقت امریکا میں اس کے اور اس کی ایجاد کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

ذرا مختصر سا بیان نائٹروگلیسرین کے بارے میں ہوجائے۔ بارود صدیوں قبل چینی قوم نے ایجاد کیا تھا۔ لیکن اس کی کارکردگی محدود تھی۔ یہ جنگلوں میں کارآمد تھا لیکن جہاں تک تعمیراتی دنیا کا سوال تھا تو بارود اپنی افادیت ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ قلعی شورے اور بعض دیگر عناصر کی مدد سے تیار کیا جانے والا یہ مادہ درحقیقت چٹانوں کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ آج بھی پٹاخے سازی میں یہی بطور خام مال استعمال ہوتا ہے۔ ایسے میں پروفیسر موبرے نے نائٹروگلیسرین کا تجربہ کیا اور اسے عام بارود سے کہیں مؤثر اور طاقت ور دھماکا خیز مادہ پایا۔ لیکن یہ بارود کے مقابلے میں بے حد حساس تھا۔ ہلکی سی تھپیں یا معمولی سی حرارت بھی اسے دھماکے پر مائل کرلیا کرتی تھی۔ اسی وجہ سے نائٹروگلیسرین ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں الفریڈ نوبل نے نائٹروگلیسرین پر تجربات کر کے نہ صرف اس کی حساسیت کو بے حد کم کردیا بلکہ اسے کم حجم میں زیادہ طاقتور بنا کر انسانیت کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی تھی۔ اس سے نائٹروگلیسرین کا تعمیرات کی دنیا میں محفوظ استعمال ممکن ہوسکا تھا۔ اپنی ایجاد یعنی ڈائنامائٹ سے الفریڈ نوبل نے خوب دولت کمائی اور یہ دولت مرنے کے بعد ایک ٹرسٹ کو عطیہ کر گیا جس کا مقصد ہر سال سائنس کے مختلف شعبوں میں بہترین خدمات انجام دینے والوں کو انعامات سے نوازنا تھا۔ آج نوبل پرائز دنیا میں سائنس، ادب، طب اور امن کے شعبوں میں دیا جانے والا سب سے بڑا انعام ہے۔

بہرحال پروفیسر موبرے کا کارنامہ اپنی جگہ۔ اس نے نائٹروگلیسرین ایجاد کر کے بھاری تعمیراتی کاموں کو حیرت انگیز حد تک کم لاگت پر مکمل کرنے کی راہ ہموار کردی تھی۔ برطانیہ میں اس کی ایجاد کامیابی سے کئی کاموں میں استعمال ہوئی تھی لیکن پروفیسر موبرے کو اس کا صحیح مستقبل امریکا میں نظر آیا جو تیزی سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھا۔ وہاں تعمیراتی دنیا کے بڑے بڑے منصوبوں پر کام ہو رہا تھا۔ لہٰذا پروفیسر موبرے نے برطانیہ سے اپنا بوریا بستر سمیٹا اور جہاز پر سوار ہو کر امریکا چلا آیا۔ لیکن کوئی خاص توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس وقت امریکا پر دنیا بھر سے باصلاحیت تارکین وطن کی یلغار ہو رہی تھی۔ ایسے میں پروفیسر موبرے پر کون توجہ دیتا۔ مگر آخرکار اس نے اپنی جگہ بنا ہی لی۔

اس زمانے میں امریکا میں مائع پیٹرولیم کی صنعت ابھر رہی تھی اور ٹیکساس میں تیل کے کنوؤں کی کھدائی تیزی سے جاری تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی کمی ایک اچھے دھماکا خیز مادے کی تھی جو کھدائی کے دوران میں راہ میں آنے والی چٹانوں کو اڑا سکے۔ مروجہ بارود یہ ضرورت پوری کرنے میں ناکام ہی تھی۔ ایسے میں پروفیسر موبرے کی ایجاد کام آئی اور اس نے تیل کے کنوؤں کی کھدائی میں شاندار کردار ادا کیا۔ وہی کنواں جو پہلے اوسطاً دو مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچتا تھا' اب محض دو ہفتے میں تیار ہونے لگا۔ مگر تیل کے کنوؤں کی کھدائی کوئی عوامی پروجیکٹس میں نہیں شمار ہوتی' جن سے پروفیسر اور اس کی ایجاد کو مطلوبہ شہرت حاصل ہوجاتی۔ ایسے میں اس نے ہوزاک کی سرنگ کے بارے میں سنا۔ نہ صرف بوسٹن بلکہ امریکا کے اخبارات اس پروجیکٹ کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ پروفیسر نے سوچا کہ شاید اس کی ایجاد کے مشہور ہونے کا وقت آگیا ہے۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ نائٹروگلیسرین اس راہ میں آنے والی تمام مشکلات کا حل کردے گی اور وہ اس مقصد کے لیے ہوزاک تک آیا تھا اور اس وقت ایک بلند مقام پر کھڑا تباہ ہوجانے والی سرنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔

دوسرا فریڈ جو اتفاق سے اس وقت تباہ شدہ سرنگ کا جائزہ لینے آیا ہوا تھا' وہ مشہور اسٹیلے برادران میں چھوٹا بھائی والٹر اسٹیلے تھا۔ اسے تعمیرات کی دنیا میں عجیب وغریب کام کرنے کا جنون تھا۔ ایسے ناممکن کام جنہیں دوسرے مسترد کرچکے ہوں یا ان میں پیش آنے والی مشکلات کے آگے ہار مان چکے ہوں۔ اس نے ہوزاک کے بارے میں سنا کہ وہ تعمیراتی کمپنیوں کے لیے ایک جہنم ثابت ہو رہی ہے تو اس کی مشکل پسند طبیعت پھڑک اٹھی اور وہ فوراً ہوزاک چلا آیا۔ اتفاق سے ان ہی دنوں آتش زدگی کا واقعہ ہوا۔ جس نے اب تک کیے جانے والے تعمیراتی کام کو ملیامیٹ کردیا۔ والٹر نے بغور سارے کام اور اس میں پیش آنے والی دقتوں کا جائزہ لیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ کام کرنے والی کمپنیوں نے بہترین پلاننگ کی تھی لیکن ان کی بدقسمتی کہ ان کے پاس اس کام کے لیے مناسب وسائل نہیں تھے اور وہ اسی وجہ سے ناکام رہیں۔

جس جگہ پر پروفیسر موبرے کھڑا تھا' اتفاق سے والٹر اسٹیلے نے بھی سرنگ کے جائزے کے لیے اسی جگہ کا انتخاب کیا۔ اتنی تباہی وبربادی نے پروفیسر کو افسردہ کردیا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا "افسوس صد افسوس۔"

والٹر نے یہ الفاظ سنے تو اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس وقت تک وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے لیکن پروفیسر کی تصاویر اخبارات میں چھپتی رہی تھیں۔ والٹر نے بہ غور اسے دیکھا تو کچھ یاد آنے لگا۔ وہ اس کے پاس آیا۔ اس نے پروفیسر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ پروفیسر موبرے ہیں؟"

"آپ نے ٹھیک پہچانا" پروفیسر نے جواب دیا۔

"مجھے والٹر اسٹیلے کہتے ہیں۔ میں اسٹیلے کارپوریشن کا ایک شراکت دار ہوں۔"

پروفیسر نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہوزاک سرنگ کے لیے یہ مصافحہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس مصافحے نے والے دنوں میں انوکھا کارنامہ انجام دیا' جس نے تعمیرات کے شعبے کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔

اس وقت پروفیسر قریب ہی والٹر کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے والٹر کو اپنے ہوٹل مدعو کیا تاکہ اسے اپنی ایجاد کے بارے میں بتا سکے۔ اسی شام کو والٹر اور پروفیسر کی ملاقات ہوئی تو والٹر نے پہلی بار نائٹروگلیسرین کا مشاہدہ کیا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ایک نیم شفاف جیلی نما شے سیاہ بارود سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوسکتی تھی۔

"کیا یہ واقعی اتنی ہی خطرناک ہے؟"

"میں اس کا کامیاب تجربہ کرچکا ہوں۔" پروفیسر نے فخر سے کہا "مجھے یقین ہے یہ ہوزاک کی سخت ترین چٹانوں کو بھی ریت کی طرح بکھیر دے گی۔"

والٹر اسٹیلے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ہوزاک کا خیال مچل رہا تھا۔ وہ اس چیلنج کو قبول کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے وہ اپنے اندازوں کا یقین کرنا چاہتا تھا۔ آخر اس نے گہری سانس لے کر پروفیسر سے کہا "کیا آپ مجھے اس کا ایک تجربہ کر کے دکھائیں گے؟"

"میں تیار ہوں۔" خلاف توقع پروفیسر فوراً مان گیا "لیکن اس کے انتظامات تمہیں کرنا ہوں گے۔"

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے تجربے کے لیے ایسی جگہ سوچی ہے کہ آپ بھی خوش ہوجائیں گے۔"

☆☆☆

ہوزاک سرنگ کی تباہی کے بعد عام لوگوں کو اس طرف جانے سے روکنے کے لیے حکومت نے پہرے دار بٹھا رکھے تھے۔ کیوں کہ اس شکستہ سرنگ کے بہت سے حصے اب بھی خطرناک حالت میں تھے اور کئی جگہوں پر بارود لگا ہوا تھا۔ انجانے افراد وہاں جا کر کسی حادثے کا شکار بھی ہوسکتے تھے۔

اس رات بس ایک پہرے دار اپنی ذمے داری پوری کر رہا تھا۔ اچانک تاریکی میں کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس کے ہاتھ عقب میں باندھ دیے۔ آخر میں اسے جا کر اوزاروں کے شیڈ میں ڈال دیا۔ تاریکی میں اسے محض دو سائے حرکت کرتے نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک دیوقامت تھا۔ یہ والٹر تھا جس نے چوکیدار کو قابو کیا تھا۔ دوسرا پستہ قامت اور مختصر سا پروفیسر موبرے تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک کنستر اٹھا رکھا تھا جس میں دھماکا خیز نائٹروگلیسرین بھری ہوئی تھی۔

چوکیدار کو باندھ کر وہ سرنگ کی طرف آئے۔ اس کے دہانے پر ہی اوپر سے گرنے والی دیوہیکل چٹان پڑی تھی۔ پروفیسر نے تجربے کے لیے اسے منتخب کیا۔ اس کے مختلف حصوں میں نائٹروگلیسرین سے بھری ٹیوبیں لگا کر اس سے ان کے تار دور لیجا کر ایک بیٹری سے منسلک کردیے۔ پھر جیسے ہی اس نے تاروں کو ملایا' ایک زوردار دھماکا ہوا اور جب گرد وغبار کے بادل چھٹے تو والٹر نے دیکھا کہ اب وہاں چٹان کا نام ونشان تک نہ تھا۔ محض ایک کنستر نائٹروگلیسرین نے وہ کارنامہ انجام دیا تھا جو اس سے پہلے دس گنا زیادہ بارود بھی نہیں دے سکتا تھا۔ ذرا دیر بعد والٹر اور پروفیسر سرنگ کے دہانے پر جمی چٹان کے مختصر ہوجانے والے بے شمار ٹکڑوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ لالٹین کی روشنی میں والٹر کا چہرہ کھلا جا رہا تھا۔

"پروفیسر! میں شرط لگا سکتا ہوں عام طریقے سے اس چٹان کو ایک مہینے میں بھی اس جگہ سے نہیں ہٹایا جاسکتا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب میں یہ کام بہت کم مدت میں اور بہت کم پیسوں میں کرسکتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ مجھے مطلوبہ مقدار میں یہ مادہ فراہم کرسکیں۔"

"ایسا کرنا بالکل ممکن ہے" پروفیسر نے اعتماد سے جواب دیا "بشرطیکہ مجھے مطلوبہ رقم وقت پر فراہم کردی جائے۔"

"یہ میرا ذمہ ہے" والٹر نے کہا۔

اس کے چند ہفتوں بعد والٹر اسٹیلے نے محض سینتالیس لاکھ ڈالرز میں ہوزاک سرنگ کی تکمیل کا منصوبہ بنا کر ریاست کی حکومت کو پیش کردیا۔ کام کی منظوری دینے والی کمیٹی کے ارکان یہ لاگت دیکھ کر دم بہ خود رہ گئے تھے۔ اس سے پہلے جن کمپنیوں نے ٹینڈر دیے تھے' ان کی پیش کشیں ساٹھ لاکھ سے ایک کروڑ کے درمیان میں تھیں' جب کہ والٹر اسٹیلے نے اس سے کہیں کم رقم میں اور کہیں کم مدت میں اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا پُراعتماد دعویٰ کردیا تھا۔ پھر اسٹیلے برادران کا

نام بھی ان کے لیے نیا نہیں تھا۔

اس دوران میں بعض افراد اور تنظیموں نے جو ہوزاک سرنگ کی مخالفت کر رہی تھیں' نائٹروگلیسرین جیسے خطرناک مادے کے استعمال پر احتجاج کیا کہ اس سے مزدوروں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ مگر پروفیسر موبرے نے اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ نائٹروگلیسرین بارود سے زیادہ محفوظ ہے۔ کیونکہ اس کی حساسیت کی وجہ سے لوگ اسے استعمال کرتے ہوئے زیادہ احتیاط کرتے ہیں اور اس کے حادثات بارود کے مقابلے میں کہیں کم ہوتے ہیں۔ والٹر اسٹیلے کی پرکشش پیش کش نے تاجروں کو مجبور کر دیا اور انہوں نے کمیٹی کے ارکان پر دباؤ ڈال کر اس منصوبے کی منظوری دلوادی۔

والٹر نے منصوبے کی منظوری کے ساتھ ہی خود کو ذہنی طور پر آنے والی مشکلات سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ نائٹروگلیسرین کی مدد کے باوجود ہوزاک سرنگ کی تکمیل کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اب تک اس کی تعمیر میں جتنی مشکلات پیش آ چکی تھیں' جتنے حادثات ہو چکے تھے اور جتنے مزدور مر چکے تھے' اس کے بعد ایسا لگتا تھا کہ کوئی شاید ہی سرنگ میں کام کرنے کے لیے تیار ہو۔ جب والٹر نے اس کا ٹھیکا لیا تو عام لوگوں کا یہی خیال تھا کہ سب سے پہلی مشکل تو خود مزدوروں کی فراہمی میں پیش آئے گی اور ٹھیکے دار منہ مانگی قیمت پر مزدور فراہم کریں گے۔ مگر ایک بات سے منصوبے کے مخالفین اور مقامی لوگ ناواقف تھے کہ اسٹیلے برادر ان مزدوروں میں مقبول ترین نام تھا۔ ماضی میں انہوں نے مزدوروں کے ساتھ ہمیشہ بہترین سلوک روا رکھا تھا۔ نہ صرف ان کو بہترین معاوضہ دیا بلکہ منصوبے کی تکمیل کے دوران میں ان کا ہر ممکن خیال رکھا۔ اس لیے منصوبے کے اعلان کی دیر تھی۔ اسٹیلے برادران کا نام سنتے ہی چاروں طرف سے مزدوروں کی ٹولیاں آنے لگیں۔ حتیٰ کہ نیویارک اور واشنگٹن جیسے دور دراز مقامات سے بھی مزدور چلے آ رہے تھے۔

ایک طرف تو والٹر زیادہ سے زیادہ مزدور بھرتی کر رہا تھا تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام ہو سکے۔ اس کے ساتھ وہ پہلے سے زیادہ مشینیں لا رہا تھا۔ اس سے پہلے ہوزاک سرنگ کے منصوبے پر ہونے والا بیشتر کام انسانی ہاتھوں سے تکمیل پایا تھا لیکن والٹر نے سوراخ کرنے' ملبہ اٹھانے اور وزن لے جانے کے لیے مشینیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے کم وقت میں زیادہ کام ممکن تھا۔ اس وقت ان پہاڑوں کے دامن میں فلوریڈا نامی شہر بسایا جا رہا تھا جو آج ایک جدید امریکی شہر کا روپ دھار چکا ہے۔ واضح رہے کہ اس نام کی ایک معروف امریکی ریاست بھی ہے۔

اس بستی کے نزدیک پروفیسر موبرے نے اپنا نائٹروگلیسرین تیار کرنے کا کارخانہ دس ایکڑ رقبے پر قائم کیا تھا۔ اس کی تکمیل محض چند ہفتوں میں ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پروفیسر موبرے اپنے مددگاروں کے تعاون سے دن رات نائٹروگلیسرین کی تیاری میں لگ گیا۔ یہ کام انتہائی احتیاط کا متقاضی تھا اس لیے پروفیسر زیادہ تر کام خود اپنے ہاتھ سے کر رہا تھا اور اپنے مددگاروں کو بھی اس نے خود تربیت دی تھی۔ ان دنوں وہ کوئی بیس گھنٹے روزانہ کام کرتا تھا تاکہ اپنے دوست کو مطلوبہ مقدار میں یہ دھماکا خیز مادہ فراہم کر سکے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہوزاک کی مکمل تکمیل کے لیے کوئی پانچ لاکھ پاؤنڈز نائٹروگلیسرین درکار تھی اور یہ سارا مادہ پروفیسر کو خود اپنے ہاتھ سے بنانا تھا۔ جب سے اس نے نائٹروگلیسرین ایجاد کی تھی اس کی خواہش تھی کہ اسے کسی بڑے اور لمبے عرصے تک کام کرنے والے پروجیکٹ میں استعمال کیا جائے اور اب بالآخر اسے اپنی ایجاد کی کارکردگی دکھانے کا موقع مل گیا تھا۔

ملبہ اٹھانے اور سرنگ میں ازسرنو سہارے قائم کرنے کے بعد بالآخر وہ دن آ گیا جب سرنگ کو آگے بڑھانے کا کام شروع ہوا۔ اس روز پہلی بار ایک سو پچاس پاؤنڈز کی مقدار میں نائٹروگلیسرین راہ میں آنے والی ایک چٹان میں سوراخ کر کے بھری گئی۔ اس پہلے دھماکے کے موقع پر لوگوں کا ایک ہجوم پروفیسر کی ایجاد کا مظاہرہ دیکھنے کے لیے جمع تھا۔ کئی پرانے انجینئروں اور کارکنوں کے خیال میں اس سے دس گنا زیادہ بارود بھی اس چٹان کو اڑانے سے قاصر تھا۔ انہیں پروفیسر کی کامیابی پر شک تھا۔ بٹن دبانے سے پہلے اس نے وہاں موجود افراد سے کہا۔

''صاحبان! ابھی آپ تعمیرات کی دنیا کو ایک نئے دور میں داخل ہوتا دیکھیں گے۔''

جیسے ہی پروفیسر نے بٹن دبایا' ایک لرزہ دینے والا دھماکا ہوا۔ گرد و غبار کا بادل اٹھا اور جب گرد بیٹھی تو لوگوں نے دیکھا وہ کوہ پیکر چٹان اپنی جگہ سے ایسے غائب تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ پروفیسر نے ٹھیک کہا تھا۔ دنیا ایک نئے تعمیراتی دور میں داخل ہو گئی تھی۔ اس احساس نے کہ ان کی مدد کے لیے ایک کارآمد دھماکا خیز مادہ موجود ہے' مزدوروں میں جوش کی لہر دوڑا دی تھی۔ والٹر نے انہیں نعرہ دیا تھا ''ہوزاک کو شکست دو۔'' اور یہ ان کا مقبول ترین نعرہ بن گیا تھا۔ کام کے بوجھل

لمحات میں یہ نعرہ ان میں جوش و خروش کی لہر دوڑا دیتا تھا۔

سرنگ پر کام کا آغاز نہایت جذبے اور تندہی سے ہوا تھا۔ گزشتہ بارہ مہینوں میں اتنا کام نہیں ہوا تھا جتنا اس بار دنوں میں ہونے لگا تھا اور سرنگ تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ایک حادثہ پیش آ گیا۔ ہوزاک نام ہی حادثوں کا ہے اور لوگوں کے دلوں میں مسلسل وہم موجود رہتا تھا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ جائے' جس میں ان کا کوئی پیارا نہ مارا جائے۔ اس روز پروفیسر حسبِ معمول دھماکے کے لیے نائٹروگلیسرین تیار کر کے پہاڑی پر لے گیا۔ اس نے نائٹروگلیسرین کے کنستروں سے بھری گھوڑا گاڑی کھڑی کی اور خود ہی کام کرنے والے مزدوروں کے پاس گیا۔ اس کے عقب میں ایک لڑکے نے عجلت میں گھوڑوں پر چھڑی مارا۔ گھوڑے بدک کر بھاگے اور اس پر لدے نائٹروگلیسرین کے کنستر بے قابو ہو کر لڑھکنے لگے۔ ان میں سے ایک کنستر پاس ہی کھانا کھاتے ہوئے کچھ مزدوروں کے بیچ میں جا کر پھٹا جس سے چار مزدور فوراً ہی ہلاک ہو گئے اور باقی شدید زخمی ہوئے۔

اس واقعے سے پہلے ہی شہری اور مزدوروں کے گھر والے نائٹروگلیسرین کے خلاف تھے۔ ان کے خیال میں یہ مادہ انتہائی خطرناک تھا۔ اس حادثے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے اور ہلاک ہونے والوں کے اہلِ خانہ میئر کے پاس جا پہنچے۔ دراصل اس سارے ہنگامے کے پیچھے بارود بنانے والی صنعت کے مالکان تھے جنہیں اپنے کارخانے بند ہوتے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نائٹروگلیسرین کے خلاف تعصب پھیلایا اور لوگ ان کے جھانسے میں آ گئے۔

اسی شام جب پروفیسر واپس شہر میں اپنے ہوٹل پہنچا تو وہاں پہلے سے ایک ہجوم جمع تھا جو اس کے خلاف غم و غصے کا اظہار کر رہا تھا۔ ان میں مرنے والوں کے اہلِ خانہ بھی تھے جو پروفیسر کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنے پیاروں کی موت کا ذمے دار قرار دے رہے تھے۔ ایسے میں کسی نے اطلاع دی کہ پروفیسر کے کمرے میں اس خطرناک مادے سے بھری ایک بوتل ہے جو پورے ہوٹل کو اڑانے کے لیے کافی ہے۔ اس پر ہوٹل میں دہشت پھیل گئی۔ دوسرے مسافر انتظامیہ سے مطالبہ کرنے لگے کہ پروفیسر کو نہ صرف ہوٹل سے بلکہ شہر سے بھی نکال دیا جائے جو اتنا خطرناک مادہ اتنی بے پروائی سے چھوڑ جاتا ہے۔ چنانچہ پروفیسر کو ہوٹل آتے ہی وہاں سے روانگی کا نوٹس مل گیا۔

اس پر پروفیسر خاموشی سے اپنے کمرے میں گیا اور وہ بوتل اٹھا کر لے آیا پھر اس نے سب کے سامنے بوتل منہ سے لگا کر اس میں موجود شے حلق سے نیچے اتار لی۔ ''صاحبو! اس میں مارفین ہے۔ اگر کسی صاحب کو شک ہے تو وہ خود بھی اسے چکھ سکتے ہیں'' پروفیسر نے بوتل لہرا کر شگفتہ لہجے میں کہا۔

اس مظاہرے نے لوگوں پر اچھا اثر ڈالا تھا اور ان کی طرف سے مخالفت میں کمی آ گئی۔ لوگوں کے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جانے پر شرپسند اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے۔ اس پر والٹر اسٹیلے کے حسنِ سلوک نے مزدوروں کے رہے سہے خدشات بھی دور کر دیے۔ اس نے مرنے والے مزدوروں کے اہلِ خانہ کو ایک ایک ہزار ڈالرز دیے اور زخمی ہونے والے افراد کی صحت یابی تک ان کی تنخواہیں بحال رکھنے کا اعلان کیا۔ یہی نہیں' بلکہ اس نے ان کے علاج کی ساری ذمے داری بھی لے لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کام کی رفتار اپنی مناسب سطح پر آ گئی۔ اس حادثے سے والٹر کو خاصا مالی نقصان ہوا تھا لیکن اس کام کو مکمل کرنے کے لیے وہ ہر پریشانی اور ہر طرح کا مالی نقصان برداشت کرنے کو تیار تھا۔ کام ایک بار پھر پوری رفتار سے ہونے لگا۔

لیکن ابھی والٹر نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا کہ ستمبر کا مہینہ آ گیا اور بے پناہ بارشیں شروع ہو گئیں۔ بارشیں اتنی شدید اور اتنی زیادہ تھیں کہ انہوں نے کام کرنا دوبھر کر دیا تھا۔ سرنگ کے مختلف حصوں میں بار بار پانی بھر جاتا تھا۔ جسے نکالنے کے لیے پمپ چلانے پڑتے تھے۔ ہر روز کی بارش سے علاقے کی ساری ندیوں اور نالوں میں طغیانی کی کیفیت تھی۔ وہ راستہ جس سے نائٹروگلیسرین لے جانے والی گھوڑا گاڑی اوپر جاتی تھی بارشوں کے سبب ٹوٹ پھوٹ کر دشوار گزار ہو گیا تھا اور اس پر گاڑی لے جانے میں بے پناہ مشکلات پیش آنے لگی تھیں۔ حتیٰ کہ کئی بار گھوڑا گاڑی لے جانے والے کارکنوں کو حادثہ پیش آیا۔ انہوں نے دھماکے کے خوف سے خود زخم کھا لیے لیکن گاڑی کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ کئی کارکن شدید زخمی ہوئے۔ مگر اس سے بھی زیادہ دراصل یہ نائٹروگلیسرین کا خوف تھا جس کے سبب کارکنوں نے گھوڑا گاڑی لے جانے سے انکار کر دیا۔

والٹر کو اس انکار سے شدید دھچکا پہنچا تھا۔ کیونکہ نائٹروگلیسرین کی مدد کے بغیر سرنگ کے آگے بڑھنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے کارکنوں کو ترغیبات دیں۔ انہیں لالچ دیا لیکن کوئی کارکن یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ والٹر نے پروفیسر سے کہا ''لگتا ہے بارشیں رکنے اور راستہ بہتر

ہونے تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے۔''

اگرچہ پروفیسر اس منصوبے میں مالی طور پر شریک نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کا شراکت دار تھا' اس کے باوجود والٹر ہر کام میں اسے آگے رکھتا تھا اور سارے ہی امور پروفیسر کے مشورے سے طے پاتے تھے۔ اس نے اب تک پروفیسر کو خام مال اور رقم کے معاملے میں تکلیف نہیں ہونے دی تھی' اس کا ہر مطالبہ فوراً مانا تھا۔ اسی وجہ سے پروفیسر اس پروجیکٹ کے لیے اس طرح فکرمند رہتا تھا جیسے یہ اس کا اپنا پروجیکٹ ہو۔ والٹر کی بات کا مفہوم سمجھنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ بارشیں گزرنے کا انتظار کرنے کا مطلب تھا کہ وہ پروجیکٹ کی طے شدہ مالیت سے زیادہ خرچ پر مجبور ہو جاتے۔ اس نے گہری سانس لے کر اپنے دوست سے کہا۔

''تم فکر مت کرو۔ نائٹروگلیسرین میں خود لے کر جاؤں گا۔''

پروفیسر اگلے چار پانچ دن کی ضرورت کے مطابق دھماکا خیز مادہ بنا کر ایک ساتھ اگلی تعمیراتی جگہ پہنچا دیا کرتا تھا۔ گزشتہ دو روز سے دھماکا خیز مادہ نہ ہونے کی وجہ سے برائے نام ہی کام ہو رہا تھا۔ پروفیسر نے تیار شدہ نائٹروگلیسرین کے کنستر گھوڑا گاڑی پر بار کرائے اور خود اسے لے کر نکلا۔ اس وقت بھی ہلکی بارش جاری تھی مگر جب وہ پہاڑی پر پہنچا تو نہ صرف بارش میں بے پناہ تیزی آ گئی تھی بلکہ بجلی بھی رہ رہ کر کڑک رہی تھی اور بادلوں کی گرج سے دل دہل رہے تھے۔ اسے خوف تھا کہ کسی گرج کے ارتعاش سے کہیں نائٹروگلیسرین نہ پھٹ جائے۔ ان حالات میں وہ جیسے تیسے گھوڑا گاڑی لے کر مقررہ مقام پر پہنچا۔ اس نے کارکنوں کی مدد سے دھماکا خیز مادہ مقررہ جگہوں پر لگایا اور واپسی کے لیے چل پڑا لیکن جب وہ سرنگ کے مشرقی دہانے پر پہنچا تو اس نے وہاں ایک خوفناک منظر دیکھا۔ زمین پر قطاروں میں لاشیں پڑی تھیں۔ جن پر عورتیں اور بچے بین کر رہے تھے۔ سامنے سے کارکن سرنگ سے مزید لاشیں نکال کر لا رہے تھے۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ عورتیں اسے نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ سامنے سے غم زدہ اسٹیٹے چلا آ رہا تھا۔ پروفیسر لپک کر اس کے پاس پہنچا ''کیا ہوا ہے؟''

شدت غم سے والٹر کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بہ مشکل اتنا کہا ''بجلی..... نائٹروگلیسرین۔''

کچھ دیر میں پروفیسر پر واضح ہو گیا کہ یہ ساری کارستانی آسمانی بجلی کی تھی۔ کڑک کے ساتھ بجلی گری اور لوہے کی راڈ سے ہوتی سرنگ میں بچھائی جانے والی فولادی پٹریوں سے ہوتی' ان حصوں تک جا پہنچی جہاں نائٹروگلیسرین لگائی گئی تھی۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ مزدوروں کو جان بچا کر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کچھ تو براہ راست جان لیوا برقی رو کا شکار ہو گئے اور جو باقی بچے وہ نائٹروگلیسرین کے دھماکوں کی نذر ہو گئے۔ پروفیسر نے اندر جا کر دیکھا۔ یہاں بھی امدادی کارروائیاں جاری تھیں۔ ملبے تلے سے دس لاشیں نکالی جا چکی تھیں۔ ہر طرف خون اور گوشت کے لوتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

شہر میں یہ خبر پھیلتے ہی مزدوروں کے اہل خانہ اور دوسرے افراد ہوزاک کی طرف چل پڑے۔ وہ سب غم و غصے سے بھرے ہوئے تھے اور پروفیسر کی نائٹروگلیسرین کو اس سانحے کا ذمے دار قرار دے رہے تھے۔ دوسری طرف اوہام پرست لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ سرنگ ہی منحوس ہے۔ یہ جہنم کا راستہ ہے اور اس سے سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا اس لیے اس پر کام بند کر دینا چاہیے۔ بلکہ اس سرنگ کو پاٹ دینا چاہیے تاکہ مستقبل میں کوئی طالع آزما لوگوں کی جانوں سے نہ کھیل سکے۔

اگلی صبح جب طلوع ہوئی تو ہوزاک سرنگ کا مستقبل تاریکی میں ڈوبتا نظر آ رہا تھا۔ مشرقی دہانے پر ایک فرد بھی کام کرنے نہیں آیا تھا اور مغربی دہانے پر بھی چند ایک مزدور ہی آئے تھے۔ مزدوروں نے دہشت کے مارے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جب تک بارشیں نہیں رک جاتیں نائٹروگلیسرین سے کام نہ لیا جائے۔ لیکن ایسا کرنے کا مطلب تھا' کام نہ کرنا۔ نائٹروگلیسرین کے بغیر سرنگ کی تعمیر دیوانے کے خواب سے کم نہیں تھی۔ ابھی والٹر مزدوروں کو قائل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک مصیبت اور نازل ہو گئی۔

جب پے در پے حادثات کی خبریں بوسٹن پہنچیں' جو ریاست میساچوسٹس کا دارالحکومت بھی تھا تو اس منصوبے کے مخالفوں نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔ انہوں نے ریاستی حکومت کو قائل کرنے کی کوشش شروع کر دی کہ یہ منصوبہ سوائے ناکامی اور بربادی کے کچھ نہیں ہے' اس لیے اسے فی الفور ترک کر دینا چاہیے۔ اس بار مخالفین کی کوشش کامیاب رہی۔ اور ریاستی کمیٹی نے اسٹیٹے کارپوریشن کی طرف سے بھیجے جانے والے بلوں کی ادائیگی روک دی۔ یہ ایک اور دھچکا تھا۔ اسٹیٹے کارپوریشن کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ اپنے پاس موجود سرمایہ وہ اس منصوبے میں جھونک چکے تھے۔ اب ان کے پاس اتنی رقم بھی نہیں رہی تھی کہ روزمرہ کے اخراجات بھی

پورے کر سکیں۔

سونے پہ سہاگا کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ارکان کو تحقیقات کے لیے ہوزاک بھیجے گی تاکہ اصل صورتِ حال سامنے آئے۔ والٹر کو جب ان لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ تمام مزدور کام چھوڑ کر جا چکے تھے۔ مسلسل بارشوں اور حادثے کی وجہ سے سرنگ کی ظاہری حالت ایسی ہو رہی تھی کہ یہ سرنگ کے بجائے اس کا کھنڈر لگ رہی تھی۔ اس حالت میں اگر کمیٹی کے تفتیشی ارکان سرنگ کا معائنہ کرتے تو وہ یہی فیصلہ کرتے کہ یہ منصوبہ ناکام ہو چکا ہے۔ اس صورت میں اسٹیٹے کارپوریشن مالی تباہی کا شکار ہو جاتی۔ اس کے لاکھوں ڈالرز اس منصوبے پر صرف ہو چکے تھے اور ریاست اگر بل روک لیتی تو ان کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جاتی۔

والٹر اور پروفیسر سخت پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تفتیشی کمیٹی میں اکثر ارکان ایسے تھے جو ان کے پروجیکٹ کے مخالف یا سخت دشمن تھے۔ ان سے کسی صورت بھلائی کی توقع نہیں تھی کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے جو منصوبہ اعلیٰ توقعات اور خوش فہمیوں کی روشنی میں شروع کیا تھا اس کا حشر تقریباً ایسا ہی ہوا تھا جیسا کہ اس سے پہلے ہوزاک سرنگ کے لیے تیار کیے جانے والے دوسرے پروجیکٹس کا ہو چکا تھا۔ ایک ابر آلود شام والٹر پروفیسر سے ملا۔ دونوں بے حد دکھی تھے۔ خاص طور سے والٹر۔ اسے تو اپنا مستقبل ہی تاریک نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ ہوزاک سرنگ سے شکست کھا جاتا تو آئندہ کبھی اسٹیٹے کارپوریشن کو کوئی بڑا ٹھیکا نہ ملتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ وہ ہوزاک سرنگ مکمل کرے اور اس کے لیے بے حد ضروری تھا کہ ریاست کی حکومت ان کے بل ادا کرے۔

''پروفیسر' ہمیں بہرصورت سرنگ پر کام جاری رکھنا ہوگا۔''

جس وقت والٹر یہ الفاظ کہہ رہا تھا' تقدیر اس کے ساتھ ایک اور سنگین مذاق کرنے جا رہی تھی۔ پروفیسر جو کچھ دیر پہلے پہاڑوں سے آ رہا تھا' اس نے اسٹیٹے سے پوچھا۔ ''کیا آج تم سرنگ کی طرف گئے تھے؟''

والٹر اس سوال پر چونک گیا ''کیوں' کیا ہوا؟''

''میں کچھ دیر پہلے ہی وہاں سے آ رہا ہوں۔ مشرقی دہانے سے کچھ دور جو نالا بہتا ہے اس کے اوپری حصے میں جھاڑیاں اور طوفان سے ٹوٹ جانے والے درختوں کا کچرا اس طرح پھنس گیا ہے کہ اس نے اوپر ایک بند سا بنا دیا ہے۔ اس کے عقب میں پانی جھیل کی صورت میں جمع ہو رہا ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ پانی سرنگ میں جا رہا ہوگا۔''

''میرے خدا!'' والٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا ''یہ تو ہماری ساری محنت کو برباد کر دے گا۔ ہمیں جلد سے جلد وہاں پہنچنا ہوگا۔''

پہاڑوں کے اوپر بارش مسلسل جاری تھی اور جب وہ دونوں روانہ ہوئے تو بارش میں اور بھی تیزی آ گئی تھی۔ جب وہ اوپر پہنچے تو پروفیسر کے خدشات کے عین مطابق کچرے کے بند کے عقب میں بننے والی جھیل کا پانی سرنگ کے دہانے میں داخل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جب تک یہ بند قائم تھا سرنگ کی طرف پانی کے بہاؤ کو روکنا ناممکن تھا۔

''پروفیسر' ہمیں ہر صورت میں پانی کو سرنگ میں داخل ہونے سے روکنا ہوگا'' والٹر نے چلّا کر کہا۔

پروفیسر موبرے نے بہ غور صورتِ حال کا جائزہ لیا اور بولا ''اس کی ایک ہی صورت ہے۔ بند کو نائٹروگلیسرین سے اڑا دیا جائے۔ تب ہی سرنگ تباہی سے بچ سکتی ہے۔''

''ہاں یہ حل ممکن ہے'' والٹر خوشی سے اچھل پڑا تھا۔

''اب سوال یہ تھا کہ اس کام کو کرے گا کون؟ اول تو نائٹروگلیسرین کو بند تک لے جانا' پھر اسے وہاں لگانا۔ تار کو نیچے بیٹری تک لانا۔ یہ سارے کام بڑے حوصلے والے آدمی کے لیے ہی ممکن تھے۔ اس وقت بھی بارش جاری تھی اور بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ ذرا سی غلطی یا بجلی کی ایک چمک نائٹروگلیسرین کو اٹھا کر لے جانے والے کے بھی پرخچے اڑا دیتی۔ کارکن سارے جا چکے تھے اور جو ابھی موجود تھے وہ سرنگ کے کام کو ہاتھ لگانے کو تیار نہ تھے.... نہ کہ نائٹروگلیسرین کے پاس بھی جاتے۔ والٹر نے جس سے بھی درخواست کی اس نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ وہ ہزار کوشش کے باوجود کسی کو بند اڑانے پر آمادہ نہ کر سکا تھا۔ آخر میں اس نے مایوسی سے پروفیسر سے کہا۔

''لگتا ہے تباہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ہمارے مخالفین کو ہمارا مذاق اڑانے کا موقع مل جائے گا۔''

اس وقت پروفیسر کو اس پُرعزم نوجوان کی مایوسی پر ترس آنے لگا۔ وہ بلاشبہ ایک اچھا اور مہربان شخص تھا۔ پروفیسر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

''دوست اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔''

''آپ بتائیے کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے؟'' والٹر پہلی بار جھنجلایا تھا ''کون کرے گا یہ کام؟''

''تم فکر نہ کرو۔ میں نائٹروگلیسرین لے کر جاؤں گا اور

اس بند کو اڑا دوں گا۔''

''آپ؟'' والٹر خوشی سے اچھل پڑا تھا ''ہاں' آپ ہی یہ مشکل کام کر سکتے ہیں۔'' اس نے تشکر آمیز نظروں سے پروفیسر کو دیکھا۔

پروفیسر نے ایک کنستر نائٹروگلیسرین کا لیا۔ تاریں اپنی کمر سے باندھیں اور گھٹنوں کے بل اوپر کی طرف جانے لگا۔ وہ عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس کا جسم کمزور تھا لیکن اس کا حوصلہ جوانوں سے بھی زیادہ جوان تھا۔ اوپر جانے کا راستہ تقریباً عمودی تھا۔ اس پر چڑھتے ہوئے خود کو سنبھالنا بھی کسی کارنامے سے کم نہیں تھا۔ پروفیسر کے ہاتھ میں پندرہ کلوگرام نائٹروگلیسرین کا کنستر بھی تھا۔ بند کے پاس پہنچ کر اوپر جانے کا راستہ اور بھی دشوار ہو گیا تھا کیونکہ یہ مٹی یا پتھر کے بجائے درختوں کی شاخوں' تنوں اور پتھروں سے نہایت بے ڈھنگے پن سے بنا تھا۔ بعض مقامات پر پانی کی وجہ سے اتنی پھسلن تھی کہ وہاں قدم جمانا ناممکن تھا۔ کئی جگہ پروفیسر ایسے ڈگمگایا کہ دیکھنے والوں کے دل دہل گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مقام پر لڑھکنے کا کیا مطلب ہے۔

اچانک بند کے اوپر سے بہہ کر آنے والا ایک تختہ پروفیسر کے پیروں سے ٹکرایا۔ اسٹیلے کے منہ سے چیخ نکلی تھی لیکن اس سے پہلے ہی پروفیسر قلابازیاں کھاتا نیچے نالے کی طرف جانے لگا۔ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئی تھیں اب بہ ظاہر پروفیسر کا بچنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مگر قدرت ایسے ہی موقعوں پر اپنے کرشمے دکھاتی ہے۔ معجزانہ طور پر پروفیسر نالے کے عین اوپر اگی درخت کی شاخوں میں اس طرح پھنس گیا کہ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور وہ سر کے بل لٹکا ہوا تھا۔ ابھی تک اس کے دائیں ہاتھ نے نائٹروگلیسرین کا کنستر تھام رکھا تھا۔ صورتِ حال بے حد سنگین تھی۔ بڑے بڑے دل گردے والے ایسے موقع پر حوصلہ ہار جاتے۔ پروفیسر صرف گرنے کے خطرے سے دوچار نہیں تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں دبا نائٹروگلیسرین کا ڈبا چھوٹ کر کسی پتھر سے جا ٹکراتا تو ہونے والے دھماکے سے اس کے پرخچے بھی اڑ جاتے۔ معاً پروفیسر کا ایک پاؤں شاخوں سے نکل گیا' اب اس کی زندگی کا دارومدار اس پیر پر تھا جو اب تک شاخوں میں پھنسا ہوا تھا۔

دیکھنے والے پروفیسر کی موت کا یقین کر چکے تھے لیکن دوسری طرف پروفیسر خود کو بچانے کی سعی کر رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب ٹٹولی جہاں چاقو ہونے کا امکان تھا لیکن یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ گرنے کے دوران میں چاقو اس کی جیب سے نکل گیا تھا۔ چاقو کی طرف سے مایوس ہو کر اسے اپنی بیلٹ کا خیال آیا۔ اس کی مدد سے وہ کنستر کو درخت کی شاخ سے لٹکا کر پھر خود اوپر ہونے کی کوئی تدبیر کر سکتا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ایک ہاتھ سے بیلٹ کھول لی۔ پھر اس کا ہک کنستر کے کنڈے میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی گیلی انگلیاں پھسل رہی تھیں اور ہک کنڈے میں نہیں پھنس رہا تھا۔ کنستر پر اس کی گرفت بھی کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اسے ہر لمحے خطرہ لگا تھا کہ ابھی کنستر اس کے ہاتھ سے نکل کر کسی باہر نکلی چٹان سے ٹکرائے گا اور اس کو بھی لے ڈوبے گا۔ وہ اپنی ہی ایجاد کے ہاتھوں فنا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

کنستر کے وزن کی وجہ سے اس کا دایاں ہاتھ نیچے تھا اور بائیں ہاتھ سے ہک لگانے کی کوشش بار آور ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر کنستر پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ اور پھر دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ کنستر پروفیسر کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں تیرتا نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ کمزور دل حضرات نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ ابھی یہ کنستر کسی باہر نکلی چٹان سے ٹکرائے گا اور پروفیسر کے جسم کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ مگر قدرت کو ابھی پروفیسر کی زندگی منظور تھی۔ کنستر ابھری چٹانوں کے درمیان سے نکلتا سیدھا نالے کے پانی میں ڈوب گیا۔ اور پھر ذرا آگے جا کر پھٹ گیا۔ پانی کا ایک عظیم الشان فوارہ فضا میں بلند ہوا لیکن اس سے پروفیسر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ہاتھ آزاد ہو جانے کے بعد اس کے لیے خود کو اوپر اٹھا لینا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

''پروفیسر واپس آ جاؤ'' اسے نظر نہ دیکھ کر اسٹیلے چلایا۔

اصولاً تو پروفیسر کو اسٹیلے کی بات مان لینا چاہیے تھی مگر اس موقع پر اس کی انگریز فطرت آڑے آئی۔ وہ جس کام کے لیے آیا تھا اسے ادھورا چھوڑ کر جانا اسے اپنی مردانگی کے خلاف لگا۔ اس نے نیچے آنے سے انکار کر دیا۔

''نائٹروگلیسرین کا ایک اور کنستر بھیجو' میں بند اڑا کر ہی آؤں گا۔''

پہلے تو اسٹیلے نے انکار کیا۔ اسے پروفیسر کی سلامتی بھی عزیز تھی لیکن بالآخر وہ مان گیا۔ اس نے ایک باہمت نوجوان کو راضی کر لیا کہ وہ کنستر اوپر تک پہنچائے۔ اس نوجوان نے دوسرا طریقہ اختیار کیا' اس نے کنستر اپنی کمر پر باندھا اور پروفیسر کی نسبت زیادہ آسانی سے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے بعد پروفیسر نے ایک موزوں مقام پر یہ کنستر لگایا۔ اس میں تاریں نصب کیں اور تار بچھاتا نیچے تک آ گیا۔ اسٹیلے نے بے اختیار اسے گلے لگا لیا۔ وفورِ جذبات سے اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ پروفیسر نے تاریں بیٹری سے لگائیں اور جب اس نے بیٹری

کا بٹن دبایا تو زوردار دھماکے کے ساتھ نالے میں پھٹنے والے درختوں کے تنے شاخیں اور پتھر فضا میں بلند ہوئے۔ نائٹروگلیسرین کے کنستر نے بند کے پرخچے اڑا دیے تھے اور نالا اپنی پوری روانی سے اپنے راستے پر بہنے لگا تھا۔ انہوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ اوپر جھیل میں پانی کی سطح گرنے لگی تھی اور ذرا ہی دیر میں یہ اتنی کم ہو گئی کہ سرنگ میں داخل ہونے والا پانی رک گیا تھا۔ والٹر نے اسی وقت جا کر خود سرنگ سے پانی نکالنے والا پمپ چلانا شروع کر دیا اور چند گھنٹوں کی مشقت کے بعد ہی اس نے سرنگ میں جانے والا سارا ہی پانی باہر نکال دیا تھا۔

اس وقت بھی کئی سو افراد، جن میں بیشتر کارکن تھے، اپنے مالکوں کی ہمت اور جرأت کا نظارہ کر رہے تھے کہ کس طرح انہوں نے جان پر کھیل کر نہ صرف سرنگ کو تباہ ہونے سے بچایا تھا بلکہ ان کے روزگار کو بھی بچا لیا تھا۔ یہ سرنگ کتنی ہی خطرناک اور منحوس سہی لیکن اس کی بدولت ان کے گھروں میں چولہے جلا کرتے تھے۔ پروفیسر کی جرأت نے دیکھتے ہی دیکھتے ماحول کو بدل دیا تھا۔ مزدوروں کو احساس ہوا کہ صرف وہی نہیں بلکہ ان کے مالک بھی خطرات سے کھیل رہے تھے۔ اس سرنگ کی تکمیل نہ صرف ان کے روزگار کی ضمانت تھی بلکہ ایک بار سرنگ مکمل ہو جاتی تو آنے والے برسوں کے لیے اس پورے علاقے کے لیے خوشحالی کا دروازہ کھل جاتا۔ بس یہ ایک بار کی مشقت تھی اس کے بعد چین ہی چین تھا' ان کے لیے بھی اور ان کی آنے والی نسلوں کے لیے بھی۔

اگلے روز مزدوروں کی توقع سے فیصد تعداد کام پر لوٹ آئی تھی اور وہ محض کام پر ہی نہیں آئے تھے بلکہ اس عزم کے ساتھ آئے تھے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ سرنگ کو مکمل کر کے دم لیں گے۔ چاہے حادثات ہوں۔ چاہے ان کی جان جائے۔ اگلے روز برسات زور شور سے جاری تھی لیکن کام اس سے بھی زیادہ رفتار سے ہو رہا تھا۔ چند دن کے اندر سرنگ سے سارا ملبہ صاف کر دیا گیا۔ اب پروفیسر کو ایسے رضاکار بھی میسر آ گئے تھے جو نائٹروگلیسرین کو دھماکا کرنے کے مقام تک لے جاتے تھے اور وہ پوری دل جمعی سے نائٹروگلیسرین کی تیاری میں لگ گیا تھا۔

بوسٹن تک جو اطلاعات پہنچی تھیں ان سے لگ رہا تھا کہ سرنگ بالکل تباہ ہو گئی ہے اور وہاں ایک فرد بھی کام کرتا نظر نہیں آئے گا لیکن جب کمیٹی کے اراکین ہوزاک پہنچے تو وہاں انہوں نے ایک اور ہی منظر دیکھا۔ خراب موسمی حالات اور دشوار راستوں کے باوجود کارکن اتنے جوش و لگن سے کام کر رہے تھے کہ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے جتنے بھی لوگوں سے بات کی انہوں نے اسٹیلے اور پروفیسر کی تعریف کی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس سرنگ کی تکمیل میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ کام کی رفتار بھی ایسی تھی کہ لگ رہا تھا کہ منصوبہ اپنی مدت سے پہلے ہی مکمل ہو جائے گا۔ اس کمیٹی نے واپس جا کر اسٹیلے کارپوریشن کے حق میں رپورٹ دی اور ان کے بلوں کی ادائیگی ہونے لگی۔

ہوزاک سرنگ پر اس کے بعد بھی کام اسی رفتار سے جاری رہا۔ اگرچہ بعد میں بھی کئی حادثات پیش آئے، جس میں اور بھی کئی افراد نے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے لیکن لوگوں کے دلوں سے وہم نکل چکا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ اس قسم کے کاموں کے لیے قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر قومی اہمیت کے منصوبے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتے اور قومیں ترقی نہیں کرتیں۔ اگلے تین سال تک ہوزاک سرنگ پر کام ہوتا رہا اور آخر کار وہ وقت آ گیا جب یہ آر پار مکمل ہونے والی تھی۔

16 نومبر 1873ء کے دن ہوزاک سرنگ کے مشرقی دہانے پر ہزاروں افراد جمع تھے۔ ان میں پریس کے نمائندے' اعلیٰ سرکاری حکام اور ہزاروں کی تعداد میں محنت کش تھے' جنہوں نے اس سرنگ کی تکمیل میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ پروفیسر اس وقت ایک برقی سوئچ کے پاس کھڑا تھا۔ اسے بٹن دبا کر تقریباً ایک سو پینسٹھ پاؤنڈ نائٹروگلیسرین سے اس آخری چٹان کو اڑانا تھا جو دونوں طرف سے بننے والی سرنگوں میں آخری رکاوٹ بھی تھی۔ اس کے بعد راستہ کھل جاتا۔ والٹر اسٹیلے بے حد خوش تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں تعمیرات کی دنیا کا معجزہ کر دکھایا تھا۔ اس نے ڈائس پر آ کر لوگوں سے کہا ''خواتین و حضرات! وہ شخص جس کی بدولت آج ہوزاک کی سرنگ اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے صرف اور صرف پروفیسر موبرے ہیں۔ ابھی یہ بٹن دبا کر دونوں طرف سے سرنگوں کے درمیان آخری رکاوٹ کو بھی اڑا دیں گے اور آپ ایک عظیم الشان منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچتے دیکھیں گے۔''

پھر جیسے ہی پروفیسر نے بٹن دبایا' سرنگ کا آخری حصہ ایک دھماکے سے صاف ہو گیا اور دوسری طرف سے آتی سورج کی روشنی صاف نظر آنے لگی۔ یہ ایسا منظر تھا کہ لوگ وفورِ مسرت سے پاگل ہو گئے۔ وہ سیٹیاں بجانے اور اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھالنے لگے۔ بالآخر عزمِ انسانی نے پہاڑوں کو شکست دے کر ان میں راہ نکال لی تھی۔

عجائباتِ عالم

دنیا کے سات عجائبات کا اکثر تذکرہ ہوتا ہے لیکن ایسے بہت ہی کم افراد ہوں گے جو ان سات عجائبات سے واقف ہوں۔ بہت سوں کو تو ان کے نام تک نہیں معلوم ہوں گے۔ یہ عجائبات دراصل عمارتیں ہیں اور اپنی تعمیراتی ندرت کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ یہ عمارات صدیوں تک اس زمین پر موجود رہ کر دیکھنے والوں کو حیران کرتی رہیں۔ ان عمارات کو محض عمارات ہی نہیں بلکہ انسان کی قوتِ متخیلہ اور قوتِ عمل کا مظہر بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان میں جہاں انسانی اقدار کی عظمتیں اور اس کے جمالیاتی ذوق کی جھلکیاں ملتی ہیں وہیں ان سے انسان کی عالی حوصلگی اور عزائم کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کسی ایک شخصیت کی کہانی بیان نہیں کرتیں بلکہ ان میں مختلف ادوار کی مختلف شخصیات کی سوچوں کی اڑانوں، بازوؤں کی قوت اور ارادوں کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں پڑھ کر اور انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انسان موجودہ جدّت طرازی کے دور سے سیکڑوں سال قبل بھی تخلیق کاری اور تعمیراتی مہارت کی بلندیوں پر تھا۔

اس جگہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر سات ہی کیوں؟ اس کی وجہ ہر کسی کو نہیں معلوم۔ یہ معاملہ کچھ یوں ہے کہ سن عیسوی کے آغاز سے کافی پہلے، بیبلن کے دور کے اسکندریہ میں ایک شخص فیثاغورث گزرا ہے۔ جو ایک ماہر ریاضی داں اور فلسفی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''سات'' کا عدد متبرک اور مقدس چیزوں سے متعلق عدد ہے۔ چینی علامت کاری یعنی Symbolism میں بھی سات کا عدد نمایاں تر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح یونانی آرٹ میں بھی سات کے عدد کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ عبرانی دور میں بھی اس عدد کو ''تکمیل'' کا عدد سمجھا جاتا ہے کہ اس میں عدد چار اور عدد تین شامل ہیں جو اپنی جگہ اشکال کی وجہ سے مکمل سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے مثلث اور مربع کا ملاپ۔ انجیل اور کتابِ پیدائش میں اس کا بہت تذکرہ ہے۔ مثلاً ''سبت'' کے سات دن یا یونان کے سات دانش مند۔ یا ایلی سس کے سات خوابیدہ یا روم کے مقدس شہر کی سات پہاڑیاں، شیکسپیئر نے آدمی کی عمر کو سات ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ سات سمندر، سات براعظم وغیرہ۔ یہ سب کے سب اسی عدد سات کی اہمیت کو اجاگر کرنے والے ہیں۔

دنیا کے ان سات عجوبوں کی قدیم فہرست سے جس شخص نے ہمیں سب سے پہلے روشناس کرایا وہ آج سے کوئی دو ہزار سال پہلے گزرا تھا۔ اس کا ذکر Antipator of Sidon کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ شخص قدیم زبانوں کے پڑھنے کا ایک ماہر تھا۔ اس نے ایک ٹریول گائیڈ بک بھی تصنیف کی تھی۔

یہ تمام کے تمام عجوبے بحیرۂ روم کے آس پاس ہی بنے ہوئے تھے۔ اہرام مصر کو چھوڑ کر کوئی چھٹی صدی قبل مسیح سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک یونان کے ساحلی حصے میں تھا۔ اسی طرح ایک یونانی جزائر میں سے ایک پر تھا اور بقیہ ایشیا یا افریقہ میں تھے۔

فہرست میں سب سے پہلا نام جس عجوبے کا ہے وہ ''فرعون خوفو کا اہرام'' ہے۔

یہ اہرام مصر کے دریائے نیل کے مغربی کنارے، اسکندریہ سے کوئی ایک سو ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ اہرام کوئی بارہ ایکڑ اراضی پر محیط ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اسے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی کوئی دو ہزار ستر سال قبل کا قرار دیا گیا ہے۔ دس سال تک تو صرف اس کی بنیاد رکھنے میں لگے تھے اور قدیم مؤرخ ہیروڈوٹس کے مطابق اس کے بعد کوئی بیس سال تک ہزار ہا مزدور اس مقبرے کو مکمل کرنے کے لیے کام کرتے رہے تھے۔ اس عظیم عمارت کی تعمیر برسہابرس کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ تھی۔ معلوم نہیں کتنے سال تک تو اسی کام میں صرف ہوئے تھے جس کے لیے یہ مقبرہ تعمیر ہوا تھا۔ یعنی مردہ فرعون کی لاش کو اس وقت تک محفوظ کرنے کے لیے جب تک موت کے بعد دوسری زندگی کے ملنے کا وقت نہ آتا۔ اس مقبرے کی ہر دیوار کی لمبائی سات سو چھپن فٹ تھی اور چوڑائی ایک سو چالیس میٹر (سوا چار سو فٹ سے زیادہ) اس کی چوٹی کی ناپ ایک سو چونتیس میٹر (چار سو فٹ سے زیادہ) تھی۔ کتنا وقت گزر چکا ہے کہ یہ عمارت اپنی تمام تر شکستگی کے باوجود آج بھی اس دور کے فنِ تعمیر کے ایک شاندار نمونے کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس مقبرے سے تھوڑے ہی فاصلے پر ''ابوالہول'' بھی بنا ہوا ہے جو Great Sphinx of Gizeh کہلاتا ہے۔

☆☆☆

فہرست میں دوسرا عجوبہ بابل کے معلق باغات Hanging Gardens of Babylon کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی تعمیر شاہ بخت نصر دوئم Nebuchadnezzar II نے کرائی تھی جو بے بی لونیا کا بادشاہ تھا اور جس کا دورِ حکومت چھٹی صدی قبل مسیح سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بابل کا شہر ایک عظیم الشان شہر گردانا جاتا تھا۔ یہ باغ متعدد پلیٹ فارم یا تھوں پر مشتمل تھا جو تلے اوپر بنے ہوئے تھے۔ یہ بہت بلند محرابوں پر قائم تھے اور ان میں دنیا بھر کے رنگا رنگ پودے اور پھول لگائے گئے تھے، جنہیں بے شمار فواروں سے سینچا جاتا تھا۔ یہ خوب صورت عجوبہ اب باقی نہیں، صرف اس کے کھنڈرات ہی رہ گئے ہیں۔

دنیا کا تیسرا عجوبہ ''زیوس دیوتا کا مجسمہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک دیوپیکر مجسمہ تھا اور اس کے تخلیق کار کا نام Phidias تھا۔ فیدیاس ایک یونانی نژاد مجسمہ ساز تھا۔ یہ مجسمہ بارہ میٹر بلند تھا۔ اسے Ivory (ہاتھی دانت) اور سونے سے بنایا گیا تھا۔ زیوس کا یہ مجسمہ چار سو بیاسی سال قبل مسیح میں بنایا گیا تھا۔ ''زیوس'' کو یونانی دیومالا میں خداوند کا درجہ حاصل ہے۔ کہتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی میں ایک زلزلہ آیا تھا اور یہ مجسمہ اسی میں زمین بوس ہوگیا تھا۔ عیسوی دورِ حکومت میں اسے اٹھا کر قسطنطنیہ لایا گیا تھا اور پھر اسے نذرِ آتش کر دیا گیا۔

☆☆☆

ڈائنا کا مندر عجائباتِ عالم میں چوتھے نمبر پر ہے۔ یہ Ephicon کے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا۔ دور تھا سکندرِ اعظم کا۔ یعنی کوئی چوتھی صدی قبل مسیح۔ اس کے سائز کا تخمینہ تقریباً سو بیالیس فٹ لگایا گیا ہے۔ اس کی چوڑائی کوئی پچاس میٹر تھی۔ اسے گوتھ قوم نے حملہ کر کے دو سو باسٹھ عیسوی میں تباہ کر دیا تھا۔ یہ عمارت سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی تھی جس میں کوئی ایک سو ستائیس کے قریب بڑے پتھر استعمال کیے گئے تھے۔

☆☆☆

پانچویں نمبر پر جو عمارت عجائباتِ عالم میں شامل ہے وہ ہیلی کارناسس پر بنا ہوا ایک مقبرہ تھا۔ اسے ملکہ آرٹی میسیا نے اپنے شوہر بھائی Mausolus of Caria کی یادگار کے طور پر تعمیر کرایا تھا جس کا انتقال سن تین سو تریپن قبل مسیح میں ہوا تھا۔ یہ سنگِ مرمر کا بنا ہوا مقبرہ تھا۔ اس کی بلندی ایک سو چالیس فیٹ تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ بھی پندرہویں صدی عیسوی میں کسی زلزلے سے تباہ ہوگیا تھا۔

☆☆☆

چھٹا عجوبہ Colossus of Rhodes کے نام سے موسوم ہے۔ یہ دراصل ایک فیل پیکر مجسمہ تھا جو تانبے سے بنایا گیا تھا۔ یہ مجسمہ یونانی دیوتا ہیلیاس کا تھا۔ اس کی بلندی 105 فیٹ تھی اور اسے یونان کی ایک بندرگاہ پر اس طرح نصب کیا گیا تھا کہ اس کا گیٹ اس دیوپیکر مجسمے کی پچھلی ہوئی ٹانگوں تلے رہتا تھا۔ اسے 280 قبل مسیح میں بنایا گیا تھا اور یہ بارہ سال میں مکمل ہوا تھا۔ یہ مجسمہ بھی ایک زلزلے ہی میں تباہ ہوا تھا۔ صدیوں تک اس کی باقیات پڑی رہی تھیں اور پھر ایک کارواں جو مشرقی سمت میں جا رہا تھا، اسے اٹھا لے گیا تھا۔

☆☆☆

دنیا کے ساتویں عجوبے کو ''اسکندریہ کا مینار'' (یا اسکندریہ کا روشنی کا مینار) کہا جاتا ہے۔ The Light House of Alexandaria یہ شاہ پٹولومی ثانی کے دور میں اسکندریہ کی بندرگاہ پر تعمیر کیا گیا تھا اور جہازوں کو روشنی دکھانے کے کام آتا تھا۔ اس کی بلندی دو سو فٹ تھی۔ اس کے اوپری حصے میں ہر وقت آگ جلتی رہتی تھی۔ کہتے ہیں کہ یہ مینار سن 955 عیسوی میں ایک زلزلے سے تباہ ہوگیا تھا۔

اس جگہ یہ بیان خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ قدیم فہرست کے علاوہ سات عجائبات کی ایک اور فہرست بھی بنائی گئی تھی اور یہ فہرست دوسری صدی قبل مسیح کے ایک بازنطینی Phiro of Byzentine نے تیار کی تھی۔ لیکن یہ فہرست انہی عجوبوں پر مشتمل تھی جس میں سے اس نے..... اسکندریہ کے مینار کو نکال کر بابل کی دیواروں کا اضافہ کر دیا تھا۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ان عجائبات کے بارے میں جو کام وہ اور ستر ہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ ان کی جانب جس ماہر آثارِ قدیمہ نے سب سے پہلے توجہ دی اس کا نام اتھانا سیس کرچر تھا۔

آپ نے قدیم عجائباتِ عالم کا احوال پڑھا، ان کے علاوہ ازمنہ وسطیٰ کے عجائباتِ عالم بھی ہیں جو تاریخ میں اہمیت کے حامل سمجھے گئے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

1۔ روم کا اکھاڑہ (Colossium of Rome) یہ اکھاڑہ نیرو کی موت کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے اندر گپھائیں اور غار بنائے گئے تھے جہاں درندوں کو رکھا جاتا تھا۔ یہاں تماشائیوں کے بیٹھنے کے لیے نشستیں بھی تھیں۔ یہ کچھ اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ اسے پانی سے لبالب بھرا جاسکتا تھا۔ یہ کام اس وقت کیا جاتا تھا جب اس میں تجربہ کی جنگ ہوتی ہے۔ یہ اکھاڑہ خونی مقابلوں کے لیے بدنام تھا۔

کہتے ہیں کہ اس میں ایک مقابلے کا جشن پورے چار ماہ تک ہوتا رہا تھا۔ یہاں غلاموں کو لڑایا جاتا تھا۔ آدمیوں سے بھی اور درندوں

سے بھی۔

2۔ Catacomb of Alaxandria یا اسکندریہ کا زمین دوز قبرستان۔ یہ صحارا نامی ریگ زار کے کنارے بنا ہوا تھا۔ عیسائی پناہ گزین اس کے زیر زمین راستوں کو استعمال میں لایا کرتے تھے۔ یہ نویں صدی عیسوی میں ترکوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔

3۔ عظیم دیوار چین۔ یہ تیسری صدی عیسوی میں بننی شروع ہوئی تھی اور اس کا سلسلہ بعد کی دو صدیوں میں بھی جاری رہا۔ یہ چین کے شمالی حصے میں ہے اور اس کی لمبائی 4500 میل ہے۔ اسے حملہ آوروں کے حملوں سے چین کو بچانے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا اور یہ تاتاری اور چینی سلطنتوں کے درمیان ایک سرحد کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔

4۔ نون کن کا پگوڈا۔ اسے ''پرو کلین ٹاور'' بھی کہا جاتا ہے۔ 360 فٹ بلند یہ پگوڈا سترہویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ نو منزلہ عمارت ہے۔

5۔ پیسا کا (جھکا ہوا) مینار۔ اسے Leaning Tower of Pisa بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مکمل طور پر سیدھا نہیں ہے بلکہ اس کا مینارہ ذرا سا جھکا ہوا ہے۔ یہ سن گیارہ سو چوہتر میں بننا شروع ہوا تھا اور سن بارہ سو پچاس میں مکمل ہوا۔ یہ درحقیقت ایک کیتھڈرل یعنی گرجا کے بیل ٹاور (Bell Tower) کے طور پر بنایا گیا تھا جہاں سے گھنٹیاں بجائی جاتی تھیں۔ یہ آٹھ منزلہ ہے اور اس کی بلندی ایک سو ستر فٹ ہے۔ زمین کی سمت اس کا جھکاؤ کوئی دس فٹ کا ہے۔

6۔ Hagia Sophia۔ یہ آج کل کی استنبول (قسطنطنیہ) کی مسجد ایا صوفیا کا پرانا نام ہے۔ ہیگیا صوفیا کہلانے والی یہ عمارت شاہ جسٹینین کی بنوائی ہوئی تھی، جو سن 537 سے 548 سن عیسوی تک حکمران رہا تھا۔ اس دور میں یہ ایک مسیحی گرجا گھر تھا۔ سن 1453ء میں عیسائی حکومت کے خاتمے پر یہ ایک مسجد میں بدل دیا گیا تھا۔ اب یہ ایک بازنطینی دور کے عجائب گھر کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ چھٹی ساتویں اور دسویں صدیوں میں اس کی مرمت وغیرہ ہوتی رہی تھی جس کی وجہ سے یہ آج بھی موجود ہے۔

7۔ ساتواں عجوبہ جو دور وسطیٰ کا گردانا جاتا ہے، وہ انگلینڈ میں تھا۔ لیکن اس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا جا رہا ہے کہ اسے اب دور وسطیٰ کے عجوبوں سے خارج کر دیا گیا ہے۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے عہد حاضر کی کچھ عمارات کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے جو آج کے دور میں دنیا کے سات جدید عجائبات کی طرح تسلیم کی گئی ہیں۔

1931ء میں امریکا کی امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی تعمیر، تعمیرات کی دنیا میں ایک شاندار کارنامہ سمجھی جاتی ہے (ویسے اب اس سے بھی بلند عمارات تعمیر ہو چکی ہیں) جنہیں آج کے دور کے سات عجائبات کہا جاتا ہے، ان کی فہرست کچھ یوں ہے۔

1۔ اہرام مصر۔
2۔ مسجد ایا صوفیا۔
3۔ پیسا کا ٹاور۔
4۔ آگرے کا تاج محل۔
5۔ یادگار واشنگٹن۔
6۔ امپائر اسٹیٹ بلڈنگ۔

کچھ فہرستیں اور بھی ہیں۔ جن میں پانامہ کنال، گولڈن برج، اسکائی لائن، نیویارک کا ٹرانسپورٹ سسٹم، نیشنل پارک آف ہونشو، جاپان۔ مصر کا آمون دیوتا کا مندر شامل ہیں۔

عمارات کے علاوہ کچھ جدید سائنسی ایجادات کو بھی عجائبات عالم کی مختلف فہرستوں میں رکھا گیا ہے۔ مثلاً ذرائع ابلاغ کے سات عجوبے۔ ان میں ٹیلی فون، وائرلیس، متحرک تصویریں، فونوگراف، مطبع، ریڈیو اور ٹی وی کو شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح ادویات میں بھی سات عجوبے ہیں۔ ان میں ریڈیم، ایکسرے، بے ہوشی کی ادویات، دافع عفونت ادویات، کیموتھراپی اور سرجری کو شامل کیا گیا ہے۔

یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا اگر دنیا کے سات قدرتی عجائبات کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

(1) اریزونا (امریکا) میں واقع GrandCanyon (2) ریوڈی جنیرو کی بندرگاہ۔ (3) آبشار نیاگرا۔ (4) پوسی مائٹ ویلی (5) ماؤنٹ ایورسٹ (6) دریائے نیل (مصر) (7) شمالی روشنیاں۔ (الاسکا)

قدرتی عجائبات کی ایک اور فہرست بھی ہے تاہم جس فہرست پر زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے یہاں اس فہرست کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(معلومات کا ماخذ۔ انسائیکلوپیڈیا امیریکانو)

تلاش: احمد صغیر صدیقی

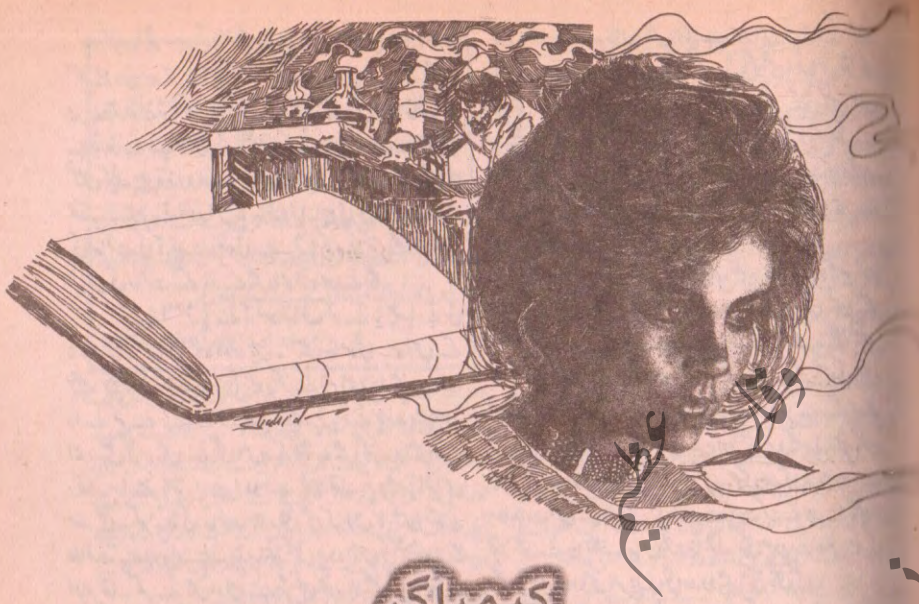

کیمیا گر

عبدالرب بھٹی

کیمیا گری تو دراصل سائنس دانوں کا شعبہ ہے، مگر یہ اصطلاح سن معنوں میں غیر سائنسدان قسم کے لوگ استعمال کرتے ہیں وہ اس کی حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ دراصل یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے لئے بے انتہا محنت اور کاوش کے باوجود نتائج کے بارے میں کچھ پہلے سے نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بہرحال کچھ لوگ اس میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں، جیسا کہ ہمارے دوست الیاس صاحب۔

سونا بنانا یا ابدی حیات پانا کیا انسان کے بس میں ہے؟

بعض لوگ بہت دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ جو بادی النظر میں تو کسی بڑبولے کی ''بڑک'' ہی محسوس ہوتی ہے مگر بعد میں جب اسی ''بڑک'' کی کوکھ سے کوئی پُرمغز منطق یا کسی انوکھی حقیقت کی تصویر جنم لیتی ہے تو انسان انگشت بدنداں ہوجاتا ہے۔

کال بیل کے جواب میں اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ ذرا سا کھلا۔ باریک رنگین آنچل کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی اور پھر ایک نسوانی آواز ابھری۔

''کون صاحب ہیں؟''

''بھابی، میں قیوم ہوں..... الیاس کیسے ہیں؟''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

''اوہ، قیوم بھائی!'' ایک دبی ہوئی سسکی سی جیسے ابھری ''اتنے دن بعد آئے آپ.....'' دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ میرے سامنے ثریا کھڑی تھی۔ بال بکھرے، لباس اچھا خاصا مگر بے قدرے بے ترتیب۔ لگتا تھا کہ تین چار دن سے تبدیل نہیں کیا۔ چہرہ زرد اور پریشانی کا مظہر، آنکھوں میں نمی کی جھلک۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ بیوی کی حالت، خاوند کی حالت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ثریا کو دیکھ کر مجھے فوراً ہی الیاس کی حالت کے بارے میں اندازہ ہونے لگا۔

''آیئے!'' ثریا نے آنسو صاف کرنے یا چھپانے کی ناکام سی کوشش کی ''وہ اندر ہیں۔'' میں خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ لاؤنج عبور کر کے ہم اندر دائیں جانب والے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ ثریا نے پردہ ہٹایا اور اندر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کے عقب میں کمرے میں قدم رکھا۔ سامنے بستر پر میرا دوست لیٹا تھا۔ پروفیسر الیاس صدیقی۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کا مکین شدید علالت سے دوچار ہے۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر دواؤں کی شیشیوں کا انبار تھا۔ کمرے میں وہی بے ترتیبی اور بوجھل پن تھا جو عموماً کسی بیمار کے گھر میں ہوتا ہے۔ ثریا چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی، پھر بہت دھیمی آواز میں بولی۔

''اب تو گھنٹوں سوتے رہتے ہیں۔''

میں نے ثریا کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے بیمار دوست کے آرام میں خلل واقع ہو۔

ثریا اس دوران میں ''میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے.....'' کہتی ہوئی جلدی سے نکل گئی تھی۔ مجھے اسے روکنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ شاید وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کچن میں جا کر پہلے دل بھر کر روئے گی، پھر چائے بنا کر لائے گی۔ لہٰذا میں ذرا جم کر بیٹھ گیا اور گہری نیند سوئے ہوئے الیاس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ پروفیسر الیاس صدیقی عمر کے ڈھلتے ہوئے حصے میں تھا۔ نحیف و نزار یوں تو وہ گویا پیدائشی تھا۔ کالج کے شریر لڑکوں نے اس کا نام ''پروفیسر سینک سوار'' رکھ چھوڑا تھا۔ یہ نام سب کو معلوم بھی تھا مگر جب ''پروفیسر سینک سوار'' کو اپنے اس لقب پر اعتراض نہ تھا تو بھلا مجھے کیوں ہوتا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر جو سکون اور اطمینان تھا، وہ بے حد غیر معمولی تھا۔ ورنہ بہت سے لوگ تو ذرا بھی بیمار پڑتے ہیں تو چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں مگر پروفیسر الیاس صدیقی کے پُرسکون اور گہری طمانیت میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خون کے سرطان میں مبتلا ہے اور اس کی زندگی شاید سال بھر سے زیادہ کی نہیں رہ گئی تھی۔ ثریا کو بھی احساس تھا کہ اس کا سہاگ زندگی کے آخری کنارے پر ہے، لیکن اس مرحلے پر دعا کے سوا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر انسان کو اپنی وقعت معلوم ہو جاتی ہے۔ پروفیسر الیاس صدیقی کا نہایت پُرسکون اور معصوم سا چہرہ میرے سامنے تھا اور میں خود نقشِ حیرت بنا اسے تک رہا تھا۔

ہم دونوں یعنی میں عبدالقیوم، طبیعات کا پروفیسر اور الیاس صدیقی، کیمیا کا پروفیسر، ایک ہی کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ہمارے شعبے بالکل مختلف تھے، لیکن کالج کی دن بھر کی رفاقت اور آپس میں ایک خاص قسم کی ذہنی قربت اور ہم آہنگی نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ یوں تو کالج میں اور بھی پروفیسرز تھے لیکن میری زیادہ دوستی الیاس سے ہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے معاملات جن میں الیاس کسی اور سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا، مجھ سے بلا تکلف بیان کر دیتا تھا۔ یہی صورت حال میری تھی۔ ہماری دوستی ہمرازی کی حدود میں پہنچ چکی تھی۔

پروفیسر الیاس صدیقی ایک قابل کیمیا دان تھا۔ اس کا بیشتر وقت تدریس کے بعد کیمیا کی تجربہ گاہ میں گزرتا تھا۔ وہ اپنے نت نئے تجربات سے مجھے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا، جو کبھی میری سمجھ میں آتے، کبھی بالکل بھی نہیں۔ بہرحال میں اپنے دوست کی حوصلہ افزائی ضرور کرتا تھا۔ یہ بھی تو آخر دوستی کے فرائض میں سے ایک ہے۔

الیاس ایک محبت کرنے والا وفادار اور سلیقہ شعار بیوی کا خاوند بھی تھا۔ البتہ اس کی زندگی میں ایک کمی تھی کہ اس کے ہاں ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ثریا بھی اس بات کے ناتے اس کا شدید احساس تھا مگر بہرحال وہ خاوند کے ساتھ خوش تھی اور وہ اس کے ساتھ۔ شاید اس خلا کو پُر کرنے کے لیے وہ لکھنے لکھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا یا پھر خود اس کے اندر خداد صلاحیت نے سر ابھارا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ مجھے اپنے افسانے اور کہانیاں پڑھنے کے لیے دیتا، جن میں سے بعض ادبی رسائل و اخبارات میں بھی چھپیں۔ اس لحاظ سے وہ تھوڑا بہت پہچانا جانے لگا تھا لیکن باضابطہ طور پر کسی ادبی حلقے میں نہ وہ خود گیا، نہ اس نے کسی ادبی جریدے سے وابستگی اختیار کی۔ اسے وقت گزاری کا ایک مشغلہ کہا جا سکتا تھا۔ یہ تھا اس کی کل زندگی کا خاکہ۔ ایک سیدھا سادہ، بلکہ آج کل کے حساب سے ''بدھو'' قسم کا پروفیسر۔ جس میں کوئی نیا پن، کوئی رنگینی کوئی رعنائی کم ہی تھی۔

اس کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ جو شاید صرف مجھے ہی معلوم تھا۔ غالباً ثریا کو بھی اپنے خاوند کی شخصیت کے اس پہلو کا پوری طرح اندازہ نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ وہ شاید اس موضوع پر اپنی بیوی سے بھی بات نہیں کرتا ہوگا۔ وہ پہلو یہ تھا کہ اس کی سوچ کا دھارا اکثر فطرت کی مخالف سمت بہتا تھا۔ اسی وجہ سے کالج کے دوسرے ساتھی اساتذہ اسے خبطی سمجھتے تھے۔ مگر اس سلسلے میں میرا رویہ مختلف تھا۔ بلکہ میں تو اس کی کسی انہونی گفتگو کی تہہ کو کریدنے کی کوششیں کرتا تھا۔ شاید پورے کالج میں، میں واحد شخص تھا۔ جو اس پراسرار سے الجھے ہوئے اور پیچیدہ شخص کی گفتگو غور سے سنتا اور سمجھنے کی کوششیں کرتا تھا۔ پروفیسر الیاس صدیقی، میرا دوست، جو اپنی ذات میں شاید کسی پیچیدہ کہانی کا فارمولے کے طور ہی تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ثریا چائے لے کر آ گئی۔ الیاس بدستور محوِ خواب تھا۔ ثریا نے چائے بنا کر ایک پیالی مجھے تھما دی اور دوسری خود سنبھال لی۔ میں نے ایک نظر اسے دوبارہ دیکھا۔ اس کا چہرہ غم و اندوہ اور فکر سے ستا ہوا تھا۔ میں نے رسمی تسلی کے چند کلمات ادا کرنے کے بجائے اس کے میکے کی باتیں شروع کر دیں۔

چائے کے بعد ثریا برتن سمیٹ کر لے گئی تو میں الیاس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسی طرح گہری نیند سو رہا تھا۔ اپنی جان لیوا بیماری سے بیخبر بے تعلق و بے پروا۔ تب جانے کیوں مجھے سرِ شام کی وہ صبح یاد آ گئی جب گرم دھوپ میں ہم دونوں کالج کے ایک الگ گوشے میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے اور وہ ہمیشہ کی طرح گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے توجہ دلانے پر گفتگو کا آغاز اسی نے کیا تھا۔

''یار قیوم زندگی واقعی بہت خوب صورت ہے!'' ہمیشہ کی طرح وہ عجیب سے انداز میں بولا۔ اس کا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا چہرہ کسی انوکھے تاثر کا حامل تھا۔

''بے شک!'' میں نے مختصراً کہا۔

''لیکن قیوم..... اگر اس خوب صورت زندگی کو دوام مل جائے تو کیا اس کے حسن میں مزید اضافہ نہیں ہو جائے گا؟'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''قطعی نہیں!'' میں نے فوراً کہا ''پھر یہ زندگی حسین نہیں رنگین ہو جائے گی۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولا۔

''قیوم..... تم نے زندگی کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح میں کرتا ہوں۔ مگر اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم اس (طبیعات) کے پروفیسر ہو، لیکن زندگی کو بھی ایک ٹھوس مادّے کی طرح سمجھتے ہو۔'' اتنا کہہ کر وہ چپ

حقیقت دنیا

خلیفہ عبدالرحمٰن حقیقت دنیا کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''باوجود ایک سلطنت پہ مدت دراز تک خود مختار رہنے کے تمام زندگی میں اس کے صرف چودہ دن خوشی سے گزرے۔ زیادہ غور کیا تو وہ بھی خلش سے خالی نہ تھے لیکن میرے اتنے دن بھی خوشی سے نہیں گزرے اور اس کی یہ وجہ ہے کہ میں کبھی اپنے لیے زندہ نہ رہا، ریاکاری اور خودنمائی کے لیے زندہ رہا ہوں۔''

مرسلہ: بابر دین پوری۔ خان پور اکٹورا

ہو رہا اور میں اس کی بات سے کچھ اخذ کرنے کی سعی میں لگ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''اب تم یہی دیکھ لو۔ میں کیمسٹری کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اپنی ذاتی رائے اور نظریے کے مطابق زندگی کے لیے ایک الگ تعریف رکھتا ہوں جس کے تحت زندگی کچھ ایسے عناصر کی ترتیب کا نتیجہ ہے جو باہم مل کر ایک کمپاؤنڈ بناتے ہیں اور پھر ایک مضبوط اور مکمل بانڈ بنتا ہے۔''

میں نے اس کی الجھی ہوئی سی گفتگو کو کسی نتیجے پر پہنچانے کی غرض سے کہا۔

''چلو بقول تمہارے زندگی کو دوام مل جائے تو یہ اور حسین ہو جائے گی۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ زندگی کو دوام مل جائے؟''

''ہے ممکن..... میں اسے ممکن بناؤں گا۔'' وہ تیزی سے بولا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ وہ پُرجوش لہجے میں بول رہا تھا ''میں کچھ ایسے طاقت ور عناصر کو یک جا کرنا چاہتا ہوں جس سے انسانی زندگی کو ابدیت مل جائے اور اسے کبھی موت نہ آئے۔ میں ایک ایسے ہی سربستہ راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ ایک انوکھی ایجاد کرنا چاہتا ہوں جو میری زندگی کو دائمی بنا دے اور مجھے کبھی موت نہ آئے۔''

''گویا تم آبِ حیات قسم کی کوئی چیز ایجاد کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل!'' وہ ایک دم بولا اور میں آج کے جدید اور سائنسی دور کا اس کی اس ''نامعقول'' بات سے موازنہ کرنے لگا۔ میرے اندر کھد بدی ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے چھیڑا ''یار..... کیا بات کر رہے ہو تم۔ خود تم سائنس کے پروفیسر ہو پھر بھی ایسی بات پر بھی یقین رکھتے ہو۔ مقام حیرت نہیں؟ یہ تو پرانے وقتوں کے قصے کہانیوں کا موضوع رہا ہے۔''

''نہیں قطعی نہیں!'' وہ فوراً اختلاف کرتے ہوئے

قدرے زوردار لہجے میں بولا ''قیوم..... دور آفرینش سے..... جب انسان کی عقل نے ستاروں پر کمندیں نہیں پھینکی تھیں تو وہ سورج چاند کو دیوتا مانتا تھا اور آگ کی بھی پوجا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلی آب و ہوا کو بھی پوجتا۔ لیکن پھر جیسے جیسے عقلِ انسانی شعور کی بلندیوں تک پہنچنے لگی تو کائنات کے راز ہائے سربستہ اس کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے گئے۔ یہ ''آب حیات'' بھی بے شک گئے وقتوں کا ایک سربستہ راز ہے لیکن آج تک اس پر سے پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔ اسے محض قصے کہانیوں کا موضوع سمجھتے ہوئے جھٹلایا جاتا رہا' لیکن میں اسے ایک دن ضرور بے نقاب کروں گا۔''

چاروں طرف جیسے ایک گمبھیر خاموشی سی چھا گئی تھی۔ چند ثانیے بعد الیاس مجھ سے رازدارانہ لہجے میں بولا ''دیکھو دوست اس بات کو ابھی اپنے تک ہی محدود رکھنا۔ اگر میں ''آب حیات'' بنانے میں کامیاب ہوگیا تو یقیناً تم بھی اس سے فائدہ اٹھا سکو گے۔ کیونکہ تم میرے دوست ہو۔''

اور نہ جانے کیوں مجھے اپنے اندر ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی اور جب میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو عقب سے اس خبطی کے قہقہے کی آواز سنائی دی تھی۔

زندگی اپنی پرانی ڈگر پر چلی جارہی تھی۔ وہی صبح کالج جانا اور واپسی پر گھر کے فرائض پھر اگلے دن کا سورج وہی پیغام لاتا۔ لیکن اب ایک تبدیلی دکھائی دے رہی تھی۔ الیاس اب کچھ زیادہ ہی مصروف اور مجھ سے بھی کچھ دور دور رہنے لگا تھا۔ دوسرے ساتھی اساتذہ پہلے ہی اس سے بے تکلف نہیں تھے اور رسمی سلام دعا سے زیادہ اس کی بات چیت کسی سے بھی نہیں ہوتی تھی۔ اب تو وہ اکثر لیکچر دیتے ہی کالج سے گھر چلا جاتا۔ اور پھر ایک دن کالج سے لمبی رخصت لے کر چلا گیا اور اس دوران اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی۔ لگ بھگ دو ڈھائی ماہ کا عرصہ خاموشی سے گزر گیا پھر ایک دن الیاس کی شدید علالت کی اطلاع ملی اور یہ اطلاع ملتے ہی آج میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ گہرے سکوت کی چادر اوڑھے میرے سامنے لیٹا تھا۔ کچن سے برتن دھونے کی آواز آنی بند ہوچکی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے الیاس کو جگانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی لیکن صرف چپ رہ کر بھی تو عیادت نہیں کی جاسکتی۔

''الیاس.....!'' آخر میں نے اس کا شانہ ہولے سے ہلا کر اسے آواز دی۔ دو تین بار ہلانے اور آواز دینے پر اس نے اپنی خوابیدہ آنکھیں دھیرے سے کھولیں اور بے اختیاری کے سے عالم میں پھر بند کرلیں۔ میرے تیسری بار آواز دینے پر اس نے اب باقاعدہ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر کسی نامعلوم سے تاثر کا ہلکا سا ارتعاش ہوا ہوا پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری اور وہ ''تم'' کہتے ہوئے اپنی کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوششیں کرنے لگا۔ میں نے فوراً ہی سہارا دے کر اسے زبردستی لٹا دیا ''الیاس تم نے یہ کیا کیا..... مجھے بھی خبر تک نہیں دی۔ تم تو ثریا کے ساتھ ایسے غائب ہوئے کہ میں جب بھی آیا تمہارے اپارٹمنٹ پر تالا ہی ملا۔ کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ ایسی بھی کیا بے مروتی؟'' میں نے گویا شکایات کا دفتر کھول دیا۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا۔

''بس یار معاف کردو۔ ایسے چکروں میں تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکا۔ تم کچھ خیال مت کرنا۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''اور تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ ثریا کا خیال بھی نہیں کیا؟ اس کا کون ہے تمہارے بعد؟ اتنے بیمار تھے تو اطلاع تو کرتے۔ ہم لوگ ہی کچھ کرتے۔''

میں نے غصہ دکھایا۔ میری بات پر وہ نقاہت بھرے انداز سے مسکرا دیا۔

''قیوم کچھ نہیں ہوا مجھے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا مجھے۔'' عجیب ہیلے پتے سے بولا۔ مجھے اس کے لہجے میں وہی انداز اسی روایتی خود اعتمادی کی جھلک محسوس ہوئی جو اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کی بیماری وغیرہ کے بارے میں اس سے استفسار کرنا محض روایتی اور فرسودہ طریقہ ہی نہیں بلکہ اسے دکھ پہنچانے کا باعث بھی ہوگا۔ لہٰذا میں ماحول کی کدورت کو دور کرنے کی غرض سے موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''ہاں..... ہاں یار..... مجھے معلوم ہے تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بھلا ایسے انسان کو کیا ہوسکتا ہے جس نے بذاتِ خود موت کو شکست دینے کی ٹھان رکھی ہو۔'' میں نے غیر محسوس طریقے سے اسے ایک پرانے موضوع کی یاد دلادی تھی اور شاید وہ بھی میرا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ میں نے دیکھا جیسے اس کے پژمردہ چہرے پر زندگی کے اجلے رنگ بکھرنے لگے تھے۔

''میں جانتا تھا قیوم کہ تم ضرور آؤ گے۔ بلکہ میں یہ بھی دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ تم میری عیادت کے لیے نہیں بلکہ کسی اور ہی مقصد کے لیے آئے ہو۔''

''ہاں! شاید تم درست کہتے ہو۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''اچھا مجھے بتاؤ کہ..... تمہارا وہ ''آبِ حیات'' والا فارمولا کیا ہوا؟''

میں نے پُرتجسس لہجے میں کہا ''قیوم میں چند دنوں کا مہمان ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''مگر مجھے اس کی ذرا بھی فکر نہیں۔ اس لیے کہ میں اپنا کام مکمل کرچکا ہوں۔ میں اب موت سے خائف نہیں ہوں۔''

''اچھا تو گویا یہ خبطی آبِ حیات بنانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔'' میرے اندر کسی نے پراسراری سرگوشی کی۔

''ہاں قیوم.....! میں نے آبِ حیات کی تخلیق مکمل کرلی ہے۔''

اس کا لہجہ سنسنی خیزی لیے ہوئے تھا ''بس اب ایک آخری تجربے کی دیر ہے۔ تم انشاء اللہ عن قریب میری کامیابی کی ایک حیران کن خبر سنو گے۔''

اس کی سانس پھولنے لگی تھی۔ اس لیے وہ خاموش ہوگیا۔ میں نے دیکھا' جوش اور ایک خاص قسم کے تیقن نے اس کے زرد پڑتے چہرے کو توانا کردیا تھا۔ میرا سویا ہوا تجسس ایک بار پھر جاگنے لگا تھا ''تو..... تو پھر تم اب تک اس تکلیف دہ حالت میں کیوں ہو۔ تم اپنے فارمولے کو خود پر آخر کب آزماؤ گے۔ تمہیں تو واقعی کسی آبِ حیات ہی کی ضرورت ہے۔ جو تمہیں نورانی زندگی کی طرف لوٹا سکے۔''

''میرج..... میرے ہمراز..... میرے دوست..... ہر ری یاد داشت اثر دہی میں ظاہر ہوتا ہے۔'' میں سوچنے لگا۔ یہ پاگل تو نہیں ہوگیا یا واقعی اس سنکی اور خبطی کیمیاگر نے ''آبِ حیات'' تخلیق کرلیا ہے۔ بہرحال میں نے رسمی خوشی کا اظہار کیا ''یار میرے..... اگر تم اپنے تجربے میں واقعی کامیاب ہوگئے ہو تو یقین جانو مجھے سب سے زیادہ خوشی تمہارے آبِ حیات کے فارمولے کی کامیابی پر نہیں بلکہ تمہارے زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آنے پر ہوگی۔ میں تم جیسے دوست کو کھونا نہیں چاہتا۔''

یہ کہتے ہوئے میں یک دم گلوگیر ہوگیا تھا۔ اس پر مجھے خود بڑی حیرت تھی کہ اچانک یہ مجہول سا شخص مجھے کیوں بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

''میرے دوست مجھے ضرور کامیابی ہوگی۔ انشاء اللہ مجھے یقین ہے کہ موت کو بالآخر شکست کا ہی سامنا کرنا پڑے گا۔''

وہ پھولی سانس اور یقین کے ساتھ بول رہا تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے اس پر مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور تسلی و تشفی کے چند الفاظ کہہ کر رخصت لی۔ ثریا کی آنسو بھری آنکھیں دیر تک میرے ذہن پر چھائی رہیں۔

اس کے چند دن بعد مجھے الیاس صدیقی کے انتقال کی خبر ملی۔ میں اور کالج کے دیگر اساتذہ' عملہ اور بہت سے طلبہ الیاس صدیقی کی تدفین میں شریک ہوئے۔ سوئم میں بھی کالج سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد خاصی تھی۔ ایک دو روز تک الیاس صدیقی کا تذکرہ ہوتا رہا' پھر ایسا لگا کہ لوگ جیسے اسے بھولنے لگے۔ انسان کا حال یہی ہے۔ وہ اپنے قریب ترین عزیز کی موت کا غم بھی رفتہ رفتہ بھول جاتا ہے۔

اس دن موسم خاصا خوشگوار تھا مگر میری طبیعت پر جانے کیوں قنوطیت سی طاری تھی۔ موسم گرما کی تعطیلات تھیں۔ فارغ بیٹھنے کے لیے بھی ایک لگے بندھے معمول کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اکتاہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ میں یونہی ایک دن شہر کے مرکزی بازار آگیا۔ ایک بک اسٹال سے کوئی اخبار خریدتے ہوئے اچانک میری نظر شیشے کے شیلف میں رکھی ایک کتاب پر پڑی اور میں چونک گیا۔ میں نے وہ کتاب نکلوائی اور بغور اس کے سرورق کو دیکھنے لگا۔ جس پر جلی حروف میں کتاب کا عنوان ''آبِ حیات'' اور نیچے مصنف کا نام پروفیسر الیاس صدیقی تحریر تھا۔ یہ کوئی ضخیم ناول تھا' جو میرے مرحوم دوست الیاس صدیقی ہی کا تحریر کردہ تھا۔ میں وہیں کھڑا ہوکر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

مذکورہ ناول کا دیباچہ ایک بڑے کہنہ مشق ادیب اور تنقید نگار کا تحریر کردہ تھا، جس میں انہوں نے فاضل مصنف کی کتاب پر اپنی مستند رائے دیتے ہوئے لکھا تھا۔

''زیرِ نظر ناول ''آبِ حیات'' کو حال ہی میں اگرچہ ایک بڑے ادبی انعام سے نوازا گیا ہے جو اپنی جگہ ایک بڑا اعزاز سہی لیکن میری ذاتی رائے کے مطابق بذاتِ خود یہ ناول اردو ادب کے لیے ایک بیش قیمت انعام ہے' جو مرحوم الیاس صدیقی کا مرہونِ منت ہے۔ بے شک فاضل ادیب کا یہ ناقابلِ فراموش ناول خود مصنف کے لیے ''آبِ حیات'' کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ جسے پی کر وہ ہمیشہ کے لیے امر اور زندہ جاوید ہوگیا ہے۔''

میں نے کتاب بند کی' اس کی قیمت چکائی اور جب واپس گھر کی جانب لوٹنے لگا تو میری آنکھیں نم آلود تھیں اور میں بے اختیار گلوگیر لہجے میں بڑبڑایا۔

''بے شک میرے دوست تم اپنے تجربے میں کامیاب رہے۔ تم نے واقعی ''آبِ حیات'' دریافت کرلیا۔ تمہارا نام ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔''

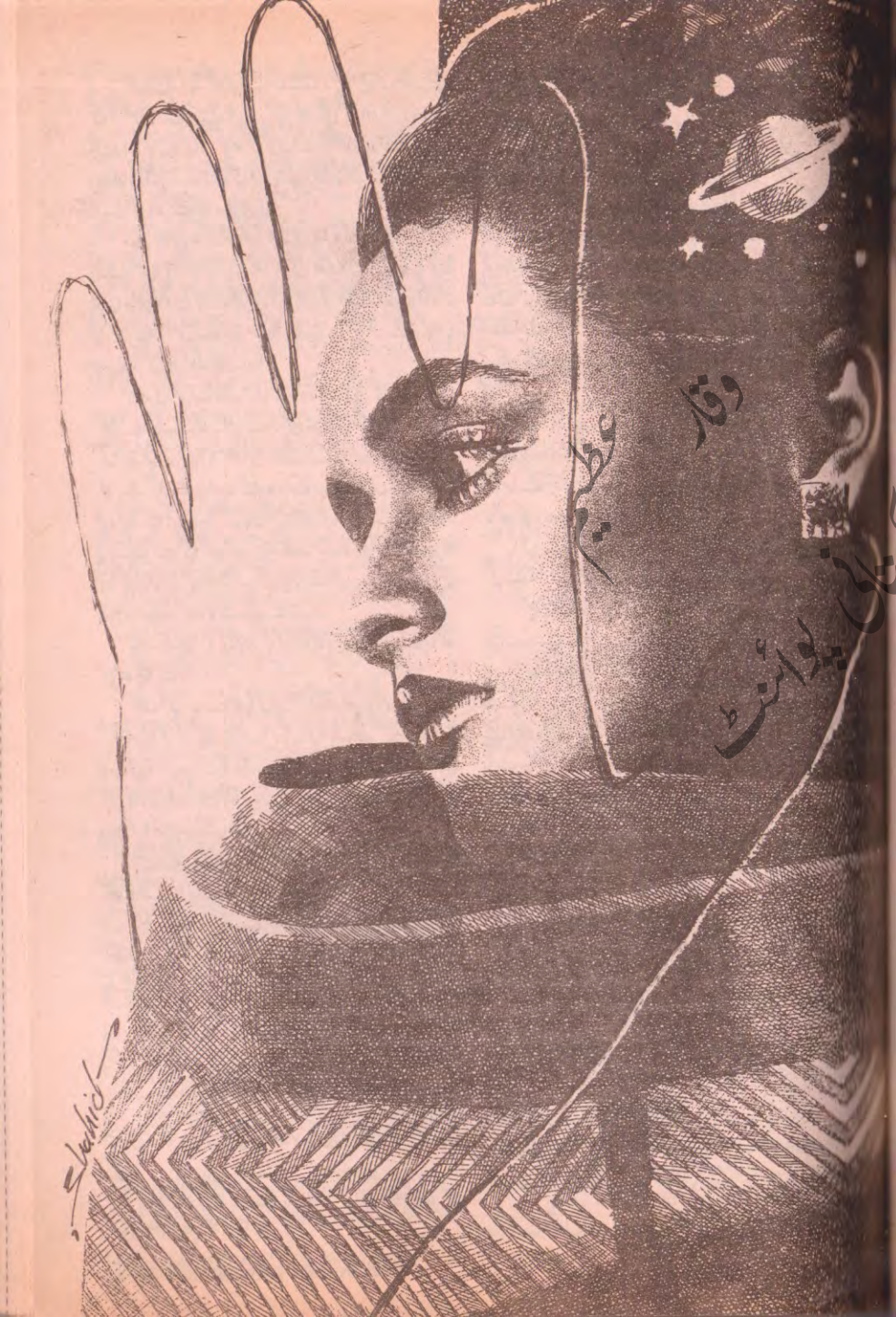

مقدر

محی الدین نواب

نواب صاحب کے نام سے کون واقف نہیں، ان کا شمار ملک کے صف اوّل کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ہر موضوع پر لکھا اور خوب لکھا۔ انسانی معاشرت کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں پر نواب کی گہری نظر ہے، ساتھ ہی ساتھ انسانی نفسیات کی بوالعجبی سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔ لہٰذا جب اپنے فطری جرأت اظہار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی کہانی بنتے ہیں تو پڑھنے والوں کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ چہروں سے نقابیں اتر جاتی ہیں۔ ہماری معاشرتی منافقتوں کا سارا پول کھل جاتا ہے۔ اپنی انہی تحریری صفات کے سبب وہ "معاشرے کے جراح" کے طور پر مشہور ہوئے۔

سرگزشت کے لیے نواب صاحب نے معاشرے کی زہریلی کہانیوں کو بیان کرنے کے لیے ایک نیا اسلوب، نیا ڈھنگ اپنایا ہے کہ یہ کہانیاں کسی انسان کی زبانی بیان نہ کی جائیں بلکہ ان کا راوی اس بازی گر کو بنایا جائے جسے مقدر کہا جاتا ہے جو انسان کی توقع کے خلاف، اس کی سوچ کے برعکس بازی پلٹنے کا ماہر ہے۔ زیر نظر کہانی کے کردار بہ ظاہر افسانوی ہیں لیکن درحقیقت ان کا تعلق ہمارے اسی معاشرے سے ہے اور یہ اسی معاشرے کی کہانی ہے۔

انسان کے روز و شب پر مقدر کی آہنی گرفت کا دلچسپ تماشا

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عروج کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ عینی کی آنکھوں میں تو پہلے ہی تاریکی چھا چکی تھی اور اس تاریکی میں وہ نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔ اب آنکھوں والی عروج کو وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی اور جب دکھائی نہ دے تو آنکھوں والے بھی اندھے کہلاتے ہیں۔

وہ پریشان ہو کر عینی کو ڈھونڈتی اور لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر مایوس ہو کر اس نے سوچا فوراً بھائی جان کو فون کرے پھر یاد آیا انہیں تو پچھلی رات گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اب کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس ہمدرد کو پکارے؟

دوسری طرف فلک آفتاب اور بابر اپنی کار کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ذہن میں بھی یہی سوالات تھے کہ اب کیا کریں؟ نامعلوم افراد ان کے دو کروڑ روپے چھین کر لے گئے تھے۔ اب کسے مدد کے لیے پکاریں؟ وہ قانونی طور پر تو کسی کی مدد حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے ایس۔ پی۔ بیٹے سے بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ایک تو وہ گرفتار ہو گیا تھا اور اگر گرفتار نہ بھی ہوتا تب بھی یہ بات اس سے چھپائی ہی گئی تھی کہ ان کے دو کروڑ لوٹ لیے گئے ہیں۔

بابر نے کہا ''ڈیڈ کم از کم ممی کو تو بتا دیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔''

فلک آفتاب نے موبائل پر نمبر پنچ کرنا چاہا پھر رک کر بولا۔ ''تمہاری ممی کو کیسے بتاؤں؟ وہاں تو ایک جگہ گھنٹی بجے گی تو سب کو پتا چل جائے گا کہ فون آ رہا ہے۔ پھر فلک ناز، اسما کوئی بھی ہماری بات سن سکتا ہے۔ فی الحال وہاں تمہاری ممی سے بات کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''

ان کے ساتھ اب یہ مسئلہ تھا کہ وہ گھر بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ گاڑی کے دو ٹائر بیکار ہو چکے تھے۔ فلک آفتاب نے اس سلسلے میں مدد کے لیے ایک گیراج فون کیا اور مکینک کا انتظار کرنے لگا۔ بابر نے کہا ''ڈیڈ! دردانہ کو بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے ساتھ اتنی بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔''

فلک آفتاب نے دردانہ کے نمبر پنچ کیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی ''ہیلو۔ میں بول رہی ہوں۔''

''دردانہ! میں فلک آفتاب بول رہا ہوں۔''

''ہاں بولیے۔ کل رات کو بھی آپ نے فون کیا تھا مگر افسوس کہ میں یہاں نہیں تھی اور موبائل فون بھی یہیں بھول گئی تھی۔''

وہ بڑے درد بھرے لہجے میں بولا ''دردانہ! ہم کیا بتائیں ہم پر مصیبتوں پر مصیبتیں آ رہی ہیں۔''

وہ انجان بن کر مسکراتے ہوئے بولی ''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ پچھلی رات سی۔ آئی۔ اے والے ذیشان کو گرفتار کر کے لے گئے۔''

''میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا وہ مجھ سے سمجھوتا نہیں کرے گا۔ بہت ہی بددماغ ہے۔ اس نے فون پر مجھ سے کل رات ہی کہہ دیا تھا کہ وہ میری شرط نہیں مانے گا پھر میں کیوں اس کا لحاظ کرتی؟ آپ نے نتیجہ دیکھ لیا۔ سی۔ آئی۔ اے والے اسے گرفتار کر کے لے گئے۔ یہ تو ابھی ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھتے رہیں وہ اس سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوتا رہے گا۔''

فلک آفتاب نے کہا ''ہمارا کام تھا بیٹے کو سمجھانا۔ ہم نے سمجھا دیا۔ وہ پھر بھی تم سے دشمنی کر رہا ہے تو واقعی نتائج اس کے سامنے آ رہے ہیں لیکن اس معاملے سے ہٹ کر ہمارے ساتھ ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔''

اس نے پھر انجان بن کر پوچھا ''بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے؟ آپ کچھ زیادہ ہی پریشان لگ رہے ہیں؟''

''پریشانی کی ہی بات ہے۔ ہمارے وہ دو کروڑ روپے جو تم نے دیے تھے، اسے ڈاکو لوٹ کر لے گئے ہیں۔''

اس وقت دردانہ کا جی چاہ رہا تھا فلک شگاف قہقہہ لگائے۔ اسے ہر طرف سے کامیابی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اطلاع ملی تھی کہ عینی کو اغوا کر کے لایا جا رہا ہے۔ پچھلی رات یہ کامیابی ہوئی تھی کہ ذیشان کو گرفتار کرایا گیا تھا۔ تیسری کامیابی یہ تھی کہ شہباز کے آدمی وہ دو کروڑ روپے لوٹ کر لا رہے تھے۔

فلک آفتاب نے پوچھا ''دردانہ! تم چپ کیوں ہو؟ کیا تمہیں ہماری بات کا یقین نہیں ہو رہا؟''

وہ بولی ''ہاں۔ یقین نہیں ہو رہا ہے۔ آخر اتنی بڑی رقم کون لوٹ کر لے جائے گا؟ اور پھر کسے معلوم تھا کہ آپ کے پاس اتنی بڑی رقم ہے؟''

''تم یقین کرو اس رقم کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔ ہم بڑی رازداری سے بینک میں جمع کرنے جا رہے تھے۔ جو لوگ ہمیں لوٹ کر لے گئے ہیں۔ لگتا ہے انہیں بھی اتنی بڑی رقم ملنے کی امید نہیں ہوگی۔''

دردانہ نے کہا ''ہاں یہی ہو سکتا ہے۔''

''پلیز دردانہ! ہمارے لیے کچھ کرو۔''

''اب میں کیا کر سکتی ہوں؟ میں نے مفت میں اتنی بڑی رقم آپ لوگوں کو دی۔ نہ دیتی تو کیا بگاڑ لیتے؟ ہر حال میں آپ کی بیگم میری تابعدار بن کر رہنے پر مجبور ہیں اور ہمیشہ رہیں گی لیکن میں نے دوستی اور رشتہ داری قائم رکھنے کے لیے اتنے قیمتی ہیرے دیے پھر ان ہیروں کے عوض رقم دیدی۔ وہ ہیرے میرے پاس واپس آ گئے اور رقم ڈاکو لے گئے۔ آپ لوگ واقعی بدنصیب ہیں۔ بہت ہی بدنصیب ہیں۔''

''تمہارے ذرائع بہت وسیع ہیں۔ شہباز صاحب ہمارے لیے کچھ کر سکتے ہیں؟ ان لٹیروں کا پتا چلا سکتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ میں شہباز درانی سے کہوں گی۔ لیکن اتنی بڑی رقم لوٹنے والے نادان نہیں ہوں گے۔ شاید ہی ہمارے ہاتھ آ سکیں پھر بھی کوشش کی جائے گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا پھر دل کھول کر قہقہے لگانے لگی۔ شہباز درانی بیڈروم کی طرف آ رہا تھا۔ دور سے قہقہے سن کر حیران ہوا پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے دیکھا۔ دردانہ وہاں تنہا مستی میں قہقہے لگا رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا ''کیا بات ہے۔ ایسی کیا بات ہو گئی؟''

وہ پلٹ کر لہراتے ہوئے اس کے قریب آتی ہوئی بولی۔ ''کل ذیشان گرفتار ہو گیا۔ آج عینی بھی میرے پاس آ رہی ہے اور ادھر فلک آفتاب کو دیے گئے دو کروڑ بھی میرے پاس واپس آ رہے ہیں۔''

وہ شاید شہباز درانی کے ساتھ زیادہ اظہارِ محبت کی خاطر کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہتی تھی کہ وہ بولا ''ابھی تو تم میرے ساتھ ڈرائنگ روم میں آؤ۔ وہاں وہ مشہور و معروف نجومی بیٹھا ماسٹر آیا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں، وہ تمہارا ہاتھ بھی دیکھے۔''

وہ اپنی دونوں ہتھیلیاں بلند کرتے ہوئے فخر سے بولی۔ ''میرا ہاتھ اب کوئی اور کیا دیکھے گا۔ میری ہتھیلیوں پر تو خوش قسمتی کے ستارے چمک رہے ہیں۔''

وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا ''تمہیں خوش رکھنے کے لیے اور مقدر کو جگائے رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے مقدر کا حال جانتے رہیں۔ ساؤتھ افریقا کا ایک بہت معروف وچ ڈاکٹر ژنگورارا ابھی کل یہاں آنے والا ہے۔''

وہ بولی ''ژنگورارا۔ یہ کیسا نام ہے؟''

''افریقی جادوگروں کے روایتی نام کچھ اسی طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ آؤ چلیں۔''

وہ بیڈروم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ وہاں پبلو ماسٹر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر شہباز درانی سے مصافحہ کیا۔ شہباز نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ''یہ میری جانِ حیات دردانہ ہے۔''

دردانہ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مشرقی عورتیں مردوں سے مصافحہ نہیں کرتیں لیکن مجھے تم سے ہاتھ ملانے میں کوئی اعتراض نہیں کیونکہ تم تو میری قسمت کا حال بتانے کے لیے میرا ہاتھ پکڑنے ہی والے ہو۔''

پبلو ماسٹر نے ہنستے ہوئے اس سے مصافحہ کیا اور کہا۔ ''لیکن پہلے میں مسٹر درانی کا ہاتھ دیکھوں گا کیونکہ مقدر حیات کے ہاتھ کی لکیروں نے مجھے چکرا دیا ہے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ دونوں کے ہاتھوں کی لکیریں یکساں ہیں یا نہیں؟''

شہباز درانی اس کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا ''ٹھیک ہے۔ میں بھی یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ دیکھتے ہی حیران ہو گیا۔ کہنے لگا ''مائی گاڈ! میں زندگی میں پہلی بار دو ہاتھوں کو ایک جیسا دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی ہر لکیر جو بات کہہ رہی ہے وہی اس کے ہاتھ کی ہر لکیر کہہ رہی تھی۔''

''اس کے ہاتھ کی لکیریں کیا کہہ رہی تھیں؟''

اس نے ایک جگہ انگلی پھیرتے ہوئے کہا ''یہ لکیر کہہ رہی ہے کہ آپ کسی عورت سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ اس کے دیوانے ہیں۔ یہی بات اس کے ہاتھ کی لکیر بھی کہہ رہی تھی کہ وہ بھی کسی کو بہت چاہتا ہے۔ دیوانوں کی طرح چاہتا ہے۔''

شہباز درانی نے کہا ''ایسا تو کتنے ہی ہاتھوں کی لکیریں کہیں گی۔ کتنے ہی لوگ محبت کرتے ہیں۔''

''میں بحث نہیں کروں گا۔ ابھی آپ کو یقین ہو جائے گا۔ آپ کے ہاتھ کی یہ لکیر کہہ رہی ہے کہ آپ اپنے ایک دشمن کے مقابلے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ یہی ناکامیاں میں نے مقدر حیات کے ہاتھوں میں پڑھی ہیں۔''

پبلو ماسٹر درست کہہ رہا تھا۔ جب وہ میرا ہاتھ دیکھ رہا تھا تو ان لمحات میں میرے ہاتھ پر شہباز کی لکیریں نقش تھیں۔ ان میں سے ایک لکیر یہی کہہ رہی تھی کہ میں بھی کئی معاملات میں ناکام ہو رہا ہوں۔ یہ بات اس طرح درست تھی کہ میں نے سی۔ آئی۔ اے کے افسر باقر مہدی کو ذیشان کے خلاف ایکشن لینے اور گرفتاری کا وارنٹ حاصل کرنے سے نہیں روکا تھا۔ میں نمرہ کو دل و جان سے چاہتا ہوں لیکن میرا رقیب اسے اپنے ساتھ لے گیا اور میں نے اسے جانے سے نہیں روکا۔ یہ بھی میری ایک ناکامی تھی جو مصلحتاً تھی۔ ایک اور ناکامی یہ تھی کہ عینی کو اغوا کیا گیا اور میں نے اسے اغوا ہونے سے نہیں روکا تھا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں میں کہ لکیر کا فقیر ہوں۔ ہاتھ کی لکیریں جو کہتی ہیں، اسی کے مطابق چلتا ہوں۔ کسی کی کامیابی

کے ساتھ کامیاب ہوتا ہوں۔ کسی کی ناکامیوں کے ساتھ ناکام ہوجاتا ہوں۔

پبلو ماسٹر نے اس کی مٹھی بند کرتے ہوئے کہا ''ہاتھ کیا دیکھوں۔ یہ تو بالکل مقدر حیات کا ہاتھ لگ رہا ہے۔ ہاں ایک بات یاد آرہی ہے' کیا اس نے آپ سے کہا ہے کہ آپ اسے ہلاک کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ آپ کی موت نہیں آئے گی؟''

اس نے پوچھا ''کیا وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہی ہم دونوں کے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں؟''

''بے شک یہی کہہ رہی ہیں۔''

وہ جھنجلا کر بولا۔ ''کیا مصیبت ہے؟ کیا مقدر کا تماشا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا' وہ کیسے میری زندگی اور موت کے ساتھ جڑ گیا ہے؟''

وہ وہاں سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا پھر بولا ''یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ علم نجوم سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ بہت سارے علوم جانتا ہے یا نہیں۔ اس لیے میں نے وچ ڈاکٹر ژنگو رارا کو یہاں بلایا ہے۔''

پبلو ماسٹر نے کہا ''آپ مانیں یا نہ مانیں، آپ دونوں کے ہاتھ کی لکیریں یہ کہہ رہی ہیں کہ آپ میں سے کوئی پراسرار علم نہیں جانتا ہے۔ اس لیے آپ یہ غلط سوچ رہے ہیں کہ مقدر حیات در پردہ پراسرار علوم میں مہارت رکھتا ہے۔''

''میں تمہارے علم نجوم سے انکار نہیں کروں گا لیکن تم بھی یہ مان لو کہ وہ ضرور پراسرار علم جانتا ہے۔ تم نے دیکھا تھا کہ میرا ایک آدمی اسے ہلاک کرنے گیا تھا۔ اس سے پہلے ہی اسے معلوم ہوگیا کہ اس پر حملہ کیا جانے والا ہے اس لیے وہ حملہ کرنے والا ناکام رہا اور وہ کم بخت تمہارے کمرے سے زندہ سلامت واپس چلا گیا۔''

دردانہ نے پبلو ماسٹر کے پاس آکر صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا ''آپ شہباز سے بے شک بحث کرتے رہیں لیکن میرا ہاتھ بھی تو دیکھیں۔''

اس نے اپنی ہتھیلی اس کے آگے پھیلا دی۔ وہ اسے توجہ سے پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا ''آپ کی زندگی میں جگنو چمک رہے ہیں۔''

دردانہ نے پوچھا ''اس کا مطلب کیا ہوا؟''

''یہی کہ آپ کی زندگی میں جو بھی خوشیاں اور کامیابیاں آتی ہیں، وہ جگنو کی طرح ہوتی ہیں۔ چمکتی ہیں اور بجھ جاتی ہیں۔ مثلاً آپ کو ابھی کوئی خوشی مل رہی ہے تو وہ تھوڑی دیر بعد جگنو کی طرح بجھ جائے گی۔ کوئی کامیابی حاصل ہو رہی ہے تو اس کے بعد آپ کو ناکامی کی بھی خبر ملے گی۔''

''میں آپ کی یہ بات کیسے مان لوں جبکہ مجھے مسلسل خوشیاں مل رہی ہیں، کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں؟''

''نہ مانیں۔ میں تو وہی کہوں گا جو آپ کے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہباز درانی نے آگے بڑھ کر فون کے پاس آکر ریسیور اٹھایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا ''ہاں۔ میں بول رہا ہوں۔''

وہ دوسری طرف کی باتیں سن رہا تھا۔ دردانہ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ گرج کر بولا ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم نے کن لوگوں کو گن پوائنٹ پر رکھا تھا؟ کیا وہ باپ بیٹے تھے؟''

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر پوچھا ''کیا؟ وہاں باپ بیٹے نہیں تھے۔ صرف ایک جوان کار ڈرائیو کر رہا تھا؟ تم لوگوں نے کس کار پر حملہ کیا تھا؟ گاڑی کا نمبر بتاؤ۔''

اس نے دوسری طرف کی بات سنی پھر دہاڑتے ہوئے کہا ''کتے کے بچے۔ تمہیں یہ نمبر نہیں بتایا گیا تھا۔ فلک آفتاب کی کار کا نمبر اے ایچ۔ زیرو سیون ون سیون ہے اور تم نمبر بتا رہے ہو کے ایچ ون سیون ون۔ کیا صبح کے وقت شراب پی کر واردات کرتے ہو؟ یو ایڈیٹ میں تم سے بعد میں نمٹ لوں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ دردانہ نے پریشان ہو کر پوچھا ''کیا ہوا؟''

''تم ابھی خوش ہو رہی تھیں کہ تمہارے دو کروڑ روپے واپس آنے والے ہیں لیکن وہ گدھے کسی اور کار میں گھس گئے تھے۔ وہاں انہوں نے گن پوائنٹ پر رقم نکلوانے کی کوشش کی تو کار والے کے پاس سے صرف دس ہزار روپے نکلے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو خود فلک آفتاب نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دو کروڑ روپے گن پوائنٹ پر چھین لیے گئے ہیں۔''

شہباز درانی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا ''تعجب ہے۔ اگر ہمارے آدمیوں نے ایسا نہیں کیا ہے تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو ان باپ بیٹے سے رقم چھین کر لے گئے؟''

دردانہ نے پریشان ہو کر اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا پھر پبلو ماسٹر کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا ''میں آپ کے معاملات نہیں

جانتا لیکن میری بات درست ہو رہی ہے کہ آپ کو جو خوشی حاصل ہوئی تھی وہ عارضی ثابت ہوئی۔ جگنو کی طرح چمک کر بجھ گئی۔''

کچھ دیر پہلے وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی۔ اب مایوس ہو کر شہباز درانی کو دیکھنے لگی۔ شہباز نے کہا ''پبلو ماسٹر! ٹھیک ہے۔ تمہاری یہ بات درست ثابت ہو رہی ہے لیکن ایک ناکامی سے کچھ نہیں ہوتا۔ میری دردانہ میری پناہ میں رہتی ہے۔ اسے مزید خوشیاں حاصل ہوں گی اور اس پر کبھی کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

پبلو ماسٹر نے بڑے ہی مستحکم لہجے میں کہا ''آئے گی۔''

ان دونوں کی باتیں سن کر چونک کر دیکھا پھر شہباز درانی نے پوچھا ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا ''میں ابھی میڈم کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن آپ کو خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنے دوں گا۔ آپ کا ہاتھ یہ ضرور کہتا ہے کہ آپ کو بہت تحفظ حاصل ہے۔ آپ پر مصیبتیں آتے آتے رہ جاتی ہیں لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوگا۔ ایک بہت ہی زبردست دشمن آپ کے تعاقب میں ہے۔ آپ کو جلد ہی کوئی نقصان پہنچنے والا ہے۔''

شہباز نے کہا ''ماسٹر! تم دردانہ کو ڈرانے والی باتیں کر رہے ہو۔''

''جو سچ ہے وہ کہہ رہا ہوں۔ یہ ہفتہ میڈم کے لیے بھاری ہے۔ سات دنوں کے اندر کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔''

دردانہ گھبرا گئی۔ وہ اٹھ کر چلتی ہوئی شہباز کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ شہباز نے اسے ایک بازو میں لے کر تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ڈونٹ وری۔ تم اس ہفتے کوٹھی سے باہر نہیں نکلو گی۔''

پبلو ماسٹر نے کہا ''مسٹر درانی! گھر ہو یا باہر، آسمان ہو یا زمین، انسان کہیں بھی چلا جائے' وہاں مقدر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ موت اور مقدر کہیں بھی اپنے حصے کی بازی کھیلنے پہنچ جاتے ہیں۔''

شہباز نے ناگواری سے پوچھا ''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ دردانہ کو موت بھی آسکتی ہے؟''

''میں نے یہ نہیں کہا۔ ان کی زندگی کو فوری خطرہ نہیں۔ میں تو صرف یہ سمجھا رہا ہوں کہ آپ انہیں گھر کے اندر بند کر دیں یا کسی تہ خانے میں چھپا دیں جو مصیبت آنے والی ہے وہ ضرور آئے گی۔''

وہ جھنجلا کر بولا ''کچھ معلوم تو ہو کیسی مصیبت آنے والی ہے؟ کب آنے والی ہے؟ کیا تم وضاحت سے نہیں بتا سکتے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا ''میرا علم اتنا ہی ہے۔ ہاتھ کی لکیریں جتنا کہہ رہی ہیں اتنا ہی بتا رہا ہوں۔ اس سے زیادہ بتانے کے قابل نہیں ہوں۔''

وہ دردانہ کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے پریشان ہو کر بولا۔ ''میں نے خواہ مخواہ تمہیں دردانہ کا ہاتھ دیکھنے کے لیے کہہ دیا۔ تمہیں یہاں نہ بلاتا تو اچھا ہوتا۔''

وہ بولا ''یہی تو ہاتھ کی لکیروں اور مقدر کی باتیں ہیں۔ مجھے یہاں نہ بلانے کی بات کر رہے ہیں لیکن مقدر چاہتا تھا کہ میں یہاں آؤں۔ اس لیے آپ نے بلایا ہے۔ آپ نے ابھی کہا ہے کہ کسی وچ ڈاکٹر ژنگو رارا کو یہاں بلایا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ یہاں آجائے۔ مقدر کی مرضی ہوگی تو آپ کی اس سے ملاقات ہوگی۔''

وہ پبلو ماسٹر کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا وہ وچ ڈاکٹر نہیں آئے گا؟''

''جب آپ نے بلایا ہے تو وہ ضرور آئے گا۔ میں تو مقدر کی بات سمجھا رہا ہوں کہ وہ آنے والوں کو روک دیتا ہے اور رکنے والوں کو آگے بڑھا دیتا ہے۔''

پتا نہیں کیا ہونے والا تھا؟ شہباز درانی کو اس کا انتظار تھا۔ وہی اسے میری پُراسراریت کے بارے میں کچھ بتا سکتا تھا۔ پھر وہی سوال پیدا ہوتا تھا' کیا وہ آجائے گا؟ کیا میرے بارے میں کچھ بتا پائے گا؟

☆☆☆

ذیشان کی گرفتاری نے بچھو بابا کے دماغ میں گرمی پیدا کر دی تھی۔ وہ ذیشان کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ یہ بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سی' آئی' اے والے اتنے بڑے افسر کو گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ وہ اس کی گرفتاری پر اپنی توہین محسوس کر رہا تھا۔

اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا کہ وہ اپنے باس کو قانون کی گرفت میں جانے سے نہ روک سکا۔ وہ غصے کے باوجود موقع اور مصلحت کو سمجھ رہا تھا۔ پھر ذیشان نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ایک ہفتے تک سلاخوں کے پیچھے رہے گا۔ لہٰذا اس کی عدم موجودگی میں مقدر حیات کے احکامات کی تعمیل کرے۔

پہلے تو اس نے ذیشان کے احکامات کی تعمیل کی۔ اس نے کہا تھا کہ اسد عزیزی کے زخموں کو بھرنا نہیں چاہیے۔ ان زخموں کو ناسور بناتے رہو۔ اس نے ایسا کرنے میں دیر نہیں

کی۔ رات ایک بجے ہاسپٹل میں پہنچا۔ آدھی رات کے بعد وہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ وارڈ بوائز اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے تھے۔ صرف ایک نرس مریضوں کے وارڈز کے درمیان بنے ہوئے ایک چھوٹے سے کمرے میں جاگ رہی تھی۔

بچھو بابا نے نوٹوں کی گڈیوں کے ساتھ ایک سائلینسر لگا ہوا ریوالور بریف کیس میں رکھا پھر اس بریف کیس کے ساتھ نرس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ نرس نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا ''تم مجھے نہیں جانتیں' لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ تمہارا نام ماریہ ہے۔ تم بہت برے حالات سے گزر رہی ہو۔ میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''بیٹھ جاؤ۔ تم یہ کیسے جانتے ہو کہ میں برے حالات سے گزر رہی ہوں؟''

وہ بیٹھتے ہوئے بولا ''ہمارا پیشہ ایسا ہے کہ ہمیں اپنے ضرورت کے لوگوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل کرنی پڑتی ہے۔''

وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔ ''میرے برے حالات کیا ہیں؟ کیا تم بتا سکتے ہو؟''

''تمہارا شوہر تمہیں طلاق دے کر کسی دوسری عورت کے ساتھ رہنے لگا ہے۔ تم اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے لیے دن رات محنت کرتی رہی ہو۔ اسپتال سے جو تنخواہ ملتی ہے اس میں تمہارا گزارا نہیں ہوتا اس لیے تم اس اسپتال سے دوائیں چوری کر کے باہر فروخت کر دیتی ہو۔ ناجائز حمل گرانے کے سلسلے میں اچھی خاصی رقم وصول کرتی رہتی ہو۔''

وہ غصے سے بولی ''تم بکواس کر رہے ہو۔ سراسر الزام لگا رہے ہو۔ یہاں سے چلے جاؤ' ورنہ میں وارڈ بوائز کو بلاؤں گی وہ تمہیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دیں گے۔''

اس نے بریف کیس کھول کر ریوالور دکھاتے ہوئے کہا ''اس میں سائلینسر لگا ہوا ہے۔ آواز نہیں ہوگی۔ کسی کے آنے سے پہلے ہی میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

وہ ریوالور دیکھتے ہی سہم گئی۔ ہونٹوں کو سختی سے بند کر لیا۔ بچھو بابا نے کہا ''میرے سامنے شریف اور پارسا نہ بنو۔ تمہاری طرح میں بھی الٹے سیدھے دھندے کرتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میری بات مان لو گی تو ابھی اسی وقت تمہیں ایک لاکھ روپے ملیں گے۔''

ماریہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کھلے ہوئے بریف کیس کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھو، یہ پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔''

بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان نوٹوں کو دیکھنے لگی۔ بچھو بابا نے کہا ''تم نے ملک سے باہر بھیجنے والے ایک ایجنٹ سے بات کی ہے کہ وہ تمہارے بیٹے کو لندن پہنچا کر وہاں ملازمت دلا دے۔ ملازمت بالکل پکی ہے۔ کسی طرح کے دھوکے کا احتمال نہیں ہے لیکن بیٹے کو باہر بھیجنے کے لیے تمہیں ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے اور وہ یہاں تمہارے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ میں یہ رقم تمہارے لیے لایا ہوں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی ''میں سمجھ گئی۔ اتنی بڑی رقم کے بدلے تم مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہو۔''

''تم نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اس لیے کچھ کہنے سے پہلے ہی سمجھ گئی ہو۔ یہاں انٹینسل وارڈ کے کمرا نمبر دس میں ایک زخمی ہے۔ اس کا نام اسد عزیزی ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی ''اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آپریشن کے ذریعے جوڑی گئی ہے۔ پہلی کی ایک ٹوٹی ہوئی ہڈی کو بھی جوڑا گیا ہے۔ وہ بری طرح زخمی ہو کر یہاں آیا تھا۔''

''میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ اس کے زخم بھر نے نہ پائیں بلکہ ناسور بن جائیں۔ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہو؟''

وہ تھوڑی دیر تک اسے الجھتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی ''اگر یہ رقم اتنی سستے دے کر جا رہے ہو تو سمجھو تمہارا کام ہو جائے گا۔''

''مجھے سمجھاؤ کام کیسے ہوگا؟''

''میں اسے انجکٹ کرنے والی دوائیں تبدیل کر سکتی ہوں۔ انجکشن دینے والی دواؤں کی شیشیاں وہی رہیں گی۔ لیبل بھی وہی رہیں گے لیکن ان کے اندر کی دوائیں تبدیل ہو جائیں گی اور وہ دوائیں مضر رساں ہوں گی جو رفتہ رفتہ اس کے زخموں کو ناسور بناتی رہیں گی۔''

''اس کے منفی نتائج کب ظاہر ہوں گے؟''

''چند گھنٹوں بعد ظاہر ہونے لگیں گے۔ ڈاکٹر دوائیں تبدیل کریں گے۔ دوسرے انجکشن کی شیشیاں رکھی جائیں گی۔ میں ان شیشیوں میں بھی دوائیں تبدیل کر دیا کروں گی۔''

وہ مسکرا کر بولا ''تم بہت کام کی عورت ہو۔ آئندہ بھی میں تم سے کام لیا کروں گا۔''

وہ بریف کیس بند کر کے اسے دیتے ہوئے بولا ''اگر

خاطر خواہ نتائج ظاہر ہوتے رہے تو سمجھو تمہیں پچاس ہزار روپے اور ملیں گے۔''

وہ خوش ہو کر بولی ''پھر تو میں ساری زندگی تمہاری کنیز بن کر رہوں گی۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''میری دوستی تمہیں فائدہ پہنچائے گی۔ دشمنی مہنگی پڑے گی۔''

اس نے ریوالور دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے بیٹے کو سات سمندر پار بھیجنے میں مدد کر رہا ہوں' دشمنی کی تو اسے سات سمندروں میں ڈبو بھی سکتا ہوں۔''

وہ ریوالور کو لباس میں چھپاتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ کی لکیروں پر چل رہا تھا۔ اگرچہ وہ ذیشان کے احکامات کی تعمیل کر رہا تھا لیکن حقیقتاً وہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کی مطابق عمل کرتا جا رہا تھا۔

دوسری صبح اس نے فلک آفتاب کو لوٹنے کے لیے اپنے ماتحتوں کو استعمال کیا۔ دن کے دس بجے تک اس کے ماتحتوں نے اس کے پاس دو کروڑ روپے پہنچا دیے۔ میں نے فون پر اسے مخاطب کیا ''ہیلو بچھو بابا! میں مقدر حیات بول رہا ہوں۔''

وہ بولا ''یس سر! میں اپنے باس کے حکم کے مطابق آج سے آپ کا تابعدار ہوں۔ آپ حکم دیں مجھے کیا کرنا ہے؟''

''فی الحال تو رپورٹ دو کہ بھائی جان کی گرفتاری کے بعد اب تک کیا کرتے رہے ہو؟''

وہ رپورٹ پیش کرنے لگا کہ اس نے کس طرح اسپتال کی ایک مجرمانہ ذہن رکھنے والی نرس کو ٹریپ کیا ہے اور اس کے ذریعے کس طرح اسد عزیزی کو ہمیشہ بیمار بنائے رکھے گا۔ اس کے زخم ناسور بن کر اس انتہا کو پہنچ جائیں گے کہ وہ اپنی آخری عمر تک اپاہج بنا رہے گا۔

میں نے کہا ''بھائی جان ایک پولیس افسر ہیں۔ ان کی تنخواہ اتنی نہیں ہے کہ وہ لاکھوں روپے خرچ کرتے رہیں اور اپنے آلہ کاروں اور ماتحتوں کو بڑی بڑی رقمیں ادا کرتے رہیں۔ تم نے نرس ماریہ کو ایک لاکھ روپے دیے۔ یہ رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''سر! میں بھی کوئی خاندانی رئیس نہیں ہوں۔ باس کے حکم سے مجرمانہ ذہن رکھنے والوں کو ٹریپ کرتا ہوں اور ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہوں۔ شہباز درانی نے آپ کی اصلیت اور کمزوریاں معلوم کرنے کے لیے ایک پہلو ماسٹر کو یہاں بلایا تھا۔ میں نے اس نجومی پہلو ماسٹر سے دس لاکھ روپے وصول کیے۔ ان ہی میں سے ایک لاکھ روپے میں نے نرس ماریہ کو دیے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''ان باپ بیٹے سے چھینی ہوئی رقم کہاں ہے؟''

''میرے پاس امانت کے طور پر ہے۔ آپ جہاں حکم دیں گے وہاں پہنچا دوں گا۔''

''نہیں۔ وہ رقم تم اپنے اکاؤنٹ میں رکھو۔ جب بھائی جان واپس آئیں تو انہیں دے دینا۔''

''سر! میں ان گواہوں کو ٹھکانے لگانا چاہتا ہوں جنہیں باس کے خلاف عدالت میں استعمال کیا جانے والا ہے۔''

''میں خون خرابے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تم میری لائن آف ایکشن پر چلو گے۔ شہباز درانی اور دردانہ کو کمزور سے کمزور تر بناتے جاؤ گے۔ ہم انہیں بھی قانونی شکنجے میں لے لیں گے۔''

''شہباز درانی بڑے بڑے سیاسی جرائم کا مرتکب ہوتا رہتا ہے لیکن ہمارے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہے۔''

''بے شک شہباز درانی کی پشت پر اتنی بڑی طاقت ہے کہ وہ پاکستانی قوانین کی گرفت میں نہیں آتا لیکن میں اسے گرفت میں لاؤں گا۔ فی الحال ہمیں دردانہ کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہے۔ کیا تم یہاں کے ایک سیاست دان جان محمد گبول کو جانتے ہو؟''

''اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''پچھلے دنوں اس کے ہاں ایک بڑی ڈکیتی ہوئی۔ دو کروڑ روپے کے ہیرے چرا لیے گئے اور کچھ ایسی دستاویزات بھی چرائی گئیں' جن کے ذریعے جان محمد کی ذاتی اور سیاسی زندگی کے بہت سے شرم ناک اور مجرمانہ راز ظاہر ہو سکتے ہیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ شہباز درانی جان محمد گبول کی یہ ساری کمزوریاں اپنے ہاتھ میں رکھ کر اسے اپنے اشاروں پر نچانا چاہتا تھا۔ جان محمد ہر الیکشن میں کامیاب ہو کر قومی اسمبلی میں پہنچتا تھا اور وہاں سے کسی نہ کسی شعبہ کی وزارت ضرور حاصل کرتا تھا۔ شہباز اپنے مقاصد کے لیے اسے اسمبلی میں کٹھ پتلی بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

بچھو بابا نے پوچھا ''سر! وہ ہیرے اور دستاویزات کہاں ہیں؟''

''دستاویزات میرے پاس ہیں اور ہیرے دردانہ کے پاس۔''

''اب آپ کیا چاہیں گے؟''

''میں نے ان دستاویزات کو شہباز تک پہنچنے نہیں دیا۔

اب وہ جان محمد گبول کو نہ بلیک میل کر سکے گا' نہ اسے کٹھ پتلی بنا سکے گا۔ وہ اپنی اس ناکامی کے باعث اپنے امریکی آقاؤں کے سامنے جوابدہ ہوگا۔ اس طرح میں اسے کمزور بناتا جا رہا ہوں۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ شہباز درانی سے نمٹ رہے ہیں۔ مجھے دردانہ سے نمٹنا ہوگا۔"

"ہاں۔ میں چاہتا ہوں تم ایک پراسرار اجنبی بن کر گبول سے فون پر باتیں کرو۔ اسے بتاؤ کہ اس کے دستاویزات تمہارے پاس محفوظ ہیں۔ شہباز درانی بلیک میل نہیں کر سکے گا۔"

میں اسے سمجھانے لگا کہ آئندہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ میری تمام باتیں سننے کے بعد بولا "یس سر! آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ اب کچھ عینی کا ذکر ہونا چاہیے کہ اس پر کیا گزر رہی ہے؟

☆☆☆

عینی کو خود پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گم ہو گئی تھی؟ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اپنے وجود سے غافل کہیں پڑی ہوئی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے انسان سانس لیتے لیتے مردہ ہو جاتا ہے اور مردہ ہو کر بھی زندہ رہتا ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان وہ کچھ وقت کہاں گزارتا ہے اسے خبر نہیں ہوتی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے..... ساری دنیا بجھ گئی تھی، گم ہو گئی تھی پھر بھی وہ دنیا والوں کو چھو کر اور ان کی آوازیں سن کر یہ سمجھ سکتی تھی کہ اسی دنیا میں موجود ہے لیکن بے ہوشی کی حالت میں نہ کسی چیز کو چھو سکتی تھی نہ کسی کی آواز سن سکتی تھی۔

پھر اس کے حواس آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگے۔ اس کی سماعت جاگنے لگی۔ کانوں میں دھیمی دھیمی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولنے سے کیا ہوتا ہے؟ اسے تو کچھ دکھائی نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی اس وقت کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی "مجھے کچھ دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے؟ میں آنکھیں کھول کر دیکھ رہی ہوں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کیا رات ہو چکی ہے اور میں نے لائٹ نہیں جلائی ہے؟

پھر جلد ہی اسے یاد آیا کہ وہ اپنی بینائی کھو چکی ہے۔ اس کے لیے دن اور رات برابر ہو چکے ہیں۔ وہ ہر رات عروج کے ساتھ سوتی تھی۔ اس نے آواز دی "عروج! تم کہاں ہو؟"

جواب میں خاموشی رہی۔ اس نے ذرا اونچی آواز میں پکارا "عروج! کیا تم واش روم میں ہو؟"

پھر بھی جواب نہ ملا۔ وہ جب واش روم میں جاتی تھی تو دروازے کو کھلا رکھتی تھی تاکہ عینی کی باتوں کا جواب دے سکے۔ اس وقت عینی کو کہیں سے جواب نہیں مل رہا تھا۔

وہ بیڈ کی چادر پر دونوں ہاتھ پھیر رہی تھی۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ اس کا اپنا بیڈ نہیں ہے۔ وہاں پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں مٹھیوں میں پتیاں لے کر انہیں محسوس کیا۔ سانسوں کے قریب لا کر سونگھا تو وہ گلاب کی تازہ پتیاں تھیں۔

وہ پریشان ہو کر بستر کو ٹٹولنے لگی۔ سرہانے والے حصے کو چھو کر دیکھا تو پتا چلا کہ یہ اس کا بیڈ نہیں ہے۔ وہ کسی دوسرے کے بستر پر پہنچی ہوئی ہے۔ پریشانی اور خوف سے دل دھڑکنے لگا۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔ تب اسے یاد آنے لگا کہ وہ تو عروج کے ساتھ کار میں تھی۔ عروج اس کو لینے ایک ہاسپٹل کے اندر گئی تھی۔ اسی وقت اس نے پاشا کی آواز سنی تھی اور دروازہ کھول کر کار سے نکل آئی تھی۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ پاشا کی آواز سنتے ہی وہ کیسی پاگل سی ہو گئی تھی۔ اس آواز کے پیچھے بے اختیار چلی جا رہی تھی۔ ٹھوکریں کھا رہی تھی، سنبھل رہی تھی۔ آخر وہ ایک گاڑی کے کھلے دروازے سے ٹکرا گئی تھی پھر کسی نے اسے دھکا دیا تو وہ گاڑی کے اندر پہنچ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن کسی نے اس کے منہ پر کپڑا رکھ دیا۔ جس میں بے ہوشی کی دوا تھی۔ وہ دوسرے ہی لمحے میں اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی۔

یہ باتیں یاد آتے ہی پریشانی بڑھ گئی۔ خوف طاری ہونے لگا۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ مگر کس نے کیا ہے؟

وہ رونے کے انداز میں سوچنے لگی "میں تو اپنے پاشا کی آواز کے پیچھے جا رہی تھی۔ کیا پاشا میرے آگے نہیں تھا؟ کیا اس نے مجھے اغوا ہوتے نہیں دیکھا تھا؟ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ وہ مجھ سے محبت کر رہا ہے یا مجھے تماشا بنا رہا ہے؟

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ اس تاریکی میں دردانہ کی آواز سنائی دی "میری بیٹی کیوں رو رہی ہے؟"

عینی نے چونک کے اپنے چہرے پر سے دونوں ہاتھ ہٹائے پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اسے آواز سنائی دی "میں یہاں ہوں۔ تم تاریکی میں ہو مگر

میں روشنی میں ہوں۔ یہ کمرا روشن ہے۔ تم ایک شہزادی کی طرح زندگی گزارتی آ رہی ہو' اس لیے اس کمرے میں بھی تمہاری آسائش کی ہر چیز موجود ہے۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی "آپ دل جلا کر ٹھنڈک پہنچانے والی بات کر رہی ہیں۔ یہ اب میں سمجھی کہ آپ نے مجھ سے یہ زیادتی کی ہے اور آپ کے غنڈے بدمعاش مجھے اٹھا کر یہاں لائے ہیں۔"

وہ قریب آتے ہوئے بولی "مجھے الزام نہ دو۔ تم خود ہی پاشا کی آواز کے پیچھے بھاگتی ہوئی یہاں تک آئی ہو۔"

"میں اپنے پاشا کے پیچھے بھاگتے بھاگتے گڑھے میں گر جاتی لیکن یہاں کیسے نہ آتی۔"

"چلو تم خود یہاں تمہیں لے آئی۔ کیا کروں بیٹی؟ میں نے تمہیں پیار سے سمجھایا کہ میرے بیٹے جواد سے شادی کر لو۔ میری بہو بن جاؤ لیکن تم نے نہ صرف انکار کر دیا اور میری توہین کی۔ ایک ماں اس وقت اپنی توہین محسوس کرتی ہے' جب اس کے بیٹے کو مسترد کیا جاتا ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آپ اپنے بیٹے کا رشتہ مانگنے کہیں جائیں اور وہاں سے انکار ہو جائے تو آپ اپنی توہین سمجھنے لگیں۔"

"میں ایسی ہی ماں ہوں۔ اپنے بیٹے کے لیے زمین کے اندر چھپے خزانے بھی ڈھونڈ کر لا سکتی ہوں۔"

"یہی غرور آپ کو کھا گیا۔ جس بیٹے پر ناز تھا وہ مارا گیا۔"

"تمہارا بھائی ذیشان بھی مارا جائے گا اور تم میری بہو بننے سے انکار کر دو گی تو میں تمہاری بھی زندگی حرام کر دوں گی۔"

وہ جھنجلا کر بولی "آخر آپ مجھے اپنے کس بیٹے کی بہو بنانا چاہتی ہیں؟"

"میرے بیٹے کا نام ہے سلامت پاشا عرف پاشا جانی۔"

وہ گم صم سی ہو کر تاریک خلا میں تکنے لگی پھر اس نے پوچھا "کیا پاشا اپنی خوشی سے آپ کا بیٹا بن گیا ہے؟"

"کسی سے جبراً کوئی رشتہ جوڑا نہیں جاتا۔ پاشا راضی خوشی مجھے اپنی ماں تسلیم کرتا ہے۔ میں ابھی اسے یہاں بلاتی ہوں۔ تم اس سے جی بھر کے باتیں کر لینا۔ اس کی بارے میں، میرے بارے میں، اپنے بارے میں جو چاہو بات کر لینا۔"

"آپ اسے بلائیں میں پوچھنا چاہتی ہوں' وہ میرے ساتھ تماشا کیوں کر رہا ہے؟"

"وہ نہیں کر رہا ہے، تماشا میں کر رہی ہوں۔ آج تم اس کی آواز کے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔ دراصل اس وقت میں نے اس کی آواز ایک کیسٹ میں ریکارڈ کر لی ہے۔ میرا ایک آدمی تمہاری کار کے سامنے سے وہی کیسٹ سناتا ہوا گزرا تو تم نے یہی سمجھا کہ پاشا بولتا ہوا جا رہا ہے۔ لہٰذا تم اس کے پیچھے بھاگتی چلی آئیں۔"

"کیا وہ نہیں جانتا کہ مجھے کس طرح لایا گیا ہے؟"

"پہلے نہیں جانتا تھا۔ میں نے ابھی اسے بتایا ہے۔ وہ مجھ سے کچھ ناراض ہے۔ کہہ رہا تھا کسی شریف زادی کو اس طرح اغوا نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر وہ تمہیں چاہتا ہے، تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے میرے اشاروں پر چلنا ہوگا۔"

"کیا آپ نے اسے قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ اب میں تمہیں سچ بتا دوں کہ اس کی یادداشت گم ہو چکی ہے۔ وہ پچھلی زندگی بھول گیا ہے۔ اپنے آپ کو بھی بھول گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے صرف اتنا ہی یاد دلایا کہ اس کا نام پاشا ہے۔ وہ عینی نام کی ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا اور یہ کہ میں اس کی سگی ماں ہوں اور اس کے باپ کا نام شہباز درانی ہے۔"

"میں اسے اس کی پچھلی زندگی یاد دلانے کی کوشش کروں گی۔"

"اگر تم ایسی حماقت کرو گی تو پچھتاؤ گی۔ پھر پاشا تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔"

عینی چپ رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرنا چاہیے۔ دردانہ نے کہا "سوچو، اچھی طرح سوچ لو تمہیں اب کیا کرنا چاہیے۔ ذرا سی بھی حماقت کرو گی تو پاشا کو بھی ہمیشہ کے لیے کھو دو گی اور تم بھی یہاں سے کبھی باہر نہیں نکل سکو گی۔"

وہ رونے کے انداز میں بولی "آپ کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ اس طرح خوا مخواہ مجھے اپنی بہو بنا کر آپ کیا حاصل کر لیں گی؟"

"میں تمہارے خاندان والوں کی ناک نیچی کروں گی۔ سب نے مجھے حقارت سے کہا تھا کہ تمہارے خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک نوجوان ہے۔ ان کے مقابلے میں جواد کو بھی اس گھر کے داماد کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جائے گا۔"

وہ ایک ذرا توقف سے بولی "تمہارے خاندان والوں نے اپنی ضد پوری کر لی۔ تمہارے ذیشان بھائی نے میرے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ تمہیں بہو بنانے کی میری

خواہش حسرت بن کر رہ جائے لیکن میں ہار ماننے والی نہیں ہوں۔ آج نہیں اپنی بہو بنا کر رہوں گی۔"

عینی نے پریشان ہو کر پوچھا "آج؟"

"ہاں۔ یہاں پاشا کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھانے کی تیاریاں ہو چکی ہیں۔ قاضی صاحب دوسرے کمرے میں موجود ہیں۔"

"میں صرف عروج اور اپنے بزرگوں کی موجودگی میں نکاح قبول کروں گی۔"

"بعد میں انہیں تمہارا نکاح نامہ دکھا دیا جائے گا۔ میں تم سے زیادہ بحث نہیں کروں گی۔ یاد رکھو اگر تم نے آج نکاح قبول نہیں کیا تو ابھی تمہارے سامنے پاشا کو گولی ماردی جائے گی۔"

عینی کے دماغ کو ایسا جھٹکا لگا جیسے پاشا کو واقعی گولی ماردی گئی ہو۔ تصور کی آنکھ سے تاریکی میں دردانہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میں جا رہی ہوں اور ابھی پاشا کو یہاں بھیجتی ہوں۔ تم دونوں کو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے تک باتیں کرنے کا موقع دوں گی۔ اس کے بعد پاشا نے آکر کہہ دیا کہ تم نکاح کے لیے راضی ہو تو نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ انکار کی صورت میں تم جانتی ہو کہ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

ایک ذرا توقف سے اس کی آواز سنائی دی "میں جا رہی ہوں اور ابھی پاشا کو بھیجتی ہوں۔"

وہ بولی "پلیز، ذرا رک جائیں۔ میری ایک بات مان لیں تو میں نکاح قبول کر لوں گی۔"

"بولو، تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"آپ جانتی ہیں کہ میں عروج کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ بس میری ایک بات مان لیں۔ آپ صرف اسے یہاں بلائیں۔ میں اس کی موجودگی میں نکاح قبول کر لوں گی۔"

وہ بولی "سوری، تمہارا اپنا یہاں کوئی نہیں ہوگا۔ شادی کے بعد تم اپنے تمام رشتے داروں سے مل سکو گی۔"

اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ تیزی سے سوچ رہی تھی کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ اس نے اسے آواز دی "آپ موجود ہیں نا؟ عروج کو یہاں نہ بلائیں کم سے کم فون پر اس سے بات کرنے دیں۔"

وہ چپ ہوئی۔ جواب سننا چاہتی تھی لیکن جواب نہیں ملا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بدنصیبی کے اندھیرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔

پاشا جانی دوسرے کمرے میں ایک ایزی چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پچھلے تین دنوں سے بہت پریشان تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اجنبی ماحول میں ہے۔ یہ جو دردانہ بیگم اور شہباز درانی ہیں، اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ البم میں اس کے ساتھ چند تصاویر تھیں اور اس کی اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی ڈائری تھی۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے لیکن دل نہیں مان رہا تھا۔

یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس کی دماغی کمزوری رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی۔ اس کی یادداشت دبے قدموں توانائی کی طرف گامزن تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک بار عروج کو خواب میں دیکھا تھا۔ عروج اپنے اسپتال والے کوارٹر میں اس کے ساتھ تنہا تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی تھی تو عروج نے پریشان ہو کر کہا "پتا نہیں اتنی رات کو کون آیا ہے۔"

عروج نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو باہر پریشان کھڑا ہوا تھا۔ پاشا نے اسے خواب میں دیکھا تو پہچان نہیں سکا۔ یادداشت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ بس اتنی ہی بات سمجھ میں آئی کہ کوئی پولیس والا دروازے پر پہنچ گیا ہے۔

خواب وہیں تک نظر آیا تھا کہ آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ بے چینی سے سوچنے لگا تھا "کیا وہ خوبصورت سی لڑکی میری محبوبہ ہے؟"

اس کے دل نے کہا "بے شک، وہ میری محبت ہے میری جان ہے، کبھی تو میں نے اسے خواب میں دیکھا ہے۔ اور اس کے ساتھ میں تنہا وقت گزار رہا تھا ایسے میں کوئی پولیس والا آ گیا تھا۔ کیا ایسا میری پچھلی زندگی میں ہو چکا ہے؟"

اسے پچھلی زندگی یاد نہیں تھی۔ لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ عروج اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسی لیے اس نے خواب میں اسے دیکھا تھا۔ اس نے عینی کو نہیں دیکھا تھا۔ جو لاشعور میں چھپی ہوئی تھی وہی خواب کی صورت میں سامنے آئی تھی۔

اس نے دوسری رات پھر عروج کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا "میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم ہی سے شادی کروں گا۔ تم کیوں عینی سے شادی کرنے کی ضد کر رہی ہو؟"

عروج نے کہا "اگر تم مجھے دل و جان سے چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری شریک حیات بن جاؤں تو پھر مجھ سے پہلے تمہیں عینی سے شادی کرنی ہوگی۔ میری یہ بات نہیں مانو گے تو میں تمہاری زندگی سے دور چلی جاؤں گی۔"

یہ کہتے ہی وہ پلٹ کر چلی گئی۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ ایک دم سے چونک کر، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں کھلتے ہی خواب میں آنے والا حسین چہرہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اب وہ گہری سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ اس خوبصورت سی اجنبی لڑکی سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ خواب میں وہ عینی کا ذکر کر رہی تھی اور اس سے بھی شادی کرنے کی ضد کر رہی تھی۔ عجیب محبوبہ تھی۔ اپنے اوپر سوکن لانا چاہتی تھی۔

دوبارا سے خوابوں میں دیکھنے کے بعد اس کا چہرہ ذہن میں نقش ہوگیا تھا۔ اب وہ جاگتی آنکھوں سے بھی اسے خیالوں میں دیکھنے لگا تھا۔ دردانہ نے اس سے کہا تھا کہ وہ عینی کو اغوا کر کے یہاں لانا چاہتی ہے۔ وہ پاشا کے ذریعے اغوا کرنا چاہتی تھی۔ پاشا نے انکار کرتے ہوئے کہا ''نہیں ممی! یہ مناسب نہیں ہے۔ اگر وہ اندھی ہوگئی ہے تو میں اس کی مجبوری سے کھیلنا پسند نہیں کروں گا۔ اسے آوازیں دے کر اپنے پیچھے بلا کر یہاں نہیں لاؤں گا۔''

دردانہ نے کہا تھا ''ٹھیک ہے۔ تم ایسا نہ کرو لیکن میں اسے یہاں لے آؤں گی تو اس کے ساتھ نکاح سے تم انکار نہیں کرو گے۔''

''آپ کیوں جبراً نکاح پڑھوانا چاہتی ہیں؟''

''میں تمہاری محبت تمہیں دینا چاہتی ہوں۔ وہ تمہاری محبوبہ ہے۔ تم خود اپنی لکھی ہوئی ڈائری میں پڑھ چکے ہو۔ جب اس سے شادی ہو جائے گی اور تم اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارو گے تو تمہیں رفتہ رفتہ اس کے ساتھ گزاری ہوئی پچھلی زندگی بھی یاد آجائے گی۔''

وہ پریشان تھا۔ سوچ رہا تھا' اسے کیا کرنا چاہیے؟ ایک تو عینی کی طرف دل مائل نہیں تھا اور اسے نکاح قبول کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا پھر دوسری بات یہ ذہن میں آئی تھی کہ اگر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر درست ہے تو پھر عینی اس کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ وہ اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارے گا تو اسے گزری ہوئی باتیں سچ مچ یاد آجائیں گی۔ شادی کے بعد عینی کے گھر جائے گا تو شاید اس خوبصورت حسینہ سے ملاقات ہو سکے گی جسے وہ خوابوں اور خیالوں میں دیکھتا آرہا ہے۔

وہ خیالات سے چونک گیا۔ دردانہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔ مسکرا کر بولی ''اب تم جا سکتے ہو اور عینی سے مل سکتے ہو۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا ''کیا عینی مجھ سے نکاح کے لیے راضی ہے؟''

''اسے راضی ہونا پڑے گا۔ وہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ میں اس کی کمزوریوں کو سمجھتے ہوئے اسے دھمکی دے چکی ہوں کہ انکار کرے گی تو تمہیں گولی مار دی جائے گی۔''

اس نے چونک کر پوچھا ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

وہ قریب آکر اس کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ میں تو تمہاری موت کا تصور بھی نہیں کر سکتی لیکن اس کی کمزوری سے کھیلنا ضروری تھا۔ اس لیے ایسی دھمکی دی تھی۔''

وہ آگے کی طرف جھک کر اس کی پیشانی کو چوم کر بولی۔ ''تم بھی اس سے یہی کہو گے کو وہ تمہاری سلامتی کی خاطر راضی ہو جائے گی۔''

وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ دردانہ کی ممتا یہ یقین دلا رہی تھی کہ وہی اس کی ماں ہے اور اسی نے اسے جنم دیا ہے لیکن عروج کو بار بار خوابوں میں دیکھنے کے بعد وہ الجھتا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ شبہات پیدا ہو رہے تھے کہ اس کی زندگی کے بہت سے اہم رازوں اور واقعات کو اس سے چھپایا جا رہا ہے۔

اس کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا کہ اس کی زندگی میں عینی کی نہیں' عروج کی اہمیت ہے۔ دردانہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا ''کس سوچ میں پڑ گئے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا ''ممی! میرا دل عینی کی طرف مائل نہیں ہو رہا ہے۔ اس سے شادی کرنا کیا ضروری ہے؟''

''بکواس مت کرو۔ تمہیں اپنی ماں کا حکم ماننا چاہیے۔ تم بہت کچھ بھول گئے ہو۔ یہ نہیں جانتے کہ اس خاندان میں تمہاری ماں کی کتنی توہین ہو چکی ہے۔ میں اس توہین کا بدلہ لوں گی۔ اسے اپنی بہو بنا کر رہوں گی۔ تم نے میرا دودھ پیا ہے' تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ جاؤ وہ کمرے میں تنہا ہے۔ اس سے باتیں کرو۔ اس کی دلجوئی کرو۔ آدھے گھنٹے بعد نکاح پڑھایا جائے گا۔''

وہ اس کمرے میں آگیا جہاں عینی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آہٹ سن کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس کی خالی خالی نظریں کہہ رہی تھیں کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا ''کون ہے؟''

پاشا اس کے قریب آتے ہوئے بولا ''میں ہوں، پاشا.....''

وہ بالکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے بے یقینی سے پوچھا ''کیا واقعی تم میرے پاس آئے ہو یا پھر کیسٹ ریکارڈر کے ذریعے دھوکا دیا جا رہا ہے؟''

اس نے کہا ''ایسی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ تمہارے بالکل قریب ہوں۔''

عینی نے آواز کی سمت اپنا ہاتھ بڑھایا۔ پاشا نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس پاتے ہی عینی نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی زندگی کی گھور تاریکیوں میں اس لمس کو اچھی طرح پہچان رہی تھی۔ اسے یاد آرہا تھا' جب پہلی بار اس نے پاشا کو اپنی کوٹھی کے احاطے سے رخصت کرتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا تھا۔ وہ پہلا مصافحہ' ہاتھوں کا وہ لمس پھر لوٹ آیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھام کر کہہ رہا تھا ''میں عارضی طور پر بچھڑ گیا تھا۔ اب تمہارے پاس آگیا ہوں۔ مجھے پہچانو۔ مجھ پر شبہ نہ کرو۔''

اس کی آواز نے اور ہاتھوں کے لمس نے یقین دلایا کہ وہ اسے پا چکی ہے۔ وہ فوراً ہی بستر سے اتر کر کھڑی ہوگئی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے چھونے لگی۔ اس کے چہرے کو دونوں ہتھیلیوں میں لے کر بولی ''تم کہاں کھو گئے تھے؟ ہمیں کیوں بھول گئے تھے؟ کیا ہماری یاد نہیں آتی تھی؟ کیوں ہمیں دل سے نکال کر پھینک دیا تھا؟''

''میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کن حالات سے گزر رہا ہوں۔''

''تم کیسے ہی حالات سے گزر رہے ہو مگر تمہارا دل تو دھڑک رہا ہے نا؟ اور دل کی ان دھڑکنوں میں کیا عروج نہیں ہے؟ تم تو اسے دل و جان سے چاہتے رہے ہو۔ کیا تم نے اسے بھی بھلا دیا ہے؟''

''عروج۔۔؟'' پاشا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا ''کیا میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی دوسری لڑکی بھی آئی تھی؟ کیا میں اسے دل و جان سے چاہتا رہا ہوں؟''

''یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنی محبت کرنے والیوں کو بھلا بیٹھے ہو۔''

''مجھے غلط نہ سمجھو۔ میری یادداشت گم ہو چکی ہے۔ میں اپنی پچھلی زندگی بھول چکا ہوں۔''

عینی کو یاد آیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے دردانہ نے یہی کہا تھا کہ پاشا اپنی پچھلی زندگی بھول چکا ہے۔ اسے یہ سمجھایا گیا ہے کہ دردانہ اور شہباز درانی اس کے والدین ہیں اور وہ خود کو ان کا بیٹا سمجھنے لگا ہے۔

''اگر تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو، سب کچھ بھول چکے ہو تو یہاں کس حیثیت سے رہتے ہو؟ کیا واقعی تم نے خود کو دردانہ بیگم کا بیٹا تسلیم کر لیا ہے؟''

''مجھے تسلیم کرنا چاہیے۔''

''نہیں' تم ان کے بیٹے نہیں ہو۔ تم ایک ٹیکسی ڈرائیور ہو۔ تمہارے والد کا نام شہباز درانی نہیں ہے۔ یہ لوگ تو بہت ہی امیر کبیر لوگ ہیں اور تم ایک غریب باپ کے بیٹے ہو۔ تمہارے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''عینی! انہوں نے ٹھوس ثبوت فراہم کیے ہیں۔ میرے ہاتھوں کی لکھی ہوئی تحریر بھی موجود ہے۔ میں اپنی تحریر پہچانتا ہوں۔ میری ممی کے پاس کئی البم ہیں' جن میں بچپن سے لے کر اب تک کی بہت ساری تصویریں ہیں۔ ممی اور ڈیڈی کے ساتھ جوانی کی تصویریں بھی ہیں۔ میرے شناختی کارڈ میں باپ کا نام شہباز درانی لکھا ہوا ہے۔''

''پاشا! تمہیں سمجھنا چاہیے کہ جعلی شناختی کارڈ آسانی سے تیار ہو جاتے ہیں اور مختلف انداز کی جعلی تصویریں بھی بنوائی جاتی ہیں۔''

''میں مانتا ہوں لیکن میرے ہاتھ کی جو ڈائری لکھی ہوئی ہے وہ تو غلط نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس میں اپنی ممی اور ڈیڈی شہباز درانی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور تمہارے بارے میں بھی لکھا ہے کہ میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔''

عینی سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دیکھ تو نہیں سکتی تھی مگر تاریکی میں اس کی طرف تک رہی تھی۔ اس نے پوچھا ''کیا تم نے اپنی اس ڈائری میں عروج کا ذکر کیا ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا ''نہیں۔ عروج کا ذکر ایک آدھ جگہ بس یوں ہی کیا ہے ورنہ اس ڈائری میں تم سے بھرپور محبت کا اظہار کرتا رہا ہوں۔''

''پھر تو وہ ڈائری بھی فراڈ ہے۔ پاشا! تم بھول رہے ہو کہ تم مجھ سے زیادہ عروج کو چاہتے ہو۔ تم نے اس کی محبت کی خاطر مجھے قبول کیا۔ اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ ہم دونوں سہیلیاں تمہاری شریکِ حیات بن کر رہنا چاہتی تھیں۔ تم یہ ساری باتیں بھول رہے ہو۔''

پاشا کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے خواب میں یہی دیکھا تھا۔ عروج اس سے کہہ رہی تھی کہ اسے عینی سے محبت کرنا چاہیے اور شادی بھی کرنا چاہیے۔ وہ عینی کو اپنی سوکن بنائے گی۔ وہ دونوں اس کی شریکِ حیات بن کر رہنا چاہتی تھیں اور یہ بات وہ پچھلے دن خواب میں بھی دیکھ چکا تھا۔

دیکھا جائے تو وہ خواب دراصل خواب نہیں تھا۔ اس کی یادداشت واپس آنا چاہتی تھی۔ اس لیے واپسی کا چور راستہ اختیار کر رہی تھی۔ اسے خوابوں اور خیالوں کے ذریعے اپنے

دل میں دھڑکنے والی عروج کی طرف لے جارہی تھی۔

اس وقت پاشا کا دل کہہ رہا تھا کہ عینی جس عروج کا ذکر کررہی ہے اسی کو وہ خوابوں میں دیکھتا آرہا ہے۔ اس نے کہا ''عینی! میرا دل کہتا ہے' تم سے شادی ہو جائے گی۔ ہم ازدواجی زندگی گزارنے لگیں گے۔ ہمیں یہاں سے باہر جانے کے مواقع ملتے رہیں گے اور میں تمہارے گھر جایا کروں گا تو مجھے بہت سی باتیں یاد آئیں گی پھر تم جس عروج کا ذکر کررہی ہو میں اسے دیکھوں گا تو شاید پہچان سکوں گا۔''

وہ بولی ''اگر دردانہ بیگم اور شہباز درانی تمہارے ماں باپ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ان سے کہو کہ وہ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر جانے دیں۔ وہاں تم عروج سے ملاقات کرو گے۔ ہم دونوں تمہیں بہت سی باتیں یاد دلائیں گی۔ اس طرح تمہیں اپنی پچھلی زندگی یاد آتی رہے گی۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا ''عینی! وہ چاہتی ہیں کہ پہلے ہماری شادی ہو جائے۔ ابھی یہاں نکاح پڑھایا جائے۔ ہم ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں باہر جانے کی اجازت دیں گی۔''

''وہ ایسا کیوں چاہتی ہیں۔ یہ کیوں نہیں چاہتیں کہ اس شادی میں میرے اپنے رشتے دار اور بزرگ بھی شامل ہوں؟''

''وہ کہتی ہیں' تمہارے بزرگ کبھی تمہیں ان کی بہو نہیں بننے دیں گے۔ اس لیے پہلے وہ راز داری سے ہمارا نکاح پڑھوانا چاہتی ہیں۔ ہماری شادی کے بعد تمہارے خاندان والے اس رشتہ سے انکار نہیں کرسکیں گے اور مجھے اپنا داماد تسلیم کرلیں گے۔''

''پاشا! تم یہ بات بھول چکے ہو کہ میرے رشتہ دار میرے تمام بزرگ تمہیں داماد تسلیم کرچکے ہیں۔ ہماری شادی ہونے والی تھی لیکن عین شادی کے وقت تم پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس کے بعد تم اتنے عرصے تک غائب رہے۔ آج مل رہے ہو تو بالکل ہی بدل چکے ہو۔''

وہ پریشان ہو کر بولا ''میری اپنی زندگی مجھے الجھا رہی ہے۔ میں کسی سے کیا شکایت کروں کہ کون مجھے بھٹکا رہا ہے اور کون مجھے راہ پر لگانا چاہتا ہے؟ موجودہ مسئلے کا حل بس یہی ہے کہ ہم میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو جائیں۔ ممی نے وعدہ کیا ہے کہ ہمارا ازدواجی رشتہ قائم ہونے کے بعد وہ ہمیں یہاں سے جانے دیں گی۔ وہاں عروج سے ملنے کے بعد ہی مجھے پچھلی زندگی یاد آسکے گی۔''

وہ پریشان ہو کر بولی ''تم بھی یہی چاہتے ہو کہ ابھی ہمارا نکاح پڑھادیا جائے؟ ذرا سوچو تو سہی' یہ کتنا عجیب اور نامناسب سا لگتا ہے کہ میرا یہاں اپنا کوئی نہیں ہے' کوئی بزرگ نہیں ہے۔ بھائی جان بھی نہیں ہیں۔ میری عروج بھی نہیں ہے اور مجھے اپنی زندگی کا اتنا اہم قدم اٹھانے کے لیے کہا جارہا ہے۔''

''بعض حالات میں انسان اسی طرح مجبور ہو جاتا ہے۔ تم یہ سوچو کہ ابھی مجبوری کی حالت میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بعد ہم دونوں مجبور نہیں رہیں گے۔ تم کہہ رہی تھیں' ہماری شادی ہونے والی تھی لیکن نہ ہوسکی۔ آج ہو رہی ہے تو اسے قبول کرلو۔''

اسے قبول کرنا ہی تھا۔ نہ کرتی تو اپنی اندھیری دنیا میں کہاں جاتی؟ یہ یقین ہو گیا تھا کہ پاشا بھی مجبور ہے۔ اگرچہ اسے زنجیریں نہیں پہنائی گئی تھیں لیکن دردانہ اور شہباز اس کے ماں باپ بن کر اسے محبت کی زنجیریں پہنا کر قیدی بنائے ہوئے تھے اور اس کے گمشدہ ماضی سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

عینی نے ایسے مشکل اور آزمائشی حالات دیکھ کر فیصلہ کیا کہ وہ شادی کرے گی اور اس کی شریکِ حیات بن کر اس کی پچھلی زندگی اسے یاد دلائے گی اور اسے دردانہ کے طلسم سے نکالے گی۔ لہٰذا اس نے نکاح قبول کرلیا۔

اس نے جو بھی کیا وہ تاریکی میں رہ کر کیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نکاح کے وقت اس کے آس پاس کون کون ہے؟ دردانہ تہمینہ، شہباز درانی اور قاضی صاحب کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ قاضی صاحب نے نکاح قبول کرانے کے بعد اس کے ہاتھ میں قلم پکڑایا تھا پھر اس کا ہاتھ ایک جگہ رکھ کر کہا تھا۔ ''یہاں دستخط کردو۔''

اس سے کسی دستاویز یا کسی سادے کاغذ پر بھی دستخط کرایا جاسکتا تھا۔ وہ تو دیکھنے کے قابل نہیں تھی لیکن اسے پاشا پر اعتماد تھا کہ وہ سامنے بیٹھا ہوا ہے اور اسے نکاح نامے پر دستخط کرتے دیکھ رہا ہے۔ پھر پاشا کے نکاح قبول کرنے کی آواز... بھی سنائی دی۔ اس نے یہ بھی سنا کہ وہ نکاح نامے پر دستخط کررہا ہے۔ وہ صرف سنتی جارہی تھی۔ جہاں تک دیکھنے کا تعلق تھا' اس کا خداداد کیور ہا تھا۔

دردانہ نے نکاح کے بعد عینی کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا ''آج میں نے تمہیں اپنی بہو بنا ہی لیا۔ تمہیں اپنی نئی زندگی مبارک ہو۔ اب ہم جارہے ہیں۔ تم اپنے دولھا کے ساتھ وقت گزارو۔''

وہ بولی ''میں گھر جانا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے' چلی جانا۔ ابھی تو تم اپنے دولھا کے ساتھ

کچھ لمحات گزارو۔ ابھی سہ پہر کے تین بجے ہیں۔ شام کے چھ بجے تک تم پاشا کے ساتھ اپنے گھر جاسکو گی۔''

وہ وہاں سے چلی گئی۔ پاشا نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے' اس کے قریب آتے ہوئے کہا ''وہ جاچکے ہیں۔ ہم یہاں تنہا ہیں۔''

عینی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ہاتھ کو تھام لیا۔ وہ بولی ''دردانہ ممی نے کہا ہے' ہم تین گھنٹے بعد یہاں سے جاسکتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا' انہوں نے ہمیں تین گھنٹے تک یہاں کیوں روک رکھا ہے؟''

''ان کی ایک شرط ہے۔''

عینی نے سوالیہ نشان کی طرح سر اٹھایا۔ وہ بولا ''وہ کہتی ہیں جب تک ہمارے درمیان میاں بیوی کے تعلقات قائم نہیں ہوں گے' وہ ہمیں یہاں سے نہیں جانے دیں گی۔''

وہ پریشان ہو کر بولی ''وہ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟''

''ان کے نقطۂ نظر سے سمجھو۔ وہ یقین کرنا چاہتی ہیں کہ ہم واقعی میاں بیوی بن چکے ہیں۔ انہوں نے تمہیں اپنی بہو بنا لیا ہے اور تم یہ رشتہ بھی توڑ نہیں پاؤ گی۔''

وہ اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے بازوؤں میں لے کر بولا ''اب ہم ایک مضبوط رشتے میں بندھ چکے ہیں۔ آؤ اس رشتے کو اور مضبوط کرلیں۔''

دردانہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی بڑے سے اسکرین پر عینی اور پاشا کو دیکھ رہی تھی۔ عینی اپنے دولہے کی آغوش میں تھی اور دردانہ شہباز کے بازوؤں میں سمائی ہوئی کہہ رہی تھی ''مجھے پاشا پر شبہ ہے۔''

شہباز درانی نے پوچھا ''کیسا شبہ؟''

''یہی کہ شاید اس کی یادداشت واپس آرہی ہے۔''

وہ بولا ''میں نے یہاں بیٹھ کر عینی اور اس کی باتیں سنی ہیں۔ اس کی باتوں سے ایسا لگتا ہے جیسے وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا ہے۔ کچھ یاد کررہا ہے۔ ویسے یہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ آج رات ڈاکٹر پھر اسے انجکشن لگائے گا پھر اس کا ذہن کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

''آج میرا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ آج میں عینی کے خاندان میں ایسا دھماکا کروں گی کہ سب ہی کے سر جھک جائیں گے پھر بھی کوئی میرے سامنے سر نہیں اٹھا سکے گا۔''

شہباز نے کہا ''آج کے بعد پاشا بھی ہمارے لیے غیر ضروری ہو جائے گا لیکن ابھی کچھ عرصے تک ہمیں اسے اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ عینی اور اس کے خاندان والوں کے معاملات میں پھر اسے مہرہ بنانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

وہ بڑے سے اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''دیکھو شہباز! میں اسے کس طرح بے حیا بنا رہی ہوں۔ اس نے میری بہو بننے سے انکار کیا تھا۔ میرے بیٹے کو دھتکارا تھا۔ اس کی وجہ سے میرا جوان بیٹا مارا گیا اور اسے مارنے والا اسی کا ایس' پی' بھائی ہے۔ اس ایس' پی' کو تو اپنی سلاخوں کے پیچھے بھیج دیا۔ اب یہ رہ گئی ہے۔ آج کے بعد یہ بدچلن لڑکی کہلائے گی۔ جہاں جائے گی اس کے ساتھ ساتھ بدنامی اور رسوائی بھی چلتی رہے گی۔''

☆☆☆

عروج اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اس نے فلک ناز، فلک آفتاب اور بیگم آفتاب سب ہی کو اس کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا۔ فلک ناز پریشان ہو گئی تھی۔ فلک آفتاب اور بیگم آفتاب نے بھی یوں ہی پریشانی ظاہر کی تھی۔ ان پر جو مصیبت آئی تھی اس کے پیش نظر وہ عینی کی گمشدگی کو زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ دو کروڑ ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھے ہائے ہائے کررہے تھے۔ عروج نے ذیشان تک یہ خبر پہنچانے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہی۔ سی' آئی' اے کے افسر باقر مہدی نے اسے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

عروج نے کہا ''ایسے وقت مقدر بھائی ہمارے لیے کچھ کرسکتے ہیں لیکن پتا نہیں وہ کہاں ہیں۔ فون پر رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔''

فلک ناز نے اپنے بھائی فلک آفتاب سے کہا ''آپ ہمارے ساتھ ذیشان کے دفتر چلیں۔ اگرچہ وہ سی' آئی' اے والوں کی کسٹڈی میں ہے لیکن اس کے جان پہچان والے بہت سے افسر ہیں جو عینی کی گمشدگی کے سلسلے میں ہماری مدد کرسکتے ہیں۔''

فلک آفتاب نے کہا ''میں بہت بیمار ہوں۔ صبح سے میرا پیٹ ٹھیک نہیں ہے ۔ میں گھر سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔''

عروج نے بابر سے کہا ''تم ہی ہمارے ساتھ چلو۔''

وہ بولا ''تمہیں میرے حالات کا علم نہیں ہے' میں اس وقت بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو رہا ہوں۔ جن سے کاروبار کے سلسلے میں قرض لیا تھا' ان سے منہ چھپاتا پھر رہا ہوں۔ میں گھر سے باہر نہیں جاسکوں گا۔''

شام کو چار بجے مجھ سے رابطہ ہوا۔ عروج نے کہا ''بھائی جان! آپ کہاں ہیں؟ ہم پر قیامت آئی ہوئی ہے۔ عینی صبح سے گم ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے کسی نے اغوا کیا ہے۔ ہم نے

بھائی جان کے دوست افسران کی مدد سے عینی کے اغوا ہونے کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ پولیس والے اسے تلاش کر رہے ہیں لیکن صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے اور اس کی کوئی خبر نہیں مل رہی ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ میں نے فون پر تسلی دی "رونے سے بات نہیں بنے گی۔ تم تعلیم یافتہ بھی ہو اور عملی زندگی گزارنے والی لیڈی ڈاکٹر بھی۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔"

"حوصلہ کیسے کروں جبکہ دشمن ہمارے سامنے ہیں اور ہم ان کا کچھ بگاڑ نہیں پا رہے ہیں؟"

میں نے انجان بن کر پوچھا "تم کس کی بات کر رہی ہو؟"

"میں اسی دشمن عورت دردانہ کی بات کر رہی ہوں۔ وہ کئی بار ہمیں چیلنج کر چکی ہے اور آج اس نے اپنے چیلنج کے مطابق اتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ پتا نہیں میری عینی کو لے جا کر کہاں چھپا دیا ہے۔ ہم اس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ فی الحال تو کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہم اسے کوئی الزام بھی نہیں دے سکتے۔ بہر حال میں فون پر اس سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ وہ جواباً کیا کہتی ہے؟"

میں نے ٹیلیفون کے ذریعے دردانہ سے رابطہ کیا۔ وہ شہباز درانی کی آغوش میں پڑی ہوئی تھی۔ فون کا بزر سن کر اسے اٹھایا۔ اس کے نمبر پڑھے۔ اسے میرے نمبر یاد نہیں تھے۔ اس نے شہباز سے کہا "پتا نہیں کون کال کر رہا ہے؟"

شہباز نے نمبر پڑھے، پھر ناگواری سے کہا۔ "مقدر حیات تمہیں کال کر رہا ہے۔ اٹھو اور اسے اٹینڈ کرو۔ دیکھو وہ بدذات کیا کہنا چاہتا ہے؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنا لباس درست کرنے لگی پھر فون کے بٹن کو دبا کر کان سے لگایا۔ "ہیلو۔ میں بول رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا "عینی کہاں ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی "اوہو۔ صبح سے یہ وقت ہو گیا ہے اور اب بہن کا خیال آ رہا ہے؟"

میں نے کہا "میرے سوال کا جواب دو۔"

"تم نے تھانے وغیرہ میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ تو درج کرائی ہوگی؟"

میں نے پھر پوچھا "عینی کہاں ہے؟"

"وہ جہاں بھی ہے، زندہ ہے، سلامت ہے۔ اگر پولیس والوں کو میرے خلاف کوئی بیان دیا گیا تو پھر وہ سلامت نہیں رہے گی۔"

"تمہارے خلاف کوئی بیان نہیں دیا گیا ہے۔ عینی سے میری بات کراؤ۔"

"مقدر! تم تو علم نجوم میں حیرت انگیز مہارت رکھتے ہو۔ تم نے عینی کا ہاتھ بھی پڑھا ہوگا۔ کیا اس کے ہاتھ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کبھی گھر سے بے گھر ہو جائے گی اور میرے رحم و کرم پر رہے گی؟"

"میں نجومی ہوں، جادوگر نہیں۔ تمہارا یار شہباز درانی سمجھتا ہے کہ میں پراسرار علوم جانتا ہوں۔ اگر میں جانتا تو عینی کو اغوا ہونے نہ دیتا۔ تمہارے ہر منصوبے میں تمہیں ناکام بناتا رہتا۔"

وہ بولی "بے شک۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم پراسرار علوم نہیں جانتے۔ بہر حال، تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری بہن خیریت سے ہے اور اب سے دو گھنٹے بعد گھر پہنچ جائے گی۔"

میں نے دھمکی دینے کے انداز میں کہا "وہ خیریت سے گھر پہنچنا چاہیے ورنہ تم خیریت سے نہیں رہو گی۔ میں نے تمہارا ہاتھ دیکھا تھا، لکیریں پڑھی تھیں اور تمہیں بہت سی باتیں نہیں بتائی تھیں۔ میں نے تمہاری بہت سے کمزوریوں کو سمجھ لیا ہے۔ اگر یہ چاہتی ہو کہ تمہاری کسی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھاؤں تو میری بہن کو خیریت سے گھر پہنچ جانا چاہیے۔"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ وہ پریشان ہو کر ہیلو ہیلو کہنے لگی۔ مجھے پکارنے لگی پھر اس نے فون بند کر دیا۔ شہباز درانی نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

"اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔ کہتا ہے میرا ہاتھ پڑھنے کے بعد اسے میری بہت سی کمزوریاں معلوم ہو چکی ہیں۔ اگر عینی گھر نہ پہنچی تو وہ میری کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے گا۔ اور مجھے نقصان پہنچاتا رہے گا۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "پتا نہیں کس خبیث سے ہمارا پالا پڑا ہے؟ مجھے معلوم ہوتا تو میں کبھی اسے تمہارا ہاتھ نہ دیکھنے دیتا اور نہ ہی کبھی اپنا ہاتھ دکھاتا۔ ہم نے انجانے میں اپنی بہت سی کمزوریاں اسے بتا دی ہیں۔"

وہ بولی "اس میں شبہ نہیں کہ وہ ہمارے لیے مصیبت بن گیا ہے لیکن ہمیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ فی الحال تو ہم اپنے منصوبوں میں کامیاب ہو رہے ہیں۔"

"ایسی بات بھی نہیں ہے۔ یہ کیوں بھول رہی ہو کہ اس کی وجہ سے اسد عزیزی ہاسپٹل میں پڑا ہوا ہے؟ ایک طرح

سے میرا دایاں بازو کٹ چکا ہے۔ پتا نہیں وہ کب میرے کام کے قابل ہوگا؟"

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی "ہاں۔ مقدر کی طرف سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔"

"دوسرا نقصان بھی بھول رہی ہو۔ میں نے ایک بہت بڑے سیاست دان جان محمد گبول کے دستاویزات حاصل کئے تھے۔ وہ میرے پاس پہنچنے سے پہلے ہی کہیں راستے میں غائب ہو گئے۔ اب تک پتا نہیں چلا کہ وہ کیسے گم ہو گئے اور کس کے ہاتھ لگ گئے؟"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ شہباز درانی نے ریسیور اٹھایا اور بولا "ہیلو۔ میں بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے آواز آئی "باس! میں آپ کا خادم افضل بول رہا ہوں۔ اس وقت ہاسپٹل میں ہوں۔ عزیزی صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔ اچانک ان کے زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگی ہیں۔ ڈاکٹر بھی پریشان ہیں کہ اچانک عزیزی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔"

شہباز درانی نے کہا "وہاں کے بڑے ڈاکٹر کو فون دو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

وہ انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر کی آواز آئی "یس مسٹر درانی! میں ڈاکٹر فیروز بول رہا ہوں۔"

"فیروز صاحب! آپ جانتے ہیں اسد عزیزی میرا کتنا اہم آدمی ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ آپ اس پر توجہ کیوں نہیں دے رہے ہیں؟ اگر آپ کی بے پروائی سے اسے کچھ ہو گیا تو آپ کو بھی بہت کچھ ہوگا اور وہ آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔"

"مسٹر درانی! آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں چوبیس گھنٹے کسی بھی مریض کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے۔ میری عدم موجودگی میں ہوا ہے۔"

"میں یہی جاننا چاہتا ہوں، کیا ہوا ہے؟"

"ابھی لیبارٹری ٹیسٹ کے بعد پتا چلا ہے کہ اسے جو انجکشن دیا جا رہا ہے اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔ یعنی کسی نے انجکشن بدل دیا ہے۔"

"کیا آپ اندھے ہیں، اسے دوا انجکٹ کرنے سے پہلے اس کا لیبل نہیں پڑھتے؟"

"میں نے لیبل پڑھا ہے۔ انجکشن کی شیشی وہی ہے لیکن اندر کی دوا تبدیل کر دی گئی ہے اور میں نہیں جانتا یہ کس نے کیا ہے۔ میں یہاں کے پورے اسٹاف سے سختی سے باز پرس کر رہا ہوں لیکن سب ہی قسمیں کھا رہے ہیں کہ انہوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔"

"اگر اس ہاسپٹل کے کسی شخص نے ایسا نہیں کیا ہے تو پھر باہر کا کون آدمی ایسا کر سکتا ہے؟"

"آپ سمجھدار ہیں، خود سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کے کتنے ہی دشمن ہیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کسی نے ایسی کوئی حرکت کی ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ہاسپٹل کے اندر میرے اسٹاف میں سے کسی نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔ پلیز آپ خود معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہی ہوتا رہا تو اسد عزیزی کی جان کو خطرہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں ابھی کچھ کرتا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور غصے سے بڑبڑانے لگا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے دستِ راست پر اس طرح حملہ کیا جائے گا۔"

وہ دردانہ کی طرف دیکھ کر بولا "اسے جو انجکشن دیا جاتا تھا وہ اچانک تبدیل ہو گیا ہے۔ کسی نے بڑی رازداری سے انجکشن کی اسی شیشی میں دوا بدل دی ہے۔ اس کے منفی اثر سے اسد عزیزی ناقابلِ برداشت تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔"

دردانہ نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا مقدر ایسا کر رہا ہے؟"

وہ جھنجلا کر بولا "اور کون کرے گا؟ وہی ایک ایسا دشمن ہے جو میرے قابو میں نہیں آ رہا ہے۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کئے۔ دردانہ نے پوچھا۔ "کسے فون کر رہے ہو؟"

وہ بولا "واشنگٹن کے تمام اہم شعبوں میں میری پذیرائی ہوتی ہے۔ میں وہاں کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے بات کر رہا ہوں۔"

رابطہ ہو گیا۔ اس نے کہا "میں شہباز درانی بول رہا ہوں۔ اس وقت مجھے آپ کی بہت سخت ضرورت ہے۔"

"آپ حکم دیں۔"

"میرا ایک دستِ راست بری طرح زخمی ہو گیا ہے اور دشمن اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ اسے بڑی رازداری سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اسے فوری طور پر آپ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ آپ فوراً اسد عزیزی کے نام ایک اجازت نامہ یہاں کے سفارت خانے میں بھیج دیں۔ میں اسے یہاں سے روانہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہوں۔"

وہ اسد عزیزی کو امریکا بھیجنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ میں اس کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر سکتا تھا لیکن نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ جو کچھ وہ کر رہا تھا اس کا منفی ردِعمل ہونا تھا۔ ادھر

دردانہ پاشا کو مزید قیدی بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا بھی منفی ردِعمل ان دونوں کے سامنے آنے والا تھا۔ جہاں جہاں میں انہیں ڈھیل دے رہا تھا۔ وہاں وہاں آگے جا کر ان کی رسیاں بھی کھینچنے والا تھا۔ انسانی زندگی پتنگ کی طرح ہے۔ مقدر کبھی اسے ڈھیل دیتا ہے، کبھی اس کی ڈور کھینچ لیتا ہے۔

میں جان محمد گبول کی ہتھیلی پر آ گیا۔ اس کی لکیروں پر چلنے لگا۔ وہ ایک بہت ہی معروف سیاست دان تھا۔ ملک میں جب بھی انتخابات ہوتے تھے تو اسے الیکشن میں کھڑے ہونے کے لیے ٹکٹ ضرور ملتا تھا کیونکہ وہ اچھی خاصی کامیابی حاصل کر کے قومی اسمبلی میں پہنچتا تھا۔

شہباز درانی ایسے ہی کامیاب سیاست دانوں کو شکار کرتا رہتا تھا۔ وہ مختلف ہتھکنڈوں سے انہیں اپنے زیر اثر لاتا تھا اور ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں بلیک میل کرتا تھا۔ اپنے مقاصد کے لیے انہیں اپنے اشاروں پر چلاتا رہتا تھا۔

اس بار شہباز درانی تین بڑے سیاست دانوں کو اپنے زیر اثر لانے میں ناکام ہو رہا تھا۔ جن میں ایک جان محمد گبول تھا۔ اس کی کمزوریوں سے کھیلنے کے لیے شہباز درانی کے آدمیوں نے اس کے اہم دستاویزات چرائے تھے جو اب میری تحویل میں تھے۔

جان محمد گبول بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی ذاتی اور سیاسی مجرمانہ حرکتیں منظر عام پر آئیں۔ اس نے چوری کی رپورٹ درج کرائی تھی اور اپنے ذرائع بھی استعمال کر رہا تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کس نے اس کی داشتہ کے ذریعے اتنی بڑی واردات کرائی ہے؟

شہباز درانی کی ایک آلہ کار پچھلے ایک برس سے جان محمد گبول کے پاس داشتہ کی حیثیت سے رہتی آئی تھی۔ اس نے موقع پا کر اس کی تجوری پر ہاتھ صاف کیا تھا اور دستاویزات کے ساتھ ساتھ دو کروڑ کے ہیرے چرا کر لے گئی تھی۔

جان محمد گبول کو یقین تھا کہ وہ داشتہ کہیں نہ کہیں پکڑی جائے گی۔ اسے ہر صوبے، ہر شہر اور ہر علاقے میں تلاش کیا جا رہا تھا لیکن وہ تو جیسے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو گئی تھی۔

جان محمد سے قریبی تعلقات رکھنے والے پولیس افسران کہہ رہے تھے کہ اس عورت کو مار کر اس کی لاش کہیں چھپا دی گئی ہے۔ اسی لیے وہ نظر نہیں آ رہی ہے۔

جان محمد ہیرے جواہرات کا شوقین تھا۔ ہیروں کی چوری سے اسے دکھ پہنچا تھا لیکن اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ اس کے دستاویزات چرائے گئے تھے اور یہ ابھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اہم کاغذات کس دشمن کے ہاتھوں میں پہنچے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی وقت بچھو بابا نے اسے فون پر مخاطب کیا۔

''ہیلو مسٹر گبول! میں ایک خدائی خدمت گار ہوں۔ لوگوں کی مشکلیں آسان کرتا ہوں۔ کیا تم میری خدمات حاصل کرنا چاہو گے؟''

اس نے پوچھا ''کون ہو تم؟ اپنا تعارف کراؤ؟''

''تم آم کھانے کی بات کرو۔ یہ نہ پوچھو کہ آم کس درخت سے آ رہے ہیں۔ کیا تم اپنے اہم دستاویزات اور ہیروں کی واپسی نہیں چاہو گے؟''

وہ ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا ''ہاں ہاں ضرور۔ کیا تم ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''بتا بھی سکتا ہوں اور تمہارے چوری شدہ مال تک تمہیں پہنچا بھی سکتا ہوں۔''

''ذرا ایک منٹ، میں ابھی تم سے بات کرتا ہوں۔'' تھوڑی دیر تک فون پر خاموشی رہی پھر اس نے کہا ''مسٹر! تم میری مدد کرو۔ میرا مال مجھے واپس مل جائے گا تو میں منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔''

بچھو بابا نے کہا ''میں نے تم پر مہربانی کرنے کے لیے فون کیا۔ تم نے پولیس سے اس کال کو ٹریس کرنے کا کہہ دیا۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے ہمدردی کی جائے۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ جان محمد گبول پریشان ہو کر فون پر چیخنے لگا ''ہیلو مسٹر ہیلو! فون بند نہ کرنا مجھ سے بات کرو۔ دیکھو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے۔ ہیلو ہیلو.....''

اس نے جھنجلا کر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا اور خود کو کوسنے لگا ''میں نے فون کال کے دوران خاموشی کیوں اختیار کی؟ وہ فون کرنے والا کوئی بھی ہو بہت ہی چالاک ہے اور یقیناً وہ جانتا ہوگا کہ میرے چرائے ہوئے ہیرے اور دستاویزات کہاں ہیں؟''

دس منٹ بعد ایک پولیس افسر نے آ کر اسے سلام کیا پھر کہا ''گبول صاحب! وہ شخص کسی پی سی او سے بات کر رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ وہ پی سی او کس علاقے میں ہے؟''

وہ مایوس ہو کر بولا ''معلوم کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ بہت چالاک ہے۔ وہاں سے جا چکا ہوگا۔''

پولیس افسر نے پوچھا ''وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

''وہ جانتا ہے کہ میری دستاویزات اور وہ تمام ہیرے کہاں ہیں؟''

''پھر تو وہ ضرور دوبارہ فون کرے گا کیونکہ اسے اتنی اہم

معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں آپ سے اچھی خاصی رقم کی توقع ہوگی۔''

''وہ جتنی بھی رقم طلب کرے گا میں دوں گا لیکن گڑبڑ ہو گئی ہے۔ پتا نہیں وہ دوبارہ فون کرے گا یا نہیں؟''

وہ افسر سے باتیں کرتا رہا اور بار بار ٹیلیفون کی طرف دیکھتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد گھنٹی بجی تو وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لپک کر ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ میں۔ میں جان محمد گبول بول رہا ہوں۔''

بچھو بابا نے کہا ''سی ایل آئی میں نمبر دیکھو۔ اب میں موبائل فون کے ذریعے بول رہا ہوں۔ پی سی او سے رابطہ ختم کرنے کے فوراً بعد تم سے بات کر سکتا تھا لیکن میں نے آدھے گھنٹے تک تمہیں انتظار کے کرب میں مبتلا رکھا۔ کیا تمہاری سمجھ میں آ گیا کہ مجھ سے چالاکی نہیں کی جا سکتی؟''

''ہاں میں سمجھ گیا ہوں کہ تم بہت چالاک ہو۔ مجھے چور اور چوری کے مال تک پہنچاؤ۔ میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔''

''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ میں تم سے کوئی رقم طلب نہیں کروں گا۔''

وہ حیرانی سے بولا ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، خدائی خدمت گار ہوں۔ نیکی کرتا ہوں دریا میں ڈال دیتا ہوں اور جو میری نیکی کی قدر نہیں کرتا اسے بھی دریا میں ڈال دیا کرتا ہوں۔''

''میں تمام عمر تمہارا مشکور رہوں گا۔''

''میرے ایک سوال کا جواب دو۔ چور تو ہیرے جواہرات اور نقدی چرا کر لے جاتے ہیں۔ کاغذات کبھی نہیں لے جاتے۔ تمہارے دستاویزات جس نے بھی چرائے ہیں وہ کون ہو سکتا ہے؟ تم نے کچھ اندازہ تو لگایا ہوگا؟''

وہ بولا ''جس نے بھی ایسا کیا ہے اس کا تعلق سیاست سے ہوگا اور میں سمجھتا ہوں میری مخالف سیاسی پارٹی کے لوگوں نے ایسا کیا ہے۔''

''مسٹر گبول! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے آس پاس کوئی چھپا ہوا ہے۔ اس لیے تم اصل بات بولنے سے کترا رہے ہو۔ میں تم سے سوال کر رہا ہوں۔ تم صرف ہاں یا نہ میں جواب دو۔ کیا کسی پولیٹیکل ایجنٹ نے تمہیں خریدنے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

جان محمد گبول نے پولیس افسر سے کہا ''آپ مائنڈ نہ کریں۔ ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھیں۔ میں ابھی آپ کے پاس آتا ہوں۔''

پولیس افسر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے فون پر کہا ''ہاں۔ ایک بہت ہی شاطر پولیٹیکل ایجنٹ ہے۔ وہ مجھے خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ میرا انکار مجھے مہنگا پڑے گا اور اب میں دیکھ رہا ہوں کہ واقعی مہنگا پڑنے والا ہے۔''

''تم اس شاطر پولیٹیکل ایجنٹ کا نام نہیں بتا رہے۔ میں بتا دیتا ہوں۔ اس کا نام شہباز درانی ہے۔''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں، بالکل یہی نام ہے۔ تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔ آخر تم ہو کون؟''

''خبردار! میرے بارے میں آئندہ کوئی سوال نہ پوچھنا ورنہ میں فون بند کر دوں گا۔''

وہ گھبرا کر بولا ''نہیں نہیں فون بند مت کرنا۔ وہ دستاویزات میری جان ہیں۔ میں انہیں واپس حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ شہباز درانی کے پاس ہیں؟''

''وہ دستاویزات کہیں بھی ہوں۔ فی الحال تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے پہلے تم ہیروں کے بارے میں بات کرو۔''

''میں ان ہیروں کی واپسی بھی چاہتا ہوں۔ تم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟ پلیز، جلدی بتاؤ۔''

''ایسی جلدی بھی کیا ہے؟''

اس نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ بچھو بابا نے کہا ''یہ تو تم جانتے ہو کہ شہباز درانی کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ اسے یہاں کا قانون اپنی گرفت میں نہیں لے سکے گا۔ تم اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکو گے۔''

''ہاں، مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔''

''اس کی ایک داشتہ ہے جس کا وہ دیوانہ ہے۔ اس داشتہ کا نام دردانہ ہے اور وہ ہیرے اسی کے پاس ہیں۔''

وہ پریشان ہو کر بولا ''میں کسی ثبوت کے بغیر اس پر کیسے الزام لگاؤں؟''

''پہلے یہ بتاؤ اگر وہ ہیرے اس کے پاس سے برآمد ہو جائیں تو تم کیسے ثابت کرو گے کہ وہی تمہارے چوری شدہ ہیرے ہیں؟''

''میرے پاس ان کی خاصیت، ان کے مخصوص نام اور ان کی مالیت ریکارڈ ہے۔''

''میں ابھی بتاتا ہوں کہ وہ ہیرے کہاں ہیں۔ پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے اعتماد کے پولیس افسران بڑی رازداری سے اس جگہ چھاپا ماریں گے۔ اگر رازداری نہ برتی گئی اور دردانہ اور شہباز کو اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ

اپنے بچاؤ کے دس راستے نکال لیں گے۔"

"میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم اطمینان رکھو بڑی رازداری سے کام کیا جائے گا۔"

"دردانہ کے بینک اکاؤنٹ نمبر اور لاکر کے نمبر نوٹ کرو۔"

جان محمد نے فوراً ہی کاغذ قلم لے کر نمبر نوٹ کیے۔ پھوبابا نے کہا "کل صبح کورٹ کھلتے ہی اس کا لاکر کھلوانے کا اجازت نامہ حاصل کرو۔ اس لاکر سے جب ہیرے برآمد ہو جائیں تب پولیس والے دردانہ کو اس بینک میں طلب کر کے بازپرس کریں۔"

"ایسا ہوگا۔ پھر تو اس شہباز درانی کی داشتہ کو چوری کے الزام میں ضرور گرفتار کیا جائے گا۔"

"صرف چوری کے الزام میں نہیں، قتل کے الزام میں بھی گرفتار کیا جانا چاہیے۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا "قتل؟ کس کا قتل؟"

"تم بھول رہے ہو کہ تمہاری وہ داشتہ جو یہ سب کچھ چرا کر لے گئی تھی کہیں گم ہو چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے قتل کر کے اس کی لاش چھپا دی گئی ہے۔ میں اس جگہ کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولا "اجنبی! تم کون ہو؟ تم تو میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن گئے ہو۔ اس طرح تو میں دردانہ کے ذریعے شہباز درانی پر بھی کسی حد تک حاوی ہو سکوں گا۔"

"وہ بہت بڑا پہاڑ ہے۔ اس سے ٹکرا نہیں سکو گے۔ تم سے جتنا کہا جا رہا ہے اتنا ہی کرو۔"

وہ بولا "اس کا مطلب ہے میری دستاویزات اس کم بخت درانی کے پاس ہوں گی۔"

"نہیں۔ اگر اس کے پاس ہوتیں تو وہ پہلی فرصت میں تمہیں بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے کہا نا دستاویزات کی طرف سے بے فکر رہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی میرے وہ اہم کاغذات کہاں ہیں؟"

"تمہیں بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ جو کہا جا رہا ہے وہ کرتے رہو۔"

"ٹھیک ہے، جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ اس جگہ کی نشاندہی بھی کرو جہاں اس داشتہ کو قتل کر کے لاش چھپائی گئی ہے۔"

"جب بینک کے لاکر سے ہیرے برآمد ہو جائیں گے۔ تب میں فون پر تمہیں بتاؤں گا۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے۔ دیٹس آل۔"

اس نے فون بند کیا پھر مجھ سے رابطہ کر کے تفصیلات بتانے لگا۔ میں نے اس کی باتیں سنیں پھر فون بند کر دیا۔ میں جان محمد گبول کی لکیروں پر بھی تھا۔ پھوبابا مجھے کچھ نہ بتاتا تب بھی مجھے سب کچھ معلوم ہوتا رہا تھا۔

☆☆☆

باقر مہدی نے فون پر دردانہ سے کہا "میڈم! ہم نے ذیشان کو تو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔ آپ گل خانم اور یادر خان کو اپنی حمایت پر آمادہ کریں تو ذیشان کے خلاف کیس اور مضبوط ہو جائے گا۔"

وہ بولی "میں تو خود یہ چاہتی ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا گل خانم اور یادر خان ذیشان کے خلاف میری حمایت کریں گے؟"

"یادر خان کے متعلق تو میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ آپ کے قدموں میں آ کر بیٹھ جائے گا۔ گل خانم کا معاملہ ذرا سا پیچیدہ ہے کیونکہ وہ ذیشان سے محبت کرتی ہے۔ اس کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ دیوانوں کو سمجھایا نہیں جا سکتا پھر بھی اس سے ملاقات کر لیں تو بہتر ہوگا۔"

"کیا آج رات آٹھ بجے اس سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"ضرور ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے اور یادر خان کو اسی کی کوٹھی میں نظر بند کر رکھا ہے۔ انہیں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیا آپ اس کی کوٹھی میں آنا پسند کریں گی؟"

"ٹھیک ہے۔ رات آٹھ بجے اپنے کسی ماتحت کو میرے پاس بھیج دو۔ میں اس کے ساتھ آ جاؤں گی۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ شہباز درانی نے کہا "تمہارا باہر جانا مناسب نہیں ہے۔ تم پہلو ماسٹر کی پیش گوئی کو بھول رہی ہو۔"

"مجھے یاد ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس ہفتہ مجھ پر کوئی بہت بڑی مصیبت آ سکتی ہے۔ خواہ میں پاتال میں رہوں یا سمندر کی تہ میں چھپ جاؤں۔ مصیبت کو آنا ہے تو وہ آ کر رہے گی۔"

"پھر بھی محتاط رہنا چاہیے۔ تم کہو تو میں باقر مہدی سے کہتا ہوں۔ وہ گل خانم اور یادر خان کو یہاں لے آئے گا۔"

"ہاں پھر بھی میرا باہر جانا ضروری ہے۔ چھ بج چکے ہیں میں ابھی عینی کو اس کی کوٹھی تک لے جا رہی ہوں۔ وہاں اسے چھوڑ کر واپس آؤں گی۔ یہاں پاشا اس کے بغیر تلملائے گا۔ تم اسے سنبھالنا۔"

عینی چھ بجے اپنے گھر واپس جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ پاشا نے کہا "میں لباس بدل کر آتا ہوں۔ آج مدتوں بعد تمہارے ساتھ کھلی فضا میں نکلوں گا۔"

وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا تھا۔ دردانہ نے دس منٹ کے بعد آ کر عینی سے کہا "اٹھو، اب ہم چل رہے ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر بولی "پاشا کہاں ہے؟"

"وہ آ رہا ہے۔ تم میرے ساتھ چل کر گاڑی میں بیٹھو۔"

دردانہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ باہر ایک کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس گاڑی کے آگے پیچھے دو اور گاڑیاں بھی تھیں جن میں مسلح افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ جب وہ گاڑیاں وہاں سے چلنے لگیں تو عینی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "پاشا کہاں ہے؟"

دردانہ نے کہا "وہ بعد میں آ جائے گا۔ پہلے تم اپنے گھر پہنچو۔"

"آپ نے تو کہا تھا میں اس کے ساتھ اپنے گھر جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، میں نے کہا تھا۔ اب میں اپنی بات بدل رہی ہوں۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔ زیادہ بولیں یا شور مچایا تو میں گاڑی واپس لے جاؤں گی اور تمہیں بھی پاشا کی طرح قیدی بنا کر رکھوں گی پھر تم کبھی اپنے گھر والوں سے نہیں مل سکو گی۔"

یہ بات سن کر فوراً ہی عروج کا چہرہ اس کی اندھی آنکھوں کے سامنے ابھر آیا۔ وہ اس کے لیے تڑپ رہی تھی۔ بے چین ہو رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی "عینی تم کہاں ہو؟"

وہ عجیب دوراہے پر تھی۔ آگے عروج پکار رہی تھی، پیچھے پاشا کا ہاتھ چھوٹ رہا تھا۔ وہ ضد نہیں کر سکتی تھی۔ دردانہ سے اپنی بات نہیں منوا سکتی تھی۔ وہ ظالم عورت اسے بھی قیدی بنا لیتی۔ دانشمندی یہی تھی کہ اسے گھر پہنچایا جا رہا ہے تو پہلے گھر ہی پہنچ جائے۔

ادھر پاشا لباس تبدیل کر کے عینی کے کمرے میں آیا تو وہ کمرا خالی تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے باہر جانے لگا۔ شہباز نے اسے آواز دی "پاشا! یہاں آؤ۔"

اس نے شہباز کے پاس آ کر کہا "ڈیڈ! عینی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے ممی کے ساتھ باہر گئی ہے۔ میں بھی عینی کے ساتھ اس کے گھر جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔ تم نہیں جاؤ گے۔"

وہ حیرانی سے بولا "آپ مجھے کیوں روک رہے ہیں؟ ممی نے وعدہ کیا تھا میں شام چھ بجے عینی کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گا۔"

"ہاں۔ وعدہ کیا تھا لیکن اب ہمارا منصوبہ بدل گیا ہے۔ تمہیں فی الحال اس کے گھر نہیں جانا چاہیے۔"

"ڈیڈ یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ وہ میری بیوی ہے۔ مجھے اتنی آزادی تو ہونی چاہیے کہ میں اس کے گھر جا سکوں اور وہ یہاں میرے پاس آ سکے۔"

"بیٹے! تمہاری ممی عینی کے خاندان والوں کے ساتھ جو گیم کھیل رہی ہیں اسے تم نہیں سمجھ سکو گے۔ ابھی صبر کرو۔ جو ہم کہتے ہیں اس پر عمل کرو۔ تمہیں رفتہ رفتہ سب کچھ معلوم ہوتا رہے گا۔"

"نہیں ڈیڈ! پلیز، مجھے جانے دیں۔"

"جبراً جانا چاہو گے تو نہیں جا سکو گے۔ میرے گارڈز تمہیں باہر نہیں جانے دیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر بولا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ مجھے قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں؟"

"نافرمانی کی صورت میں یہی کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں عینی کے پاس ضرور جانے دیا جائے گا لیکن ذرا صبر کرو۔"

وہ سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ جانتا تھا کہ کوٹھی کے اندر اور باہر مسلح گارڈز کی فوج ہے اور وہ سب شہباز درانی کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ اسے باہر نہیں جانے دیں گے۔

اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ بیٹا بیٹا کہنے والے اسے قیدی بنا کر رکھتے ہیں۔ وہ سر جھکا کر گہری سنجیدگی سے اپنے موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔

گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ دردانہ نے باہر آ کر عینی سے کہا "آؤ، باہر نکلو۔ تمہارا گھر آ گیا ہے۔"

وہ گاڑی کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹولتی ہوئی باہر آئی۔ دردانہ نے کہا "اپنے دونوں ہاتھ بڑھاؤ۔"

اس نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ دردانہ نے ایک بڑا سا پیکٹ اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا "یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔ یہ تحفہ اپنے گھر والوں کو ضرور دکھانا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "میرے گھر والے شادی کے سلسلے میں پوچھیں گے، انہیں یقین نہیں ہوگا کہ میرا نکاح پڑھایا گیا ہے کیونکہ میں دولہا کے بغیر گھر واپس جا رہی ہوں۔"

"گھر والوں کو یقین ہو جائے گا۔ تم جاؤ۔ وقت ضائع نہ کرو۔"

وہ پریشان ہو کر بولی ''میں کہاں جاؤں؟ مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے؟ آپ مجھے کہاں چھوڑ کر جا رہی ہیں؟''

''ٹھیک تمہارے سامنے چند قدم کے فاصلے پر تمہاری کوٹھی کا مین گیٹ ہے۔ تمہارے مسلح گارڈز تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تمہاری طرف آ رہا ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔''

وہ اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ تینوں گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ ایک گارڈ نے قریب آ کر کہا ''بی بی جی! وہ تو دردانہ بیگم تھیں جو آپ کو یہاں چھوڑ کر گئی ہیں۔''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مجھے کوٹھی کے اندر لے چلو۔''

گارڈ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس کے ساتھ جانے لگی۔ ادھر دردانہ نے فون کے ذریعے اس کے گھر والوں کو اطلاع دی۔ فلک آفتاب نے فون اٹینڈ کیا۔ دردانہ نے کہا ''آپ کی بھتیجی گھر واپس آ گئی ہے۔ کوٹھی کے دروازے پر ہے۔ اس کا استقبال کریں۔''

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ ادھر فلک آفتاب نے کہا ''ہیلو دردانہ! ہیلو کیا تم عینی کے بارے میں کہہ رہی ہو؟ کیا وہ واپس آ گئی ہے؟''

اسے جواب نہیں ملا۔ بیگم آفتاب، فلک ناز اور عروج نے یہ سنا تو ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئیں۔ عروج تڑپتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔ اسی وقت وہ گارڈ کے ساتھ اندر آ گئی۔ عروج نے اسے دیکھتے ہی چیخ کر کہا ''عینی میری جان!''

وہ دوڑتی ہوئی، روتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ عینی بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ تمام گھر والے قریب آ گئے۔ کوئی عینی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کوئی اس کے شانے کو تھپک کر تسلیاں دینے لگا۔ فلک ناز نے کہا ''بیٹی! چپ ہو جاؤ۔ خدا کا شکر ہے کہ تم گھر واپس آ گئی ہو۔''

اسما بھی زینے سے اترتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے تیزی سے آ کر عینی کو عروج سے الگ کیا پھر اس سے لپٹ کر روتی ہوئی اسے تھپکنے لگی ''ہائے میری جان! تم کہاں گم ہو گئی تھیں؟ ہمارے اندر تو جان ہی نہیں رہی تھی۔ بس تمہاری واپسی کی امید میں جی رہے تھے۔''

بیگم آفتاب نے کہا ''پہلے اسے آرام سے بٹھاؤ تو سہی۔ سب ہی اس سے لپٹی جا رہی ہیں۔ اس بے چاری کو کھڑا کر رکھا ہے۔ آؤ بیٹی میرے ساتھ آؤ۔''

اس نے ایک طرف سے عینی کو پکڑا۔ دوسری طرف سے اسما نے اسے پکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے صوفے کی طرف لے جا رہی تھیں۔ عینی نے رکتے ہوئے کہا ''عروج! تم کہاں ہو؟''

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی ''میں تمہارے پیچھے ہوں۔''

''میں اپنے کمرے میں جانا چاہتی ہوں۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

فلک ناز نے کہا ''عینی! ابھی کمرے میں جا کر بند نہ ہو جانا۔ ہماری پریشانیوں کا خیال کرو۔ صبح سے یہ وقت آ گیا ہے۔ ہم نے ایک دانہ منہ میں نہیں رکھا ہے۔ بھوکے پیاسے تمہارا انتظار کرتے رہے ہیں۔ یہاں بیٹھو۔ ہمیں بتاؤ۔ دردانہ تمہیں کہاں لے گئی تھی؟ اس نے کہاں تمہیں چھپایا تھا؟ وہ تم سے کیا کہہ رہی تھی؟''

عروج نے سامنے آ کر اس کا ہاتھ تھام کر کہا ''عینی! تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے سب ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ ان سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم کہاں تھیں اور تمہارے ساتھ کیا ہوا؟''

وہ اسما اور عروج کے درمیان ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ فلک ناز نے پوچھا ''یہ تمہارے ہاتھوں میں پیکٹ کیسا ہے؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولی ''وہ۔ وہ مجھے۔ ممی نے شادی کا تحفہ دیا ہے۔''

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اسما نے پوچھا ''شادی کا تحفہ؟''

بیگم آفتاب نے پوچھا ''کس کی شادی؟ کیا وہ تمہیں کسی شادی کی تقریب میں لے گئی تھی؟''

عینی نے انکار میں سر ہلایا۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔ ایک دم سے پلٹ کر عروج سے لپٹ گئی پھر روتے ہوئے بولی۔ ''میری شادی ہو چکی ہے۔''

سب ہی کے دماغوں میں جیسے دھماکا سا ہوا۔ کسی کو یقین نہیں ہوا کہ جو انہوں نے ابھی سنا ہے، عینی نے وہی کہا ہے۔ عروج نے ایک دم سے پریشان ہو کر پوچھا ''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ کیا واقعی تیری شادی ہو گئی ہے؟ تو سچ کہہ رہی ہے؟''

عینی اس سے لپٹی ہوئی روتی رہی۔ اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ اسما نے کہا ''اس کے آنسو بتا رہے ہیں کہ اس مکار عورت نے زبردستی اس کی شادی کرائی ہے۔ عینی ہمیں بتاؤ، کس سے تمہاری شادی کرائی گئی ہے؟''

وہ رو رہی تھی۔ عروج اسے تھپک رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تیرے ساتھ زبردستی کی گئی ہے؟''

عینی نے انکار میں سر ہلایا۔ فلک آفتاب نے کہا ''شادی کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کا نکاح پڑھایا گیا ہے۔''

اسما نے پوچھا ''کیا باقاعدہ نکاح پڑھایا گیا ہے؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ عروج نے پھر وہی سوال کیا ''کیا زبردستی نکاح پڑھایا گیا ہے؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ عروج نے پوچھا ''انکار میں سر ہلانے کا مطلب کیا ہوا؟ کیا تو نے اپنی مرضی سے نکاح قبول کیا ہے؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ سب ہی اسے شدید حیرانی سے دیکھنے لگے۔ عروج نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے اس کے دونوں شانوں کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا ''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ تو نے کس سے نکاح قبول کیا ہے؟ کون ہے وہ؟''

اس نے پھر اس سے لپٹ کر اپنا منہ چھپاتے ہوئے کہا۔ ''پاشا.....''

عروج یہ سنتے ہی دنگ رہ گئی۔ دوسرا بیٹھنے والوں کو اچھی طرح سنائی نہیں دیا۔ بیگم آفتاب نے پوچھا ''یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

اسما نے کہا ''اس کا نکاح پاشا سے پڑھایا گیا ہے۔''

''کیا؟''

فلک ناز نے کہا ''یہ دردانہ کیا تماشے کرتی پھر رہی ہے؟ اس کا نکاح پاشا سے پڑھوایا اور اتنی بڑی خوشی میں ہمیں شریک نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہم سے چھپ کر ایسا کیوں کیا ہے؟''

بیگم آفتاب نے کہا ''ہم تو پہلے ہی عینی کی شادی پاشا سے کرنے والے تھے۔ اگر وہ ہمیں شریک کر لیتی تو ہم کبھی اعتراض نہ کرتے۔ چلو اس نے اچھا ہی کیا ہے۔ عینی جو چاہتی تھی، وہی کیا ہے۔''

اسما نے کہا ''اچھا ہی کیا ہے تو پھر اچھا ہی کرتی۔ اسے اغوا نہ کراتی۔ رازداری سے اس کا نکاح نہ پڑھواتی۔''

بیگم آفتاب نے دونوں کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا ''تم تو کبھی کسی کی تعریف نہیں کرو گی۔ دردانہ جیسی بھی ہے اس نے عینی کے حق میں اچھا کیا ہے۔ اس سے کوئی دشمنی نہیں کی ہے۔ کم از کم دردانہ کے اس جذبے کی قدر تو کرو کہ عینی کا کھویا ہوا پاشا اسے مل گیا ہے۔''

عروج نے جل کر پوچھا ''لیکن وہ پاشا ہے کہاں؟''

پھر وہ عینی سے بولی ''تو چپ کیوں ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟ پاشا کہاں ہے؟''

وہ بولی ''میں کیا بتاؤں۔ وہ تو میرے ساتھ آنے والے تھے۔ لباس تبدیل کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں گئے۔ ممی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی میں بٹھا دیا۔ جب گاڑی چلنے لگی تو میں نے پوچھا پاشا کہاں ہے؟ انہوں نے کہا، وہ بعد میں آ جائے گا۔ ابھی مجھے گھر پہنچایا جا رہا ہے۔ میں نے ضد کی کہ میں اسی کے ساتھ گھر جانا چاہتی ہوں۔ تب انہوں نے سختی سے کہا۔ اگر میں نے ضد کی یا شور مچایا تو وہ مجھے واپس لے جائیں گی اور پھر قیدی بنا کر رکھیں گی۔''

فلک ناز نے کہا ''تعجب ہے۔ جب اس نے نکاح پڑھوا دیا تو پھر پاشا کو یہاں عینی کے ساتھ کیوں نہیں لائی؟ نکاح کے بعد دونوں کو الگ کیوں کر دیا؟''

اسما نے کہا ''وہ مکار عورت کوئی بہت ہی پیچیدہ کھیل کھیل رہی ہے۔ ہمیں اس سے پوچھنا چاہیے کہ آخر وہ عینی کے ساتھ ایسی حرکتیں کیوں کرتی رہی ہے۔''

عروج نے اپنے موبائل پر دردانہ کے نمبر پنچ کیے پھر اس کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ تھوڑی دیر بعد دردانہ کی آواز سنائی دی ''ہیلو! میں دردانہ بول رہی ہوں۔''

''میں عروج ہوں ہم یہاں عینی کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ رہی ہے، پاشا کے ساتھ اس کا نکاح پڑھایا گیا ہے، کیا یہ درست ہے؟''

وہ بولی۔ ''غلط ہے۔ پاشا کے ساتھ اس کا نکاح نہیں پڑھایا گیا ہے۔ وہ اپنے یار کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہے۔''

عروج نے غصہ سے پوچھا ''یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔''

دردانہ نے کہا ''تمہاری سہیلی اپنے ساتھ ایک پیکٹ لے کر آئی ہے۔ اس پیکٹ کو صرف عورتوں کے سامنے کھولو اور اسے دیکھو پھر مجھ سے بات کرو۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ عروج نے اپنا فون بند کرتے ہوئے عینی کے پاس رکھے ہوئے پیکٹ کو دیکھا پھر اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

''دردانہ نے کہا ہے اسے صرف عورتوں کے سامنے کھولا جائے۔''

سب نے حیرانی اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ فلک ناز نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا ''میرے کمرے میں چل کر اس پیکٹ کو کھولو۔ ہم عورتیں اسے دیکھیں گی۔''

اسما نے وہ پیکٹ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ عروج نے عینی کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ سب وہاں سے چلتی ہوئی فلک ناز کے بیڈروم میں آئیں۔ انہوں نے دروازے کو اندر سے بند کیا پھر

اس پیکٹ کو کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک ویڈیو کیسٹ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پرچی لگی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا تھا ''اسے صرف عورتیں دیکھیں تو عینی کا بھلا ہوگا۔''

وہ پرچی اور وہ ویڈیو کیسٹ سب ہی کے تجسس کو بھڑکا رہا تھا۔ سب ہی یہ تو سمجھ گئے تھے کہ اب تو... اس کیسٹ میں ضرور کوئی پردے والی بات ہے۔

فلک ناز اس کیسٹ کو وی' سی' آر میں سٹ کر کے ٹی' وی آن کرنے لگی۔ عینی پوچھ رہی تھی ''کیا ہوا؟ پیکٹ میں کیا ہے؟''

عروج نے کہا ''ایک ویڈیو کیسٹ ہے۔ ہم ابھی دیکھ کر تمہیں بتاتے ہیں۔''

ٹی' وی اسکرین آن ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد اس اسکرین پر پاشا اور عینی دکھائی دیئے۔ وہ دونوں ایک بیڈ پر تھے۔ پاشا اسے آغوش میں لے کر پیار کر رہا تھا پھر جب وہ اس کا لباس اتارنے لگا تو ان سے برداشت نہ ہوسکا۔ عروج نے چیخ کر کہا۔ ''بند کرو اسے۔''

فلک ناز نے وی' سی' آر بند کردیا۔ عروج دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ عینی نے ٹٹولتے ہوئے اسے چھو کر پوچھا ''کیا ہوا؟ تم کیوں رو رہی ہو؟''

اسما کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ بیگم آفتاب اور فلک ناز پریشان ہو کر ایک دوسرے کو تک رہی تھیں۔ عروج نے عینی سے لپٹ کر کہا ''وہ ذلیل عورت بہت ہی بے شرم اور بے حیا ہے۔ پاشا کے ساتھ تمہاری ایسی ویڈیو فلم تیار کی ہے جسے دیکھتے ہی شرم سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ تو مجھے جواب دے۔ تو نے پاشا کے ساتھ ایسا وقت کیوں گزارا؟''

وہ حیران پریشان ہو کر تاریکی میں تکنے لگی۔ اس اندھی نے ویڈیو فلم نہیں دیکھی تھی۔ لیکن بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ میرا ان سے نکاح ہو چکا ہے۔ وہ میرے شوہر ہیں۔''

''اس بازاری عورت نے بڑی ذلالت کا ثبوت دیا ہے۔''

''کیا اس ویڈیو فلم میں ہمارا نکاح پڑھاتے ہوئے نہیں دکھایا گیا ہے؟''

''کچھ نہیں دکھایا گیا ہے۔ صرف ایسے مناظر ہیں جو تجھے بے حیا اور بدچلن ثابت کرتے ہیں۔''

اس نے فون کے ذریعے پھر دردانہ سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے آواز آئی ''معلوم ہوتا ہے' ویڈیو فلم دیکھی جا چکی ہے۔''

عروج نے چیخ کر کہا ''لعنت ہے تم پر' تمہیں ایسی فلم اتارتے ہوئے شرم نہیں آئی؟''

دردانہ نے پوچھا ''کیا عینی کو بے حیائی کرتے ہوئے اور اپنے یار کے ساتھ ایسا شرم ناک کھیل کھیلتے ہوئے شرم نہیں آئی؟''

''بکواس مت کرو۔ تم نے عینی کے اندھے پن سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر تم میں ذرا سی بھی انسانیت اور شرافت ہے تو عینی اور پاشا کا نکاح نامہ ہمیں دے دو۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا ''نکاح نامہ؟ کیسا نکاح نامہ؟ اگر وہ اندھی لڑکی یہ کہہ رہی ہے کہ پاشا کے ساتھ اس کا نکاح پڑھایا گیا ہے تو یہ سراسر غلط ہے۔''

اسما نے پوچھا ''عروج وہ کیا کہہ رہی ہے؟''

عروج نے کہا ''یہ تو صاف انکار کر رہی ہے کہ پاشا کے ساتھ عینی کا نکاح نہیں پڑھایا گیا ہے۔''

اسما نے اس سے فون چھین کر اپنے کان سے لگاتے ہوئے کہا ''دردانہ بیگم! تم کیوں خوامخواہ ایسی گھٹیا حرکتیں کر رہی ہو؟ تمہیں عینی کو بدنام کر کے کیا ملے گا؟''

دردانہ نے چہکتے ہوئے کہا ''آہا! بیگم ذیشان بول رہی ہیں۔ کہاں ہے تمہارا وہ ایس' پی' شوہر؟ بہت غیرت مند بنتا تھا۔ میرے مقتول بیٹے پر الزام لگاتا رہا کہ وہ عینی کو اغوا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ اس غیرت مند بھائی نے میرے بیٹے کو قتل کرا دیا۔ اب میں دیکھوں گی کہ وہ غیرت کے جوش میں آکر اپنی بے حیا بہن کو قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟ اگر مجھے الزام دیا جائے گا کہ میں نے اسے بے حیا بنایا ہے تو آئے اور مجھے الزام دے اور میرا جو بگاڑ سکتا ہے بگاڑ لے۔''

وہ قہقہے لگانے لگی۔ اسما نے کہا ''چڑیل کی بچی ابھی تو تم قہقہے لگا رہی ہو مگر جلد تمہاری زندگی پوری ہونے والی ہے۔ جس دن میرا ذیشان جیل سے باہر آئے گا' وہ دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

وہ قہقہے لگا رہی تھی۔ کچھ نہیں سن رہی تھی پھر اس نے فون کو بند کر دیا۔ اسما بھی اپنا فون بند کر کے اسے برا بھلا کہنے لگی۔ عینی اور عروج ایک دوسرے سے لپٹ کر رو رہی تھیں۔ عروج کہہ رہی تھی ''بھابی جان! یہ میری عینی کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں اس سے دشمنی کی جا رہی ہے؟ ہائے! مقدر ہی اس کا دشمن بنا ہوا ہے۔ جب بھی اس کی زندگی میں خوشیاں آتی ہیں تو اس سے پہلے بدنصیبی کی ٹھوکریں لگنے لگتی ہیں۔''

وہ عینی کو تھپکتے ہوئے کہہ رہی تھی ''پہلے اس کی کمزور بینائی

سے فائدہ اٹھا کر اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ کبھی دردانہ کے بیٹے جواد نے اور کبھی میرے بھائی حشمت نے اس کی عزت سے کھیلنا چاہا۔ پاشا اس کی زندگی میں خوشیاں لانے والا تھا لیکن اسے بھی اغوا کر لیا گیا۔ اس بے چارے کو پتا نہیں کہاں قیدی بنا کر رکھا گیا ہے؟''

عینی عروج سے الگ ہوگئی۔ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی ''میں اندھی نہیں رہنا چاہتی۔ اس اندھے پن نے مجھے بہت دھوکا دیا ہے۔ عروج! اس جاوید برقی سے ابھی فون پر بات کرو۔ میں جلد سے جلد آنکھیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس اندھیرے سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

عروج نے جاوید برقی نے آج صبح فون کیا تھا۔ تمہارے سلسلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ ہمارے ساتھ اس کے بعد ایک ٹریجڈی ہو رہی ہے۔ پہلے ہمارے بھائی جان کو گرفتار کیا گیا ہے اور پھر تمہیں اغوا کیا گیا ہے۔ جب تمہارا کوئی سراغ ملے گا اور تم واپس آؤ گی تو ہم ان سے رابطہ کریں گے۔''

عروج نے اسما سے فون لے کر اس کے نمبر ملائے۔ چند لمحوں کے بعد جاوید برقی کی آواز سنائی دی۔ عروج نے کہا ''میں عینی کی سہیلی عروج بول رہی ہوں۔ عینی واپس آگئی ہے اس لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔''

جاوید برقی نے کہا ''میں بہت پریشان ہوں۔ مایوس ہو رہا ہوں۔ یوں تو عطیہ حاصل کرنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن اس میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے۔ عورتیں یا تو ادھیڑ عمر کی ہیں یا پھر شادی شدہ ہیں۔ کوئی بن بیاہی عورت نہیں ہے۔ میری بیوی کی یہ آخری خواہش پوری ہوتی نہیں لگتی کہ اس کی موت کے بعد بھی اس کی آنکھوں سے کوئی اس دنیا کو، مجھ کو اور میرے بچوں کو دیکھے۔''

عروج نے کہا ''آپ نے آخری بار فون کر کے کہا تھا' عینی کو آپ کی وائف کی آنکھیں ملنی چاہیے۔ خواہ وہ آپ سے شادی کرے یا نہ کرے لیکن وہ کبھی بھی آپ کے بچوں سے آکر مل لیا کرے۔''

''جی ہاں! میں اب بھی اس بات پر قائم ہوں۔ میں اس سلسلے میں حلفیہ بیان دے سکتا ہوں کہ میں عینی سے کبھی شادی کا تقاضا نہیں کروں گا۔''

''تو پھر آپ ضروری کاغذات تیار کریں۔ ہم کل صبح آکر اس پر دستخط کریں گے۔''

''میری وائف کی آنکھیں منتقل کرنے کے سلسلے میں تمام کاغذات تیار ہیں۔ میں بھی اپنے طور پر ایک تحریر لکھ کر دے دوں گا۔ آپ کل صبح اپنے کسی بزرگ کے ساتھ عینی کو لے کر ہاسپٹل آجائیں۔ متعلقہ ڈاکٹر کی موجودگی میں تمام معاملات طے ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ کل صبح دس بجے ہم ہاسپٹل آجائیں گے۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ عروج نے عینی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''انشاء اللہ بات بن جائے گی۔ تمہیں جلد ہی آنکھوں کی روشنی ملے گی۔ انہوں نے کہا ہے' کل ہم اپنے کسی بزرگ کے ساتھ ہاسپٹل آجائیں۔''

بیگم آفتاب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا ''میں ابھی جا کر اس کے بڑے ابو سے کہتی ہوں۔ وہ کل تمہارے ساتھ ہاسپٹل چلے جائیں گے۔''

وہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔ اسما نے پریشان ہو کر کہا ''اس ویڈیو فلم کا کیا کیا جائے؟ ہم اسے ضائع کر دیں گے پھر بھی اس کی ماسٹر کاپی اس مکار عورت کے پاس ہوگی۔ نہ جانے وہ آئندہ عینی کے خلاف کیا کرنا چاہتی ہے؟''

عینی نے کہا ''ایسے برے وقت میں بھائی جان ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن مقدر بھائی جان تو ہیں۔ میں ان سے کہوں گی میرے ہاتھ کی لکیریں پھر سے پڑھیں اور مجھے بتائیں۔ کیا میرے مقدر میں بدنامی اور رسوائی ہے؟''

میں آسرا کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے گیا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو عینی، عروج، اسما' فلک ناز سب ہی ڈرائنگ روم میں آرہی تھیں۔ میں نے عینی کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ ''خدا کا شکر ہے میری بہن واپس آگئی ہے۔''

آسرا نے آگے بڑھ کر عینی کو گلے سے لگا لیا پھر کہا ''مجھے مقدر نے بتایا تھا کہ دردانہ نے تمہیں اغوا کیا ہے اور کہا ہے کہ شام تک تمہیں واپس بھیج دیا جائے گا۔ تھینکس گاڈ! تم واپس آگئی ہو۔''

عینی نے خلا میں تکتے ہوئے مجھ سے کہا ''مقدر نے مجھے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔ ہم پر کوئی مصیبت آتی تھی تو بھائی جان ہمارے سامنے ڈھال بن جاتے تھے۔ سوتیلی ماں کی سازشوں نے انہیں بھی ہم سے دور کر دیا ہے۔ اب ہم کس کے سہارے جئیں؟ کیا آپ ہمارے کسی کام نہیں آئیں گے؟''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ''تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مصیبتوں کے دن ہمیشہ نہیں رہتے۔''

وہ اپنی ہتھیلی بڑھا کر بولی ''آپ ابھی میرا ہاتھ دیکھ کر مجھے بتائیں' کیا میں ہمیشہ اندھیروں میں رہوں گی؟ بد

نصیبی ہمیشہ مجھے ٹھوکریں مارتی رہے گی؟''

میں نے اس کی ہتھیلی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر سر جھکا کر اسے چوما پھر کہا ''اپنی مٹھی بند کرلو۔ تمہیں جلد ہی روشنی ملنے والی ہے۔''

عروج نے آگے بڑھ کر کہا ''بھائی جان! دردانہ نے بڑی ذلالت کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے ایسی حرکت کی ہے کہ ہم سب کی گردنیں شرم سے جھک گئی ہیں۔''

میں نے انجان بن کر پوچھا ''اس نے ایسا کیا کیا ہے؟''

عروج اس شرم ناک ویڈیو کیسٹ کے بارے میں اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس نے فلک ناز کی طرف دیکھا۔ فلک ناز نے کہا ''مقدر! یہاں میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں اس مکار عورت کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔''

میں فلک ناز کے ساتھ وہاں سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں آیا۔ وہاں فلک ناز مجھے اس ویڈیو کیسٹ کے بارے میں بتانے لگی۔ میں نے عینی اور عروج کے پاس آکر تشویش کا اظہار کیا پھر انہیں تسلی دی کہ اس سلسلے میں دردانہ سے بات کروں گا۔ اسے کسی نہ کسی طرح سمجھانے اور اس ویڈیو کیسٹ کو کسی بھی شرط پر واپس کرنے پر آمادہ کروں گا۔''

میں انہیں تسلیاں دینے لگا۔ آئندہ ان کے ساتھ اور دردانہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، انہیں یہ بتانا مناسب نہیں تھا۔

☆☆☆

پاشا کا سر گھوم رہا تھا۔ دردانہ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے اس کی دلہن عینی کے ساتھ باہر جانے دیا جائے گا لیکن اس نے دھوکا دیا تھا اور عینی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر شہباز نے اسے روک لیا تھا۔ اسے سمجھایا تھا کہ عینی کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔ اس کی ممی دردانہ جو کچھ بھی کررہی ہیں، وہ اس کے خاندان والوں سے انتقام لینے کے لیے کررہی ہیں۔ اسے ابھی اس کے گھر نہیں جانا چاہیے اور اگر اس نے جانے کی ضد کی تو سیکورٹی گارڈز اسے کوٹھی سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یہ سنتے ہی اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ یہ بات دماغ میں گونجنے لگی کہ وہ وہاں قیدی بن کر رہ گیا ہے۔ کیا ماں باپ جوان بیٹے کو قیدی بنا کر رکھتے ہیں؟ کیا یہ اپنے بیٹے کے جذبات کو نہیں سمجھنا چاہتے؟ اس کی نئی نویلی دلہن کو چھین کر اس سے دور کرچکے ہیں۔

شہباز درانی سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے حکم دینے کے انداز میں کہا ''اپنے بیڈروم میں جاکر آرام کرو۔ یہاں کچھ لوگ مجھ سے ملنے آرہے ہیں۔''

اس نے سر اٹھا کر شہباز درانی کو دیکھا پھر وہاں سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر آگیا۔ اس کوٹھی کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگا۔ عینی نے اس سے کہا تھا کہ شادی کے بعد وہ اس کے ساتھ اس کے گھر جائے گا تو وہاں عروج سے ملاقات ہوگی پھر دونوں سہیلیاں اسے اس کی پچھلی زندگی کے بہت سے واقعات یاد دلائیں گی۔

وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا۔ بے چینی سے سوچنے لگا ''یہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے؟ مجھ سے جھوٹ بولا جارہا ہے۔ مجھے دھوکا دیا جارہا ہے۔ عینی نے کہا تھا' میری ماں کا نام دردانہ اور باپ کا نام شہباز درانی نہیں ہے۔ اور میں نے ڈائری میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔ میں عینی سے نہیں عروج سے محبت کرتا تھا۔''

وہ پھر اپنے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا ''وہ حسین لڑکی دو بار میرے خوابوں میں آچکی ہے۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ مجھے عینی سے شادی کرنی ہوگی۔ اگر میں نہیں مانوں گا تو وہ مجھ سے ناراض ہوجائے گی، مجھ سے دور چلی جائے گی۔ پھر یہی بات عینی نے.... مجھ سے آج کہی تھی۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ اس کی سہیلی عروج ہی وہ حسینہ ہے جو میرے خوابوں میں آچکی ہے۔''

وہ اپنے بیڈروم کے دروازے پر آکر رک گیا۔ اس قدر الجھا ہوا تھا کہ جگہ جگہ رک کر سوچ رہا تھا۔ ''اگر عینی کی باتیں درست ہیں تو پھر وہ ڈائری میں نے نہیں لکھی ہے۔ یہ دردانہ بیگم اور شہباز درانی میرے ماں باپ نہیں ہیں۔''

وہ اندر ہی اندر بری طرح الجھ رہا تھا۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے اچھی طرح سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن آج دردانہ اور شہباز کے رویے نے اس کے اندر باغیانہ خیالات پیدا کردیئے تھے۔ وہ عینی کے ساتھ باہر جاکر اپنی حقیقت معلوم کرسکتا تھا لیکن اسے باہر جانے سے جبراً روک دیا گیا تھا۔

وہ سوچتا ہوا، دروازہ کھولتا ہوا اندر آیا' وہاں تہمینہ ایک کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر ٹی' وی' آن تھا۔ وہ پاشا کے انتظار میں ٹی' وی' چینل بدل بدل کر دیکھ رہی تھی اور دل بہلا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ مسکرا کر بولی ''نئی دلہن مبارک ہو۔ لوگ سہاگ رات مناتے ہیں۔ تم نے سہاگ کا دن منالیا ہے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا ''یقیناً تمہیں تکلیف پہنچ رہی

ہے۔"

وہ اس کے قریب ہو کر بولی "تکلیف پہنچے بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر چکی ہوں۔ اب تمہیں جینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہا ہے۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اچانک ہی اسے ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے کہا "تہمینہ! میں ایک ایسی بات کہہ رہا ہوں جسے سنتے ہی تمہیں شاک پہنچے گا۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے پاشا کو دیکھا پھر پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ میری یادداشت واپس آ گئی ہے۔"

تہمینہ نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ وہ بولا "میں اپنی پچھلی زندگی کی ایک ایک بات یاد کر رہا ہوں۔"

وہ حیرانی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے کہا "میری پچھلی زندگی کے کسی لمحے میں بھی تم میرے ساتھ نہیں ہو۔ نہ خلوت میں نہ جلوت میں۔ میرے پیچھے جو سچ چھپا ہوا تھا' وہ میرے سامنے آ گیا ہے اور میں تمہارے چہرے پر لکھا ہوا جھوٹ صاف طور سے پڑھ رہا ہوں۔"

وہ پریشان ہو کر بولی "نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں۔ تمہاری یادداشت واپس نہیں آ سکتی۔"

"جو یادداشت جا سکتی ہے وہ واپس بھی آ سکتی ہے۔ تمہیں یقین کیوں نہیں ہو رہا ہے؟"

"اس لیے کہ ڈاکٹر تمہیں....."

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پاشا نے پوچھا "رک کیوں گئیں؟ آگے بولو؟ ڈاکٹر مجھے کیا کر رہا ہے؟ میرا ٹریٹمنٹ کیسے کر رہا ہے؟"

وہ ہکلاتے ہوئے بولی "میں۔ میں یہی تو کہہ رہی ہوں کہ ڈاکٹر بڑی توجہ سے تمہارا علاج کر رہا ہے۔ یہ تو تم خود ہی دیکھ رہے ہو۔"

"ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ تم حیران ہو کہ ڈاکٹر اتنی توجہ سے علاج کر رہا ہے' اس کے باوجود میری یادداشت کیسے واپس آ رہی ہے؟"

"یہ۔ یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

وہ پریشان ہو کر بولی "کچھ نہیں....."

وہ اتنا کہہ کر جانا چاہتی تھی۔ پاشا نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اپنے بازو کو دیکھ کر جذباتی انداز میں سوچنے لگی "ہائے! کیسی فولادی گرفت ہے۔ کم بخت جکڑتا ہے مگر چھوڑ دیتا ہے۔"

اس نے کہا "میں کوئی نادان بچہ نہیں ہوں۔ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ تم میرے سلسلے میں کوئی بہت اہم بات چھپا رہی ہو۔ خاص طور پر ڈاکٹر کی ٹریٹمنٹ کے بارے میں۔ جب تک تم صحیح بات نہیں بتاؤ گی میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ ایک دم سے آگے بڑھ کر، اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بہت ہی جذباتی انداز میں بولی "مجھے یوں جکڑنے کے بعد نہ چھوڑو۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ تم سے کچھ نہیں چھپا رہی ہوں۔"

وہ اسے اپنے سے الگ کرنے لگا لیکن وہ جونک کی طرح چمٹتی جا رہی تھی' کہتی جا رہی تھی "مجھے الگ نہ کرو۔ میری بات سنو۔ ڈاکٹر نے کہا تھا تمہاری یادداشت کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اس لیے میں حیران ہو رہی تھی۔ مجھے اب بھی تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے کہ تمہیں پچھلی باتیں یاد آنے لگی ہیں۔"

وہ بولتی جا رہی تھی اور کمبل بنتی جا رہی تھی۔ پاشا اپنے سے الگ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ ایسی ہی کوششوں کے دوران میں اس کی نظریں اس کے کھلے ہوئے گریبان کی طرف گئیں۔ لپٹتے اور جھپٹتے وقت چھپا ہوا خزانہ دکھائی دے رہا تھا۔ پاشا نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً ہی اپنا ہاتھ وہاں ڈالا تو وہ ہائے کہتی ہوئی بولی "یہ کیا کر رہے ہو؟ تم تو بالکل ہی فری ہو رہے ہو۔"

پاشا نے اپنا ہاتھ باہر نکال کر مٹھی کھولتے ہوئے کہا "میں یہ کر رہا تھا۔"

وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ اس سے الگ ہو گئی۔ پاشا کے ہاتھ میں ایک تہ کیا ہوا کاغذ تھا۔ وہ کاغذ کی طرف جھپٹتے ہوئے بولی "یہ کچھ نہیں ہے۔ مجھے دو۔"

پاشا نے ہاتھ بلند کیا۔ وہ اچھل اچھل کر اس کاغذ تک پہنچنے کی کوششیں کرنے لگی اور کہنے لگی "فار گاڈ سیک، یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے۔ مجھے واپس کرو۔ مجھے دے دو۔"

پاشا نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اسے حاصل کرنے کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہو رہی ہو؟"

وہ ہانپتے ہوئے بولی "یہ میرا پرسنل معاملہ ہے۔ پلیز اسے کھول کر نہ پڑھنا۔ یہ بات آؤٹ آف ایٹی کیٹ ہوگی۔"

وہ اچھلتے اچھلتے تھک گئی تھی۔ ہانپتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ تھام کر التجا کرنے لگی "یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے۔ خدا

کے لیے اسے نہ کھولو۔ اسے نہ پڑھو۔ مجھے واپس کر دو۔"

"تمہارا اصرار، تمہاری پریشانی کہہ رہی ہے کہ مجھے ضرور پڑھنا چاہیے۔ تم ادھر کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"میں نہیں بیٹھوں گی۔"

وہ پھر کاغذ کی طرف جھپٹنا چاہتی تھی۔ پاشا نے اسے ایک دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کرسی کے پاس گئی پھر کرسی سمیت فرش پر گر پڑی اور تکلیف سے کراہنے لگی۔ وہاں سے فوراً ہی اٹھ نہ سکی۔ کمر پکڑ کر، تکلیف برداشت کرتی ہوئی اٹھنے لگی۔ اس وقت تک پاشا اس کاغذ کو کھول کر پڑھ رہا تھا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر پلٹ کر دیکھا تو گھبرا گئی۔ اس کاغذ کی طرف لپکنا چاہتی تھی لیکن ایک قدم آگے بڑھتے ہی پھر تکلیف سے کراہتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔ کمر کی ہڈی پر سخت چوٹ لگی تھی۔ وہ سر اٹھا کر بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے کھلے ہوئے کاغذ کو دکھاتے ہوئے پوچھا "یہ کیا لکھا ہوا ہے؟"

وہ کراہتے ہوئے بولی "یہ میرا اپنا حساب کتاب ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

"میں ایسا اناڑی بھی نہیں ہوں۔ اتنا تو سمجھتا ہوں کہ یہ سب کوڈ ورڈز میں لکھا گیا ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ یہ بتا دو کہ کوڈ ورڈز اور کوڈ نمبرز کے پیچھے کیا باتیں چھپی ہوئی ہیں؟"

"جو باتیں چھپی ہوئی ہیں ان کا تعلق تم سے نہیں ہے۔ یہ جانتے ہو کہ میں باس کی رازدار سیکریٹری ہوں۔ ان کے اہم پیغامات اور اہم معاملات کو کوڈ ورڈز میں لکھا جاتا ہے پھر میں پرائیویٹ چیمبر میں جا کر انہیں کسی ریکارڈ فائل میں رکھ دیتی ہوں۔"

"تو پھر اسے ریکارڈ فائل میں کیوں نہیں رکھا؟"

"میں بعد میں رکھ دوں گی۔"

"ڈیڈی ابھی یہاں موجود ہیں۔ وہ خود اس کاغذ کو وہاں لے جا کر رکھ سکتے ہیں پھر انہوں نے تمہیں رکھنے کے لیے کیوں دیا؟ اور جب دیا ہے تو تم نے اسے گریبان کے اندر چھپا کر کیوں رکھا ہے؟"

"یہ میرا اور باس کا معاملہ ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

"میں سمجھنا چاہتا ہوں اور اگر تم نے نہ سمجھایا تو میں ابھی جا کر اسے ڈیڈی کو دکھاؤں گا اور پوچھوں گا کہ یہ ریکارڈ فائل میں کیوں نہیں ہے؟ تمہارے گریبان میں کیوں چھپا ہوا ہے؟"

وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلانے لگی۔ اس سے آ کر لپٹنا چاہتی تھی۔ وہ دور ہو کر ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "خبردار! مجھ سے فاصلہ رکھو۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ کاغذ تمہارے لیے کتنا اہم ہے۔"

وہ بے بسی سے بولی "پاشا! کیوں میرے لیے مشکلات پیدا کر رہے ہو؟"

"میری ایک بات کا جواب دو۔ اس کاغذ کو ڈیڈی کے ہاتھوں میں پہنچنا چاہیے یا نہیں؟"

وہ نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی "مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔"

"ٹھیک ہے پھر میں ڈیڈی سے سوال کروں گا۔"

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر بولی "نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"تو تم مجھے ایسا کرنے سے روکو گی؟"

وہ ایک دم سے دوڑتی ہوئی آ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی "نہیں۔ خدا کے لیے یہ مجھے واپس کر دو یا اسے جلا ڈالو۔"

وہ سر جھکا کر اسے اپنے قدموں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب میں کسی حد تک تمہیں سمجھ رہا ہوں۔ تم ڈیڈی سے فراڈ کر رہی ہو۔ ان کی لاعلمی میں کوئی بہت بڑا گیم کھیل رہی ہو۔"

وہ روتے ہوئے بولی "آہستہ بولو۔ اگر باہر تک آواز گئی اور باس نے سن لیا تو مجھے اپنے ٹارچر سیل میں پہنچا دیں گے۔ وہاں اتنی اذیتیں دی جائیں گی کہ میں موت کی بھیک مانگتی رہوں گی لیکن وہ مجھے مرنے نہیں دیں گے۔ پتا نہیں کتنے دن اور کتنی راتوں تک اذیتیں دینے کے بعد مجھے موت ملے گی۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر بولی "اسے جلا ڈالو۔"

"کیوں جلا ڈالوں؟ تم اپنے اس باس کو دھوکا دے رہی ہو جو میرا باپ ہے۔"

وہ جلدی سے بولی "وہ تمہارے باپ نہیں ہیں۔"

اس نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا "آگے بولو؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی "تم میرے کام آؤ۔ میں تمہارے کام آؤں گی۔ یہ کاغذ مجھے واپس کر دو۔ میں تمہارے بارے میں جتنا جانتی ہوں' تمہیں بتاؤں گی۔"

"میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"میں سب کچھ بتاؤں گی۔ پہلے وہ کاغذ مجھے دے دو۔"

وہ کاغذ کو مٹھی میں بند کرتے ہوئے بولا ''یہ تمہاری کمزوری ہے' میرے ہاتھ میں رہے گی۔ میرے نام نہاد ڈیڈی کے پاس نہیں پہنچے گی۔ چلو، وقت ضائع نہ کرو۔ میرے بارے میں بتاؤ؟''

وہ ٹھہر ٹھہر بولی ''تمہیں بہت ہی زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ پتا نہیں تمہیں کتنی گولیاں لگی تھیں۔ تم سر سے پاؤں تک لہو میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ یہاں بڑی رازداری سے تمہارا علاج ہوتا رہا ہے۔''

''وہ دشمن کون تھے' جنہوں نے مجھے زخمی کیا تھا؟''

''یہی دردانہ بیگم' جنہیں تم اپنی ممی کہتے ہو۔ پہلے تو طے کیا گیا کہ تمہیں قیدی بنا کر رکھا جائے گا پھر تم ہوش میں آئے اور خود کو پہچان نہ سکے۔ اپنے بارے میں پوچھنے لگے' تب اندازہ ہوا کہ تمہاری یادداشت گم ہو چکی ہے۔ دردانہ اور مسٹر درانی نے فیصلہ کیا کہ تمہیں اسی طرح رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر ایسے انجکشن لگایا کرے گا کہ تمہارا دماغ ہمیشہ کمزور رہے گا۔ کبھی تمہاری یادداشت بحال نہیں ہو سکے گی۔''

''مجھے انجکشن کب لگایا جاتا ہے؟''

''ہر سات دن کے بعد ہفتے کی رات کو۔''

''ہوں۔ تو وہ انجکشن مجھے کمزور بنانے اور قیدی بنا کر رکھنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔ مجھے تصویروں کے البم دکھائے گئے جن میں دردانہ اور شہباز درانی کے ساتھ میری تصویریں ہیں پھر میرے شناختی کارڈ میں باپ کی جگہ شہباز درانی کا نام لکھا ہوا ہے۔''

''یہ سب جعلی تصویریں ہیں۔ جعلی شناختی کارڈ ہے۔ وہ ڈائری بھی تم نے نہیں لکھی ہے۔ تحریر کی نقالی کرنے والے ایک ماہر کو اچھی خاصی رقم دے کر وہ ڈائری لکھوائی گئی ہے۔''

''اوہ گاڈ! مجھ سے کتنا بڑا فراڈ کیا جا رہا ہے۔ میری پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''میں تمہارے بارے میں اور کچھ نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ ایک بار میں نے دردانہ بیگم کو مسٹر درانی سے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا کہ تمہاری شادی عینی سے ہونے والی تھی اور وہ اس شادی کو روکنے کے لیے تم پر قاتلانہ حملہ کرا چکے تھے۔ ان کے آدمی تمہیں تلاش کر رہے تھے پھر میں نے دوسرے دن دیکھا تمہیں زخمی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔''

وہ سوچتے ہوئے زیر لب بڑبڑانے لگا ''عینی درست کہہ رہی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلوں گا۔ وہاں عروج سے ملاقات ہو گی تو دونوں سہیلیاں مجھے میری پچھلی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتائیں گی۔''

تہمینہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا ''ابھی تو تم نے کہا تھا تمہاری یادداشت واپس آ گئی ہے اور تم اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو؟''

''میں نے جھوٹ کہا تھا۔ تم سے حقیقت اگلوانا چاہتا تھا۔ تھینکس گاڈ! مقدر میرا ساتھ دے رہا ہے۔ یہ کاغذ تمہارے گریبان سے نہ نکلتا اور میرے ہاتھ نہ آتا تو کبھی مجھے اصلیت معلوم نہ ہوتی اور میں ہمیشہ ان فراڈ ممی اور ڈیڈی کا قیدی بنا رہتا۔''

''اب کیا سمجھتے ہو؟ آئندہ ان کے قیدی بن کر نہیں رہو گے؟ ان کی اجازت کے بغیر یہاں سے باہر جا سکو گے؟''

وہ پریشان ہو کر اسے تکنے لگا۔ وہ بولی ''تم نے اتنا عرصہ یہاں رہ کر دیکھا ہے کہ کتنے سخت حفاظتی انتظامات ہیں۔ میڈم اور باس کی اجازت کے بغیر کوئی یہاں سے باہر قدم نہیں نکال سکتا اور باہر کا کوئی بندہ یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔''

وہ تپھنے کے انداز میں اس سے ذرا دور ہٹ گیا۔ سوچتا ہوا بولا ''مجھے کچھ کرنا ہو گا۔''

''تم کچھ بھی کر لو۔ ان سے بغاوت کرو گے۔ زنجیر توڑ کر یہاں سے جانا چاہو گے تو تمہیں گولی مار دی جائے گی۔ یہ تمہیں بیٹا کہتے ہیں لیکن انہوں نے تمہیں موبائل فون نہیں دیا ہے اور تم یہاں کے فون سے کسی سے بھی رابطہ کرو گے تو انہیں خبر ہو جائے گی۔ کیونکہ یہاں کی تمام کالوں کو ٹیپ کیا جاتا ہے۔''

اس نے کہا ''ایک بار میں تمہارے ساتھ شاپنگ سینٹر گیا تھا۔ ہو سکتا ہے پھر کسی ضرورت کے تحت دردانہ اور درانی مجھے یہاں سے باہر لے جائیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو۔ تم میرے ساتھ شاپنگ سینٹر تک تنہا گئے تھے؟ نہیں ہمارے ساتھ آگے پیچھے مسلح افراد تھے۔ وہ تمہیں نظر نہیں آ رہے تھے لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں تمہاری نگرانی کی جا رہی تھی۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں خطرہ مول لوں گا۔ میرے سر کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ میں ہیئر کٹنگ کے بہانے یہاں سے باہر جانے کی کوشش کروں گا۔''

''وہ جانے دیں گے لیکن تم سخت نگرانی میں رہو گے۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں انہیں دھوکا دے کر، ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کہیں نکل جاؤں گا۔''

''کہاں نکل جاؤ گے؟ تم شہباز درانی کو نہیں جانتے' وہ یہاں سے واشنگٹن تک وسیع ذرائع اور بے انتہا اختیارات کا مالک ہے۔ تم جہاں جاؤ گے' وہاں اس کے آلہ کار تمہیں گولی مار دیں گے۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی ''تم پہلے بھی ان سے بھاگ رہے تھے' انہوں نے تم پر دن کے وقت حملہ کرایا تھا۔ تم ان کے قابو میں نہیں آئے تھے۔ وہ سب تلاش کرتے رہے تھے۔ آخر پتا نہیں کہاں تم نظر آ گئے تھے اور وہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کر کے یہاں لے آئے تھے۔''

وہ پریشانی سے سوچتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی ''تم میرے رازدار ہو۔ میں تمہاری رازدار رہوں گی۔ انہیں یہ نہیں بتاؤں گی کہ تمہیں اپنے ماضی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے اور تم اپنے ان ماں باپ کو فراڈ سمجھ رہے ہو۔ تمہیں بھی یہ بات چھپا کر رکھنی ہو گی۔''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ وہ بولی ''یہ کاغذ مجھے دے دو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گی۔''

اس نے کاغذ کو دیکھا پھر پوچھا ''تم کس طرح میرے کام آؤ گی؟''

''مجھے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ملتی ہے۔ میں پورا دن اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔ باہر کی دنیا سے بالکل تعلق رہتا ہے۔ میں تمہارا کوئی بھی پیغام بڑی رازداری سے عینی تک پہنچا سکوں گی۔ یہ یقین تو نہیں ہے کہ وہ تمہاری رہائی کے لیے کچھ کر سکے گی لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری رہائی کے لیے کوئی راستہ نکال لے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا ''ہاں، مجھے فی الحال یہاں قیدی بن کر رہنا چاہیے اور عینی کے ذریعے رہائی کا کوئی راستہ نکالنا چاہیے۔''

تہمینہ نے کاغذ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ کاغذ کو اپنی طرف کھینچ کر بولا ''اب اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم شہباز درانی سے کس طرح کا فراڈ کر رہی ہو؟''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی پھر بولی ''آج سے دس دن پہلے ایک نامعلوم شخص نے فون پر مجھ سے رابطہ کیا پھر کہا میری چھوٹی بہن اس کے قبضے میں ہے اور وہ اس وقت تک گھر واپس نہیں آئے گی' جب تک میں اس کے احکامات کی تعمیل نہیں کروں گی۔ اس نے یہ بھی وارننگ دی کہ میں شہباز درانی سے اس کا ذکر کروں گی اور اس کی مدد لینا چاہوں گی تو میری بہن مجھے زندہ واپس نہیں ملے گی اور شہباز درانی اس اغوا کرنے والے کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

''وہ نامعلوم شخص تم سے کیا چاہتا تھا؟''

''اس نے کہا کہ میں شہباز درانی کی ذاتی اور سیاسی مصروفیات کے بارے میں ایک ایک بات جانتی ہوں۔ اگر میں اسے تمام معاملات اور تمام مصروفیات کے بارے میں رپورٹ دیتی رہوں گی تو وہ میری بہن کو رہا بھی کر دے گا اور پچیس لاکھ روپے بھی دے گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی ''میرے ماں باپ بہت بوڑھے ہیں۔ میں اپنے بھائی بہنوں کو بہت چاہتی ہوں۔ انہیں ماں کی طرح پیار کرتی ہوں۔ میری وہ بہن جو اس نامعلوم شخص کے قبضے میں تھی' میں اس کی شادی کرنے والی تھی۔ میرے سامنے یہی ایک راستہ تھا کہ اس کی بات مان لوں اور پچیس لاکھ روپے قبول کر لوں تاکہ اپنی بہن کے اور بھائیوں کے مستقبل کو سنوار سکوں۔''

''تو تم یہاں رہ کر اس کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دے رہی ہو؟''

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا ''وہ زبان کا دھنی ہے۔ اس نے میری بہن کو رہا کر دیا ہے۔ میرے بوڑھے باپ کے اکاؤنٹ میں پچیس لاکھ روپے جمع کرا دئیے ہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میرے اکاؤنٹ میں رقم جمع ہو گی تو شہباز درانی کو اطلاع مل جائے گی کیونکہ اس کے جاسوس میری بھی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔''

اس نے اس کاغذ کی طرف دیکھا جو پاشا کی گرفت میں تھا۔ وہ بولا ''اطمینان رکھو۔ میں تمہارے ساتھ دشمنی نہیں کروں گا۔ آگے بولو۔''

''میں اس کے احکامات کے مطابق یہاں کی ایک ایک رپورٹ موبائل فون کے ذریعے پہنچاتی ہوں کہ وہ کس طرح دردانہ بیگم کا دیوانہ ہے۔ سیاسی معاملات کے علاوہ کس طرح دردانہ کے ذاتی معاملات میں دلچسپی لیتے ہوئے عینی اور ذیشان وغیرہ کے خلاف کوئی نہ کوئی کارروائی کرتا رہتا ہے۔''

پاشا نے پوچھا ''اس کاغذ پر لکھے ہوئے کوڈ ورڈز اور کوڈ نمبرز کے بارے میں بتاؤ؟''

وہ بولی ''اس نامعلوم شخص نے مجھے ایک نیا کام دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ اس کے عوض مزید پچیس لاکھ روپے میرے باپ کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دے گا۔ اس نے مجھے چند کوڈ الفاظ اور کوڈ نمبرز لکھوائے اور کہا کہ ان تمام کوڈز کے مطابق شہباز درانی کے پرائیویٹ چیمبر میں فائلیں رکھی ہوئی ہیں۔ میں ان فائلوں کے اندر سے تمام کاغذات چرا کر لے آؤں۔''

پاشا نے کہا ''شہباز درانی اپنے پرائیویٹ چیمبر میں کسی کو

نہیں جانے دیتا۔ تم کیسے جاسکتی ہو؟''

''میں جاتی ہوں۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ مجھے وہاں کی صفائی کے لیے بلاتا ہے۔ اس کے مطالعے کے دوران جو فائلیں اور جو ایکسس وغیرہ بے ترتیب ہو جاتے ہیں انہیں ترتیب سے رکھنے کو کہتا ہے۔ آئندہ ایسے وقت میں ہاتھ کی صفائی دکھانے کی کوشش کروں گی۔''

پاشا نے وہ کاغذ اس کو دیتے ہوئے کہا ''میں تمہاری یہ کمزوری اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا لیکن ایسا نہیں کر رہا ہوں لیکن اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ کبھی مجھ سے فراڈ کر سکو گی۔ جب بھی کرنا چاہو گی تو میں تمہاری ایک اور کمزوری سے کھیلوں گا۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''تمہارے باپ کے اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ روپے جمع کیے گئے ہیں۔ تم دشمنی کرو گی تو میں بھی دشمنی سے شہباز درانی کو یہ بتا دوں گا۔ پھر تم سے جواب طلب کیا جائے گا کہ اتنی بڑی رقم تمہارے باپ کے اکاؤنٹ میں کہاں سے آگئی؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی پھر اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی ''میں تم سے کبھی دشمنی نہیں کروں گی۔ تم میرے دل کو اور میری محبت کو کیوں نہیں سمجھ رہے ہو۔ ہم دونوں بڑی محبت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔''

پاشا نے اپنے گھٹنوں پر سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا ''میری فطرت میں عیاشی ہوتی تو میں پہلے ہی دن تمہاری طرف مائل ہو جاتا۔ اس بات کو اپنے دل اور اپنے دماغ سے نکال دو کہ مجھ سے کبھی جسمانی تعلقات قائم ہو سکیں گے۔ میں اپنی پچھلی زندگی بھلا چکا ہوں۔ اس کے باوجود میری فطرت میں پارسائی ہے۔ مجھے یقین ہے میں نے کبھی گناہ نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گا۔ یہاں سے اٹھو اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاؤ۔''

وہ سر جھکا کر اٹھ گئی۔ جس کرسی سے اٹھ کر آئی تھی وہاں بیٹھ گئی۔ جب وہ کمرے میں آیا تھا تو وہ اسی کرسی پر بیٹھی ہوئی ٹی' وی' دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹی' وی' اب تک آن تھا۔ پاشا نے سر گھما کر ادھر دیکھا پھر کہا ''اسے کیوں خوا مخواہ آن کر رکھا ہے؟ بند کرو۔''

تہمینہ نے پاس رکھے ہوئے ریموٹ کنٹرول کو اٹھایا۔ وقت پاشا اسکرین کی طرف دیکھ کر ایک دم سے چونک گیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں اسکرین پر عروج دکھائی دے رہی تھی۔ اسی وقت تہمینہ نے ریموٹ کنٹرول کے ذریعے اسے آف کیا۔ ٹی' وی بند ہو گیا۔ وہ چیخ کر بولا ''آن کرو۔ فوراً آن کرو۔''

تہمینہ نے اسے پھر آن کیا۔ وہ چیخ کر بولا ''آواز بڑھاؤ۔''

اس نے آواز بڑھائی۔ نیوز چینل پر کہا جا رہا تھا ''ہاسپٹل کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے ڈاکٹر عروج کو اس سال کی بہترین کارکردگی پر پرائیڈ آف پرفارمنس کی یہ سند عطا کی ہے اور انہیں سینئر سرجن کے عہدے پر فائز کیا ہے۔''

پاشا کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے حلق میں آرہا ہو۔ وہاں منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ نیوز کا دوسرا حصہ سنایا جا رہا تھا۔ عروج اسکرین سے گم ہو گئی تھی۔ وہ تڑپ کر تیزی سے چلتا ہوا ٹی' وی' کے پاس آیا پھر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا ''یہی ہے۔ وہ حسینہ یہی ہے۔ میں نے اسے ہی خوابوں میں دیکھا تھا۔''

تہمینہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی دیوانگی کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی پھر آگے بڑھ کر بولی ''مگر تم تو عینی کو چاہتے تھے۔ تمہاری شادی اس سے ہو چکی ہے۔''

وہ بڑے جذبے سے بولا ''نہیں' میں عینی کو نہیں عروج کو چاہتا ہوں۔ خواب میں عروج نے مجھ سے کہا تھا میں عینی سے شادی کروں۔ اگر نہیں کروں گا تو وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ مجھ سے دور ہو جائے گی۔''

اس نے کہا ''عروج نے یہ بات تمہیں خواب میں کہی تھی۔ حقیقت میں نہیں کہی تھی۔''

''یقیناً اس نے کبھی سچ مچ یہ کہا ہوگا۔ یہ بات عینی نے آج مجھ سے کہی تھی کہ عروج مجھے چاہتی ہے مجھ سے شادی کرنا بھی چاہتی ہے لیکن اس کی شرط یہی ہے کہ پہلے میں عینی سے شادی کروں۔ وہ عینی کو اپنی سوکن بنانا چاہتی ہے۔''

وہ بولی ''ایسا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی لڑکی شادی سے پہلے کسی دوسری لڑکی کو اپنی سوکن بنانے کی خواہش کرے۔''

''اگر تم نے ایسی سر پھری سہیلیوں کو نہیں دیکھا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری دنیا میں ایسی محبت کرنے والی لڑکیاں نہیں ہوتی ہیں۔ ضرور ہوتی ہیں اور میری زندگی میں تو ہیں۔ میرے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔''

اس نے پوچھا ''کیا عینی کی سہیلی یہی ڈاکٹر عروج ہے جو ابھی اسکرین پر نظر آرہی تھی۔''

''میرا دل کہتا ہے، میرا دماغ کہتا ہے کہ یہی ہے۔ اسے میں نے خوابوں میں دیکھا ہے پھر اس کا ذکر عینی نے کیا۔ اس کا چہرہ میرے ذہن میں نقش ہو گیا ہے۔ اسی لیے میں نے

اسے اسکرین پر دیکھتے ہی پہچان لیا ہے۔''

''کیا یہ عجیب سی بات نہیں ہے کہ تم اپنے خوابوں اور خیالوں میں اس عروج کو چاہتے ہو لیکن تم نے عینی سے شادی کی ہے۔''

''میں نے حالات سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے لیکن یہ یقین سے کہتا ہوں کہ میں نے خواب کے مطابق اور عروج کی خواہش کے مطابق یہ شادی کی ہے۔ بہر حال جو بھی ہو رہا ہے' اچھا ہی ہو رہا ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں عینی سے شادی کرنے کے بعد اپنی عروج کے قریب پہنچنے والا ہوں۔''

اس بار اٹھ کر تہمینہ کو دیکھا پھر پوچھا ''تم سنڈے کو چھٹی کرتی ہو۔ کیا آج سے دو دن بعد اپنے گھر والوں سے ملنے جاؤ گی۔ کیا عینی اور عروج کو پیغام دو گی؟''

وہ سوچنے کے انداز میں ہنکاری بھری اس سے ذرا دور گئی پھر پلٹ کر واپس آتے ہوئے بولی ''مجھے بہت بڑا خطرہ مول لینا ہوگا۔ میں رازداری سے عینی کو فون کروں گی تو وہ سوال کرے گی کہ میں کون ہوں؟ اور جب کچھ میں تمہارے بارے میں اس سے کہوں گی وہ یقین کرنے کی کوشش کرے گی یا نہیں؟ اگر یقین کرے گی اور یہاں کسی فون پر تم سے بات کرے گی تو راز افشا ہو جائے گا۔ مجھ پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ شہباز درانی ایک درندہ ہے۔ اسے ذرا بھی شبہ ہوا تو وہ صرف مجھے ہی نہیں میری پوری فیملی کو خاک میں ملا دے گا۔''

''تم اس طرح ڈرتی رہو گی تو میرا کوئی کام نہیں کر سکو گی۔''

وہ بولی ''تم نے یہ کاغذ مجھے واپس کیا ہے۔ میرے رازدار بن گئے ہو۔ اس لیے میں تمہارے کام ضرور آؤں گی۔ اس بار میں باہر جاؤں گی تو ایک موبائل فون خرید کر اسے چھپا کر تمہارے پاس لاؤں گی۔ تم اسے چھپا کر رکھو گے اور بڑی رازداری سے عینی اور عروج سے باتیں کر سکو گے۔''

وہ خوش ہو کر بولا ''تھینک یو تہمینہ! اگر ایسا ہو جائے تو میں ان دونوں سے کھل کر باتیں کر سکوں گا اور یہاں سے نکلنے کا کوئی ٹھوس منصوبہ بنا سکوں گا۔''

''اچھا میں چلتی ہوں'' اس نے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پاشا نے خوش ہو کر اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

شہباز درانی بہت ہی وسیع ذرائع کا اور بے انتہا اختیارات کا مالک تھا۔ بڑے بڑے شہزوروں کو خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی ہوں سب ہی کو کچل کر رکھ دیتا تھا۔ بے شک وہ ایک بلند و بالا پہاڑ تھا لیکن وہ پہاڑ بھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کھدائی کرنے والے اس کے نیچے سرنگ بناتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

گل خانم اپنی ہی کوٹھی میں قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ اندر اور باہر مسلح پولیس والے تھے۔ اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ فون کا کنکشن کاٹ دیا گیا تھا اور موبائل فون چھین لیا گیا تھا۔ اس طرح وہ کسی سے رابطہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی گورنس کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک لیڈی کانسٹیبل کو وہاں رکھا گیا تھا۔

یاور خان کا علاج پولیس ہاسپٹل میں ہو رہا تھا۔ وہاں بھی اس کی سختی سے نگرانی کی جا رہی تھی اور کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا رہی تھی۔ گل خانم کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا محسن ایس' پی' ذیشان مصائب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ دوسرے دن صبح باقر مہدی نے بتایا تھا کہ اس ایس' پی' کو معطل کر دیا گیا ہے اور اب وہ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے ہے۔

یہ ایسی خبر تھی جسے سنتے ہی گل خانم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اپنے آپ کو کوس رہی تھی، گالیاں دے رہی تھی کہ اس نے ایک ہمدرد محسن کی قدر نہیں کی۔ اسے ایک اعلیٰ عہدے سے نیچے گرا کر ذلت کی انتہائی پستیوں میں پہنچا دیا ہے۔

وہ یاور خان کے متعلق تذبذب میں مبتلا رہا کرتی تھی کہ طلاق کے بعد اس سے رجوع کرنا چاہیے یا نہیں؟ وہ اس کی زندگی میں پہلی بار محبوب کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس کی پہلی محبت' پہلا محبوب تھا۔ اس لیے دل اسی کی طرف کھنچا جاتا تھا پھر ایک عورت کی شرم کہتی تھی کہ ایک کے ساتھ تنہائی میں زندگی گزار چکی ہے تو آئندہ بھی اسی کے ساتھ زندگی گزارنا چاہیے لیکن اس کی جہالت اور بد دماغی نے پریشان کر رکھا تھا۔ آخر انتہا یہ ہوئی کہ اس نے اپنی جہالت کے باعث غصے میں آکر طلاق دے دی۔ صرف اتنا ہی نہیں' اس کی وجہ سے اس کا نوزائیدہ بچہ بھی مارا گیا تھا۔ وہ بہت دنوں تک اس سے نفرت کرتی رہی لیکن اندر ہی اندر اس ظالم شوہر کے لیے کشش بھی محسوس کرتی رہی۔

ایسے حالات میں وہ ایس' پی' ذیشان کی شخصیت سے متاثر ہونے لگی۔ وہ اس کے برے وقتوں میں کام آرہا تھا اور ہمدردی سے اور محبت سے اس کے دل میں جگہ بنا رہا تھا۔ بہت جلد وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے تھے' جس کی توقع

وہ نہیں کر سکتی تھی۔

بات شادی تک آ پہنچی تھی کہ عدت کے ایام گزارنے کے بعد وہ اس کی شریک حیات بن جائے گی لیکن ذیشان نے ایسی شرائط پیش کیں' جن کی وجہ سے اس کا دل اس کی طرف سے پھرنے لگا۔ شرائط یہ تھیں کہ وہ عارضی طور پر نکاح پڑھائے گا تاکہ گل خانم طلاق لے کر اپنے سابقہ شوہر سے رجوع کر سکے اور وہ گل خانم کو طلاق بھی اسی وقت دے گا جب وہ اس کے لیے ایک بچے کو جنم دے گی۔

ایسی شرائط کوئی مجبور عورت ہی مان سکتی تھی اور گل خانم مجبور نہیں تھی۔ ایک تو وہ شادی کے بعد طلاق لینا نہیں چاہتی تھی۔ اگر سابقہ شوہر سے رجوع کرنا ہوتا اور طلاق لینی ہوتی تو وہ ایک ماں بننے کے بعد اپنا بچہ ذیشان کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔ یہ ایسی عورت کے لیے ناممکن سی بات تھی جو ایک بچے سے پہلے ہی محروم ہو چکی تھی۔ اور اب ذیشان اسے دوسرے بچے سے محروم کرنے کی بات کر رہا تھا۔

ان حالات نے اسے تذبذب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کیا کرے کیا نہ کرے؟ ذیشان سے دل پھر گیا تھا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی خاطر جیل چلا گیا ہے، دھتیں اٹھا رہا ہے تو وہ ایک دم سے تڑپ گئی۔ دل میں چھپی ہوئی اور لاشعور میں دبی ہوئی محبت پھر سے ابھر آئی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ ذیشان اس کے معاملات میں ملوث ہو کر اس انجام کو پہنچ رہا تھا۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال آتا تھا کہ کس طرح وہ اپنے محسن کو نا کردہ گناہ کی سزاؤں سے بچائے؟

اسے اس کی ہی کوٹھی میں نظر بند کیا گیا تھا۔ اور اسے کسی سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ بالکل ہی بے دست و پا ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنے اور ذیشان کے حق میں کیس لڑنے کے لیے کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن اسے ایسا کرنے کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں تھی۔ اسے اطلاع دی گئی کہ سی' آئی' اے کا افسر باقر مہدی اس سے ملنے آیا ہے۔ وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو باقر مہدی کے ساتھ دردانہ بیگم آئی ہوئی تھی۔ اس نے تعارف کرایا ''میڈم! یہ گل خانم ہے۔ یادر خان سے طلاق لے کر بیٹھی ہوئی ہے۔''

تعارف کرانے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے بدچلنی کے باعث طلاق دے کر انتہائی پستی میں پھینک دیا گیا ہو۔ وہ ناگواری سے بولی ''سوری آفیسر! میں نے طلاق نہیں لی ہے۔ میرے جاہل اور بددماغ شوہر نے مجھے طلاق دی ہے اور میں یہاں بے بس اور مجبور ہو کر نہیں بیٹھی ہوں بلکہ آپ قانون کو ہاتھوں میں لے کر مجھے مجبور اور بے بس بنا رہے ہیں۔''

دردانہ نے حقارت سے کہا ''یہ ثابت ہو چکا ہے کہ تم ذیشان کے ساتھ منہ کالا کر چکی ہو۔ یہ تو تمہیں عدالت میں معلوم ہوگا کہ کون قانون کو ہاتھ میں لے رہا ہے؟''

گل خانم نے بھی اسے حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا ''تو کون ہے؟ کیا اس آفیسر کے ساتھ منہ کالا کر کے آئی ہے؟''

باقر مہدی نے ایک دم سے غصے میں آ کر کہا ''یو شٹ اپ نان سینس۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو گل خانم نے کلائی پکڑ لی پھر کہا ''آفیسر! میں پٹھان عورت ہوں۔ اگر میرا ایک ہاتھ پڑ گیا تو تو اپنی ساری افسری بھول جائے گا۔''

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی ''بہتر ہے دور سے بات کر۔ میں دیکھوں گی تو کب تک مجھے جیل میں بند کیے جا میں رکھے گا۔ عدالتی کارروائی شروع ہوگی تو مجھے اپنا وکیل کرنے کی اجازت ملے گی۔ اس کے بعد میں تجھ سے نمٹ لوں گی۔''

دردانہ اس کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ بولی ''مسٹر باقر! تم نے درست کہا تھا۔ یہ بہت ہی تیز طرار عورت ہے۔ اپنے شوہر کو بددماغ کہہ رہی ہے۔ جبکہ خود بددماغ ہے۔''

گل خانم نے پوچھا ''آفیسر! تم اس بھونکنے والی کتیا کو یہاں لائے ہو؟ آخر یہ ہے کون؟''

باقر مہدی نے دانت پیستے ہوئے اسے دیکھا پھر کہا ''گل خانم! اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو۔ جانتی ہو یہ کون ہیں؟ یہ اس ملک کی بڑی بڑی ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے سامنے حکومت کے اعلیٰ عہدے دار سر جھکاتے ہیں۔ یہ دردانہ بیگم ہیں۔ اور یہی تمہارے ایس' پی' ذیشان کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے والی ہیں۔''

گل خانم نے غصے سے پوچھا ''مگر تم اس کتیا کو یہاں کیوں لائے ہو؟''

وہ گرج کر بولا ''بار بار تم اسے گالیاں دے رہی ہو۔ میں بہت برداشت کر رہا ہوں۔ اگر میرے آدمیوں نے تمہیں ٹارچر کرنا شروع کیا تو تمہیں دن میں تارے دکھائی دینے لگیں گے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی ''یہی تو میں چاہتی ہوں کہ مجھ پر تشدد کیا جائے تاکہ میں خود کو عدالت میں پیش کر کے تمہارے خلاف کارروائی کر سکوں۔''

دردانہ اور باقر مہدی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دردانہ

بولی ''اس سے بات کرنا فضول ہے۔ یہ ہماری بات نہیں مانے گی۔''

باقر مہدی نے کہا ''گل خانم! یہ اگرچہ ایس' پی' ذیشان کی دشمن ہیں لیکن تم سے دشمنی نہیں کرنا چاہیں۔ اگر تم ان کا ساتھ دو تو یہ تمہیں بدچلنی کے الزام سے بچا لیں گی۔''

''اگر محبت کرنا بدچلنی ہے تو پھر میں یہ الزام لیتی رہوں گی۔ پہلے تو میں تذبذب میں تھی، پریشان تھی کہ ذیشان کے متعلق کیا فیصلہ کروں۔ اب میں سمجھ گئی ہوں کہ میں دل کی گہرائیوں سے اس فرشتہ صفت انسان کو چاہنے لگی ہوں۔ مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔''

وہ دونوں حیرت سے گل خانم کو دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں دردانہ کے فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے پرس میں سے فون نکال کر کان سے لگایا۔ میں نے کہا ''ہیلو میری پیاری سوتیلی ممی۔ یقیناً پہچان گئی ہوں گی کہ کس کا فون ہے؟''

وہ ناگواری سے بولی ''مجھے فون کیوں کیا ہے؟''

میں نے کہا ''آج پبلو ماسٹر نے آپ سے کچھ کہا تھا مگر آپ وہ اہم بات بھول رہی ہیں۔''

اس نے پریشان ہو کر پوچھا ''کون سی اہم بات؟''

''میں یہ وضاحت سے نہیں کروں گا کہ پبلو ماسٹر نے آپ سے کیا کہا ہے لیکن میں آپ کا ہاتھ پڑھ چکا ہوں۔ میں نے بہت کچھ باتیں آپ کو نہیں بتائی تھیں۔ آج بتا رہا ہوں کہ اس ہفتے آپ پر بہت بڑی مصیبت آنے والی تھی۔''

وہ ذرا مطمئن ہو کر بولی ''آنے والی تھی۔ یعنی اب نہیں آئے گی؟''

''آپ نے پوری بات نہیں سنی۔ میں کہہ رہا ہوں کہ اس ہفتے آپ پر مصیبت آنے والی تھی.....''

میں یہ کہہ کر جان بوجھ کر ذرا چپ ہوا پھر بولا ''وہ آ چکی ہے۔''

وہ ایک دم سے گھبرا کر بولی ''کیا کہہ رہے ہو؟ مجھ پر مصیبت آئی ہے اور نہ آئے گی۔ تم خوا مخواہ مجھے ڈرا رہے ہو۔''

''تم بھول رہی ہو۔ پبلو ماسٹر کی پیش گوئی سن کر شہباز درانی نے تم سے کہا تھا' وہ اس ہفتے تمہیں باہر نکلنے نہیں دے گا۔ کہیں تم کسی حادثے سے یا کسی ناگہانی مصیبت سے..... دور چار نہ ہو جاؤ اور تم ایسی نادان ہو کہ گھر سے باہر نکل آئی ہو۔ اب کیا ہوگا میری پیاری سوتیلی ممی؟''

یہ کہتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ وہ ہیلو ہیلو کہہ کر پکارنے لگی پھر جھنجلا کر فون بند کر کے سوچ میں پڑ گئی۔ باقر مہدی نے پوچھا ''کیا ہوا میڈم؟''

وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے بولی ''کچھ نہیں، میں ابھی گھر واپس جاؤں گی۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی کوٹھی سے باہر آ گئی اور اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی کار کے آگے پیچھے مسلح افراد کی گاڑیاں تھیں۔ باقر مہدی نے کار کی کھڑکی پر جھک کر پوچھا۔ ''میڈم! میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''میں گھر پہنچنے کے بعد تم سے رابطہ کروں گی۔ ابھی میں بہت اپ سیٹ ہوں۔''

اس نے حکم دیا ''گاڑی چلاؤ۔''

وہ گاڑیاں اس کے حکم سے آگے بڑھتی ہوئی اس کوٹھی کے احاطے سے باہر نکل گئیں۔ ایک گھنٹے بعد اس نے اپنی کوٹھی میں پہنچتے ہی شہباز درانی کو دیکھا تو دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی پھر پریشان ہو کر بولی ''مجھے بچاؤ۔ وہ کہہ رہا ہے کہ مجھ پر مصیبت آ رہی ہے۔''

شہباز درانی نے پریشان ہو کر پوچھا ''کس کی بات کر رہی ہو؟ کون تم سے کہہ رہا ہے؟''

''وہی مقدر۔ اس نے ابھی مجھ سے فون پر کہا ہے کہ اس ہفتے مجھ پر جو مصیبت آنے والی تھی وہ آ چکی ہے۔''

''وہ بکواس کرتا ہے۔ تم خیریت سے ہو۔ میری پناہ میں ہو۔ تم پر کوئی مصیبت نہیں آئی ہے۔ اس خبیث کی پیش گوئی کو اپنے دل اور دماغ سے نکال دو۔''

فون کا بزر پھر بولنے لگا۔ دردانہ نے چونک کر اپنے پرس کو دیکھا۔ اس میں سے فون کو نکال کر نمبر پڑھا۔ پریشان ہو کر بولی ''مقدر کا فون ہے۔''

شہباز درانی نے فون کی آواز کا والیوم بڑھا کر کہا ''بات کرو۔''

وہ اس کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر بولی ''ہاں بولو! اب کیا بات ہے؟''

شہباز درانی اس کے کان کے قریب آ گیا تھا اور میری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے کہا ''ایک نہیں کئی بار دیکھ چکی ہو کہ میری پیش گوئی کبھی غلط نہیں ہوتی۔ لہٰذا گھڑی دیکھو' رات کے دس بجے ہیں۔ ٹھیک اب سے بارہ گھنٹے بعد اسی گھر میں تم پر قیامت آنے والی ہے۔''

میں نے یہ کہتے ہی فون بند کر دیا۔ وہ چیخ چیخ کر ہیلو ہیلو کہتی رہی۔ شہباز درانی نے فون اس کے ہاتھ سے لے کر آف کر دیا اور پریشانی سے سوچنے لگا۔ وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی پیش گوئی درست ہوتی ہے۔ میری سمجھ نہیں آرہا ہے کہ اب سے بارہ گھنٹے بعد تم پر کس طرح مصیبت آئے گی؟ کیسے آئے گی؟ کچھ معلوم تو ہونا چاہیے۔“

کیسے معلوم ہوتا؟ پیش آنے والے خوا مخواہ واقعات کا من وعن علم کبھی کسی کو نہیں ہوتا۔

وہ دونوں اپنا سر کھپا رہے تھے۔

☆☆☆

ژنگورارا آگیا۔ وہ شہباز درانی کا دوسرا مہرہ تھا جسے میرے خلاف استعمال کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ اس نے رات نو بجے شہباز کو فون پر اطلاع دی۔ ”ویل مسٹر درانی! میں یہاں آگیا ہوں۔ ہوٹل شیرٹن میں ہوں۔“

”ویل کم مسٹر ژنگورارا! میں بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کیا ابھی ملاقات کے لیے آسکو گے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”واقعی بے چین ہو۔ یہ تو سوچو لمبے سفر سے تھکا ہوا ہوں۔ کچھ آرام کرلوں۔ آج رات ذرا عیاشی ہو جائے۔ بھئی! یہاں آتے ہی کیا چیز دیکھی ہے۔ چاند کو پہلی بار زمین پر اترتے دیکھا ہے۔ آج تو مجھے معاف کرو۔ کل صبح ٹھیک دس بجے تمہارے سامنے حاضر ہو جاؤں گا۔“

”مسٹر! تم میرے کام سے آئے ہو۔ عیاشی میں پڑو گے تو مقدر حیات تمہیں کچا نگل جائے گا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میرے سامنے آکر سانسیں لینے کے قابل رہے گا‘ تب مجھے ہاتھ لگا سکے گا نا؟ میں سارے انتظامات کر کے آیا ہوں۔ آج اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں تم سے کہہ چکا ہوں‘ اسے زندہ رکھنا ہے۔ میں اس کی اصلیت اور اس کی کمزوریاں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”ایسی معلومات کا وقت گزر چکا ہے۔ میرے ایک پراسرار علم نے بتایا ہے کہ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ آج رات وہ حرام موت مارا جائے گا۔“

”اوہ گاڈ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ دشمن تمہاری نیندیں حرام کر رہا ہے۔ اسے مر جانے دو۔“

ہاں‘ اگر مرتا ہے تو مر جائے۔ لیکن وہ بڑا ہی چالباز اور خطرناک ہے۔ بچ بھی سکتا ہے۔“

”موت سے آج تک کوئی شہزور‘ کوئی چالباز نہیں بچ سکا۔ وہ بھی نہیں بچے گا۔ میرا علم کبھی غلط پیش گوئی نہیں کرتا۔ آج رات بارہ بج کر پانچ منٹ پر میں تمہیں اس کے مرنے کی خوش خبری سناؤں گا۔“

”میں نے تمہیں پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تمہاری پیش گوئی درست ہوئی تو میں تمہیں دس لاکھ روپے دوں گا۔“

”تو پھر دس لاکھ روپے میرے ہو چکے۔ اب بارہ بج کر پانچ منٹ پر بات ہوگی۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ڈائننگ ہال کی ایک میز سے لگا بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے پاس آکر پوچھا ”کیا میں یہاں پانچ منٹ کے لیے بیٹھ سکتا ہوں؟“

اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر کہا ”بیٹھ جاؤ۔“

وہ ساؤتھ افریقا کا ایک سیاہ فام باشندہ تھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اس نے چوٹی گوندھ کر اس کے آخری سرے پر سرخ رنگ کی ربن باندھی ہوئی تھی۔ گہرے رنگ کا پاجامہ اور گیروے رنگ کا لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا تھی اور ایک لاکٹ میں بہت بڑی خوبصورت سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ اس کی دسوں انگلیوں میں دس انگوٹھیاں تھیں‘ جن میں قیمتی ہیرے اور موتی جڑے ہوئے تھے۔

وہ ڈائننگ ہال کی بالکونی میں سب سے الگ تھلگ ایک بڑی سی میز پر بیٹھا تھا۔ اس میز کے ایک سرے پر اس کا بریف کیس رکھا ہوا تھا۔ میں اسی طرح کیس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ مجھے اپنے پراسرار علم کے ذریعے پہچان گیا ہے لیکن میں نے انجان بن کر کہا ”مسٹر! میں ایک پیشہ ور نجومی ہوں۔ اس بڑے ہوٹل میں غیر ملکوں اور بیرونی ملکوں سے آنے والے دولت مند افراد کے ہاتھ دیکھتا ہوں۔ انہیں ماضی، حال اور مستقبل کی سچی باتیں بتاتا ہوں اور ان سے کچھ انعام حاصل کرتا ہوں۔“

”ہوں۔ تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”اگر آپ کو اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا ہے تو میں حاضر ہوں۔“

اس نے کہا ”یہ تمہارے پاس میرا لیپ ٹاپ کمپیوٹر رکھا ہوا ہے۔ اسے کھولو اور آپریٹ کرو۔“

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کمپیوٹر کو آپریٹ کرنے سے کیسی کیسی باتیں سامنے آئیں گی۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے کھولا۔ اسے آن کیا اور پھر پوچھا ”کونسی فائل کھولوں؟“

اس نے جواباً کہا ”ژنگورارا.....“

میں نے فائل پر اس کا نام پڑھا پھر اسے اوکے کیا۔ دوسرے ہی لمحے میں مونیٹر کی اسکرین پر ایک تحریر ابھری۔ وہاں لکھا ہوا تھا ”جب میں پاکستان کے ایک ہوٹل میں پہنچوں گا تو وہاں ڈائننگ ہال میں میرا وہ شکار خود ہی چل کر میرے سامنے آئے گا جسے قابو میں کرنے کے لیے شہباز درانی نے مجھے بلایا ہے۔“

یہ پڑھ کر میں زیر لب مسکرانے لگا۔ آگے لکھا ہوا تھا ”وہ خود کو ایک پیشہ ور نجومی کی حیثیت سے ظاہر کرے گا اور میرے ہاتھ کی لکیریں پڑھنا چاہے گا۔ بے چارہ مقدر حیات! ابھی بچہ ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں پرانے زمانے کے جادوگروں کی طرح اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں پر چلتا ہوا اس کے پاس آؤں گا۔ اور اسے قابو میں کروں گا۔ نہیں۔ یہ سائنسی ترقی کا انتہائی تیز رفتار زمانہ ہے۔ یہ صدی تمام انسانی ذہانت کو ایک کمپیوٹر میں سمیٹ چکی ہے۔ میں نے بھی جادوئی ہتھکنڈوں کو اور اپنے پراسرار علوم کو اس کمپیوٹر میں سمیٹ لیا ہے۔

اے مقدر حیات! میرے ہاتھوں کی لکیریں پڑھ کر تمہیں جو کچھ معلوم ہوگا وہ یہ کمپیوٹر تمہیں بتا رہا ہے۔ میں بھی کوئی معمولی نجومی نہیں ہوں۔ یوں سمجھو کہ علم نجوم بھی جانتا ہوں اور پراسرار علوم بھی۔ میرے ہاتھ کی لکیروں نے سمجھایا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف دو گھنٹے تک دوستی رہے گی۔ رات کے بارہ بجے مقدر اپنا آخری فیصلہ سنائے گا اور پھر ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔“

میں نے وہ تحریر پڑھنے کے بعد اسے دیکھا۔ زیر لب مسکرایا پھر کہا ”تمہاری یہ سائنٹیفک جادوگری بہت پسند آئی۔ میں بہت متاثر ہو رہا ہوں۔“

اس نے میری طرف جھکتے ہوئے پوچھا ”تو پھر ہماری دو گھنٹے کی دوستی کے متعلق کیا خیال ہے؟“

”جب مقدر کو یہ منظور ہے تو پھر مجھے بھی منظور ہے۔ ہم کتنی بھی سائنسی ترقی کر لیں ہمیں قدرتی حالات کی روانی میں بہنا پڑتا ہے۔ ہم دونوں مقدر کے فیصلے کے مطابق حالات کے دھارے میں بہتے رہیں گے۔“

اس نے بڑی سفاکی سے مسکراتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ اسی لمحے ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ آکر ہمارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں اپنے بارے میں بتا چکا ہوں کہ اس دنیا کی ہر ذی روح کی ہتھیلی پر کھڑا رہتا ہوں۔ اس کی ہتھیلی بھی میرے قدموں تلے تھی۔ اس کا نام عرصہ تھا۔ بڑا ہی منفرد نام تھا۔ وہ ایسی ہی تھی کہ سمجھنے والے اسے ایک عرصے میں بھی سمجھ نہیں پاتے تھے۔ ژنگورارا اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھ گیا پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا ”ویل کم عرصہ!“

عرصہ نے اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سحر زدہ ہے اور حقیقت یہی تھی کہ وہ ژنگورارا کے کسی پراسرار عمل کے شکنجے میں تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا ”مسٹر مقدر! تمہارا پاکستان بہت خوبصورت ہے۔ یہاں آتے ہی اس کے حسن و شباب نے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس سے ملو‘ اس کا نام عرصہ حیات ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ تمہارے نام کے آخر میں بھی لفظ ’حیات‘ آتا ہے۔“

میں نے کہا ”ژنگورارا! اس بات کو یوں سمجھو کہ بہن اور بھائی اپنے اپنے نام کے آخر میں اپنے باپ کا نام ضرور لگاتے ہیں۔ میرے باپ کا نام فلک سکندر حیات تھا۔ اس کے باپ کا نام بھی حیات ہی ہوگا تب ہی یہ عرصہ حیات کہلاتی ہے اور میں مقدر حیات۔ میں اسے نہیں جانتا لیکن نام کے حوالے سے یہ میری بہن ہے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا ”میری تمہاری دوستی تو دو گھنٹے کی ہے۔ اس کے بعد تمہاری بہن سے صبح تک میری دوستی رہے گی۔“

یہ کہہ کر وہ قہقہہ لگانے لگا۔ میں اسے گہری سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بہت ہی زہریلی بات کہی تھی۔ مجھے اس بات کو فی الحال برداشت کرنا تھا۔ اس نے کہا ”اپنی بہن سے مصافحہ نہیں کرو گے؟“

میں نے عرصہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا پھر ہاتھ سے ہاتھ ملتے ہی‘ مصافحہ کرتے ہی عرصہ کو یوں لگا جیسے اس کا مقدر جاگ رہا ہو۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”ڈونٹ وری۔ تم بالکل سہی جگہ پہنچی ہو، بیٹھ جاؤ۔“

ہم سب اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ویٹر نے مینو لا کر ہمارے سامنے رکھا۔ ژنگورارا نے کہا ”میں اور عرصہ کھانے کا آرڈر دیتے ہیں۔ تب تک تم اس کمپیوٹر کے ذریعے عرصہ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہو۔“

میں کمپیوٹر کو آپریٹ کرتے ہوئے عرصہ کے متعلق پڑھنے لگا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت ہی پسماندہ علاقے میں رہتی تھی۔ اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا کہ گدڑی میں لعل اسی طرح ہوا کرتے ہیں۔ اس کا باپ بوڑھا اور معذور تھا۔ ماں کپڑے سلائی کرتی تھی۔ بہنیں ٹیوشن پڑھایا کرتی تھیں۔ ایک بھائی بے روزگار تھا۔ دوسرا

بھائی ہڈحرام تھا۔

عرصہ ایک ایسے کالج میں پڑھتی تھی' جسے ایک مل اونر لاکھوں روپے عطیہ کے طور پر دیا کرتا تھا۔ اس نے کالج کے ایک فنکشن میں عرصہ کو نعت پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اس نے اپنے چمچوں کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ ایک چمچے نے آکر کہا ''وہ غریب ہے اور بہت ہی حیا والی ہے۔ آپ اسے ہزاروں روپے میں خریدنا چاہتے ہیں۔ وہ لاکھوں میں بھی بکنے والی نہیں ہے۔''

دولت کا کمال یہ ہے کہ وہ دولت مند کو شکار کھیلنے کی آسانیاں فراہم کردیتی ہے۔ ژنگورارا کے کمپیوٹر نے صرف اتنا ہی بتایا کہ وہ حالات سے مجبور ہوکر بکنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ حقیقت میں جانتا تھا کہ عرصہ اور اس کے گھر والوں پر ایک ایسی قیامت گزری تھی کہ وہ مجبور ہوکر اس مہنگے ہوٹل میں خود کو فروخت کرنے آگئی تھی۔

میں اس کی اصل ہسٹری بعد میں بیان کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی بتا رہا ہوں جتنا کہ ژنگورارا کا کمپیوٹر مجھے بتا رہا تھا۔ اس مل اونر کا چمچہ عرصہ کو سجا سنوار کر اس ہوٹل میں لایا تھا۔ ایسے ہی وقت ژنگورارا نے اسے دیکھا تو ہزار جان سے اس پر عاشق ہوگیا۔

اس نے پراسرار عمل کے ذریعے اس مل اونر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ سحرزدہ ہوکر اس کے قدموں میں آگیا۔ اس کے ساتھ عرصہ بھی آئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ مل اونر اس کے کمرے سے باہر آیا تو وہ پوری طرح سحرزدہ تھا۔ ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ اپنے ہوٹل والے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ کر گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ عرصہ بھی سحرزدہ ہوکر ژنگورارا کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا ''ابھی میں تمہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ میں اپنے پراسرار علم پر عمل کرتے ہوئے ایک ایک لمحے کا حساب رکھتا ہوں۔ اس وقت مجھے ڈائننگ حال میں جانا ہے۔ وہاں ایسے دشمن سے ملنا ہے جس سے میری دو گھنٹے تک دوستی رہے گی۔ ہم اس کے ساتھ کہیں جائیں گے۔ اس کے بعد اس کمرے میں واپس آئیں گے۔ میں نیچے ڈائننگ ہال میں جا رہا ہوں۔ تم آدھے گھنٹے بعد چلی آنا۔''

میں نے کمپیوٹر کو آف کردیا۔ ویٹر میز پر کھانے کی ڈشیں لاکر رکھ رہا تھا۔ عرصہ اس کی ہدایت کے مطابق وہاں آگئی تھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ژنگورارا نے مجھ سے کہا ''کھانا شروع کرو۔ ہماری دو گھنٹے کی دوستی میں یہ ہمارا پہلا اور آخری کھانا ہے۔''

ہم سب نے کھانا شروع کیا۔ اس نے پوچھا ''تم شہباز درانی سے دشمنی کیوں کررہے ہو؟''

میں نے کہا ''دشمنی میں نے نہیں' اس نے شروع کی ہے۔''

''وہ تمہاری اصلیت معلوم کرنا چاہتا ہے۔ پورے یقین سے کہتا ہے کہ تم صرف نجومی نہیں ہو بلکہ پراسرار علوم میں بھی مہارت رکھتے ہو۔ اسے اپنی اصلیت کیوں نہیں بتا دیتے؟''

میں نے کہا ''ہم مسلمان ہیں۔ نہ کالا علم سیکھتے ہیں نہ ایسا کوئی کالا عمل کسی پر کرتے ہیں۔ جو سچ ہے وہ میں نے اس سے کہہ دیا تھا لیکن وہ یقین نہیں کررہا ہے۔''

اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا ''میں مان رہا ہوں کہ تم کوئی پراسرار علم نہیں جانتے ہو۔ اگر جانتے تو مجھ سے دو گھنٹے کی دوستی کبھی نہ کرتے۔ تم بہت اچھے دوست بن سکتے ہو مگر افسوس کہ ہمارے مقدر میں یہی دو گھنٹے کی دوستی لکھی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا ''تم نجومی بھی ہو۔ تم نے اپنے ہاتھ کی لکیریں پڑھی ہوں گی۔''

''بے شک پڑھی ہیں' تب ہی میں اتنے اعتماد سے یہاں آیا ہوں اور تم سے دوستی کررہا ہوں۔''

میں نے پوچھا ''تمہاری زندگی کی لکیر کیا کہہ رہی ہے؟''

وہ کھاتے کھاتے رک گیا۔ اس نے پہلی بار مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا ''تم میری زندگی کی لکیر کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا ''تم نجومی ہو اور میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا ہوں کہ تم میرا ہاتھ کیوں نہیں پڑھ رہے ہو؟ اپنا ہاتھ مجھے کیوں نہیں پڑھنے دیتے؟ زندگی کی لکیر مجھے الجھا رہی ہے اور میں تمہاری زندگی کی لکیر پڑھنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہنسنے لگا پھر بولا ''تمہارا ہاتھ کبھی نہیں پڑھوں گا۔''

میں نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا ''کیوں نہیں پڑھو گے؟''

''میرے ایک پراسرار علم نے مجھے منع کیا ہے کہ آج میں کسی کا ہاتھ نہ پڑھوں اور کسی کی ذاتی زندگی میں جھانک کر نہ دیکھوں۔''

میں نے تائید میں سر ہلا کر کہا ''کبھی کبھی بڑی مہارت رکھنے والوں پر بھی آگہی کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔''

''میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھ پر بھی آگہی کے دروازے بند نہیں ہوئے۔ البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ

جب میں کوئی بڑی واردات کرنے نکلتا ہوں تو میری زندگی کی لکیر ایک ذرا دھندلا جاتی ہے۔ ان حالات میں میرا پراسرار علم کہتا ہے' مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے اور میں پریشان نہیں ہوتا۔ جہاں بھی جاتا ہوں کامیابی سے واردات کرکے واپس چلا آتا ہوں اور زندہ سلامت رہتا ہوں۔''

میں نے کہا ''ہاتھ کی لکیریں بڑی بے ایمان ہوتی ہیں۔ کہتی کچھ ہیں لیکن کبھی کبھی کچھ اور ہوجاتا ہے۔ تب ہی انسان مانتا ہے کہ قدرت کے بدلتے ہوئے مزاج کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا۔''

ہم کھانے سے فارغ ہوگئے۔ وہ بولا ''گیارہ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ اب ہماری دوستی کے صرف پینتالیس منٹ رہ گئے ہیں۔ کھانے کے بعد چہل قدمی ضروری ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہم ساحل پر چلیں؟''

میں نے مسکرا کر کہا ''دوستی کا تقاضا ہے کہ دوست کی بات مان لی جائے۔ آؤ چلتے ہیں۔''

ہم ہوٹل سے باہر آئے۔

میں نے کہا ''میرے پاس اپنی کار ہے لہٰذا میری ہی کار میں چلو۔''

وہ میرے ساتھ اگلی سیٹ پر آگیا۔ ایک عامل کی حیثیت سے عرصہ کو حکم دیا کہ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائے۔ وہ بے چاری عرزدہ تھی۔ اس کے حکم کے مطابق پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم سمندر کی طرف چل دیے۔

سمندر بہت گہرا ہوتا ہے لیکن ہاتھ کی لکیروں سے زیادہ گہرا نہیں ہوتا کیونکہ ان لکیروں کے پیچھے قدرت کی گہرائیاں ہوتی ہیں۔ ان گہرائیوں میں ڈوبتے رہو، الجھتے رہو، بدحواس ہوتے رہو، یا ہوش وحواس سے کام لیتے رہو' کچھ بھی کرتے رہو پھر بھی قدرت کے بھید سمجھ میں نہیں آتے۔

ہم سمندر کے ایک ویران ساحل پر پہنچ گئے۔ اس خطرناک جادوگر دوج ڈاکٹر ژنگورارا کو قدرت کے کچھ بھید سمجھانے کا وقت آگیا تھا۔ ہم دونوں کار سے باہر نکل آئے۔ اس نے عرصہ کو بھی باہر آنے کا حکم دیا۔ چاندنی رات میں سمندر کی لہریں شور مچا رہی تھیں۔ زندگی کی طرح اچھلتی کودتی، شور مچاتی، دوڑتی ہوئی ساحل پر آرہی تھیں پھر وہاں پہنچ کر دم توڑ رہی تھیں۔ ژنگورارا نے مجھ سے کہا ''گھڑی میں وقت دیکھو۔''

میں نے وقت دیکھتے ہوئے کہا ''صرف نو منٹ رہ گئے ہیں۔ نو منٹ کے بعد ہماری دوستی کی مدت ختم ہوجائے گی۔''

وہ مسکرا کر بولا ''شہباز درانی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہاری اصلیت اور کمزوریاں معلوم کروں لیکن میرے علم نے بتایا کہ معلومات ضروری نہیں ہیں۔ تمہاری موت ایک لڑکی کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے اور یہ لڑکی ہمارے درمیان کھڑی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا ''تم علم نجوم کے ذریعے اور مختلف پراسرار علوم کے ذریعے بہت کچھ معلوم کرتے رہے لیکن افسوس سب کچھ معلوم نہ کرسکے۔''

اپنا اپنا ظرف

مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے وزیر اعظم عبدالرحیم خانخانان اپنی دریا دلی اور سخاوت کے لیے بہت مشہور تھے۔ دربار شاہی کی طرف سے انہیں منعم خان کا خطاب بھی عطا ہوا تھا (منعم یعنی سخی دولت مند) ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ شاہی مہم کے سلسلے میں دہلی سے دکن کی طرف مع لاؤلشکر اور خدم وحشم جارہے تھے۔ شام ہوئی تو ایک بڑے کھلے میدان میں پڑاؤ کیا۔ خیمے لگنے شروع ہوگئے۔ عنبر وعطر کا چھڑکاؤ ہوا۔ منعم خان کھلی فضا میں بیٹھ کر موسم کی رنگینی کا مزہ لینے لگے۔ اتفاقاً ایک فقیر ادھر سے یہ شعر پڑھتا گزرا

منعم بہ دشت وکوہ و بیاباں غریب نیست
ہرجا کہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

یعنی منعم تو کسی دشت وبیابان اور پہاڑ میں بھی پردیسی نہیں ہوتا۔ وہ جہاں کہیں جاتا ہے اس کے لیے خیمہ لگ جاتا ہے اور بارگاہ تیار ہوجاتی ہے

منعم خان نے فقیر کو طلب کیا۔ اس سے شعر کو دوبارہ سنا، پسند کیا اور فقیر کو ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔ دوسری شام پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ منعم خان نے فقیر کو پھر ایک لاکھ روپیہ دیا۔ سات دن تک یہی ہوتا رہا۔ فقیر کو سات لاکھ روپے حاصل ہوگئے۔ اب اس نے سوچا کہ رئیس آدمی ہے کیا پتا کب غضب ناک ہوجائے اور جو کچھ دیا ہے وہ بھی ضبط کرلے لہٰذا جو مل گیا ہے اسی پر قانع ہوجانا بہتر ہے۔ چنانچہ آٹھویں شام فقیر نہیں آیا۔ منعم خان نے کافی دیر انتظار کیا پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ فقیر دل کا کمزور تھا۔ برداشت نہ کرسکا بھاگ کھڑا ہوا حالانکہ میرا سفر بائیس دن کا تھا اور میں نے دوسرے ہی روز فقیر کے نام سے بائیس لاکھ روپے الگ رکھ لیے تھے۔

مرسلہ: سید قمر عباس زیدی، خیرپور

اس نے اپنے لباس میں سے ایک ریوالور نکالتے ہوئے کہا ''اس کی ایک گولی چلے گی تو سب کچھ کیا' کچھ بھی معلوم کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔''

اس نے عرصہ کے پاس آکر ریوالور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''جب میں تمہیں حکم دوں تو تم اسے گولی مار دینا۔ ٹھیک بارہ بجے۔''

وہ اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا ''اور ابھی بارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔''

میں نے کہا ''پانچ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ میرے ہاتھ کی لکیریں پڑھ لو۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا ''میں اتنا نادان نہیں ہوں۔ میرے پراسرار علم نے سمجھا دیا ہے کہ آج کسی کا ہاتھ نہیں دیکھنا ہے اور کسی کی ذاتی زندگی میں جھانک کر بھی نہیں دیکھنا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ تمہارے پراسرار علم نے تمہیں نہیں سمجھایا ہے بلکہ مقدر نے چپکے سے تمہارے کان میں اور تمہارے دماغ میں یہ بات پھونک دی ہے کہ تمہیں کسی کا ہاتھ نہیں دیکھنا چاہیے۔ اگر دیکھ لو گے تو موت سے پہلے تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔''

''تمہاری دلیری کی داد دینی چاہیے۔ گن پوائنٹ پر کھڑے ہوئے ہو۔ موت آنے والی ہے پھر بھی بڑھ بڑھ کر بول رہے ہو۔''

''اور جو بول رہا ہوں اسے تم سمجھ نہیں پا رہے ہو۔ تمہیں بے شمار علوم میں مہارت رکھنے کا گھمنڈ ہے لیکن تمہارے کسی پراسرار علم نے یہ نہیں بتایا کہ میرے ہاتھ کی لکیریں یہی کہہ رہی ہیں کہ میں ابھی مرنے والا نہیں ہوں کیونکہ تم مرنے والے ہو۔ میں تمہارا مقدر ہوں۔ دو گھنٹے تک تمہارا دوست رہا۔ تمہارا دشمن بھی ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ جنم لیا ہے اور اب تمہارے ساتھ مرنے والا ہوں۔''

میں نے اس کی طرف ہتھیلی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے ہاتھ کی لکیریں میری اس ہتھیلی پر ہیں۔ ہم دونوں کی زندگی کی لکیریں ایک ہی ہیں اور یہ ایک لکیر کہہ رہی ہے کہ ہم دونوں کا وقت پورا ہو چکا ہے۔''

وہ حقارت سے بولا ''تمہاری یہ بکواس ناقابلِ فہم ہے۔''

''مقدر ہوتا ہی ناقابلِ فہم ہے۔ تم نے عرصہ کو اپنے سحر میں گرفتار کیا تھا اور یہ نہیں جانتے تھے کہ مقدر اس سحر کو پائیدار نہیں رہنے دے گا اور اب یہی ہو رہا ہے' یہ تمہارے شکنجے سے نکل چکی ہے۔''

وہ ایک دم سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ عرصہ آہستہ آہستہ اس کی طرف گھوم رہی تھی اور ریوالور کا رخ اسی کی طرف ہو رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر بولا ''یہ کیا کر رہی ہو؟ میں حکم دیتا ہوں مقدر حیات کو گولی مارو۔''

میں نے کہا ''ٹھیک بارہ بجے ہم دونوں کی موت ہوگی اور ابھی بارہ بجنے میں ایک منٹ اور سات سیکنڈ رہ گئے ہیں۔ تم اپنے بچاؤ کے لیے منتر پڑھنا چاہتے ہو لیکن بھول رہے ہو کیونکہ موت کے سامنے حافظہ کمزور ہو جاتا ہے۔ تم یاد کرتے رہو' تمہیں کالے علم کا کوئی منتر یاد نہیں آئے گا۔''

وہ کوئی منتر یاد نہ کر سکا۔ جھنجلا کر عرصہ سے ریوالور چھیننا چاہتا تھا۔ میں نے گھوم کر ایک کک ماری۔ اس کے منہ پر لات پڑی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ چکرانا تو تھا ہی مقدر نے اسے آخری ٹھوکر ماری تھی۔ وقت ایک ایک سیکنڈ کے حساب سے گزرتا جاتا ہے۔ اس نے دو گھنٹے کی دوستی کا وقت مقرر کیا تھا۔ وہ وقت گزر گیا۔ اس کے باوجود ہم دونوں ہم سفر تھے۔ ہم نے ایک ساتھ جنم لیا تھا اور ایک ساتھ مرنے والے تھے۔

ان لمحات میں عرصہ کے دماغ میں یہ بات گونج رہی تھی کہ وہ جادوگر اسے سحر زدہ کر کے اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا اور اب اپنی عزت بچانے اور اس سے انتقام لینے کا موقع آگیا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ ٹھائیں سے گولی چلی اور اس وچ ڈاکٹر کے سینے کے آر پار ہو گئی۔ سینے میں جہاں سوراخ ہوا وہاں سے خون کا فوارہ نکلنے لگا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ اس ہتھیلی پر اس کی زندگی کی، اس کی قسمت کی، اس کے دل کی، اس کے دماغ کی تمام لکیریں مٹ رہی تھیں۔ ادھر اس نے دم توڑا' ادھر میری ہتھیلی سے اس کی تمام لکیریں مٹ گئیں۔ اس کا جو مقدر تھا' وہ میری ہتھیلی سے ہمیشہ کے لیے مر چکا تھا۔ ہائے! میں کیا ہوں؟

اک بازی گر ہوں
ہاتھوں کی لکیروں پر
تمہارا ہم سفر ہوں
تمہارا دوست بھی ہوں
اور دشمن بھی
تمہارے ساتھ جنم لیتا ہوں
تمہارے ساتھ ہی مر جاتا ہوں
مقدر ہوں۔ میں مقدر ہوں
اک بازی گر ہوں۔

جاری ہے

سرمایہ دار مفلس

محترم معراج رسول صاحب، آداب!

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا مگر ہم میں سے بعض کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر گھٹیا ترین حیوان بھی شرمائے۔ میری طرح کچھ لوگوں کو بعد میں پچھتاوا بھی ہوتا ہے، مگر کس کام کا؟ میں تو اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ خدا پھر بھی مجھ جیسے گھٹیا لوگوں کو زندگی اور رزق دیتا ہے، شاید اپنی حرکتوں پر ندامت اور دوسروں کے لئے عبرت کی خاطر۔ میں اس قادرِ مطلق سے ہر لمحہ معافی مانگتا رہتا ہوں اور آپ سب سے بھی التجا ہے کہ میرے لئے دعا کیا کریں۔

انتہائی نالائق

جاوید، کراچی

میں اپنے دادا کی جائداد کا اکیلا حق دار تھا لیکن ایم۔ اے کرنے کے بعد معمولی سی نوکری کے لیے ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ دادا کے پاس بے پناہ دولت تھی جس کے باوجود مجھے حکم ملا تھا کہ پہلے نوکری کر کے دکھاؤں، اس کے بعد وہ اپنی جائداد میرے نام کریں گے۔ بلکہ بقول ان کے کاغذات تیار کر کے بینک میں رکھ دیے ہیں، صرف دستخط کریں گے۔ اگر مر گئے تو سب کچھ خود بہ خود میرے نام ہو جائے گا۔ اب یا تو میں ان کے مرنے کا انتظار کرتا یا نوکری ڈھونڈتا۔ لہٰذا میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ نوکری ڈھونڈوں۔

میں نے اپنے ہوش کی پہلی نظر دادا پر ہی ڈالی تھی۔ میری والدہ میری پیدائش کے چند دن بعد ہی انتقال کر گئی تھیں اور والد ان کی موت سے ایسے دل برداشتہ ہوئے تھے کہ اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے۔ اسی دیوانگی میں گھر سے ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کہاں گئے۔ دادا کی دولت بھی انہیں نہ روک سکی جس کے وہ وارث تھے۔ اس طرح وہ تمام دولت جو میرے والد کو منتقل ہوتی، میرے دادا کے پاس رہی۔ دادا کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے پالا پوسا، تعلیم دلائی۔ ان کے احسانات اپنی جگہ لیکن ان کی کنجوسی پر غصہ بھی آتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت تو بہت ہی غصہ آیا جب انہوں نے نوکری کرنے کا حکم صادر کیا۔ مرتا کیا نہ کرتا نوکری ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔

میں نے یہ سوچ کر نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی کہ ذرا سی تگ و دو کے بعد دادا کی شرط پوری ہو جائے گی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ نوکری ڈھونڈنا لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے۔ اخباروں میں اشتہار دیکھے، دوستوں کی مدد لی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ بار بار دادا سے کہا کہ مجھے کوئی بزنس کرا دیں لیکن وہ ایک پیسا مجھ پر خرچ کرنے کے حق میں نہیں تھے اور مصیبت یہ تھی کہ اپنے تعلقات تک استعمال کرنے کے حق میں نہیں تھے جو کچھ کرنا تھا مجھے خود اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔

میں نوکری کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا کہ میری ملاقات تانیہ سے ہو گئی۔ وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی پھر میں یونیورسٹی چلا گیا۔ وہ غریب گھر کی لڑکی تھی اس لیے شاید تعلیم جاری نہ رکھ سکی تھی۔ میری اس سے ایسی دوستی نہیں تھی کہ میں یہ سوچتا کہ وہ کہاں گئی۔ بہت سی لڑکیاں ساتھ پڑھتی ہیں، ان ہی میں سے ایک وہ بھی تھی۔ کالج میں اس سے محض شناسائی تھی لیکن اس روز وہ اچانک سرِ راہ مل گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا، اسی نے مجھے پہچان لیا اور اس کی ہمت کہ مجھے مخاطب بھی کر لیا۔

''ہیلو، آپ جاوید ہی ہیں نا؟''

''ارے تم۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم میرے ساتھ.....''

''کالج میں پڑھتی تھی اور میرا نام تانیہ ہے۔''

''تم مجھے مزید شرمندہ مت کرو۔ تمہارا نام مجھے یاد ہے۔''

''چھوڑیے جناب۔ میری صورت تک تو آپ کو یاد نہیں تھی نام کیا خاک یاد ہوتا۔''

''ہم ملے بھی تو پورے پانچ سال بعد ہیں۔اور سناؤ کیا حال ہے۔''

''یہ کیا طریقہ ہے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہو۔ چلو کسی جگہ بیٹھ کر کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔''

اس کی اس پیش کش پر میں پریشان ہو گیا۔ میری جیب میں اس وقت اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں اس کے ساتھ کسی قاعدے کی جگہ بیٹھ سکتا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کوئی جگہ طے کر لیں اور کل وہاں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں؟''

''کل کیوں، آج کیوں نہیں؟''

''میرے دادا کی طبیعت بہت خراب ہے اور مجھے فوراً گھر پہنچنا ہے۔''

''کل اسی وقت میں آپ کو اسی جگہ مل جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ضرور آ جانا۔''

میں نے جیسے تیسے پیچھا چھڑایا اور کچھ دور چل کر اپنی کھٹارا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ غضب خدا کا، جس کے دادا کی پانچ سو ایکڑ زمین ہو، کئی فلیٹ کرائے پر ہوں وہ ایسی گاڑی میں بیٹھا ہے۔ اگر دادا اپنی جائداد کا آدھا حصہ بھی مجھے دے دیں تو نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں گھر پہنچا تو دادا میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی جیسے کہہ رہے ہوں آج بھی نامراد لوٹے ہو۔

''کیا ہوا، کہیں ملی نوکری؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں ملی اور شاید ملے گی بھی نہیں۔'' میں نے غصے میں کہا۔

''انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہیے۔کوشش کرتے رہو۔''

''دادا جان، آپ آخر اتنے ظالم کیوں ہو گئے ہیں۔ میں آپ سے اپنا حصہ نہیں مانگ رہا ہوں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کوئی کاروبار کرا دیں۔''

''کاروبار تمہارے بس کا نہیں ہے برخوردار، پیسے بھی ضائع کرو گے۔نوکری ڈھونڈو۔''

''سفارش کے بغیر کوئی نوکری نہیں ملے گی۔''

''میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔دنیا سے خود لڑو۔''

''دادا جان، کچھ تو کریں۔''

''ملازم سے کہو میرے لیے چائے بنا کر لائے۔سر میں درد ہو رہا ہے۔''

''ملازم کیوں، آپ کے لیے چائے میں بناتا ہوں۔''

''زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔''

میں جب بھی ان کی کوئی خدمت کرنا چاہتا تھا وہ اسے خوشامد ہی سے تعبیر کرتے تھے اور اس وقت تو میں واقعی خوشامد کر رہا تھا۔ خدمت وغیرہ کا کوئی تصور اس وقت ذہن میں تھا ہی نہیں۔ میں نے ملازم سے چائے کے لیے کہہ دیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں پہنچتے ہی مجھے تانیہ کا خیال آ گیا۔ اس سے میری کوئی دوستی نہیں تھی کہ اس کی یاد مجھے بے چین کر دیتی۔ خیال بھی محض اسی لیے آ گیا تھا کہ اس کے سامنے میری بے عزتی ہوئی ہے۔ وہ بھی کیا سوچتی ہو گی کہ میں نے اسے کپ چائے کے لائق بھی نہیں سمجھا۔

میں نے تانیہ سے ملنے کا وعدہ ضرور کر لیا تھا لیکن میں اپنے وعدے میں سنجیدہ نہیں تھا اس سے ملنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ کئی سال بعد ملی تھی، کئی سال بعد پھر مل جائے گی۔ یہی سوچ کر ٹی وی دیکھنے بیٹھ گیا۔

دوسرے دن جب میں نوکری کی تلاش میں گھر سے نکلنے لگا اس وقت بھی یہی سوچا تھا کہ تانیہ سے نہیں ملنا ہے۔ تھوڑے بہت پیسے جیب میں ہیں وہ اس پر کیوں ضائع کروں۔

نوکریوں کے کئی اشتہار میری جیب میں پڑے ہوئے تھے اور ان سب جگہوں پر مجھے جانا تھا۔ میں اپنی کھٹارا گاڑی میں اِدھر سے اُدھر چکر کاٹتا پھرا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ اچانک مجھے تانیہ کا خیال آ گیا۔ اس کو جو وقت دیا تھا اس میں ابھی دو تین گھنٹے باقی تھے۔ میں اتنا تھک گیا تھا کہ اس وقت کہیں بیٹھ کر کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ تانیہ کے لہجے میں کتنی اپنائیت تھی۔ اگر وہ کچھ دیر ساتھ بیٹھ جائے تو تھکن دور ہو جائے۔ اسے یقین بھی آ جائے گا کہ میں نے اس سے بہانہ نہیں کیا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ یہ وقت کہاں گزاروں۔ گھر چلا گیا تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دادا جان دوبارہ گھر سے نکلنے ہی نہ دیں۔ بس یہ سوچ کر گاڑی ایک جگہ پارک کی اور بازار میں پیدل گھومنے لگا۔ بازار اتنا بارونق تھا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میں ایک موہوم سی امید کے ساتھ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں تانیہ نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں موجود تھی۔

''کہاں چلیں؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''وہ سامنے اسنیک بار ہے وہاں چلتے ہیں۔''

''ارے نہیں، اس وقت چائے کا موڈ ہے۔ دن بھر دفتر میں اتنی تھکن ہو جاتی ہے کہ بس۔''

شین

بچو! دیکھنا ذرا یہ شوکت تھانوی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ یہ مزاح نگار ہیں، اگر تم کو ان کے اس خیال پر ہنسی آ گئی تو بھی یہ اس کو اپنی مزاح نگاری کی کرامت ہی سمجھیں گے۔

بچو! یہ شاعر بھی ہیں۔ جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو ہنسی آتی ہے۔ جب مزاحیہ کلام سناتے ہیں تو لوگ عبرت پکڑتے ہیں حالانکہ خود ان کو پکڑ لینا چاہیے۔

بچو! خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر جشنِ نجات مناؤ۔ یہ بہت بدآواز ہیں مگر گا کر شعر سنانے سے باز نہیں آتے۔ دعا کرو ان کی آواز خود ان کے کان میں بھی پہنچ جایا کرے بلکہ اگر صرف ان ہی کے کان میں پہنچا کرے تو بہت اچھا ہے۔

بچو! ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر اگر تم کو ہنسی نہ آئے تو اپنے کو سمجھ دار سمجھنا اور اگر ہنسی آ جائے تو کسی فقیر سے اپنے لیے تعویذ لکھانے کی کوشش کرنا۔

بچو! تم کو نہیں معلوم۔ بات یہ ہے کہ شوکت تھانوی چونکہ باقاعدہ پڑھ نہ سکے، لہٰذا لکھنا شروع کر دیا۔ مگر تم لکھنے کی کوشش نہ کرنا صرف پڑھنے کی کوشش کیے جانا تاکہ شوکت تھانوی بننے سے خدا تم کو محفوظ رکھے۔

بچو! جب تم بڑے ہو کر قانون ساز مجلسوں کے ممبر بننا تو اس قسم کا قانون ضرور بنوانا کہ شوکت تھانوی قسم کے لوگ ''محمد فاضل'' بنے نہ پھریں۔ اس قسم کی جرأت کرنے والوں کے لیے عبرت انگیز سزائیں رکھوانا۔

بچو! بعض لوگ شوکت تھانوی کو مزاح نگار کہتے ہیں اور بعض لوگ طنز نگار اور اس قسم کے لوگ بہت کم ہیں جو طنز اور مزاح کا فرق سمجھ سکیں۔ فرق سمجھتے ہوتے تو طنز نگار کہتے نہ مزاح نگار۔ خود ان کی ذات کو طنز اور مزاح کہتے۔ نگار کی تہمت نہ لگاتے۔

بچو! ان کو دیدۂ عبرت نگاہ سے دیکھو اور یاد رکھو۔

(شوکت تھانوی کی ایک تحریر)

مرسلہ: بابر دین پوری، خان پور کٹورا۔

''تم کہیں کام کرتی ہو؟''

''ہاں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ کیا تم بھی ان دقیانوسی لوگوں میں سے ہو جو لڑکیوں کی ملازمت کو برا سمجھتے ہیں؟''

''برا تو نہیں سمجھتا لیکن یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ لڑکیوں کی وجہ سے بے چارے لڑکے بے روزگار رہ جاتے ہیں۔''

''یہ تو اہلیت کی بات ہے جس میں اہلیت ہو گی اسے نوکری مل جائے گی۔''

''جی نہیں۔ لوگوں کو کام نہیں دفتر کی آرائش چاہیے ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک فیشن بن گیا ہے۔''

''تم تو بہت لڑاکا ہو گئے ہو۔ کہیں بیٹھ کر لڑو بھئی۔''

''ارے ہاں، میں تو بھول ہی گیا تھا۔''

اب اسے کسی ہوٹل تک لے جانے کے لیے گاڑی ضروری ہو گئی تھی۔ میں چاہ تو یہی رہا تھا کہ اپنی گاڑی کا دیدار اسے نہ کراؤں لیکن اب مجبوری تھی۔ میں اس کے ساتھ پیدل چل کر گاڑی تک آیا۔ میں سمجھ رہا تھا وہ میری گاڑی دیکھ کر مایوس ہو گی لیکن شاید اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ میری گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ بیٹھ گئی۔ میں اسے ایک مناسب سے ہوٹل میں لے کر چلا گیا۔ کچھ دیر ہم دونوں کالج کے زمانے کی یادیں تازہ کرتے رہے اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ بھی تو ملازمت کرتی ہے۔ اپنی ملازمت کے بارے میں اس سے بات کروں۔

''تم کہاں جاب کرتی ہو؟''

''تم نے قاضی بلڈرز کا نام سنا ہو گا۔''

''یہ تو بہت مشہور بلڈرز ہیں۔''

''ان کے ہاں اکاؤنٹس کی جاب ہے میری۔''

''تنخواہ تو اچھی خاصی دیتے ہوں گے؟''

''تنخواہ تو زیادہ نہیں لیکن یہ بڑی بات ہے کہ وقت پر مل جاتی ہے ورنہ اس قسم کے لوگ عموماً بڑے نادہند ہوتے ہیں۔''

''تانیہ بات یہ ہے کہ میں بھی ملازمت کی تلاش میں

ہوں۔ اسی لیے تم سے تفصیل معلوم کر رہا ہوں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔ تم اور ملازمت؟ تم تو کالج کے زمانے میں کہا کرتے تھے کہ تمہارے دادا لینڈ لارڈ ہیں۔ تم ان کے اکلوتے پوتے ہو۔ تمہیں نوکری کی کیا ضرورت۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔ دادا کہتے ہیں پہلے نوکری کرو پھر جائداد تمہارے نام منتقل کروں گا۔"

"تو کرلو نوکری۔"

"ملے تو، کروں نا۔ میرے تو بقول شخصے جوتے گھس گئے۔"

"یہ پکی بات ہے کہ نوکری کے بعد ان کی ساری دولت تمہاری ہو جائے گی؟"

"کہہ تو وہ یہی رہے ہیں۔"

"تو پھر اچھی بری کو چھوڑو، کوئی بھی نوکری کرلو۔"

"ہاں، اب تو یہی سوچ رہا ہوں۔ میں نے معیار کے چکر میں بہت وقت ضائع کیا۔"

"تم کہو تو میں اپنے دفتر میں بات کروں؟"

"میرا حساب کتاب بہت کمزور ہے۔ اکاؤنٹس کے معاملات میں کہاں نمٹا سکوں گا۔"

"انگریزی تو اچھی ہے؟"

"ظاہر ہے۔ میں نے ایم۔ اے انگریزی میں کیا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ میں اپنے دفتر میں تمہارے لیے بات کروں گی۔ تم اپنا کنٹیکٹ نمبر دو۔ جیسے ہی کوئی بات بنی، میں تمہیں اطلاع کروں گی۔"

"میری قسمت سے تم بھی لڑکر دیکھ لو۔"

میں نے اسے اپنا نمبر دے دیا اور دل ہی دل میں ہنسنے لگا کہ ایسے وعدے بہت سوں نے کیے لیکن حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں کہ نوکری کتنی مشکل چیز ہے۔ ہم دونوں پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔ اس نے میری پیش کش کے باوجود بس میں جانا مناسب سمجھا۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنا گھر دکھانا نہیں چاہتی۔ میں نے بھی ضد نہیں کی۔ گھر پہنچا تو دادا غصے میں بھرے بیٹھے تھے۔

"اب تک کون سا دفتر کھلا ہوا تھا جو تم نوکری ڈھونڈ رہے تھے۔"

"ایک دوست مل گیا تھا۔ اس سے نوکری کی بات کرنے بیٹھ گیا تھا۔"

"کیا کہا اس نے؟"

"وعدہ تو کیا ہے۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"جلدی گھر آجایا کرو۔ تمہیں معلوم ہے، میں تمہیں زیادہ دیر نہ دیکھوں تو پریشان ہو جاتا ہوں۔"

"آپ کیسے ہیں دادا۔ مجھ سے اتنا پیار بھی کرتے ہیں اور مجھے نوکری کے بکھیڑوں میں بھی پھنسا رہے ہیں۔"

"میں تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں کہ دولت کمانے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب تک یہ نہیں سمجھو گے، دولت کی قدر نہیں سیکھو گے اور میری جمع کی ہوئی دولت اِدھر اُدھر اڑا دو گے۔ بس اب تم جاؤ۔ تھک گئے ہو گے۔ آرام کرو۔"

آرام کیا خاک کرنا تھا۔ ایک مرتبہ پھر ایک لڑکی کے سامنے میری گردن نیچی ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے نوکری ملے گی تو احسان مند ہی ہونا پڑے گا۔ یہ سب دادا کی وجہ سے ہو رہا تھا۔

میں اپنا غصہ اسی طرح اتار سکتا تھا کہ میں نے نوکری کی تلاش ہی ترک کر دی۔ گھر سے نکل ضرور جاتا تھا لیکن ادھر ادھر گھوم پھر کر لوٹ آتا تھا۔ دادا یہی سمجھ رہے تھے کہ میں نوکری ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔

ایک دن میں گھر آیا ہی تھا کہ دادا جان نے مجھے بلایا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ اکثر مجھے بلا لیتے تھے تاکہ تجربات کا رس میرے کانوں میں نچوڑتے تھے۔ موضوع یہی ہوتا تھا کہ کس طرح دولت کمائی اور جمع کی جاتی ہے۔ میں فریش ہو کر ان کے پاس چلا گیا۔

"آؤ برخوردار، آج دن بھر کہاں گھومتے رہے۔" انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"آپ نے جو ذمے داری مجھ پر ڈال دی ہے، اسے پورا کرتا پھر رہا ہوں۔"

"اس کے علاوہ بھی تو کچھ کر رہے ہو؟"

"اور کیا کر سکتا ہوں؟"

"یہی کہ لڑکیوں سے دوستی وغیرہ۔"

"اتنا وقت میرے پاس کہاں ہے۔"

"وقت تو ہے آپ کے پاس۔ آج ہی ایک لڑکی کا فون آیا تھا۔"

"تانیہ ہو گی۔"

"تو کیا تانیہ لڑکی نہیں ہے۔ آواز تو لڑکیوں کی سی تھی۔ کب سے جانتے ہو اسے۔"

"میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔"

"ماشاء اللہ! تو ابھی تک ملنا جلنا ہے۔"

"نہیں، ایک ہفتے پہلے اتفاق سے مل گئی تھی۔ میں نے کہا میں دادا جان کی دولت کے باوجود بے روزگار ہوں تو اس

کو مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لیے نوکری تلاش کرے گی اور فون پر مجھ سے کنٹیکٹ کرے گی۔"

"اس نے کنٹیکٹ کر لیا۔ اس نے پیغام دیا ہے کہ کل شام چار بجے وہ تمہیں اسی جگہ ملے گی جہاں پہلے ملی تھی۔" دادا جان نے کہا "مجھے تم سے یہی کہنا تھا۔ اب تم جاؤ۔ میں ذرا ٹہلنے کے لیے باہر جا رہا ہوں۔"

خاموشی سے اٹھا اور اپنی واحد کائنات اپنے کمرے میں آ گیا۔ اب دادا جان سے زیادہ اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں کتنا بزدل ہوں۔ دادا جان کو چھوڑ کر چلا کیوں نہیں جاتا۔ کچھ دیر بعد مجھے یہ ماننا پڑا کہ دادا کی دولت میرے پیروں کی زنجیر بنی ہوئی ہے۔ دولت کے لالچ میں یہاں پڑا ہوا ہوں۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یہ جواز سوجھ گیا کہ دادا کی دولت پر میرا حق ہے، کوئی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔ اگر یہ دولت میرے والد کو منتقل ہو گئی ہوتی تو مجھے بہ آسانی مل گئی ہوتی۔

دوسرے دن میں تانیہ سے ملا۔ اس کے پاس میرے لیے خوش خبری تھی۔ اس نے اپنی کمپنی میں میرے لیے ملازمت کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ کام اتنا آسان ہو جائے گا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب مجھے دادا کی دولت اپنی جیب میں کھنکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میں اگلے ہی دن تانیہ کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ دفتر بہت صاف ستھرا اور دیدہ زیب تھا۔ میں منیجر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے مجھ سے کچھ ضروری سوالات کیے اور مجھے میرا کام سمجھا دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر وقتی طور پر دکھ ہوا کہ منیجر کی تعلیمی قابلیت مجھ سے بہت کم ہے۔ شخصیت بھی واجبی سی ہے۔ اس کی جگہ مجھے منیجر ہونا چاہیے تھا لیکن میں معمولی سی نوکری کرنے پر مجبور تھا، کیا کرتا۔

میں نے گھر پہنچتے ہی دادا کو خوش خبری سنا دی۔ انہیں خوش ہونا ہی چاہیے تھا۔ انہوں نے مجھے شاباش دی۔ اٹھ کر گلے لگایا اور وہ نسخے بتانے لگے جنہیں استعمال کر کے میں آگے ترقی کر سکتا تھا۔ میں ان کی ہر بات پر سر ہلاتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کون سی ہمیشہ نوکری کرنی ہے۔

میری نوکری بخیر و خوبی چل رہی تھی۔ ایک تنخواہ بھی دادا کے حوالے کر چکا تھا لیکن ابھی تک ان سے جائداد کا تقاضا نہیں کیا تھا۔ میں انہیں اس شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا کہ میں ان کی جائداد پر نظر جمائے بیٹھا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ وہ خود مجھے اس قابل سمجھیں۔ مجھے امید تھی کہ جیسے ہی میری نوکری کو چند مہینے گزریں گے، وہ خود اپنی تحریر کردہ وصیت پر دستخط کر کے میرے حوالے کر دیں گے۔

میں اور تانیہ ایک ہی دفتر میں ہونے کی وجہ سے بہت قریب آ گئے تھے۔ میری اور اس کی میزیں قریب قریب تھیں۔ ویسے بھی لنچ کے لیے ہم دونوں ساتھ باہر جاتے تھے لیکن میں اسے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ ایسی ہی کوئی مجبوری شاید اس کے ساتھ تھی۔

ہماری یہ دوستی بہت جلد محبت کے رشتے میں بدل گئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کالج کے زمانے ہی سے مجھ سے محبت کرتی چلی آئی ہے۔ جس طرح یہ کہانی اس نے مجھے سنائی اور بتایا کہ اس نے مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا اور یہ کہ میری ہی وجہ سے ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کالج میں اسے دوستی تک کے لائق نہیں سمجھا اور وہ محبت کی چنگاری دل میں دبائے بیٹھی رہی۔ میں نے اس کے جذبات کو بھی سمجھا ہی نہیں۔ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا اور اس کے سامنے یہ جھوٹ بولنا پڑا کہ میں بھی اس سے محبت کرتا تھا لیکن کبھی کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔

میں تانیہ کی محبت میں ایسا گم ہوا کہ دادا جان بلکہ یوں کہیے کہ اپنی جائداد تک کو بھول گیا۔ یہ کہنا ہی چھوڑ دیا کہ اب میں نے نوکری کر لی ہے، وہ اپنا وعدہ پورا کریں۔ اب تو میں یہ سوچنے لگا تھا کہ شادی کے وقت دادا جان کی ضرورت پڑے گی اور شادی کے بعد تو وہ میرا حصہ مجھے دے ہی دیں گے۔

تانیہ کی طرف سے شادی کا تقاضا بڑھنے لگا تھا۔ وہ مجھ پر زور دے رہی تھی کہ میں اپنے دادا سے بات کروں اور انہیں رشتے کے لیے اس کے گھر بھیجوں۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر ہمت پکڑ ہی لی۔

"دادا جان، ایک بات پوچھوں؟" میں نے ان کے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔

"پوچھو۔"

"ایک فون آیا تھا نا، تانیہ کا۔ وہ..... وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

"پھر؟"

"دادا جان، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی کا تقاضا اسی کی طرف سے ہوا ہو گا؟"

"جی ہاں۔ جی نہیں۔ میرا مطلب ہے ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کہا تھا۔"

"اس سے شادی مت کرو۔"

"کیوں دادا جان؟"

''جو لوگ احسان کر کے بدلہ چاہتے ہیں وہ کبھی اچھے لوگ نہیں ہوتے۔ وہ لڑکی بھروسے کے لائق نہیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں دادا جان۔ وہ تو کالج کے زمانے سے مجھ سے محبت کرتی ہے۔''

''تم نے یہ تو مجھے نہیں بتایا تھا۔ تم تو کہہ رہے تھے وہ تمہارے ساتھ پڑھتی تھی۔''

''مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔ یہ تو اس نے مجھے اب بتایا ہے کہ وہ مجھ سے خاموش محبت کرتی رہی ہے۔''

''جھوٹی ہے وہ اور بے وقوف ہو تم۔''

اس وقت ان سے بحث کرنا بے کار تھی لیکن یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے نہیں مانیں گے۔ وہ پھر بھی نہیں مانے تو ان کی مرضی کے بغیر ہی شادی کرنی ہوگی۔ میں اس وقت خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گیا۔

اس دن کے بعد سے میں ان کی خوشامد میں لگ گیا۔ رات کو دیر گئے تک ان کی جوانی کے قصے ان کی زبانی سنتا رہتا۔ پھر ایک دن موقع دیکھ کر تانیہ سے شادی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ انہوں نے پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''یہ لڑکی مطلبی ہے۔ میں ملا نہیں ہوں لیکن لالچی لگتی ہے۔ اس سے شادی کا ارادہ ترک کر دو۔''

''دادا جان، عورتیں تو سبھی لالچی ہوتی ہیں مگر تانیہ مطلبی ہرگز نہیں ہے۔''

''خاموش! بے ادب! عورتوں کو تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو؟''

میری جان عجیب مشکل میں تھی۔ ایک طرف تانیہ میری جان کھا رہی تھی دوسری طرف دادا جان تھے کہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ میں نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ برابر ضد کیے جا رہا تھا اور ایک دن معجزہ ہو گیا۔ دادا جان شادی پر تو نہیں لیکن اس کے گھر جانے پر تیار ہو گئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وہ پہلے اس کے گھر والوں سے ملیں گے، اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے۔

''تم نے اس کا گھر دیکھا ہے؟'' ایک دن انہوں نے کہا۔

''اسی سے اس کی شرافت کا اندازہ لگا لیں۔ وہ آج تک مجھے اپنے گھر لے کر نہیں گئی۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ زیادہ تعریفیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل اس کا ایڈریس لے آؤ اور پرسوں مجھے اس کے گھر لے چلنا۔''

میں خوشی کے مارے دادا جان سے لپٹ گیا۔ گرما گرم چائے اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے بنا کر لایا اور ہم دونوں دیر تک تانیہ کی باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اندر سے مان گئے ہیں۔

دوسرے دن میں نے تانیہ کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔ ''نتیجہ ہوتا ہے گھر نہ دکھانے کا۔ تمہارا گھر میں نے دیکھا ہوتا تو آج دادا کو لے کر تمہارے گھر پہنچ جاتا۔''

''تو کیا مان گئے تمہارے دادا؟''

''ایسے ہی نہیں مان گئے جناب۔ تمہاری خاطر پورے دو ہفتوں سے ان کا نوکر بنا ہوا ہوں۔''

''میری خاطر کیوں۔ شادی تو تمہاری بھی ہوگی۔''

''اچھا ایڈریس دو۔ اپنے گھر والوں سے کہہ دینا، کل شام کو لڑکے والے آ رہے ہیں۔''

دوسرے دن دادا جان نے اپنی کب کی رکھی ہوئی شیروانی نکالی۔ خوب بن سنور کر میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ آج ان کے انداز ہی دوسرے تھے۔ فخر سے گردن تنی ہوئی تھی۔ ایک ساتھ دو پان منہ میں دبائے ہوئے تھے۔ ''بھئی، لڑکی والوں کے گھر جا رہے ہیں، کوئی مذاق تو نہیں۔'' انہوں نے پان سے بھرے ہوئے منہ کو بڑی مشکل سے کھولا اور پھر چپ ہو گئے۔

میں تانیہ کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق گاڑی چلاتا رہا۔ میری گاڑی جب گلبرک کے علاقے میں پہنچی تو میں نے ایک دو جگہ رک کر مکان نمبر دریافت کیا اور بالآخر تانیہ کے گھر پہنچ گیا۔

دادا کا ایک اندازہ تو درست نکلا۔ یہ گھر اردگرد کے گھروں کے مقابلے میں بہت معمولی تھا۔ گھر کے اندر پہنچ کر بھی اندازہ ہو گیا کہ گھر کے مکین خوش حال نہیں۔ معمولی سے بھی کم درجے کے لوگ تھے۔ ایسا لگتا تھا، یہ گھر نانیہ کی تنخواہ ہی چل رہا ہے۔ غربت کوئی گالی نہیں اس لیے میں نے کوئی پروا نہیں کی لیکن دادا جان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

تانیہ نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا تھا لہٰذا وہ سب تیار تھے۔ تانیہ کا بھائی آ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی والدہ آ گئیں۔ پھر اس کے والد آ گئے۔ تانیہ کے والد کو دیکھ کر دادا جان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ شاید وہ اسی وقت اٹھ جاتے۔ بہرحال ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تانیہ کو بھی بلا لیا گیا تاکہ دادا جان دیکھ لیں۔

اس کارروائی کے بعد ہم نے ان لوگوں سے اجازت چاہی۔ میں نے دیکھا کہ دادا جان کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا۔ ہر بات کا الٹا جواب دے رہے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ

یہی کیا کرتے تھے۔ یہی ان کی ناراضگی کا اظہار ہوا کرتا تھا۔ میں ابھی سلام دعا میں مصروف تھا کہ وہ گاڑی میں جا کر بیٹھ بھی گئے۔

میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ راستے میں کوئی بات کروں۔ وہ بھی چپ تھے لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اندر ہی اندر کھول رہے ہیں۔ میں آنے والے طوفان سے ڈرتا ہوا گاڑی چلاتا رہا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے۔ گھر پہنچتے ہی لاوا پھوٹ نکلا۔

''یہ تم کس کے گھر لے گئے تھے مجھے۔ تمہیں نہ اپنے معیار کا خیال ہے نہ میری عزت کا۔''

''کیا ہوا دادا جان۔ کیا وہ شریف لوگ نہیں؟''

''شرافت کو لے کر کب تک چاٹو گے۔ پیٹ بھر کے غریب ہے وہ لڑکی۔''

''دادا جان، کیا انسانیت کا معیار امیری ہے۔''

''بالکل۔ یہ غریب لوگ اس طرح دولت والوں کو پھانستے ہیں۔ تم ہرگز یہاں شادی نہیں کرو گے۔''

''دادا جان، میں اسی لڑکی سے شادی کروں گا۔''

''تمہیں معلوم ہے، اس کا باپ کتنا بڑا جھوٹا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں انہیں؟''

''یہ شخص دہلی کا ہے اور اپنے آپ کو علی گڑھ کا بتا رہا تھا صرف اس لیے کہ وہ مجھے پہچان چکا تھا۔''

''اگر وہ پہچان بھی چکے تھے تو اپنا وطن کیوں چھپاتے۔''

''اس لیے کہ یہ شخص میرے گھر میں مالی کا کام کرتا تھا۔ آج بنا بیٹھا ہے عزت دار۔ میں اپنے مالی کی بیٹی سے تمہاری شادی کروں گا؟''

''ہو سکتا ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو کیونکہ کہیں سے یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ آپ کو پہچان چکے ہیں۔''

''اداکاری کر رہا تھا اداکاری۔ بس میں نے کہہ دیا ہے تم وہاں شادی نہیں کرو گے اور اگر کرو گے تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔''

وہ اتنے غصے میں تھے کہ میں نے چپ رہنے ہی میں عافیت سمجھی، حالانکہ میں ان کے خیالات سے قطعاً متفق نہیں تھا۔ اگر تانیہ کے والد مالی تھے بھی تو کیا، غریب بھی تھے تو کیا۔ تانیہ تو مالن نہیں وہ تو پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔

میں دوسرے دن دفتر گیا تو صاف ظاہر تھا کہ وہ دادا کی لگی کو سمجھ چکی ہے۔ وہ اتنی سرد مہری سے ملی کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ دادا جان نے ان لوگوں کی بے عزتی کی تھی، مجھے اس کا احساس تھا۔

''تانیہ، کیا مجھ سے ناراض ہو؟'' میں نے لنچ ٹائم میں اس سے پوچھا۔

''تم سے کیوں ناراض ہوتی مگر تمہارے دادا کے رویے کا دکھ ہے۔''

''ارے یہ بوڑھے لوگ ایسے ہی دقیانوسی ہوتے ہیں۔''

''میرے والد غریب ہیں یہی ان کا قصور ہے۔ غلطی میری ہے کہ میں نے خواب بہت بڑا دیکھ لیا تھا۔''

''بات غربت کی نہیں تانیہ۔ دادا جان کو کسی اور بات پر غصہ ہے۔''

''کس بات پر۔''

''تم یہ بتاؤ تمہارے والد کا تعلق علی گڑھ سے ہے یا دہلی سے۔''

''والد کیا میری تو والدہ بھی علی گڑھ کی ہیں۔''

''تمہارے والد کبھی ملازمت کے سلسلے میں دہلی گئے ہوں؟''

''میرے والد جب پاکستان آئے تو صرف چودہ سال کے تھے۔ دہلی کیا گئے ہوں گے۔ ابو تو یہی بتاتے ہیں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''دادا جان کہتے ہیں تمہارے والد دہلی میں ان کی کوٹھی پر مالی کا کام کرتے تھے۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے ان کا۔ میرے والد پوسٹ آفس میں کلرک تھے۔ وہیں سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ مالی کہاں سے ہو گئے۔''

اس سے بات کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ دادا جان کو غلط فہمی ہوئی ہے پھر بھی میں نے ضروری سمجھا کہ تانیہ کے ابو سے مل کر مزید تحقیق کروں۔ انہوں نے بھی مجھے وہی باتیں بتائیں جو تانیہ بتا چکی تھی۔

انہوں نے مجھے اپنے کئی رشتے داروں سے بھی ملوایا۔ ان سب کا تعلق بھی علی گڑھ سے تھا۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ وہ کبھی دہلی نہیں گئے۔ عمر ہی ایسی تھی کہ ملازمت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں نے دادا جان سے ایک مرتبہ پھر بات کی لیکن میری ہر دلیل ان کی ضد کے سامنے ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ ان کی یادداشت کے سامنے میری ہر دلیل بے کار ہو گئی۔

''اگر وہ مالی نہیں بھی تھے تو تانیہ غریب لڑکی ضرور ہے۔'' انہوں نے زچ ہو کر کہا۔

''اس سے مجھے انکار نہیں لیکن غربت سے کیا ہوتا ہے۔''

''غربت سے کیا ہوتا ہے؟'' انہوں نے میرے فلسفے کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے کہا ''دولت کے بھوکوں کو جب دولت ملتی ہے تو انہیں بدہضمی ہو جاتی ہے۔ اس لڑکی کو تم سے نہیں تمہاری دولت سے پیار ہے۔ تمہیں کسی وقت بھی دھوکا دے جائے گی۔''

''دادا جان، آپ کو کیا۔ اگر وہ دھوکا دے گی تو مجھے دے گی۔''

''تمہارے پاس میری دولت ہوگی جسے لے کر وہ رفو چکر ہو جائے گی۔''

''آپ اپنی دولت اپنے پاس رکھیں۔'' میں نے طیش میں آ کر کہا ''میں غریب بن کر اس سے شادی کروں گا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس دن اسے معلوم ہوگیا تم غریب ہو گئے ہو، وہ شادی سے انکار کر دے گی۔ یہ ہمارا تجربہ ہے۔ تم جیسے گستاخ کے لیے میری دولت میں کوئی حصہ نہیں۔ جب چاہو مجھے چھوڑ کر جا سکتے ہو۔''

میں غصے میں اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس کر رہا تھا۔ دادا جان کو اب منانا فضول تھا۔ اب مجھے دولت اور تانیہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب دادا جان سے الگ ہو کر تانیہ سے شادی کر لوں گا۔ یہ اپنی دولت قبر میں لے کر چلے جائیں۔

مجھے کمرے میں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دادا خود چل کر میرے کمرے میں آئے۔ بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی یہ شفقت دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بھی میرے ساتھ رو رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ سمجھاتے بھی جا رہے تھے۔ اب بھی وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ سارا زور اسی بات پر تھا کہ میں تانیہ سے شادی نہ کروں۔

''میرے بچے! تو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میں تجھے خوش دیکھنا چاہتا ہوں لیکن یہ لڑکی تیری دولت لے کر چلتی بنے گی۔ یہ تو سن لے۔''

میں نے ان کی کسی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ ان کی باتیں میرے دل میں اتر رہی ہیں۔ انہوں نے بڑے پیار سے مجھے بستر پر لیٹنے کا حکم دیا اور کمرے سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں ان کی ذہنی حالت پر غور کرنے لگا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ مجھ سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ انہیں یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ تانیہ سے شادی کے بعد میں ان کا نہیں رہوں گا۔ اسی لیے وہ اپنے آپ سے لڑ رہے ہیں۔ وہ تانیہ سے کیا کسی لڑکی سے بھی میری شادی نہیں ہونے دیں گے۔ تو کیا مجھے اپنی شادی کے لیے ان کی موت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ انتظار مختصر بھی ہو سکتا ہے اور طویل بھی۔ وہ مجھے دولت کی زنجیر سے باندھ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لیے میرا حصہ مجھے نہیں دے رہے ہیں۔ میں ان کی خوشی کے لیے اپنی خوشی برباد نہیں کر سکتا۔ مجھے دولت نہیں چاہیے۔ میں تانیہ سے شادی ضرور کروں گا۔ اس فیصلے پر پہنچ کر ہی مجھے سکون مل گیا۔

دوسرے روز میں نے تمام باتیں تانیہ کو تفصیل سے بتائیں۔ اسے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا کہ میں دولت کو لات مار کر دادا کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کروں گا۔ میرا خیال تھا وہ میری اس قربانی کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گی اور اس فیصلے کو سراہے گی لیکن اس کا ردِعمل دوسرا تھا۔

''یہ نادانی ہرگز مت کرنا۔ تمہارے دادا دودھ دینے والی گائے کی طرح ہیں۔ ان کی لاتیں برداشت کرتے رہو۔ اتنی بڑی دولت چھوڑنا بے وقوفی ہے۔ انسان کو اپنا حق حاصل کرنا چاہیے۔''

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تمہارا خیال چھوڑ دوں؟'' ''میں نے کب کہا؟''

''اس کا تو یہی مطلب ہوا۔ کیونکہ دادا ہرگز نہیں چاہتے کہ میری شادی تم سے ہو۔''

''جاوید، میں انتظار کر لوں گی۔ تم اپنے دادا کو منانے کی کوشش کرتے رہو۔ ہو سکے تو انہیں یہ باور کرا دو کہ تم تانیہ سے شادی نہیں کر رہے ہو تا کہ وہ تمہارا حصہ تمہیں دے دیں۔''

''تانیہ، اس کا مطلب ہے تم مجھ سے نہیں میری دولت سے شادی کر رہی ہو۔''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ ملنے والی دولت میرے نام کر دو۔ یہ دولت تمہارے پاس ہی رہے گی۔ ذرا سوچو، ہمارے پاس دولت ہوگی تو ہمارے بچوں کا مستقبل بہتر ہوگا۔ ہم معمولی تنخواہوں میں کیا کریں گے۔''

''اگر میرے دادا کے پاس دولت نہ ہوتی تو کیا تم مجھ سے شادی کرتیں؟''

''جاوید، اگر تم مجھے لالچی سمجھ رہے ہو تو میں تم سے ابھی شادی کرنے کو تیار ہوں۔ چھوڑ دو اپنے دادا کو۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہاری دولت سے نہیں۔ خدا کے لیے تم غلط مت سمجھو۔''

وہ اتنا روئی کہ میرے لیے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ ہم اس وقت دفتر میں نہیں تھے ورنہ تماشا بن کر رہ جاتے۔

دادا جان کی مہربانیاں مجھ پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ یہ مہربانیاں صرف روپے تک محدود نہیں ورنہ پیسے کے معاملے میں وہ پہلے کی طرح تھے۔ میں نے کئی مرتبہ اشاروں اشاروں میں اپنے حصے کی طرف توجہ دلائی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہیں یقین آ گیا تھا کہ میں نے تانیہ کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ یہ میرے لیے اچھی بات تھی کہ انہیں یقین آ گیا تھا لیکن یہی یقین میرے لیے مصیبت بھی بن گیا۔ اب وہ اصرار کرنے لگے تھے کہ میں ان کے ایک بھولے بسرے دوست کی نواسی سے شادی کرلوں۔ ان کے یہ دوست برسوں سے جنوبی افریقا میں مقیم تھے اور اب ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئے تھے۔ میں نے دادا جان کی زبان سے ان کا تذکرہ تک نہیں سنا تھا لیکن اب وہ تیسرے چوتھے دن آنے لگے تھے۔ دادا جان کا کہنا تھا کہ اس شخص کے پاس بے پناہ دولت ہے۔ اگر تم نے اس کی نواسی سے شادی کرلی تو بہت کچھ ہاتھ لگے گا۔ اب مجھے دادا جان سے نفرت ہونے لگی۔ یہ کیسے دادا ہیں جو مجھے بکاؤ مال سمجھ رہے ہیں۔

''تمہارے باپ کا اور تمہارا حصہ ملا کر بھی تمہیں دیتا تو اتنا نہ ہوتا جتنا اس شادی کے بعد تمہارے ہاتھ آئے گا۔'' ایک دن ان کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

''اس کا مطلب میں یہ لوں کہ میرا حصہ آپ مجھے نہیں دینا چاہتے؟''

''تمہیں میری چند کوڑیوں کی ضرورت ہی کیا رہ جائے گی۔ تم ویسے ہی امیر بن جاؤ گے۔ اپنی دولت سے میں اپنا بڑھاپا کاٹ لوں گا۔''

''دادا جان، تو یہ ہے آپ کی اسکیم۔ لیکن میں اس سودے کے لیے تیار نہیں۔ میں تو اب تک یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ اپنے دوست کی محبت میں مجھے اس کی نواسی سے شادی کے لیے کہہ رہے ہیں مگر آپ تو سودا کر رہے ہیں۔''

''اس میں سودے کی کیا بات ہے۔ میری عقل کی داد کیوں نہیں دیتے۔ میاں، دولت بے وقوفوں کے حصے میں نہیں آتی۔ وہ لڑکی، کیا نام تھا اس کا، تانیہ۔ کیا دیتی تمہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ میں تمہاری زندگی بنانے کی سوچ رہا ہوں اور تم ہو کہ ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتے۔''

''میں نے شادی کا ارادہ ہی ترک کر دیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم ابھی تانیہ کو نہیں بھولے۔''

''آپ یہی سمجھ لیں۔''

''تو جیتے رہو زندگی بھر کلرک۔''

''مجھے نہیں چاہیے آپ کی دولت۔''

''میں نے تمہیں گود کے بچے سے جوانی کی حدود تک پہنچا دیا۔ یہ ہے میری محنت کا صلہ۔''

''کبھی کسی قابل ہوا تو وہ تمام رقم لوٹا دوں گا جو آپ نے مجھ پر خرچ کی ہے۔''

''رقم تو لوٹا دو گے لیکن وہ راتیں کیسے لوٹاؤ گے جو میں نے تمہارے ساتھ جاگ کر گزاری ہیں۔ کیا وہ دن بھی واپس کر سکو گے جو میں نے تمہیں اسکول لانے اور لے جانے اور تمہارے ساتھ بچوں کی طرح کھیل کر گزارے؟'' وہ آبدیدہ ہوگئے۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ان کے قدموں میں بیٹھ کر تانیہ کو مانگا لیکن وہ برابر اپنی ضد پر اڑے رہے کہ میں ان کے دوست کی نواسی سے شادی کروں۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں ان کی اجازت کے بغیر تانیہ سے شادی کرلوں گا۔ دوسرے دن دفتر گیا تو صبح ہی صبح اس نے کہہ دیا کہ وہ آدھے دن کی چھٹی لے لے۔ مجھے [illegible] ضروری بات کرنی ہے۔ ہم دونوں لنچ ٹائم میں دفتر سے اور ایک نسبتاً ویران ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔

''میں نے ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی۔ دادا جان تیار نہیں ہوتے۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ ان کی رضا کے بغیر تم سے شادی کرلوں گا۔''

''تمہارے حصے کا کیا ہوگا؟''

''دادا جان، میرا حصہ مجھے کبھی نہیں دیں گے۔ مجھے تو لگتا ہے میرے والد بھی کسی ایسے ہی صدمے سے دوچار ہو کر ان سے الگ ہوئے ہوں گے۔''

''ہوں۔'' تانیہ نے ایک گہرا سانس لیا ''اب تو مجھے بھی یہ لگنے لگا ہے کہ ان کے مرنے سے پہلے ان کی دولت تمہارے ہاتھ نہیں آ سکتی۔''

''شاید۔'' میں غمگین لہجے میں بولا۔

''یہی میں کہنا چاہتی ہوں۔''

''میں ان کے مرنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میں تم سے ابھی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو جاوید۔ میری بات غور سے سننا۔ بات ذرا کڑوی ہوگی لیکن غور کرو گے تو بھلی لگے گی۔''

''وہ بات بھی کہہ دو۔ ہر بات تو سن رہا ہوں۔''

''کسی فوری ردِعمل کے بجائے سوچ کر جواب دینا۔''

''اب کہہ بھی چکو۔''

''اگر تمہارے دادا جلدی مر جائیں تو؟''

''ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کے خاندان میں عمریں بہت ہوتی ہیں۔ ویسے بھی ان کی صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''اگر وہ کسی حادثاتی موت کا شکار ہو جائیں؟''

''اب حادثے کا انتظار کروں۔ عجیب بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو۔''

''یہ حادثہ تم پیدا کر سکتے ہو۔''

''میں؟''

''ہاں تم۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ''تم انہیں اپنے ہاتھوں سے مار سکتے ہو مثلاً چھت سے دھکا دے دو یا۔۔۔''

''پاگل ہو گئی ہو۔ ان کو قتل کر کے میں بچ جاؤں گا۔''

''پاگل تو تم ہو گئے ہو۔ تم پر کون شک کرے گا۔ اول تو اس تک معاملہ جائے گا نہیں اور اگر گیا بھی تو پوچھ گچھ کے بعد معاملہ صاف ہو جائے گا۔ ان کے بعد ان کی تمام دولت تمہاری ہوگی۔''

''یار، اب تو میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ ان کا گلا گھونٹ دوں لیکن ڈر لگتا ہے۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے۔ گلا گھونٹ دو۔ کہنا ہارٹ فیل ہو گیا۔''

اس کی بات سن کر میرے دل میں ایک لمحے کو یہ خیال ضرور آیا کہ دادا جان کا خیال ٹھیک تھا۔ تانیہ مجھ سے غریبی کی حالت میں شادی کرنے پر تیار نہیں۔ یہ دولت کے لیے مجھے دادا جان کی جان تک لینے پر اکسا رہی ہے لیکن میں شاید خود بھی لالچ میں آ چکا تھا۔ خوف زدہ ہونے کے باوجود میں اس قدم کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے سوچا، دادا جان کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ یہ کام آج ہی کیوں نہ ہو جائے۔ وہ اپنی عمر گزار چکے ہیں۔ ان کے مرنے کا کسے افسوس ہوگا۔ میں نے تانیہ سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی موقع ملے گا، میں دادا جان کو ٹھکانے سے ہٹا دوں گا۔

میں گھر پہنچا تو ان کے وہی دوست بیٹھے تھے جو اپنی نواسی کو میرے سر تھوپنا چاہتے تھے اور لطف یہ تھا کہ ان کی نواسی بھی ان کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ دونوں کو دیکھ کر میرا خون کھول گیا۔ اخلاق کا تقاضا تھا کہ میں ان کے پاس کچھ دیر بیٹھوں۔ دادا جان کی عزت کا بھی خیال تھا۔

ان کے جانے کے بعد دادا جان سے میری زور دار جھڑپ ہوئی۔ انہوں نے اس لڑکی کی تعریف کرتے ہوئے شادی پر اصرار کیا تھا اور میں نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اسی پر بات بڑھ گئی تھی۔ تانیہ نے مجھے اتنا بھڑکا دیا تھا کہ میں بدزبانی کی تمام حدیں پھلانگ گیا۔

ان سے لڑنے جھگڑنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اگر میں نے اسی طرح نفرت کا اظہار کیا تو دادا جان ہوشیار ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے وہ اپنے دوست سے بھی اس کا تذکرہ کریں اور خوامخواہ ایک گواہ پیدا ہو جائے۔ دادا جان کے مرنے کے بعد اگر پولیس نے چھان بین کی تو ان کے دوست پولیس کو بتا سکتے ہیں کہ دادا جان سے میرا جھگڑا ہوا ہے۔ ان کے پاس جواز بھی مضبوط ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی مجھے اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا۔ مجھے دادا جان سے فوراً معافی مانگ لینی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی میں بھاگتا ہوا دادا جان کے پاس پہنچ گیا اور جاتے ہی ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

''دادا جان، مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔''

''جو زبان تم نے استعمال کی ہے، اس کے بعد معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ سمجھے تم۔''

''دادا جان، معاف تو اللہ بھی کر دیتا ہے آپ تو پھر میرے دادا جان ہیں۔'' میں واقعی رونے لگا۔

''یہ مت سمجھو کہ تمہارے آنسو مجھے پگھلا دیں گے۔ اب تم سونے کے بن کر بھی آ جاؤ گے تو میرے لیے بے کار ہو۔ میں نے ماں اور باپ بن کر تمہیں پالا۔ احسان فراموش! نکل جاؤ میرے گھر سے۔ تمہیں میری جائداد سے حصہ چاہیے نا؟ وہ تمہیں مل جائے گا۔''

''مجھے دولت نہیں چاہیے۔ بس آپ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے گلے سے لگا لیں۔''

''میری شرط اب بھی وہی ہے۔''

''مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔''

''تو پھر میں صلاح الدین سے کہہ دوں کہ تم اس کی نواسی سے شادی کرنے پر تیار ہو۔''

''بالکل بتا دیں لیکن انہیں یہ مت بتایئے گا کہ میں کتنے جھگڑے کے بعد تیار ہوا ہوں۔''

''میں کوئی پاگل ہوں جو تمہاری بدکلامی کا قصہ انہیں سناؤں گا۔'' انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''کتنی ٹھنڈ پڑی ہے کلیجے میں یہ سن کر کہ تو شادی کے لیے تیار ہے۔ ارے تو ہی تو ہے جس سے میری نسل چلے گی۔ اگر تو میرا کہا نہ مانتا تو تانیہ سے تیری نسل نہیں چلتی۔ کیا سمجھا تو۔''

''سمجھ گیا دادا جان۔''

''میری تمام دولت تیری ہے۔ یہ میں پہلے ہی لکھ چکا

ہوں۔ اب تجھے دولت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لیے لکھ دیا ہے کہ تجھے میری دولت میرے مرنے کے بعد ملے گی۔''

''خدا میرے سر پر آپ کا سایہ ہمیشہ رکھے۔''

''ارے ہمیشہ کون رہا ہے۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔ میں صلاح الدین سے کہہ دوں گا، وہ شادی کی تیاری کرے۔''

میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ میرا منصوبہ کامیاب ہوا۔ دادا جان کو میری فرمانبرداری کا یقین ہوگیا ہے۔ اب میرا داؤ آسانی سے چل جائے گا۔ ان کے دوست بے چارے بھی یہی سمجھتے رہیں گے کہ ایسا فرمانبردار پوتا کیوں اپنے دادا کو قتل کرنے لگا تھا۔

اب مصلحت یہی تھی کہ میں دادا جان کی ہر بات مانتا رہوں۔ میں نے تانیہ کو بھی باخبر کردیا تھا کہ اگر وہ میری شادی کے بارے میں سنے تو افسوس نہ کرے۔ میں یہ شادی ہونے سے پہلے ہی اپنے منصوبے پر عمل کرڈالوں گا۔

دادا جان نے بات چیت کا عمل دو چار دن ہی میں طے کرلیا۔ صلاح الدین صاحب نے شادی کے لیے ایک مہینے کا وقت مانگا۔ وہ بھی انہیں دے دیا گیا۔ دادا جان بہت خوش تھے۔ اب ان کا زیادہ وقت میرے پاس ہی گزرنے لگا تھا۔

''دادا جان، چھت پر چل کر بیٹھتے ہیں۔ آج دھوپ بہت اچھی نکلی ہوئی ہے۔''

''کیوں سیڑھیاں چڑھا کر مجھے تھکائے گا۔ بیٹھا رہ یہیں۔''

''دادا جان!'' میں نے ٹھنکتے ہوئے کہا ''میں تو آپ کی ہر بات مان لیتا ہوں۔ آپ میری کوئی بات نہیں مانتے۔''

''اچھا بھائی چل۔ تو مانے والا نہیں ہے۔''

میں انہیں لے کر چھت پر چلا گیا۔ چھت کی دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ بڑی آسانی سے انہیں اٹھا کر نیچے صحن میں پھینک سکتا تھا۔ چھت پر ٹہلتے ہوئے دو ایک مرتبہ میں نے یہ ارادہ کیا بھی لیکن اس ہولناک موت کے بارے میں سوچ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرے سامنے دادا جان کا بھیجا نکل کر صحن میں پھیل جائے گا۔ نہیں نہیں، یہ مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔

''چلئے دادا جان، نیچے چلتے ہیں۔''

''عجیب ہاؤ لے انسان ہو۔ ابھی چھت پر آنے کی جلدی تھی اب نیچے چلنے کی ضد کررہے ہو۔''

''دھوپ اچھی نہیں لگ رہی ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے میرے ساتھ نیچے اتر آئے۔ میں اپنی ناکامی پر سخت رنجیدہ تھا۔ دادا جان کو چھوڑ کر گھر سے نکل گیا۔ اب افسوس ہو رہا تھا کہ خوامخواہ موقع ضائع کردیا۔ موت تو کوئی بھی ہو، ہولناک ہوتی ہے۔ میں خوامخواہ ڈر گیا۔ میں نے طے کیا کہ کل پھر کوشش کروں گا۔ پھر سوچا کیا خبر وہ کل میرے ساتھ چھت پر نہ جائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے انہیں شک ہوجائے۔ کوئی اور ترکیب کرنی چاہیے۔ کئی دن میں قتل کی مختلف ترکیبوں پر غور کرتا رہا لیکن دل نہیں ٹھکا۔ ہر ترکیب میں کوئی نہ کوئی جھول نظر آتا تھا۔

دن پر دن گزرتے جارہے تھے۔ کبھی میری بزدلی آڑے آجاتی تھی۔ کبھی عقل مجھے ڈرا دیتی تھی۔ کبھی دادا جان کی محبت میرا ہاتھ روک لیتی تھی۔ میری جھنجلاہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ آخر ایک رات میں نے دل پر پتھر رکھ ہی لیا۔ میں ان کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھا ان کے سونے کا انتظار کررہا تھا۔

''اب مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی جاکر سوجاؤ۔''

''سوجاؤں گا دادا جان۔ آپ کو نیند آرہی ہے تو آپ سوجائیں۔''

''بے وقوف، میں سوگیا تو اندر سے دروازہ کون بند کرے گا۔ تجھے معلوم ہے دروازہ بند نہ ہو تو مجھے نیند نہیں آتی۔''

''ٹھیک ہے، آپ دروازہ بند کرلیں۔ میں جارہا ہوں۔''

مجھے معلوم تھا کہ وہ دروازہ بند کرکے سوتے ہیں۔ ان کے سونے کے بعد دروازے سے اندر آنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس باتھ روم کا ایک دروازہ صحن کی طرف بھی کھلتا تھا۔ اس دروازے سے داخل ہوکر میں ان کے کمرے میں آسکتا تھا۔ میں ان کے پاس صرف اس لیے بیٹھا ہوا تھا کہ کہیں وہ باتھ روم کا دروازہ اندر سے نہ بند کرلیں۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ نیند سے بے حال ہوگئے ہیں۔ اب سونے کے سوا کچھ نہیں کریں گے تو میں اٹھ گیا۔ میرے باہر نکلتے ہی انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور کمرے کی لائٹ بند ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بستر پر لیٹ گئے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں آگیا اور ان کے بے خبر سوجانے کا انتظار کرنے لگا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ سوگئے ہوں گے میں کمرے سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا صحن میں آگیا۔ باتھ روم کے دروازے میں داخل ہوا اور ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ دادا جان بے خبر سو رہے تھے۔ ان کے ہلکے ہلکے خراٹے صاف سنائی دے رہے تھے۔ میرے ہاتھ پاؤں بری طرح کانپ رہے تھے۔

یہ سوچ کر کہ کچھ دیر بعد کیا ہونے والا ہے، میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ایک مرتبہ میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑا۔ جاوید، یہ تو کیا کررہا ہے۔ اس شخص کا قتل کررہا ہے جس نے تجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔ ایک عورت کے کہنے میں آگیا۔ تھوڑی دیر کو یہ خیال بھی آیا کہ تانیہ لالچی ہے۔ وہ اپنی غربت دور کرنے کے لیے مجھے قتل پر آمادہ کررہی ہے۔ میرے قدموں نے کھڑے ہونے سے انکار کردیا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ ارادہ کرتا تھا اور توڑ دیتا تھا۔ پھر اچانک نہ جانے مجھے کیا ہوا۔ شیطان مجھ پر غالب آگیا۔ میں تیزی سے اٹھا اور قریب رکھا ہوا تکیہ اٹھا کر دادا جان کے منہ پر رکھ کر پوری طاقت سے دبا دیا۔ دادا جان کے کمزور جسم نے بہت زور لگایا لیکن میری گرفت بہت مضبوط تھی۔ کچھ دیر کشمکش ہوتی رہی اور پھر ان کا جسم ٹھنڈا ہوگیا۔ میں نے تکیہ ہٹایا۔ اچھی طرح اطمینان کیا کہ کوئی سانس باقی تو نہیں اور پھر ان کا بستر درست کیا تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ ان سے زبردستی کی گئی ہے۔ جس طرح اندر آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔

صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی رہ گئی تھی۔ آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا لیکن میں بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی خیالات کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ دادا جان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ یہ خیال آتے ہی بے ارادہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ یہ میں نے کیا کردیا۔ لیکن فوراً ہی بے پناہ دولت یاد آگئی۔ تانیہ یاد آگئی۔ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ سوال میرے سامنے تھا۔ صبح ہوگئی تھی۔ میں نے حسبِ معمول غسل کیا۔ کپڑے تبدیل کیے اور دفتر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ اٹھتے ہی میز پر آیا تو ملازم ناشتا لگا چکا تھا۔

''آج دادا جان نہیں اٹھے ابھی تک؟''

''وہ تو نماز کے وقت ہی اٹھ جاتے ہیں۔ آج پتا نہیں کیا ہوا۔ دیکھتا ہوں جاکر۔''

''رہنے دو۔ سو رہے ہیں تو سونے دو۔ خود ہی اٹھ جائیں گے۔''

میں نے ناشتا کیا اور دفتر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کیا ہونے والا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے دل پر قابو پایا اور گاڑی چلاتا رہا۔ میرے دفتر پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی تانیہ آگئی۔ میں نے جلدی جلدی اسے سب کچھ بتایا اور اپنی میز پر آگیا۔ کوئی دو گھنٹے گزرے تھے کہ گھر سے ٹیلی فون آگیا۔ ملازم نے بتایا کہ دادا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں فوراً گھر پہنچوں۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا ہوچکا ہے۔ ملازم محض میرے خیال سے طبیعت کا بہانہ کررہا ہے۔ میں نے دفتر سے چھٹی لی اور گھر پہنچ گیا۔ سب کچھ میری توقع کے مطابق تھا۔ محلے کے دو چار بوڑھے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے مجھے گلے لگالیا۔

''بیٹا، ایک دن سب کو مرنا ہے۔ تمہارے دادا تمہیں چھوڑ گئے۔''

''صبر کرو۔ اللہ کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں۔''

میں نے دادا کے مرنے کی خبر اس طرح سنی جیسے مجھے کچھ معلوم ہی نہ ہو اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے آنسو مصنوعی نہیں تھے بلکہ موت کی خبر سن کر واقعی مجھے رونا آگیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ پچھتاوے کے آنسو تھے یا افسوس کے۔

''شاید ہارٹ فیل ہوا ہے۔ سوتے کے سوتے رہ گئے۔''

''دروازہ توڑ کر لوگ اندر گئے۔''

''یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے سو رہے ہیں۔''

میں سب کی باتیں سن رہا تھا اور چپ تھا۔ اس وقت میری خاموشی ہی میرے صدمے کی دلیل تھی۔ جو آرہا تھا مجھے صبر کی تلقین کررہا تھا۔ کچھ دیر میں صلاح الدین صاحب بھی آگئے۔ انہوں نے بھی مجھے سینے سے لگایا۔

''یہ مت سمجھنا بیٹا کہ تمہارے دادا مرگئے ہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔''

''جی ہاں، اب تو آپ ہی کا سہارا ہے۔''

''افسوس صرف اتنا ہے کہ وہ تمہاری شادی نہ دیکھ سکے۔ خیر.....''

میں مطمئن تھا کہ کسی کو شک نہیں ہوا۔ تمام لوگ ان کی موت کو طبعی سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت میری ڈھارس کے لیے یہی بہت تھا کہ میں بچ گیا ہوں۔ پولیس وغیرہ کا بھی کوئی چکر نہیں ہوا ہے۔ ان کی موت سے شادی بھی کچھ دن کے لیے ٹل جائے گی۔

شام تک دادا جان کی تدفین بھی عمل میں آگئی۔ انہیں دفن کرکے میں گھر پہنچا اور جب تمام مہمان رخصت ہوگئے تو جیسی تنہائی کا سامنا ہوا ایسا اکیلا خود کو میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ گھر میں کچھ لوگ ہوتے تو دل بہل بھی جاتا۔ یہاں تو میں تھا یا میرا ملازم۔ میں گھبرا کر گھر سے نکل گیا۔ رات دیر تک باہر گھومتا رہا۔ لوٹ کر آیا تو ملازم میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

''چھوٹے مالک، اپنے آپ کو سنبھالیے۔ مجھے معلوم ہے آپ کتنے بڑے صدمے سے دوچار ہوئے ہیں لیکن اب آپ کو سب کچھ بھولنا ہی ہوگا۔''

وہ مجھے دیر تک سمجھاتا رہا۔ میں نے بھی خوب اداکاری کی تاکہ وہ واقعی یہ سمجھے کہ مجھے دادا جان کی بے وقت موت کا بہت افسوس ہوا ہے۔ دوسرے دن صلاح الدین صاحب آ گئے۔ ان کی بیوہ بیٹی یعنی میری ہونے والی ساس بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے بھی مجھے سمجھانے کا فریضہ انجام دیا بلکہ ان کا اصرار تو یہ تھا کہ میں ان کے گھر شفٹ ہو جاؤں لیکن میں نے معذرت کر لی۔

''یہ گھر میرے دادا جان کی یاد دلاتا رہے گا۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ وہ میرے دادا ہی نہیں میرے باپ بھی تھے۔''

''یہ وقت تو اس بات کا نہیں لیکن میں تمہیں یہی مشورہ دوں گی کہ اب تم جلد ہی شادی کا بندوبست کر لو۔ اس سے تمہاری تنہائی بھی دور ہو گی اور تمہارے دادا کی روح بھی خوش ہو گی۔''

''آنٹی، کس دل سے شادی کر لوں۔ دادا جان کی موت نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔''

''ہمیں اندازہ ہے لیکن کسی کے مرنے سے زندگی کے کام رک نہیں جاتے۔ تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔''

''ابھی مہینے دو مہینے تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔''

میں نے ان سے باتوں باتوں میں دو مہینے کا وقت لے لیا تھا۔ اب میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں دادا کی جائداد اپنے نام کرا سکتا تھا لیکن اگر جلدی کرتا تو لوگ مجھے لالچی سمجھتے کہ دادا کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور میں دولت سمیٹنے لگا لہٰذا کچھ دن چپ رہنے میں مصلحت تھی۔

دادا جان کو مرے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا کہ ایک دن ان کا وکیل مجھ سے ملنے آیا۔ وہ یہ بتانے آیا تھا کہ دادا جان اپنی تمام جائداد اپنی زندگی ہی میں میرے نام کر گئے ہیں اور اب رسمی سی کارروائی کے بعد کاغذات میرے نام سے بن جائیں گے۔

''وکیل صاحب، میری دولت تو میرے دادا تھے۔ میں اس دولت کو لے کر کیا کروں گا۔''

''آپ کے جذبات قابلِ قدر ہیں لیکن وصیت پر عمل کرنا بھی تو نیکی ہے۔ میں نے تمام کارروائی مکمل کر لی ہے۔ آپ کو صرف دستخط کرنے کے لیے میرے ساتھ چلنا ہو گا۔''

''وکیل صاحب، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ میرا صدمہ تو کچھ کم ہونے دیں۔''

''جاوید صاحب، یہ کام جتنی جلد ہو جائے اچھا ہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔''

وہ ایک دن کا کہہ رہے تھے لیکن کاغذات کی تکمیل میں کئی دن ضائع ہو گئے۔ بہرحال میں بیٹھے بٹھائے کروڑ پتی ہو گیا۔ دادا کے زرعی اراضی، مکانات، بینک بیلنس سب میرا ہو گیا۔

صلاح الدین صاحب کی مہربانیاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ مجھے یہ فکر تھی کہ وہ شادی پر اصرار کریں گے تو میں انہیں ٹالوں گا کس طرح۔ جب کاغذات میرے نام ہو گئے اور میں نے حالات پر اچھی طرح کنٹرول کر لیا تو میرے لیے یہ مشکل نہیں تھا کہ میں شادی سے انکار کر دوں۔

میں نے سب سے پہلے تو یہ کام کیا کہ دادا کا وہ مکان فروخت کر دیا جس میں دادا جان اب تک میرے ساتھ رہتے چلے آئے تھے۔ دوسرا کام یہ کیا کہ دادا جان کے ملازم کو فارغ کیا۔

اس مکان کو بیچ کر میں نے ڈیفنس میں ایک شاندار کوٹھی خریدی، نئی گاڑی خریدی۔ پرانی گاڑی میں نے تایا کے بھائی کو دے دی۔ اب میں اس فکر میں تھا کہ دادا جان کی زرعی زمین فروخت کر کے کوئی فیکٹری قائم کروں۔

صلاح الدین صاحب میری ان تیاریوں سے پریشان تھے۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں شادی سے پہلے ضروری تیاریاں کر رہا ہوں۔ اسی لیے دو مہینے گزر جانے کے باوجود انہوں نے شادی پر اصرار نہیں کیا البتہ یہ کہتے ضرور رہے کہ تم ان تیاریوں سے نمٹ لو تو پھر شادی کی جائے۔ میں نے بھی ابھی انکار نہیں کیا تھا۔

میں زندگی بھر کی محرومیوں کو دور کرنے میں لگا ہوا تھا۔ دولت میرے پاس تھی اور تنہائی ساتھ تھی۔ جن ہوٹلوں میں بیٹھنے کا میں صرف خواب دیکھ سکتا تھا اب وہاں میری شامیں گزر رہی تھیں۔ صلاح الدین صاحب کی بیٹی برا نہیں تھی لیکن ان سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ ایک دن انہوں نے میرا باقاعدہ تعارف کرکے مجھے پکڑ لیا۔

''بھئی، تم اتنے مصروف ہو گئے ہو کہ ملنا دوبھر ہو گیا ہے۔'' انہوں نے بڑے پیار سے کہا۔

''جب آپ کو معلوم ہے کہ میں مصروف ہوں تو کیوں اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں۔ کیا مجھ سے ملنا ایسا ضروری ہے؟''

''ضروری کیوں نہ ہو۔ بھئی تم سے شادی کی تاریخ لینی ہے۔''

''دیکھئے صلاح الدین صاحب، یہ شادی دادا جان کی پسند سے ہو رہی تھی، میں ہرگز تیار نہیں تھا۔''

''کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ کہیں نہ کہیں تو شادی کرو گے نا۔ اپنے دادا کی روح کو خوش کر دو۔''

''ان کی روح کو خوش کرنے کے اور بہت طریقے ہیں۔''

''تو تم انکار کر رہے ہو؟''

''مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی نواسی سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''افسوس! تمہارے دادا اس وقت زندہ نہیں۔ انہیں کتنی تکلیف ہوتی۔''

''شکر ہے وہ زندہ نہیں۔ اس تکلیف سے بچ گئے۔''

''میں انکار سمجھوں؟''

''میرے خیال میں، میں انکار کر چکا ہوں۔''

انہیں غصہ تو بہت آیا ہو گا لیکن اب میں دادا جان کا محتاج نہیں تھا بلکہ خود مختار تھا۔ دولت کی طاقت میرے پاس تھی۔ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ اچھا سامنہ لے کر چلے گئے۔

ایک اور کانٹا نکل جانے کے بعد تانیہ سے شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے اس کے گھر والوں سے بات کی اور اس سے میری شادی ہو گئی۔ شادی سے پہلے ہی یہ طے ہو گیا تھا کہ تانیہ کے گھر والے بھی میرے ساتھ رہیں گے۔ ان کے لیے میں نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا اور میرے گھر آ گئے۔ میں نے بھی بچپن سے تنہا زندگی گزاری تھی۔ دادا کے علاوہ کسی اور کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ تانیہ کی ماں کی شکل میں مجھے اپنی ماں مل گئی۔ اس کے بھائی کی شکل میں مجھے چھوٹا بھائی مل گیا۔ تانیہ کے ابو البتہ مجھے دادا جان کا دوسرا روپ معلوم ہوتے تھے اس لیے ان کی طرف میرا دل نہ کھینچ سکا لیکن میں نے کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں انہیں ناپسند کرتا ہوں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تانیہ کی صورت میں مجھے خوشیوں کا خزانہ مل گیا تھا۔ مہینوں تک تو یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ دن کب نکلا، رات کب آ گئی۔ ہم دونوں سیر سپاٹوں میں مشغول تھے۔ ہنی مون کے طور پر ہم پورا یورپ گھوم آئے۔

خوشیوں کا چراغاں کچھ کم ہوا تو ہم دونوں کو مستقبل کی فکر ہوئی۔ اگر یونہی دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے رہے تو ایک دن خزانہ بھی کم پڑ جاتا۔ لہٰذا سوچا کہ کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔ میں اور تانیہ دونوں کنسٹرکشن کمپنی میں ملازمت کر چکے تھے لہٰذا ہمیں اس کام کا کچھ تجربہ تھا۔ میں نے ایک پرائیویٹ کنسٹرکشن کمپنی قائم کر لی۔ کچھ پلاٹ خریدے اور تعمیر کر کے فروخت کیے۔ لوگ ہم سے مکانات کی تعمیر کے لیے بھی رجوع کرتے تھے۔

بلڈرز تو بہت سے ہوتے ہیں لیکن خدا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ میں ملک کا نامور بلڈر بن گیا۔ میرا نام ہی کسی پروجیکٹ کی کامیابی کے لیے کافی تھا۔ مجھے اپنی کامیابیوں کو دیکھ کر دادا جان کے اندازوں پر ہنسی آ جایا کرتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ میں ان کی دولت کو سنبھال نہیں سکوں گا۔ وہ اگر ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے ان کی معمولی سی دولت میں کتنے فیصد اضافہ کر دیا ہے۔ میرا شمار ملک کے دولت مند لوگوں میں ہونے لگا ہے۔ تانیہ بھی ویسی ثابت نہیں ہوئی جیسا کہ دادا جان کا اندازہ تھا۔ وہ ہرگز لالچی نہیں تھی۔ میرا آدھے سے زیادہ کاروبار اس نے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بہترین بزنس وومین ثابت ہو رہی تھی۔ مصروفیات کے باوجود وہ میرے لیے وقت نکال لیتی تھی۔ ہماری سوشل لائف بہت ہنگامہ خیز ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود تانیہ کی محبت میں کمی نہیں آئی تھی۔

ہماری شادی کو چار سال گزر گئے تھے لیکن ابھی تک ہمارے آنگن میں پھول نہیں کھلا تھا۔ ہر دولت، ہر خوشی میسر تھی اولاد کی نعمت کے سوا۔ زندگی کے ہنگاموں میں خیال ہی نہیں آیا کہ ہم کتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ جب خیال آیا اور میں نے تانیہ کی توجہ اس طرف مبذول کی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اسے اس محرومی کا خیال تک نہیں بلکہ وہ تو خوش تھی کہ بچوں سے جان چھوٹی ہوئی ہے۔

''خود سوچو، بچوں میں الجھ گئی تو کاروبار کا کیا ہو گا۔'' تانیہ نے میری ضد کے جواب میں کہا۔

''یہ بھی تو سوچو کہ ہم جو کچھ کما رہے ہیں، کس کے لیے؟''

''ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ ابھی ہم نے کمایا ہی کیا ہے۔''

''کاروبار میں ہمارے قدم جم چکے ہیں۔ صرف نگرانی کی ضرورت ہے تمام کام چلتے رہیں گے اور پھر ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک چھوڑ کئی ملازم رکھ سکتے ہیں۔ کم از کم دو بچے تو گھر میں ہونے چاہئیں۔''

وہ بچوں کے حق میں نہیں تھی لیکن خدا نے میری سن لی اور شادی کے پانچ سال بعد مجھے جڑواں بچوں کا تحفہ مل گیا۔ دونوں بیٹے تھے۔ میں نے ایک کا نام ثاقب اور دوسرے کا راغب۔

یہ تجربہ میرے لیے بہت ہی خوش گوار تھا البتہ تانیہ اسے

محض برداشت کررہی تھی۔ اسے نئی زندگی کی چکا چوند کی عادت پڑ گئی تھی اور اب شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ بچے اس کے پاؤں کی زنجیر بن جائیں گے لیکن جب ایسا نہیں ہوا اور بچے پیدا ہوتے ہی ملازموں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے تو اس کے اندیشے دور ہوگئے۔ دو چار مہینوں کے آرام کے بعد وہ پھر دفتر میں بیٹھنے لگی۔

دونوں بچے چار سال کے ہوگئے تھے۔ اس دوران کوئی اور خوشی ہمیں نہیں ملی۔ مجھے بھی اب آرزو نہیں رہی تھی۔ دو ہی بچے میرا دل بہلانے کے لیے بہت تھے۔ میں تھکا ہارا گھر پہنچتا تو ان بچوں کی پیاری پیاری باتیں میری ساری تھکن اتار کر ایک طرف رکھ دیتیں۔

ایک روز میری گاڑی پورچ میں کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور دوسری گاڑی لے کر بازار گیا ہوا تھا۔ تانیہ کو کچھ چیزیں خریدنی تھیں، وہ اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میرا ایک نہایت اہم فون آگیا اور مجھے جانا پڑ گیا۔ بات کچھ ایسی تھی کہ میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ڈرائیور کا انتظار کرتا تو بہت دیر ہوجاتی۔ میں پورچ میں گیا اور گاڑی ریورس کرکے باہر نکالنے لگا۔ نہ جانے دونوں بچے کب گاڑی کے پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ میں نے بھی گھبراہٹ میں پیچھے دیکھے بغیر گاڑی ریورس کی۔ میرے کانوں میں دور بیٹھے دربان کے چیخنے کی آواز آئی اور یہ محسوس ہوا کہ گاڑی کسی چیز پر چڑھی ہے۔ میں گاڑی سے نیچے اترا۔ میرا ایک بیٹا گاڑی کے ایک وہیل کے نیچے تھا۔ دوسرا دوسرے وہیل کے نیچے۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ دونوں کے بھیجے باہر نکلے ہوئے تھے۔ بس میں نے یہ دیکھا کہ دربان کی چیخیں رک گئی ہیں اور وہ سر تھامے فرش پر بیٹھا ہے۔ اس کے بعد مجھ پر غشی طاری ہوگئی تھی۔

مجھے کس نے سنبھالا، کون اسپتال لے کر گیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ میں کئی دن بے ہوش رہنے کے بعد اپنے بچوں کو پکارتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا اور بستر سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں موجود اسپتال کے اسٹاف نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ فوراً ڈاکٹر آگیا تھا جس نے انجکشن لگا کر مجھے پھر بے ہوش کردیا تھا۔ اس کے بعد یہ معمول ہوگیا کہ دن میں کئی کئی مرتبہ میں ہوش میں آتا تھا اور مجھے بے ہوش کردیا جاتا تھا۔

میری حالت پھر بھی نہیں سنبھلی تو مجھے ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ وہاں بھی میرے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہا۔ مجھے انجکشنوں کے ذریعے سلایا جاتا رہا۔ کبھی جاگتا تو میری برین واشنگ کی جاتی۔ آہستہ آہستہ میری حالت سنبھلنے لگی لیکن یہ معلوم ہوتا تھا جیسے میں بولنا بھول گیا ہوں۔ جب چاپ برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ تانیہ مجھ سے ملنے نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ جب آپ ٹھیک ہوجائیں گے تو آپ کی بیگم آپ سے ملنے آئیں گی۔ یہی بہانے کرتے کرتے ایک سال گزر گیا۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ تانیہ مجھے یہاں رکھ کر بھول گئی ہے۔ وہ اب مجھے دیکھنے کبھی نہیں آئے گی اور نہ میں یہاں سے نکل سکوں گا۔ اسپتال والوں کو بھاری رقم مل رہی ہوگی، وہ مجھے یہاں سے کیوں نکالیں گے۔ اس بات کا یقین ہوتے ہی میں نے اپنا رویہ بدل لیا۔ اب تک میں ڈاکٹروں سے تعاون کرتا رہا تھا لیکن اب میں نے شدید غصے کا اظہار شروع کردیا۔ گالیوں سے کام نہیں چلا تو میں نے ایک ڈاکٹر کی پٹائی کردی۔ مجھے رسیوں سے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا اور دوسرے دن مجھے پاگل وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈاکٹروں نے مجھے پاگل قرار دے دیا تھا۔ اس وارڈ میں آنا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں ذہنی طور پر بالکل صحیح تھا لیکن یہاں پاگلوں کے ساتھ بند کردیا گیا تھا۔ میں روتا تھا، گڑگڑاتا تھا۔ پاگل مجھ پر ہنستے تھے لیکن ڈاکٹروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اب نہ مجھے تانیہ یاد تھی نہ اپنے بچے۔ اب تو بس اپنی فکر تھی۔ میں نے بہت سے قصے سن رکھے تھے کہ عزیز رشتے دار دشمنی میں پاگل ظاہر کرکے بعض لوگوں کو ایسے اسپتالوں میں چھوڑ جاتے تھے اور پھر پلٹ کر خبر نہیں لیتے تھے۔ میں بھی اپنے آپ کو انہی میں سے ایک سمجھنے لگا تھا۔ تانیہ نے میری دولت ہڑپ کرنے کے لیے مجھے یہاں چھوڑ دیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگتا تھا۔ ڈاکٹر آتے تھے اور انجکشن لگا کر چلے جاتے تھے۔

کچھ دنوں سے میں محسوس کرنے لگا تھا کہ میں نشے کا عادی ہوگیا ہوں۔ میرا خود جی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر آئیں اور مجھے انجکشن لگادیں اور ایسا ہی ہوتا بھی تھا۔ انجکشن لگتے ہی مجھے سکون آجاتا تھا۔

ایسے ہی شب و روز گزر رہے تھے کہ ایک روز تانیہ مجھ سے ملنے آگئی۔ ایک سال سے زیادہ کے عرصے میں یہ پہلا دن تھا جب میں نے وارڈ سے باہر قدم رکھا۔ مجھے ایک کمرے میں پہنچادیا گیا جہاں دو تین ڈاکٹر اور تانیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں بچوں کی طرح رونے لگا۔

''تانیہ، تم اب آئی ہو۔ اتنے عرصے بعد۔ میں تو تمہارا چہرہ ہی بھول گیا تھا۔ یہ صلہ دیا تم نے مجھے۔''

''جاوید، تم کیا سمجھتے ہو۔ تمہارے بغیر میں چین سے رہی ہوں گی لیکن یہ ڈاکٹر مجھے ملنے ہی نہیں دیتے تھے۔''

''ان ڈاکٹروں کا کیا ہے۔ یہ تو مجھے پاگل بھی سمجھتے ہیں تو کیا میں پاگل ہوں۔''

''تمہیں نہیں معلوم، تمہارا ذہنی توازن خراب ہوگیا تھا مگر اب تم ٹھیک ہوگئے ہو۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔''

''کیا واقعی تم مجھے لینے آئی ہو۔''

''ہاں جاوید، میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ چلو میرے ساتھ۔''

ضروری کارروائی کے بعد مجھے اسپتال سے نجات مل گئی۔ باہر ڈرائیور گاڑی لیے کھڑا تھا۔ مگر یہ پرانا ڈرائیور نہیں تھا۔ تانیہ نے نیا ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ گھر پہنچا تو دربان اور دیگر ملازمین بھی دوسرے تھے۔ دنیا ہی بدل گئی تھی البتہ گھر وہی تھا، تانیہ کا خلوص وہی تھا۔ گھر پہنچتے ہی جو سکون ملا جسے میں بیان نہیں کرسکتا۔

شام تک میری حالت ٹھیک رہی۔ میں ہوش مندوں کی طرح اپنے کاروبار کے بارے میں باتیں کرتا رہا البتہ شام ہوتے ہی مجھے انجکشن کی طلب ہونے لگی اور رات تک تو میرے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے۔

''تانیہ، مجھے اسپتال لے چلو۔ وہاں ڈاکٹر مجھے انجکشن لگایا کرتے تھے تو میں ٹھیک ہوجایا کرتا تھا۔''

''اب بھی ٹھیک ہوجاؤ گے۔'' وہ ہنسنے لگی ''ڈاکٹروں نے مجھے انجکشن لگا کر دے دیے تھے کہ جب ضرورت پڑے لگوالینا۔ تم ذرا صبر کرلو۔ انجکشن ابھی آئے جاتے ہیں۔''

''لگائے گا کون؟''

''دلشاد لگادے گا۔'' اس نے اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی بھی لگائے، انجکشن جلدی منگواؤ۔''

اس نے دلشاد ہی سے کہا اور وہ انجکشن لے کر آگیا۔ انجکشن لگتے ہی میرے بدن میں ٹھنڈی پڑ گئی اور میں نے آنکھیں موندلیں۔ تانیہ کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ وہ میرا کتنا خیال رکھتی ہے۔

دوسرے دن میں سو کر اٹھا تو میرا بدن پھول کی طرح ہلکا ہورہا تھا۔ دو سال بعد میں گھر کے بستر پر سویا تھا لیکن اچانک گھر کا سناٹا دیکھ کر دل بھر آیا۔ دیوار کی طرف نظر اٹھائی تو دونوں بچوں کی تصویر لٹکی نظر آئی۔ ان کی موت کا میں ہی ذمے دار ہوں۔ میں ہی مجرم ہوں۔ میری چیخوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ تانیہ دفتر جانے کے لیے تیار ہورہی تھی۔ گھبرائی ہوئی آئی اور اپنے بھائی دلشاد کو بلانے لگی۔ اس کی آواز پر وہ بھی دوڑا ہوا چلا آیا۔

''دلشاد، جلدی سے انجکشن لے کر آؤ۔ انہیں دورہ پڑ گیا ہے۔''

''تانیہ، میرے بچے۔'' میں بری طرح چیخ رہا تھا۔

دلشاد انجکشن لایا اور میرے بازو میں گھونپ دیا۔ کچھ سکون ملا اور میں غافل ہوگیا۔ رات ہوئی تو ایک انجکشن اس نے اور لگادیا۔ اس سے اگلے دن میں نے تانیہ سے دفتر جانے کی ضد کی۔

''میں چاہتا ہوں، اب زندگی کی طرف لوٹ آؤں۔ آج سے میں دفتر جاؤں گا۔''

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ دن آرام کرلو۔ کام تو چل ہی رہا ہے۔''

''بہت آرام ہوچکا۔ سارا بوجھ تم پر آن پڑا ہے۔ مجھے بھی کچھ کرنے دو۔'' میں نے غسل خانے میں جاتے ہوئے کہا۔

میں غسل خانے سے نکلا تو دلشاد بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انجکشن تھا۔ انجکشن دیکھ کر مجھے اس کا سرور یاد آگیا۔ دفتر تو کل بھی چلا جاؤں گا۔ اس وقت دلشاد آگیا ہے تو اس سرور سے فیض یاب ہوجاؤں۔ کسی نادیدہ طاقت نے میرے ہاتھ کو حرکت دی اور میں نے آستین چڑھادی۔ سر گھومنے لگا غفلت طاری ہوئی اور میں بستر پر ڈھیر ہوگیا۔

وہ شاید مجھے دفتر لے جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں جب بھی دفتر جانے کے لیے کہتا وہ مجھے سلا دیتی۔ پھر اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رات کو جب مجھے نشے کی طلب ہوتی تو وہ مجھے ترسانی رہتی۔ صبح ہوتی تو میری حالت ایسی ہوجاتی کہ وہ مجھے دفتر لے جانا چاہتی اور میں کہتا انجکشن لگادو۔ وہ مجھے کام چوری کے طعنے دیتی اور انجکشن لگوا دیتی۔ میں سوجاتا اور وہ دفتر چلی جاتی۔

اسی طرح جب کچھ دن گزر گئے تو اس نے صبح کے وقت بھی انجکشن دینا بند کردیا لیکن اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں دفتر جاتا۔ وہ مجھے کمرے میں بند کرکے دفتر چلی جاتی۔ میں نے بہت ضبط کیا لیکن چوتھے دن میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''پہلے اس کاغذ پر دستخط کرو، پھر انجکشن دوں گی۔''

''جلدی دو۔ جلدی کاغذ دو۔''

''معلوم ہے یہ کیا ہے؟''

''کچھ بھی ہے۔ تم کہہ رہی ہو دستخط کردو تو لاؤ

کردوں۔"

"اس نے کچھ کاغذات میرے آگے کردیے اور میں نے بغیر پڑھے دستخط کردیے۔ انعام میں مجھے انجکشن مل گیا۔ سو ابر انہیں تھا۔ وہ دفتر چلی گئی۔ میں نشے کا جھولا جھولنے لگا۔

اب اس نے یہ معمول بنالیا تھا۔ مجھے نشے کے لیے ترساتی رہتی۔ میں ہاتھ جوڑتا، گڑگڑاتا۔ جب وہ یہ دیکھ لیتی کہ میں بے بس ہوگیا ہوں تو کسی کاغذ پر دستخط کرالیتی۔

پھر ایک وقت وہ آیا کہ بغیر مانگے مجھے انجکشن مل جاتا۔ وہ مجھے ہر وقت مدہوش رکھنے لگی۔ جتنے کاغذوں پر دستخط کرانے تھے وہ کرا چکی تھی۔ یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے میرا تمام کاروبار اپنے نام منتقل کرالیا تھا۔ چیک بکوں پر دستخط کرا کے میری تمام رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرلی تھی۔

میری حالت روز بروز بگڑتی جارہی تھی۔ ہر وقت نشے میں رہنا ہی میری زندگی تھی۔ میں تانیہ کا شکر گزار تھا کہ وہ میری طلب کو پورا کررہی تھی۔ کاروبار کیسا چل رہا ہے کون چلا رہا ہے، مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

میں ہوش میں آتا تھا تو اپنی حالت پر افسوس ہوتا تھا لیکن نشے کی لت ایسی پڑ گئی تھی کہ اسے چھوڑنا میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے اپنی حالت پر خود تو رحم نہیں آیا لیکن شاید خدا کو رحم آگیا تھا۔ میں اب یہ سوچنے لگا تھا کہ کسی طرح اس عادت سے چھٹکارا مل جائے۔ میں نے تانیہ کو اعتماد میں لینا چاہا۔

"تانیہ، میں تنگ آچکا ہوں۔ اس نشے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ میں تمہارے لائق نہیں رہا ہوں۔ تم مجھے کسی اسپتال لے جاؤ۔ میرا نشہ چھڑوادو۔"

"جس حالت میں ہو اسی میں پڑے رہو۔ ایسی گندی عادت میں مبتلا ہوگئے ہو کہ اب اس کا کوئی علاج نہیں۔" تانیہ نے بدتمیزی سے جواب دیا۔

"تم کوشش تو کرو۔ بہت سے اسپتال ہیں جہاں نشہ چھڑوایا جاتا ہے۔"

"میں اب یہی کرنے کی رہ گئی ہے میرے پاس تم پر لٹانے کے لیے اب ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔"

"تانیہ، جو کچھ ہے وہ میرا ہی تو ہے۔ کیا میرے علاج پر خرچ نہیں ہوسکتا؟"

"اب تمہارا کچھ نہیں ہے۔ تم سب کچھ میرے نام کرچکے ہو۔"

"بکواس مت کرو۔ میں نے کچھ تمہارے نام نہیں کیا۔"

"ہر کاغذ پر تمہارے دستخط موجود ہیں۔ تم نے اپنی خوشی سے سب کچھ میرے نام کردیا ہے۔"

"تم نے نشے کی حالت میں مجھ سے دستخط کرائے ہیں۔ میں عدالت میں جاؤں گا۔"

"تم سے پہلے میں عدالت میں جاؤں گی۔ تم اپنے دادا کے قاتل ہو۔ تم میرے دونوں بچوں کے قاتل ہو۔ تم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری دولت میرے بچوں کو ملے اسی لیے تم نے انہیں مار دیا۔"

"وہ ایک حادثہ تھا۔ بھلا کوئی اپنے بچوں کو مارتا ہے۔"

"میں ثابت کردوں گی کہ تم نے جان بوجھ کر انہیں مارا ہے۔"

"تانیہ، یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے اتنا بڑا الزام مت دو۔"

"میں اپنی زبان بند رکھوں گی۔ تم بھی چپ کر کے گھر کے ایک کونے میں پڑے رہو۔ دنیا کی نظر میں تو تم مجھے طلاق بھی دے چکے ہو۔ طلاق نامے پر تمہارے دستخط موجود ہیں۔ تم اسے جعلی ثابت نہیں کرسکتے۔ میں نے تمہیں رکھا ہوا ہے میرا احسان ہے۔"

"اتنا بڑا فراڈ۔ اتنا بڑا دھوکا۔ میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ نشے نے میرے اعضا اتنے کمزور کردیے تھے کہ میں چکرا کر گر گیا۔

مجھے ہوش آیا تو تانیہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور کچھ کپڑے ساتھ لیے۔ پھر اب تانیہ کی طرف سے خطرہ ہوگیا تھا۔ میں اس سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے ڈریسنگ ٹیبل پر تانیہ کے گلے کا سونے کا ہار اور دو کڑے نظر آئے۔ میں نے جھپٹ کر انہیں اٹھالیا۔ کروڑوں کی دولت میں صرف یہ دو چیزیں میرا حصہ تھیں۔ میں نے انہیں جیب میں ٹھونسا اور کمرے سے نکل گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ دلشاد اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ کوئی اور بھی قریب نہیں تھا۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ دربان نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

"صاحب آپ کدھر جاتا ہے؟"

"بہت دن ہوگئے باہر نہیں نکلا ہوں۔ چہل قدمی بھی ہوجائے گی اور لانڈری پر کپڑے بھی ڈال آؤں گا۔"

"بی بی صاحب نے منع کیا ہے آپ کو باہر نہیں جانا ہے۔"

"نوکری کرنی ہے یا کہیں اور انتظام کرلیا ہے؟"

"بی بی صاحب ناراض ہوجائے گی۔"

"انہیں معلوم بھی نہیں ہوگا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ میں نے نہ جانے کتنے دن بعد گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ آزادی کا احساس ہوتے ہی میں نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کردیے۔ جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹیکسی کرلیتا۔ سڑک کے پیدل چلتا رہا۔ مین روڈ پر آکر مجھے بس میں بیٹھنا پڑا۔ صدر پہنچ کر میں ایک سنار کی دکان پر گیا۔ کڑے اور ہار صرف پینتالیس ہزار میں بیچنے پڑے۔ میں نے پیسے جیب میں ڈالے اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ یہ شہر میرے لیے نیا نہیں تھا۔ میں ایک ایسے اسپتال چلا گیا جہاں نشے کے مریض داخل کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے میرے جذبے کی قدر کی اور امید ظاہر کی کہ چونکہ میں خود نشہ چھوڑنا چاہتا ہوں اس لیے بہت جلد چھٹکارا مل جائے گا۔ میں نے فیس جمع کی اور داخل ہوگیا۔

ایک مہینے بعد ہی ڈاکٹروں نے مجھے صحت یاب قرار دے کر اسپتال سے رخصت کردیا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ مجھے صلاح الدین صاحب کا خیال آیا۔ وہاں جانے کا میرا منہ تو نہیں تھا لیکن اس وقت وہی کام آسکتے تھے۔ میں ٹیکسی کی اور ان کے گھر پہنچ گیا۔ ان کی نواسی کی شادی ہوچکی تھی لیکن میں ان کے اخلاق اور وضع داری کی داد دیتا ہوں انہوں نے کسی مطلب کے بغیر بھی مجھے اسی طرح ویلکم کیا جس طرح وہ پہلے ملتے تھے۔

"انکل، میں اپنے رویے کی معافی مانگنے آیا ہوں۔"

"بیٹا معافی کس لیے؟ چیز کی۔ یہ تمہارا حق تھا کہ تم جہاں چاہو جاؤ۔ ویسے کردو البتہ ایک شکایت ہے کہ تم اتنے عرصے بعد آئے میں تمہارے دادا کا دوست تھا۔ دادا کی یاد تازہ کرنے ہی آجاتے۔"

"اسے میری نالائقی سمجھ کر نظر انداز کردیجیے۔"

"بچوں سے ایسی غلطیاں ہوہی جاتی ہیں۔" انہوں نے کہا "اور سناؤ۔ کاروبار کیسا چل رہا ہے۔ بیوی کا کیا حال ہے بچے کتنے ہوگئے اور ہاں اکیلے کیوں آئے ہو۔ بیوی کو ساتھ کیوں نہیں لائے۔"

انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ میرے پاس ان سوالوں میں سے کسی کا بھی جواب نہیں تھا۔ سر جھکائے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا، کس سوال کا کیا جواب دوں۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں۔ کچھ پریشان ہو؟"

انہوں نے اتنی شفقت سے پوچھا کہ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میری یہ کیفیت دیکھی تو وہ بھی گھبرا گئے۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے قریب آکر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اصرار کرکے حالات پوچھے۔ میں تو آیا ہی اس امید پر تھا کہ وہ میری مدد کریں گے۔ میں نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کردیا۔ میرے حالات سن کر مجھ سے زیادہ وہ پریشان ہوگئے۔

"یہ تو بڑا برا ہوا۔ بڑی خطرناک عورت ہے وہ۔ تم نے اپنے ہاتھ سے اپنے ہاتھ کاٹ لیے۔ تمہیں کاغذات پر دستخط نہیں کرنے چاہیے تھے۔"

"وہ دستخط میں نے اپنے ہوش میں نہیں کیے تھے۔"

"یہ کون مانے گا۔"

"اسپتال کی رپورٹیں بتائیں گی کہ مجھے نشہ دیا جارہا تھا۔"

"وہ تو ہے لیکن بیٹا، دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس عورت کے پاس دولت کی طاقت ہے۔ عدالت میں جاؤ

دماغ کی غذا

پروفیسر پال ڈیراک (POUL DIRAC) کو نیوٹن اور آئن اسٹائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز سائنس دان سمجھا جاتا ہے۔ پروفیسر ڈیراک نے نوبل پرائز کے علاوہ اور بہت سے اعزازات حاصل کیے۔ کوانٹم میکانیکل تھیوری پروفیسر پال ڈیراک کے نام کے ساتھ منسوب ہے۔ یہ سائنسی نظریہ ایٹم کے انتہائی چھوٹے ذرے سے بحث کرتا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اینٹی میٹر (ANTIMATTER) کی پیش گوئی کی تھی جو بعد میں مزید تحقیقات سے ثابت ہوگئی۔ پال نے ایٹم میں پہلا اینٹی پارٹیکل بھی دریافت کیا جسے پازیٹران (POSITRAN) کہا جاتا ہے۔ اس دریافت نے نیوکلیئر فزکس میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ لوگ جب پال ڈیراک سے پوچھتے کہ اس نے ایٹم کے مادّے کی نوعیت کے بارے میں اپنا چونکا دینے والا نظریہ کیسے دریافت کیا تو وہ بتاتے کہ وہ اپنے کمرے میں اس طرح لیٹ جاتے تھے کہ ان کا سر زمین پر ٹکا ہوتا اور پیر اوپر تا کہ دورانِ خون دماغ کی طرف دوڑے۔ فکری اور دماغی کاموں میں یہ ورزش بہت مدد دیتی ہے کیونکہ اس طرح ان کے سارے جسم کا خون دماغ میں سمٹ آتا ہے اور ہر کام آدمی سے اس کی پوری قوت مانگتا ہے۔

مرسلہ: جاوید شبیر برہ۔ علی پور

گے تو اس کی دولت کی فتح ہوتی رہے گی۔ اگر مصالحت کا راستہ اختیار کیا جائے تو تم تیار ہو جاؤ گے؟''

''مصالحت کیسی انکل۔ اس نے تو طلاق نامے پر بھی میرے دستخط کروا لیے ہیں۔ وہ تو اب مجھے اپنا شوہر بھی تسلیم نہیں کرتی۔''

''تم سمجھے نہیں۔'' انہوں نے کہا ''بیوی بنانے کے لائق تو وہ ہے بھی نہیں۔ طلاق جب نہیں دی جاتی تو اب دے دینا۔ مصالحت سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ کسی طرح تمہیں تمہاری دولت کا کچھ حصہ دینے پر تیار ہو جائے۔''

''بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گی۔''

''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ورنہ پھر کوئی دوسرا راستہ تلاش کریں گے۔''

''یہ کوشش کرے گا کون۔''

''میں جاؤں گا تمہارے بزرگ کی حیثیت سے۔ اس سے بات کروں گا۔ اس کے باپ سے ملوں گا۔ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گا۔''

انہوں نے میری ڈھارس بندھائی۔ مجھے رہنے کے لیے کمرا دیا۔ زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک نہیں لائے۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ دادا جان میری شادی بالکل ٹھیک جگہ کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے جرم نے میرا حصار کر لیا۔ یہ دنیا مکافاتِ عمل ہے۔ میں نے جو گناہ عظیم کیا ہے اس کی سزا یہی ہونا چاہیے تھی۔ جس دولت کے لیے میں نے دادا جان کو قتل کیا، آج اس دولت کے لیے ترس رہا ہوں۔ میں نے جن ہاتھوں سے دادا کو قتل کیا تھا، قدرت نے انہی ہاتھوں کو میری اپنی اولاد کے خون سے رنگین کر دیا۔ وہ دونوں بیٹے تھے۔ میری نسل ہی ختم ہو گئی۔ دادا جان نے ٹھیک کہا تھا کہ اس عورت سے تمہاری نسل نہیں چلے گی۔ اب میرے گناہوں کا کفارہ یہی ہونا چاہیے کہ میں دادا جان کی چھوڑی ہوئی دولت کی ایک ایک پائی کو ترستا رہوں۔ شاید اسی طرح قدرت میرے گناہ کو معاف کر دے۔

میں رات بھر پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی صلاح الدین صاحب کا ملازم ناشتے کے لیے بلانے آ گیا۔ میں نے صلاح الدین صاحب کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ ناشتے کی میز پر بھی تانیہ کی باتیں ہوتی رہیں مگر اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے ایسی دولت نہیں چاہیے تھی۔ میں بے نیازی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ وہ تانیہ کی طرف چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

دوپہر کے قریب وہ تانیہ کی طرف سے آئے تو بہت پریشان تھے۔ ظاہر ہوتا تھا کہ تانیہ نے ان کی بات نہیں مانی ہے۔ جب انہوں نے تفصیل بتائی تو بات صرف اتنی نہیں تھی بلکہ دادا کے قتل کا قصہ بھی درمیان میں آیا تھا۔ بچوں کے قتل کا بہتان بھی اس نے مجھ پر ہی لگایا تھا۔ مجھے جھوٹی قسم اٹھا کر انکل کو مطمئن کرنا پڑا ورنہ انہیں بھی شک ہو گیا تھا کہ دادا کو میں نے ہی قتل کیا ہے۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے کوشش جاری رکھی۔ میرے چند کاروباری دوستوں کو بھی درمیان میں ڈالا اور بالآخر تانیہ کو رضامند کر لیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر میں اسے طلاق دے دوں تو وہ مجھے میرا مکان دے دے گی۔ کاروبار اور نقد رقم وہ اپنے پاس رکھے گی۔ مجھے اب مکان سے غرض تھی نہ اس کی دولت سے۔ طلاق تو میں اسے دل ہی دل میں دے چکا تھا۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی۔ میں نے تحریری طلاق دے کر مکان اپنے قبضے میں کر لیا۔

صلاح الدین صاحب مجھے طرح طرح کے مشورے دینے لگے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ایک مشورہ یہ تھا کہ مکان بیچ کر کوئی کاروبار کر لوں اور ان کے ساتھ رہتا رہوں۔ مجھے یہ مشورہ پسند آیا۔ میں نے مکان بیچ دیا لیکن اس سے ملنے والی رقم اب میرے لیے حرام تھی۔ میں نے تمام رقم انکل کو بتائے بغیر ایک خیراتی ادارے کو دے دی۔

انہیں میں نے بتایا کہ رقم میں نے بینک میں جمع کرا دی ہے اور کاروبار کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا ہوں لیکن دراصل میں نوکری ڈھونڈ رہا تھا۔ چند دن کی تگ و دو کے بعد مجھے ایک جگہ نوکری مل گئی جس سے میں اپنا خرچ اٹھا سکتا تھا۔ میں نے کرائے کا مکان لے لیا۔ اب مجھے انکل کو بتانا پڑا کہ میں نے تمام رقم ایک ادارے کو خیرات کر دی ہے۔ انہوں نے میرے اس اقدام کو پسند نہیں کیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ میں کس گناہ کا ازالہ کر رہا ہوں۔

لالچ کا انجام یہی ہوتا ہے۔ میں جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا ہوں۔ جب دادا نوکری کے لیے کہتے تھے تو میں برا مانتا تھا۔ اب معمولی سی نوکری کر رہا ہوں۔ یہ احساس جرم اندر مجھے کھائے جا رہا ہے کہ میں قاتل ہوں۔ کاش! میں لالچ نہ کیا ہوتا۔ ملازمت تو اس وقت بھی کر رہا ہوتا لیکن قاتل ہونے کا داغ تو نہ لگا ہوتا۔

ہم شیدے پان والے کی دکان کے سامنے تھڑے پر بیٹھے تھے۔ سامنے سے سیاہ گاڑی گزری جسے حسبِ معمول اشرف صاحب گردن اکڑائے ڈرائیو کر رہے تھے۔ انہوں نے ہم پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کی۔ ممکن ہے اس لیے بھی کہ شاید انہیں معلوم تھا ہمارے چہروں پر ان کے لیے سوائے نفرت اور بیزاری کے کچھ نہیں ہے۔ اشرف صاحب کو اس محلے کی سب سے ناپسندیدہ شخصیت ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔

مجھے متوسط طبقے کی اس بستی میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ چھ مہینے پہلے ہی میں اپنے بیوی بچوں سمیت ایک سو بیس گز کے اس مکان میں منتقل ہوا تھا جسے میں نے بڑی دقتوں سے خریدا تھا۔ اپنی ساری جمع پونجی لگانے کے بعد بھی مجھے قرض لینا پڑا تھا تب کہیں جا کر سر چھپانے کے لیے یہ ٹھکانہ ملا تھا۔ شہر کے نواحی علاقے میں سرکار نے یہ جگہ امراء کے لیے رکھی تھی مگر ہوا یہ کہ امراء کو یہ جگہ رہائش کے لیے اچھی نہیں لگی۔ اپنے لیے شوق سے بنائے مکان کرائے پر دے دیتے لیکن

ظالم ہمدرد

وقار عظیم

محترمی معراج رسول صاحب، اسلام علیکم!

ہماری زندگیاں عجیب و غریب واقعات سے پُر ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اپنے اردگرد سے بالکل لاتعلق ہوتے ہیں لیکن بہت سے دوسرے ہمیشہ دوسروں کے غم میں گھلتے رہتے ہیں۔ کسی کے چہرے سے اس کی اصلیت کا پتا لگانا اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ اور پھر ہم میں سے اکثر کا تو کام ہی افواہیں اڑانا یا بہتان تراشی ہے۔ آئیے ایسی ہی ایک کہانی سنائوں۔ ایک ایسے شخص کی کہانی جسے لوگ پہچان نہ سکے۔

خیر طلب

طارق محمود، کراچی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

آنے والے بھی زیادہ عرصے نہیں رہے ان کا بھی دل نہیں لگا۔ مڈل کلاس کے لوگ ان مکانوں بلکہ بنگلوں اور کوٹھیوں کا کرایہ برداشت نہیں کر سکتے تھے' اسی لیے ان میں سے بیشتر مکان خالی پڑے کھنڈر ہو رہے تھے۔

باقی جن لوگوں نے پلاٹ خریدے تھے انہوں نے اپنے پیسے وصول کرنے کے لیے ان پلاٹوں کے ٹکڑے کر کے کم آمدنی والے لوگوں کو بیچنا شروع کر دیئے۔ یوں بے ترتیب پلاٹ وجود میں آ گئے۔ لوگوں نے اپنے مکانوں کا رقبہ بڑھانے کے لیے گلیاں گھیرنا شروع کر دیں اور سرکار کی طرف سے گلیوں کی جو تیس چالیس فٹ کی حد رکھی گئی تھی وہ سکڑ کر پندرہ بیس فٹ کی رہ گئی۔ مکان آگے پیچھے ہونے سے یہ گلیاں کبھی ٹیڑھی میڑھی ہو گئی تھیں اور آبادی کسی کچی آبادی کا منظر پیش کرنے لگی تھی۔ بہت سارے لوگوں نے اپنے پلاٹ بیچنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔ ان کے ان پلاٹوں پر ایسے غریب غربا آ کر بیٹھ گئے جو کرائے کے مکان بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے وہ جھونپڑیاں ڈال کر رہنے لگے۔ مجموعی طور پر یہ ایک ایسی آبادی کا روپ دھار گئی تھی۔ جہاں کوئی نفیس مزاج شخص رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

مجھے یہاں پر رہائش اختیار کرنے میں یوں بھی کوئی پریشانی نہیں تھی کہ میں اس سے پہلے جہاں رہ رہا تھا وہ سچ مچ کچی آبادی تھی۔ وہاں صرف بجلی کی سہولت تھی' وہ بھی کنڈے کی مدد سے..... میں قریب ہی ایک سپر اسٹور میں سیلز مین تھا۔ سیلز مین کیا بلکہ مالک نے پورا اسٹور مجھے سونپ دیا تھا اور خود یونیورسٹی روڈ پر ایک اور شاپنگ سینٹر بنوانے میں مصروف تھا۔ میں گزشتہ بیس سال سے اس کے پاس کام کر رہا تھا۔ میری امانت و دیانت داری سے متاثر ہو کر اس نے یہ پورا اسٹور میرے حوالے کر دیا تھا۔ مین روڈ اور آبادی علاقے میں ہونے کی وجہ سے سیل خاصی تھی۔ روزانہ رات کو جب مالک آتا تو میں تیس چالیس ہزار روپے اس کے حوالے کرتا تھا۔ وہ مجھ پر اتنا یقین رکھتا تھا کہ اس نے کبھی حساب کتاب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا کہ اسٹور کی آمدنی میں کمی نہیں آئی تھی۔ اضافہ ہی ہوا تھا۔

خوش قسمتی سے جس گلی میں میرا مکان تھا وہ سیدھی تھی اور اس میں تقریباً سارے ہی مکان ترتیب سے اور صفائی سے بنے تھے۔ سوائے گلی کے آخری مکان سے پہلے والے خالی پلاٹ کے۔ اس پر ایک غریب خاندان نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہ خاصا بڑا خاندان تھا۔ چار سوگز کے اس پلاٹ پر کوئی دس سال سے آباد تھا۔ جس کے اندر چار پانچ کچے کمرے تھے۔ اس پلاٹ پر دس بارہ افراد رہتے تھے جو ایک ہی خاندان کے تھے۔ کنڈے سے بجلی لے رکھی تھی۔ پانی آس پاس کے گھروں سے بھرا کرتے تھے اور کھانا بنانے کے لیے لکڑی جلاتے تھے۔ سرِ شام اس جگہ سے دھواں اٹھتا نظر آتا تھا۔

اس پلاٹ سے اگلا مکان بلکہ بنگلہ اشرف صاحب کا تھا۔ جس میں وہ منتقل کوئی چھ مہینے پہلے ہوئے تھے۔ گویا میں اور وہ اس علاقے میں ساتھ ہی آئے تھے۔ ان کا پہلا تاثر منفی تھا۔ میں اس روز صبح نو بجے کے قریب اسٹور جانے کے لیے نکل رہا تھا کہ ایک متوسط قد کے ادھیڑ عمر شخص کو جھونپڑی والے پلاٹ کے سامنے کھڑے گرجتے برستے پایا۔

''کتوں کی سی زندگی گزار رہے ہو تم لوگ۔ یہ کیا گند پھیلا رکھا ہے۔'' ان کا اشارہ گلی میں بہتے گندے پانی کی طرف تھا۔ اس پانی میں غلاظت بھی تھی۔ جھونپڑی والے ان صاحب کے سامنے ڈرے سہمے کھڑے تھے اور محلے کے کچھ لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان صاحب کا واعظ جاری تھا۔

''جانور بھی جس جگہ رہتا ہے اسے صاف رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تم لوگ کیا جانوروں سے بھی گئے گزرے ہو۔''

اس خاندان میں دو تین مرد بھی تھے لیکن وہ محنت مزدوری کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ صرف عورتیں اور بچے تھے اور وہ ان صاحب کے غیض و غضب کے سامنے ڈرے سہمے سے کھڑے تھے۔ آخر مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور میں نے آگے بڑھ کر کہا ''جناب..... آرام سے..... آپ اتنا غصہ کیوں کر رہے ہیں؟''

''یہ دیکھیں جناب ان لوگوں نے کتنی گندگی کی ہے۔ سارا گندا پانی گلی میں آ رہا ہے۔ آنے جانے والوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے اور یہ لوگ!'' انہوں نے ایک قہر آلود نظر سہمی ہوئی عورتوں پر ڈالی ''کیسے پانی بہا رہے ہیں۔''

''جناب اس بستی کی گلیوں میں اس طرح گندا پانی بہتا رہتا ہے۔ یہ تو غریبوں کی بستی ہے۔'' میں نے یوں کہا جیسے ان سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ اس گندی بستی میں کیا لینے آ گئے۔ وہ میرے لہجے سے مفہوم پا گئے۔

''غریب ہیں یا جانور۔ ایسے تو جانور بھی نہیں رہتے۔'' انہوں نے تلخی سے کہا پھر عورتوں سے بولے ''کل سے میں نے تم لوگوں کو گلی میں پانی بہاتے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں تم لوگوں کی شکایت کروں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پیر پٹختے اپنے عالیشان مکان کی طرف چلے گئے۔ ان صاحب کے جانے کے بعد میں نے ان کے گھر کے سامنے رہنے والے ارشد بھائی سے پوچھا۔

''یہ کون ہیں ارشد بھائی؟''

''طارق میاں..... ابھی آئے ہیں۔ کل ہی شفٹ ہوئے ہیں۔ نام اشرف خان ہے۔ سنا ہے اکیلے آدمی ہیں اور مزاج کے کیسے ہیں آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔''

''بالکل فرعون بن رہے تھے۔'' میں نے منہ بنایا ''بے چاروں پر بلاوجہ خفا ہو رہے تھے۔''

''خراب بلاوجہ بھی خفا نہیں ہو رہے تھے۔'' ارشد بھائی دھیمے لہجے میں بولے ''یہ لوگ واقعی بہت گند کرتے ہیں۔ اب دیکھو اس پانی میں انسانی غلاظت بھی ہے۔ لوگوں کے پاؤں اس پر لگیں گے تو گھروں میں جائے گی یہ گندگی۔ یہاں سے گزرنے والے اندازیوں کے کپڑے خراب ہوں گے۔''

میں نے تسلیم کیا ''آپ نے درست کہا..... لیکن ان کے کہنے کا انداز درست نہیں تھا۔ اگر وہ جیسے والے ہیں تو انہیں غریبوں کو ذلیل کرنے کا حق تو نہیں مل گیا ہے۔''

''طارق بھائی نے ٹھیک کہا۔'' میرے برابر میں رہنے والا نعمان بولا ''اس شخص کو کوئی حق نہیں کہ کسی غریب کو یوں ذلیل کرے۔''

نعمان کا باپ کسی مل میں مزدور تھا اور نعمان بھی اس کے ساتھ ہی کام پر جاتا تھا۔ کم سے کم اس کا کہنا یہی تھا۔ ورنہ میں نے اسے اکثر گھر پر ہی پایا تھا اور اس وقت جو وہ تڑپ کر بولا تھا۔ اس کے پسِ پشت غریبوں کی ہمدردی سے زیادہ ان جھونپڑیوں میں رہنے والی ایک نوجوان اور کسی قدر پرکشش لڑکی تھی۔ اس کا نام امینہ تھا اور محلے میں مشہور تھا کہ نعمان اس کے چکر میں رہتا ہے۔ میں نے خود کئی بار نعمان کو ان پلاٹ کی جھاڑی نما باڑھ کے آس پاس منڈلاتے پایا تھا اور ایک بار میں نے اسے ٹوکا بھی تھا ''میاں یہ کیا حرکت ہے۔ اس طرح کسی کے گھر کے پاس پھرتے رہنا اچھی بات نہیں ہوتی۔''

''مم..... میں تو اس طرف سے گزر رہا تھا۔''

''چلو گزر رہے تھے لیکن کسی کے گھر کی چار دیواری نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اس میں جھانکتے ہوئے جائیں۔''

''جی..... میں آپ کو آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔'' اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

میں ہنسا ''مجھے کیا شکایت کا موقع دو گے۔ بس یہ خیال رکھنا یہ لوگ غریب پر عزت دار ہیں۔ ان کی عورتوں کو بلاوجہ باہر جاتے نہیں دیکھا اور ان کے مرد سخت ہیں۔''

''جی میں سمجھ رہا ہوں۔'' نعمان خوف زدہ ہو گیا تھا۔

پہلی گھڑی

دنیا کی سب سے پہلی گھڑی خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں یونس نامی ایک مسلمان سائنس دان نے ایجاد کی۔ خلیفہ نے یہ شاندار اور حیرت انگیز ایجاد بطور تحفہ عظیم رومی سلطنت کے بانی اور شہنشاہ فرانس شارلیمان (CHARLEMAGNE) کو بھیجی۔ نامور فرانسیسی مؤرخ ڈاکٹر گستاوُلی بون (GUSTAVE LEBON) لکھتے ہیں۔

''ہارون الرشید نے فرانسیسی سفیر کے ذریعے جو قیمتی تحائف بادشاہ فرانس کو روانہ کیے ان میں سب سے زیادہ اہم وہ گھڑی تھی جو وقت بتاتی تھی۔ اور ہر گھنٹے پر گھنٹی بجاتی تھی۔ شارلیمان اور اس کے مصاحبین اس گھڑی کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے اور پورے دربار میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو اس گھڑی کی بناوٹ کو سمجھ سکتا۔''

مرسلہ: ہمایوں دین پوری۔ خان پور کٹورا

میرا خیال تھا کہ میرے سمجھانے کا اثر ہوگا۔ مگر یہ عمر سمجھنے والی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی میں نے نعمان کو کئی بار اس پلاٹ کے آس پاس دیکھا تھا لیکن اتنا تھا کہ مجھے دیکھتے ہی وہ وہاں سے سرک جاتا تھا۔ میں نے اسے اور لڑکیوں کے چکر میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے شاید امینہ سے محبت ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے اسے اشرف صاحب کا جھونپڑی والوں کو برا بھلا کہنا کھل رہا تھا۔ وہ ان کے سامنے تو کچھ نہیں بولا تھا لیکن ان کے جانے کے بعد خاصا بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔ اشرف صاحب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

میں کام پر چلا گیا۔ جب شام کو واپس آیا تو پلاٹ کے سامنے زمین صاف تھی۔ اگرچہ نمی تھی لیکن پانی اور گند صاف کر دیا گیا تھا۔ میں نے ارشد بھائی سے پوچھا ''یہ کام کس نے کیا ہے؟''

''ظاہر ہے ان عورتوں نے ہی کیا ہوگا۔'' وہ بے پروائی سے بولے ''ورنہ اشرف صاحب نے کل صبح پھر ان کی جان کھانی تھی۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اس شخص کو کم سے کم عورتوں کا خیال کرنا چاہیے۔'' میں نے نفرت سے کہا ''اصل میں اسے دولت کا غرور لگتا ہے ان بے چاروں کو یہ انسان ہی نہیں سمجھتا ہے شاید۔''

بستی میں تین چار سو گھر تھے اور اس کا مرکز شیدے پان والے کا کھوکھا تھا۔ جو آبادی کی طرف آنے والی سڑک پر تھا

اور آبادی کے بالکل شروع میں۔ اسے مرکز میں نے اس لیے کہا کہ شام کو اپنے کاموں سے لوٹنے والے افراد چند گھڑی کے لیے اس طرف ضرور آتے تھے۔ بعض کی تو یہ گھنٹوں کی بیٹھک تھی۔ شیدے پان والے کے ساتھ ہی ایک جھگی ہوٹل تھا۔ جہاں کھانے کے ساتھ چائے بھی مل جاتی تھی۔ ہوٹل والے نے سامنے میدان میں سڑک کے دونوں طرف میزیں اور بینچیں ڈال رکھی تھیں۔ ہمارا ڈیرا ان پر ہی جمتا تھا۔ میں روز صبح دس سے شام سات بجے تک اسٹور پر ہوتا تھا۔ مالک اس وقت آکر مجھے چھٹی دے دیتا تھا۔ ساڑھے سات بجے گھر آکر کھانا کھا کر اور کچھ آرام کر کے میں شیدے کے کھوکھے کا رخ کرتا تھا۔ وہاں میں گھنٹا بھر تو بیٹھتا ہی تھا۔

اس رات میں ڈیرے پر پہنچا تو صبح والے واقعے کا ذکر چل رہا تھا۔ تذکرہ اشرف صاحب کی سخت دلی کا تھا۔ تقریباً سب نے ان کے طرزِ عمل کو ناپسند کیا تھا۔ ایک دو نے دبی زبان میں کہا بھی کہ جھونپڑی والوں نے بھی اچھی حرکت نہیں کی تھی لیکن ان کی کسی نے سنی نہیں۔ سب کو جھونپڑی والوں سے ہمدردی تھی اور اشرف صاحب پر غصہ آرہا تھا۔ خاصی دیر یہ موضوع چلتا رہا پھر لوگ اپنی باتوں میں مگن ہوگئے۔ اگلے دو تین دن میں لوگ اسے بھول بھی گئے تھے مگر اشرف صاحب کے بارے میں بات کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی سے ملتے نہیں تھے۔ سلام دعا بھی نہیں کرتے تھے۔ آتے جاتے نظر آتے تھے۔ روز اپنی بڑی سی سیاہ کار میں جاتے اور اکثر رات گئے ان کی واپسی ہوتی۔ وہ گھر سے نکلتے ہی نہیں تھے۔ ان کے گھر میں ایک ہی شخص نظر آتا تھا۔ صورت وشکل سے بنگالی نظر آنے والا یہ شخص باورچی تھا۔ اس کے علاوہ ہفتے میں دو تین دن ایک مالی آتا تھا اور ایک صفائی کرنے والی ادھیڑ عمر عورت آتی تھی۔ جو صبح آتی اور دوپہر کو چلی جاتی تھی۔ ان کا باورچی بھی ہفتے میں ایک بار چھٹی والے دن خود گاڑی لے کر نکلتا تھا اور سارے ہفتے کا سامان ایک ساتھ ہی لے آتا تھا اس کے علاوہ وہ گھر سے نہیں نکلتا تھا۔ حتیٰ کہ بستی کی کسی دکان سے کچھ لیتا بھی نہیں تھا۔

کئی مہینے گزرے تو لوگ اس معاملے کو تقریباً بھول گئے تھے مگر اشرف صاحب کے لیے ان کی ناپسندیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی وجہ اشرف صاحب کی بے نیازی تھی۔ جو غرور کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بستی کے لوگ ان کے نزدیک انسان نہیں تھے۔ ان کی شان دار کوٹھی ان کی شخصیت کی طرح اکیلی اور کسی قدر پُراسرار نظر آتی تھی کیونکہ اب بستی میں اتنی بڑی کوٹھی واحد اشرف صاحب کی رہ گئی تھی۔ باقی یا تو تقسیم ہوگئی تھیں یا ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ میری گلی اس کے آغاز میں ہی تھی۔ یعنی مین روڈ سے دوسری گلی تھی پھر بستی آگے پھیلتی چلی گئی تھی۔ آبادی خاصی تھی لیکن اردگرد آبادی نہ ہونے کی وجہ سے کم لگتی تھی۔

اس تنہائی نے لوگوں کو مجبور کر دیا تھا کہ ایک دوسرے کے پاس آئیں۔ بستی میں ہر فرد دوسرے کو جانتا تھا۔

حالانکہ اب اسی شہر میں پڑوسی پڑوسی کو نہیں جانتا ہماری بستی میں ایسی بات نہیں تھی۔ ہاں اشرف صاحب کی مثال الگ تھی۔

پھر ایک چھٹی والے دن میں حسبِ معمول دیر تک سو رہا تھا۔ کیونکہ ایک اس دن جی بھر کے سونے کو مل جاتا تھا۔ اچانک بیوی نے مجھے جھنجوڑ کر اٹھایا ''دیکھیں..... باہر کیا شور ہو رہا ہے۔ اشرف صاحب اور پلاٹ والوں میں جھگڑا ہو رہا ہے۔''

میں چونک کر اٹھا۔ منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور باہر آیا۔ جہاں اشرف صاحب ایک بار پھر پلاٹ والوں پر گرج برس رہے تھے۔ اس بار ان میں مرد بھی تھے۔ ظاہر ہے چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ بھی گھر پر ہی تھے۔ ان کے پاس دو مزدور نما افراد کلہاڑیاں تھامے کھڑے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہ اشرف صاحب کے گماشتے ہوں اور آج مار دھاڑ کا پروگرام بھی ہو۔ ایسے میں بعض اوقات دخل اندازی کرنے والوں کی بھی گوشمالی ہو جاتی تھی لیکن پھر دل کڑا کر کے آگے بڑھا اس بار پہلے سے زیادہ اہلِ محلہ جمع تھے۔ وجہ وہی چھٹی کا دن تھا۔ ایسے میں دلچسپی جاگ کر میں نکلے والوں کی نظر میں بزدل نہیں بننا چاہتا تھا لیکن پاس جا کر اندازہ غلط ثابت ہوا۔ کلہاڑی بردار اصل میں مزدور ہی تھے ان کی کلہاڑیاں ہتھیار نہیں بلکہ اوزار تھے۔ جن کی مدد سے وہ جھاڑیاں اور لکڑی وغیرہ کاٹتے تھے۔

''میں یہ جھاڑیاں ضرور کٹواؤں گا۔'' اشرف صاحب نے تیز لہجے میں اپنے مکان کے ساتھ اُگی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''صاحب ان سے ہمیں تحفظ ہے۔'' جھونپڑی میں رہنے والے مردوں میں سب سے معمر شخص بولا۔ اس کا نام شاید جمعہ تھا ''پھر صاحب ان سے پردہ رہتا ہے۔''

''تم لوگ کچی دیوار بھی بنا سکتے ہو لیکن یہ جھاڑیاں خطرناک ہیں۔ ان میں سانپ بچھو رہتے ہیں۔''

''ہمیں رہتے ہوئے برسوں ہوگئے پر اب تک کوئی سانپ بچھو نہیں ملا۔'' جمعہ نے کہا تھا۔

''ان جھاڑیوں سے گندگی پھیلتی ہے مچھر مکھیاں پیدا ہوتے ہیں پھر یہ میرے گھر کے اندر تک چلی آتی ہیں۔ ان کو کاٹنا میرا حق ہے۔ چلو تم لوگ اپنا کام کرو۔'' اشرف صاحب نے مزدوروں کو للکارا تو وہ جلدی سے کلہاڑیاں سنبھال کر جھاڑیوں کی طرف لپکے مگر جھونپڑی والے مردوں نے انہیں روک لیا۔

''نہیں صاحب..... ہم یہ جھاڑیاں نہیں کاٹنے دیں گے۔'' خالق نامی نوجوان نے سخت لہجے میں کہا۔ وہ جمعہ کا بیٹا تھا۔

''کیوں نہیں کاٹنے دو گے؟'' اشرف صاحب بھڑک اٹھے تھے ''یہ میرے گھر کی حدود میں آرہی ہیں۔ انہیں کاٹنا میرا حق ہے۔''

بوڑھے جمعہ نے بھانپ لیا تھا کہ اب بات جھگڑے کی حد میں داخل ہو رہی ہے اور جھگڑے میں نقصان ہمیشہ کمزور فریق کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ پلاٹ ان کا نہیں تھا بلکہ وہ اس قبضہ کیے بیٹھے تھے جھگڑا ہوتا اور بات پولیس تک جاتی تو یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں اس جگہ سے نکلنا پڑتا۔ اس لیے جمعہ نے پہلے تو اپنے بیٹے کو ڈانٹ کر پیچھے کیا اور پھر عاجزی سے اشرف صاحب سے بولا۔

''سرکار۔ ہم غریب لوگ ہیں آپ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتے پر یہ جھاڑیاں ضروری ہیں۔ ادھر بچیاں ہیں عورتیں ہیں۔ جھاڑیاں نہیں ہوں گی تو آتے جاتے لوگ انہیں دیکھیں گے۔ آپ مہربانی کرو۔ اتنی جھاڑی کٹوا دو جتنی آپ کے گھر تک آرہی ہے۔ باقی چھوڑ دو۔''

''تاکہ جھاڑیاں پھر بڑھ جائیں اور میں بار بار کٹواتا رہوں۔'' اشرف صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں صاحب آئندہ ہم خود خیال رکھیں گے۔ جھاڑی کاٹتے رہیں گے۔'' جمعہ نے یقین دہانی کرائی۔

اشرف صاحب کچھ دیر ان لوگوں کو تیز نظروں سے گھورتے رہے پھر بولے ''آج میں چھوڑ رہا ہوں لیکن آئندہ جھاڑیاں میرے گھر تک آئیں تو بلڈوزر چلوا دوں گا۔''

یہ کہہ کر اشرف صاحب اپنے گھر میں چلے گئے۔ مزدور جھاڑیاں کاٹنے میں لگ گئے۔ جمعہ کے بیٹے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے لیکن باپ کے سامنے بول بھی نہیں سکتے تھے۔ مزدوروں نے جھاڑیاں تراش کر کم کر دیں کہ اب وہ نہ تو گلی تک آرہی تھیں اور نہ اشرف صاحب کے گھر کی دیوار تک جارہی تھیں۔ اس دوران میں محلے والے ٹولیوں میں جمع ہو کر اس واقعہ پر تبصرے کر رہے تھے۔ اکثر کا انداز جھونپڑی والوں سے ہمدردی پر مبنی تھا۔ حیرت ہے جب اشرف صاحب تھے تو کسی نے جھونپڑی والوں کی حمایت کی جرأت نہیں کی تھی اور جب وہ چلے گئے تو سب بڑھ چڑھ کر ان کے خلاف بول رہے تھے۔ میں بھی ان محلے والوں میں شامل تھا۔ جمعہ کی مصالحانہ کوشش اور ذہانت نے سب کو متاثر کیا تھا۔ سب اس کی تعریف کر رہے تھے۔

''پر صاحب..... یہ شخص کچھ زیادہ ہی مغرور ہے۔ روز کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ان بے چاروں کی زندگی عذاب کرتا رہے گا۔'' ایک محلے دار توفیق نے کہا۔

''اصل بات یہ ہے کہ اسے اپنے عالیشان مکان کے برابر میں یہ جھونپڑیاں برداشت نہیں ہیں۔'' میں نے بھی اظہارِ خیال کیا ''اشرف خان چاہتا ہے کہ کسی بہانے یہ پلاٹ ان لوگوں سے خالی کرا لے۔''

''عین ممکن ہے اس کی خود اس پلاٹ پر قبضے کی نیت ہو۔'' ارشد بھائی نے بھی حصہ لیا ''اتنا بڑا پلاٹ ہے اور اس کے مالک کا کچھ پتا ہی نہیں ہے۔''

میرے خیال میں خود ارشد بھائی کی نیت اس پلاٹ پر تھی۔ انہوں نے ایک بار شیدے پان والے ڈیرے پر بیٹھے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کسی طرح ان جھونپڑی والوں سے یہ پلاٹ خالی کرا لیا جائے تو ہم دونوں مل کر اس پر قبضہ کر سکتے تھے پھر کوئی چکر چلا کر پلاٹ اپنے نام بھی کیا جا سکتا تھا۔ چار سو گز کے پلاٹ کے کوئی چار ٹکڑے آسانی سے کیے جا سکتے تھے۔ ایک پلاٹ دو لاکھ میں بھی بکتا تو آٹھ لاکھ مل سکتے تھے۔ ارشد بھائی کے 'ڈی' اے میں جاب کرتے تھے ان کے لیے یہ سارے چکر نئے نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خرچہ نکال کر دونوں کے حصے میں تین تین لاکھ روپے آسکتے تھے۔ اتنی رقم کا سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ میرے پاس اتنی رقم آئی تو میں اپنا جنرل اسٹور کھول سکتا تھا مگر پھر میری فطری بزدلی آڑے آئی۔ نہ جانے یہ پلاٹ کن لوگوں کا تھا۔ چار سو گز کا پلاٹ غریب غربا تو لیتے نہیں ہیں۔ ایسی پارٹی اگر پیچھے پڑ جاتی تو میں مارا جاتا اس لیے میں نے ارشد بھائی کو ٹال دیا۔ شاید ان کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جھگڑا ہوتا اور ارشد بھائی بھی جھگڑے سے گھبرانے والے شخص تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مزدوروں نے جھاڑیاں تراش کر بالکل چھدری کر دی تھیں۔ اب یہ گلی سے دور تھیں اور اشرف صاحب کے مکان کی دیوار سے بھی دور تھیں۔

اب تک اشرف صاحب کے بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ ان کے گھر

والے کہاں ہیں اور ہیں بھی یا نہیں۔ شروع میں سب کو ان کے پس منظر کی کرید لگی رہی تھی لیکن رفتہ رفتہ سب بھول گئے پھر ایک روز میں اسٹور سے واپس آ رہا تھا کہ بس سے اترتے ہی ارشد بھائی نظر آ گئے۔ وہ اپنے اسکوٹر پر سوار تھے مجھے دیکھ کر رک گئے ''کیا حال ہیں طارق بھائی؟''

''اللہ کا کرم ہے۔ آپ سنائیں؟''

''بس یار آج ایسی خبر ملی ہے کہ تمہیں سناؤں گا تو حیران رہ جاؤ گے۔''

''تو سنا دیں خبر اور ہے کس بارے میں؟''

''ابھی نہیں۔ ابھی تو میں بائیک کا کچھ کام کرانے جا رہا ہوں۔'' ارشد بھائی نے کہا ''رات کو شیدے کے ڈیرے پر ملاقات ہوگی تب بتاؤں گا۔ اچھا اللہ حافظ!'' وہ عجلت میں اسکوٹر اسٹارٹ کر کے چلے گئے اور میں دل ہی دل میں انہیں برا بھلا کہتا رہ گیا۔ دراصل مجھے کسی بات کی بھنک لگ جائے اور پھر پوری بات کا علم نہ ہو تو مجھے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ دل ارشد بھائی والی بات میں اٹکا ہوا تھا۔ نو بجتے ہی میں گھر سے نکل گیا۔ عقب سے بیوی آوازیں دیتی رہ گئی تھی۔ ارشد بھائی عام طور سے رات نو بجے شیدے کی دکان پر آتے تھے مگر اس روز وہ اب تک نہیں آئے تھے۔

میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

رات ساڑھے نو بجے کے قریب ارشد بھائی چمکتے ہوئے آئے تھے ''مجھے یقین تھا کہ اپنا یار انتظار کر رہا ہوگا۔''

''تبھی آپ آدھا گھنٹا دیر سے آئے۔'' میں نے شکوہ کیا۔

ارشد بھائی ہنسے ''ارے یار۔ ابھی جو میں خبر سناؤں گا اسے سن کر ساری کوفت دور ہو جائے گی۔ چائے کا آرڈر تو دو یار۔''

''آپ نے بھی چھوڑنا نہیں۔'' میں مسکرایا اور ہوٹل والے سے چائے کا کہہ دیا ''اب بتا دیں ارشد بھائی۔''

''یہ جو اپنے اشرف خان صاحب ہیں۔'' ارشد بھائی نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا ''پتا ہے ان کا تعلق کس خاندان سے ہے۔''

''نہیں..... مجھے کیا معلوم ہے.....''

''ابے..... یہ مولانا..... کے خاندان سے ہیں۔'' ارشد بھائی بولے تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ انہوں نے ایک نامور عالمِ دین کا نام لیا تھا جن کا پورا ہی خاندان دین کی خدمت میں مصروف تھا۔ تصوف سے لے کر سیاست تک ہر طبقے میں وہ معروف تھے۔

''ارے نہیں بھائی!'' میرے منہ سے نکلا۔

''ہاں یار۔ یہ اشرف خان صاحب اس خاندان کے ہیں اور پتا ہے موصوف کو خاندان سے نکالا دیا گیا ہے۔''

''مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''لیکن کیوں نکالا گیا۔''

''اس کے پیچھے بھی لمبی کہانی ہے۔ یہ اپنے خان صاحب ایک طوائف پر عاشق ہو گئے تھے۔ اس کے چکر میں ایسے پاگل ہوئے کہ سارے شہر کو ان کے کرتوتوں کا علم ہو گیا تھا۔''

''اور ان کے خاندان والوں نے انہیں نکال دیا۔'' میں نے لقمہ دیا۔ جس پر ارشد بھائی نے مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں اس لیے نہیں۔ بلکہ خان صاحب کے دیس نکالا کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس طوائف کو شادی کر کے گھر لے آئے تھے۔ اس پر خاندان میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ اشرف صاحب کے والد غصے میں آ گئے اور انہوں نے اشرف صاحب کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس وقت اشرف صاحب خالی ہاتھ تھے۔ طوائف نے اپنی کمائی کے دنوں میں دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی تھی۔ وہ سچ مچ اشرف صاحب سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس لیے اس نے اپنی ساری دولت خان صاحب کے حوالے کر دی۔ اس دولت سے انہوں نے کاروبار جمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی ہو گئے پھر قضائے الٰہی سے ان کی بیگم بیمار ہوئیں اور چند دن میں چٹ پٹ ہو گئیں۔ لوگوں نے بڑی باتیں بنائیں۔ ایک افواہ یہ بھی تھی کہ طوائف بیگم اپنے پرانے دھندوں کی طرف لوٹ گئی ہیں۔ خان صاحب سے یہ برداشت نہیں ہو سکا اس لیے انہوں نے بیگم کا کام تمام کر دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خان صاحب کا ان سے دل بھر گیا تھا اور وہ دولت مند بھی ہو چکے تھے اس لیے انہوں نے ان سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔''

''میرے خدایا خان صاحب تو چھپے رستم نکلے!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اس سے بھی زیادہ..... بیگم کے مرنے کے بعد انہوں نے وہ کوٹھی چھوڑ دی اور یہاں مکان بنوا کر رہنے لگے۔ آج بھی ان کے خاندان کا کوئی فرد انہیں منہ لگانے کو تیار نہیں ہے۔''

''یہ کام کیا کرتے ہیں؟''

''شہر میں کاروں کا بڑا سا شوروم ہے۔ اس سے لاکھوں کی آمدنی ہے اور دولت ان کے پاس اتنی ہے کہ ساری عمر کھل کر بھی خرچ کریں تب بھی نہ کم ہو۔''

''پھر انہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''بس یار آدمی کو دولت کی ہوس بھی تو ہوتی ہے۔'' ارشد بھائی بے پروائی سے بولے۔

''میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا کہ اتنے پیسے والے شخص کو اس معمولی سی بستی میں آ کر رہنے کی کیا ضرورت ہے جو شہر سے باہر بھی ہے۔''

''ممکن ہے وہ اپنے کسی چکر کو چھپانے کے لیے یہاں آیا ہو۔ طوائفوں کے چکر میں پڑنے والا شخص مر کر ہی اس چکر سے نکلتا ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''اشرف صاحب نے کم سے کم اس محلے میں ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ نہ تو ان کے ساتھ اور نہ ہی اکیلے میں کسی نوجوان عورت یا لڑکی ان کے گھر آتی جاتی نظر آئی۔''

''ممکن ہے یہ دھندا وہ کہیں اور چلاتے ہوں۔'' ارشد بھائی نے خیال ظاہر کیا۔

''پر یار ارشد بھائی۔ سوال وہی ہے آخر انہیں اس جگہ آ کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے بتایا کہ شہر میں ان کی عالیشان کوٹھی ہے۔ کیا وہ کرائے پر دے دی ہے۔''

''نہیں..... خالی پڑی ہے۔ یہ سنا ہے کبھی کبھی وہاں رہتے ہیں۔''

''اور یہ ساری باتیں آپ کے علم میں کیوں کر آئیں؟''

ارشد بھائی نے چائے کی چسکی لی ''یار میرے دفتر میں ایک نیا بندہ آیا ہے۔ پہلے وہ اشرف صاحب کے ساتھ ہوتا تھا اس سے ہی ساری باتیں میرے علم میں آئی ہیں۔ ایک روز اتفاق سے خان صاحب کا ذکر نکل آیا تو وہ چونک گیا پھر اس نے مجھے ساری کہانی سنائی۔''

''ممکن ہے وہ گپ مار رہا ہو۔'' میں نے کہا۔

ارشد بھائی نے نفی میں سر ہلایا ''میں اسے جانتا ہوں وہ گپ مارنے والا آدمی نہیں ہے۔ ورنہ اور معاملوں میں بھی گپ ضرور مارتا۔''

میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ اشرف صاحب نے کبھی ایسا تاثر نہیں دیا کہ وہ اتنے بڑے مذہبی خاندان سے ہیں۔ ان کے کسی انداز سے نہیں لگتا تھا کہ انہیں مذہب سے کوئی دلچسپی ہے اور جس طرح وہ غریب جھونپڑی والوں کے پیچھے پڑ گئے تھے اس سے لگتا تھا کہ وہ انسانیت سے بھی عاری تھے۔ اتنی دولت رکھنے کے باوجود ان کی نظر اس پلاٹ پر تھی۔ شاید ان کا خیال تھا کہ اس پلاٹ کا مالک مر کھپ گیا تھا یا اپنا پلاٹ بھول گیا تھا۔ اس لیے وہ اس پر قبضہ کر سکتے تھے۔ اصل رکاوٹ پلاٹ پر رہنے والے لوگ تھے۔ وہ اس طرح تنگ کر کے انہیں یہاں سے بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر ان دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ جس نے بستی والوں کے دل میں اشرف صاحب کے لیے موجود ناپسندیدگی کو نفرت کی حد تک بڑھا دیا تھا۔ اس روز لائٹ گئی ہوئی تھی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ گرمی کی وجہ سے اکثر لوگ خاص طور سے مرد اور بچے گھروں سے باہر تھے۔ میں بھی اپنے گھر کے سامنے چبوترے پر بیٹھا تھا۔ اچانک اشرف صاحب کی سیاہ کار خاصی تیز رفتاری سے گلی میں داخل ہوئی۔ جیسے ہی وہ پلاٹ کے نزدیک پہنچے۔ جھونپڑی کی جانب سے ایک بچہ تیزی سے بھاگتا ہوا آیا۔ اشرف صاحب نے کار کے بریک لگائے لیکن اتنی کم جگہ میں بریک لگانا ممکن نہیں تھا۔ کار رکتے رکتے بھی بچے سے جا ٹکرائی۔ کار کی قوت نے اسے اچھال دیا تھا اور وہ خاصی دور زمین پر جا گرا۔ اس کی چیخ اور کار کی بریکوں نے سب کو چونکا دیا تھا۔ لوگ بھاگے۔ کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بچہ زمین پر پڑا تھا اس کے جسم کے کئی حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ بچہ ساکت تھا۔ ارشد بھائی نے اسے دیکھا۔ اس دوران میں اشرف صاحب بھی کار سے اتر آئے تھے۔ حسبِ معمول انہوں نے چیخنا شروع کر دیا تھا۔

''تم لوگ بچوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہو۔''

جھونپڑیوں سے روتی پیٹتی عورتیں نکلی تھیں۔ بچہ خالق کا لڑکا تھا۔ مشکل سے سات آٹھ سال کا تھا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا ''وہ تو بچہ تھا اور آپ جو گلی میں اتنی تیز گاڑی چلا رہے تھے۔ آپ کو رفتار کم رکھنی چاہیے تھی۔''

میری بات سن کر وہ چپ سے ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں ارشد بھائی نے سر اٹھایا ''بچہ زندہ ہے اسے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔''

''جناب آپ اسے اسپتال لے جائیں۔'' میں نے کسی قدر نرم لہجے میں اشرف صاحب سے کہا۔

''اچھا۔'' کسی قدر تذبذب کے ساتھ وہ گاڑی میں جا بیٹھے۔ بچے کے ماں باپ اسے لے کر کار کی عقبی نشست پر آ بیٹھے۔ اب اشرف صاحب نے کار اسٹارٹ کرنے کی کوشش شروع کر دی مگر کار تھی کہ اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ انجن نے ذرا سی بھی جنبش نہیں کی۔ ایسا لگتا تھا کہ دھچکے سے کار رکنے سے اس کے اندر کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ اشرف صاحب نے جھلا کر بچے کی روتی ماں کو ڈانٹا ''چپ کر..... یہ کار بھی کم بخت اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔''

خالق جو اپنے بچے کی حالت دیکھ دیکھ کر کھول رہا تھا۔

اشرف صاحب کے لہجے کو برداشت نہ کرسکا۔ وہ گاڑی سے اترا اور چلا کر بولا ''خان صاحب اگر میرے بچے کو کچھ ہوا تو میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔''

خالق اور اس کے ساتھی بچے کو پیدل ہی لے کر بھاگے۔ آگے جا کر انہیں گاڑی بھی مل گئی تھی مگر بچہ جتنی سانسیں لایا تھا وہ پوری ہو چکی تھیں۔ وہ اسپتال تک بھی نہ پہنچ سکا تھا۔ اشرف صاحب اپنے گھر میں تھے وہ اتنے سنگ دل تھے کہ ان لوگوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں سن کر بھی باہر نہ آئے۔ معذرت تو ایک طرف رہی انہوں نے تعزیت کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ اپنی گاڑی انہوں نے رات ہی نوکر سے مکینک بلوا کر صحیح کروالی تھی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اشرف صاحب بہانے بازی کررہے ہیں۔ گاڑی انہوں نے جان بوجھ کر اسٹارٹ نہیں کی تھی مگر جب مکینک کار کی مرمت کر کے جارہا تھا تو میں نے اس سے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

''کار میں مسئلہ کیا ہوا تھا؟''

''جھٹکے کی وجہ سے کاربوریٹر کی وائرنگ کٹ گئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

گویا اشرف صاحب بہانہ نہیں کررہے تھے۔ انہوں نے سچ کہا تھا۔ جبکہ بستی کے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے بہانہ کیا ہے۔ ورنہ کار میں کوئی مسئلہ نہیں تھا اور مکینک بھی انہوں نے دکھاوے کے لیے بلوایا تھا۔ میں نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کیونکہ خود میرے اندر خان صاحب کے خلاف لاوا سا ابل رہا تھا۔ ہم بچے کو رات ہی دفنا کر آگئے۔ اس کی ماں کے بین صبح تک جاری رہے تھے۔ ہم سب رات بھر جلتے کڑھتے رہے تھے۔ ممکن ہے اشرف صاحب کی جگہ کوئی اور اس بستی میں ہوتا تو لوگ اب تک اس کی گاڑی اور گھر کو آگ لگا چکے ہوتے مگر نہ جانے کیا بات تھی اشرف صاحب کے خلاف کچھ کرنا ایک طرف رہا۔ لوگ ان سے بات کرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔

ان کی بے پروائی کی وجہ سے ایک معصوم بچے کی جان گئی تھی مگر کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان پر انگلی بھی اٹھا سکتا۔ البتہ لوگ بچے کے باپ اور دادا کو اکسا رہے تھے کہ وہ اشرف صاحب کے خلاف تھانے میں رپورٹ لکھوادیں۔ خالق شاید مان بھی جاتا اسے اشرف صاحب پر بے حد غصہ تھا مگر بچے کا دادا جمعہ نہ مانا اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ تھانے جانا ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا۔ پولیس والے جیسے ہی اشرف صاحب کی حیثیت دیکھتے الٹا جھونپڑی والوں کو مجرم بنا کر انہیں تنگ کرنا شروع کردیتے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہ ایک پلاٹ پر ناجائز طور پر رہائش پذیر تھے۔ کوئی بھی بات جو پولیس تک جاتی ان کے لیے مسئلہ بن جاتی اس لیے جمعہ نے سمجھا بجھا کر خالق کو رپورٹ لکھوانے سے باز رکھا تھا اور اکسانے والوں کے سامنے اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''بھائیوں مجھے معاف کرو۔ میں خان صاحب کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''چھوڑو بھائیوں۔'' ارشد بھائی نے منہ بنا کر کہا تھا۔ ''ان کو اپنے بچے کے خون کی پروا نہیں ہے تو ہمیں پروا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

میں کسی حد تک ارشد بھائی کا مقصد سمجھ رہا تھا۔ ان کی شروع سے یہ خواہش تھی کہ کسی طرح ان جھونپڑی والوں کو اس پلاٹ سے بے دخل کردیا جائے اور وہ اس پلاٹ پر قابض ہوجائیں۔ وہ خود سوگز پر بنے مکان میں رہ رہے تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان کے اندر بہتر رہائش کی خواہش تھی مگر جمعہ بھی ایک ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا جس سے اسے اس پلاٹ سے بے دخل کرنے کا موقع ملتا۔ وہ محلے میں کسی سے ملتا جلتا نہیں تھا اور نہ ہی اس کے گھر والے ملتے جلتے تھے وہ سب اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ وہ جانتے تھے۔ اس میں ان کی عافیت ہے کہ کم سے کم لوگوں سے رابطہ رکھیں۔

بچے کی موت کے بعد سے اب بستی میں ایک بھی فرد ایسا نہیں تھا جو اشرف صاحب کے لیے اچھے جذبات رکھتا ہو۔ اگرچہ یہ واضح تھا کہ بچے کو انہوں نے جان بوجھ کر اپنی کار کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ یہ اتفاقی امر تھا کہ بچہ اس وقت بھاگتا ہوا کار کے سامنے آگیا۔ یہ اشرف صاحب کی غلطی تھی کہ بالکل تاریک گلی میں وہ اتنی تیزی سے کار چلا رہے تھے اور پھر جب حادثہ ہوگیا تو انہوں نے اتنی انسانیت بھی نہیں دکھائی کہ اس حادثے پر جھونپڑی والوں سے افسوس کرتے ہوئے معافی مانگ لیتے۔ ان کی اس حرکت کی وجہ سے بستی والے ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ کسی نے ان کی کوٹھی کی دیوار پر لکھا تھا۔

''بچے کا قاتل اشرف!''

اگلے روز اشرف صاحب نے لکھنے والے کو گالی میں صلواتیں سناتے ہوئے اس لکھے پر رنگ پھروایا۔ چند دن بعد پھر کسی نے یہی جملہ لکھ دیا۔ اشرف صاحب زچ ہوگئے۔ تیسری بار کسی نے یہ جملہ لکھا تو انہوں نے چوکیدار رکھ لیا۔ تاکہ آئندہ کوئی یہ حرکت نہ کرے مگر چوکیدار بھی انسان تھا۔ چوبیس گھنٹے جاگ کر پہرا نہیں دے سکتا تھا۔ دروازے

ساتھ ہی اس کی چارپائی پڑی تھی۔ بارہ بجے وہ سونے کے لیے چلا جاتا تھا۔ اس وقت موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی نہ کوئی کام کر جاتا تھا۔ مثلاً دروازے پر پان تھوک جاتا۔ دیوار پر رنگ پھینک جاتا ایک بار تو حد ہوگئی۔ کسی نے اشرف صاحب کے گھر کے گیٹ کے عین سامنے رفع حاجت کردی۔ اگلی صبح اشرف صاحب اپنے مبینہ مجرم کے خاندان کو بگھار رہے تھے۔ انہوں نے واضح طور پر نہیں کہا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا اشارہ جھونپڑی والوں کی طرف تھا۔ انہوں نے چلاتے ہوئے کہا۔

''دیکھتا ہوں۔ یہ کمینے لوگ اب کیسے یہاں رہتے ہیں۔''

اس کے بعد خان صاحب کا چوکیدار زیادہ مستعد رہنے لگا تھا۔ اس کی وجہ سے شرپسندوں کو اپنا کام کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ مجھے کسی حد تک اندازہ تھا کہ خان صاحب کو اس حد تک تنگ کرنے میں کس کا ہاتھ تھا لیکن میرا اس معاملے میں دخل اندازی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس معاملے سے میرا خاص تعلق بھی نہیں تھا۔ میں صرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اشرف صاحب سے نفرت تھی اور نہ دوسرے فریق سے محبت۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اشرف صاحب اور ان کے دشمن دونوں ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ جھونپڑی والوں کی طرف سے ایسی کوئی حرکت دیکھنے میں نہیں آرہی تھی جو خان صاحب کو چراغ پا کرتی۔ کئی مہینے خاموشی سے اور امن سے گزر گئے۔ مجھے لگا جیسے اب کچھ نہیں ہوگا مگر میرا اندازہ درست نہیں تھا۔ یہ سردیوں کے دن تھے۔ کھلا علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سردی کی شدت دوسرے علاقوں سے زیادہ ہی ہوا کرتی تھی۔ اس لیے سرِ شام ہی سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ آٹھ بجے تک دکانیں بھی بند ہو جاتی تھیں۔ حتیٰ کہ نو بجے شیدے پان والے کا کھوکھا بھی بند ہو جاتا تھا جو گرمیوں میں ایک دو بجے رات سے پہلے نہیں بند ہوتا تھا۔ سب اپنے گھروں میں گھس جاتے۔ میں بھی رات نو دس بجے تک بستر میں گھس جاتا تھا۔ ٹی وی تھا مگر بچوں کی وجہ سے ڈش کیبل نہیں لگوایا تھا۔ میری تفریح تو گھر سے باہر ہوتی تھی۔ سردی نے اسے بھی ختم کردیا تھا۔ اس لیے جلدی سو گیا۔ رات نہ جانے کس وقت بیوی نے جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔

''اٹھیں باہر دیکھیں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا مصیبت آ گئی ہے!'' میں نے گہری نیند سے جگائے جانے پر جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''باہر شور ہو رہا ہے۔'' وہ بولی۔

میں نے کان لگا کر سنا۔ واقعی ایسا شور ہو رہا تھا باہر جیسے کوئی حادثہ ہوگیا ہو۔ لوگوں کے چلّانے کے علاوہ کوئی اور آواز بھی تھی۔ جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں بادلِ نخواستہ بستر سے اٹھا۔ چپل پہنی اور اوپر سے چادر لے کر باہر نکلا۔ گلی میں جھانکتے ہی مجھے اشرف صاحب کے مکان کی طرف سے شعلے اٹھتے دکھائی دیئے۔ میں بے اختیار اس طرف بھاگا لیکن آگ اشرف صاحب کی کوٹھی میں نہیں بلکہ اس کے برابر والے پلاٹ کی جھاڑیوں میں لگی تھی۔ گلی کے ساتھ کی ساری ہی جھاڑیاں آگ کی لپیٹ میں آچکی تھیں اور شاید اندر کسی جھونپڑی میں بھی آگ لگ گئی تھی کیونکہ شعلے زیادہ ہی اونچے تھے۔ جھونپڑی والوں کی چیخیں باہر تک آرہی تھیں۔ سارے ہی محلے والے جمع ہوگئے تھے جو حسبِ توفیق آگ بجھانے کی سعی کر رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کو کال کرنا بیکار تھا ان کی آمد تک پلاٹ کی ساری جھونپڑیاں خاکستر ہو جاتیں۔ میں واپس مکان کی طرف بھاگا اور میں نے جاتے ہی فائر بریگیڈ کو فون کیا۔ اگر آگ بے قابو ہو جاتی تو دوسرے گھروں تک بھی پھیل سکتی تھی۔

فون کر کے میں واپس آیا تو کئی محلے والے اپنی پانی کی موٹروں سے پائپ لگا کر آگ پر پانی پھینک رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کم سے کم ایک طرف کی آگ بجھ جائے۔ تاکہ پلاٹ والوں کے باہر نکلنے کا راستہ بنے۔ دراصل جھونپڑی والوں کے آنے جانے کا واحد راستہ یہ گلی تھی۔ اس پلاٹ کے تین طرف مکانات تھے اور باہر نکلنے والے راستے پر آگ بھڑک رہی تھی۔

آگ اس قدر تیز تھی کہ اس کے سامنے محلے والوں کی کوششیں بیکار ہی ثابت ہو رہی تھیں۔ جھاڑیاں زیادہ تر خشک تھیں اس لیے ان میں آگ زیادہ سرعت سے پھیل رہی تھی۔ میں بھی محلے والوں کے ساتھ کوشش میں لگا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اشرف صاحب کے مکان کے پچھلے حصے کی طرف سے کوشش کی جائے تو ان لوگوں کو باہر نکالا جاسکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ارشد بھائی سے کہا۔ وہ بولے ''بیکار ہے۔ میں کوشش کر چکا ہوں۔ اندر سے کسی نے دروازہ کھولنے کی زحمت ہی نہیں کی۔''

''میرے خدا.....!'' میں دنگ رہ گیا تھا ''کس قدر سنگ دل ہے یہ شخص۔''

''میرا خیال ہے برابر والے لوگوں سے بات کرتے ہیں۔ اس مکان سے تو ممکن ہی نہیں دو منزلہ عمارت ہے۔'' ایک اور صاحب نے تجویز پیش کی۔

کوشش کر کے عقبی طرف والے مکان سے ہم لوگوں نے جھونپڑی والوں کو بحفاظت ان کے جلتے پلاٹ سے نکال لیا اور جب تک فائر بریگیڈ کا عملہ آیا توقع کے عین مطابق پلاٹ پر موجود ساری جھونپڑیاں اور ان کا سارا سامان خاکستر ہو چکا تھا۔ صرف انسان بچائے جاسکے تھے۔ کچھ دیر میں پولیس بھی آگئی اور اس نے لوگوں کے بیانات لینا شروع کردیئے۔

کسی کو علم نہیں تھا کہ آگ کسی نے لگائی ہے یا از خود لگی ہے۔ لگتا ایسا تھا کہ کسی نے کوئی جلتی چیز جھاڑیوں پر پھینک دی۔ اس کی وجہ سے آگ لگی۔ پولیس کو تفتیش کے باوجود کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی لیکن بعد میں ارشد بھائی نے مجھے رازدارانہ انداز میں بتایا تھا۔

''آگ کے سامنے لگی تھی۔''

''آپ کے سامنے!'' میں دنگ رہ گیا تھا ''کیسے؟''

''میں باتھ روم جانے کے لیے باہر نکلا تھا کہ میں نے کسی جلتی شے کو جھاڑیوں پر گرتے دیکھا۔ یہ جلتی شے اشرف خان کے مکان کی طرف سے آئی تھی۔''

میں پھر دنگ رہ گیا تھا ''اس کا مطلب ہے آگ اشرف صاحب نے لگائی ہے۔ یہ بات آپ نے پولیس کو کیوں نہیں بتائی کہ اس شخص نے کیا کیا۔''

''میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ اول تو میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کسی اور نے نہیں دیکھا ہے۔ اگر میں اکیلا اشرف خان پر شک کرتا تو پھنس جاتا۔ اشرف خان تو اپنی دولت کا سہارا لے کر صاف بچ نکلتا۔ میں بلاوجہ پولیس کے چکر میں پڑ جاتا۔''

''یار آپ ہمت تو کرتے۔ ہم سب آپ کا ساتھ دیتے۔'' میں نے کہا۔

''ارے نہیں بھائی۔ ان پولیس والوں سے اللہ بچائے..... اللہ کے بعد ان سے صرف پیسا اور اثر و رسوخ ہی بچا سکتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اپنے پاس نہیں ہیں۔''

ارشد بھائی نے یہ بات مجھے بتائی اور میں نے دوسروں کو بتادی۔ اگلے روز تک پوری بستی جان چکی تھی کہ جھونپڑی والوں کے پلاٹ پر آتش زنی میں اشرف صاحب کا ہاتھ ہے۔ ساری بستی غم و غصے کا اظہار کر رہی تھی مگر اشرف صاحب کے سامنے اس الزام کے ساتھ کوئی نہیں گیا تھا۔ جھونپڑی والے عارضی طور پر بستی کے مختلف گھروں میں ٹھہرے تھے ان کے پاس اب کچھ نہیں تھا۔ بستی کے لوگوں نے ترس کھا کر سامان اور پیسے وغیرہ دیئے تھے۔ اگلے روز ہی جمعہ نے اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر شیدے کے پان کے کھوکھے سے ذرا آگے کھلے میدان میں بانسوں اور چٹائیوں کی مدد سے جھونپڑی بنانی شروع کردی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب پلاٹ صاف ہو جائے گا تو وہ دوبارہ خاندان سمیت اس پر آکر رہے گا مگر اس سے پہلے ہی پولیس نے سب کو خبردار کردیا کہ اس کی اجازت کے بغیر اس پلاٹ پر کوئی رہائش اختیار نہ کرے۔ یہ پابندی جمعہ کے خاندان پر بھی تھی کیونکہ وہ پلاٹ پر اپنی ملکیت ثابت کرنے میں ناکام رہے تھے۔

ایک ہفتے میں جمعہ اور اس کے بیٹوں نے کہیں جھونپڑی بنالی اور وہ اپنے خاندان سمیت وہاں چلے گئے لیکن وہاں انہیں کوئی سہولت نہیں تھی۔ نہ پانی تھا اور نہ بجلی۔ پلاٹ پر انہیں یہ سہولت تھی۔ وہ بے چارے اس کھلے میدان میں شدید سردی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ بستی والے بدستور ان کی مدد کر رہے تھے لیکن یہ مدد ان کے لیے ناکافی تھی پھر ایک رات وہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اس روز جب لوگوں نے دیکھا تو بنائی ہوئی جھونپڑی خالی پڑی تھی اور جمعہ اور اس کے خاندان کے کسی فرد کا پتا نہیں تھا۔ وہ لوگ جا چکے تھے یا زبردستی لے جائے گئے تھے۔ یہ کسی کو نہیں پتا تھا۔ بستی والے کئی دن اس کھوج میں لگے رہے کہ آخر وہ لوگ کہاں گئے تھے پھر ارشد بھائی نے شبہ ظاہر کیا۔

''میرا خیال ہے اس اشرف خان نے انہیں غائب کردیا ہے۔''

میں اور توفیق چونک گئے۔ ہم شیدے پان والے کے کھوکھے کے پاس بیٹھے تھے ''یہ خیال کیسے آیا۔''

''یار کون اپنی جگہ سے جاتا ہے اور وہ بھی اس طرح رات کے وقت ان سے کوئی جرم تو نہیں ہوا تھا۔ جو وہ اس طرح رات کی تاریکی میں اپنی جھونپڑی چھوڑ گئے۔'' ارشد بھائی نے دلیل دی۔

بات قابلِ غور تھی۔ واقعی کون راتوں رات اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر جاتا ہے۔ عین ممکن تھا اشرف صاحب نے غنڈوں یا پولیس کی مدد سے انہیں وہاں سے زبردستی ہٹا دیا ہو۔ تاکہ ان کے دوبارہ پلاٹ پر آباد ہونے کا کوئی امکان نہ رہے۔ ہم اشرف صاحب کے خلاف کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس کے ایک ہفتے بعد مزدوروں نے آکر خالی پلاٹ کے گرد چاردیواری کی تعمیر شروع کردی۔ یہ نہیں معلوم مزدور کو کس نے بھیجا تھا۔ وہ روز آتے خاموشی سے کام کرتے اور چلے جاتے۔ کچھ لوگوں نے انہیں کریدنے کی کوشش بھی کی مگر انہیں سوائے اس کے کچھ نہیں معلوم تھا کہ انہیں ایک ٹھیکے دار نے بھیجا ہے۔ ہمیں شبہ تھا کہ اس ٹھیکے دار کے پس پشت اشرف صاحب تھے جو اس پلاٹ کے گرد چاردیواری بنوا کر اس پر قبضہ کر رہے تھے۔ مزدوروں نے چار دن میں اپنا کام کرلیا۔

ایک مضبوط اور بڑا سا گیٹ بھی لگوا دیا گیا تھا۔ کچھ دن بعد ایک چوکیدار نما شخص آ کر پلاٹ میں رہنے لگا تھا۔ اس نے چھپر سا بنا لیا تھا۔ اشرف صاحب کے چوکیدار سے اس کی بہت بنتی تھی۔ اکثر وہ ساتھ کھانا کھاتے تھے اس سے شبہ ہونے لگا کہ وہ اصل میں اشرف صاحب کے پے رول پر ہے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ اشرف صاحب اپنے معمول کے مطابق آتے جاتے رہے۔ پہلے محلے والے ان سے ملنے گھلنے کی جو کوشش کرتے تھے وہ کب کی ترک کر چکے تھے۔ اشرف صاحب کی جانب سے ایسی کوئی کوشش کبھی کی ہی نہیں گئی تھی۔ وہ محلے کا ایک ناگوار مگر ناگزیر حصہ تھے پھر ایک روز وہ معمول کے مطابق اپنے کام پر نہیں گئے۔ ان کی طبیعت خراب تھی اس کے بعد وہ کئی روز تک نہیں گئے۔ محلے والوں کو ان کی بیماری کا ڈاکٹر کی آمد و رفت سے پتا چلا۔ ایک ہفتے بعد اشرف صاحب دفتر جانے کے لیے نکلے تو لوگ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے پھر ان کی بیماری اور دفتر میں وقفہ بڑھتا گیا۔ اسی تناسب سے ڈاکٹر کی آمد و رفت میں بھی اضافہ ہوتا گیا پھر ایک رات ڈاکٹر افراتفری میں آیا۔۔۔ اس نے اشرف صاحب کو دیکھا اور پھر ایمبولینس بلوائی جو پہلے اشرف صاحب کو اسپتال لے گئی اور پھر واپس لے آئی لیکن اشرف صاحب جاتے وقت زندہ تھے مگر واپسی میں وہ ایک لاش کی صورت میں تھے۔

فجر کے وقت بستی کی مسجد سے ان کی وفات کا اعلان کیا گیا۔ ان کے نوکروں میں سے یا ان کی کوٹھی سے صبح سے دوپہر ہو گئی مگر کوئی آیا نہیں۔ بقول چوکیدار ان کے رشتے داروں کو اطلاع کر دی تھی اور اب ان کا انتظار تھا کہ وہ آئیں اور لاش کو کفنانے دفنانے کا انتظام کریں، دوپہر کے وقت مسجد کے امام صاحب نے مشورہ دیا کہ اب انتظار کرنے کے بجائے محلے والے خود اشرف صاحب کو کفنانے دفنانے کا بندوبست کریں۔ میں نے بھی ارشد بھائی اور دوسرے لوگوں سے کہا۔ ''اشرف صاحب زندگی میں کتنے ہی برے سہی لیکن اب وہ مر چکے ہیں اور ہمارا مذہب میت کا احترام کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

کہہ سن کر سارے بستی والے تیار ہو گئے لیکن اس سے پہلے کہ ہم اشرف صاحب کی کوٹھی میں جاتے۔ ہماری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ وہاں پر ایک سوزوکی پک اپ آ کر رکی۔ اس سے جمعہ اور اس کے بیٹوں کے ساتھ ان کے سارے خاندان والے اترے۔ وہ سب رو رہے تھے۔ بلند آواز سے روتے وہ اشرف صاحب کی کوٹھی میں چلے گئے۔ ان کے بعد لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ سب غریب مزدور ٹائپ لوگ تھے۔ جو آتے اور اشرف صاحب کی میت پر بین کرتے تھے۔ جمعہ کفن اپنے ساتھ لایا تھا اس نے اشرف صاحب کو اپنے بیٹوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر غسل دیا۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی حتیٰ کہ ساتھ والا پلاٹ بھر گیا۔ جنازے کے وقت بلاشبہ ہم سب بستی والے دم بخود سے تھے۔ کبھی گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ جمعہ اور اس کے خاندان والے اشرف صاحب کی موت پر رو سکتے ہیں جو ان کے بدترین دشمن تھے۔ جن کی وجہ سے وہ اپنے برسوں پرانے گھر سے بے دخل ہوئے تھے اور پھر پولیس یا غنڈے انہیں لے گئے تھے۔ ہمیں دوسرے لوگوں پر بھی حیرت تھی۔ کیونکہ انہیں کبھی اشرف صاحب کے پاس آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ جنازے کے بعد ہم بستی والوں نے جمعہ کو گھیر لیا۔

''یہ کیا چکر ہے..... تم اپنے خاندان سمیت کہاں غائب ہو گئے تھے..... اور پھر اپنے دشمن کی موت پر رو رہے تھے؟''

ہم لوگوں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ خفا نظر آنے لگا ''کون کہتا ہے..... اشرف صاحب ہمارے دشمن تھے وہ تو فرشتہ صفت انسان تھے خدا ان کی مغفرت کرے۔''

''وہ جو تمہارا گھر جلایا تھا..... پھر تم لوگوں کو غائب کیا تھا۔''

''وہ تو پلاٹ کے اصل مالک نے ہمیں یہاں سے نکلوانے کے لیے جلوایا تھا۔ اشرف صاحب تو مصالحت کی کوشش کر رہے تھے پھر وہ نہیں مانے اور جب ہم نے جگہ خالی نہیں کی تو انہوں نے آگ لگا دی پھر اشرف صاحب نے ہی ہمیں سر چھپانے کی جگہ دی۔ نہیں ہی نہیں بلکہ چالیس دوسرے خاندان کو انہوں نے اپنے خرچے پر مکانات بنوا کر دیئے ہیں۔ شہر سے کچھ دور ہے یہ جگہ۔ اب ہم لوگ مکان میں رہتے ہیں جہاں سے ہمیں کوئی نہیں نکال سکتا۔

ہم لوگ سکتے میں رہ گئے۔ اشرف صاحب کیا تھے اور ہم انہیں کیا سمجھتے رہے پھر ارشد بھائی نے زبان کھولی۔

''وہ تمہارے پوتے کی موت کے ذمے دار تو تھے۔''

''اس روز ان کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے تیزی سے گھر آ رہے تھے۔ یہ حادثہ ہو گیا پھر انہوں نے اس کی تلافی یوں کی کہ ہمیں مکان بنا کر دیا۔ میرے دونوں بیٹوں کو پکے روزگار سے لگوایا۔'' جمعہ نے کہا ''وہ اچھے آدمی تھے بس دنیا نے انہیں پہچانا نہیں۔''

جمعہ اور اس کے ساتھی چلے گئے اور ہم سوچتے رہ گئے۔ اشرف صاحب نے ان سے بے غرض نیکی کی اور آج انہیں رونے والے مل گئے۔ ممکن ہے اس نیکی کے طفیل اللہ انہیں آخرت میں بھی بخش دے۔

میرے والد اور چچا میں اتنی محبت تھی کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ ہی رہے تھے۔ اسی یک جائی کی وجہ سے میں اور میرا چچا زاد بھائی ساجد ساتھ ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے۔ ساجد کی عمر مجھ سے صرف تین مہینے کم تھی اور اتنے کم فرق کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ مجھے میرا نام لے کر ہی مخاطب کرتا تھا۔ اس کے نقوش بہت واجبی سے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ جب میں سنِ بلوغت کو پہنچی تو میرے دل میں مچنے والی ہلچل کا سبب میرے ماموں زاد بھائی فیروز تھے۔ میرے دل میں ساجد کی گنجائش اس لیے بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مجھ سے تین ماہ چھوٹا تھا جبکہ فیروز مجھ سے پانچ سال بڑے تھے اور یہ بات بھی میرے کانوں میں پڑتی رہی تھی کہ جب میں بی اے کر لوں گی تو میری شادی انہی کے ساتھ ہو گی۔ ان سے میری منگنی تو نہیں ہوئی تھی لیکن میری پیدائش کے چند ماہ بعد ہی میرے والدین اور فیروز کے والدین میں یہ بات طے پا گئی تھی اور میرے جوان ہونے تک اس معاملے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ بات بدستور طے تھی کہ جیسے ہی میں بی اے کر لوں گی میری اور فیروز کی شادی کر دی جائے گی۔

فیروز اتنے وجیہہ تھے کہ انہیں دیکھ کر کسی بھی لڑکی کے دل میں ہلچل پیدا ہو سکتی تھی اور میرے دل میں مچنے والی ہلچل میں محبت کا رخ' یہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا کہ ان سے میری

محترم ایڈیٹر صاحب، آداب!

سرگزشت اکثر پڑھتی رہتی ہوں اور اس کی سچ بیانیاں بعض اوقات رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ واقعی لوگوں کے ذاتی تجربات اور بعض کے مشاہدے ہیں۔ ان میں حقیقت بھی ہے اور درس بھی، کیونکہ میں خود ایک کہانی بنی ہوئی ہوں۔ مدتوں بعد آخر ہمت کر رہی ہوں کہ اپنی بپتا بیان کروں۔ شاید یوں دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے اور اپنے کردہ گناہ کے عذاب میں شاید کچھ کمی ہو سکے۔ ویسے تو نیتوں کا حال اوپر والا جانتا ہی ہے اور وہی ہمارے اعمال پر ہمیں سزا یا جزا دینے پر قادر ہے۔

اپنی زندگی پر شرمندہ

صباحت رضا، کراچی

وقار عظیم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

شادی طے پا چکی تھی۔

فیروز کو میری اس محبت کا علم نہیں تھا۔ ہم دونوں تنہائی میں ایک دوسرے سے کبھی ملے بھی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

یہاں میں اپنی ایک بات دہراؤں گی۔ ساجد کے واجبی سے نقوش اور عمر میں مجھ سے کم ہونے کے باعث بھی میرے دل میں اس کے لیے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس وقت میرے ذہن کو دھچکا سا لگا جب میں نے اپنے لیے اس کی نظر میں خاص قسم کے جذبات دیکھے۔

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے تو غلط نہیں کہا جاتا کہ مرد کی نظر عورت بہت جلدی محسوس کر لیتی ہے۔

مجھے یہ برا تو لگا لیکن عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں اسے نظر انداز کر دوں' لیکن ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے مجھے اکثر اس کی نظروں کی چبھن محسوس ہوتی تھی اور مجھے اس پر غصہ آتا تھا۔ اسے نظر انداز کرنے پر میں اس لیے بھی مجبور تھی کہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ہم بچپن سے ساتھ رہے تھے اس لیے ہم میں جو بے تکلفی تھی' اسے میں نے دھیرے دھیرے کم کرنا شروع کر دیا لیکن اس کی طرف سے دھیرے دھیرے اضافہ ہونے لگا اور آخر یہ نوبت بھی آئی کہ اس نے باتوں باتوں میں اظہار محبت کی طرف بڑھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ میں ایسے موقعوں پر اس کی بات کاٹنے کی کوشش کرتی اور جب اس میں کامیابی ہوتی نظر نہ آتی تو کسی بہانے کسی کو پکار کر بلا لیتی۔ میری ایک چھوٹی بہن' ایک چھوٹا بھائی اور ساجد کی چھوٹی بہن بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ جب میں ان کو بلا لیتی تو اپنی بات کہنے کا موقع ساجد کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ ایسے موقعوں پر وہ اس طرح مسکرا دیتا تھا جیسے میری چالاکی کو سمجھ گیا ہو۔

جن دنوں میں ایف اے کے امتحانات کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی وہ اچانک میرے کمرے میں آیا اور کسی تمہید کے بغیر بولا۔

''اس سے پہلے کہ تم پکار کر کسی کو بلا لو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں صباحت کہ اس سے فائدہ کیا۔ تم میرے دل کی بات سمجھ تو چکی ہو..... یہ کہنے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔''

یہ ''جملہ'' اتنا اچانک تھا کہ چند لمحوں کے لیے میں ششدر رہ گئی اور انہی چند لمحوں میں ساجد میرے بہت قریب آ گیا۔ شاید وہ میرے شانوں پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت یکا یک مجھے جیسے ہوش آ گیا اور میں بڑی تیزی کے ساتھ اس سے دور ہٹ گئی۔

''شرم آنا چاہیے تمہیں!'' میں نے اسے غصے سے دیکھا۔

''محبت میں بے شرمی کی کیا بات ہے صباحت؟'' وہ اپنی جگہ کھڑا مسکراتے ہوئے مجھے دیکھتا رہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میری شادی فیروز سے طے پا چکی ہے۔''

''تم چاہو تو یہ بات ختم بھی ہو سکتی ہے۔''

''کیوں چاہوں میں؟'' میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا ''کیوں چاہوں؟''

''اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔''

''کبھی اپنی صورت دیکھی ہے آئینے میں؟''

یکا یک وہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کچھ ناراض سے انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا ''اپنی خوبصورتی پر بہت گھمنڈ ہے تمہیں!''

''مجھے کسی بات پر کوئی گھمنڈ نہیں ہے۔'' میں نے جھلا کر کہا ''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میرا نام فیروز کے ساتھ جڑتا ہے اور یہ تم بھی جانتے ہو۔''

''اچھا!'' وہ کچھ طنزیہ سے انداز میں بولا ''کیا تمہیں ابھی تک نہیں معلوم؟ خاندان میں کیا چرچے ہو رہے ہیں آج کل فیروز کے!''

''مجھے فرصت نہیں ہے اس قسم کی باتیں سننے کی۔''

''تو نکالو فرصت..... مجھ سے سن لو!''

''اس کی بھی ضرورت نہیں ہے مجھے..... اور اب تم چلے جاؤ میرے کمرے سے ورنہ اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ گھر کے سب بڑوں کو بتا دوں گی کہ تم.....''

''بتا دو۔'' اس نے میری بات کاٹ دی ''میں تو خود چاہتا ہوں کہ سب کو معلوم ہو جائے۔ اس کے بعد ہی تو میری تمہاری شادی کا راستہ بنے گا۔''

''یہ کیڑا تو تم اپنے دماغ سے نکال ہی دو۔''

''یہ کیڑا تو اب میرا زندگی بھر کا ساتھی ہے۔ تمہیں میرا ہی پڑے گا صباحت! فیروز کے جو معاملات چل رہے ہیں' ان کی وجہ سے تمہارا اور اس کا رشتہ کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے۔''

''میں وہ ٹوٹنے نہیں دوں گی۔''

وہ ہنس پڑا ''میں تمہیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔''

اس وقت میں نے زور سے اپنی چھوٹی بہن کو پکارا۔

''اچھا میں جا رہا ہوں۔'' وہ بولا ''لیکن یہ بات تم لکھ کر رکھ لو کہ تمہیں میرا ہی ہونا پڑے گا۔''

وہ کمرے سے چلا گیا اور میری پکار کی وجہ سے

میری چھوٹی بہن آئی تو میں غصے سے کانپ رہی تھی۔

☆☆☆

فیروز کے بارے میں ساجد نے جو کچھ کہا تھا' وہ بہر حال غلط نہیں تھا۔ ان دنوں بزرگوں میں جو سرگوشیاں ہو رہی تھیں' ان سے بھی پتا چل گیا تھا کہ فیروز کا چال چلن شاید بہت عرصے سے ٹھیک نہیں تھا لیکن بات اب سامنے آئی تھی کہ اس کے تعلقات کئی لڑکیوں سے رہ چکے تھے۔

ساجد نے جو مجھ سے یہ بات کہی تھی کہ وہ مجھے اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا' تو اس کی یہ بات بے بنیاد نہیں تھی۔ کوئی لڑکی بھی یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے ہونے والے شوہر کا چال چلن بگڑا ہوا ہو لیکن میں فیروز سے اتنی محبت کرنے لگی تھی کہ ان معاملات کے بارے میں دوسرے ہی انداز سے سوچتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فیروز کی خوبصورتی کی وجہ سے لڑکیاں خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوتی ہوں گی۔ اسے رجھاتی ہوں گی اور لڑکیاں جب خود پہل کریں تو مرد کے قدم ڈگمگا ہی جاتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ مجھ جیسی خوبصورت لڑکی سے شادی کے بعد فیروز بدل جائے گا۔

یہ تو خیر میرے خیالات تھے لیکن میرے والدین کو تشویش ہو گئی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرے والدین نے اس سلسلے میں فیروز کے والدین سے گفت و شنید شروع کر دی تھی اور اس پر میرے والدین کو دور غلانے میں خاص کردار ادا کر رہا تھا۔ مجھے ساجد پر غصہ آ رہا تھا لیکن میں اس سلسلے میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ میں ڈرنے لگی کہ میرے والدین کہیں یہ رشتہ توڑ نہ دیں۔ کسی بھی لڑکی کے والدین یہ نہیں چاہ سکتے کہ ان کے ہونے والے داماد کا چال چلن ایسا ہو۔

امتحانات ختم ہونے کے بعد میرے لیے اگر سوچنے کو کچھ تھا تو صرف یہی کہ میری اور فیروز کی شادی کا کیا ہو گا' البتہ یہ فیصلہ میں کر چکی تھی کہ فیروز سے میری شادی ہو یا نہ ہو' ساجد سے میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ اس سلسلے میں یہ اندیشہ مجھے نہیں تھا کہ میرے والدین کی طرف سے مجھ پر دباؤ پڑ سکتا ہے۔ ساجد مجھ سے تین مہینے چھوٹا تھا اس لیے میرے والدین اس سے میری شادی کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

پھر اچانک یہ بات سننے میں آنے لگی کہ فیروز نے اپنے طور طریقے بدل لیے تھے۔ اس کا چال چلن درست ہو گیا تھا۔ شاید اس میں یہ تبدیلی اپنے والدین کے سمجھانے بجھانے سے آئی ہو لیکن مجھے یہ سب کچھ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری خوشی کے لیے یہی کافی تھا کہ میرے والدین کو دھیرے دھیرے اطمینان ہوتا جا رہا تھا کہ اب فیروز ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ دو سال میں جب تک میں بی اے کر لوں گی' معاملات بالکل اطمینان بخش ہو جائیں گے۔

جن دنوں میرے کالج کھلے' انہی دنوں یہ سننے میں آیا کہ فیروز کے چال چلن میں تبدیلی کے بعد ان میں یاسیت سی آ گئی تھی۔ دفتر سے گھر اور گھر سے دفتر' ان کا بس یہی ایک معمول رہ گیا تھا۔ جولائی کی جو کیفیت ان کا خاصہ تھی' وہ ختم ہو چکی تھی۔ ہنستا مسکراتا تو الگ رہا' انہوں نے لوگوں سے بول چال بھی ختم کر دی تھی۔ گھر میں کوئی ان سے بات کرتا تھا تو وہ مختصر سا جواب دیتے تھے اور دفتر میں بھی ان کی یہی حالت ہو گئی تھی۔

فیروز کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جن کی شادی سات آٹھ سال پہلے ہو چکی تھی۔ فیروز اپنی بھابی سے بھی بہت مذاق کیا کرتے تھے۔ ان کی شرارتیں بعض اوقات ان کی بھابی کو تنگ بھی کر ڈالتی تھیں لیکن اب یہ سب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ خود بھابی انہیں چھیڑتیں تو بھی وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر رہ جاتے۔ دفتر سے گھر لوٹنے کے بعد ان کا زیادہ تر وقت اپنے

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو جوانی ناسمجھی کی چار پیچہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے انکے لیے اپنے تجربے تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بزرگوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور ہاں گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ہفتہ آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جو ہر واقعی بے بہا قوت کا سرچشمہ ہے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہو ئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پر سرخی ہاتھ پیروں میں پختگی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپکو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جاتی ہیں کہ آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپکو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز

پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

کمرے میں گزرنے لگا تھا۔

چند ماہ اسی طرح گزر گئے تو ان کے والدین کو تشویش ہونے لگی۔ اس تشویش کا اثر میرے والدین پر بھی پڑا۔ فیروز کے والدین ہمارے گھر آتے جاتے تو تھے۔ میری والدہ آخر فیروز کے والد کی بہن تھیں مگر اچانک ان کی آمد و رفت میں اضافہ ہوا اور بند کمروں میں بزرگوں کی میٹنگز ہونے لگیں۔ فیروز کے والدین کا خیال تھا کہ فیروز کی شخصیت میں اچانک جو یاسیت رچ بس گئی تھی' اس کا خاتمہ اس طرح ممکن تھا کہ جلد از جلد ان کی شادی کر دی جائے۔

میرے والدین کی خواہش تھی کہ پہلے میں بی اے کر لوں مگر اس میں ڈیڑھ سال لگ جاتا جبکہ فیروز کے والدین کو اب بہت جلدی ہو گئی تھی۔ میرے والد نے اس سلسلے میں میرے چچا سے بھی مشورہ کیا اور طے پایا کہ اگر میں چاہوں تو شادی کے بعد بھی بی اے کر سکتی ہوں لہٰذا شادی کر دی جائے۔

مجھے اس کا علم ہوا تو میں بے حد خوش ہوئی۔

میری اور فیروز کی شادی کی تیاریاں بہت تیزی سے کی گئیں۔ طے یہ پایا تھا کہ پندرہ دن میں ہی ہم دونوں کی شادی کر دی جائے۔

ان دنوں میں جب ساجد سے میرا آمنا سامنا ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا جیسے وہ اندر ہی اندر کھول رہا ہو۔ اس کی یہ حالت محسوس کر کے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

ایک مرتبہ کی لڑائی کے بعد اس نے مجھ سے دوبارہ کبھی اس قسم کی بات کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ غالباً اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے لیکن جب وہ مجھے دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ہوس ضرور ہوتی تھی۔ محبت کی نگاہوں میں اور ہوس کی نگاہوں میں بڑا فرق ہوتا ہے اور وہ صرف عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔

شادی کی تیاریوں کے دوران ایک دن میں لاؤنج میں تنہا بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہاں کوئی اور نہیں تھا اس لیے مجھے ہی ریسیور اٹھانا پڑا ''ہیلو!'' میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔

''ہیلو!'' میں نے کچھ زور سے کہا۔

اس مرتبہ ایسی آواز سنائی دی جیسے دوسری طرف سے طویل سانس لی ہو اور پھر کہا گیا ''شکر ہے کہ تم نے ریسیور اٹھایا۔ میں نے ایک ہفتے میں کم سے کم بیس مرتبہ فون کیا لیکن ریسیور کسی اور نے اٹھایا اس لیے میں نے کچھ کہے بغیر لائن کاٹ دی۔''

میرے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ فیروز سے باتیں کرنے کا موقع مجھے بہت کم ملا کرتا تھا اور فون پر تو ان سے کبھی بات نہیں ہوئی تھی مگر نہ جانے کیسے میں نے ان کی آواز پہچان لی۔

''ہیلو!'' آواز پھر آئی ''تم صباحت ہو نا؟''

''جی!'' میری آواز بہت دھیمی تھی۔

''کیا تم نے میری آواز نہیں پہنچانی؟''

''پہچان لی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ جان کر میں بے حد خوش ہوئی تھی کہ فیروز مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین تھے اور بیس مرتبہ فون کر چکے تھے۔

یہاں یہ بتانا غالباً ضروری ہے کہ جو واقعات بیان کر رہی ہوں' یہ پچیس سال پہلے کے ہیں۔ سی ایل آئی کی سہولت تو ہمیں حال ہی میں حاصل ہوئی ہے لیکن اس وقت تو موبائل فون بھی نہیں آئے تھے۔

''تم حیران ہو گی کہ میں تم سے کیا کہنے کے لیے بے چین تھا کہ بیس مرتبہ فون کر چکا ہوں۔ مجھے تم سے [illegible] نہیں کرنی ہے۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے ڈیسیژن کو حتمی قرار دیتے ہوئے اس شادی سے انکار کر دو۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فیروز مجھ سے ایسی کوئی بات کہیں گے۔

میری خاموشی پر وہ بولے ''سن رہی ہو نا؟''

''جی۔'' میرے منہ سے بمشکل نکل سکا۔

''میں تمہیں وہ خوشیاں نہیں دے سکوں گا جو شادی کے بعد ہر لڑکی چاہتی ہے۔ میرے بارے میں سارا خاندان جان چکا ہے کہ میں کیا کرتا رہا ہوں۔''

''لیکن اب آپ وہ سب کچھ چھوڑ چکے ہیں۔'' میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ سب کچھ چھوڑ چکا ہوں لیکن اب ایک تبدیلی آ گئی ہے کہ میں شراب پینے لگا ہوں۔ یہ بات صرف میرے گھر والے جانتے ہیں اور تمہارے گھر والوں سے یہ بات اس لیے چھپائی گئی ہے کہ شادی سے انکار نہ ہو جائے۔ میرے گھر والے سمجھتے ہیں کہ شادی کے بعد میں خود شراب پینا چھوڑ دوں گا یا تم چھڑوا دو گی لیکن ایسا نہیں ہو گا صباحت اور میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا اس لیے تمہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے۔''

میری سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں کوئی آنہ جائے۔

فیروز کہتے رہے ''اگر کوئی اجنبی لڑکی ہوتی تو میں اس کی

پروا نہیں کرتا لیکن تم میری پھوپی کی بیٹی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے تمہیں وہ خوشیاں نہ مل سکیں جن کا حق تمہیں حاصل ہے۔''

اس وقت کچھ بولنا میرے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ منہ میں زبان جیسے خشک ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔ اسی وقت میں نے ایسی آہٹ سنی جیسے کوئی لاؤنج کی طرف آ رہا ہو۔

میں نے جلدی سے کہا ''کوئی آ رہا ہے' فون بند کر دیجیے!''

''ٹھیک ہے تم بس انکار کر دو یہ شادی کرنے سے!'' فیروز بھی جلدی سے بولے۔

میں نے جلدی سے ریسیور رکھا۔ اسی وقت میری والدہ لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے مجھے ریسیور رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''کون تھا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''رانگ نمبر تھا امی!'' میں نے کہا اور اخبار اٹھا کر جلدی سے لاؤنج سے جانے لگی۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ امی سے بات کرنا میرے لیے مشکل ہوتا اور شاید وہ میری کیفیت بھی بھانپ لیتیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر گری تو میرا جسم سنسنا رہا تھا اور فیروز کی ساری باتیں میرے دماغ میں گونج رہی تھیں۔

خود کو سنبھالنے میں مجھے خاصا وقت لگا اور میں سکون سے فیروز کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اب میں نے ایک نئے انداز میں سوچنا شروع کیا۔ فیروز کے چال چلن میں تبدیلی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ شاید وہ کسی لڑکی سے محبت کرنے لگے ہوں اور اس لڑکی نے انہیں دھوکا دیا ہو۔ اسی وجہ سے ان میں تبدیلی بھی آئی تھی اور اس لڑکی کا صدمہ بھلانے کے لیے وہ شراب پینے لگے تھے۔

یہ سب کچھ سوچنے اور شراب نوشی کے سلسلے میں فیروز کے اعتراف کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس شادی سے انکار نہیں کروں گی۔ مجھے بڑا اعتماد تھا خود پر۔ مجھے فیروز کے والدین کے اس خیال سے اتفاق تھا کہ شادی کے بعد فیروز کی یہ عادت چھوٹ جائے گی یا میں وہ عادت چھڑوا دوں گی۔ میں نے بھی بالکل انہی کی طرح سوچا۔ میں انہیں اتنی محبت دوں گی کہ وہ اس لڑکی کو بھول جائیں گے جس نے انہیں دھوکا دیا تھا۔

فیصلہ کرنے کے بعد میں بالکل مطمئن ہو گئی۔

جلد ہی وہ دن بھی آ گیا جب رات کو میں یہ سوچتے سوچتے سوئی کہ اگلی رات کو میں فیروز کے ساتھ ہوں گی۔ شاید اس سوچ ہی کی وجہ سے میں نے اس رات فیروز کو خواب میں اپنے ساتھ دیکھا۔ یہاں یہ اتنا ہی لکھ دینا مناسب ہو گا کہ وہ ایک کیف آور خواب تھا۔

اس دوران میں ممکن ہے فیروز نے دوبارہ بھی فون کیا ہو اور مجھ سے بات کرنا چاہی ہو لیکن ایسا موقع نہیں آیا تھا کہ ان کے فون کرنے پر ریسیور میں نے اٹھایا ہو۔

☆☆☆

آخر وہ رات بھی آ گئی جب میں دلہن بنی فیروز کی خواب گاہ میں تھی اور فیروز کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ انہوں نے مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور ایک الماری کی طرف بڑھ گئے تھے۔ الماری سے انہوں نے شراب کی بوتل نکالی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ فیروز نے وہیں بیٹھ کر شراب پینا شروع کی۔ مجھ سے انہوں نے ایک بات بھی نہیں کی تھی۔ مجھے اس سے صدمہ تو پہنچا لیکن میں نے یہ سوچ کر خود کو سنبھال لیا کہ فیروز کو اپنی محبت کے حصار میں لانے کے لیے مجھے ایسی دقتوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑے گا۔ انہوں نے تو خود فون کر کے کہہ دیا تھا کہ مجھے ان سے خوشیاں نہیں مل سکیں گی اس لیے میں شادی سے انکار کر دوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تھا لہٰذا اب اس قسم کی کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے مجھے خود کو تیار تو رکھنا پڑے گا۔

شراب کا ایک گلاس فیروز نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ختم کیا اور دوسرا گلاس پیتے ہوئے انہوں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ ذرا دیر بعد وہ بستر کے قریب رکے اور سپاٹ سے لہجے میں بولے ''میں نے فون پر تم سے کچھ کہا تھا صباحت لیکن تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی ٹھیس پہنچے یا پہنچتی رہے تو مجھے کوئی دوش نہ دینا۔''

میں کچھ نہیں بولی۔ دلہن کی حیثیت سے وہ میری پہلی رات تھی۔ فیروز کو کمرے میں آئے ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا۔ بے تکلفی کی ذرا سی فضا بھی نہیں بنی تھی۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ان سے باتیں کرنا شروع کر دیتی۔

دوسرا گلاس ختم کرنے کے بعد فیروز صوفے پر جا بیٹھے اور تیسرا گلاس بنانے لگے۔ میں سوچنے لگی' کب تک پئیں گے یہ؟ کیا بے ہوش ہو جانے تک.....؟

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تیسرا گلاس ختم کرنے کے بعد وہ بستر

پر میرے قریب آبیٹھے۔ اب ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور بولے ''بہت خوبصورت ہو تم!''

میں اتنا ہی سن کر نہال ہوگئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ انہیں اپنی محبت کے حصار میں لانے کے لیے مجھے زیادہ عرصے تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ میری بھول تھی جس کا اندازہ مجھے وقت گزرنے کے ساتھ ہوتا رہا۔

شراب پینے کے بعد جب وہ جذبات کی رو میں بہتے، تبھی وہ میرے قریب آتے، ورنہ گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح مجھ سے بھی بہت کم بات کرتے۔

فیروز کی بھابی کا نام شاہانہ تھا۔ میں شادی سے پہلے بھی انہیں شاہانہ بھابی کہتی تھی۔ وہ مجھے پسند بھی کرتی تھیں۔ شادی کے بعد وہ مجھ سے بہت قریب ہوگئیں۔ ان کے انداز میں بتدریج بے تکلفی آنے لگی۔ وہ مجھے فیروز کے حوالے سے چھیڑتیں تو میں مسکرا کر رہ جاتی۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ شادی کے چند دن بعد ہی گھر کے لوگوں سے فیروز کے رویے کی شکایت کرنے لگتی۔

لیکن میں اپنے اس مسئلے پر پریشان ضرور ہوگئی تھی۔ میرے لیے سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ فیروز کی شراب نوشی چھڑانی یا کم کرانی مگر وہ مجھ سے بڑے سخت لہجے میں کہہ چکے تھے کہ میں اس معاملے میں اپنی زبان کبھی نہ کھولوں۔

میری یہ پریشانی شاہانہ بھابی سے چھپی نہ رہ سکی اور ایک دن انہوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان کی محبت آمیز ہمدردی کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے انہیں بھی کچھ بتا دیا، حتیٰ کہ اس فون کے بارے میں بھی جو فیروز نے مجھے کیا تھا۔

''جب تم نے اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی فیروز سے شادی کی ہے تو ابھی اتنی جلدی ہمت کیوں ہار رہی ہو!'' شاہانہ بھابی نے کہا اور پھر مسکرا کر بولیں ''بس دعا کرو کہ جلد از جلد تمہارا پیر بھاری ہوجائے۔ تم ماں بن جاؤ گی تو فیروز کے رویے میں تبدیلی ضرور آئے گی۔''

''صرف ماں بن جانے کی وجہ سے؟'' میں سوچتی ہوئی بولی۔

''ہاں۔'' شاہانہ بھابی نے جواب دیا ''بچوں کی بہت خواہش ہے فیروز کو! یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف رہا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ بہت سے بچوں کا باپ بننا چاہتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اسے گھر میں ہر طرف سے ڈیڈی ڈیڈی کی پکار سنائی دے۔''

''خدا کرے آپ کی یہ بات ٹھیک نکلے۔''

''ضرور ایسا ہی ہوگا۔'' شاہانہ بھابی نے زور دے کر کہا ''جب تم اسے بچوں کے تحفے دوگی تو وہ تمہیں کیسے نظر انداز کرے گا۔''

''مگر ان میں جو اچانک یہ تبدیلی آئی ہے تو کیوں آئی ہے۔ وہ کسی لڑکی سے محبت تو نہیں کرنے لگے تھے؟''

شاہانہ بھابی نے ایک طویل سانس لی اور پھر کہا ''فیروز کے ماضی کے بارے میں دوسروں کی طرح تم بھی سب کچھ جانتی ہو لیکن ایک بات ایسی ہے جو صرف میں جانتی ہوں۔ اس معاملے میں صرف میں ہی فیروز کی رازدار ہوں۔ میں تمہیں اس بارے میں بتا دیتی ہوں لیکن تمہیں قسم کھانا ہوگی کہ تم یہ بات فیروز پر کبھی ظاہر نہیں کرو گی۔''

''آپ بہت اچھی ہیں شاہانہ بھابی..... اگر آپ مجھے قسم نہ دیں تو بھی میں آپ کی بات کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی لیکن آپ کے اطمینان کے لیے میں قسم بھی کھا لیتی ہوں۔''

اور اس طرح مجھے ایک ایسی بات معلوم ہوئی جس کا فیروز کی زندگی میں ایک خاص اہمیت تھی۔ ماضی میں فیروز کا تعلق جن لڑکیوں سے رہا تھا، انہی میں سے ایک ماں بن گئی تھی اور اس نے فیروز سے کہا تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے کیونکہ وہی اس بچے کا باپ ہے۔

فیروز کو تو بچوں سے محبت تھی۔ وہ اس لڑکی سے شادی کر لیتے لیکن انہیں شبہ تھا کہ وہ لڑکی ان سے جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ اس لڑکی سے آخری مرتبہ جب ملے تھے تب وقت زیادہ گزر چکا تھا۔ وہ اس بچے کے باپ ہو ہی نہیں سکتے تھے لیکن لڑکی کا اصرار تھا کہ انہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

اپنی یہ پریشانی انہوں نے شاہانہ بھابی کو بتائی تھی اور شاہانہ بھابی ہی نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ میڈیکل ٹیسٹ کروا کے حقیقت جان سکتے ہیں۔

فیروز اس سلسلے میں چند دن کے لیے امریکا گئے تھے اور وہاں سے آنے کے بعد انہوں نے اس لڑکی کو بری طرح دھتکار دیا تھا۔ وہ اس بچے کے باپ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ بچہ کسی اور کا تھا جو وہ لڑکی فیروز کے سر تھوپنا چاہتی تھی۔

''بس اس کے بعد ہی فیروز میں تبدیلی آئی تھی۔'' شاہانہ بھابی نے بتایا ''اس کے بعد وہ کبھی کسی لڑکی سے نہیں ملا۔ شاید اس کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ کوئی لڑکی کبھی کسی اور کے بچے کو اس کا بچہ بنانے میں کامیاب نہ ہوجائے۔''

''لیکن وہ شراب کیوں پینے لگے؟'' میں نے پوچھا ''کیا

وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگے تھے؟''

''اس کا اعتراف تو فیروز نے مجھ سے نہیں کیا لیکن شاید ایسا ہی ہو اور اگر ایسا ہو تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اپنے بچوں کے بعد جب وہ تمہاری طرف متوجہ ہوگا تو اس کا صدمہ ختم ہوجائے گا اور اس وقت شاید وہ شراب پینا چھوڑ دے۔''

شاہانہ بھابی کی ان باتوں سے مجھے کچھ تقویت ضرور ملی لیکن مجھے یہ کرید بھی لگ گئی کہ کسی طرح اس لڑکی کا پتا لگایا جائے۔ آخر وہ تھی کون؟

شاہانہ بھابی کو اس کا علم نہیں تھا اور اب وہ فیروز سے اس کے بارے میں پوچھ بھی نہیں سکتی تھیں۔ فیروز اب ان کے لیے بھی پہلے جیسے فیروز نہیں رہے تھے۔ سبھی کی طرح ان سے بھی وہ الگ تھلگ ہی رہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے لیے شاہانہ بھابی کے دل میں محبت کم نہیں ہوئی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ فیروز میں پھر تبدیلی آئے گی اور وہ پہلے جیسے ہوجائیں گے۔

مجھے ان کے اس یقین نے بھی سہارا دیا۔

اور پھر جلد ہی ایک دن ایسا آیا جب مجھے شبہ ہوا کہ میں ماں بننے والی ہوں..... یہ بات میں نے فوراً شاہانہ بھابی کو بتائی۔ انہوں نے خوش ہوکر مجھے گلے لگایا اور کہا کہ اگلے دن وہ مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گی۔

دوسرے ہی دن لیڈی ڈاکٹر نے میرے شبے کی تصدیق کردی۔

شاہانہ بھابی بولیں ''جی چاہ رہا ہے کہ ابھی سارے گھر کو یہ خوشخبری سنا دوں لیکن اچھا یہ رہے گا کہ تم یہ خوش خبری سب سے پہلے فیروز کو سناؤ!''

شاہانہ بھابی نے بالکل ٹھیک سوچا تھا۔ میں بے صبری سے فیروز کا انتظار کرنے لگی۔ عموماً وہ پانچ بجے تک دفتر سے آجایا کرتے تھے لیکن اسی دن انہیں کوئی خاص مصروفیت بھی ہوگئی۔ میرے سسر کا فون آیا کہ آج وہ اور فیروز، دونوں ہی آٹھ بجے سے پہلے گھر نہیں آسکیں گے۔

آج ہی ہونا تھا کام! میں نے جھنجلا کر سوچا۔

مختصر یہ کہ تین گھنٹے کا وہ وقت مجھ پر صدیوں کی طرح گزرا، بلکہ آٹھ بجے کے بعد بھی دس منٹ اور مجھ پر بہت بھاری گزرے۔

میں نے کمرے کے دروازے پر ان کا استقبال کیا اور مسکراتی ہوئی بولی ''آج میں بڑی بے چینی سے آپ کی منتظر تھی۔''

''اچھا۔'' ان کا لہجہ بے حد سرسری تھا اور وہ اس الماری کی طرف بڑھ گئے تھے جس میں ان کی بوتلیں رکھی رہتی تھیں۔

عام طور پر جب وہ پانچ بجے کے قریب آتے تھے تو کوئی کتاب یا اخبار پڑھتے رہتے تھے یا خاموش بیٹھے ٹیلی وژن دیکھتے رہتے تھے اور ان کی شراب کی بوتل اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی کھلتی تھی لیکن اس روز وہ آئے ہی اندھیرا پھیلنے کے بعد تھے لہٰذا انہوں نے فوراً ہی بوتل کھولی اور صوفے پر بیٹھ کر پینے لگے۔

میں دل پر جبر کر کے ان کے پاس جا بیٹھی اور بولی ''آپ نے پوچھا نہیں کہ مجھے بے چینی سے آپ کا انتظار کیوں تھا؟''

''کیا ضرورت ہے پوچھنے کی۔'' اپنے معمول کے مطابق انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا ''کوئی خاص بات ہے تو تم خود ہی بتاؤ گی۔''

''میں آپ کو ایک خوش خبری سنانا چاہتی ہوں۔''

فیروز نے صرف دو پل کے لیے مجھے گہری نظر سے دیکھا اور پھر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ انہوں نے کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

آخر مجھے ہی کہنا پڑا ''آپ باپ بننے والے ہیں۔''

وہ اس طرح چونکے جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑی خبر سنی ہو۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور دھیمی آواز میں کہا ''آج شاہانہ بھابی مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں۔ اس نے میرے اس شبے کی تصدیق کردی ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔''

وہ ابھی بھی کچھ نہیں بولے اور میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ انہوں نے گلاس منہ سے لگا لیا تھا اور ایک سانس میں اس طرح پیتے چلے جا رہے تھے جیسے پانی پی رہے ہوں۔ بے اختیار میرا ہاتھ اٹھا مگر ان کی طرف بڑھ نہیں سکا۔ میں انہیں اس طرح پینے سے روکنا چاہتی تھی لیکن مجھے ان کی اس سخت تاکید کا خیال آگیا تھا کہ میں شراب کے معاملے میں ان سے کبھی کچھ نہ کہوں۔

گلاس ختم کر کے انہوں نے اس میں دوبارہ شراب نکالی۔ اس مرتبہ انہوں نے گلاس آدھے کے قریب بھر لیا اور اس میں پانی ملائے بغیر گلاس ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے کمرے میں ٹہلنا شروع کردیا۔ وہ شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے تھے اور ان کے چہرے پر برہمی کا ایسا تاثر تھا جیسے میں نے انہیں کوئی بہت بری خبر سنائی تھی۔

میری ساری خوشی خاک میں مل گئی اور مجھے اپنا دل بیٹھتا ہوا سا لگا۔ میں نے نظریں جھکا لیں اور مجھے شاہانہ بھابی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ کیا انہوں نے غلط کہا تھا کہ فیروز کو باپ بننے کا بہت ارمان ہے اور وہ اپنے اردگرد اپنے بہت سے بچے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ان خیالات اور خود کو لگنے والے ذہنی دھچکے کے باعث مجھے احساس ہی نہیں ہو سکا کہ کب کتنا وقت گزر گیا۔ میں اس وقت چونکی جب فیروز خالی گلاس لیے صوفے پر آبیٹھے اور بوتل اٹھا کر انہوں نے پھر گلاس میں انڈیلی۔

''کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی اس بات سے؟'' میں نے بہت جھجکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''کیا مجھے خوشی ہونا چاہیے اس سے؟'' ان کے لہجے کی تلخی شاید شراب سے بھی زیادہ تلخ تھی۔

میں ان کا منہ تکنے لگی۔ انہوں نے اپنی نظریں میرے چہرے سے ہٹالیں اور گلاس میں انڈیلی ہوئی شراب میں پانی ملانے لگے۔ اس کے بعد گلاس ہاتھ میں لے کر انہوں نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

میری آنکھوں میں آنسو امنڈنے لگے۔ میں بہ مشکل صوفے سے اٹھ کر بستر پر جا گری اور تکیے میں منہ چھپا کر خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں فیروز کی محبت کبھی نہیں جیت سکوں گی۔

کتنا وقت مجھے آنسو بہاتے گزرا اور کب میری آنکھیں خشک ہوئیں۔ مجھے کچھ احساس نہیں۔ میں تو ایک دھچکے کی وجہ سے چونکی تھی اور میں نے دیکھا تھا کہ فیروز اس طرح بستر پر آگرے تھے جیسے اپنا توازن برقرار نہ رہ سکے ہوں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ انہوں نے آتے ہی شراب پینا شروع کر دی تھی اس لیے سوٹ ابھی بھی ان کے جسم پر تھا اور انہوں نے اپنے جوتے بھی نہیں اتارے تھے۔ آج انہوں نے اتنی پی لی تھی کہ انہیں کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

معمول تو یہ تھا کہ شراب کے تین چار گلاس پینے کے بعد وہ مجھ سے کھانے کے لیے کہتے تھے اور میں خود جا کے کھانا ایک ٹرے میں لے آتی تھی اور خود بھی ان کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ شادی کے دو تین دن بعد ہی انہوں نے یہ معمول بنالیا تھا۔ گھر کے باقی لوگ ہم دونوں کے بغیر ہی کھانا کھالیا کرتے تھے۔ فیروز کو تو کسنا بھی نے چھوڑ دیا تھا اور ایک اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سب تو بس اس انتظار میں تھے کہ میری وجہ سے ان کے رویے میں کب تبدیلی آنا شروع ہوتی ہے لیکن اس رات جو کچھ ہوا تھا' اس کے بعد تو میں خود مایوسی کا شکار ہونے لگی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ ان سے کھانے کے لیے پوچھا بھی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بالکل غافل ہو چکے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو پھر مچلنے لگے۔ میں نے اسی حالت میں ان کے جوتے اور موزے اتارے اور خود بھی بستر پر کروٹ لے کر لیٹ گئی۔ اس صورتحال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ مجھے بھوک لگتی۔

☆☆☆

دوسرے دن جب میں نے شاہانہ بھابی کو اس بارے میں بتایا تو وہ حیران رہ گئیں۔ میں اس معاملے میں اتنا رو چکی تھی کہ اب ان کے سامنے میری آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔ میں بس افسردہ سی بیٹھی رہی۔

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے صباحت!'' شاہانہ بھابی کچھ توقف سے بولیں۔ میں خاموش بیٹھی رہی۔

''گھر والوں کو تو اب بتانا ہی پڑے گا کہ تم ہنی مون پر ہو۔'' شاہانہ بھابی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

میں اب بھی خاموش رہی۔

شاہانہ بھابی نے اسی دن میری اور اپنی ساس کو میرے ماں بننے کے بارے میں بتا دیا لیکن فیروز کے ردِعمل کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر گھر کے سبھی لوگوں کو اس کا علم ہو گیا۔ گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میری ساس نے دفتر فون کر کے میرے سسر کو یہ خوش خبری سنائی اور انہوں نے اپنی بہن یعنی میری والدہ کو فون کر لیا۔ اس طرح دونوں ہی گھروں میں خوشی کا ماحول پیدا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ میرے سسر نے فیروز کو بھی بتایا ہو گا لیکن مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اپنے باپ کے سامنے فیروز کا کیا ردِعمل سامنے آیا ہو گا' لیکن فیروز اس دن دیر سے گھر آئے جبکہ میرے سسر پانچ بجے ہی آ گئے تھے۔

فیروز کی آمد کے وقت میں اپنے کمرے میں تھی۔ مجھے بعد میں شاہانہ بھابی سے معلوم ہوا کہ اس دن میری ساس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا تھا اور وہ فیروز پر برس پڑی تھیں لیکن فیروز نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سب کچھ سن کر خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کمرے میں آ گئے تھے اور شراب کی بوتل کھول لی تھی۔

میرے سسر کیونکہ میری والدہ کے بھائی تھے اس لیے یہ خبر میرے گھر تک بھی پہنچ گئی کہ فیروز کو اس معاملے میں کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔

میرے سسر نے تو اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی لیکن میری ساس نے میرے سامنے ہی بڑے جھنجلائے ہوئے انداز میں شاہانہ بھابی سے کہا تھا ''ایسی تیسی میں جائے وہ۔'' ان کی مراد فیروز سے تھی۔'' میں تو چھوٹی دلہن کی گود بھرائی کی رسم بڑی دھوم دھام سے کروں گی۔''

اور ایسا ہوا بھی لیکن فیروز بدستور لاتعلق بنے رہے۔ اب تو صورتِ حال میرے لیے اور زیادہ تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ پہلے تو فیروز شراب پیتے تھے تو جذبات کی برانگیختگی انہیں میرے قریب لے آتی تھی لیکن اس دن کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ وہ اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی گھر لوٹتے تھے اور اتنی زیادہ پی جاتے تھے کہ ان پر مدہوشی طاری ہو جاتی تھی اور وہ کھانا کھائے بغیر ہی سو جاتے تھے۔ ان کی وجہ سے میں بھی رات کو بھوکی ہی سوتی تھی۔

شادی کے بعد ایسا ہوتا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک دو دن کے لیے اپنی والدہ کے پاس چلی جایا کرتی تھی اور فیروز خود مجھے چھوڑنے اور لینے جایا کرتے تھے لیکن اب وہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اس معاملے کے بعد ایک مرتبہ میری والدہ خود آ کر مجھے لے گئی تھیں اور دوسری مرتبہ میرے جیٹھ' یعنی شاہانہ بھابی کے شوہر مجھے چھوڑنے گئے۔

میں اب بھی جاتی تھی' ساجد سے آمنا سامنا ہوتا ہی تھا اور میں اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھتی تھی جیسے مجھ پر گزرنے والی قیامت سے وہ بہت خوش ہو۔

جب دوسری مرتبہ میں گھر گئی تو ایک مرتبہ اسے مجھ سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا اور اس نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا ''فیروز کو پا کے بہت خوشیاں ملی ہیں نا تمہیں!''

اور میں اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ شاہانہ بھابی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایک مرتبہ ان کے شوہر نے فیروز کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی مگر نتیجہ یہ نکلا تھا کہ فیروز کے رویے کی وجہ سے وہ بھی فیروز سے ناراض رہنے لگے تھے۔

ایک مرتبہ جب فیروز نے شراب پینا شروع ہی کی تھی تو میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا تھا ''اگر آپ کو میرا ماں بننا اچھا نہیں لگا ہے تو میں ابارشن کرا دیتی ہوں۔''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن جب میں نے جواب کے لیے اصرار کیا تو انہوں نے پٹخنے کے سے انداز میں گلاس تپائی پر رکھا اور غصے سے بولے ''تم جو چاہو فیصلہ کرو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں!''

اور میں نے فیصلہ کیا کہ فیروز کی اتنی زیادہ ناراضگی سے تو یہی بہتر ہے کہ میں ابارشن کرا دوں۔ میں نے دوسرے دن ہی شاہانہ بھابی کو اس بارے میں بتایا تو وہ نہایت سخت لہجے میں بولیں ''ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گی۔''

''لیکن بھابی!'' میں نے روہانسی آواز میں کہا ''اس آنے والے بچے نے تو مجھے فیروز کی اس توجہ سے بھی محروم کر دیا ہے جو اس سے پہلے مجھے ملتی تھی۔''

''کچھ بھی ہو صباحت..... تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ایک بے گناہ کا قتل کرو۔ جو بچہ اس دنیا میں آنے والا ہے اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے اس سارے معاملے میں!''

شاہانہ بھابی کی ان باتوں کے بعد میں نے اپنا فیصلہ تبدیل تو کر لیا لیکن بچے کی پیدائش سے پہلے ہی ماں بننے کی جو خوشی ہوتی ہے وہ ختم ہو گئی۔

اور جب میں ماں بن گئی تو بھی مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی۔

میں ایک بیٹے کی ماں بنی تھی اور گھر والوں کا خیال تھا کہ بیٹے کا چہرہ دیکھنے کے بعد تو فیروز کے دل سے باپ کی محبت امنڈنا ہی چاہیے لیکن فیروز نے تو بچے کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ فیروز سے شادی کر کے ساری زندگی آنسو بہاتے رہنا میرا مقدر ہی بن گیا تھا۔

اس کے بعد فیروز کے رویے کی وجہ سے گھر میں کشیدگی خاصی بڑھ گئی اور ایک رات فیروز نے مجھ سے کہا ''میرا یہ پیغام تم ہی میرے گھر والوں کو دے دو کہ جس طرح پہلے انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ رکھا تھا' ویسا ہی اب بھی کریں ورنہ میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا' ویسا ہی وہ کر بھی گزریں گے اس لیے دوسرے دن میں نے اپنا سر اپنی ساس کے قدموں میں رکھ دیا اور دہائی دی کہ فیروز کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

شادی کے بعد مجھے فیروز سے خوشیاں تو نہیں مل سکی تھیں لیکن یہ نوبت بڑی قیامت خیز ہوتی اگر وہ مجھے چھوڑ کر چلے جاتے۔

شاہانہ بھابی اس صورتِ حال سے نہ صرف پریشان بلکہ حیران بھی تھیں۔

''میں تو ایک ہی نتیجے تک پہنچ سکی ہوں بھابی!'' میں نے افسردگی سے کہا ''جس لڑکی نے کسی اور کا بچہ فیروز کے سر تھوپنا چاہا تھا' فیروز اس سے محبت کرتے تھے اور اس لڑکی کی بے وفائی نے انہیں اتنا صدمہ پہنچایا ہے کہ اب انہیں بچوں

سے بھی کوئی لگاؤ نہیں رہا۔"

"یہ تو بڑی عجیب بات ہے صباحت..... بچے سے کسی لڑکی کی بے وفائی کا کیا تعلق؟"

"وہ تعلق تو میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے لیکن اگر کسی طرح اس لڑکی کا پتا چل جائے تو اچھا ہے۔"

"کیوں؟ اس سے کیا ہوگا؟"

"میں اس لڑکی سے ملوں گی۔ میں کوشش کروں گی کہ فیروز سے اس کی معافی تلافی ہو جائے۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"اگر فیروز اسے معاف کردیں تو میں کوشش کروں گی کہ اس لڑکی سے فیروز کی شادی بھی ہو جائے۔"

"کیا!" شبانہ بھابی حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ "تم دوسری شادی کرواؤ گی فیروز کی؟"

"اگر میں اس طرح بھی فیروز کی کچھ محبت حاصل کرسکوں تو سودا میرے لیے مہنگا نہیں ہوگا۔"

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا! پاگل ہوگئی ہو تم!" شبانہ بھابی نے جھڑک کر کہا۔

اس وقت میری آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔ شاید شبانہ بھابی کی یہ بات ٹھیک تھی کہ ان حالات کی وجہ سے میں پاگل ہوئی جارہی تھی۔

بچے کی پیدائش کے بعد ایک خاص وقت اپنے سسرال میں گزارنے کے بعد جب میں اپنی والدہ کے گھر جانا تھا اور شبانہ بھابی مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مجھے چھوڑنے چلی جائیں گی لیکن اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا اس سے پچھلی رات کو میں نے فیروز کی باہوں میں بتائی تھی۔

"شبانہ بھابی کے ساتھ نہیں۔" فیروز میری طرف دیکھے بغیر بولے۔ "اکیلی ہی خود جنہیں چھوڑ آؤں گا۔ نائٹ ڈرائیو سے چلا جاؤں گا۔"

یہ میرے لیے بڑی خوشی کی بات تھی کہ بہت دن بعد انہیں خیال آیا تھا کہ وہی مجھے چھوڑنے جائیں۔

دوسری صبح میں نے بڑی جلدی جلدی تیاری شروع کی۔ اپنی والدہ کے گھر جانے سے زیادہ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ مجھے کچھ دیر کے لیے فیروز کی رفاقت میسر آجائی اور مجھے یہ گمان بھی ہوا تھا کہ شاید اب فیروز کے رویے میں بتدریج تبدیلی آنا شروع ہوئی۔

فیروز مجھے نے کر روانہ ہوئے تو میں اپنے بیٹے دانش کو وہیں لیے ان کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی مگر انہوں نے اس وقت بھی دانش پر ایک اچٹتی سی نظر بھی نہیں ڈالی۔

گھر کے سامنے کار روک کر وہ مجھ سے بولے۔ "تم بلا مجھے دفتر پہنچنا ہے۔"

"ٹھیک ہے کل کسی وقت آجائیے گا مجھے لینے۔" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

اس وقت فیروز نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔ "یہ لیتی جاؤ۔"

"کیا ہے؟" مجھے الجھن ہوئی۔

"گھر میں جا کر دیکھ لینا۔"

فیروز سے بحث کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا اور لفافہ پرس میں رکھ کر کار سے اتر گئی۔ فیروز نے فوراً کار چلادی۔

گھر میں میرا استقبال بڑے پُرجوش انداز میں ہوا۔ سب سے زیادہ پُرجوش مجھے اپنے بہن بھائی نظر آئے۔ والدہ نے تو دانش کو فوراً ہی میری گود سے لے لیا اور اسے پیار کرنے لگیں۔ میرے والد بچوں اور ساری دنیا سے بے نیاز ہی تھے۔

میں فیروز کا بایوڈاٹا دیکھنے کے لیے بے تاب تھی لیکن وہ سب کے سامنے نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ جلد ہی میں نے اپنا موقع نکال لیا اور لفافہ کھولا۔

طلاق نامہ اور میرے نام فیروز کا چیک تھا اس میں!

کوئی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس وقت مجھ پر کیا گزری ہوگی۔

پھر جب باقی لوگوں کو پتا چلا تو ایسا ماحول ہوگیا جیسے گھر میں کسی کی موت ہوگئی ہو اور پھر سچ مچ ایک موت ہوئی تھی میرے اندر کی۔ اندر کا جو زندہ رہنے والا حصہ تھا، ان پر وہ روح پرور دوا کا اثر کرنا بند ہوگیا تھا۔ ہمارا گھر سچ مچ ایک بار پھر ماتم کدہ بن گیا۔ فیروز کے علاوہ اس کے سبھی گھر والے والدین بہن بھائی بلکہ میرے سسر بھی اپنے اپنے طریقے سے میرا دل بہلانے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے یہ بتانے کی بھی کسی نے زحمت نہیں کی تھی کہ فیروز نے دوسری شادی کرلی ہے۔ میں ہی ہر ایک سے پوچھتی پھرتی تھی کہ فیروز کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ کیسے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ ان سارے سوالات کے جواب میرے سرہانے چارٹ پر بالکل بے تصور تھے۔ ان کے گرد گھومتی پھرتی بے تصور تھی۔ مجھے ان سبھی نے محبت دی تھی۔ میرے گھر کی کربلا کے ذمے دار صرف فیروز تھے۔

اس سلسلے میں بات چیت تو چلی لیکن فیروز نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا کہ انہوں نے مجھے طلاق کیوں دی تھی؟ البتہ وہ مزید کہتے رہے کہ وہ میرے بچے سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے۔

کچھ عرصے بعد یہ گرما گرمی ختم ہوگئی۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا لیکن میری والدہ نے اپنے بھائی سے تعلقات ختم کرلیے تھے۔ ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کا اب کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

آنسو جو میرا مقدر بن چکے تھے انہیں دیکھ کر ساجد کے چہرے پر کبھی کوئی ایسا تاثر نہیں آیا جس سے سمجھا جاسکتا کہ اسے میری زندگی کے اس اندوہناک واقعے سے کوئی دلچسپی ہوگی۔

سارا کار وبار اب چچا کے ہاتھ میں تھا لیکن جس طرح وہ اپنے مرحوم بھائی سے محبت کرتے تھے اسی طرح وہ مجھ سے اور میری والدہ اور میرے چھوٹے بہن بھائی سے کرتے رہے لیکن جانے کیوں میری والدہ کو یہ احساس شدت سے رہا کہ اب ہماری زندگی چچا کے آسرے پر گزر رہی ہے۔ ان کا یہ احساس بتدریج بڑھتا رہا اور ایک سال بعد وہ بیمار رہنے لگیں۔

☆☆☆

چچا کی اس بات نے مجھے شدید بے بسی کا شکار کردیا۔ ان دنوں مجھے ساجد کے چہرے پر پڑی فاتحانہ سی مسکراہٹ نظر آئی تھی جیسے اسے یقین ہو کہ مجھے گھٹنے ٹیکنا پڑیں گے۔ اس کی وہ مسکراہٹ میرے ذہن میں آج بھی محفوظ تھی لیکن اپنے مقدر سے تو کوئی لمحہ بھی لڑنا سکھا۔ میری والدہ کو اگر کچھ ہوجاتا تو الگیاں ہمیشہ میری ہی طرف اٹھتیں۔ میں ساجد سے شادی کرنے پر مجبور ہوگئی لیکن میں نے پہلی ہی رات میں ساجد سے کہہ دیا۔

"میں اپنی ماں کی وجہ سے بارگی ہوں ساجد لیکن یہ طے ہے کہ میری محبت تم کبھی نہیں پاسکو گے۔" میرے لہجے میں شدید نفرت تھی۔

"مجھے تمہاری محبت کی نہیں تمہاری ضرورت ہے۔" ساجد نے بڑی ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارا یہ خوبصورت چہرا..... تمہارا بے..." وہ بے حیائی سے ہنسا۔ "میں نے بس یہی حسن حاصل کرنے کا خواب دیکھا تھا جو آرزو اب پوری ہوگئی۔"

میں غصے میں تلملا کر رہ گئی۔

ڈیڑھ سال بعد میں ساجد کے بچے کی ماں بنی۔ ایک بیوی کی حیثیت سے یہ میرے اختیار میں نہیں تھا کہ ساجد کو اپنے قریب آنے سے روک سکتی لیکن یہ مضروریوں کی کہ اس کی قربت میں مجھے ہمیشہ کراہیت کا احساس ہوتا تھا۔

دانش کی عمر چار سال ہو چکی تھی اور یہ دیکھ کر کہ میں بہت تلملاتی تھی کہ ساجد نے اسے خود سے بہت مانوس کرلیا تھا۔ یہ تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ جو ان سے محبت جتاتا ہے وہ اس کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں۔

ایک دن زچ ہو کر میں نے ان سے کہا۔ "مجھ سے شادی کرنے چلا گا تھا؟" اور جواب میں بچی نے دبی زبان سے بتایا کہ ان کا بیٹا ساجد اس کے لیے تیار ہے۔ اس پر میں بری طرح بگھر گئی تھی اور ایک جواز میں نے یہ دیا تھا کہ ساجد میرا ہم عمر تھا لہٰذا اس سے شادی کرنی نہیں سکتی تھی۔

میری والدہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن میں نہ مانی تو ایک دن والدہ پر دل کا دورہ پڑا۔ بچانے والے بچا نہ سکے۔ جس کے بعد خود میرے بچانے سے بھائیا کہ اگر میں ابھی ساجد سے شادی کے لیے تیار نہ ہوئی تو میری والدہ پر پڑنے والا دل کا دوسرا دورہ جان لیوا بھی ہوسکتا ہے۔

"تم اس تدبیر سے بھی میری محبت نہیں جیت سکتے۔" میں نے ایک دن بڑے تلخ لہجے میں ساجد سے کہا "تم نے شاید کہیں سن لیا ہے کہ اگر کسی عورت کی محبت حاصل کرنا ہو تو اس کے بچوں سے محبت کرو لیکن میرے معاملے میں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔"

"صباحت۔" اس دن ساجد نے بڑی سنجیدگی سے کہا "تمہیں میرا اکم از کم یہ احسان تو ماننا چاہیے کہ تمہارے بیٹے کو میرا نام مل گیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں میرے بیٹے کو تمہارے نام کی۔" میں نے تڑخ کر جواب دیا "مجھے طلاق ہوگئی تو کیا ہوا' بیٹا تو یہ فیروز ہی کا ہے۔"

"یہ فیروز کا بیٹا ہوتا تو فیروز تمہیں طلاق نہیں دیتا۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"تم اسے اتفاق کہہ لو یا کچھ اور لیکن میں ایک ایسی لڑکی کو جانتا ہوں جس سے فیروز کے تعلقات تھے۔ وہ ایک آوارہ لڑکی ہے صباحت..... اس نے کسی اور کا بچہ فیروز کے سر تھوپنے کی کوشش کی تھی لیکن فیروز کو کسی وجہ سے شبہ ہوگیا۔ اس نے میڈیکل ٹیسٹ سے یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں ہے اور یہ ثابت بھی ہوگیا لیکن دوسری طرح..... میڈیکل رپورٹ کے مطابق فیروز میں کوئی ایسی خامی ہے کہ وہ کبھی باپ بن ہی نہیں سکتا۔

"تمہاری اس بکواس پر کم از کم میں تو یقین نہیں کر سکتی ساجد..... تم بے وقوف ہو جو مجھ سے یہ کہہ رہے ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو دانش ان کا بیٹا نہیں ہوتا۔"

"اسی لیے تو فیروز نے تمہیں طلاق دی ہے کہ دانش اس کا بیٹا نہیں ہے۔ یہی تو اس کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہے کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا۔ اس لیے جب اسے معلوم ہوا ہوگا کہ تم ماں بننے والی ہو تو اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس لڑکی کی طرح تم بھی کسی اور کا بچہ اس کے سر تھوپ رہی ہو۔"

"اگر تم نے اپنی یہ بکواس بند نہیں کی تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گی ساجد!" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں سچائی بتا رہا ہوں صباحت!" وہ بولا "فیروز نہ جانے کیوں اس معاملے میں شدید احساسِ کمتری کا شکار ہوگیا ہے۔ اگر وہ تمہیں فوراً طلاق دیتا تو یہ کہا جاتا کہ تم ماں بننے والی ہو اس لیے طلاق ممکن ہی نہیں اور یہ وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ باپ بن ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے اس نے اتنا انتظار کیا کہ تم بچے کو جنم دے دو تو وہ تمہیں طلاق دے اور اسے یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئے کہ وہ باپ بن ہی نہیں سکتا۔"

غصے سے میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ساجد مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ مجھ پر آوارگی کا الزام لگا رہا تھا اور میں غصے سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"حقیقت سمجھنے کی کوشش کرو صباحت!" ساجد اس مرتبہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "یہ ہرگز نہ سمجھو کہ میں تم پر کوئی الزام لگا رہا ہوں۔ دراصل اس لڑکی سے حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد میں سمجھ گیا تھا کہ اس بچے کا باپ دراصل میں ہوں۔ آج میں تمہیں وہ حقیقت بھی بتا دیتا ہوں۔ میری سمجھ میں یہ بات ویسے آج تک آ بھی نہیں سکی کہ اس رات آخر تمہیں کیا ہوگیا تھا۔ یہ اندازہ تو مجھے ہے کہ اس وقت تم کوئی خواب دیکھ رہی تھیں اور تم پر کلورو فارم کا اثر پوری طرح نہیں ہوا تھا لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تم اتنی دیر تک کسی خواب میں رہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہی ہو کہ تم پر کلورو فارم کا کچھ کچھ اثر ضرور ہوا ہوگا۔"

میں غصے اور کچھ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ساجد کی طرف دیکھ رہی تھی اور وہ کہے جا رہا تھا "یہ تمہاری شادی سے پہلے کی رات کا واقعہ ہے جب میں چوری چھپے تمہارے کمرے میں داخل ہوا تھا اور میرے ہاتھ میں کلورو فارم سے بھیگا ہوا رومال تھا۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی صباحت کہ تم مجھ سے پہلے کسی اور کی ہو جاؤ۔ اس رات....."

ساجد بولتا رہا لیکن میرا دماغ ہوا میں اڑنے لگا تھا۔ اس نے کیا کچھ کہا' مجھے سنائی نہیں دیا۔ مجھے وہ رات یاد آ رہی تھی جب میں نے خواب میں فیروز کو دیکھا تھا۔ اپنے اس خواب کا ذکر میں شروع ہی میں کر چکی ہوں۔

اس کے بعد ساجد کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا سوال ہی باقی نہیں رہا تھا لیکن اس دن کے بعد ساجد کے لیے میری نفرت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا اور آج جب ساجد اس دنیا میں نہیں ہے تو بھی میرے دل میں اس کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں جبکہ میں اس کے ایک بیٹے کی ماں بھی ہوں۔

میری زندگی کے اس واقعے کے کئی کردار اب اس دنیا میں نہیں ہیں ورنہ شاید میں یہ سب کچھ لکھنے کی ہمت نہیں کر پاتی۔

میں کرکٹ کی دیوانی ہوں لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں آج کل کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یعنی وہ کھیل سے زیادہ کھلاڑیوں کی شیدائی ہوتی ہیں۔ نہایت ذوق وشوق سے کرکٹ میچز دیکھنے والی لڑکیوں کو بعض اوقات یہ تک نہیں معلوم ہوتا کہ کلین بولڈ کسے کہتے ہیں اور رن آؤٹ کیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ان کی دلچسپی کا محور کھیل نہیں ہوتا بلکہ کھلاڑی ہوتے ہیں۔ میں ان سب سے مختلف تھی۔ بچپن میں جب لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ میں کرکٹ کھیلنے میدان میں پہنچی ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے پاس ہی ایک بڑا سا میدان تھا۔ جہاں شام ہوتے ہی کئی ٹیمیں بیک وقت نبرد آزما ہو جاتی تھیں۔ یہ مختلف عمر کے لڑکوں پر مشتمل ہوتی تھیں اور ان میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں لڑکی تھی' بلکہ اس لیے کہ میں اچھی کھلاڑی تھی۔

میرے دو بڑے بھائی ہیں' سجاد بھائی اور فرہاد بھائی۔ میرے بعد ایک بہن اور پھر ایک چھوٹا بھائی ہے۔ بہن صفیہ اور اس سے چھوٹا بھائی اکبر ہے۔ ابو جی ایک ملکی فرم میں کام

محترم معراج صاحب، تسلیمات!

پوری دنیا میں شاید ہمارا ملک اس لحاظ سے بڑا بدنصیب ہے کہ یہاں میرٹ کی بجائے تعلقات، سفارشات، رشوتوں اور بے ایمانیوں سے زیادہ تر کام کیے جاتے ہیں۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ اگر ہم ہر شعبہ میں دیانتداری، راست گوئی اور میرٹ کو اپنا معیار بنالیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی ترقی یافتہ قومیں بھی ہمارا شاید مقابلہ نہ کرسکیں۔ مگر یہ ایک بڑا بھاری پتھر ہے اور کسی کو اسے اٹھانے تو کیا ہلانے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ اللہ ہی ہمارے حال پر رحم کرنے والا ہے۔ اگر یہ سچ بیانی آپ کے معیار پر پوری اترے تو اپنے پرچے میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

والسلام

رمیہ سرمد، کراچی

فائنل سلیکشن

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کرتے آئے ہیں۔ ابو اس فرم کے قیام ہی سے اس میں کام کررہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے فرم ترقی کرتی رہی ابو جی کی بھی ترقی ہوتی رہی اور ان دنوں وہ جنرل منیجر ہیں۔

گلشن اقبال کے ایک پرانے اور گنجان آباد علاقے میں ہمارا بڑا سا مکان ہے۔ جب ابو جی نے یہ مکان بنایا تھا پلاٹ بڑے اور سستے ہوا کرتے تھے۔ اب پلاٹ چھوٹے اور مہنگے ہوگئے ہیں۔ ابو نے بینک سے قرض لے کر اس پر مکان بنوایا۔ آج یہ مکان خاصا پرانا ہوگیا ہے' لیکن ہمارے لیے یہ دنیا کے سب گھروں سے زیادہ خوب صورت ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کرکٹ کا شوق کس طرح میرے اندر سرایت کرگیا تھا۔ کیونکہ نہ تو سجاد بھائی کو اور نہ ہی فرہاد بھائی کو کرکٹ سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔ وقت ملا تو کھیل لیا۔ ورنہ وہ دونوں ہی اپنی تعلیم میں مگن رہا کرتے تھے۔ ابو جی ہم سب بہن بھائیوں سے بے انتہا پیار کرتے ہیں لیکن تعلیم کے معاملے میں شروع سے ہی سخت رہے ہیں۔ خاص طور سے دونوں بڑے بھائیوں کو وہ خود پڑھاتے تھے۔ ابو عام طور سے شام سات بجے گھر آجاتے اور آتے ہی بھائیوں کو اور بعض اوقات ہمیں بھی پڑھانے بیٹھ جاتے اور یہ سلسلہ خاصی دیر جاری رہتا۔ ابو جی کو ہمیشہ سے مطالعے کا شوق رہا ہے۔ گھر میں ٹی وی شروع سے موجود ہے لیکن شاذ ہی چلتا تھا۔ گھر میں مختلف اخبار اور رسائل آتے تھے۔ ابو جی نے بعض ادبی قسم کے پرچے بھی مستقل لگا رکھے تھے۔ یوں ہمارے گھر کا ماحول خاصی حد تک پڑھنے لکھنے والا تھا۔ اس میں کھیل اور ٹی وی جیسی چیزوں کی گنجائش کم ہی تھی۔

لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں چار سال کی تھی تو گلی میں کھیلتے چھوٹے بچوں کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اس وقت دو تین لڑکیاں اور بھی ہوتی تھیں جو یہ کھیل کھیلا کرتی تھیں۔ ہم بچے ایسے ہی کھیلتے تھے جیسے اور بچے کھیلتے ہیں۔ یعنی کھیلتے کم تھے اور لڑتے زیادہ تھے۔ ہر بچے کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ بیٹنگ کرے اور اس مقصد کے لیے آؤٹ ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس پر خوب جھگڑے ہوتے۔ بالنگ کرانے کو کوئی تیار نہیں ہوتا لیکن میں شروع سے بالنگ کرانا پسند کرتی تھی اور خاصی تیز بالنگ کراتی۔ میری بالنگ پر بچے ہر تھوڑی دیر بعد آؤٹ ہوجاتے۔ اس پر شور مچتا پھر مجھے تیز بالنگ کرانے سے روک دیا جاتا۔ میں آہستہ بال کراتی پھر بھی آؤٹ کردیا کرتی تھی۔

میری اٹھان عام بچوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ تھی۔ چار سال کی عمر میں چھ سات سال کی لگتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب دوسروں کو پتا چلتا کہ میں ابھی تک اسکول نہیں گئی تھی تو وہ تعجب کرتے کہ اتنی بڑی بچی کو ابھی تک اسکول میں داخل نہیں کرایا۔ آج کل بچے تین چار سال کے ہوتے نہیں ہیں اور ماں باپ انہیں کسی نرسری یا مونٹیسوری اسکول میں داخل کرا دیتے ہیں۔ اس وقت انگریزی اسکول کا رواج اتنا نہیں تھا اور بچوں کو پانچ چھ سال کی عمر میں ہی اسکول میں داخل کرایا جاتا تھا۔

جب لوگوں نے امی اور ابو سے کئی بار کہا تو امی نے تنگ آکر ابو سے بولا ''اسے اب اسکول میں داخل کرا ہی دیں۔''

''کون..... رمیہ.....؟'' ابو چونکے ''اس کی عمر ہی کیا ہے؟''

''ہاں لیکن لگتی ماشاءاللہ سے چھ سات سال کی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ چونک جاتے ہیں کہ اب تک بچی کو اسکول میں داخل نہیں کرایا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ابو نے سر ہلا دیا ''چند ہفتے بعد نیا سیشن شروع ہورہا ہے۔ تم آس پاس کوئی اسکول دیکھ لو۔''

''گورنمنٹ اسکول تو خاصا دور ہے۔ قریب میں ایک اسکول ہے۔ میری ایک جاننے والی اس میں ٹیچر ہیں۔ میں ان سے بات کرلوں گی۔ رمیہ ان کے ساتھ ہی چلی جایا کرے گی۔''

''بھئی میں نہیں سمجھتا کہ رمیہ کو اسکول آنے جانے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔'' ابو جی نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ وہ سجاد اور فرہاد بھائی کے ہمراہ مجھے گھر پر ہی کچھ نہ کچھ پڑھاتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول نہ جانے کے باوجود میں بہت کچھ جانتی تھی۔

ابو کی بات سن کر امی بھی ہنسنے لگیں ''ہاں ماشاءاللہ رمیہ اتنی تیز ہے کہ کرکٹ میں بھی محلے کے سارے بچوں کو ہرا دیتی ہے۔ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔''

''تم دیکھنا رمیہ بہت خود اعتماد نکلے گی۔'' ابو نے پیار سے میری طرف دیکھا میں خوش ہوگئی۔ لیکن ساتھ ہی اسکول کے حوالے سے مجھے فکر لاحق ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ جو بچے کھیلتے تھے ان میں سے کئی اسکول بھی جاتے تھے۔ اور وہ سب اسکول سے سخت نالاں تھے۔ تعلیم اور اپنی ٹیچرز کا ذکر وہ اتنے خوفناک انداز میں کرتے کہ مجھے بھی پڑھنے کے نام سے خوف آنے لگتا تھا۔ اس لیے میں نے موقع پاکر امی سے منمنا کر کہا ''میں ابھی اسکول نہیں جاؤں گی۔''

''کیوں نہیں جاؤ گی؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''بس نہیں جاؤں گی!'' میں نے ضد کی مگر امی پر اس کا

کوئی اثر نہیں ہوا۔

مجھے دو مہینے بعد ایک پرائیویٹ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ شروع میں تو میں بہت روئی دھوئی۔ میں تو ہر وقت گیند بلا لیے کرکٹ کھیلا کرتی تھی اسکول جانے کی وجہ سے یہ پریکٹس چھوٹ گئی۔ مجھے بہت برا لگا تھا کہ اسکول کی وجہ سے میں کرکٹ سے دور ہوگئی تھی۔ شروع شروع میں تو امی کو مجھے زبردستی اسکول چھوڑ کر آنا پڑا تھا پھر رفتہ رفتہ مجھے عادت ہی ہوگئی اور جب ایک مس نے اسکول میں بھی آدھی چھٹی کے وقفے میں بچوں کے ساتھ کرکٹ کھلانا شروع کی تو اسکول سے ساری نفرت ختم ہوگئی۔ ظاہر ہے میں اسکول کی ننھی سی ٹیم میں فوراً ہی شامل ہوگئی اور پھر جلد ہی اپنے اچھے کھیل کی وجہ سے میں ٹیم کی کیپٹن بن گئی۔

دوسری طرف گلی میں شام کی کرکٹ جاری تھی۔ ایک روز میں بالنگ کرا رہی تھی کہ چچا عبدالباری وہاں سے گزرے۔ انہوں نے مجھے بالنگ، اور وہ بھی فاسٹ بالنگ، کراتے دیکھا تو حیرت کے مارے رک گئے۔ میں باقاعدہ فاسٹ بالر کے انداز میں بھاگتی ہوئی آئی اور ہاتھ گھما کر بال کرائی۔ اس وقت میں کوئی پانچ چھ سال کی تھی۔ جب میں نے اوور ختم کرلیا تو چچا عبدالباری میرے پاس آئے۔

''شاباش بیٹی تم تو بہت اچھی بالنگ کراتی ہو۔'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ''کیا نام ہے؟''

''رمیہ علی۔'' میں نے شرما کر جواب دیا۔

''اچھا تم رمدعلی کی بیٹی ہو۔ معاف کرنا بیٹی میں پہچان ہی نہیں سکا۔'' چچا عبدالباری ہنسے ''اچھا یہ بتاؤ کب سے کرکٹ کھیل رہی ہو؟''

''بہت دن سے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ماشاءاللہ اتنی سی عمر میں تمہیں کرکٹ کی سمجھ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ ہماری ٹیم کی طرف سے کھیلو گی؟''

چچا عبدالباری نے محلے کے بچوں کی ایک کلب ٹیم بنا رکھی تھی جس کے سرپرست وہی تھے۔ وہی بچوں کی کوچنگ کرتے تھے اور وہی ہر جمعے کو میچ منعقد کراتے تھے۔ جب انہوں نے مجھے اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی بات کی تو میں خوش ہوگئی۔

''سچ چچا آپ مجھے اپنی ٹیم میں کھلائیں گے؟''

''ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔ لیکن پہلے تم اپنی امی ابو سے اجازت لے لو۔''

یہ ایک مسئلہ تھا' یعنی امی ابو سے بڑے بچوں کی ٹیم میں کھیلنے کا اجازت نامہ حاصل کرنا۔ لیکن میں نے آرام سے جاکر ابو سے پوچھ لیا ''ابو میں چچا باری کی ٹیم میں کھیل سکتی ہوں؟''

''کیا..... کہاں کھیل سکتی ہو؟'' ابو چونکے۔ وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔

''چچا باری کی کرکٹ کی ٹیم میں.....'' اس بار میں نے زیادہ وضاحت سے بتایا۔

''تم کرکٹ کھیلو گی؟'' ابو نے حیرت سے دریافت کیا۔

''لیجیے' جناب کو پتا ہی نہیں۔ صاحب زادی کرکٹ کی دیوانی ہیں۔ روز دو تین گھنٹے محلے کے بچوں کے ساتھ کھیل نہ لیں تو ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔'' امی نے ابو کی چائے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ چھٹی والے دن ابو جی شام کی چائے گھر کے چھوٹے سے لان میں پیا کرتے تھے۔ یہاں پر امی نے محنت کرکے بے شمار پھول دار پودے لگا رکھے تھے۔ وہیں ایک طرف نیم کا بڑا سا درخت تھا اس کے تلے کرسیاں اور میز کے ساتھ ایک عدد بڑی سی چارپائی بھی رکھی تھی۔ ایک طرف ابو نے درخت کی موٹی سی شاخ پر بڑا سا صوفے نما جھولا ڈلوا رکھا تھا۔ ذرا آگے سجاد بھائی نے میرے اور صفیہ کے لیے رسی والا جھولا بھی ڈال رکھا تھا۔ امی چارپائی پر اپنے سارے کام نمٹاتی جاتی تھیں۔ دوپہر کا کھانا ہم اکثر اسی جگہ کھاتے تھے اور جس روز امی زیادہ تھک جاتی تھیں۔ دوپہر میں اس چارپائی پر سو جاتی تھیں۔ اس کی زمین کچی تھی جس پر امی نے پانی چھڑک کر اسے تقریباً پختہ کرلیا تھا۔ امی نے اس کچے فرش پر گھاس نہیں لگائی۔

ابو اس وقت یہیں بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا تو وہ حیران رہ گئے۔ انہوں نے امی سے کہا ''بھئی..... میں جانتا ہوں۔ یہ کرکٹ کی شوقین ہے لیکن باری کی ٹیم میں تو خاصے بڑے لڑکے کھیلتے ہیں۔ یہ ان کے ساتھ کیسے کھیلے گی۔''

''جی اور لوگ کیا کہیں گے جب یہ لڑکوں کے ساتھ کھیلے گی۔'' امی نے کہا تو ابو نے جز بز ہوکر انہیں دیکھا۔

''آپ عورتوں کے دماغ میں بس یہی ایک بات بھری رہتی ہے۔ جہاں لڑکی ہوئی نہیں آپ نے اسے جوان کرنا شروع کردیا۔''

''میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہ بچی ہے اور وہاں بڑے لڑکے کھیلتے ہیں۔ کہیں اسے چوٹ نہ لگ جائے۔''

''ابو مجھے کھیلنا آتا ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا ''مجھے چوٹ نہیں لگے گی۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' امی نے مجھے ڈانٹا ''میں تو سوچ رہی تھی کہ اسے گھر بٹھالوں اور صاحب زادی میدان میں جاکر کھیلنے کی فکر میں ہیں۔''

''لڑکی سے اس طرح بات مت کیا کرو۔'' ابو جی نے امی سے کہا پھر مجھ سے بولے ''بیٹا جی آپ کھیلنے کے بجائے پڑھنے پر توجہ دیں تو اچھا ہوگا۔''

''ابو میں پڑھتی بھی تو ہوں۔'' میں نے التجا کی ''ابو پلیز مجھے اجازت دے دیں۔''

''اچھا میں باری سے بات کروں گا۔'' ابو نے اخبار دوبارہ سامنے کرلیا اور میں منہ لٹکائے ہوئے اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ابو جی مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے مگر واپس آئے تو ان کے ساتھ چچا عبدالباری بھی تھے۔ انہیں دیکھ کر میں خوش ہوگئی اور امی نے منہ بنالیا ''یہ مصیبت یہاں بھی آگئی!''

میں منتظر تھی کہ ابو اور چچا میں کیا بات ہوتی ہے۔ اتنے میں ابو نے مجھے آواز دی ''رمیہ بیٹی ادھر آؤ۔''

میں لیک کر گئی ''جی ابو!''

ابو خوشگوار موڈ میں تھے ''بیٹا تمہارے چچا کہہ رہے ہیں کہ تم بہت اچھا کھیلتی ہو۔''

''میں اس کا بالنگ ایکشن دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔'' باری چچا بولے ''بالکل کسی منجھے ہوئے بالر کا انداز تھا۔''

''اچھا.....!'' ابو جی دلچسپی سے بولے پھر میری طرف دیکھا ''بیٹا جی..... ذرا بال کرا کے دکھاؤ۔''

میں مارے جوش کے فوراً بال لے کر آئی۔ صحن خاصا بڑا تھا۔ میں ایک کونے تک گئی اور بھاگتی ہوئی آکر ہاتھ گھما کر بال کرائی جو سیدھی امی کے ایک پودے کو جا کر لگی۔ شکر ہے امی اس وقت وہاں نہیں تھیں ورنہ میری شامت آجاتی۔ ابو نے حیرت سے مجھے دیکھا ''ویری گڈ۔ بھئی تم تو واقعی کرکٹ کھیل سکتی ہو۔''

''جی ابو۔'' میں نے فخر سے کہا ''کیا میں چچا باری کی ٹیم میں کھیل سکتی ہوں؟''

''یہ تو آپ کی امی سے پوچھنا پڑے گا۔'' ابو جی سوچ میں پڑ گئے۔

''یار سرمد۔ بچی کو روکو مت۔ اس میں صلاحیت ہے۔ یہ آگے جائے گی۔ اب تو لڑکیوں کی ٹیمیں بھی بننے لگی ہیں۔ ممکن ہے اسے چانس مل جائے۔''

''یار اتنی دور کی مت سوچو۔'' ابو جی ہنسے ''میں نے تو بس اس کا شوق دیکھ کر تم سے بات کرلی۔''

چچا عبدالباری ابو جی پر بہت زور دے کر گئے تھے کہ مجھے ٹیم میں ضرور بھیجیں۔ ابو جی نے امی سے بات کی تو انہوں نے صاف انکار کردیا ''کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ کیا کہیں گے' لڑکی ہو کر اتنے سارے لڑکوں کے درمیان میں کھیلتی ہے۔''

امی میرے سامنے ہی یہ بات کہہ رہی تھیں اس پر ابو نے انہیں گھورا ''ذرا خیال رکھیں..... اور رمیہ تم جا کر سو جاؤ۔''

میں رونے والے انداز میں امی ابو کے پاس سے چلی آئی۔ میرا خیال تھا امی کسی صورت اجازت نہیں دیں گی مگر اگلے روز جب ابو نے مجھے بلا کر کہا کہ میں چچا عبدالباری کی ٹیم میں کھیل سکتی ہوں تو میں حیران رہ گئی تھی۔

''سچ ابو جی؟'' میں نے پوچھا ''پر امی.....؟''

''بھئی آپ کی امی بھی مان گئی ہیں۔'' ابو بولے تو میں خوشی سے ان سے لپٹ گئی۔

اگلے روز سے میں نے میدان میں جانا شروع کردیا۔ جہاں چچا عبدالباری روزانہ اپنی ٹیم کو پریکٹس کراتے تھے۔ جب لڑکوں نے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئے ''چچا کیا یہ ہمارے ساتھ کھیلے گی؟''

''ہاں یہ بہت اچھی بالر ہے۔'' چچا عبدالباری بولے۔

''لیکن یہ تو لڑکی ہے۔''

''ہاں لیکن بہت اچھا کھیلتی ہے۔''

ٹیم میں دس سال سے لے کر بارہ تیرہ سال کی عمر تک کے لڑکے شامل تھے۔ ایک نسبتاً بڑے نظر آنے والے لڑکے نے حقارت سے کہا ''یہ کیسے کھیلے گی۔ یہ تو اتنی چھوٹی سی ہے۔ یہ کیا کھیلے گی۔''

''بیٹے ایسا کرو تم بلّا لے کر کھیلنے آجاؤ۔'' چچا عبدالباری مسکرا کر بولے۔

وہ بلّا لے کر وکٹوں کے سامنے آیا تو چچا عبدالباری نے مجھے بال دی ''رمیہ بیٹی گھبرانا نہیں۔ جیسے تم بال کراتی ہو اسی طرح کرانا اور وکٹوں کا نشانہ لینا۔''

میں گھبرا رہی تھی لیکن چچا عبدالباری کے حوصلہ دلانے پر میں نے ہمت کی اور اپنے مخصوص انداز میں بھاگ کر آکے بال کرائی اور میرے منہ سے مارے خوشی کے چیخ نکل گئی جب اگلے والا بلے باز میری پہلی ہی گیند پر کلین بولڈ ہوگیا۔ اس نے کھسیا کر چچا عبدالباری سے کہا ''اتفاق ہے چچا۔ اسے کہیں پھر سے بال کرائے۔''

چچا باری کے کہنے پر میں نے اسے پورا اوور کرایا اور اسے ایک بار اور آؤٹ کیا۔ وہ مجھے ایک بار بھی اعتماد سے نہیں کھیل سکا۔ چچا عبدالباری بے حد خوش تھے۔ اس شام میں نے ان کے ساتھ پریکٹس کی۔ میں بہت خوش تھی کیونکہ گلی کے بچوں کے ساتھ کھیل کھیل کر مجھے بوریت ہونے لگی تھی۔ درحقیقت وہ میرے معیار کے کھلاڑی نہیں تھے۔ حالانکہ عمر میں تقریباً سب ہی میرے برابر یا مجھ سے بڑے تھے مگر کھیل

کے معاملے میں میں کسی سے کم نہیں تھی۔ سات سال کی عمر میں ہی خاصی پختگی سے کھیلنے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے خود سے خاصے بڑے اور تجربے کار لڑکوں کے ساتھ کھیل کر مزہ آیا تھا۔ پریکٹس کے دوران میں نے ٹیم کے تمام اچھے بلے بازوں کو کئی بار آؤٹ کیا۔

''بس آج سے رمیہ ہماری طرف سے کھیلا کرے گی۔'' ٹیم کے کپتان محسن احمد نے چچا عبدالباری سے کہا۔

''میں اسی لیے تو اسے لایا ہوں۔'' چچا بولے ''بلکہ یہ اگلے میچ میں بھی کھیلے گی۔''

''سچ چچا؟'' میں خوش ہوگئی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

یوں میں نے صرف سات سال کی عمر میں باقاعدہ اپنا پہلا میچ کھیلا۔ ہمارے گھر کے پاس جو میدان تھا اس کے ایک حصے پر چچا عبدالباری نے باقاعدہ سیمنٹ وکٹ بنا رکھی تھی۔ ہر جمعے کو نماز کے بعد یہاں پر محلے کے بچوں کی ٹیموں کا آپس میں میچ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی دوسرے محلوں کی کوئی ٹیم بھی آجاتی تھی۔ چچا عبدالباری جان بوجھ کر نسبتاً بڑے لڑکوں کی ٹیم سے اپنی ٹیم کا میچ کراتے تھے تاکہ ان کے کھلاڑیوں کو تجربہ ملے اور وہ اپنے کھیل کو بہتر بنا سکیں۔ اس روز جب میں میدان میں پہنچی تو خاصے لوگ وہاں جمع تھے۔ ان کے لیے یہ خبر حیرت انگیز تھی کہ چچا باری کی ٹیم' جو باری کلب الیون کے نام سے جانی جاتی تھی' اس میں ایک لڑکی بھی میچ کھیل رہی ہے۔ ایک ہفتے کی پریکٹس سے میں نے چچا عبدالباری سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

جب امی نے سنا کہ میں باقاعدہ میچ کھیلنے جارہی ہوں تو انہوں نے سر پیٹ لیا ''اب یہ میدان میں جا کر لڑکوں کے ساتھ کدنگڑے لگائے گی۔''

''بابا اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔'' ابو جی نے تنگ آکر کہا۔ کیونکہ جب سے میں میدان میں جا کر کھیل رہی تھی۔ امی کا برابر ابو سے اصرار تھا کہ مجھے دی ہوئی اجازت واپس لے لیں مگر ابو نے ان کی بات ماننے سے صاف انکار کردیا تھا۔ انہوں نے امی سے کہا ''ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کھیلنے دو۔''

''آپ تو جب یہ بارہ تیرہ سال کی ہوجائے گی تب بھی یہی کہیں گے۔'' امی نے تلملا کر کہا تھا ''اس کی جسامت دیکھی ہے ماشاءاللہ سے دس گیارہ سال کی لگتی ہے۔ اور دو تین سال میں جوان لگنے لگے گی۔''

''جب دس بارہ سال کی ہوگی تو دیکھا جائے گا۔'' ابو جی نے بے پروائی سے کہہ کر انہیں ٹال دیا۔

بہرحال امی کی سخت مخالفت کے باوجود مجھے اس میچ میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ اس وقت تک محلے کی کوئی لڑکی بھی ایسے کسی میچ میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ یہ اعزاز صرف مجھے حاصل ہوا تھا اور یہ اعزاز مجھے میرے کھیل نے دلایا تھا۔ چچا عبدالباری نے بھانپ لیا تھا کہ مجھ میں اچھا کھلاڑی بننے کی تمام صلاحیتیں ہیں۔ میرا قد لمبا اور جسم چھریرا تھا۔ میں اپنے جسم کی لچک سے فائدہ اٹھا کر تیز بال کراتی تھی اور بال کو دکٹ پر گھمانے کا فن بھی سیکھتی جارہی تھی۔ اسی وجہ سے اچھے اور عمر میں کہیں بڑے بلے باز بھی مجھے درست طریقے سے نہیں کھیل پاتے تھے۔ اس میچ میں بھی چچا عبدالباری نے ہمارا مقابلہ ایک سخت ٹیم سے کرایا تھا جس کے اکثر لڑکے چودہ پندرہ سال کی عمر کے تھے لیکن ہماری ٹیم نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ پہلے کھیل کر ہم نے اچھے خاصے رنز بنائے اور جب ان کی باری آئی تو میں نے ان کے دو کھلاڑی آؤٹ کردیئے تھے۔ مگر کوشش کے باوجود ہم وہ میچ نہ جیت سکے۔ اس میچ میں میری کارکردگی دیکھ کر سب ہی حیران ہوئے تھے۔ خاص طور سے چچا عبدالباری بے حد خوش تھے وہ خود مجھے چھوڑنے گھر تک آئے تھے۔ انہوں نے کہا۔

''اب تم ہماری طرف سے ہر میچ میں کھیلو گی۔''

یہ بات امی نے سنی تو مجھے خوب ڈانٹا ''بس بہت ہوگیا کھیل۔ اب تم گھرداری سیکھو۔''

''گھرداری سیکھنے کے لیے عمر پڑی ہے۔'' ابو نے انہیں یاد دلایا ''رمیہ ابھی صرف سات برس کی ہے۔''

سجاد بھائی اور فرہاد بھائی بھی میرے طرف دار تھے اس لیے میں بدستور کرکٹ کھیلتی رہی۔ میری سزا بے چاری صفیہ کو ملی۔ امی نے اس کے باہر جا کر کھیلنے پر پابندی لگادی تھی۔ انہیں خطرہ تھا کہ وہ بھی میری طرح میدان میں جا کر نہ کھیلنے لگے۔ ویسے بھی میری بہن صفیہ کو لڑکوں والے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ابو جی کی طرف سے اجازت مل چکی تھی اس لیے میں روزانہ شام کو پریکٹس کرنے میدان میں جاتی تھی اور ہر جمعے کو میچ میں بھی حصہ لیتی تھی۔ میری کارکردگی ہر میچ کے بعد اچھی ہورہی تھی۔ میں پریکٹس میں سب سے زیادہ محنت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چچا عبدالباری مجھ سے بے حد خوش تھے۔ وہ خود مجھے گھر سے لینے اور چھوڑنے آتے تھے' حالانکہ میدان دو گلی کے بعد ہی تھا۔ غالباً چچا عبدالباری اسی وجہ سے زیادہ خیال رکھتے تھے کہ امی کو اعتراض کا موقع نہ ملے۔ وہ بھی جان گئے

تھے کہ امی کو میرا کرکٹ کھیلنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا اور ان کا بس چلتا تو مجھے گھر بٹھا لیتیں۔

میں پڑھائی میں بھی اچھی خاصی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں پہلی دوسری پوزیشن تو حاصل نہیں کرسکتی تھی لیکن اوسطاً طلبا سے بہتر ہی تھی۔ اس کی بڑی وجہ تو ہمارے گھر کا ماحول تھا اور ابو جی بھی اپنی مصروفیت کے باوجود ہم سب بہن بھائیوں کی پڑھائی پر مکمل توجہ دیا کرتے تھے۔ دوسرے مجھے ابو جی نے یہ تاکید بھی کی تھی کہ اگر مجھے اپنا کرکٹ کا شوق پورا کرنا ہے تو مجھے تعلیم کی طرف بھی پوری توجہ دینا ہوگی۔ ابو جی نے کہا تھا ''اگر تعلیم کے معاملے میں تم پیچھے رہ گئیں تو تمہاری امی کو موقع مل جائے گا کہ تمہارے کھیلنے پر پابندی لگا دی جائے۔'' چنانچہ میں نے نہ صرف ابو سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی تعلیم پر پوری توجہ دوں گی' بلکہ دل و جان سے کھیل کے ساتھ پڑھائی میں بھی پورا زور لگاتی تھی۔

ہم پانچوں بہن بھائیوں میں مجھے لگتا تھا کہ ابو سب سے زیادہ محبت مجھ سے ہی کرتے تھے۔ بہرحال مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی کوئی فرمائش کی ہو اور ابو نے اسے پورا نہ کیا ہو جبکہ دوسرے بہن بھائیوں کو وہ انکار بھی کر دیتے تھے اور انہیں ضد کرنے پر ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے مگر میری ہر بات ابو جی پوری توجہ سے سنا کرتے تھے۔ سجاد بھائی نے تو میرا نام ہی ابو کی چہیتی رکھ دیا تھا مگر میں بھی تو ابو کا سب سے زیادہ خیال رکھتی تھی۔ وہ جب دفتر سے آتے میں بھاگ کر ان کا استقبال کرتی۔ ان کے ہاتھ سے بریف کیس لیتی پھر جب ابو آکر بیٹھتے تو انہیں پانی پلاتی۔ ان کے لیے چپل لاتی اور جب ابو نہا دھو کر آتے تو میں ان کے لیے چائے بنا کر لاتی۔ آٹھ سال کی عمر سے میں نے یہ ذمے داری اپنے ذمے لے لی تھی۔ دس سال کی عمر سے میں ابو کے لیے ناشتا بھی بنانے لگی تھی۔ پھر امی کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تو گھر کی زیادہ تر ذمے داری میں ہی پوری کرتی تھی۔ میں اکثر یوں بھی گھر کے کاموں میں زیادہ ہاتھ بٹاتی تھی کہ کہیں اسی بہانے میرے کھیل پر پابندی نہ لگا دی جائے۔

جیسے جیسے میری عمر اور جسامت بڑھ رہی تھی میرے کھیل کے معیار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دس سال کی عمر تک میں چچا عبدالباری کے کلب کے ساتھ کھیلتی رہی پھر میں ایک سرکاری اسکول میں چلی گئی۔ جہاں پر لڑکیوں کی کرکٹ ٹیم تھی۔ میں اس کی طرف سے کھیلنے لگی۔ دوسرے دس گیارہ سال کی عمر میں ہی میں خاصی بڑی لگنے لگی تھی۔ محلے کی بات تھی اس لیے جب امی نے چچا عبدالباری کی ٹیم سے کھیلنے کی مزید اجازت دینے سے انکار کیا تو میں ان کی بات مان گئی۔ ویسے بھی اب میرا کرکٹ کا شوق اسکول میں پورا ہو جاتا تھا۔

اسکول میٹرک تک تھا اور اس وقت میں چھٹی جماعت میں تھی۔ ٹیم میں ساری ہی لڑکیاں عمر اور کلاس کے معاملے میں مجھ سے آگے تھیں لیکن کھیل میں سب ہی مجھ سے پیچھے تھیں۔ اس لیے ایک سال کے اندر کھیلوں کی ٹیچر نے مجھے ٹیم کا کپتان بنا دیا۔ ہمیں آدھی چھٹی آخری پیریڈ کے بعد ملتی تھی اور ایک گھنٹا ہمیں اسکول میں ہی گزارنا ہوتا تھا اس لیے کہ اس سے پہلے اسکول سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی تھی۔ اسی لیے ٹیم کی لڑکیاں اس پیریڈ میں اسکول کے عقبی میدان میں پہنچ جاتی تھیں اور پھر ہم پریکٹس کرتے یا آپس میں پریکٹس میچ کھیلتے۔ میں لڑکیوں کی کپتان ہی نہیں تھی بلکہ ایک طرح سے ان کی کوچ بھی تھی۔ انہیں سکھاتی اور اپنی بساط بھر ان کی خامیاں بھی دور کرتی تھی۔ میری محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سالانہ کھیلوں میں ہمارا میچ ایک اور اسکول سے ہوا اور ہم نے اسے باآسانی ہرا دیا تو سب حیران رہ گئے۔ کیونکہ ہماری مخالف ٹیم بھی مضبوط تھی اور اس میں زیادہ تر نویں دسویں کلاس کی لڑکیاں تھیں۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہماری ٹیم اتنا اچھا کھیلتی ہے۔ ہمارے اسکول کی پرنسپل نے ہمیں انعام دیتے ہوئے کہا ''ورنہ میں اپنی ٹیم کا نام انٹر اسکول ٹورنامنٹ میں بھیجتی۔''

میں افسوس کرکے رہ گئی۔ کیونکہ اب تو ٹورنامنٹ ختم ہونے کے قریب تھا۔ میں نے پرنسپل سے کہا ''آپ اگلے ہونے والے ٹورنامنٹ میں ہمارا نام بھیج سکتی ہیں۔''

''میں ایسا ضرور کروں گی۔'' انہوں نے یقین دلایا ''لیکن تم لوگوں کو پوری تیاری کرنا ہوگی اور ٹورنامنٹ جیت کر لائیں تو میرا وعدہ ہے میں پوری ٹیم کو پکنک پر لے جاؤں گی۔''

لڑکیاں یہ سن کر خوش ہوگئیں اور انہوں نے پریکٹس میں زیادہ جان مارنی شروع کردی۔ کھیل کی خاطر اسکول کی طرف سے ہمیں ایک پیریڈ سے چھٹی مل گئی تاکہ ہم دو گھنٹے اسکول میں پریکٹس کرسکیں۔ ہمیں یہ سہولت ملی تو اسکول کی چند دوسری لڑکیوں نے جنہیں ان کی خواہش کے باوجود ٹیم میں نہیں لیا گیا تھا' اپنی الگ کرکٹ ٹیم بنالی اور اسپورٹس ٹیچر سے مطالبہ کیا کہ انہیں بھی ایک پیریڈ کی چھٹی دی جائے تاکہ وہ بھی پریکٹس کرسکیں۔ ان لڑکیوں میں اسکول پرنسپل کی کوئی رشتے دار بھی شامل تھی اس لیے انہیں اجازت حاصل کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ ٹیم کا نصف سامان انہیں دے دیا گیا اور پریکٹس کے لیے وہ بھی ہمارے

ساتھ ہی میدان میں آنے لگیں۔ اسکول کا میدان اتنا بڑا نہیں تھا۔ اس پر میں نے اسپورٹس ٹیچر سے احتجاج کیا۔

''مس اس طرح ہم ٹورنامنٹ کی تیاری کس طرح کریں گے۔ اب ہمارے پاس پورا سامان بھی نہیں ہے اور پھر میدان بھی چھوٹا ہے۔''

''تم لوگ مل جل کر کھیل لو۔'' مس نے مشورہ دیا۔

''جی نہیں۔'' میں نے صاف انکار کردیا ''ہماری ٹیم بنی ہوئی ہے اور ویسے بھی یہ صرف ہمیں تنگ کرنے آئی ہیں ان کو کھیلنا کہاں آتا ہے۔''

اسپورٹس ٹیچر نے اپنی مجبوری ظاہر کردی ''دیکھو، شاہینہ پرنسپل صاحبہ کی رشتے کی بھانجی لگتی ہے۔ اسی نے یہ سارا چکر چلایا ہے۔ دراصل وہ ٹورنامنٹ کے لیے اسکول کی ٹیم میں شامل ہونا چاہتی ہے۔''

''اس کی ٹیم میں کوئی جگہ ہی نہیں بنتی۔'' میں نے جلدی سے کہا ''اسے نہ تو بالنگ آتی ہے اور نہ بیٹنگ اور وہ تو ایک گھنٹے میں رونے لگتی ہے کہ اس سے نہیں کھیلا جا رہا ہے۔''

اسپورٹس ٹیچر ہنسیں ''یہ تو ہے مگر اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ تم لوگ انہیں برداشت کرو۔''

شاہینہ اپنی ٹیم کی کپتان تھی۔ حالانکہ اسے خود کچھ آتا جاتا نہیں تھا۔ لیکن چار دن تک وہ پریکٹس کے نام پر تفریح کرتی رہی اور ہمارے کھیل میں رخنہ ڈالتی رہی پھر اس نے مطالبہ کیا کہ ہم اپنا نیا بلا اس کے حوالے کردیں جو ہم نے خود چندہ کرکے خریدا تھا۔ میں نے تلملا کر کہا۔

''وہ کس خوشی میں۔ یہ بلا اسکول کا نہیں ہے بلکہ ہم نے اپنے پیسوں سے خریدا ہے۔ اسکول کا بلا تم لوگ پہلے ہی لے چکی ہو۔''

''ہمیں ایک اور بلے کی ضرورت ہے۔'' اس نے اٹھلائی سے کہا۔

''تو اپنے پیسے جمع کرو اور جا کر بلا لے آؤ۔'' میں نے غصے سے کہا ''یہ بلا ہمارا ہے اس لیے تمہیں نہیں دے سکتے۔ تم جو چاہو کرلو۔''

''میں پرنسپل سے شکایت کروں گی۔'' اس نے دھمکی دی۔

''ضرور کرو۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ مجھے اعتماد تھا کہ پرنسپل اپنی بھانجی کی اس حد تک طرف داری نہیں کریں گی مگر اس وقت میری حیرت کی حد نہیں رہی جب اسپورٹس ٹیچر نے آکر پرنسپل کا حکم سنایا کہ ہم اپنا نیا بلا شاہینہ کے حوالے کردیں۔ میں نے احتجاج کیا ''کیوں مس..... یہ اسکول کا بلا نہیں ہے ہمارا بلا ہے۔ اسکول کا بلا پہلے ہی وہ لوگ لے چکے ہیں۔''

''یہ پرنسپل کا آرڈر ہے اگر تمہیں انکار کرنا ہے تو انہیں کرو۔'' مس نے رکھائی سے کہا۔

میں پرنسپل صاحبہ کے دفتر جا پہنچی وہاں بھی میں نے جب احتجاج کیا تو پرنسپل بولیں ''اگر تم لوگ مل جل کر نہیں کھیل سکتے تو میں پیریڈ کی چھٹی ختم کردوں گی اور ٹورنامنٹ کے لیے اسکول کا نام بھی نہیں جائے گا۔''

پرنسپل صاحبہ کے دباؤ کی وجہ سے ہم نے اپنا بلا بھی شاہینہ کی ٹیم کے حوالے کردیا اور اپنے لیے اپنے ہی پیسوں سے ایک اور بلا لے آئے۔ شاہینہ اور اس کی ساتھی ہمارا سامان ہتھیا کر ہمارا مذاق اڑاتی تھیں۔ انہیں کھیلنے سے زیادہ تفریح کرنے کا شوق تھا۔ بہرحال جیسے تیسے ہم نے تیاری کی۔ اگلا ٹورنامنٹ نزدیک تھا۔ پرنسپل صاحبہ نے اسکول کا نام بھی بھیجا اور جب ٹیم بنائی گئی تو اس میں نصف لڑکیاں شاہینہ کی ٹیم کی تھیں میری ٹیم کی کئی باصلاحیت اور محنتی لڑکیاں جو اتنے عرصے سے پریکٹس میں جان مارتی رہی تھیں اسکول کی ٹیم میں شامل نہیں کی گئیں۔ میں نے ایک بار پھر احتجاج کیا لیکن پرنسپل اور اسپورٹس ٹیچر دونوں نے میری بات سننے سے انکار کردیا۔ بلکہ پرنسپل صاحبہ نے یہاں تک کہا۔

''تمہیں نہیں کھیلنا تو آرام سے بیٹھو۔ ٹیم سلیکشن تمہارا کام نہیں ہے۔''

''اس صورت میں میں کیپٹن نہیں بن سکتی۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''اس طرح تو ہم ہار جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے پھر میں شاہینہ کو کپتان بنا دیتی ہوں۔''

یوں شاہینہ نیاز اسکول ٹیم کی کپتان بن گئی جسے صحیح طور سے بلا پکڑنا بھی نہیں آتا تھا۔ ہم نے پہلا نہ کھیلوں میں نامور ٹیم کو جو شکست دی تھی اس سے ساری ٹیمیں ہم سے خوف زدہ تھیں مگر پہلے ہی میچ میں ایک کمزور سی ٹیم نے ہمیں اس بری طرح ہرایا کہ سب پہلے سے بھی زیادہ حیران رہ گئے۔ میری کارکردگی بھی اچھی نہیں تھی۔ پہلے ہی میچ میں ہماری ٹیم ٹورنامنٹ سے باہر ہوگئی۔ مزے کی بات ہے شاہینہ نے اس شکست کا سارا الزام مجھ پر لگا دیا۔ اس نے پرنسپل صاحبہ کے سامنے کہا ''رمیہ نے جان بوجھ کر خراب بالنگ کرائی اسی وجہ سے ہم ہار گئے۔''

''میں نے ہی نہیں سب نے خراب بالنگ کرائی اور خود کپتان صاحبہ صفر پر آؤٹ ہوئیں۔ شکست کی ساری ذمے داری انہی کی ہے۔ ہم انہی کی وجہ سے ہارے ہیں۔'' میں نے

دفاع کرنے کے بجائے الٹا اس پر چڑھائی کردی۔

پرنسپل صاحبہ نے اس کی طرف داری کی کوشش کی تو میں نے کہہ دیا ''سوری میڈم! میں اب اسکول کی طرف سے کرکٹ نہیں کھیلوں گی۔''

یوں میں نے اسکول کی ٹیم بھی چھوڑ دی اور اپنی ساری توجہ تعلیم کو دینے لگی۔ میں اتنی دل برداشتہ تھی کہ میں نے آئندہ کرکٹ نہ کھیلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ امی اس فیصلے سے بہت خوش تھیں اور میں اتنی ہی دکھی تھی۔ کرکٹ میری زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گئی تھی۔ اس لیے دل برداشتہ ہونے کے باوجود کرکٹ سے دوری میرے لیے ممکن نہیں تھی۔ ابو بھی مجھے تسلی دیا کرتے تھے کہ میں اپنی تعلیم کی طرف توجہ دوں ''بیٹا میٹرک کرلو۔ اس کے بعد کالج جاؤ گی تو وہاں پر کرکٹ کی اچھی ٹیمیں ہوتی ہیں۔''

ابو نے واقعی کام کی بات بتائی تھی۔ اسکول کی ٹیم میں چھوڑ چکی تھی، پھر کچھ عرصے بعد وہ ٹیم ہی ختم ہوگئی۔ روز روز تپتی دھوپ میں پریکٹس کرنا شاہینہ جیسی لڑکیوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ بس ہاف ٹائم میں میں اور کچھ اور لڑکیاں تفریحاً کرکٹ کھیل لیا کرتے تھے۔ میں تیرہ سال کی عمر میں خاصی بڑی لگنے لگی تھی۔ قد وقامت اچھا تھا اور جسم بھی بھر گیا تھا۔ اب میں اگر باہر کھیلنے کی بات بھی کرتی تو امی سے مار کھاتی۔ ویسے ہی وہ میری جسامت دیکھ کر ہولا کرتی تھیں۔

''کم بخت بس کر ابھی سے بیس سال کی لگنے لگی ہے۔''

وقت گزرنے کے ساتھ میں نے اچھے نمبروں سے میٹرک کرلیا۔ ساتھ ہی کرکٹ کی قابلیت بھی تھی' اس دوران میں میں معلومات حاصل کرتی رہی تھی۔ ہمارے علاقے کے ایک کالج کی ٹیم بڑی مشہور تھی۔ میں نے وہاں داخلے کے لیے فارم جمع کرایا اور مجھے وہاں داخلہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ داخلہ ملتے ہی میں نے کالج کی ٹیم میں شامل ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کردیئے۔ تب مجھے پتا چلا کہ اسکول میں اقربا پروری تھی' کالج کی سطح کی کرکٹ میں سیاست چلتی تھی۔ میں نے کالج کی اسپورٹس انچارج سے ملاقات کی۔

''میں کرکٹ کھیلنا چاہتی ہوں۔''

''بی بی کرکٹ آسان کھیل نہیں ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولیں ''جب میدان میں گھنٹوں کھیلنا پڑتا ہے تو پتا چل جاتا ہے۔''

''میں کرکٹ کھیلتی رہی ہوں۔ آپ میرا سرٹیفکیٹ دیکھ سکتی ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''بی بی۔ اس قسم کے سرٹیفکیٹ تو ہر لڑکی بنوالاتی ہے۔ اصل صلاحیت کا تو نیٹ پر پتا چلتا ہے۔ ایک ہفتے بعد نیٹ پر ٹیسٹ لیا جائے گا' وہاں آجانا۔''

اس ایک ہفتے میں میں نے خوب تیاری کی۔ ورزشیں کیں۔ میرا جسم آرام طلبی سے ذرا بھاری ہوگیا تھا گھر میں صفیہ اور فرہاد بھائی کی مدد سے بالنگ پریکٹس کی اور کئی پودے برباد کرنے پر امی سے بے شمار باتیں سنیں۔ پودوں کی تباہی سے زیادہ غصہ انہیں اس بات کا تھا کہ میں پھر کرکٹ میں گھسی جارہی تھی۔

''پہلے اس موئی نے کون سی خوشی دی ہے تجھے جو تو پھر اس کے لیے مارا ماری کررہی ہے۔''

''امی پلیز۔ اگر میں کالج ٹیم میں آگئی تو میرا نام اور تصویر اخبار میں بھی آئے گی۔''

''نا بی بی۔ ہمیں ایسی شہرت نہیں چاہیے۔ تم شرافت سے گھر بیٹھو اور لڑکیوں والے کام سیکھو۔''

''امی مجھے سب آتا ہے۔'' میں نے احتجاج کیا تھا۔

''ابھی دال بنانے کو کہہ دو تو دس بار مجھ سے پوچھنے آؤ گی۔'' امی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو میں کھسیا گئی۔

یہ درست تھا میں امور خانہ داری میں اتنی طاق نہیں تھی لیکن بالکل کوری بھی نہیں تھی تقریباً سارے ہی کام آتے تھے۔ گھر کے کاموں سے ہٹ کر اگر میری کوئی دلچسپی تھی تو وہ کرکٹ تھی۔ نہ مجھے عام لڑکیوں کی طرح کپڑوں اور میک اپ اور جیولری وغیرہ کا شوق تھا اور نہ ہی دیگر تفریحات کا۔ ایک ہفتے تک گھر میں مشق کرنے کے بعد میں کالج جا پہنچی۔ وہاں نیٹ پر اپنی باری کے لیے تقریباً سو لڑکیاں منتظر تھیں اور یہ تقریباً سب کی سب فرسٹ ائیر کی طالبات تھیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ٹیم میں دو فاسٹ بالرز اور ایک بے بارز ضرورت تھی۔ کچھ دیر کے لیے میں پریشان ہوگئی لڑکیوں کے اس اژدھام میں کیا میں منتخب ہوسکوں گی؟ ان میں سے نہ جانے کتنی ہی سفارشیں لے کر آئی ہوں گی۔ میری تو کوئی سفارش بھی نہیں تھی پھر مجھے اپنی صلاحیتوں کا احساس ہوا۔ وہاں ہر لڑکی ٹیسٹ دے رہی تھیں ان میں سے کوئی میرے معیار کی نہیں تھی اور فاسٹ بالرز تو چند ایک ہی تھیں جو بس نام کی فل فاسٹ بالنگ کرا رہی تھیں۔ ان کے نہ تو ایکشن درست تھے اور نہ ہی لائن اور لینتھ۔ اکثر کی بالیں یا تو بیٹنگ کرنے والی لڑکی کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھیں یا خاصی دور سے۔

اسپورٹس انچارج سب لڑکیوں کو ایک ایک اوور بالنگ بیٹنگ کے لیے دے رہی تھیں۔ ان کا انداز اتنا بے پروا تھا کہ

میں تھوڑی سی پریشان ہوگئی تھی۔ وہ تو غور سے لڑکیوں کا کھیل دیکھ ہی نہیں رہی تھیں۔ اس کے بجائے کالج کی کرکٹ ٹیم کی کپتان فرحانہ شیخ سے باتیں کررہی تھیں۔ فرحانہ شیخ ذرا فربہ اندام اور سست نظر آنے والی لڑکی تھی۔ ایک بار اس نے پیڈز باندھ کر بیٹنگ بھی کی اور مجھے اس کے کھیل میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے اسے کالج کی ٹیم کا کپتان بنایا جاتا۔

میری باری آئی تو تقریباً ساری ہی فاسٹ بالنگ کی امیدوار بھگتائی جاچکی تھیں۔ میں بالنگ کرانے آئی تو اتفاق سے فرحانہ شیخ ایک بار پھر پیڈز باندھے اور بلا پکڑے کھڑی تھی۔ اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا ''بال کرانی آتی ہے نا..... تمہیں؟''

''مجھے تو کرانی آتی ہے پتا نہیں تمہیں کھیلنی آتی ہے یا نہیں۔'' میں نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔ وہ تلملا گئی۔

''بہت بولنا آتا ہے تمہیں۔''

''مجھے بال کرانا بھی آتا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور جا کر رن اپ گننے لگی۔ نشان لگا کر میں نے دوڑنا شروع کیا اور کریز کے پاس آکر پوری قوت سے ہاتھ گھمایا۔ فرحانہ شیخ کو توقع نہیں تھی کہ میں اتنی تیز بال کرا سکتی ہوں۔

گیند میں نے دکھوں کا نشانہ لیا تھا لیکن بال وکٹ پر گری اور سیدھی فرحانہ شیخ کے کسی قدر ابھرے ہوئے پیڈ پر جا لگی۔ اس نے چیخ ماری اور بلا پھینک کر پیٹ پکڑ لیا۔

وہ کراہ رہی تھی۔ اسپورٹس انچارج مسز دردانہ میرے پاس آئیں اور برہمی سے بولیں ''یہ کیسی بال کرائی ہے تم نے..... اسے اتنی زور سے لگ گئی۔''

''میڈم کھیل میں تو بال لگ ہی جاتی ہے۔''

فرحانہ شیخ اب غضب ناک لگ رہی تھی۔ اس نے میرے پاس آکر تلخ سے لہجے میں کہا ''تم نے جان بوجھ کر بال ماری ہے مجھے۔''

میں نے حیران ہوکر اسے دیکھا ''میں نے کوئی باؤنسر تو نہیں کرایا تھا سیدھی سی بال تھی۔ تم اسے بھی نہ کھیل سکیں تو میرا کیا قصور ہے۔''

''بہر حال تمہیں اتنی تیز گیند نہیں کرانی چاہیے تھی۔'' مسز دردانہ کریم روکھے لہجے میں بولیں۔

''میڈم مجھے فاسٹ بالنگ کے ٹرائل کے لیے بلایا گیا تھا۔'' میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا ''اب کپتان صاحب اگر صرف اسپنرز کو کھیل سکتی ہیں تو انہیں میرے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

میری بات پر فرحانہ شیخ تپ گئی تھی ''ایک بال اگر اتفاق سے لگ گئی تو تم اترا رہی ہو۔''

اس بار میں نے نرمی سے جواب دیا ''یہی تو میں میڈم کو بتا رہی ہوں۔ اگر ایک بال اتفاق سے لگ گئی تو اس میں میرا قصور تو نہیں۔ تم خود بتاؤ کیا میں نے باؤنسر یا شارٹ پچ کرائی تھی۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں دوبارہ اپنے بالنگ اسٹارٹ کی طرف چلی گئی۔ میں نے فرحانہ کو ایک اوور کرایا لیکن اس نے بس کرنے کے بجائے مجھ سے مزید بالنگ کرانے کا مطالبہ کیا۔ میں نے مزید دو تین اوورز کرائے۔ اسی دوران میں فرحانہ نے میری چند ایک بالز ہی درست طریقے سے کھیلی تھیں۔ کئی بار آؤٹ ہوئی اور مزید ایک بار بال اس کی ران پر لگی۔ فرحانہ نے حوصلے سے کام لے کر مجھے کھلا پھروہ لنگڑاتی ہوئی میڈم دردانہ کی طرف گئی۔ میں ذرا دور تھی اس لیے ان کی باتیں نہیں سن سکی لیکن اندازہ تھا کہ موضوع بحث میں ہی ہوں۔ غالباً فرحانہ مجھے منتخب کرنا چاہتی تھی لیکن میڈم دردانہ کے تاثرات منفی تھے۔ نتیجے کا اعلان اگلے روز ہونا تھا اس لیے سب لڑکیوں کو رخصت کردیا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرا نام نہیں آئے گا۔ میڈم دردانہ مجھے ناپسند کرچکی تھیں کیونکہ میں نے ان کی غلط بات کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا اور میرا اندازہ درست نکلا۔ جب اگلے روز نتیجے کا اعلان ہوا تو فاسٹ بالر کے لیے دو ایسی لڑکیوں کا انتخاب ہوچکا تھا جن کی لائن اور لینتھ تک درست نہیں تھی۔ وہ بالنگ کرانے کے نام پر مضحکہ خیز اچھل کود کرتی تھیں اور بالنگ کی رفتار شاید کسی اسپنر جتنی تھی۔ میں غصے سے بھری ہوئی میڈم دردانہ کے پاس جا پہنچی۔

''میڈم میں ان سے کہیں بہتر بالر ہوں مگر آپ نے انہیں میرے مقابلے میں سلیکٹ کرلیا۔''

میڈم دردانہ نے اپنی چھوٹی اور سرد سی نگاہوں سے مجھے دیکھا ''کیونکہ مجھے زیادہ بہتر پتا ہے کسے سلیکٹ کرنا ہے اور کسے نہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتی کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فرحانہ شیخ تھی اس سے پہلے کہ میں اسے بھی کچھ سناتی اس نے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں میڈم دردانہ کے پاس سے ہٹ آئی۔ فرحانہ مجھے کینٹین میں لے آئی ''رمیہ یار برا نہ ماننا۔ تم نے اپنی زبان سے اپنا پتا صاف کرایا ہے۔ میڈم دردانہ کو زیادہ بولنے والی لڑکیاں سخت ناپسند ہیں۔''

''جہنم میں گئیں میڈم دردانہ۔ یہ ان کے باپ کا کالج نہیں ہے۔'' میں نے غصے سے کہا ''میں پرنسپل صاحبہ کے پاس جاؤں گی ان سے شکایت کروں گی۔''

''ایسی حماقت مت کرنا۔'' فرحانہ نے جلدی سے کہا تھا۔ ''دردانہ کریم پرنسپل کی پسندیدہ ترین اسٹاف ممبر ہیں۔ وہ ان کی ہر بات آنکھ بند کر کے مانتی ہیں۔ میرا مشورہ ہے چند مہینے انتظار کرلو۔''

''اور اس کے بعد؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے دوران میں میڈم کو قائل کرنے کی کوشش کرتی ..... ہوں گی۔ ہمیں ایک اچھی ہالر کی سخت ضرورت ہے۔ اسپنرز تو کئی ہیں لیکن فاسٹ ہالر ایک بھی ڈھنگ کی نہیں ہے۔''

''اور یہ جو ابھی سلیکٹ ہوئی ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

فرحانہ ہنسی ''یہ اصل میں سفارشی ہیں۔ تم دیکھنا میں انہیں کس طرح رگڑتی ہوں۔ دو مہینے میں بھاگ جائیں گی۔''

''تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

فرحانہ نے کوک منگوائی تھی۔ وہ ہنس کر بولی ''بات یہ ہے کہ تمہارے کھیل نے مجھے متاثر کیا ہے۔ میں گزشتہ دس سال سے کلب کرکٹ کھیل رہی ہوں لیکن کسی ہالر کو میں نے اتنا تیز نہیں دیکھا۔ تم تو لڑکوں کی سی تیزی سے بال کراتی ہو۔ میں نے مس دردانہ سے تمہیں ٹیم میں شامل کرانے کے لیے بہت کوشش کی لیکن مسئلہ فی الحال سفارشیوں کا ہے۔ ان سے جانے چھڑالوں پھر تمہیں ٹیم میں لے آؤں گی۔''

''تب تک میں کیا کروں؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''کرکٹ تو پریکٹس مانگتی ہے۔ جب میں پریکٹس ہی نہیں کروں گی اور آؤٹ آف فارم ہو جاؤں گی تب مجھے ٹیم میں لانے کا فائدہ؟''

''پریکٹس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم ہمارے ساتھ آکر نیٹ پریکٹس کیا کرو۔ ہفتے میں دو بار ہم پریکٹس کرتے ہیں۔ اس میں تم بھی شامل ہو سکتی ہو۔ دو بار ایکسٹرا سائز ہوتی ہے۔ اچھا ہے تم لڑکیوں کو کھلاؤ گی تو ان کی بیٹنگ بہتر ہو گی۔''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔

''لیکن تم نہ تو کالج کی طرف سے کوئی میچ کھیلو گی اور نہ ہی کسی ٹورنامنٹ میں شامل کی جاؤ گی۔''

''میں جانتی ہوں۔ فی الحال اتنا ہی بہت ہے کہ مجھے پریکٹس مل رہی ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری ''میڈم دردانہ تو کوئی اعتراض نہیں کریں گی۔''

''نہیں ان کی فکر نہ کرو۔ انہیں میں سنبھال لوں گی۔'' فرحانہ نے مجھے تسلی دی تھی۔

یوں میں نے ٹیم نہ سہی لیکن ٹیم کا پریکٹس سیشن جوائن کرلیا تھا۔ ہفتے میں دو دن پریکٹس ہوتی تھی۔ پریکٹس کالج ٹائم کے بعد دو بجے سے شام چار بجے تک ہوتی تھی اور ایکسٹرا سائز کسی فارغ پیریڈ میں کی جاتی تھی۔ چند ہی ہفتوں میں میری بے شمار دوست اور ساتھی بن گئی تھیں۔ خاص طور سے ٹیم کی اکثر لڑکیاں کھیل کی وجہ سے میری گرویدا تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ بعض لڑکیاں خاصی باصلاحیت تھیں لیکن انہیں کوئی سکھانے والا نہیں تھا۔ میں جب پریکٹس میں حصہ لیتی تو حتی الامکان انہیں سکھایا کرتی۔ فرحانہ اس بات سے بھی خوش تھی۔ وہ ٹیم کی وکٹ کیپر تھی مگر اپنی کسی قدر بھاری جسامت کے باوجود خاصی پھرتیلی تھی۔ البتہ میڈم دردانہ مجھے دیکھ کر ہمیشہ ناک بھوں چڑھایا کرتی تھیں۔ ان کے تاثرات سے لگتا تھا جیسے انہوں نے میرا نام اپنی بیڈ بک میں لکھ لیا تھا۔

دو سفارشی فاسٹ بالرز جو ٹیم میں آئی تھیں وہ دو سے تین مہینے میں ہی ٹیم چھوڑ گئیں۔ حالانکہ ابھی کوئی میچ بھی نہیں ہوا تھا مگر پریکٹس میں ان کی ساری قلعی کھل گئی تھی۔ فرحانہ جان بوجھ کر ان سے زیادہ بالنگ کراتی اور ان بے چاریوں کی ایک دو اوورز کے بعد ہی حالت بری ہو جاتی تھی۔ ان سے رن اپ بھی نہیں لیا جاتا تھا اور جب وہ وکٹ پر آکر بال کراتیں تو وہ اناڑی شکاری کی گولی کی طرح نشانے سے خاصی دور سے گزر جاتی۔ وہ عذر کرتیں کہ تھک گئی ہیں مگر فرحانہ ان سے پانچ چھ اوورز کرا کے ہی چھوڑتی تھی پھر ایکسٹرا سائز میں بھی خاص طور سے ان پر توجہ دیتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ انہوں نے پریکٹس میں آنا چھوڑا اور پھر ٹیم ہی چھوڑ دی لیکن میری جگہ پھر نہیں بنی کیونکہ جب تک میڈم دردانہ نہیں چاہتیں میں ٹیم میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس چکر میں چار مہینے گزر گئے پھر انٹر کالجیٹ ٹورنامنٹ شروع ہوا اور میں محض ٹیم کے ساتھ پریکٹس کرتی رہی۔

فرحانہ مجھے تسلی دیتی ''فکر نہ کرو۔ تم ٹیم میں ضرور آؤ گی۔''

''کب ..... جب میرا گریجویشن مکمل ہو جائے گا؟'' میں نے مایوسی سے کہا ''آخر میڈم دردانہ میری اتنی دشمن کیوں ہو رہی ہیں؟''

فرحانہ نے بے بسی سے جواب دیا ''خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم

اس وقت ٹیم میں موجود تمام بالروں سے بہتر ہو۔ اچھی خاصی بیٹنگ بھی کر لیتی ہو پھر بھی وہ تمہیں ٹیم میں نہیں لینا چاہتیں۔ کاش کہ تم ٹورنامنٹ کھیلتیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ٹورنامنٹ جیت جاتے۔''

میں اگرچہ ٹورنامنٹ نہیں کھیلی لیکن میری کوچنگ سے ٹیم کو فائدہ ہوا تھا اس نے کئی اہم میچ جیتے اور سیمی فائنل تک رسائی حاصل کرلی۔ اس میچ میں ہماری ٹیم یونیورسٹی سے ہاری تھی۔ میڈم اور فرحانہ اس کارکردگی سے بے حد خوش تھیں اور اس سے مجھے امید بندھی کہ شاید اب ٹیم میں میری گنجائش نکل آئے مگر نہ تو میڈم نے اور نہ ہی فرحانہ نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات کی تھی۔ پھر پیپرز نزدیک آگئے۔ ہم پریکٹس اور ایکسٹرا سائز بھول کر امتحان کی تیاریوں میں لگ گئے تھے کیونکہ بہرحال کالج آنے کا اصل مقصد تعلیم حاصل کرنا تھا۔

امتحانات کے بعد جلد ہی گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں اور کالج میں کرکٹ پریکٹس شروع نہیں ہو سکی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے میں کوئی کلب جوائن کرلوں لیکن امی کے خوف سے یہ بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈرتی تھی۔ انہی دنوں اتوار کے اخبار میں کراچی کرکٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے خواتین کرکٹ ٹیم کے لیے انٹرایشن کے ٹرائلز کا اشتہار آیا۔ میں نے ابو کو اشتہار دکھایا ''ابو جی ..... یہ دیکھیں ..... کیا میں بھی ٹرائل دینے چلی جاؤں؟''

ابو جی سوچ میں پڑ گئے۔ وہ شاید اپنی صوابدید پر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بالآخر انہوں نے ہچکچا کر کہا ''بیٹا تم اپنی امی سے اجازت مانگو۔''

''ابو جی پہلے بھی تو آپ نے ہی اجازت دی تھی۔'' میں نے ٹھنک کر کہا۔

ابو جی نے گہری سانس لی ''ہاں بیٹا لیکن اس وقت بات اور تھی اس وقت آپ صرف سات آٹھ سال کی تھیں اب آپ ماشاء اللہ سترہ سال کی ہو چکی ہیں اور اس عمر میں لڑکیوں کے فیصلے ان کی مائیں بہتر طور پر کر سکتی ہیں۔''

''یعنی مجھے اجازت نہیں ملے گی۔'' میں نے منہ لٹکا کر کہا۔

''بیٹا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بات آپ کی امی کی اجازت کی ہے آپ کوشش تو کریں۔''

''آپ امی کے سامنے میری حمایت تو کریں گے۔'' میں نے التجا کی۔

''بات یہ ہے بیٹا کہ معاہدے کی رو سے اب آپ اپنی امی کے سپرد ہیں۔ اس لیے آپ کے سارے فیصلے وہی کریں گی۔''

''یعنی میری کوئی رائے نہیں ہے۔'' میں نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

''بیٹا آپ نے اپنی امی کو اتنا ہوّا کیوں بنا رکھا ہے؟'' ابو جی نے مجھے سمجھایا ''آپ ان سے بات کر کے تو دیکھیں ان سے دلیل سے بات کریں۔ وہ ضرور سنیں گی۔''

ڈرتے ڈرتے میں امی کے پاس گئی اور ان سے ٹرائل دینے کی اجازت چاہی تھی کہ حسب توقع وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ ''تمہارا دماغ درست ہے۔ محلے اسکول اور کالج کی حد تک درست تھا لیکن اب کیا تم میدانوں میں جا کر کھیلو گی۔ جہاں جو چاہے منہ اٹھائے چلا آتا ہے؟''

''امی پلیز ..... اس طرح تو مجھے ملک کی سطح پر کھیلنے کا موقع ملے گا۔ کتنے فخر کی بات ہے۔ پورے ملک میں چند ہی لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔''

''معاف کرنا بی بی ہمیں ایسے فخر کی ضرورت نہیں ہے۔'' امی نے صاف انکار کیا تو میں آنسو بہاتی ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

اس رات میں نے کھانا نہیں کھایا ابو جی کو پتا چلا تو انہوں نے دبے لفظوں میں امی کے سامنے میری حمایت کی۔ وہ چڑ گئیں۔

''آپ نے ہی شہ دے کر اسے سر چڑھایا ہے۔''

''بیگم یہ تو فخر کی بات ہے۔ رمیہ اگر میدان میں جا کر کرکٹ کھیلے گی تو اس میں کون سی بری بات ہے۔ اس ملک میں کتنی لڑکیاں کرکٹ اور دوسرے کھیل کھیل رہی ہیں۔ کبھی کسی کے منہ سے ان کی برائی نہیں سنی۔''

''دوسروں کا مجھے نہیں پتا۔ مجھے تو اپنا گھر دیکھنا ہے۔'' امی نے رکھائی سے جواب دیا ''اس سے کہیں کہ اب گھرداری سیکھے۔ کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہے۔''

ابو بھی مایوسی سے واپس آئے تو میری ساری رہی سہی امیدیں ٹوٹ گئیں۔ اس رات میں بے تحاشا روئی اور اللہ میاں سے شکوہ کرتی رہی کہ مجھے لڑکی ... کیوں بنایا کاش میں لڑکا ہوتی تو اتنی مشکلات تو نہ ہوتیں۔ پہلے گھر والے آڑے آئے تھے اور جب گھر سے کھیلنے کی اجازت ملتی تھی تو باہر سفارش راستہ روک لیتے۔ اس ملک میں لڑکیوں کے لیے اسپورٹس کے مواقع پہلے ہی نہ ہونے کے برابر ہیں اور وہ بھی مستحق اور باصلاحیت لڑکیوں کو نہیں ملتے۔ بس دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ آخر میں نے اس کھیل سے محبت ہی کیوں کی

جس میں ہمارے ملک میں کسی لڑکی نے نام نہیں کمایا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کلب کی سطح تک کھیل سکتی ہیں۔ انٹرنیشنل کرکٹ تو ایک طرف رہی۔ ہمارے ہاں خواتین کی ڈومیسٹک کرکٹ بھی شاذ ہی کھیلی جاتی ہے۔ جبکہ انگلینڈ' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ' ساؤتھ افریقا اور حتیٰ کہ انڈیا کی بھی خواتین کرکٹ ٹیمیں ہیں جو بین الاقوامی میچز بھی کھیلتی ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب کرکٹ کھیلنے کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی۔

اگلے روز سے میں نے دل لگا کر گھر کے کام شروع کردیئے۔ نہ صرف اپنے کام کیے بلکہ گھر کے اضافی کام جو امی پہلے خود کرلیتی تھیں وہ بھی اپنے ذمے لے لیے اس سے پہلے میں اپنے ذمے کے کام بھی مارے باندھے کیا کرتی تھی۔ شاید میرا ردعمل امی کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ کچھ نرم ہوگئیں بلکہ مجھے سینے سے لگا کر پیار بھی کیا تھا پھر دو تین دن بعد ایک روز جب میں شام کا کھانا بنانے کچن میں گئی تو امی نے کہا۔ ''اگر تو یہ ٹرائل دے لیتی تو پھر کیا ہوتا؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے بے دلی سے جواب دیا ''میں نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

امی کہنے سے پہلے ہچکچاتی رہیں ''کیا تو اب بھی ٹرائل دے سکتی ہے؟''

''امی میں نے کرکٹ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے پھر اس قسم کے سوال کیوں کررہی ہیں؟''

امی کی آنکھیں بھر آئیں ''زندگی میں پہلی بار تو نے کچھ اس طرح سے مانگا تھا اور میں نے انکار کردیا۔ میرا کتنا دل دکھا ہے میں بتا نہیں سکتی۔'' امی بولیں پھر کچھ دیر توقف کے بعد کہا ''رمیہ تو چاہے تو کرکٹ کھیل سکتی ہے میری طرف سے اجازت ہے۔''

''سچ امی!'' میں خوشی سے چیخ اٹھی تھی۔

امی نے مسکرا کر سر ہلایا اور میری پیشانی چوم لی ''مجھے اپنی بچی کی خوشی ہر شے سے عزیز ہے۔''

میں خوشی سے ناچ اٹھی تھی۔ ابو جی اور بہن بھائیوں کو پکڑ پکڑ کر بتایا کہ امی نے مجھے اجازت دے دی ہے۔ میں نے کرکٹ ترک کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ خود کو بہلانے کے مترادف تھا۔ میں کرکٹ نہیں چھوڑ سکتی تھی یہ کھیل تو میری روح میں شامل ہوگیا تھا۔

اگلے ہی روز میں نیشنل اسٹیڈیم گئی۔ وہاں پر ٹرائل دینے کے لیے اتنی لڑکیاں آئی تھیں کہ اسٹیڈیم مینا بازار لگ رہا تھا۔ وہاں اتنی بڑی تعداد میں فیشن ایبل لڑکیوں کو دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہاں پر کئی ایک نیٹ لگے تھے جن پر سابق کرکٹرز لڑکیوں سے بالنگ اور بیٹنگ کے ٹرائل لے رہے تھے۔ میں نے بھی جا کر فاسٹ بالر کے لیے اپنا نام لکھوا دیا۔ اس جگہ ایک سابق فاسٹ بالر ٹرائل لے رہا تھا۔ جب میری باری آئی اور میں نے بالنگ کرائی تو وہ صاحب بہت خوش ہوئے۔

''تم تو بہت اچھی بالر ہو۔''

انہوں نے مجھے ان گرد پ کی طرف بھیج دیا جہاں دن بھر کے ٹرائل کے بعد منتخب ہونے والی چند ایک لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ حتمی انتخاب ان لڑکیوں میں سے ہونا تھا اور سابق فاسٹ بالر کا ردعمل بتا رہا تھا کہ میرے انتخاب کا امکان روشن تھا۔ ٹیم کے لیے کل چار لڑکیوں کا انتخاب ہونا تھا۔ جبکہ وہاں چھ لڑکیاں تھیں۔ ان میں سے دو نے مسکرا کر بتایا کہ ان کی سفارش ہے تیسری نے ہنس کر بتایا کہ اسے سفارش کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کیمپ انچارج اس کے خالو ہیں۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ گویا اب مقابلہ تین لڑکیوں کے درمیان تھا۔ ٹرائل کا آخری دن بھی تھا۔ شام کو ٹیم کے لیے کھلاڑیوں کا اعلان ہوجانا تھا۔

شام کے وقت سابق فاسٹ بالر ہماری طرف آئے اور انہوں نے میرے ساتھ بیٹھی دو لڑکیوں سے کہا ''آپ دونوں کا سلیکشن نہیں ہوسکا۔ معذرت کے ساتھ..... آپ جاسکتی ہیں۔ آئندہ پھر آیئے گا۔''

لڑکیاں منہ بناتی ہوئی اٹھ گئیں اور میں خوشی سے بے تاب ہوگئی ''سر کیا میں سلیکٹ ہوئی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ مسکرائے ''کل اخبارات میں ٹیم کا اعلان ہوگا تو اس میں آپ کا نام بھی شامل ہوگا۔''

اسٹیڈیم سے گھر تک میں گویا ہوا میں اڑتی آئی تھی اور اگلی صبح تک ہواؤں میں رہی تھی مگر پھر صبح کے اخبار نے دھڑام سے مجھے زمین پر لا گرایا تھا۔ ٹیم کا جو اعلان ہوا تھا اس میں میرا نام شامل نہیں تھا۔ کیوں نہیں تھا اس کی وجہ میں نہیں جان سکی۔ رابطہ کرنے پر فاسٹ بالر صاحب نے صرف اتنا کہا تھا کہ بعض وجوہات کی بنا پر میرا نام ٹیم سے ڈراپ کردیا گیا تھا۔ یہ ناگزیر وجہ یہی ہوسکتی تھی کہ مزید کسی لڑکی کی سفارش آگئی ہوگی۔ اس روز کے بعد میں نے کبھی کرکٹ کھیلنے کا نہیں سوچا۔

آج جب میرے بڑے بیٹے نے ٹرائل میں جانے کی اجازت مانگی تو مجھے یہ کہانی یاد آگئی۔ اسے قارئین کی نذر کررہی ہوں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس ملک میں کبھی نہ کبھی ''میرٹ'' ضرور آئے گا۔

میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ مگر جب میں نے اپنے شوہر کی شکل دیکھی تو نفرت کی ایک شدید لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرا شوہر عاصم اتنا بدصورت ہوگا۔ میں تو اپنے خوابوں میں ایک وجیہہ اور حسین سے نوجوان کا تصور باندھے بیٹھی تھی۔ دوسری طرف میرا شوہر عاصم میری خوبصورتی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑے عجیب سے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر مجھے شدید غصہ آگیا اور میرا دل چاہا کہ اسے مسہری سے نیچے دھکا دے دوں اور دروازہ کھول کر باہر نکل جاؤں۔

''آسیہ!'' عاصم نے نرم لہجے میں مجھے پکارا۔

''جی!'' نا چاہتے ہوئے بھی میں نے جواب دیا۔

''میں اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت نہیں سمجھتا تھا کہ تم جیسی حسین و جمیل بیوی میرے نصیب میں ہوگی۔'' عاصم والہانہ انداز میں کہہ رہا تھا ''میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں تمہاری طرح خوب رو نہیں ہوں مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنی قسمت پر ناز کرو گی۔''

عاصم کے ان مہربان جملوں نے میری نفرت کا گلا گھونٹ دیا' میں نے اسے اپنی قسمت کا لکھا جانا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کردیا۔

چند ہفتے بعد جب مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ وہ تو

زندہ شکار

تحریر : فلک ناز حسین

مکرمی ایڈیٹر صاحب، تسلیمات!

اپنی سرگزشت ارسال کررہی ہوں۔ بعض اوقات ضرورتیں لیکن اکثر اوقات خواہشات بعض لوگوں کو کچھ ایسے کام کرنے پر مجبور کردیتی ہیں جو انہیں شدید تکلیف اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ شاید میری بھی یہی غلطی تھی کہ میں نے قناعت سے زیادہ خواہشات اور دوسروں سے مسابقت کو ترجیح دی۔ وہ تو شکر ہے کہ معاملہ آخری حدوں تک نہ پہنچا۔ میری اپنی تمام بہنوں سے یہی درخواست ہے کہ وہ جذبات اور وقتی خواہشات کے بجائے خدا کی ذات پر بھروسا کریں۔ خدا سب کو ہر پریشانی سے بچائے۔

خیر اندیش

آسیہ عاصم، کراچی

بالکل ہی پھکو آدمی ہے تو میرے اندر چھپی نفرت دوبارہ عود آئی' میرا لہجہ اس کے ساتھ تلخ سا ہو گیا اور میں بات بات پر ناراض ہونے لگی۔

صبح سے ہی میری ساس کی طبیعت خراب تھی وہ اپنے کمرے میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کے بری طرح کراہنے پر میں دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس آواز کو خاموش کر دوں یا پھر گھر سے باہر نکل جاؤں' شوہر سے نفرت کے باعث میں ساس اور نند کی پروا کرتی تھی اور نہ ہی انہیں کسی خاطر میں لاتی تھی۔ شام کو عاصم دفتر سے واپس گھر لوٹا تو میں دروازے میں اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے' خیریت تو ہے؟'' عاصم نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئی۔

''امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے گھبرا کر سوال کیا۔

''ہاں!'' میں تنک کر بولی ''تمہیں صرف اپنی ماں کا خیال ہے' تم نے شادی والی رات کو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مجھے اتنی خوشیاں دو گے کہ میں اپنی قسمت پر ناز کروں گی۔''

''جو کچھ میں نے کہا تھا وہ مجھے یاد ہے۔'' عاصم سکون سے بولا ''میں کوشش کر رہا ہوں کہ مجھے کوئی پارٹ ٹائم نوکری مل جائے تو میں تمہاری ساری شکایات دور کر دوں گا' میں تمہیں گھمانے کے لیے باہر بھی لے جایا کروں گا اور کبھی کبھار ہم.....''

''کیا خاک گھمانے لے جاؤ گے۔'' میں تلخی سے بولی۔ ''جب پارٹ ٹائم ملازمت کرو گے تو تمہارے پاس اتنا وقت کہاں ہوگا کہ مجھے کہیں لے جاؤ۔''

''مم..... میں وقت نکال لوں گا۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''ہونہہ!'' میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا ''تم مجھے میری ماں کے پاس چھوڑ آؤ' میں کچھ روز اپنے گھر گزارنا چاہتی ہوں۔''

''آسیہ' امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' بہن میری چھوٹی ہے۔'' اس نے مجھے سمجھانا چاہا ''امی کی طبیعت ٹھیک ہوتے ہی.....''

''میں اپنی بات ایک دفعہ کہتی ہوں۔'' اس کی بات میں نے درمیان سے کاٹی اور سخت لہجے میں بولی ''اگر تم مجھے چھوڑ کر نہیں آؤ گے تو میں خود چلی جاؤں گی' مجھے اپنے گھر کا راستہ معلوم ہے۔''

میری بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' اس کی بے بسی سے میں محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو میں آفس سے تھکا ہارا آیا ہوں۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولا ''اس وقت تمہارا گھر جانا امی اور محلے والوں کو پسند نہیں آئے گا' وعدہ کرتا ہوں صبح تمہیں گھر چھوڑتا ہوا میں آفس نکل جاؤں گا۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی وہ بولا ''میں ذرا امی کو دیکھ آؤں۔''

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ غصے سے میں بل کھا کر رہ گئی۔ نفرت سے میں نے زمین پر پیر مارا اور مسہری پر دراز ہو کر فلمی رسالہ دیکھنے لگی۔

رات کا کھانا میں نے تیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ کافی دیر بعد میں نے باورچی خانے میں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنی' عاصم نے مجھے آواز دینے کے بجائے اپنی چھوٹی بہن تہمینہ سے کچھ پوچھا اس کے بعد برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ بند ہو گئی۔ تہمینہ کا جواب میں کوشش کے باوجود نہیں سن سکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد عاصم ہوٹل سے کھانا لے آیا۔ تہمینہ نے میرے سامنے کھانا لا کر رکھا تو میں نے بڑے مزے کے ساتھ کھانا کھالیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کی لائٹ بند کی اور چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔

دوسری صبح میری ساس کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ اس کے زور زور سے کراہنے کی آواز گھر میں گونجنے لگی۔

''کیا مصیبت ہے' اس بڑھیا کی بھی اسی وقت طبیعت خراب ہونا تھی۔'' میں کمرے میں ٹہلتے ہوئے بڑبڑائی۔

تھوڑی دیر بعد ساس کے کراہنے کی آواز ذرا مدھم ہوئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ عاصم کمرے میں آیا اس کے چہرے پر شدید کرب کے آثار تھے۔

''آسیہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی' اگر تم آج گھر نہیں جاؤ تو بہتر ہوگا' میں بھی دفتر فون کر کے اطلاع دے دیتا ہوں۔''

''جب تم گھر میں ہو گے تو پھر مجھے کیوں روک رہے ہو؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا ''مجھے گھر چھوڑ آؤ' ورنہ میں خود چلی جاتی ہوں۔''

چند لمحے تک عاصم کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات نمایاں رہے' پھر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''اچھا میں چلتا ہوں۔''

سڑک پر آ کر اس نے بس اسٹاپ کی طرف بڑھنا چاہا تو

میں نے اسے فوراً جتا دیا کہ میں اپنے گھر ٹیکسی سے جاؤں گی۔ یہ بات سن کر اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی مزید گہری ہو گئی۔ ابھی وہ شش و پنج میں تھا کہ میں نے قریب سے گزرتی خالی ٹیکسی کو ہاتھ سے اشارہ دے دیا۔

ٹیکسی گھر کے قریب رکی تو میں دروازہ کھول کر نیچے اتری اور اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ میری ماں نے مجھے دیکھا تو کچن سے نکل کر مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

''آسیہ بیٹی' عاصم نہیں آیا؟'' میری ماں نے پوچھا۔

عاصم کے نام پر میں نے اپنی ماں کو گھور کر دیکھا' ان سے الگ ہوئی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے ایسا سکون ملا کہ میں بیان نہیں کر سکتی' باہر عاصم اور ماں کے بات کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ماں چائے کا کپ لیے کمرے میں داخل ہوئیں۔

''اماں آخر تم نے عاصم میں ایسی کیا خوبی دیکھی تھی کہ میری قسمت اس کے ساتھ پھوڑ دی وہ شکل کا اچھا ہے نا دولت اس کے پاس ہے۔'' میں ماں کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے بولی۔

''چپ ہو جا بیٹی!'' ماں نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا' ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور وہ بولیں ''جس طرح کوئی جوہری کسی پتھر کو دیکھ کر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے اس طرح کوئی عام آدمی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔''

''وہ اور ہیرا!'' میں ان کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ انداز میں ہنسی۔

''ہاں بیٹی!'' ماں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ''وہ ہیرا ہے' میں نے تیرے لیے اسے بہت سوچ سمجھ کر چنا ہے۔'' انہوں نے یہ کہتے ہوئے گہری سانس لی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مزید کہا ''وقت گزرے گا تو تجھے میری باتوں کا اندازہ ہوگا۔''

''ہونہہ!'' ماں کے کمرے سے باہر نکالنے کے بعد میں نے گردن جھٹکی۔

ابھی میں چائے پیتے ہوئے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میرے کانوں میں عالیہ کی آواز پڑی۔ وہ ماں سے میرے متعلق پوچھ رہی تھی۔

''عالیہ! میں یہاں ہوں۔'' میں کپ میز پر رکھ کر اٹھی اور کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہوئے بولی۔

اس نے مجھے دیکھا تو ہنستی ہوئی بھاگ کر میرے کمرے میں آ گئی۔

''ہائے آسیہ!'' وہ میرے گلے سے لگتے ہوئے بولی ''تیرے بغیر تو اب اس گلی میں میرا دل بالکل نہیں لگ رہا۔''

''گھبرا مت' اب میں یہاں آ گئی ہوں۔'' میں نے اسے الگ کرتے ہوئے پوچھا ''یہ سنا تیرا بھی کوئی رشتہ لگایا نہیں؟''

''ہائے اللہ!'' اس نے میری بات سن کر دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

''ہوں اس کا مطلب ہے تیرا بھی چل چلاؤ ہے۔'' میں اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے بولی۔

''ہائے!'' اس نے سسکاری بھری اور بولی ''میرے لیے ایک بڑا اچھا رشتہ آیا ہے۔''

''سچ!'' میں نے خوش ہو کر پوچھا۔

میری بات پر اس نے شرماتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''تو نے اسے دیکھا ہے؟'' عاصم کا خیال آیا تو میں نے بڑے بے صبرے انداز میں اس سے سوال کیا ''کہیں میری والی غلطی مت کرنا۔''

''ہاں آسیہ تیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے' تیری ماں نے سوتیلا پن کیا ہے' تیرے جیسی دودھ ملائی جیسی رنگت والی لڑکی اس پورے محلے میں کوئی نہیں۔''

''بس قسمت کی بات ہے۔'' میں ایک دکھی آہ کے ساتھ بولی۔ ''رانی کو شہزادے کی بجائے بھاڑ جھونکنے والا مل گیا ہے۔''

''تو دل میلا نہ کر۔'' عالیہ بولی ''میرے گھر چل میں تجھے اس کی تصویر دکھاتی ہوں۔''

میں بجھے دل کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے گھر آ گئی۔ عالیہ کی ماں اور چھوٹی بہن نے میرا استقبال کیا۔ ان سے مل کر میں عالیہ کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے الماری کھولی اور اس میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر وہ بری طرح شرما گئی' ہنستے ہوئے میں نے لفافے میں سے تصویر نکالی' اسے پلٹ کر دیکھا تو میں گنگ سی ہو گئی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عالیہ جیسی معمولی نقش و نگار کی لڑکی کو اتنا خوبصورت اور وجیہہ دولہا ملے گا۔ واقعی وہ بہت خوش نصیب تھی اس کے ہونے والے شوہر کو دیکھ کر میں مزید احساسِ کمتری کا شکار ہوگئی۔

''کیوں کیسا ہے؟'' عالیہ نے مجھ پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

''بہت شاندار پرسنلٹی ہے۔'' میں نے بڑے خلوص سے کہا ''تیری قسمت بڑی اچھی ہے عالیہ!''

''شکریہ' شکریہ!'' عالیہ شرماتے ہوئے بولی۔

کافی دیر بیٹھنے کے بعد میں اس کے گھر سے باہر آگئی۔ اپنے گھر میں داخل ہوئی تو میں اپنے آپ کو خاصا تھکا تھکا سا محسوس کر رہی تھی۔ میں نے ماں کی طرف دیکھا جو صحن میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ ان کی طرف شکوے بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے میں اپنے کمرے میں آگئی۔ بستر پر ڈھیر ہوکر میں رو پڑی۔

رات گئے عاصم کے گھر سے اطلاع آگئی کہ میری ساس کا انتقال ہوگیا ہے۔ ساس سے جان چھوٹنے پر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ ماں کے کہنے سننے پر میں اسی رات عاصم کے گھر واپس آگئی۔

☆☆☆

ساس کی موت کے بعد جب مجھ پر گھر کا کام آن پڑا تو مجھے اس گھر سے اور نفرت سی ہوگئی۔ میرا مزاج مزید تلخ سا ہوگیا۔ ذرا ذرا سی بات پر میں اپنی نند اور عاصم کو وہ بے نقط سنائی کہ دونوں کان دبائے سنتے رہتے۔ ان کے اس رویے نے مجھے اور شیر سا کر دیا۔

عالیہ کی شادی ہوئی تو میں نے بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ سلامی کے وقت اس کا شوہر خرم زنانے میں آیا تو میں نے اسے بے حد تنگ کیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سے چمک پیدا ہوئی تھی۔

ولیمے میں اس نے دوسرے مہمانوں کی بہ نسبت میرا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ کھانے کے دوران بار بار وہ مجھ سے پوچھتا رہا۔ اس کے اس انداز پر میں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

چند روز بعد میں نے عالیہ اور اس کے شوہر کی اپنے گھر دعوت کی اور اس میں بڑا اہتمام کیا۔ عاصم کو میں نے دفتر جاتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ وہ آج گھر دیر سے آئے۔ میری بات سن کر اس نے کچھ کہنا چاہا مگر جب میں نے اسے اپنی بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے گھورا تو وہ سر اثبات میں ہلاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

دن کے بارہ بجے کے قریب وہ دونوں میرے گھر آگئے۔ میں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔

کھانا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ چائے پیتے ہوئے خرم غور سے مجھے دیکھنے لگا' اس کے اس طرح دیکھنے میں سٹ پٹا سی گئی۔ میں نے گھبرا کر عالیہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے چائے پی رہی تھی۔

''آسیہ!'' خرم بڑی بے تکلفی سے میرا نام لیتے ہوئے بولا ''عالیہ نے بتایا ہے کہ تمہارا شوہر بڑا بدصورت ہے۔''

میں نے گھور کر عالیہ کی طرف دیکھا۔ وہ شرمندہ سی ہوکر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''اور گھر کی حالت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کوئی بڑی رقم نہیں کمار ہے ہیں؟'' خرم میری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے مزید بولا۔

''ایمان داری کا بھوت سوار ہے ان پر۔'' میں برا سا منہ بناتے ہوئے بولی ''کی پوسٹ پر ہیں اگر چاہیں تو کئی بنا سکتے ہیں۔''

''اوہ!'' خرم نے ہونٹ سکوڑے ''ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں اپنی ایمانداری کے چکر میں وہ اپنے گھر والوں کو پیس کر رکھ دیتے ہیں' ایسے لوگوں سے اللہ بچائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی۔

''میں تمہیں ایک مشورہ دوں؟'' خرم نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیسا مشورہ؟''

''تم خوبصورت ہو' تعلیم یافتہ بھی ہو اور سمجھ دار بھی ہو۔'' وہ پوری طرح میرے سراپے کو اپنی نگاہوں میں لیے ہوئے تھا۔

''کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ!'' لفظوں کی تکرار سے میں بور ہوتے ہوئے بولی۔

''میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں۔'' میرے انداز پر وہ مسکرایا' اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولا ''اگر تم نوکری کرلو تو اس گھر کی حالت بہتر ہوسکتی ہے۔''

''مجھے نوکری کون دے گا؟'' اس کی بات سن کر میں نے آنکھیں پھیلائیں۔

''یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔'' خرم بولا ''تمہیں ایسی نوکری دلاؤں گا کہ تمہاری تقدیر بدل جائے گی۔''

''خرم' اس کا شوہر یہ بات پسند نہیں کرے گا۔'' عالیہ گفتگو میں شریک ہوتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔'' عالیہ کی بات پر میں برا سا منہ بنا کر بولی۔

''یہ ہوئی نا بات!'' خرم خوش ہوکر بولا ''تم پرسوں ہمارے گھر آجانا' میں کل ہی اپنے باس سے بات کرلوں گا۔''

اس کی بات پر میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

شام ہوتے ہی وہ دونوں خوشی خوشی گھر سے رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی نند تہمینہ کو گھر کی صفائی اور برتن دھونے کا حکم دیا اور خود آرام کرنے اپنے کمرے میں آگئی۔

بستر پر لیٹے ہوئے میں خرم کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ اس کی باتوں نے میرے اندر ہلچل سی مچا دی تھی' میں اب ایک نئے انداز میں سوچ رہی تھی۔ نوکری کرنے سے جہاں میرے ہاتھ میں پیسا آتا وہاں میں عاصم کی بھی محتاج نہیں رہتی اس کے علاوہ گھر کے کام کاج سے بھی میری جان چھوٹ جاتی۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد میں نے نوکری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

رات کو عاصم گھر میں داخل ہوا تو میں جلدی سے مسہری سے نیچے اتر آئی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے باہر کی آواز دل پر کان لگا دیے۔

''تہمینہ تمہاری بھابی کہاں ہے؟'' عاصم کی آواز مجھے سنائی دی۔

''بھائی جان' وہ کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔''

''اچھا!'' عاصم بولا ''یہ بتا مہمانوں کی خاطر تواضع تو صحیح ہوئی۔ وہ یہاں سے خوش ہوکر تو گئے نا۔''

''ہاں بھائی جان' وہ کھانے کی بہت تعریف کر رہے تھے۔'' تہمینہ کہہ رہی تھی ''آپ ہاتھ منہ دھولیں میں بھابی کو اٹھاتی ہوں۔''

''نہیں اسے آرام کرنے دے۔'' عاصم نے تہمینہ سے کہا۔ ''تو کھانا گرم کرکے مجھے دے دے۔''

''اچھا بھائی جان!'' تہمینہ کی آواز ابھری۔

''تہمینہ!'' کچھ سوچ کر میں کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آگئی ''اب تو آرام کرلے تیرے بھائی کو میں کھانا دے دیتی ہوں۔''

عاصم نے مجھے غور سے دیکھا' میری فرمانبرداری پر وہ خوش سا ہوگیا اور مجھے دیکھتا ہوا وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بڑی چاہ سے کھانا گرم کیا۔ ابھی وہ ہاتھ منہ دھوکر باتھ روم سے باہر نکلا بھی نہیں تھا کہ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھانا میز پر لگا دیا۔

''آج تو بڑی نوازشیں ہو رہی ہیں۔'' عاصم خوش ہوکر بولا۔

''کیوں' کیا میں آپ کی خدمت نہیں کرتی؟'' میں اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے بولی۔

''نہیں بھئی' بہت خدمت کرتی ہو۔'' عاصم کھانے کی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

اس کی اس بات پر میں نے چونک کر اسے دیکھا' مگر میں سمجھ نہیں سکی کہ اس نے یہ بات طنز میں کہی ہے یا میری ناراضگی کو محسوس کرتے ہوئے بات بنائی ہے۔

عاصم نے کھانا کھایا ہر لقمے پر اس نے میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی تعریف کی۔ اس کی ان تعریفوں پر میں دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی جیسے ہی اس نے کھانا ختم کیا' میں دوڑ کر اس کے لیے چائے لے آئی۔

''تمہاری سہیلی اپنے گھر میں خوش تو ہے نا؟'' عاصم نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

میں جو بہت دیر سے اس بات کی منتظر تھی کہ وہ کب عالیہ کا ذکر چھیڑے اور میں اپنے مطلب پر آؤں' اس ذکر پر میرے اندر مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''ہاں وہ بہت خوش ہے۔'' میں نے اس کی بدصورتی پر چوٹ لگائی ''اس کا شوہر بہت خوبصورت ہے۔ عالیہ اس کی بہت تعریف کر رہی تھی۔''

عالیہ کے شوہر کی تعریف پر عاصم کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر سا ہوا' مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا' وہ خاصے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تمہاری سہیلی اپنے گھر خوش ہے یہ ایک اچھی بات ہے۔''

''عالیہ کے شوہر نے ایک بات کہی ہے مجھ سے۔''

''کیا؟'' عاصم نے چونک کر پوچھا۔

''عالیہ نے اسے ہمارے گھر کے بارے میں کچھ بتایا ہوگا۔'' میں آہستہ آہستہ اپنے مطلب پر آتے ہوئے بولی ''اسے ہماری حالت جان کر خاصا دکھ ہوا' اس نے مجھے بتایا کہ مہنگائی کے اس دور میں لڑکیاں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی ہیں' اپنے شوہر پر گھر کا سارا بوجھ نہیں ڈالتیں' میں نے پوچھا کہ میں اپنے گھر کے حالات کو بدلنے کے لیے کیا کرسکتی ہوں تو اس نے کہا کہ میں نوکری کرلوں۔''

''تم اور نوکری؟'' عاصم نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

''نوکری عالیہ کے شوہر نے دلانے کا وعدہ کیا

ہے۔'' میں اس کی طرف دیکھے بنا کہتی چلی گئی ''اس طرح ہمارا فائدہ ہو جائے گا کل کلاں کو ہمیں تہمینہ کی شادی کرنی ہے اور پھر آنے والے مہمان ہمارے لیے مزید مشکلات کا سبب بن سکتے ہیں' ان کی پرورش اور تعلیم کے لیے بے پناہ پیسا چاہیے۔''

میری بات سن کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' میں نے پوچھا۔

''آسیہ میں تمہیں نوکری کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' عاصم کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

''لیکن میں تو ہاں کر چکی ہوں۔'' میں مضطرب سی ہو کر بولی۔

''ہاں کر سکتی ہو تو نا بھی کر سکتی ہو۔'' عاصم کا لہجہ کچھ بدل سا گیا۔

''دیکھو عاصم میں نوکری خوشی سے نہیں کر رہی ہوں۔'' میں نے دلیل دی ''تم گھر کی حالت کو سمجھ نہیں رہے ہو' آج کا کمایا ہوا کل ہمارے کام آ سکتا ہے۔''

''بھوکے تو ہم اب بھی نہیں مر رہے ہیں۔'' عاصم مدھم لہجے میں بولا ''مجھے اللہ کی ذات سے پوری امید ہے کہ ہمارے حالات بدل جائیں گے' میں کوشش کر رہا ہوں' تم تھوڑا سا صبر کر لو۔''

''نہیں عاصم' میں تمہاری بیوی ہوں' مجھے وہ حقوق نہیں مل رہے جو ایک شوہر اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ صرف روٹی کھانے سے دیگر ضروریات پوری نہیں ہو جاتیں۔ یا تو تم مجھے وہ سارے حقوق دو یا پھر مجھے نوکری کی اجازت۔'' میرا لہجہ حتمی تھا۔

''میں تم سے بحث کرنا نہیں چاہتا۔'' عاصم بولا ''اور نا یہ چاہتا ہوں کہ یہ بات ہمارے درمیان خلیج بنے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس بات کو اپنے ذہن سے نکال دو اور آنے والے اچھے کل کا انتظار کرو۔''

اس کی اس بات نے میرے اندر آگ سی لگا دی' میں نے اسے سخت نظروں سے دیکھا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے بجائے میں ڈرائنگ روم میں جا کر صوفے پر لیٹ گئی۔ کافی دیر تک میں نے عاصم کا انتظار کیا' مگر وہ مجھے منانے نہیں آیا' اس کی اس بات نے میری انا کو شدید ٹھیس پہنچائی اور جذبات کی رو میں بہہ کر میں نے اسے چھوڑنے اور نوکری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح میری آنکھ کھلی۔ عاصم سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''آسیہ!'' اس نے مجھے مخاطب کیا۔

میں خاموش پڑی رہی۔

''رات میں نے ٹھنڈے دل کے ساتھ تمہاری نوکری کے مسئلے پر سوچا تھا؟'' عاصم کی شکستہ سی آواز میں نے سنی۔

''پھر.....؟'' جلدی سے میں نے اس کی طرف منہ گھماتے ہوئے پوچھا۔

''اگر میری امی زندہ ہوتیں تو میں تمہیں بڑی خوشی کے ساتھ نوکری کرنے کی اجازت دے دیتا۔'' عاصم میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا ''تم خود سوچو جب میں دفتر چلا جاؤں گا اور تم بھی دفتر میں ہو گی تو تہمینہ اس گھر میں اکیلی رہے گی۔ محلے والے کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔''

عاصم کا جواز بڑا مضبوط تھا' مگر میں کہاں ماننے والی تھی۔

''تہمینہ ابھی ساتویں جماعت میں پڑھ رہی ہے' بچی ہی ہے اسکول سے آنے کے بعد وہ پڑوس میں ماسی نوراں کے پاس رہ لے گی' اسکول سے وہ دو بجے آتی ہے' چار بجے تک تم آ جاتے ہو صرف دو گھنٹے کی تو بات ہے۔'' میں نے منطق جھاڑی ''یہ تم کیوں نہیں سوچ رہے کہ میں اس گھر کے فائدے کی بات کر رہی ہوں' تم اس کالے اور سفید ٹی وی کو دیکھو جو آئے دن خراب رہتا ہے' محلے کے کئی گھروں میں رنگین ٹی وی آ گیا ہے' دوسری آسائشیں انہیں میسر ہیں' کیا وہ اپنی آسائشوں میں ہمیں شیئر کرتے ہیں جو ہم ان کی پروا کریں؟''

میری اس منطق پر عاصم خاموش ہو گیا۔

''اچھا اگر تم بضد ہو تو پھر اپنی خوشی سے نوکری کرو۔'' وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا ''لیکن یہ بات یاد رکھنا میں تمہارے نوکری کرنے پر خوش نہیں ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے وہ صوفے سے اٹھا اور بغیر کچھ کہے گھر سے باہر چلا گیا۔ اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی میں اپنی جیت پر ہنس پڑی۔ انگڑائی لیتی ہوئی میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے ڈرائنگ روم سے باہر جھانکا تہمینہ باورچی خانے میں گھسی الٹا سیدھا ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ میں ہاتھ منہ دھو کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

پروگرام کے مطابق میں دوسرے روز ہی عالیہ کے گھر جا پہنچی۔ خرم کو گھر میں اکیلا دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے خوف زدہ ہوئی' دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے خوف پر قابو پا لیا۔

''آسیہ!'' خرم مجھے اپنے شاندار اور وسیع ڈرائنگ روم میں لے جاتے ہوئے بولا ''زندگی کی آسائشیں آسانی سے نہیں ملتی ہیں بلکہ انہیں چھینا جاتا ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں خرم صاحب؟'' میں نے پرس میز پر

رکھا اور صوفے میں دھنستے ہوئے پوچھا۔

''آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔'' وہ ہنسا ''تم جیسی حسین و جمیل لڑکی اس بوسیدہ سے مکان میں اپنی زندگی تمام کر رہی ہے یہ بات میرے لیے بڑی حیران کن بات تھی۔''

''یہ سب میری ماں کا کیا دھرا ہے۔'' میں نفرت بھرے لہجے میں بولی ''انہوں نے اس لنگور سے باندھ دیا ہے مجھے۔''

''تم اس سے طلاق لے لو۔'' خرم نے میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا ''تمہارے لیے کوئی بھی شخص بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ رات میں نے خود عاصم کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا' مگر یہ بات خرم کے منہ سے مجھے اچھی نہیں لگی۔

''آسیہ' تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' خاموشی نے طول کھینچا تو وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں ایک ٹھنڈا سانس لے کر بولی ''میری ماں کے لیے وہ ہیرے کی مانند ہے اور انہیں اپنے داماد پر بڑا فخر ہے۔ ان کی زندگی میں تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔''

''خیر اس مسئلے پر ہم بعد میں سوچیں گے۔'' خرم نے بڑی خوبصورتی سے بات بدلی ''میں نے تمہاری نوکری کے لیے اپنے باس سے بات کر لی ہے تم آج سے ہی کام شروع کر سکتی ہو۔''

''مجھے کیا کرنا ہو گا اور پیسے کتنے ملیں گے؟'' میں نے بڑی بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

''کام بہت آسان ہے۔'' یہ کہتے ہوئے خرم اسی صوفے پر بیٹھ گیا جس پر میں بیٹھی تھی ''فی الحال تمہیں ڈھائی ہزار روپے ماہانہ ملیں گے اوپر کی آمدنی الگ ہو گی اور.....''

''اور کیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اگر باس کو تمہارا کام پسند آ گیا اور تم نے اسے کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا تو ترقی کی رفتار تیز بھی ہو سکتی ہے۔'' خرم کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

''عالیہ ابھی تک نہیں آئی؟' اسے اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھا دیکھ کر میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ بھی آ جائے گی۔'' خرم نے پوچھا ''تم یہ بتاؤ کیا پیو گی' ٹھنڈا یا گرم۔''

''چائے پلوا دیں۔'' میں اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے بولی۔

اس نے انٹر کام پر کچن میں چائے کے لیے کہا۔ چند ہی منٹوں میں ایک نوکر چائے اور دوسرے لوازمات کی ٹرالی دھکیلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ ٹرالی میرے سامنے چھوڑ کر وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

میں نے چائے بنائی اور کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ چائے پیتے ہوئے ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ عالیہ آ گئی۔ اسے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا وہ مجھ سے بڑی خوش دلی کے ساتھ ملی۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اس نے خرم کو میرے ساتھ بیٹھا دیکھ کر برا نہیں منایا تھا۔ شاید وہ اپنے شوہر کے بارے اتنی ڈھیر ساری آسائشوں کو دیکھ کر بالکل ہی صفر ہو گئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد خرم مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک بڑے ہوٹل میں لے گیا۔ اس نے میرا تعارف ذیشان سے کرایا اور وہ اسے میرا انٹرویو لینے کا کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

خرم کے کمرے سے باہر جاتے ہی ذیشان پوری طرح میری طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سوالات کرتا اور میں اعتماد سے جواب دیتی رہی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو یہ سوال جواب کا سلسلہ موقوف ہوا۔ اتنے میں چائے آ گئی۔

''ہاں بھئی ذیشان' تمہارا انٹرویو مکمل ہو گیا یا نہیں؟'' خرم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''خرم صاحب' انٹرویو ان کا ہوتا ہے جنہیں رکھنا نہیں ہوتا میں نے آسیہ صاحبہ سے سیدھے سیدھے سوال پوچھے ہیں۔''

''تم مطمئن ہو کہ یہ تمہیں مایوس نہیں کریں گی۔''

''یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے ذیشان نے دراز کھولی اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''اپنے لوگوں کو چلانا پڑتا ہے ان میں اگر صلاحیت ہو تو وہ جلد ہی مقام بنا لیتے ہیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' میں نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے پوچھا۔

''یہ ایک طرح کا فارم ہے' اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ آپ ہوٹل کی نوکری خوشی سے کر رہی ہیں' آپ کو گاہکوں کی بات ماننا ہے اور اگر آپ کے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی ہو گئی تو ہوٹل اس کا ذمے دار نہیں ہو گا۔''

''یار چھوڑو ان باتوں کو۔'' خرم مجھے سائن کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا ''میں اس ہوٹل میں موجود ہوں' تم ہو پھر کس کی مجال ہے جو آسیہ کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔''

میں نے ایک نظر ان دونوں پر ڈالی اور کاغذ پر دستخط کر دیے۔

دوسرے روز سے میں نے ہوٹل کی نوکری جوائن کرلی، گھر پر میں نے عاصم کو خرم کے کہنے پر ایک دواؤں کی کمپنی میں نوکری کے متعلق بتایا تھا۔ دواؤں کی کمپنی کا سن کر وہ کچھ مطمئن سا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ہوٹل کی نوکری کرتے ہوئے مجھے اچھا خاصا عرصہ گزر گیا۔

شروع شروع میں عاصم کا منہ پھولا رہا، اس نے مجھے ڈھکے چھپے لفظوں میں نوکری چھوڑ دینے کے لیے بھی کہا مگر میں اس کی ہر بات ہنس کر ٹال جاتی۔ میری آمدنی شروع ہوئی تو آہستہ آہستہ گھر کی حالت بھی بدلنے لگی۔ اس پر عاصم خوش ہونے کے بجائے اور رنجیدہ ہو گیا۔ اسے کم صم دیکھ کر میں دل ہی دل میں خوشی سے پھولے نہ سمائی۔

ہوٹل کی نوکری میں ابھی تک مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ خرم اور ذیشان کا سلوک میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ہوٹل کی آڑ میں دوسرے دھندے بھی ہوتے تھے اس کے علاوہ ہوٹل کا مالک جسے سب باس کہتے تھے وہ ملک دشمن عناصر کا آلہ کار بھی تھا۔ یہ ساری معلومات مجھے بغیر کسی تگ و دو کے حاصل ہو گئی تھیں۔ باس ملک سے باہر تھا اسی لیے ابھی تک میری ملاقات اس سے نہیں ہو سکی تھی۔

ایک صبح میری آنکھ کھلی، عاصم دفتر کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میری نظر گھڑی پر پڑی تو وہ صبح کے آٹھ بجا رہی تھی۔ جلدی سے میں مسہری پر اٹھ بیٹھی، ایک انگڑائی لے کر میں مسہری سے نیچے اتری اور سیدھی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتا کرنے کے بعد میں اور تہمینہ گھر سے باہر نکلے۔ دروازے کو تالا لگایا، میں تہمینہ کو اسکول چھوڑتی ہوئی ہوٹل پہنچ گئی۔ خلافِ توقع صبح ہی صبح خرم اور ذیشان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کیا بات ہے آج آپ دونوں وقت سے پہلے ہی آفس میں نظر آ رہے ہیں؟'' میں نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے پوچھا۔

''آج کسی بھی وقت باس کی آمد متوقع ہے۔'' خرم نے میری طرف دیکھا ''وہ چند گھنٹوں کے لیے یہاں آ رہے ہیں، تم سارے انتظامات پر خصوصی نظر رکھو۔ کہیں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے۔''

''آپ دونوں بالکل مطمئن رہیں۔'' میں بڑے اعتماد سے بولی ''آپ کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہو گی۔''

''مجھے تم سے یہی امید ہے۔'' خرم بولا ''اگر تم نے آج باس کا دل جیت لیا تو ہم تینوں کی زندگی میں بہار آ جائے گی۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں انہیں خود سروس دوں گی۔'' میں نے کہا ''دوسری لڑکی کوئی غلطی بھی کر سکتی ہے۔''

میرے جواب پر وہ دونوں مطمئن سے ہو گئے۔ انہوں نے مجھے دوسری ضروری ہدایات دیں اور ہوٹل سے باہر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی میں نے تمام لڑکیوں کو بلا کر انہیں آج کے دن کی اہمیت کا احساس دلایا اور خود بھی ان کے ساتھ ساتھ کام میں مصروف ہو گئی۔

دو بجے کے قریب ذیشان نے مجھے اطلاع دی کہ باس تین بجے کی فلائٹ کے بجائے رات آٹھ بجے کی فلائٹ سے پہنچیں گے۔ یہ اطلاع میرے لیے پریشان کن تھی کیونکہ اتنا عرصہ نوکری کے دوران کبھی میں نے نائٹ ڈیوٹی انجام نہیں دی تھی۔ میں اسی شش و پنج میں تھی کہ خرم ہمارے پاس آ گیا۔ میں نے اسے اپنی پریشانی بتائی تو وہ... عجیب سی ہنسی ہنس پڑا۔

''یہاں جان پر بنی ہے آپ ہنس رہے ہیں۔'' میں بولی۔

''ہنس اس لیے رہا ہوں کہ تمہیں ہوٹل کی نوکری کرتے ہوئے کئی مہینے ہو گئے مگر تم ابھی تک چالاک نہیں ہوئیں۔ ارے بابا یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے، جاؤ عالیہ کی بیماری کا بتاؤ اور ہوٹل آ جاؤ باس کے ہوٹل سے روانہ ہوتے ہی سیدھی میرے گھر چلی چلنا، صبح وہاں سے اپنے گھر چلی جانا۔''

''آئیڈیا بہت اچھا ہے۔'' میں سر اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

شام چار بجے سے پہلے میں گھر پہنچ گئی۔ تہمینہ گھر میں تھی۔ عاصم ابھی دفتر سے واپس نہیں لوٹا تھا۔ میں نے تہمینہ کو عالیہ کی بیماری کے متعلق بتایا اور الٹے پاؤں گھر سے باہر نکل آئی۔ میں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی چوک تک پہنچی تو میں نے سامنے سے عاصم کو آتے دیکھا، اسے دیکھ کر میں جلدی سے منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی وہ میری طرف دیکھے بغیر گزرتا چلا گیا۔

میں نے اس کی پشت کو گھورا اس کی کمر خاصی جھکی ہوئی تھی اور وہ بڑے بجھے بجھے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر میں نے ایک نفرت بھری نظر ڈالی اور تیز تیز چلتی ہوئی ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئی۔

رات گیارہ بجے کے قریب باس ہوٹل پہنچا۔ خرم اور ذیشان اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ اسے بڑا پر تکلف کھانا دیا گیا۔ اس کے بعد ہوٹل میں جتنے بھی نئے لوگوں کو بھرتی کیا گیا تھا ان کا اس سے تعارف کرایا گیا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور مسکرا دیا۔ جواباً میں بھی مسکرائی۔ وہ ایک وجیہہ اور خوبصورت آدمی تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا آئیڈیل میرے سامنے آ گیا ہو۔

بارہ بجے کے قریب باس نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ میں کمرے میں پہنچی تو وہ کمرے میں اکیلا تھا اور خاصا نشے میں لگ رہا تھا۔

''تمہارا نام آسیہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی!'' میں نے آہستہ سے گردن کو جنبش دی۔

''خرم اور ذیشان نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔'' وہ مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''جی ان کی ذرہ نوازی ہے۔'' میں نے کھڑے کھڑے پوچھا ''آپ حکم کریں میں آپ کے لیے کیا لاؤں؟''

''ہمارا حکم یہ ہے۔'' باس جس صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اس پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ''ہمارے پاس بیٹھو، کچھ ہماری سنو کچھ اپنی سناؤ۔''

''جی!'' اس کی بات سن کر میں چونک پڑی۔

''ہم تمہاری زندگی یکسر بدل کر رکھ دیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پرس نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''ہمیں وہ لڑکیاں زیادہ پسند آتی ہیں جو ہماری بات مانیں۔''

''ہوٹل میں آنے والے گاہک مجھے ٹپ دیتے تھے یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر باس تو پورا پرس مجھے پکڑا رہا تھا۔ اگر میں پرس لینے سے انکار کرتی تو وہ برا مان سکتا تھا یہ میں کسی بھی صورت نہیں چاہتی تھی۔

''باس!'' میں پرس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی ''مجھے حکم کریں میں آپ کے لیے کیا لاؤں؟''

پرس ہاتھ میں پکڑتا غضب ہو گیا، اس نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مجھے ایک جھٹکے سے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔

''یہ..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' بڑی مشکل سے میرے منہ سے یہ الفاظ نکل سکے۔

''خاموش رہو۔'' وہ غرایا ''اس کمرے میں آنے والی لڑکیاں دولت سے بھی مالا مال ہو کر جاتی ہیں اور معاشرے میں زندہ رہنے کے لیے عزت کا سرٹیفکیٹ بھی لے کر نکلتی ہیں۔''

بکواس مت کرو۔'' جیسے ہی مجھے موقع ملا میں نے اسے زور سے دھکا دے دیا، سرعت سے میں پیچھے ہو گئی، ہڑبڑا میں نے اس کے منہ پر دے مارا اور چیخی ''تم مجھے غلط سمجھتے ہو۔ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں، ہوٹل میں محنت مزدوری ضرور کرتی ہوں مگر اپنی عزت کا سودا نہیں کرتی۔'' میں نے چند لمحے کا توقف کیا پھر بولی ''اور مجھے دولت ضرور چاہیے مگر ایسی غلیظ دولت نہیں اور نہ ہی مجھے تم سے عزت کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت ہے۔''

''اچھا!'' باس کا نشہ ہرن ہو گیا، وہ اپنے بازوؤں کی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ''تمہاری بات سن کر ہمیں دلی خوشی ہوئی۔ شکار اگر جاندار ہو تو پھر اس کا مزا دوسرا ہوتا ہے، تم اس کمرے میں اپنی مرضی سے آئی ہو لیکن جاؤ گی ہماری مرضی سے۔''

''میں جا رہی ہوں۔'' اچانک میرے اندر والی عورت بیدار ہو گئی۔ میں سب کچھ کر سکتی تھی، مگر اپنے مقام سے گرنا مجھے قبول نہیں تھا، میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت سے بولی ''میں تم پر اور اس نوکری پر لعنت بھیجتی ہوں۔''

''اچھا یہ بات ہے۔'' وہ بڑے مزے سے صوفے پر نیم دراز سا ہو گیا ''پھر ذرا جا کر دکھاؤ۔''

میں اسے گھورتی ہوئی الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ چھلانگ لگا کر کہیں مجھے بے بس نہ کر دے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے چند گہرے گہرے سانس لیے اور ہینڈل کو دبا کر میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ دروازہ باہر سے بند تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ لیٹے ہی لیٹے بولا ''ہم نے تم سے کہا تھا کہ تم ہماری مرضی کے بغیر کمرے سے باہر نہیں جا سکتیں۔''

میں نے خوف زدہ ہرنی کی طرح اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے شاطرانہ انداز میں مسکرا رہا تھا، اپنی بے بسی کا احساس ہوتے ہی میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

''آجا چندر مکھی!'' باس اپنے دونوں ہاتھ میری طرف پھیلاتے ہوئے بولا ''تو مجھے پسند آ گئی ہے۔ میں تیری زندگی کو پلٹ کر رکھ دوں گا۔''

''نہیں۔'' میں مضبوط لہجے میں بولی ''میں تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔''

''تو ہم تمہارے قریب آ جاتے ہیں۔'' وہ اپنی جگہ سے

اٹھتے ہوئے بولا۔

''ٹٹ..... ٹھہرو۔'' میں نے ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ایک ایسا طریقہ ہے میں تمہارے قریب آسکتی ہوں۔''

باس جو صوفے سے کھڑا ہونے والا تھا۔ دوبارہ صوفے پر ڈھیر ہوگیا اور میری طرف بھوکی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا ''چل طریقہ بھی بتادے۔''

''تم مجھ سے شادی کرلو۔''

''شادی اور وہ بھی تم سے!'' اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ''یہ مانا کہ تم خوبصورت ہو۔ بڑا بھرپور جسم رکھتی ہو مگر شادی؟ میں ان چکروں میں نہیں پڑتا' تم جتنی رقم چاہو شادی کے بغیر حق مہر کے طور پر مجھ سے لے لینا۔''

اس کی اس گھٹیا بات نے مجھے بری طرح اچھال دیا۔ یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہوسکی۔ میں ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور کسی عقاب کی طرح اس پر جھپٹی' میز پر رکھا ہوا پیتل کا گلدان اٹھایا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا میں نے تڑاتڑ گلدان اس کی کھوپڑی پر برسادیے۔ وہ چیختا ہوا صوفے سے نیچے گر پڑا۔

میرے حواس ذرا سنبھلے تو میں نے جلدی سے باس کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ اسے بے ہوش دیکھ کر میرے اندر سکون سا بھر گیا۔ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے' منہ میں بڑی مشکل سے رومال ٹھونسا اور دروازے کے سامنے جم گئی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد دروازے کے پیچھے آہٹ ہوئی۔ میں چونک کر دروازے کے ساتھ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ گلدان میں نے مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور پھر کوئی دبے پاؤں چلتا ہوا دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں سمجھ گئی کہ باقاعدہ منصوبے کے تحت سارا کام کیا گیا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی کے ساتھ دروازہ کھولا' باہر کسی قسم کی آہٹ نہیں ہوئی تو میں باہر آگئی۔ دبے قدموں چلتی ہوئی میں آگے بڑھی تو ایک کمرے سے باتوں کی آواز سن کر میں اس طرف رینگ گئی۔

کمرے کا دروازہ چند انچ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا' خرم ذیشان ڈرنک کررہے ہیں۔

''صبح ہماری قسمت کا دروازہ کھل جائے گا۔'' خرم نشے میں دھت ذیشان سے کہہ رہا تھا ''پچھلی مرتبہ باس نے ہم دونوں کو ایک ایک فلیٹ اور گاڑیاں دی تھیں' اس دفعہ ہم اس سے بنگلے کی بات کریں گے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔'' ذیشان نشے میں لہراتے ہوئے بولا ''آسیہ بڑی زبردست لڑکی ہے' اتنا عرصہ میں نے بڑی مشکل سے صبر کیا ہے صرف اس لیے کہ پہلے باس اسے شکار کرلیں۔''

خرم اور ذیشان کی باتیں سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنے گرے ہوئے اور گھٹیا انسان ہوں گے۔

''مت گھبرا میرے یار!'' خرم کی آواز کانوں میں پڑی تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی ''اب وہ ہمارے لیے نرم چارہ ثابت ہوگی۔ آئندہ وہ دن کے بجائے نائٹ ڈیوٹی ہی کیا کرے گی۔ اس پر بڑے بڑے لوگوں کا دل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مکروہ انداز میں ہنس پڑا۔ وہ ہنسا تو ذیشان بھی ہنسنے لگا۔

میں غصے میں کھولتی ہوئی ہوٹل کے عقبی راستے کی طرف بڑھ گئی۔ ہوٹل سے باہر آکر میں نے کئی گہرے گہرے سانس لیے اور پبلک کال آفس کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

میری زندگی میں اب سکون ہی سکون ہے۔ میں عاصم کو اب ٹوٹ کر چاہتی ہوں' وہ میری محبت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ میری کایا پلٹ گئی۔

نوکری کا نام سن کر میں کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوں' اگر میں جوشِ انتقام میں باس کو بے ہوش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی تو ایک ایسے گورکھ دھندے میں پھنس چکی ہوتی جس سے میں پھر کبھی نہ نکل پاتی۔ ان باتوں پر میں غور کرتی ہوں تو اب بھی کانپ اٹھتی ہوں۔

میرے فون نے پولیس اسٹیشن میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوٹل پر پولیس ریڈ ہوا تھا اور سب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔ مکمل ثبوت مل جانے کے باعث اخباری اطلاعات کے مطابق انہیں بعد ازاں سزائیں ہوگئی تھیں۔

کچھ عرصہ بعد عاصم کو بھی ایک بڑے ادارے میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی اور اب میں اپنے ایک بچے کے ساتھ بڑے مزے کی زندگی گزار رہی ہوں۔ واقعی میری ماں نے سچ کہا تھا عاصم ایک ایسا ہیرا ہے جسے صرف جوہری ہی پرکھ سکتا ہے۔ اب تو میں نے بھی اسے پرکھ لیا ہے واقعی وہ ایک نایاب ہیرے کی مانند ایک بہت ہی اچھا انسان' بہت چاہنے والا شوہر اور بہت ہی پیار اباپ ہے۔

مثلث

تحریر : نوشاد عادل

مکرمی معراج صاحب، السلام و علیکم!

سرگزشت کی کہانیاں ہمارے معاشرے کے زیادہ تر گھناؤنے اور تاریک پہلو دکھاتی ہیں۔ ایک طرح سے یہ ہی ممکن بھی ہے۔ جس کو کوئی پریشانی یا تکلیف نہ ہو اسے کہاں فرصت کہ اپنی کہانی بیان کرنے بیٹھے۔ لیکن اکثر یہ سوچ کر ہی دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے کہ آخر سارے مظالم اور تکلیفیں عورتوں کی قسمت میں کیوں ہیں؟ میں ایسی بدنصیب ہوں کہ ذاتی طور پر کوئی پریشانی نہ ہونے کے باوجود ہر وقت دکھوں اور دکھ بھری یادوں میں گھری رہتی ہوں۔ میرے لئے سکون کی دعا کریں۔

بدنصیب

شازیہ عماد، کراچی

''چابیاں کدھر ہیں گاڑی کی؟'' فیروز بھائی نے کمرے میں داخل ہوکر چلا کر پوچھا اور ساتھ ہی کرسی پر ایک لات ماری۔ میں کتاب پڑھتے پڑھتے سہم گئی اور خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

رابعہ باجی کپڑوں کی الماری سے کپڑے نکالتے نکالتے چونک اٹھیں اور پلٹ کر فیروز بھائی کو دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی تھی۔ انہوں نے ڈرے ڈرے انداز میں پوچھا ''کیا ہوگیا ہے..... کیا چیز کھو گئی ہے؟''

''تیرا باپ کھو گیا ہے کتیا۔'' فیروز بھائی دانت پیس کر غرائے ''کان کھلے رکھا کر اپنے۔ اتنی دیر سے میں کیا بھونکے جارہا ہوں۔ چابیاں ٹیبل پر رکھی تھیں گاڑی کی۔ اب کہاں چھو منتر ہوگئیں۔ ایک تو کوئی بھی چیز ٹھکانے پر نہیں رہتی اس گھر میں۔ ہزار بار کہا ہے کہ میری جو چیز جہاں رکھی ہو وہاں سے اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے..... مگر تم لوگوں کی عقل میں کوئی بات آتی ہی نہیں ہے؟''

''میں نے تو چابیاں دیکھی ہی نہیں ہیں۔'' رابعہ باجی نے بے بسی سے کہا ''میں تو دھونے کے لیے کپڑے نکال رہی ہوں۔ آپ نے خود ہی تو چابیاں رکھی تھیں۔ ہوسکتا ہے کسی اور جگہ رکھ دی ہوں۔''

''یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ بکواس کررہا ہوں کتیا

کی بچی۔'' فیروز بھائی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا اور میں سمجھ گئی اب وہی ڈراما ہوگا جو اکثر ہوتا رہتا تھا۔ وہ ایک دم جھپٹے اور رابعہ باجی کے بال جکڑ لیے۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ چیخی تو رابعہ باجی بھی تھیں' لیکن ان کی آواز گھٹی گھٹی تھی۔ وہ کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی آواز محلے والے سنیں اور انہیں گھر میں ہونے والے حالات کا علم ہو۔ انہیں خود سے زیادہ اپنے شوہر کی عزت کا خیال تھا مگر ان کے شوہر یعنی فیروز بھائی کو کسی کی بھی پروا نہ تھی۔ ان پر جب جنون سوار ہوتا تھا تو وہ رابعہ باجی کو بے دریغ مارنا شروع کردیتے تھے۔ انہوں نے رابعہ باجی کو بالوں سے جکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ رابعہ باجی نے ہزار کوشش کی کہ ان کے منہ سے آواز نہ نکلے مگر ایک زوردار چیخ بے اختیار نکل گئی۔ فیروز بھائی نے انہیں بیڈ کی طرف زور سے دھکیلا۔ میں بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔ اپنی کتاب پھینک کر بیڈ سے اتری اور صوفے کے پیچھے جا چھپی۔ میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے رابعہ باجی کی گھٹی گھٹی چیخیں اور فیروز بھائی کی گندی گندی گالیاں سنیں۔ وہ باجی کو مارتے جارہے تھے اور مغلظات بکتے جارہے تھے۔ چابیوں کا ذکر تو وہ گویا بھول ہی گئے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں باجی کو بچانے کے لیے آگے بڑھتی۔ تب میں تیزی سے باہر کو لپکی اور ٹی وی لاؤنج میں چابیاں تلاش کرنے لگی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اپنی باجی کی یہ بے بسی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی لیکن جو خود بے بس ہو وہ کسی دوسرے مظلوم کی بھلا کیا مدد کرسکتا ہے۔ میں ادھر ادھر چابیاں تلاش کررہی تھی کہ اچانک میری نگاہ صوفے پر پڑی۔ چابیاں ایک کشن کے ساتھ رکھی تھیں۔ میں نے تیزی سے لپک کر چابیاں اٹھائیں اور واپس کمرے کی طرف بھاگی۔ اتنی دیر میں فیروز بھائی نے رابعہ باجی کو مار مار کر ادھ موا کرڈالا تھا۔ ان کا حلیہ بگاڑ کر رہ گیا تھا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں فیروز بھائی کو مخاطب کیا۔

''یہ..... یہ رہیں چابیاں.....'' وہ پلٹ کر مجھے گھورنے لگے۔ میرا دم لبوں پر آگیا ''وہ..... وہاں صوفے پر رکھی تھیں۔''

''وہاں تو میں نے خود دیکھا تھا..... پھر مجھے کیوں نظر نہیں آئیں؟'' انہوں نے میرے قریب آکر چابیاں لے لیں۔

''مجھے تو صوفے پر ہی ملی تھیں کشن کے پاس۔'' بمشکل میرے حلق سے آواز نکل رہی تھی۔

''تم دونوں بہنوں کی خصلت میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔'' انہوں نے تیز آواز میں کہا اور چابیاں جیب میں ڈال لیں ''ایک دم مکار ہو۔ بھولی بھالی شکلیں بنا کر دوسروں کو دھوکا دیتی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ یقیناً انہوں نے ہی صوفے پر چابیاں رکھی تھیں اور بعد میں بھول گئے تھے۔ اب انہیں یاد آگیا ہوگا' لیکن اپنی غلطی ماننے کو وہ کبھی تیار نہیں ہوتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد میں باجی کی طرف بڑھی۔ وہ بیڈ پر بکھرے ہوئے انداز میں ساکت پڑی تھیں اور خاموشی سے چھت کو گھورے جارہی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے رونا آگیا۔ کیسی بدنصیب تھی میری بہن۔ اس کے نصیب میں کیسا ظالم شوہر لکھا تھا اور وہ اللہ کی بندی اس کی کسی جائز یا ناجائز بات پر اف بھی نہیں کرتی تھیں۔ نہ جانے وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔

رابعہ باجی میری بڑی بہن تھیں۔ ہمارا باپ تو ایک تھا لیکن مائیں الگ الگ تھیں۔ ہمارے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ میں نے بہت سے لوگوں سے یہ بات سنی ہے کہ باجی بڑی بدنصیب ہے۔ اس کی قسمت اچھی نہیں ہے۔

جب رابعہ باجی پیدا ہوئی تھیں تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس وقت میری دادی زندہ تھیں۔ انہوں نے ہی پوتی کو پالا پوسا۔ ساتھ ساتھ اپنے بیٹے پر زور دیتی رہیں کہ وہ دوسری شادی کرلے لیکن والد صاحب کاروباری شخص تھے۔ انہیں کاروبار سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی اور پھر انہیں بیوی سے محبت بھی بہت تھی' لہٰذا کسی دوسری عورت کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہ تھا۔

رابعہ باجی کے پیدا ہونے کے بعد والد صاحب کا کاروبار ٹھپ ہوتا چلا گیا۔ وہ پریشان رہنے لگے تھے۔ لوگ یہ باتیں بنانے لگے تھے کہ بچی منحوس ہے اس کی پیدائش کے بعد سے ہی کاروبار پر اثر پڑا ہے۔ پریشانیوں نے گھر دیکھ لیا ہے اور بچی پیدا ہوتے ہی ماں کو کھا گئی۔ والد صاحب نے پہلے یہ باتیں کبھی سوچی تک نہ تھیں' لیکن مستقل لوگوں کی زبانی یہ باتیں سن کر ان کے دل میں بھی اپنی بیٹی کے لیے نفرت پیدا ہونے لگی۔ پہلے وہ کام سے آتے ہی اپنی بیٹی کو پیار کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے کھانے پینے کی کوئی چیز لیتے آتے تھے۔ اسے گود میں اٹھا کر باہر لے جاتے تھے لیکن بعد میں ان کے رویے میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ اب وہ گھر آتے تھے تو بیٹی کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے۔ ان کی والدہ نے یہ تبدیلی محسوس کرلی تھی۔ وہ سمجھ دار اور روشن خیال خاتون تھیں۔ اپنے بیٹے کو سمجھاتی تھیں کہ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ اس میں بھلا اس

معصوم بچی کا کیا قصور ہے۔ تم جاہل لوگوں کی باتوں میں آکر بلاوجہ اپنی بیٹی سے نفرت کررہے ہو۔

مگر والد صاحب نے اپنی ماں کی باتوں پر زیادہ توجہ نہ دی۔ پہلے تو وہ دوسری شادی نہیں کرنا چاہ رہے تھے لیکن پھر انہوں نے اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ والدہ کو بھی آخر اپنے بیٹے کی خوشیاں عزیز تھیں۔ ان سے بیٹے کی تنہائی دیکھی نہیں جاتی تھی اور پھر وہ ابھی جوان ہی تھے۔ فوراً انہوں نے دوسری بہو کی تلاش شروع کردی۔ اصل میں انہیں ایک پوتے کی بھی خواہش تھی۔

آخر انہوں نے ایک لڑکی تلاش کرلی پھر اپنے بیٹے کے سر پر دوسرا سہرا سجا دیا۔ ایک سال بعد ہی میں پیدا ہوئی۔ اب والد صاحب کی تمام تر توجہ کا مرکز میں اور امی تھیں۔ انہیں رابعہ باجی کی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ ان کی حیثیت گھر میں پلنے والے پالتو جانور کی سی ہوگئی تھی۔ جب تک دادی زندہ رہیں وہ رابعہ باجی کی دیکھ بھال کرتی رہیں۔ دادی کی وجہ سے ہی رابعہ باجی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتی تھیں۔ دادی کے انتقال کے بعد ان کی زندگی سناٹوں اور ویرانیوں سے بھر گئی۔ امی کی عادت بہت اچھی تھی۔ وہ رابعہ باجی اور مجھ میں کوئی فرق نہیں کرتی تھیں۔ جو مجھے پہناتیں ویسا ہی رابعہ باجی کے لیے بھی خرید کر لاتی تھیں۔ کھانے پینے کی بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی لیکن ابو کی موجودگی میں امی رابعہ باجی کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھیں کیونکہ ابو کو یہ بات پسند نہ تھی کہ وہ رابعہ سے کوئی بات بھی کریں۔ مجھے بھی وہ رابعہ باجی کے پاس جانے نہیں دیتے تھے۔ ابو کی موجودگی میں رابعہ باجی اپنے کمرے میں قید ہوکر رہ جاتی تھیں۔ بچپن ہی سے ابو کا ڈر ان کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتی تھیں کہ ان کا ابو سے سامنا نہ ہو۔

رابعہ باجی اسکول بھی جاتی تھیں اور یہ امی کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا ورنہ ابو تو ان کی پڑھائی کے حق میں بھی نہ تھے۔ اس طرح وقت گزرتا چلا گیا پھر وہ وقت بھی آگیا کہ رابعہ باجی کے رشتے آنے لگے۔ ایک شادی کی تقریب میں کسی عورت نے رابعہ باجی کو اپنے بیٹے کے لیے پسند کرلیا تھا اور پھر وہ معلومات کرتی ہوئی ہمارے گھر آگئی تھیں۔ اس طرح کئی مرحلوں کے بعد رابعہ باجی اپنے گھر سدھار گئیں۔

پھر میری زندگی کا سب سے اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ ایک ٹریفک حادثے میں امی اور ابو جاں بحق ہوگئے۔ ان دونوں کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ ایسے میں رابعہ باجی نے آگے بڑھ کر مجھے سنبھالا اور اپنے گھر لے آئی تھیں۔ میں ان کے ساتھ رہنے لگی۔ پڑھائی کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا' بس خرابی یہ تھی کہ میرے بہنوئی جنہیں میں فیروز بھائی کہتی تھی' غصے کے بہت تیز تھے۔ ان میں ساری اچھی عادتیں تھیں۔ صرف یہی ایک خرابی تھی۔ غصے میں آتے تھے تو رابعہ باجی کو مارنا بھی شروع کردیتے تھے۔ اکثر معمولی اور بے تکی باتوں پر گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کردیتے تھے۔ مجھے فیروز بھائی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ جب ہنگامہ کھڑا کرتے تھے تو میں ڈر کے مارے چھپ جاتی تھی۔ غصے اور مار پیٹ کے علاوہ ان میں اور کوئی بری عادت نہیں تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ باجی پر غصے ہی ہوتے رہتے تھے یا انہیں مارا پیٹا ہی کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ ان کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتے بہت اچھی طرح پیش آتے تھے اور انہیں گھمانے پھرانے بھی لے جاتے تھے۔ اس وقت انہیں دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بے دردی کے ساتھ مارتے بھی ہیں۔

رابعہ باجی بھی ساری تلخیاں بھلا کر ان کے ساتھ ہنستی تھیں۔ کبھی ان سے زیادتیوں کی شکایت نہیں کرتی تھیں۔ صحیح معنوں میں وہ شوہر پرست ثابت ہوئی تھیں۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو فیروز بھائی کو کب کا چھوڑ چھاڑ کر چلی

جادوگروں کا بادشاہ

البرٹ میگنس کو جادوگروں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ اس نے چالیس برس تک لوگوں کو ناقابلِ یقین شعبدے دکھا کر گرداب حیرت میں ڈالے رکھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس کا تماشا دیکھنے کے لیے چھ کروڑ سے زائد کے ٹکٹ اس کی تمام زندگی میں فروخت ہوئے۔

اس نے ایک دفعہ سردیوں کے موسم میں، جب کہ زمین برف سے ڈھکی ہوئی تھی، شاہِ روم اور ہالینڈ کے سربراہ ولیم دوم کو اپنے کرتب دکھانے کی پیش کش کی تو لوگ اس کی بے وقوفی کا مذاق اڑانے لگے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ یہ دیکھ کر مجسمۂ حیرت بن گئے کہ صحن سے اچانک برف غائب ہوگئی اور بہار کا سماں پیدا ہوگیا۔ درختوں میں غنچے کھلنے لگے اور درختوں پر قسم قسم کے جادو کے پرندے زمزمہ پردازی کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب جادو کا یہ کھیل ختم ہوا تو زمین پر پھر برف آگئی۔

مرسلہ: ہمایوں دین پوری۔ خان پور کٹورا۔

جاتی لیکن انہوں نے اچھائیوں کے ساتھ ہر برائی کو بھی اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔

فیروز بھائی جب شاپ پر چلے جاتے تھے تو رابعہ باجی کو گھر میں اکیلا ہی رہنا پڑتا تھا۔ میں بھی صبح اسکول چلی جاتی تھی۔ البتہ اسکول سے واپس آکر ان کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی تھی اور ڈھیروں باتیں کرتی تھی۔ میری عمر اس وقت زیادہ نہیں تھی۔ میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ بہت سی باتیں میری عقل میں نہیں آتی تھیں۔ میرے ساتھ فیروز بھائی کا رویہ اچھا ہی تھا۔ انہوں نے کبھی مجھے بوجھ نہیں سمجھا۔ اگر وہ مجھے گھر میں رکھنے پر تیار نہ ہوتے تو نہ جانے میرا کیا حشر ہوتا۔ رابعہ باجی اس بات پر بھی شکر کیا کرتی تھیں۔

پھر سعدان کی پیدائش ہوئی۔ فیروز بھائی کو بیٹے کی بہت خوشی تھی۔ انہوں نے سعدان کی پیدائش پر دل کھول کر پیسا خرچ کیا۔ باجی کا بھی بہت خیال رکھ رہے تھے۔ جب باجی اسپتال سے گھر آئی تھیں تو انہوں نے ایک ملازمہ کا بندوبست کردیا تھا' تاکہ انہیں گھر کے کام کاج نہ کرنے پڑیں اور وہ زیادہ سے زیادہ بچے کا خیال رکھیں۔

مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا اور فیروز بھائی کی وہی غصیلی عادت دوبارہ ابھر آئی۔ ایک بار باجی کی ایک پرانی سہیلی اپنی شادی کا کارڈ دے کر گئی اور کہا کہ انہیں شادی میں ضرور آنا ہے۔ باجی نے فیروز بھائی سے تذکرہ کیا تو انہوں نے بڑے خوشگوار موڈ میں ہنس کر کہا۔

''ہاں بھئی چلیں گے۔ ضرور چلیں گے۔ اس میں پوچھنے والی بات کون سی ہے بھلا۔''

باجی خوش ہوگئیں۔ آخر تقریب کا دن آپہنچا۔ باجی نے کئی دن پہلے ہی تقریب کے لیے تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ دوپہر کے وقت انہوں نے فیروز بھائی کو شاپ پر فون کیا۔

''آپ آج جلدی آرہے ہیں ناں۔ میں تیار ملوں گی۔ وقت پر آجایئے گا۔''

''ہاں ہاں بھئی یاد ہے۔ وہ تمہاری سہیلی حنا کی شادی میں جانا ہے۔'' دوسری طرف سے فیروز بھائی نے کہا تھا۔ میں باجی کے ساتھ ریسیور سے کان لگائے کھڑی تھی۔

''کتنے بجے تک آجائیں گے۔ ہمیں نو بجے تک پہنچنا ہے۔'' باجی نے پوچھا۔

''بس زیادہ سے زیادہ سوا آٹھ بجے تک گھر آجاؤں گا۔'' انہوں نے جواب دیا اور چند اور باتیں کرکے رابطہ منقطع کردیا۔ میں نے آج اسکول سے چھٹی کی تھی۔ صبح سے ہی اپنی تیاریوں میں مصروف تھی۔ حنا باجی کو میں بچپن سے ہی جانتی تھی۔ وہ بھی مجھے چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھتی تھیں۔ ان کی شادی کی مجھے بھی بہت خوشی تھی۔ ہم لوگ تیار ہوکر انتظار کرنے لگے۔ ہماری نظریں بار بار دیوار گیر گھڑی کی طرف اٹھتی تھیں۔ وقت گزرتا چلا گیا لیکن فیروز بھائی کا کوئی پتا نہ تھا۔ آخر نو بجے میں نے ڈرتے ڈرتے باجی سے کہا۔

''باجی..... آپ ٹیلی فون کرکے معلوم کرلیں کہ وہ کب آئیں گے؟''

انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا ''نہیں..... نہیں..... میں یہ نہیں کرسکتی۔ بلاوجہ وہ ناراض ہوں گے۔ تم تو جانتی ہی ہو ان کی عادت۔ ذرا ذرا سی بات پر آگ بگولہ ہوجاتے ہیں۔''

میں خاموش ہوکر رہ گئی۔ ہم دونوں ان کا انتظار کرتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ ہمارے چہروں پر مایوسی چھاتی چلی گئی۔ تقریباً سوا دس بجے فیروز بھائی گھر آئے۔ اس وقت تک تقریب میں جانے کا ٹائم گزر چکا تھا۔ کیونکہ وہاں پہنچتے میں بھی کم از کم ہمیں ایک آدھ گھنٹا یا پینتالیس منٹ لگتے۔

فیروز بھائی کے چہرے پر تھکن اور بیزاری کے آثار نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے ہماری جانب توجہ بھی نہ دی اور صوفے پر بیٹھ کر نیم دراز ہوگئے۔

''کب سے انتظار کررہے تھے ہم آپ کا۔'' بالآخر رابعہ باجی نے خود ہی بولنے کی شروعات کی ''آپ نے تو کہا تھا کہ میں آٹھ سوا آٹھ بجے تک آجاؤں گا۔''

''نہیں آیا تو کوئی گناہ ہوگیا تجھ سے؟'' فیروز بھائی ایک دم پھٹ پڑے ''سارے کام دھندے چھوڑ چھاڑ کر آجاتا تمہیں شادی میں لے جانے کے لیے؟ کماؤں نہیں..... تمہیں گھماتا پھراتا رہوں؟''

''یہ میں نے کب کہا ہے۔'' رابعہ باجی کا چہرہ اتر گیا۔ ''لیکن آپ نے فون بھی تو نہیں کیا تھا۔''

''تو کوئی میری آفیسر ہے جو تجھے فون کرکے بتاؤں کہ میں نہیں آسکتا۔'' فیروز بھائی جہالت پر اتر آئے تھے۔ نہ جانے کس کا غصہ ان پر اتار رہے تھے ''جتنی تیری اوقات ہے اسی میں رہا کر.....''

''حنا نے کہا تھا ضرور آنا..... اب وہ بہت برا منائے گی۔'' رابعہ باجی تنکرانہ انداز میں بولیں ''میں کیا جواب دوں گی اسے؟ پتا نہیں وہ کیا سمجھے گی کہ میں کیوں نہیں آئی۔''

فیروز بھائی یہ سن کر ایک جھٹکے سے اٹھے اور انہوں نے رابعہ باجی کا بازو مضبوطی سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا۔

''جا..... دفع ہوجا..... جا..... بڑا شوق ہے ناں تجھے شادیوں میں جانے کا۔ بہت افسوس ہورہا ہے اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت نہ کرنے کا۔ جا رکشا کرکے چلی جا۔ کتیا کی بچی۔''

رابعہ باجی لڑکھڑا کر سینٹر ٹیبل سے ٹکرائیں اور گر پڑیں۔ ان کا ماتھا ٹیبل سے ٹکرایا اور وہ چیخ پڑیں۔ میں بھی دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ سارا موڈ اور خوشگوار ماحول بدل گیا تھا۔ فیروز بھائی نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ آگے بڑھ کر رابعہ باجی کے پہلو میں لات ماری اور بال جکڑ لیے۔

''اداکاری..... اداکاری کرتی ہے میرے سامنے..... ڈرامے باز..... اٹھ چل..... کھڑی ہو..... جا شادی میں جا۔ ناچ وہاں جاکر باراتیوں کے آگے۔ یاد رکھ..... تو مرے گی میرے ہی ہاتھوں۔''

فیروز بھائی نے انہیں مارنا شروع کردیا تھا۔ رابعہ باجی کی چیخیں سن کر بیڈ پر سویا ہوا ننھا سعدان خوف زدہ ہوکر رونے لگا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر اسے اٹھالیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرا خیال تھا کہ معمول کی طرح کچھ دیر بعد یہ معاملہ ٹھنڈا پڑجائے گا لیکن یہ مسئلہ بڑھ گیا تھا۔ رابعہ باجی کو بھی آج نہ جانے کیا ہوگیا تھا انہوں نے بھی فیروز بھائی پر چلانا شروع کردیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اور میرا دل آندھی کی زد میں آئے ہوئے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سعدان بدستور میری گود میں تھا۔ کچھ دیر بعد ہی رابعہ باجی آندھی طوفان کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کا حلیہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ چہرے اور ہاتھوں پر جگہ جگہ چوٹوں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے پر خوف سے زیادہ غصے کے آثار نمایاں تھے۔

''اٹھو..... شاذی..... فوراً اٹھ جاؤ..... اپنے کپڑے بیگ میں بھرو اور چلو میرے ساتھ۔'' ان کے بدلے ہوئے انداز اور لہجے پر میں چونک گئی۔ پہلی مرتبہ انہوں نے اس انداز میں بات کی تھی۔

''کک..... کہاں..... کہاں باجی.....؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''کہیں بھی..... لیکن اس جہنم سے نکلنا ہے۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔'' انہوں نے سعدان کو گود میں اٹھالیا۔ ''آخر میں بھی انسان ہوں۔ کہاں تک ظلم برداشت کروں گی۔ کب تک اس جنگلی شخص سے پٹتی رہوں گی۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اس کے ساتھ ایک پل بھی گزارے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب میں اس آدمی کے ساتھ ایک لمحہ بھی نہیں گزاروں گی۔ بہت برداشت کرچکی ہوں میں۔ دل پک گیا ہے میرا۔'' وہ اٹل لہجے میں بول رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا ہے۔ حنا باجی کی شادی کے دن کا مجھے کافی دن سے انتظار تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ یہ دن بڑا مبارک اور مزے دار گزرے گا لیکن یہ تو بہت ہی منحوس اور خوفناک ثابت ہوا ہے۔ وہ تو مجھے سامان پیک کرنے کا کہہ گئی تھیں مگر میں ماؤف دماغ کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنا چاہیے یا نہیں۔ اتنا تو میں جانتی تھی کہ رابعہ باجی کا یہ فیصلہ کتنا خوفناک اور نقصان دہ ہے۔ بھلا ہم لوگ کہاں جائیں گے۔ کون ہمیں اپنے گھر میں رکھے گا۔ میں بیٹھی خود سے الجھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد رابعہ باجی دوبارہ آئیں۔

''تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔ میں نے کہا تھا ناں کہ اپنے کپڑے اور ضروری سامان بیگ میں بھرلو۔''

''مم..... مگر کیوں..... کیوں باجی.....؟'' میں نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہمیں ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑنا ہے۔'' وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھیں۔

اسی لمحے فیروز بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ غالباً وہ اندازہ لگا چکے تھے کہ رابعہ باجی کیا ارادہ رکھتی ہیں۔ انہوں نے بے پروا سے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں ہاں جاؤ۔ شوق سے جاؤ۔ لے جاؤ اپنی جو بھی چیز لے جانا چاہتی ہو۔ بس ادھر سے دفعان ہوجاؤ۔''

اتنے میں رابعہ باجی نے میرے کپڑے خود ہی ایک بڑے بیگ میں ٹھونس لیے تھے پھر انہوں نے بیگ اٹھا کر مجھ سے کہا ''چلو شاذی..... آؤ میرے ساتھ۔''

''ہاں جاؤ جاؤ۔ اپنی باجی کے ساتھ۔'' فیروز بھائی نے مجھے گھور کر دیکھا ''دیکھتا ہوں کہاں لے کر جاتی ہے یہ تمہیں۔ روتی پیٹتی اگر واپس نہ آئے تو میرا نام بدل دینا۔ باہر سے ہی دفع کردوں گا۔''

سامان باہر لانے کے بعد رابعہ باجی نے ایک رکشا روک لیا اور پھر سعدان کو لینے اندر جانے لگیں تو فیروز بھائی نے راستہ روک لیا ''کدھر..... اندر کدھر.....؟'' انہوں نے بھویں اچکاتے ہوئے بڑی نخوت سے پوچھا۔

''میں اپنے بیٹے کو لینے جارہی ہوں۔'' رابعہ باجی نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے تحمل سے کہا۔

''پہلے وہ میرا بیٹا ہے۔ سمجھیں تم..... وہ میرے پاس ہی

رہے گا۔''

''سعدان میرا ہے وہ مجھے چاہیے!'' اس بار رابعہ باجی نے چیخ کر کہا تھا۔ آس پڑوس کے کئی گھروں کے دروازے کھل گئے تھے اور پڑوسیوں نے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یہ سب بڑا عجیب سا لگ رہا تھا اور شرمندگی بھی بہت ہو رہی تھی۔

فیروز بھائی نے زیادہ بات نہیں کی اور یہ کہہ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا کہ بیٹا میرا ہے میرے پاس ہی رہے گا۔ تم چاہے پولیس کو لے آؤ یا فوج کو۔ میں سعدان کو تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔'' رابعہ باجی بت کی طرح ساکت و جامد کھڑی رہ گئیں۔

اس کے بعد رابعہ باجی مجھے لے کر اپنی ایک دوست کے پاس پہنچی تھیں اور اسے اپنی پوری رام کہانی سنا دی۔ ان کی دوست ناہید اور ان کے شوہر رزاق بھائی بہت اچھے اور ہمدرد تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیدی تھی۔ یوں بھی ابھی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ صرف دونوں میاں بیوی تھے اور رزاق بھائی کے بوڑھے والدین تھے۔ گھر بہت بڑا تھا۔ رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم دونوں ادھر رہنے لگے۔ ہمارے والد صاحب نے میرے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ وہ سب میرے نام تھا اور ہر ماہ وہاں سے اتنا پرافٹ مل جاتا تھا کہ ہمارے اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ فیروز بھائی میں یہ اچھی عادت تھی کہ انہوں نے کبھی میرے پیسوں کے بارے میں پوچھا بھی نہ تھا۔ اس لیے وہ محفوظ تھے۔

رابعہ باجی نے اپنے بیٹے کو لینے کے لیے قانونی کارروائیوں کا سہارا لیا' لیکن کامیابی نہ حاصل ہو سکی' بلکہ ہوا یوں کہ فیروز بھائی نے انہیں طلاق دے دی۔ یہ ایک عظیم صدمہ تھا۔ رابعہ باجی غم سے نڈھال ہو گئی تھیں۔ انہیں طلاق کا صدمہ نہ تھا بلکہ سعدان کے چھن جانے کا دکھ تھا۔ ایسے میں رزاق بھائی اور ناہید باجی بہت کام آئے۔ انہوں نے رابعہ باجی کو بہت سہارا دیا۔ ایک روز ناہید باجی نے رابعہ باجی سے کہا ''رابعہ آخر کب تک تم اپنی جوانی کو تنہائی کے جہنم میں جلاتی رہو گی؟ کیا اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچا؟''

''میں تمہاری بات نہیں سمجھی؟'' رابعہ باجی نے حیرت اور سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''دیکھو میں کھل کر بتا دوں کہ میں اور رزاق چاہتے ہیں کہ تم ایک خوشگوار زندگی گزارو۔ اپنے گھر میں۔ اپنے..... شوہر کے ساتھ۔'' ناہید باجی بڑی سنجیدگی سے انہیں سمجھا رہی تھیں ''ہمیں تمہارے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ہمارا فرض ہے کہ تمہارے بارے میں اچھا سوچیں اور تمہیں مشورہ دیں۔''

انہوں نے چند لمحے توقف کیا کہ رابعہ باجی کوئی جواب دیں مگر وہ خاموشی سے ان کی بات سنتی رہیں۔ ناہید باجی نے مزید حوصلہ کرتے ہوئے آگے بات بڑھائی ''رزاق کے ایک دوست ہیں۔ ان کے آفس میں ہی کام کرتے ہیں۔ ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ جوان آدمی ہیں۔ گھر بار ہے' اچھی نوکری ہے۔ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ رزاق نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں تم سے بات کر کے دیکھوں۔ تم فوراً جواب نہ دو۔ پہلے اچھی طرح سوچ لو پھر مجھے جواب دینا۔''

یہ بات میری موجودگی میں ہی ہوئی تھی۔ رابعہ باجی نے اس معاملے پر سوچا تھا۔ اس دوران میں ہمیں علم ہوا تھا کہ فیروز بھائی نے دوسری شادی کر لی ہے۔ رابعہ باجی کے لیے یہ خبر تکلیف دہ تھی پھر رزاق بھائی نے بھی انہیں سمجھایا۔ بالآخر انہوں نے شادی پر رضامندی ظاہر کر لی۔

اس طرح رابعہ باجی کی شادی رزاق بھائی کے دوست شاہد سے ہو گئی۔ ان کی شادی کے ایک ماہ بعد تک میں رزاق بھائی اور ناہید باجی کے ساتھ رہی تھی پھر رابعہ باجی نے اپنے گھر بلوا لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ان کی زندگی کو یک سوئی حاصل ہو جائے گی' لیکن ایسا نہ ہو سکا ان کے نصیب میں ابھی اور تکالیف اور مشکلات جھیلنا تھیں۔ بہت جلد ہی یہ بات علم میں آ گئی کہ شاہد صاحب اپنی پہلی بیوی سے ان کے بچے نہیں ہو رہے تھے کئی سال گزر گئے تھے۔ شاہد صاحب ان کے والدین اور بہنیں ان کی بیوی کو طعنے دیتے رہتے تھے۔ وہ خود بھی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے بہت پریشان اور آزردہ دل رہتی تھیں اوپر سے ان لوگوں کے طعنوں نے ان کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ وہ تقریباً نفسیاتی مریضہ بن کر رہ گئی تھیں۔ اولاد کے سلسلے میں انہوں نے لوگوں کی باتوں میں آ کر نہ جانے کیا کیا جتن کیے تھے۔ کوئی ڈاکٹر' کوئی حکیم اور کسی عامل کامل کو نہ چھوڑا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہو سکا تھا۔ اس کے برعکس ہوا یہ کہ الٹی سیدھی دوائیں اور ٹوٹکے استعمال کرنے کے چکر میں وہ زندہ لاش بن گئی تھیں اور آخر کار جان ہار بیٹھیں۔

رابعہ باجی کے لیے یہ انکشاف سوہانِ روح سے کم نہ تھا لیکن انہیں تقدیر کے فیصلے کا انتظار تھا نہ جانے تقدیر میں کیا لکھا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان کے مکروہ شکل خدشات واضح ہوتے گئے۔ شاہد بھائی بہت اچھے تھے۔ ان میں کوئی خامی نہیں تھی بس انہیں اولاد کی تڑپ تھی۔ وہ اکثر رابعہ باجی

سے کہا کرتے تھے۔

''رابعہ..... تم جانتی ہو کہ مجھے اولاد کی کتنی تمنا ہے۔ مجھے بس ایک بیٹا چاہیے۔ بس ایک بیٹا.....''

''میں اس معاملے میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔'' رابعہ باجی بے بسی سے بولتیں ''یہ سب تو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رضا سے ہوتا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتا بس مجھے ایک بیٹا چاہیے۔ جو میرے نام کو آگے چلائے۔''

رابعہ باجی انہیں ہر طرح سے سمجھاتی تھیں' لیکن ان کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوئی تھی۔ شاہد بھائی اتنے تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہونے کے باوجود رابعہ باجی کی کسی دلیل کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب میں کالج میں آ گئی تھی۔ میرے خوابوں میں بھی اب رنگ بھرنے لگے تھے۔ ہر لڑکی کی طرح میں بھی جاگتی آنکھوں سے اپنے سجنے گی تھی لیکن رابعہ باجی کی زندگی میرے سامنے تھی۔ میرے دل میں خود بخود ایک انجانا خوف بیٹھ گیا تھا۔ مردوں سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ خدا جانے میرے نصیب میں آگے کیا لکھا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد میں ایک سینٹر میں پڑھنے جاتی تھی۔ وہیں ایک لڑکا عماد مجھ میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ وہ میرے ہی بیچ میں پڑھتا تھا۔ عماد مجھ سے بات کرنے کی مختلف بہانوں سے بہت کوششیں کرتا تھا۔ میں اس کی کسی بھی بات کا مختصر سا جواب دیتی اور اپنا رویہ روکھا ہی رکھتی تھی تاکہ اسے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو اور اس کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکے مگر وہ میرے سخت لہجے کو بھی بڑی تحمل مزاجی سے برداشت کر جاتا تھا۔ میری دوست ریحانہ مجھ سے کہا کرتی تھی۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو۔'' ریحانہ جھنجلا کر بول رہی تھی ''وہ اچھا لڑکا ہے۔ میں اسے جانتی ہوں۔''

''مگر مجھے جاننے کا کوئی شوق نہیں ہے اور نہ میں اس سے کچھ چاہتی ہوں۔''

''شازیہ۔ وہ تم سے سیریس ہے میں اسے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتا چکی ہوں۔'' ریحانہ نے سنجیدگی سے بتایا۔

''اگر وہ سیریس ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے نہ میں نے اسے سیریس ہونے کا کہا تھا۔'' میں نے عام سے لہجے میں ریحانہ سے کہا ''تم اسے سمجھاؤ کہ اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے پڑھائی میں لگائے۔''

''تم بڑی احمق ہو۔'' ریحانہ بھنا اٹھی۔

''شکریہ۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''بات کو سمجھنے کی کوشش کرو شازی۔'' کچھ دیر توقف کے بعد ریحانہ نرمی سے گویا ہوئی ''میں تمہارے مسائل سمجھتی ہوں۔ ان مسائل سے نکلنے کے لیے تمہیں ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ عماد ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ عماد جہاں کہے گا اس کے والدین اس کی شادی کر دیں گے۔''

اس بار میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ رابعہ باجی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ شاہد بھائی اور ان کے گھر والوں کے تقاضے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ مجھے ان پڑھے لکھے جاہلوں پر افسوس ہوتا تھا اور غصہ بھی آتا تھا۔ وہ ایک انسان سے وہ چیز مانگ رہے تھے جو انسانوں کے بس سے باہر تھی۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں سینٹر جانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ شاہد بھائی کی والدہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کسی عورت سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ بوڑھی خاتون محلے میں ہی رہتی تھیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ زمانے بھر میں گھومتی پھرتی رہتیں اور گھر گھر کی خبریں لیتی رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس دنیا میں ان کا کوئی کام نہ تھا۔ شاہد بھائی کی والدہ نے ان کے سامنے چائے بسکٹ رکھ دیے تھے اور آس پڑوس کی خبریں معلوم کر رہی تھیں۔ وہ بوڑھی خاتون خبریں دینے کے ساتھ ساتھ چائے اور بسکٹ پر پھرتی سے ہاتھ صاف کرتی جا رہی تھیں۔ ان کی آواز خاصی بلند تھی اس لیے مجھے ایک ایک بات سنائی دے رہی تھی۔

''عشرت بہن۔ تمہاری بہو کا پاؤں بھاری ہوا کہ نہیں؟'' بوڑھی خاتون نے اچانک چونک کر پوچھا۔

''ابھی کہاں خالہ۔'' انہوں نے منہ بنایا ''لگتا ہے یہ زمین بھی بنجر ہے۔ پہلی والی کی طرح ہے یہ بھی۔ اب تو کئی سال گزر گئے ہیں شادی کو۔''

''آئے میرے بیٹے کے ساتھ ہی تو شادی ہوئی تھی شاہد کی۔ اب تو ماشاء اللہ نذیر دو بچوں کا باپ بن گیا ہے۔ اب پھر میری بہو نے تیسرے کی خبر دی ہے۔''

''کیا کریں خالہ ہمارا تو نصیب ہی کھوٹا ہے۔''

''اے عشرت..... نصیب کو برا نہ کہہ..... نصیب برا نہیں ہوتا۔ بس سمجھ کی بات ہوتی ہے۔ تو چاہے تو نصیب اچھا بھی ہو سکتا ہے۔'' بوڑھی خاتون نے آگے جھکتے ہوئے کہا لیکن آواز بدستور بلند تھی۔

''وہ کیسے.....؟''

''شاہد ماشاء اللہ اچھا کماتا ہے۔ ایک دو چھوڑ..... چار

بیویاں بھی رکھ سکتا ہے۔ کسی نہ کسی سے تو من کی مراد پوری ہو جائے گی ناں۔'' بوڑھی عورت نے معنی خیز انداز میں کہا۔

یہ سن کر میرا دماغ سن ہو گیا۔ وہ جو مشورہ دے رہی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے کہ کیا رابعہ باجی کی زندگی میں بدنصیبی کا ایک موڑ آنے والا ہے۔ دل چاہا کہ اس خبیث اور مکروہ صورت بڑھیا کا پیٹ پھاڑ ڈالوں لیکن میں کچھ نہ کر سکی۔ یہ شکر تھا کہ رابعہ باجی کپڑے دھونے میں مصروف تھیں اس لیے انہوں نے کوئی بات نہ سنی تھی اور نہ میں نے انہیں بتائی پھر وہ بڑھیا تو چلی گئی مگر اپنے دماغ کا کیڑا نکال کر وہاں چھوڑ گئی۔

پھر مجھے علم نہ ہوا کہ اس گھر میں اندر ہی اندر کیا کھچڑی پکتی رہی ہے۔ رابعہ باجی بھی لاعلم تھیں۔ ادھر عماد نے ایک روز کھل کر مجھ سے بات کر لی تھی۔ اس کے انداز میں عجلت تھی

''شازیہ..... تمہیں ریحانہ نے میرے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ وہ بھی تمہاری ہر بات مجھے بتا دیتی ہے۔ دیکھو..... اب میرے پاس وقت نہیں ہے میرے والدین ایک جگہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں انہوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتاؤ۔ اگر نہیں ہے تو پھر جلد از جلد ادھر ہی شادی کر لو جہاں ہم کہہ رہے ہیں۔ اب میں فیصلہ کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے تمہارا حتمی جواب چاہیے۔''

میں تو اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ ازحد سنجیدہ تھا۔

''شازیہ پلیز جواب دو۔ تم تیار ہو؟''

''مم..... میں..... ریحانہ کو جواب دوں گی۔'' میں نے ہکلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ تب میں نے ریحانہ کو جواب دے دیا۔

میں نے ریحانہ سے صرف یہ بات کہی تھی کہ اگر عماد سنجیدہ ہے تو وہ اپنے بڑوں کو ہمارے گھر بھیج دے۔ رابعہ باجی کو بھی میری بہت فکر رہنے لگی تھی۔ کم از کم وہ مجھے اس جہنم سے نکالنا چاہ رہی تھیں پھر میری بات طے ہونے میں کوئی مسئلہ نہ ہوا اور میں بہت جلد عماد کی منگیتر بن گئی۔ رخصتی چند ماہ بعد رکھی گئی۔ رابعہ باجی کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد میری رخصتی کی متمنی تھیں۔ تاکہ میری رخصتی کے درمیان کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو جائے اور میری شادی کھٹائی میں پڑ جائے۔

لیکن ایسا کوئی معاملہ نہ ہوا اور میں عماد کی دلہن بن کر رخصت ہو گئی۔ رابعہ باجی نے سکون کی سانس لی تھی۔

ان کا بیٹا سعدان اب اسکول جانے لگا تھا۔ انہیں اپنے بیٹے کی محبت تڑپاتی تھی۔ وہ اکثر مجھ سے سعدان کا ذکر کیا کرتی تھیں۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ میں ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ رابعہ باجی سے اب ہفتوں بعد ہی ملنا ہوتا تھا۔ گھریلو مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ وہ خود بھی مجھے اپنے گھر آنے سے منع کرتی تھیں۔ مجھے معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ان کے گھر میں کیا معاملات چل رہے ہیں۔ رابعہ باجی بھی مجھے نہیں بتاتی تھیں۔ میں پوچھتی تو وہ یہی جواب دیتیں کہ تم اپنے گھر میں خوش رہا کرو۔ بلاوجہ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مطمئن ہو جاتی تھی لیکن مجھے خبر نہ تھی کہ ان پر کیا قیامت بیت گئی ہے۔ ان کے شوہر شاہد صاحب نے ایک اور شادی کر لی تھی۔ یہ شادی کرانے میں شاہد صاحب کی والدہ کا پورا ہاتھ تھا۔ رابعہ باجی یہ بات مجھ سے چھپا رہی تھیں۔ وہ تو اتفاق سے کسی اور ذریعے سے مجھے یہ بات معلوم ہو گئی۔

شاہد صاحب کی نئی بیوی نے رابعہ باجی کا جینا حرام کر رکھا تھا اور وہ سو طرح سے انہیں تنگ کرتی رہتی تھی۔ شاہد صاحب سے جھوٹی شکایتیں کرتی تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس معاملے کا نتیجہ کیا ہوگا اور چند ماہ بعد یہی خدشات واضح ہو گئے۔

رابعہ باجی کو دوسری بار طلاق ہو گئی۔ اب ان کا میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ عماد تو بہت پہلے سے ہمارے حالات سے واقف تھے۔ لہٰذا ہم نے رابعہ باجی کو سہارا دیا اور اپنے گھر لے آئے۔ بچپن سے اب تک مسلسل آزمائشوں اور دکھوں نے رابعہ باجی کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔ وہ کسی سے بھی بات نہیں کرتی تھیں بس چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھیں اور اپنے بیٹے سعدان کو یاد کرتی تھیں۔

ایک روز ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ کال بیل ہوئی۔ ہمارے گھر کی ملازمہ نے دروازہ کھولا اور آ کر بتایا کہ کوئی لڑکا آیا ہے اور رابعہ بی بی سے ملنا چاہتا ہے۔ ہم حیران ہوئے کہ کون ہو سکتا ہے۔ عماد نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا کہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ وہاں ایک خوب صورت نوجوان بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی صورت جانی پہچانی سی لگی۔ اس نے اٹھ کر ہمیں سلام کیا۔ رابعہ باجی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ''تم..... تم..... سعدان تو نہیں.....؟''

لڑکا چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو گئی۔ وہ بولا ''ہاں..... میں سعدان ہوں.....''

رابعہ باجی نے چیخ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ برسوں بعد انہوں نے سعدان کو دیکھا تھا۔ میں نے بھی سعدان کو پیار کیا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کے والد نے

فیروز بھائی کی دوسری بیوی نے ان سے خلع لے لی تھی۔ کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی۔ اس کے والدین نے زبردستی اس کی شادی فیروز بھائی کے ساتھ کر دی تھی۔ فیروز بھائی کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے رابعہ باجی کو طلاق دے کر کتنی بھیانک غلطی کی تھی۔ ان جیسی بیوی انہیں شاید دوبارہ نہیں مل سکتی تھی۔

اس روز کے بعد سعدان کا یہاں مسلسل آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ رابعہ باجی کو تو گویا دوبارہ زندگی مل گئی تھی۔ ان کے چہرے پر دوبارہ لالی دکھائی دینے لگی تھی۔ اپنے جوان بیٹے کو دیکھ دیکھ کر ان کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا۔ ایک روز سعدان نے رابعہ باجی کی عدم موجودگی میں عماد اور مجھ سے کہا۔

''آنٹی میں چاہتا ہوں کہ امی اور ابو پھر سے ساتھ رہا کریں۔ دیکھیں ناں..... وہ دونوں اپنی اپنی جگہ تنہا زندگی گزار رہے ہیں۔ ان دونوں کا آپس میں رشتہ تو باقی نہ رہا لیکن میرا رشتہ تو دونوں سے برقرار ہے۔ انکل..... آپ اور آنٹی کوشش کریں کہ وہ دونوں دوبارہ سے ایک ہو جائیں۔''

''سچ پوچھو تو تم نے ہمارے دل کی بات کہہ دی ہے۔'' عماد بولے ''خود ہماری بھی یہی خواہش تھی۔ بہرحال تم فکر نہ کرو۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ ایسا ہو جائے۔'' میں نے بھی اس بات پر خوشی اور رضامندی ظاہر کی۔ یہ آسان نہ تھا۔ رابعہ باجی کو فیروز بھائی سے دوبارہ نکاح کرنے پر راضی کرنا تقریباً ناممکن ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہ کام صرف سعدان ہی کر سکتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے باپ یعنی فیروز بھائی سے بات کی۔ تھوڑی جھجک اور پس و پیش کے بعد وہ راضی ہو گئے تھے۔ اب صرف رابعہ باجی باقی تھیں۔ سعدان جب بھی آتا تھا تو اپنی ماں سے اپنے والد کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ ان کے دل میں باپ کے لیے جگہ بنانا چاہتا تھا۔ پہلے پہل تو رابعہ باجی فیروز بھائی کا نام سننے کی روادار نہ تھیں مگر اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر باتیں کرنے لگیں۔ یہ معاملہ کئی مہینوں تک چلتا رہا۔ آخر پروگرام کے مطابق ہم لوگوں نے فیروز بھائی اور رابعہ باجی کو ایک تقریب میں اکٹھے کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے۔

''رابعہ..... تم..... تم.....؟'' فیروز بھائی کے حلق سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

رابعہ باجی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم لوگ ان سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

''کیسی ہو تم؟'' فیروز بھائی نے ہی ہمت کر کے دوبارہ کہا۔

اقوال اولیاء

۱۔ ریاضت کی تلواروں کے ساتھ اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرو۔ (حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ)

۲۔ جس نے اپنے اعضا کو شہوات دے کر خوش کیا اس نے دل میں ندامتوں کا درخت لگایا۔ (ابو یحییٰ وراقؒ)

۳۔ جب تم خاموش رہنا چاہو تو اس وقت کلام کرو، اور جب تم کلام کرنا چاہو تو خاموش ہو جاؤ۔ (حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ)

۴۔ جس نے اللہ سے محبت کی وہ زندہ رہا اور جس نے دنیا کی طرف میلان رکھا وہ محروم رہا۔ (حضرت سری سقطیؒ)

۵۔ سب سے عمدہ اور بلند پایہ مجلس وہ ہے جو میدان توحید میں فکر کے ساتھ بیٹھی ہو۔ (حضرت جنید بغدادیؒ)

۶۔ جب تک انسان طلب علم میں رہتا ہے وہ عالم ہوتا ہے اور جب یہ گمان کر لیتا ہے کہ میں عالم بن چکا، اس وقت وہ جاہل ہوتا ہے۔ (حضرت عبداللہ بن مبارکؒ)

۷۔ نفس سے مقابلہ کرنے سے بڑھ کر مجھے کچھ زیادہ سخت بات محسوس نہیں ہوئی۔ کبھی میں غالب آیا اور کبھی یہ نفس غالب رہا۔ (حضرت سفیان ثوریؒ)

مرسلہ: قیصر شاہ، گمبٹ کوہاٹ

صحیح غلط

شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ ہمارے پنجاب میں ''نے'' کا غلط استعمال رواج پا چکا ہے اکثر خطیب اور ادیب اس کے عادی ہیں ''میں نے کراچی جانا ہے۔'' یا ''میں نے کھانا کھانا ہے'' ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے، صحیح فقرہ یہ ہے کہ مجھے کراچی جانا ہے یا مجھے کھانا کھانا ہے۔

رشید احمد صدیقی بتاتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ بحث اٹھائی گئی کہ پنجاب میں جو یہ ''میں نے جانا ہے'' یا اس قسم کے دوسرے فقرے بولے جاتے ہیں انہیں غلط کیوں نہ قرار دیا جائے۔ اس محفل میں پطرس بھی تھے۔ بولے ''اس بات کو چھوڑیے یہ غلط ہو یا صحیح۔ ان فقروں کی ایک خوبی بے حد مشکل ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی پہچانا جاتا ہے۔''

مگر اب تو پہچان ہی ختم ہو گئی ہے پاکستان میں ایسی ہی اردو کا رواج جڑ پکڑ چکا ہے۔ ہر شخص بے تکان اسی طرح بولتا اور لکھتا ہے۔ خواہ وہ کہیں کا بھی رہنے والا ہو۔ اچھے بھلے تعلیم یافتہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے وہ بھی بلا جھجک ایسی ہی اردو لکھتے ہیں اور بولتے ہیں اور اسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ٹی وی کا انداز بھی یہی ہے اور بچے یہیں سے زیادہ علم حاصل کرتے ہیں۔ یہ ''نے'' اب پاکستانی ادب میں کچھ یوں رچ بس گیا ہے کہ اسے واپس نکالنا ناممکن ہو گیا ہے۔

''ٹھیک ہوں۔'' بمشکل رابعہ باجی کے منہ سے آواز نکلی۔

''سعدان تمہارا بہت ذکر کرتا رہتا ہے۔'' فیروز بھائی نے اب خود کو قدرے سنبھال لیا تھا۔

رابعہ باجی وہاں سے کھسکنے کے چکر میں دکھائی دے رہی تھیں کہ ہم لوگ ان کے پاس آپہنچے۔ سعدان بھی آ گیا تھا۔ فی الحال اتنا ہی بہت تھا۔ آخر چند روز بعد میں نے اور عماد نے رابعہ باجی سے کھل کر بات کر لی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ سعدان کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے امی۔ اگر آپ ایسا نہیں چاہتی ہیں تو پھر میں آئندہ آپ سے ملنے کبھی نہیں آؤں گا۔'' رابعہ باجی تڑپ اٹھیں ''ایسا..... ایسا مت کہو.....''

''پھر فائدہ ہی کیا آپ سے ملنے کا۔ آپ میری ایک خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔''

رابعہ باجی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ ہمارے لیے اتنا اشارہ کافی تھا۔

اور اس طرح رابعہ باجی اور فیروز بھائی کا دوبارہ نکاح ہو گیا۔ رابعہ باجی ایک بار پھر اسی گھر میں چلی گئیں۔ اب وہ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ خوش رہ رہی تھیں۔ رابعہ باجی بہت جلد اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں۔ سعدان کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ لہٰذا بات آگے بڑھائی گئی اور بات پکی کر دی۔ چند ہی ماہ بعد شادی تھی۔ رابعہ باجی بہت خوش تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کی شادی کر رہی تھیں۔ ہمیں بھی ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھ کر مسرت ہو رہی تھی۔

شادی والے روز گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ فیروز بھائی نے اپنے کسی خاص کاروباری ساتھی اور اس کی فیملی کو بھی بلایا تھا اور رابعہ باجی کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ ان لوگوں کو خصوصی اہمیت دی جائے۔ یہ بات انہوں نے میرے سامنے کہی تھی لیکن کام اتنے زیادہ تھے کہ ہم گھن چکر بنے ہوئے تھے لہٰذا یاد نہیں رہا۔ بارات روانگی کے لیے تیار تھی۔ میں ایک کام کے سلسلے میں رابعہ باجی کو تلاش کر رہی تھی لیکن وہ اتنے لوگوں میں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ تب میں ان کے کمرے کی طرف بڑھی کہ شاید وہ کسی کام سے یہاں آ گئی ہوں۔ جیسے ہی میں نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا کہ ایک گھٹی گھٹی چیخ سن کر ٹھٹک گئی۔ ساتھ ہی فیروز بھائی کی غراہٹ آمیز آواز ابھری۔

''کتیا کی بچی۔ کوئی بات نہیں بیٹھتی تیری کھوپڑی میں۔ بولا بھی تھا کہ ناصر صاحب اور ان کے گھر والوں کا خاص خیال رکھنا..... مگر نجانے تیرا دھیان کس میں لگا ہوا تھا۔ وہ ناراض ہو کر چلے گئے ہیں۔ اب کتنا نقصان ہو جائے گا مجھے۔ اس کا اندازہ ہے تجھے۔ میک اپ کر کے ادھر سے ادھر پھر رہی ہے لونڈیوں کی طرح۔''

پھر ایک دم دروازہ کھل گیا اور فیروز بھائی کا لال بھبوکا چہرہ نظر آیا۔ میں گھبرا کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔ انہوں نے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورا اور کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ میں تیزی سے کمرے میں پہنچی۔ رابعہ باجی پیٹ دبائے قالین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار نمایاں تھے۔

''باجی.....'' میں تڑپ کر آگے بڑھی اور انہیں سنبھالنے لگی۔

''اس..... اس نے مجھے..... لات..... ماری ہے..... آہ..... بہت درد ہو رہا ہے..... شا..... شازی.....'' ان کی زبان بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ معاملہ سیریس معلوم ہوتا تھا۔ میں اٹھ کر باہر بھاگی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا ہے۔ باہر لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور یہاں..... میں نے اپنے حواسوں کو مجتمع کیا اور صرف عماد کو بلا لائی لیکن جب ہم کمرے میں پہنچے تو رابعہ باجی زندگی کی بازی ہار چکی تھیں۔ وہ بے حس و حرکت قالین پر پڑی تھیں۔

اس سانحے کو ہم چھپا بھی نہیں سکتے تھے۔ سب کو آناً فاناً خبر ہو گئی۔ فیروز بھائی نے رابعہ باجی کے اس زور سے لات ماری تھی کہ ان کا پتا بھی پھٹ گیا تھا اور زہر نے فی الفور اپنا کام دکھا دیا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ انہوں نے ایک بار رابعہ باجی سے کہا تھا کہ تو مرے گی میرے ہی ہاتھوں..... اور ایسا ہی ہوا۔ رابعہ باجی کی قسمت پر میں حیران تھی۔ ان کا فیروز بھائی سے رشتہ ختم ہو گیا تھا پھر انہوں نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرے شوہر کے ساتھ بھی انہوں نے خاصا عرصہ گزارا۔ اولاد نہ ہونے پر انہوں نے بھی طلاق دے دی۔ ان کے بیٹے نے اپنے ماں باپ کو ملانے کے لیے پل کا کام کیا اور وہ دونوں دوبارہ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے اور آخر کار اپنے پہلے شوہر کے ہاتھوں ہی ان کی موت واقع ہوئی۔ کیا نصیب تھا رابعہ باجی کا۔

سعدان کی شادی کا وہ وقت مجھے بھلائے نہیں بھولتا۔ ایک طرف بیٹا دولہا بنا تھا' دوسری جانب ماں کی میت رکھی تھی اور تیسری جانب پولیس اس کے باپ کو لے جا رہی تھی۔ ایک ہی گھر میں' ایک ہی موقع پر کیا آپ نے کبھی یہ تین رخ دیکھے ہیں؟

●●●●

میرے خدا! میں نے کبھی محبت کا ایسا عذاب نہ دیکھا نہ سنا۔

اس نے میرے ہاتھ میں پستول دے دیا تھا اور خود میرے سامنے دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ''اس پستول میں دو گولیاں ہیں۔'' اس نے کہا ''چلو۔ اب مجھ پر گولیاں چلاؤ۔''

''کیا کہا' تم پر گولیاں چلاؤں؟''

''ہاں' تم نے سنا نہیں' چلاؤ پستول.....'' وہ زور سے بولا۔

اس وقت اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا اور آنکھیں ایک وحشت کے عالم میں سرخ ہو رہی تھیں۔ ''عرفان! یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' میں نے پریشان ہو کر کہا ''میں تم پر گولی کیسے چلا سکتی ہوں؟''

''ٹھیک ہے' نہ چلاؤ' میں خود اپنے آپ کو مار لیتا ہوں'' اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے پستول چھین لیا تھا۔

اس نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ لیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ بلا درجے کا جنونی۔ وہ واقعی اپنے آپ کو مار لے گا اس لیے میں اسے روکنے کے لیے اس کے بازو سے لٹک گئی۔ میں پاگلوں کی طرح پستول چھیننے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے کتنی مشکلوں سے اس کے ہاتھ سے پستول لیا تھا۔ میں بے دم سی ہو کر ایک طرف نڈھال ہو کر بیٹھ گئی جبکہ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی بھی سانسیں پھول رہی تھیں اور آنکھوں میں ابھی تک بلا

مکرمی معراج صاحب، آداب!

ہر شخص کی فطرت الگ ہوتی ہے اور اسے تبدیل کرنا کسی انسان کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ مگر بعض اوقات آپ کو اپنی زندگی خوشگوار اور پرسکون بنانے کے لئے کچھ ایسی حرکات بھی کرنی پڑتی ہیں جو آپ کی فطرت کے خلاف ہوں۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے محبت کرنے والا ''پاگل'' شوہر ملا، مگر ساتھ ہی اس کے پاگل پن کا علاج بھی۔ ہوسکتا ہے یہ نسخہ کسی اور بھائی یا بہن کے کام آجائے۔

آپ کی دعاؤں کی طالب

کنول عرفان، کراچی

عشق بلا خیز

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کا وحشیانہ پن تھا۔

''عرفان! یہ کیا پاگل پن ہے۔'' میں نے تقریباً روتے ہوئے پوچھا ''تم کیوں ایسا کر رہے ہو؟''

''سیدھی سی بات ہے' میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ تم کسی اور کی طرف دھیان دو۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں نے کس کی طرف دھیان دیا ہے؟''

''وہ راستے میں جو ملا تھا۔ تم اس سے کتنا لہک لہک کر باتیں کر رہی تھیں'' اس نے کہا۔

''حد کر دی تم نے' وہ میرے بڑے ماموں زاد بھائی ہیں۔ مجھ سے کم از کم دس پندرہ برس بڑے ہیں۔ ان سے بڑے بھائی کا رشتہ ہے میرا..... اور تم ان کے لیے ایسی بات کہہ رہے ہو۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے علاوہ کوئی اور تمہاری طرف دھیان دے۔ اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں تو کچھ نہیں کہوں گا لیکن اپنے آپ کو ضرور مار لوں گا۔''

میں پاگل ہو گئی تھی۔

پاگل تو شاید میں اس وقت ہوئی تھی جب میں نے عرفان جیسے شخص سے محبت کی تھی۔ مجھے اسی وقت اس کے اس مزاج کا اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔ اس دوستی کی ابتدا کالج سے ہوئی تھی۔ ہم ساتھ تھے۔ اس کالج میں میرا پہلا مہینہ تھا کہ یہ احساس ہونے لگا کہ کسی کی نگاہیں میرا طواف کرتی رہتی ہیں۔ کوئی ہے جو مجھے مستقل دیکھتا رہتا ہے۔

میں نے جب ایک دن براہِ راست اس سے اس حرکت کی وضاحت چاہی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا ''محترمہ! آپ نے اتنے دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں کسی اور کی طرف نہیں دیکھتا ہوں۔''

''تو پھر.....؟''

''پھر یہ کہ میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔''

''کیا!'' میں غصے اور حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟''

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے اور میں ایک بار جو بات کہہ دوں' اس پر زندگی بھر قائم رہتا ہوں۔''

''میں پرنسپل سے تمہاری شکایت کر کے تمہیں کالج سے نکلوا دوں گی۔''

''اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا'' اس نے کہا۔ ''میں اس کے باوجود تم سے محبت کرتا رہوں گا۔''

''میں اپنے باپ بھائیوں سے کہہ کر تمہاری ٹانگیں تڑوا دوں گی۔''

''تم کچھ بھی کر لو۔ تم میرے دل سے اپنی محبت ختم نہیں کر سکو گی۔ میں ایک جنونی انسان ہوں اور ایسا آدمی جب کسی کو اپنانے کا فیصلہ کر لے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔''

میں غصے اور صدمے سے اس کے پاس سے چلی آئی۔ ایسے آدمی کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔

لیکن اس سے میری جان نہیں چھوٹی تھی۔ اس نے مجھے پورے کالج میں بدنام کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کہتا پھرتا تھا کہ کنول اس سے محبت کرتی ہے اور عن قریب ہم دونوں ایک ہونے والے ہیں۔

میں یہ افواہیں سن سن کر غصے سے کھولتی رہتی تھی۔ ایک دن کالج کے احاطے میں میری اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں اس وقت انتہائی غصے میں تھی۔ اس کی بکواس نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ ''مسٹر! یہ تم میرے خلاف کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''میں تمہارے خلاف تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔'' اس نے کہا ''میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''میں پوچھتی ہوں تم میرے لیے کیا بکواس کرتے پھر رہے ہو۔ کون تم سے محبت کرتا ہے؟''

''میں..... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''شرم نہیں آتی تمہیں اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے؟''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو بلکہ سب سے یہی کہا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ کسی بھی حال میں غلط نہیں ہے۔''

''لیکن میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔''

''یہ تمہارا معاملہ ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا ''لیکن میں اسی طرح رہوں گا۔ چاہے تم مجھے جان سے مروا دو' میں یہی کہتا رہوں گا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

اور اسی وقت میں نے اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

اس وقت کچھ لڑکے اور لڑکیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے بھی یہ واقعہ دیکھ لیا تھا۔ تھپڑ کھانے کے بعد اس نے یقین نہ کرنے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تم واقعی مجھ سے نفرت کرتی ہو؟''

''ہاں..... میں نفرت کرتی ہوں۔''

''اوکے'' اس نے کہا اور بالکل پاگلوں کے انداز میں

قریب کے ایک درخت سے اپنا سر ٹکرانا شروع کر دیا۔

میں یہ سمجھی کہ وہ ڈراما کر رہا ہے لیکن اس کا سر پھٹ گیا تھا اور تازہ تازہ سرخ خون نے اس کے پورے چہرے کو رنگین کر دیا تھا۔

قریب کھڑے ہوئے ایک دو لڑکوں نے آگے بڑھ کر بڑی مشکل سے اسے روکا تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے اپنا کیا حشر کر لیتا۔ میرا یہ حال تھا جیسے پتھر کی بن گئی ہوں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ نہ جانے اس وقت کتنی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

میں جب ہوش میں آئی تو بس یہ کر سکی کہ بھاگتی ہوئی اپنی کلاس میں آ گئی۔

اس کم بخت نے پورے کالج میں مجھے تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ میں جدھر سے گزرتی آوازیں سنائی دیتیں۔ کالج کے اسٹاف تک بھی یہ کہانی پہنچ چکی تھی۔

ایک دن میری ایک ٹیچر نے مجھ سے اس معاملے پر بات کی۔ ''کنول! آخر یہ کیا کہانی ہے؟''

''پتا نہیں مس!'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے پھر میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔

''یہ تو بہت ہی خطرناک بات ہے۔'' ٹیچر نے کہا۔ ''وہ لڑکا مجھے نفسیاتی مریض معلوم ہوتا ہے۔''

''تو پھر بتائیں' میں کیا کروں..... وہ تو زبردستی میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اس دن میں نے اسے تھپڑ مار دیا تھا' جس کی وجہ سے اس نے اپنا یہ حال کر لیا ہے۔''

''اگر ایسی صورتِ حال ہے تو وہ اپنے آپ کو جان سے بھی مار سکتا ہے۔''

''وہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کس طرح اس سے جان چھڑواؤں۔''

''دیکھو' میں پرنسپل سے مشورہ کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔''

دوسرے دن کالج کی ایک لڑکی شبانہ نے مجھے پکڑ لیا۔ ''کنول! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ ہاف ٹائم میں ہم کینٹین میں ملیں گے۔ پھر میں تمہیں اصل صورتِ حال بتاؤں گی۔''

''کیسی صورتِ حال؟''

''تم آؤ گی تو سب معلوم ہو جائے گا۔''

شبانہ وہ لڑکی تھی' جسے میں دو چار بار عرفان کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔ اسی لیے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شاید اسی موضوع پر بات کرنے والی ہے اور جب میں ملی تو میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ شبانہ نے کہا ''کنول! تمہیں یقین ہو جانا چاہیے کہ عرفان ایک اچھا لڑکا ہے۔''

''کیا تم اس کے بارے میں یہی بتانا چاہتی ہو۔ اسی لیے بلایا ہے مجھے؟''

''پہلے تم میری پوری بات سن لو۔ اس کے بعد اپنے ردِعمل کا اظہار کرنا۔''

''چلو کہو۔''

''چپ چاپ سنتی رہنا۔ وہ ایک مہذب اور معزز گھرانے کا لڑکا ہے۔ تم کو تو یہ معلوم ہوگا کہ میں اس کی دوست ہوں۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ اور بھی دو چار لڑکیاں اس کے آگے پیچھے رہتی ہیں۔ اب یہ کوئی چھپانے والی بات نہیں ہے۔ ہم نے اسے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جانتی ہو اس نے ہمیں کیا جواب دیا؟''

''تم ہی بتاؤ۔''

''اس نے کہا کہ وہ ہم لوگوں سے دوستی تو کر سکتا ہے لیکن ہمارے لیے سنجیدہ نہیں ہو سکتا' کبھی بھی نہیں اور شادی وہ اسی سے کرے گا جس کو دیکھتے ہی وہ بے قابو ہو جائے' جس پر اپنا سب کچھ قربان کر دے' جس پر وہ اپنی جان دے دے اور ایسی لڑکی تم اسے ملی تھیں اسی لیے وہ تمہیں دیکھتے ہی پاگل ہو گیا ہے اور وہ ہر حال میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

''کمال ہے' کیا میں بازار میں فروخت ہونے والی کوئی ایسی چیز ہوں جس کو وہ زبردستی حاصل کر لے گا'' میں نے کہا۔ ''کیا کر لے گا وہ میرا؟ کیا مجھے جان سے مار دے گا؟''

''نہیں' ہرگز نہیں'' شبانہ نے کہا ''وہ تمہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا' کبھی نہیں بلکہ اپنے آپ کو مار لے گا۔ جس طرح درخت سے سر ٹکرا ٹکرا کر اس نے اپنا سر پھاڑ لیا تھا۔ وہ تم پر خراش بھی نہیں آنے دے گا۔ چاہے خود اس کے ساتھ جو بھی ہو جائے۔''

''تم شاید اس کا یہی پیغام لے کر میرے پاس آئی ہو؟''

''تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو۔ میں تمہیں تصویر کا وہ رخ دکھانے آئی ہوں جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہے۔''

''وہ رخ کیا ہے۔''

''وہ رخ یہ ہے کہ تم اگر اسے نہیں ملیں تو وہ خودکشی کر لے گا اور تم اس کا جنون دیکھ ہی چکی ہو۔''

''یہ تو اچھی زبردستی ہے۔'' میں پریشان ہو کر بولی۔ ''تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

''یا تو اسے قبول کر لو یا پھر اس کی موت کی خبر سن لینا۔''

شبانہ تو ایسی باتیں کر کے چلی گئی لیکن میں سولی پر لٹک گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس کم

بخت نے عجیب ماحول پیدا کر دیا تھا۔

میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب مجھے اپنے گھر والوں سے مشورہ لے لینا چاہیے۔

میں نے اپنی امی سے تذکرہ کیا۔ امی نے ابو اور دونوں بھائیوں کو بتا دیا۔ انہوں نے مجھے بلا کر صورت حال معلوم کی۔ اس وقت مجھے اتنی شرم آ رہی تھی کہ بتا نہیں سکتی۔ عرفان نے مجھے کس حال کو پہنچا دیا تھا۔

''ہاں بیٹا! بتاؤ یہ کیا سلسلہ ہے؟'' ابو نے پوچھا۔

میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ کس طرح میرے پیچھے پڑا تھا اور اس کے جنون کی کیا کیفیت ہے۔ وہ کتنا پاگل قسم کا آدمی ہے۔ یہ سب سن کر وہ سب سوچ میں پڑ گئے تھے۔

''میں اس کی ٹانگیں تڑوا دوں گا۔'' میرے بڑے بھائی نے غصے سے کہا۔

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بھائی۔ کیونکہ وہ ایک جنونی آدمی ہے۔ وہ اپنی ٹانگیں تڑوا لے گا لیکن اپنے ارادے سے باز نہیں آئے گا۔''

''ارے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں'' چھوٹے بھائی نے کہا ''تم بے فکر ہو جاؤ' ہم اسے دیکھ لیں گے۔''

''ہاں بیٹا! اور تم احتیاطاً کچھ دنوں تک کالج نہیں جاؤ گی۔''

میں نے یہی کیا۔ کالج سے چھٹی لے کر بیٹھ گئی۔ میں اس شخص کا سامنا ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

لیکن یہ احتیاط بھی اس شخص کا راستہ نہیں روک سکی۔ دس بارہ دنوں کے بعد اس کے گھر والے اچانک ہمارے یہاں آ گئے۔ انہوں نے جب اپنا تعارف کروایا کہ وہ کون ہیں تو ہم سب حیران رہ گئے تھے۔ وہ سب واقعی بہت مہذب اور معقول تھے۔

''جناب!'' عرفان کے باپ نے ابو سے کہا ''ہم سب بہت شرمندہ ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے ہماری بات نہیں مانی تو عرفان اپنی جان دے دے گا' وہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔''

''لیکن آپ کے صاحبزادے حرکتیں کیسی کر رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں کر رہا۔ وہ صرف اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اب تک آپ کی بیٹی سے کوئی بدتمیزی نہیں کی ہوگی۔''

ان کی بات درست بھی تھی۔ عرفان نے ابھی تک کسی قسم کی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ مجھے ہر حال میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''ہم سب اس کی طرف سے بہت پریشان ہیں'' اس کے باپ نے کہا ''اس نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ کی صاحبزادی سے اس کی شادی نہیں ہوئی تو وہ اپنی جان دے دے گا اور وہ واقعی ایسا ہی کرے گا۔ کیونکہ ہم سب اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہیں۔''

پھر انہوں نے بتایا کہ عرفان اور اس کے گھر والوں کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ شاندار مکان' بزنس' گاڑیاں..... یعنی وہ سب کچھ جو ایک خوش حال گھرانے کے پاس ہوتا ہے۔

ہمارے خاندان والوں کی میٹنگ بیٹھ گئی تھی۔ اکثریت کا یہ خیال تھا کہ جب ایسا رشتہ خود چل کر آیا ہے تو ہمیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں نہ کہیں تو میری شادی ہوتی ہی تھی۔ تو کیوں نہ وہاں ہو جائے جو مجھ پر جان دیتا ہے۔

بہر حال کئی ہنگاموں اور عرفان کی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے میری اس سے شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد اس کی محبت میں اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ میری مرضی میرے اشارے کا منتظر رہتا۔ میری ذرا سی ناراضگی اس کے لیے عذاب بن کر رہ جاتی۔ پتا نہیں' اس کے ساتھ یہ کیا سلسلہ تھا۔ میں نے کبھی اتنی پاگل پن والی محبت نہیں دیکھی تھی۔

عالم یہ تھا کہ وہ میرے قریب کسی اور کے سائے تک کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ مجھے تو وہ کبھی کبھی کہتا لیکن جنونیوں کی طرح اپنے آپ کو سزا دینے لگتا تھا۔ اپنے آپ کو مارا کرتا اور نہ جانے کیا کیا کرتا۔

اور اس دن اس نے انتہا کر دی۔ جب میرے ماموں زاد بھائی نے راستے میں مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھ سے رک کر باتیں کی تھیں۔ اس نے گھر واپس آ کر ایک پستول میری طرف بڑھا دیا کہ میں اسے گولی مار دوں۔

اب مجھے سنجیدگی سے سوچنا تھا کہ کیا ایسے آدمی کے ساتھ زندگی گزر سکتی ہے۔ یا میں اس سے نجات حاصل کر لوں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ اگر میں نے اس قسم کی کوئی بات کی تو شاید یہ اسی وقت خودکشی کر لے گا۔

میں نے اپنے جس ماموں زاد بھائی کا ذکر کیا ہے۔ وہ بہت کمال کے آدمی تھے۔ بہت پڑھے لکھے' نفسیات ان کا خاص شعبہ تھا۔ اس کے علاوہ روحانیت سے بھی انہیں شغف تھا۔ خاندان کے لوگ اپنی زندگی کے پیچیدہ مسائل کے مشورے کے لیے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ یہ مسئلہ بھی

میری زندگی کا ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔

اپنے ماموں کے گھر کا فون نمبر مجھے معلوم تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ دوسری طرف سے فہد بھائی ہی نے فون اٹھایا تھا ''ارے کنول! تم..... تم نے کیسے فون کر لیا؟''

''فہد بھائی! میں آپ سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا ''لیکن کہیں اور..... اور بہت خاموشی اور رازداری کے ساتھ۔ ورنہ میری زندگی عذاب ہو جائے گی۔''

''خدا خیر کرے۔ کیا کوئی ایسا معاملہ ہے؟''

''جی ہاں' میں اس وقت بہت عذاب میں ہوں۔''

فہد نے ایک پتا بتا دیا کہ میں وہاں پہنچ جاؤں۔ وہ ان کے کسی دوست کا گھر تھا۔

میں نے امی سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ عرفان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے تھے ''کنول! تمہارا شوہر نفسیاتی طور پر ایک نفسیاتی مریض ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''جی ہاں۔ یہ تو میں بھی سمجھ گئی ہوں لیکن اس کا علاج کیا ہو؟''

تم اس کے اس پاگل پن کو اس کے حربے سے ختم کر دو'' فہد بھائی نے مشورہ دیا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''تم بالکل وہی کرو جو وہ کرتا ہے' اسی انداز کی ..... رفاقت' شک اور جنونی کیفیت۔ پھر دیکھو اس کا کیا ردِعمل ہوتا ہے۔''

''لیکن میں یہ کیسے کر سکتی ہوں' وہ میرا مزاج تو جانتا ہے۔''

''مزاج بدلتے ہوئے دیر تو نہیں لگتی۔ تمہیں شدید قسم کا ڈراما کرنا پڑے گا۔ تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ تم پر بھی وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو اس پر ہے۔''

''فہد بھائی' کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ الٹ ہو جائے' پھر میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔''

''تم تو ویسے بھی کہیں کی نہیں ہو'' فہد نے کہا ''ایسے آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا عذاب سے کم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بہانے وہ سدھر ہی جائے۔''

فہد بھائی بہت دیر تک مجھے سمجھاتے رہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔

پھر میں نے بھی یہ سوچ لیا کہ فہد بھائی کے مشورے پر عمل کر کے دیکھ لیتی ہوں۔ اگر بات بن گئی تو ٹھیک ہے ورنہ عرفان کو سدھارنے کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔

اس کے بعد میں نے اس پر اپنی توجہ اور محبت کی انتہا کر دی۔

وہ دفتر جانے لگتا تو میں بھاگ کر اس کے جوتے لے آتی۔ تولیہ اور کنگھی وغیرہ لیے اس کے سامنے کھڑی رہتی۔ وہ دیر سے آتا تو اس کے انتظار میں کھڑی رہتی۔ ایک دن اس نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا ''کنول! کیا ہو گیا ہے تمہیں' تم یہ کیا کرنے لگی ہو؟''

''کچھ بھی تو نہیں۔''

''تو پھر اتنی توجہ..... اتنی خدمت..... آخر کس لیے؟''

''عرفان۔ تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو تو کیا میں تم سے محبت نہیں کر سکتی'' میں نے کہا ''کیا محبت پر میرا حق نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں ہے'' وہ مسکرا دیا ''لیکن یہ سب کچھ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔''

''کچھ دنوں کی بات ہے۔ جب میرے اس رویے کے عادی ہو جاؤ گے تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تو پھر میرا خیال ہے کہ میں اس دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہوں۔''

''اس میں کیا شک ہے'' میں مسکرا دی۔

ابھی تک معاملہ بے پناہ خدمت اور توجہ کا چل رہا تھا۔ مجھے اپنا جنون دکھانے کا موقع اس دن ملا جب عرفان کی شادی شدہ خالہ زاد بہن نعیمہ اپنے شوہر کے ساتھ ہمارے یہاں آئی۔

عرفان اور نعیمہ بچپن میں ایک دوسرے کے ساتھ رہے تھے۔ اس لیے ایک دوسرے سے مانوس بھی تھے اور دونوں لپک لپک کر ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے اور میں اپنے ڈرامے کو کلائمکس تک پہنچانے کے لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔

میں نے اپنے دوپٹے کو بل دے کر رسی سا بنا لیا اور اس کا ایک سرا سیڑھی پر چڑھ کر پنکھے سے باندھ دیا۔ یہ ایک احمقانہ سا مظاہرہ تھا۔ میں نے اتنی دیر لگائی تھی کہ عرفان کمرے میں آ جائے اور ہوا بھی یہی' میں جیسے ہی دوپٹے کا دوسرا سرا اپنے گلے میں ڈالنے والی تھی کہ عرفان کمرے میں آ گیا۔

ایک لمحے کے لیے تو وہ سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ پھر اس نے جھپٹ کر وہ دوپٹا پنکھے سے کھینچ لیا ''کنول! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' اس نے مجھے سنبھالتے ہوئے پوچھا ''تم یہ کیا کر رہی ہو؟''

''میں اپنی جان دے رہی ہوں۔'' میں نے اس کی

گرفت سے نکلنے کی کوشش کی ''چھوڑ دو مجھے۔''

''آخر کیوں' یہ کیا پاگل پن ہے؟''

''یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو..... خود کو نہیں دیکھتے' نعیمہ سے اتنا گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔''

''تو کیا ہوا' وہ میری خالہ زاد بہن ہے۔ ہم برسوں ساتھ رہے ہیں۔''

''میں یہ سب نہیں جانتی'' میں نے کہا ''میں برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی دوسرا تمہارے قریب بھی آئے۔''

عرفان کی حالت اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ مجھ پر یہ کس قسم کا دورہ پڑا ہے؟

''کنول! آئندہ سے ایسا مت کرنا'' اس نے کہا ''اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو پھر میرا کیا ہوگا؟''

''تو پھر تم بھی احتیاط رکھو۔ میرے سامنے ایسی کوئی بات نہ کرو کہ میرے دل کو ٹھیس پہنچے۔''

اس کے بعد بھی میرا بالکل وہی رویہ رہا۔ جو اس کا ہوا کرتا تھا۔ میں نے ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ راہ چلتے ہوئے اگر کسی کی طرف دیکھ بھی لیتا تو میں گھر آ کر اپنے آپ کو مارنے لگتی تھی۔ ایک بار میں نے دیوار سے سر ٹکرا کر اپنا سر بھی پھاڑ لیا تھا۔ اس کے بعد عرفان واقعی بہت پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اپنا جنون وغیرہ بھول کر اب میری دل جوئی میں لگا رہتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ میں ہرٹ نہ ہوں۔

اور جب یہ صورتِ حال اسی طرح چلتی رہی تو اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے ''خدا کے لیے کنول! اب یہ سب مت کرو۔ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ تمہاری اس احمقانہ محبت نے مجھے عذاب میں ڈال دیا ہے۔''

''تم میری اس محبت کو احمقانہ کہہ رہے ہو'' میں نے رونا دھونا شروع کر دیا۔

''ہاں یہ حماقت ہے'' وہ غصے سے بولا ''جب تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو پھر تم یہ سب کیوں کرتی ہو۔ میں تم سے کہاں بھاگا جا رہا ہوں۔ تمہارے قریب ہی تو ہوں۔''

''وہ مارا!'' میں دل ہی دل میں مسکرا دی۔ لوہا گرم ہو چکا تھا اور اب اس پر چوٹ لگانے کی دیر تھی ''تو پھر عرفان صاحب! آپ کا خود اپنے رویے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کیا مطلب.....''

''مطلب یہ کہ آپ بھی تو یہی سب کرتے آئے ہیں۔ جو آج میں کر رہی ہوں۔ کیا میں پاگل نہیں ہوئی؟ کیا میں آپ کی ان حرکتوں کی وجہ سے کنفن کا شکار نہیں ہوئی۔ کیا میں آپ کی ایسی اداؤں کو دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہوں!''

''اوہ گاڈ!'' عرفان نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ''تو یہ میری محبت کا جواب دیا ہے تم نے؟''

''ہاں۔ تمہاری جنونی محبت کا اور اب شاید تمہیں یہ احساس ہو گیا ہو کہ تمہارے اس رویے سے مجھے کتنی تکلیف پہنچتی تھی۔ میں کتنی کنفن کا شکار ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہ ہو۔ تمہاری آنکھیں ہر وقت میری نگران رہتی تھیں۔ تمہاری جنونی محبت نے مجھے قیدی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب بتاؤ' اب تمہیں کیسا محسوس ہوا؟''

''بہت برا'' عرفان مسکرا دیا ''سوری کنول! مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میری یہ محبت تمہارے لیے اتنی تکلیف دہ ہو رہی ہوگی۔''

''یہ تو کامن سنس کی بات ہے عرفان!'' میں نے کہا۔

''چلو' یہ میرا وعدہ ہے' اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں خود پر کنٹرول کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''چلو' میں بھی وعدہ کرتی ہوں کہ جیسا تمہارا رویہ ہوگا ویسا ہی میرا بھی ہوگا۔''

فہد بھائی کی بتائی ہوئی ترکیب کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ عرفان اب راہِ راست پر آ گیا ہے۔ میرا مطلب ہے' اب جنون والی وہ کیفیت نہیں رہی۔ محبت تو اب بھی اسی انداز سے کرتا ہے لیکن اس نے برداشت کرنا سیکھ لیا ہے۔

اب جب ہم کہیں جاتے ہیں اور کوئی مجھے دیکھتا ہے تو ایک لمحے کے لیے تو اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگتا ہے پھر وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتا ہے اور مسکرا کر میری طرف دیکھتا ہے ''کیوں بھئی' اب تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں' بالکل ٹھیک ہے'' میں بھی مسکرا کر جواب دیتی ہوں۔

اس کہانی کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر آپ بھی ایسے کسی شخص سے محبت کرتی ہیں یا ایسے کسی شخص کے ساتھ آپ کی شادی ہونے والی ہے تو ذرا سوچ سمجھ لیں۔

کوئی ضروری نہیں ہے کہ فہد بھائی کا فارمولا آپ کے لیے بھی کامیاب ہو جائے۔ آپ کے ساتھ صورت حال کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے جنونی قسم کے لوگوں کے ساتھ زندگی واقعی بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اپنی حکمتِ عملی اور ہمت سے اس زندگی کو گلزار بنا لیا ہے لیکن کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ بھی اس امتحان میں کامیاب ہو سکیں۔

''آج ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم سے!''

''تو کہیے..... اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے؟''

''مجھے ماہ نور کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔''

''کیا آپ اس کی شادی کے لیے فکر مند ہو رہے ہیں؟''

''ہوں۔''

''لیکن اس میں فکر مندی کی اور اتنی سنجیدگی کی کیا بات ہے؟ وہ جب چھوٹی ہی تھی تو آپ نے اس کی شادی کے لیے انشورنس کی پالیسی لے لی تھی۔''

''مجھے شادی کے اخراجات کی فکر نہیں ہے۔''

''لڑکی کے بارے میں والدین کی دوسری فکر مندی وہ ہوتی ہے جب اس کے لیے کوئی رشتہ نہ آ رہا ہو۔ ہماری ماہ نور تو ماشاء اللہ ہزاروں میں ایک ہے۔ بہت سے رشتے آ چکے ہیں اس کے۔ ان میں سے کئی تو بہت اچھے ہیں۔ میں تو انہیں' آپ جانتے ہیں بس یہ کہہ کر ٹالتی رہی ہوں کہ ماہ نور بی اے کر لے گی تو اس کے بعد ہی سوچوں گی اس کی شادی کے بارے میں۔''

''پرسوں آخری پرچہ ہے نا اس کا؟''

''ہاں..... اور مجھے تو یقین ہے۔ ماہ نور کوئی اچھی ہی

ارمانوں کا قتل

بھائی معراج رسول صاحب، تسلیمات!

ہر انسان کی قسمت خدا نے لکھی ہے اور انفرادی اور اجتماعی کوشش کے باوجود ہم قسمت کا لکھا نہیں مٹا سکتے۔ بعض لوگوں کے ساتھ جو حالات پیش آتے ہیں ان کی نہ تو کوئی وضاحت ہو سکتی ہے نہ تردید۔ ایسے ہی موقعوں پر اس مقولے پر ایمان لانا پڑتا ہے کہ انسان کی قسمت میں خدا نے جب اور جو لکھا ہے اس کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ خواہ خوشی کے بعد غم ہوں یا غموں کے بعد خوشیاں۔ ہمارا کام ہر حال میں اپنے رب کا شکر ادا کرنا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

خدا کی ایک شکر گزار بندی

ماہ نور جمال، کراچی

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ

پوزیشن لائے گی۔ شروع کی کلاسوں سے لے کر آج تک اس نے اچھے ہی نمبر حاصل کیے ہیں۔ یہ خیال مجھے ذرا بھی نہیں کہ وہ فیل ہو جائے گی۔ اسی لیے میں نے سوچ رکھا ہے کہ وہ آخری پرچہ بھی کر لے تو پھر میں آپ کو بتاؤں کہ وہ کئی اچھے رشتے کس کے ہیں جو ماہ نور کے لیے آ چکے ہیں۔''

''دراصل تم میری فکرمندی کی وجہ سمجھ ہی نہیں رہی ہو۔''

''سمجھ تو گئی ہوں۔ آپ اس کی شادی ہی کے لیے فکرمند ہیں نا!''

''ہاں..... لیکن..... بات کچھ اور بھی ہے۔ تم ایک بات بتاؤ مجھے۔ اپنی کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے مجھے کتنا عرصہ ہو گیا؟''

''جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ ہی پہلے وہ ملازمت ملی تھی آپ کو۔''

''تو پچیس سال ہو گئے نا؟''

''ہاں۔''

''لیکن میں کوئی ترقی نہیں کر سکا۔''

''واہ.....! کیوں نہیں.....! ترقی تو کی ہے آپ نے..... دس ہزار تھی اس وقت آپ کی تنخواہ..... اور اب تیس ہزار ہے۔''

''اس طرح تو ہر جگہ کام کرنے والوں کی تنخواہیں بڑھتی رہی ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ مہنگائی ہے۔ مجھے اپنی کمپنی میں منصب کے اعتبار سے جو ترقی ملی ہے، وہ بہت معمولی سی ہے۔ ارے میرے ساتھ ہی اس کمپنی میں ملازم ہونے والے کئی ایسے ہیں جن کے منصب اتنے بڑھ گئے ہیں کہ ان میں سے کوئی اسی ہزار اور کوئی ایک لاکھ لے رہا ہے۔''

''ہاں بتایا تو ہے لیکن یہ بھی بتایا ہے کہ وہ خوشامدی قسم کے لوگ ہیں۔ اپنے بڑے افسران کی خوشامد کر کے اتنی ترقی کی ہے انہوں نے اور آپ کا مزاج ایسا نہیں کہ افسران کی خوشامد کریں۔''

''اب اسی غلطی کا احساس تو ہو رہا ہے مجھے۔ تم خود سوچو تیس ہزار میں آج کل ہوتا کیا ہے۔ ماہ نور سے چھوٹے تین بچے اور ہیں ہمارے۔ ان کی تعلیم اور گھر کے اخراجات ہی کسی طرح پورے ہوتے رہے ہیں۔ کچھ پس انداز تو نہیں کر سکے نا ہم۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

''بس اب اسی خیال سے اکثر پریشان رہتا ہوں۔ اجمل اور افضل تو خیر لڑکے ہیں، وہ تو جیسے تیسے اپنی زندگی خود بنا لیں گے لیکن صفورا کا کیا ہوگا.....؟ چند سال بعد ہمیں اس کی شادی بھی کرنا ہے۔ اس کی شادی کے لیے بھی میں ایک پالیسی لینا چاہتا تھا لیکن جیب نے اجازت ہی نہ دی۔

''تو آپ صفورا کی شادی کے لیے فکرمند ہیں؟''

''ہاں.....! ماہ نور کی شادی تو خیر اطمینان سے ہو جائے گی لیکن چھ سات سال بعد صفورا کی شادی کے لیے پیسا کہاں سے آئے گا؟ ممکن ہے اس وقت تک میری تنخواہ میں چار پانچ ہزار کا اضافہ اور ہو جائے لیکن اس سے کیا ہوگا؟ اس عرصے میں مہنگائی بھی تو اور بڑھے گی۔ ہم اس وقت تک اتنا پس انداز نہیں کر سکیں گے کہ صفورا کی شادی بھی اسی طرح کر سکیں جس طرح اب ماہ نور کی شادی کر سکتے ہیں۔''

''کبھی کبھی یہ خیال آیا تو ہے مجھے لیکن آپ سے اس لیے نہیں کہا کہ آپ کی پریشانی کیوں بڑھاؤں ابھی سے۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''جب وہ وقت آئے گا تو کیا کوئی معجزہ ہو جائے گا؟''

''اللہ سب کا مددگار ہے۔''

''غلط کہہ رہی ہو تم..... جو لوگ اپنے لیے کچھ کرنے کی کوشش نہیں کرتے، اللہ بھی ان کی مدد نہیں کرتا۔''

''آخر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''میں اپنا مزاج بدلنا چاہتا ہوں۔ خوشامدی بننا چاہتا ہوں۔ چند سال میں ہی کہیں سے کہیں پہنچ جاؤں گا اور پچھلے دس پندرہ دن سے جو خیال میرے ذہن میں ہے اس پر عمل کر کے تو میں شاید بہت جلدی کوئی بڑا منصب حاصل کر لوں۔ اسی پچاس ہزار روپے ماہانہ تو ملنے ہی لگیں گے۔''

''اتنی جلدی کیسے..... ؟ ایسا کیا خیال آ گیا آپ کے ذہن میں؟''

''شجاعت صاحب یاد ہیں نا تمہیں؟ پچھلے ہفتے چائے پر آئے تھے ہمارے یہاں۔''

''ہاں ہاں، اتنی جلدی کیسے بھول جاؤں گی۔ ان کی صرف چائے بھی آپ نے بڑے اہتمام سے کی تھی۔ وہ آپ کی کمپنی کے کوئی بڑے افسر ہیں نا۔''

''ہاں۔ انہی کی وجہ سے مجھے بہت جلد کوئی بڑا منصب مل سکتا ہے۔''

''تو ان کی خوشامد کرنا چاہتے ہیں آپ؟''

''ہاں۔''

''تو آپ نے چائے پر انہیں اسی لیے بلایا تھا؟ میرا مطلب ہے۔ کیا یہ خوشامد تھی ان کی۔''

''ہاں خوشامد تو کہا جا سکتا ہے اسے، لیکن یہ بہت معمولی خوشامد تھی۔ انہیں صرف چائے پلا کر میں کوئی ترقی نہیں

کر سکتا۔ بڑا منصب حاصل کرنے کے لیے خوشامد بھی بہت زیادہ کرنا پڑے گی۔''

''تو کیجیے۔ جب آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے کہ اپنا مزاج بدل لیں گے تو کیجیے کوشش، لیکن مجھے تو یقین نہیں ہے۔ اب اتنی عمر ہونے کے بعد تو انسان کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے اپنا مزاج بدلنا۔''

''اس کا اندازہ مجھے بھی ہے اس لیے میں بس ایک ہی قدم اٹھانا چاہتا ہوں۔''

''اگر ایک ہی قدم اٹھانے سے آپ کوئی بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔''

''میں جو قدم اٹھانا چاہتا ہوں، اس میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میرے تعاون کی؟''

''ہاں۔ دراصل تم سمجھ نہیں سکی ہو گی اس دن شجاعت صاحب جب چائے پر آئے تھے تو میں نے ماہ نور کو خاص طور سے ان کے سامنے کیا تھا۔''

☆☆☆

اپنے والد کا آخری جملہ سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں گھر میں ایک ایسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں سے وہ دونوں مجھے دکھائی دے رہے تھے اور ان کی آوازیں بھی مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں لیکن وہ دونوں میری طرف سے بالکل بے خبر تھے۔

اپنے والد کا آخری جملہ سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شاید میں نے ان کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ میری والدہ کچھ حیرت سے میرے والد کی طرف دیکھنے لگیں اور بولیں ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''ماہ نور کو دیکھ کر شجاعت صاحب کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک مجھے صاف نظر آئی تھی۔''

''کیا..... کیا آپ..... کیا آپ..... میرا مطلب ہے.....'' میری والدہ کی زبان لڑکھڑانے لگی ''کیا آپ..... یہ کہنا چاہتے ہیں کہ.....'' یکایک میری والدہ نے کچھ دہشت زدہ سے انداز میں نفی میں سر ہلایا ''نہیں۔ میں غلط سمجھ رہی ہوں۔ آپ شاید کچھ اور کہنا چاہتے ہیں!''

''نہیں۔'' میرے والد نے کہا ''مجھے یقین ہے کہ تم ٹھیک سمجھی ہو۔ بس اسی لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ تم ہی ماہ نور کو سمجھا بجھا کر تیار کر سکتی ہو کہ وہ شجاعت صاحب سے شادی کر لے!''

مجھے ایسا لگا کہ میری آنکھوں سے تو نہیں لیکن میرے دل سے آنسو ٹپکنے لگے ہوں۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' میری والدہ کی آواز کانپ رہی تھی ''شجاعت صاحب کی عمر تو..... میرا مطلب ہے..... آپ کی اور ان کی عمر میں شاید دو تین سال کا ہی فرق ہوگا۔ پچاس سال کے لگ بھگ تو ہوں گے وہ، اور ہماری ماہ نور اٹھارہ سال کی ہے۔''

''اسی لیے تو میں تمہارے تعاون کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں کیسے بات کر سکوں گی اس سے.....! آپ تو مرد ہیں اندازہ نہیں ہوگا آپ کو کہ بن بیاہی جوان لڑکیوں کے کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔''

''خوب اندازہ ہے مجھے ورنہ میں تم سے تعاون کی بات کیوں کرتا.....! تم ہی سمجھا سکتی ہو اسے کہ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی خاطر یہ قربانی دے۔''

''میرے لیے یہ بہت مشکل ہے۔'' میری والدہ کی آواز بھرا گئی ''سارے ارمان خاک میں مل جائیں گے اس کے۔''

''عیش کرے گی وہ شجاعت صاحب سے شادی کر کے۔ بہت پیسا ہے ان کے پاس۔ کوئی اولاد ان کی ہے نہیں اور دو سال پہلے ان کی بیوی کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اکیلے رہتے ہیں وہ!''

دیباچہ

اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت میں بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔ ان مضامین کے افراد سب خیالی ہیں حتیٰ کہ جن کے لیے وقتاً فوقتاً واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، وہ بھی ''ہر چند کہیں کہ ہیں نہیں ہیں۔'' آپ تو اس نکتے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن کئی پڑھنے والے ایسے بھی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ان کی غلط فہمی اگر دور ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

جو صاحب اس کتاب کو کسی غیر ملکی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیں پہلے اُس ملک کے لوگوں سے اجازت حاصل کریں۔

ماخذ: ''پطرس کے مضامین''۔ پطرس بخاری

مرسلہ: بابر دین پوری۔ خان پور کٹورا

اپنے والد کی یہ باتیں سنتے سنتے میری ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ میرے لیے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، ڈگمگاتی ہوئی چال سے اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر اس طرح جا گری جیسے میرا جسم بالکل بے جان ہوگیا ہو۔ جو آنسو میں نے اپنے دل سے بہتے محسوس کیے تھے، وہ اب میری آنکھوں تک آنے لگے تھے۔

میری والدہ نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ بن بیاہی جوان لڑکیوں کے کچھ ارمان ہوتے ہیں اور وہ ارمان میرے بھی تھے۔ میں نے تو ہمیشہ ایک خوب صورت شریک زندگی کے خواب دیکھے تھے اور میں جمال سے محبت کرنے لگی تھی جو ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا تھا۔ ایک سال پہلے ایم اے کرنے کے بعد اسے ملازمت بھی جلد ہی مل گئی تھی۔ فی الحال اس کی تنخواہ آٹھ ہزار تھی لیکن اس کی ترقی کے امکانات تھے، جو اگر نہ بھی ہوتے تو میں اسی کو اپنا جیون ساتھی بنانے کی خواہش مند تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی جھونپڑی میں بھی زندگی گزار سکتی تھی۔ ایسی عیش و عشرت کی زندگی کے خواب اپنی آنکھوں میں بسانا میرے لیے ممکن نہیں تھا جس کے لیے مجھے ایک پچاس سالہ شخص کی بیوی بننا پڑتا لیکن میرے والد یہی چاہتے تھے۔

میری اور جمال کی محبت کا علم ابھی کسی کو نہیں تھا۔ ہم دونوں سوچ چکے تھے کہ جب میں بی اے کرلوں گی تو جمال اپنے والدین کو میرے گھر بھیجے گا اور جب مجھ سے میرا عندیہ لیا جائے گا تو میں یہ رشتہ قبول کرلوں گی۔ میرے خیال کے مطابق میرے والدین کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ جمال کا مستقبل تاب ناک تھا اور اب بھی اس کے گھر کے افراد بڑی آسودہ زندگی بسر کررہے تھے۔ اس کے دونوں بڑے بھائیوں کو نہایت معقول ملازمتیں ملی ہوئی تھیں اور والد بھی ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ خاندان بھی ان کا اچھا تھا۔ سب پڑھے لکھے اور آسودہ حال لوگ تھے لیکن مجھے ان سب کی آسودہ حالی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرے لیے تو جمال ہی میرا سب کچھ تھا۔ اس کی آٹھ ہزار کی تنخواہ ہی کو میں اپنا سمجھتی لیکن جمال کے تابناک مستقبل میں میرا برابر کا حصہ ہوتا۔ میں یہ سب خواب دیکھ چکی تھی لیکن میرے والد میرے ان خوابوں کو ریزہ ریزہ کرنے کے بارے میں... سوچ رہے تھے۔

میں بستر پر پڑی اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کررہی تھی اور والد کی باتیں میرے ذہن میں چکرا رہی تھیں۔ اس وقت رات ہوچکی تھی۔ گھر میں سب نے کھانا بھی کھالیا تھا۔ میرے چھوٹے دونوں بھائی اپنے کمرے میں اور میری دس سالہ بہن صفورا اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تھی۔ خود میں بھی کھانا کھا کے اپنے کمرے میں آگئی تھی لیکن پھر اپنے والد سے ایک بات پوچھنے کا خیال آیا تو کمرے سے نکلی تھی اور اس طرح مجھے ان دونوں کی باتیں سننے کا موقع مل گیا تھا۔ میں اس رات دیر تک پڑھنا چاہتی تھی کیونکہ اس کے بعد پڑھنے کے لیے بس ایک دن اور تھا۔ پرسوں مجھے آخری پرچہ کرنے کے لیے جانا تھا لیکن اپنے والد کی بات سننے کے بعد میں اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ پڑھائی پر دھیان دے سکتی۔

میری وہ رات جس طرح گزری، وہ بس میں ہی جانتی ہوں۔

☆☆☆

رات کو مجھے برائے نام ہی نیند آسکی تھی اس لیے دوسری صبح میری آنکھوں میں سرخی تھی، جسے میرے والد اور والدہ نے بھی دیکھا۔

''کیا ساری رات پڑھتی رہی ہو؟'' میری والدہ نے پوچھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولیں ''لیکن کبھی تو تم نے بارہ ایک بجے کے بعد نہیں پڑھا۔''

''بہت سخت امتحان سر پر آگیا ہے امی جان!'' میں نے جواب دیا۔

''امتحان؟'' والدہ نے کچھ تعجب سے کہا ''اب بس ایک ہی پرچہ رہ گیا ہے۔''

اس وقت میرے والد بول پڑے ''شاید یہ سمجھ رہی ہے کہ آخری پرچہ زیادہ مشکل ہوگا۔''

میں کچھ نہیں بولی ''سخت امتحان'' کی بات میں نے کسی اور معنی میں کہی تھی جو وہ دونوں ابھی سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں علم تو تھا نہیں کہ رات کو میں ان کی باتیں سن چکی ہوں۔

ناشتے کے بعد میرے بھائی بہن اپنے اپنے اسکول اور والد اپنے دفتر چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں آگئی۔ بستر پر لیٹی تو گزشتہ رات کی باتیں پھر ذہن میں چکرانے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد والدہ میرے کمرے میں آئیں تو میں احتراماً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''لیٹی رہو لیٹی رہو۔'' والدہ نے جلدی سے کہا ''کچھ دیر کی نیند لے لو تو اچھا ہے۔ میں بس یہی دیکھنے آئی تھی کہ رات بھر جاگنے کے بعد پھر نہ بیٹھ گئی ہو پڑھنے کے لیے..... سو جاؤ۔ دوپہر کو کھانے کے وقت جگادوں گی میں تمہیں۔ اس کے بعد ہی پڑھنا۔''

''جی امی!'' جواب میں کچھ اور کہنا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

وہ میرے کمرے سے چلی گئیں اور میں پھر لیٹ گئی۔

دوپہر کو وہ مجھے جگانے کے لیے آئیں تو میں نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں۔ میں خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ جب انہوں نے دو آوازیں دیں تو میں نے آنکھیں کھولیں۔

''منہ ہاتھ دھولو بیٹا۔ کھانا تیار ہوگیا ہے۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

میں اٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ کیونکہ میں سو نہیں سکی تھی اس لیے میں نے آئینے میں دیکھا کہ میری آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ چکی تھی۔

بھائی بہن بھی اسکول سے آچکے تھے اس لیے کھانے میں سب ہی شریک تھے۔

''تمہاری آنکھیں تو صبح سے زیادہ سرخ ہورہی ہیں ماہ نور!'' میری والدہ نے کہا۔

''میں نے پڑھا تو نہیں امی جان لیکن نیند بھی نہیں آسکی۔'' میں نے جواب دیا۔ بہانہ تراشا ''دن میں سونے کی عادت نہیں ہے نا مجھے۔''

اس کے علاوہ میں کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ کھانے کے دوران میں میرے بہن بھائی آپس میں بھی باتیں کرتے رہے اور والدہ سے بھی مخاطب ہوتے رہے۔ میں خود بھی چاہتی تھی کہ ان کی باتوں میں حصہ لوں تاکہ والدہ کو میری ذہنی حالت کا اندازہ نہ ہوسکے لیکن یہ مجھ سے ممکن نہیں ہوا اور والدہ نے بھی شاید میری خاموشی پر دھیان نہیں دیا۔ میں محسوس کررہی تھی کہ میرے بہن بھائیوں کی باتوں کا جواب دینے کے باوجود وہ کچھ الجھی الجھی سی تھیں۔ ایک دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ وہ کسی سوچ میں گم ہوگئیں اور نوالہ بھی ان کے ہاتھ میں رہ گیا اور پھر وہ میرے بہن بھائیوں ہی میں کسی کے ٹوکنے پر چونکیں۔ میں نے ان کی حالت سے سمجھ لیا کہ میرے والد کی باتوں کی وجہ سے وہ بھی پریشان تھیں۔

کھانے کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا ''اتنا جاگنے سے سر بہت بھاری ہوگیا ہوگا تمہارا۔ اس حالت میں کچھ پڑھا ہی نہیں جاسکتا۔ آدھی ایک گولی لے لو سونے کی۔ شام تک سو لو تو رات کو تو پڑھ ہی لوگی۔''

''جی اچھا۔''

سوچ سوچ کر میرا سر بہت بھاری ہوگیا تھا۔ میں خود بھی چاہتی تھی کہ مجھے چند گھنٹے کے لیے نیند آجائے۔ میں نے پہلے کبھی خواب آور دوا نہیں لی تھی اس لیے بس آدھی گولی کھائی۔ خواب آور گولیاں گھر میں اس لیے رہتی تھیں کہ میرے والد اس کے عادی تھے۔

لیکن وہ آدھی گولی کھا کر میں نے ٹھیک نہیں کیا۔ نیند مجھے اس کے بعد بھی نہیں آسکی اور گولی کھانے کی وجہ سے سر میں شدید درد ہونے لگا جس کی وجہ سے ایک گھنٹے بعد مجھے سپرین بھی لینا پڑی۔

تھوڑی دیر بعد میری والدہ شاید یہی دیکھنے کے لیے میرے کمرے میں آئیں کہ میں سو چکی ہوں یا نہیں۔ میں نے انہیں دکھانے کے لیے جلدی سے آنکھیں بند کیں مگر انہوں نے دیکھ لیا۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو ماہ نور۔'' وہ میرے بستر کے قریب آگئیں۔ مجبوراً مجھے آنکھیں کھولنا پڑیں۔

''نیند اب بھی نہیں آرہی ہے امی جان۔'' میں اٹھ بیٹھی ''خواب آور گولی کھانے سے سر اور بھاری ہوگیا ہے۔ درد ہونے لگا ہے سر میں۔ میں نے ابھی ایک سپرین بھی لی ہے۔''

''کیا بات ہے بیٹا۔'' وہ میرے بستر پر بیٹھ گئیں ''کسی قسم کی پریشانی ہے کیا؟''

''مجھے کیا پریشانی ہوسکتی ہے امی جان۔'' میں نے جواب دیا لیکن ان کے محبت آمیز اور ہمدردانہ لہجے کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ارے..... ارے!'' انہوں نے بے تاب ہوکر مجھے اپنے سینے سے لگایا تو مجھے خود پر بالکل ہی قابو نہیں رہا اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس سے تو میری والدہ اور گھبرا گئیں۔ مجھے چپ کرانے کی کوششوں میں ان سے کچھ بوکھلاہٹیں بھی سرزد ہوئیں لیکن میں نے خود ہی اپنے جذبات پر قابو پایا۔

''کچھ بتاؤ تو بیٹا۔ آخر ہوا کیا ہے؟'' میری والدہ نے پھر سوال کیا۔

''میں کیا بتاؤں امی جان۔ پریشان تو آپ بھی ہیں۔'' میرے منہ سے شاید بے ساختہ ہی نکل گیا تھا۔

''میں؟'' میری والدہ چونکیں، پھر بولیں ''میں کیوں پریشان ہوتی ماہ نور۔ یہ تم نے کیسے سمجھ لیا؟''

''ابھی کھانا کھاتے وقت آپ بار بار کسی سوچ میں گم ہوجاتی تھیں۔''

''ارے وہ تو..... بس ایسے ہی..... کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''میں آپ کی پریشانی جانتی ہوں امی جان.....!'' میں

نے نظریں جھکا کر کہا ''آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ مجھ سے آپ کیسے بات کریں۔''

میری والدہ چونکیں۔ میں نے ذرا سا رک کر کہا ''شاید آپ وہ بات کرنے سے پہلے انتظار بھی کریں گی کہ میرا آخری پرچہ ہوجائے' لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہیں۔ آپ ابو جی سے کہہ دیجئے گا کہ میں کوئی بے حس لڑکی نہیں ہوں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اولاد پر کچھ حق والدین کا بھی ہوتا ہے۔ اولاد کو چاہیے کہ اگر وہ اپنے والدین کی کوئی پریشانی کم کرسکتی ہو تو ضرور کرے' خواہ اسے اپنے ارمانوں کا گلا ہی گھونٹنا پڑے۔ میں خود کو اپنی چھوٹی بہن پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں امی جان۔''

مجھ سے اتنا صاف جواب سن کر میری والدہ ہکا بکا رہ گئیں۔ ان کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوا ہوگا کہ مجھے ان کی اور ابو جی کی باتوں کا پتا کیسے چل گیا۔ میں نے یہ بتا کر ان کی الجھن ختم کردی کہ میں نے اتفاقاً ان کی اور ابو جی کی باتیں سن لی تھیں۔

میری والدہ کچھ اداس نظر آنے لگیں تو میں نے مسکرانے کی کوشش کی ''سب ٹھیک ہے امی جان۔ آپ خود کو ہلکان نہ کریں۔ رات سے اب تک میں بھی سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی رہی ہوں لیکن ابھی آپ سے باتیں کرتے کرتے ہی میں نے اچانک فیصلہ کرلیا ہے اور یہ فیصلہ کرکے میرے دماغ کا بوجھ کم ہوگیا ہے۔ شاید اب مجھے نیند آجائے۔''

''میری بچی!'' میری والدہ کی آواز کچھ بھرا گئی اور انہوں نے مجھے گلے سے لگالیا۔ ان کی اس جذباتیت کی وجہ سے میں بھی جذباتی ہوگئی اور میری آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو امنڈنے لگے تو میں نے خود کو بڑی مشکل سے قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ اپنے ارمانوں کو کفن پہنانے کا فیصلہ کرنے والے کے دل پر کیا بیت جاتی ہے' اس کا اندازہ ہر ایک نہیں کرسکتا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں پرچہ کرکے کالج سے نکلی تو مجھے بڑی حد تک یقین تھا کہ پرچہ خراب ہوگیا ہے اور میں پاس نہیں ہوسکوں گی۔ اپنے والد اور والدہ کی گفتگو سننے کے بعد میں اس قابل رہی ہی نہیں تھی کہ پرچے کی تیاری کرسکتی اور جو فیصلہ میں نے کرلیا تھا' اس سے بھی دل و دماغ بوجھل ہی تھے۔ پرچہ کرتے وقت مجھے محسوس ہوتا رہا تھا کہ میں جو کچھ پڑھ چکی ہوں' وہ بھی یاد نہیں رہا ہے۔ اپنی والدہ سے تو میں نے بس کہہ دیا تھا کہ یہ فیصلہ کرکے دماغ کا بوجھ کم ہوگیا ہے۔ اپنی محبت اور اپنے ارمانوں کا قتل کرکے دماغ کا بوجھ بڑھ تو سکتا ہے' کم نہیں ہوسکتا۔

کالج سے کچھ فاصلے پر جمال اپنی موٹر سائیکل لیے موجود تھا۔ جب سے میرے پرچے ہو رہے تھے' اس نے یہ وطیرہ بنا رکھا تھا کہ اپنے دفتر سے ایک گھنٹے کی چھٹی کرکے مجھے لینے آتا تھا اور مجھے گھر پہنچا کے دوبارہ دفتر جاتا تھا۔ پرچوں کے دنوں میں ہماری ملاقات اسی طرح ممکن تھی ورنہ کالج کے زمانے میں تو ملاقاتیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔

''پندرہ منٹ کے لیے کہیں رک جانا۔'' میں نے موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھتے ہوئے کہا ''کچھ بات کرنا ہے تم سے۔''

''کچھ پریشان سی نظر آرہی ہو۔'' اس نے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''پرچہ تو خراب نہیں ہوگیا؟''

''تم موٹر سائیکل تو چلاؤ۔''

''جو حکم سرکار!'' جمال نے خوشگوار موڈ میں کہا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔

چلتی موٹر سائیکل پر بات کرنے سے مجھے بہت الجھن ہوتی تھی۔ لہٰذا ہم کچھ دیر کے لیے کسی ریسٹورنٹ یا ایک پارک میں بیٹھا کرتے تھے جو ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔

اس دن ہم پارک میں ہی جا کے بیٹھے۔

''بات پرچے کی نہیں معلوم ہوتی۔'' جمال نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''مجھے تمہارے ہونٹوں کی کپکپاہٹ سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کچھ جذباتی ہو رہی ہو۔''

میں آب دیدہ ہوگئی۔

''ارے۔'' جمال بے چین ہوگیا ''کیا بات ہے ماہ نور؟''

''ایک بہت سخت امتحان سر پر آگیا ہے جمال۔'' میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن میری آواز لڑکھڑائی ہوئی تھی ''اور اس امتحان میں میرے سرخ رو ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تم میری ہمت بندھاؤ۔''

''میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں ماہ نور؟ کچھ بتاؤ تو۔''

''اب ہم دونوں کو صرف ایک دوسرے کی یادوں کے سہارے زندہ رہنا ہے جمال۔ اب ہم ایک دوسرے کے نہیں ہوسکتے۔''

''کیا؟'' جمال کے چہرے کا رنگ بدل گیا ''کیا..... کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''ابو جی میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' جمال نے تیزی سے کہا ''تمہاری

مرضی کے بغیر وہ یہ کس طرح کرسکتے ہیں؟''

''میری مرضی شامل ہے ان کے فیصلے میں۔''

''کیا.....!'' جمال نے بے ساختہ کہا اور اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں جمال۔'' میں اس سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ ''آخر والدین کا کچھ تو حق ہوتا ہے اولاد پر..... اور وقت پڑنے پر اولاد کو یہ حق ضرور ادا کرنا چاہیے۔''

''ایسا کیا وقت پڑ گیا ہے تمہارے والد پر؟ کیا مجبوری ہے ان کے ساتھ کہ وہ تمہاری شادی.....''

''میں تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتی جمال۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''یہ ایک کڑا امتحان ہے میرے لیے۔ کیا تم میری مدد نہیں بندھاؤ گے؟''

''میں اپنے خون کا آخری قطرہ بھی نچھاور کرسکتا ہوں تم پر۔'' وہ پُرجوش ہوگیا۔

''تمہارے اس قسم کے جوابوں سے میری ہمت کیسے بندھ سکتی ہے جمال۔ اس طرح تو میں اور کمزور پڑ جاؤں گی۔''

''پھر تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟'' اس کے لہجے میں بڑی بے بسی تھی۔

''میرے اس امتحان کو تم اپنا امتحان بھی بنالو۔ بھول جاؤ کہ ہم کبھی ایک دوسرے سے ملے تھے۔''

''کیا تم بھول سکو گی؟''

میں چپ رہ گئی۔ جمال سے جھوٹ کیسے بولتی۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اسے بھول جاتی۔

میں خاموش رہی تو کچھ رک کر اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ ''تو پھر میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں ماہ نور۔''

''ہاں جمال۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں بھول سکتے۔ بس یہی ہوسکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی یادوں میں زندہ رہیں۔ آج ہم آخری بار مل رہے ہیں۔''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''یہ میرا نہیں۔ ہماری تقدیر کا فیصلہ ہے۔''

''میں یہ نہیں مانتا کہ تقدیر سے لڑا نہیں جاسکتا۔ انسان اپنی تقدیر خود بھی بنا سکتا ہے۔ مجھے معلوم تو ہو کہ آخر بات کیا ہے۔''

''میں لڑنا ہی تو نہیں چاہتی جمال۔ مجھے اپنے والد کی خواہش کے سامنے بس سر جھکانا ہے۔''

ہم دونوں میں کچھ اور جذباتی باتیں بھی ہوئیں لیکن وقت نے جو فیصلہ سنا دیا تھا' میں اسے قبول کرچکی تھی۔

☆☆☆

تیسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ شجاعت صاحب سے میری شادی طے ہوگئی تھی۔ میں یہ نہیں جان سکی کہ معاملہ طے کرانے میں درمیانی ذریعہ کون بنا ہوگا۔ بس قیاس ہی کرسکتی ہوں کہ وہ میرے والد ہی کے دفتر کا کوئی آدمی ہوگا۔

چوتھے دن میری والدہ نے مجھے بتایا کہ شجاعت صاحب ٹیلی فون پر مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں اور وہ دو بجے فون کریں گے۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا ماہ نور۔ ابھی تمہارے ابو جی کا فون آیا تھا۔ وہی کہہ رہے تھے کہ شجاعت صاحب کا فون آئے تو میں ان سے تمہاری بات کرادوں۔''

ٹیلی فون لاؤنج میں گیا ہوا تھا۔ کال عموماً میری والدہ ہی ریسیو کیا کرتی تھیں۔ اسی لیے ان سے کہا گیا ہوگا کہ وہ شجاعت صاحب سے میری بات کرادیں لیکن اس سے مجھے خاصی الجھن ہوئی۔ شادی سے پہلے آخر وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہوں گے؟

میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکی اور دو بجے ان کا فون آگیا۔ والدہ مجھے لاؤنج میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔

''ہیلو۔'' دوسری طرف سے کچھ توقف سے آواز آئی۔

''جی۔'' میری آواز بہت دھیمی تھی۔

''ماہ نور؟''

''جی!''

''معاف کرنا ماہ نور۔ ایک سوال کرنا چاہتا ہوں میں تم سے۔ اس سوال کی ضرورت مجھے یوں پیش آئی کہ میری اور تمہاری عمر میں بہت زیادہ فرق ہے۔ عموماً لڑکیاں اتنی زیادہ عمر کا شوہر پسند نہیں کرتیں۔ اسی لیے میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں تم پر اپنے والدین کا دباؤ تو نہیں ہے؟''

میں الجھن میں پڑ گئی۔ مجھے بالکل خیال نہیں آیا تھا کہ سوال اس قسم کا ہوگا۔

''ہیلو!'' کچھ توقف سے زور دے کر کہا گیا۔

''جی..... وہ..... میں سمجھی نہیں۔ یہ سوال آپ نے کیوں کیا ہے؟''

''دیکھو ماہ نور۔ میں بہت صاف گو قسم کا آدمی ہوں۔ یہ تو حقیقت ہے کہ تم مجھے اچھی لگی ہو اور اپنی بیوی کے انتقال کے بعد میری یہ خواہش بھی ہے کہ میں کسی جوان لڑکی سے شادی کروں لیکن یہ میں نہیں چاہتا کہ وہ لڑکی کسی قسم کے دباؤ کے باعث مجھ سے شادی کرے۔ بس اسی لیے یہ سوال کیا ہے میں نے تم سے۔''

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں سوچتی ہوئی بولی ''اگر میں جواب ہاں میں دوں تو؟''

''تو میں تم سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔'' شجاعت صاحب کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

اس وقت میرے دل میں شجاعت صاحب کے لیے کچھ احترام پیدا ہوگیا۔ کسی جوان لڑکی سے شادی کی خواہش ان کی شخصیت کا ایک نامناسب پہلو سہی لیکن یہ ان کی شخصیت کا ایک اچھا پہلو تھا کہ وہ کسی جوان لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتے تھے۔

''ماہ نور؟'' شجاعت صاحب بولے ''تم نے جواب میں اگر کیوں لگادیا؟''

''میں آپ کا مقصد جاننا چاہتی تھی۔''

''وہ تم نے جان لیا۔ اب جواب دو میری بات کا۔''

''میں کسی قسم کا دباؤ محسوس نہیں کرتی۔ میں اگر چاہوں تو اس شادی سے انکار کرسکتی ہوں۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے شجاعت صاحب کہ لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جاسکے۔ میں نے تو اپنے بڑوں کے اس فیصلے کو قبول کرلیا ہے۔ کوئی اعتراض نہیں ہے مجھے اس پر۔''

''بس ماہ نور! میں یہی اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اور کوئی بات نہیں کرنا۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

میں نے ریسیور رکھا اور کھوئی ہوئی سی اپنے کمرے میں آگئی۔ فوراً ہی میری والدہ بھی آگئیں۔ وہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ شجاعت صاحب نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتادیا۔ اس پر انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ذرا دیر کچھ افسردہ سی بیٹھی رہیں، پھر شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر چلی گئیں۔

میں کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی، پھر میں نے جمال کے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا۔

''بہت خوش قسمت ہوں میں!'' جمال کے لہجے میں افسردگی تھی ''کئی دن بعد آخر میں تمہیں یاد آ ہی گیا۔''

''طنز نہ کرو جمال۔''

''طنز نہیں کیا ہے میں نے۔''

''پھر یہ کیوں کہا تم نے۔ چند دن پہلے ہماری ملاقات میں یہ بات ہوئی تو تھی کہ ہم ایک دوسرے کو بھول نہیں سکتے۔ اس وقت بھی میں نے تم سے یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کو بھول نہیں سکتے تو ہم ایک دوسرے کو بس دوست کی طرح یاد رکھیں۔ ہم ایک دوسرے کے کچھ اور نہیں ہوسکے تو کم از کم اچھے دوست تو رہ سکتے ہیں۔''

''ہوں۔''

میں سمجھ گئی کہ جمال کے دل و دماغ میری بات ماننے پر آمادہ نہیں تھے لیکن اس وقت میں نے اسے نظر انداز کردیا اور بولی ''اس وقت میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں اطلاع دے رہی ہوں کہ میری شادی طے ہوگئی ہے۔''

دوسری طرف سے کچھ رک کر کہا گیا ''مبارک ہو!''

میں جانتی ہوں کہ مجھے مبارک باد دیتے ہوئے جمال کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ خود میرے دل پر بھی قیامت گزر رہی تھی، لیکن میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش جاری رکھی اور کہا ''شادی تو تمہیں بھی کرنا ہی ہوگی جمال۔ میں اپنی شادی کے بعد ایک دوست کی حیثیت سے تمہارے لیے کوئی لڑکی تلاش کروں گی۔''

''ہوں۔''

''وعدہ کرو کہ تم اس سے شادی کرلو گے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر اس لڑکی کو میرے دل نے اسی طرح قبول کیا جس طرح میں تمہیں قبول کرچکا ہوں تو میں اس سے شادی کرلوں گا۔''

''تم شرط لگا رہے ہو۔''

''کیا تم مجھے حکم دینا چاہتی ہو؟''

''ایک دوست کی حیثیت سے اپنی خواہش کا اظہار کررہی ہوں۔''

''میری بھی یہ خواہش ہے کہ تمہاری خواہش کا احترام کروں لیکن کسی بھی انسان کو اپنے دل و دماغ پر تو اختیار نہیں ہوتا۔''

جب میں نے جمال کا نمبر ملانا شروع کیا تھا، اس وقت میرے دل میں درد کی لہریں اٹھنے لگی تھیں اور جمال سے باتیں کرتے ہوئے میں نے اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھا تھا لیکن اب میں محسوس کرنے لگی کہ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ جائے گا۔

''اب میں اس مسئلے پر تم سے اپنی شادی کے بعد بات کروں گی۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ اس وقت میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

☆☆☆

میرے والد کو میری شادی کی اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے میرا رزلٹ آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور میری زندگی میں وہ رات آگئی جسے سہاگ رات کہتے ہیں۔ لڑکیوں کے دل میں اس رات کے لیے بہت ارمان ہوتے ہیں لیکن میں تو

اپنے ارمانوں کی لاش پر سے گزرتی ہوئی اس رات تک پہنچی تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جب میں تقدیر کے فیصلے کے آگے سر جھکا ہی چکی ہوں تو ایک بیوی کی حیثیت سے شجاعت صاحب کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔

سہاگ رات کی ابتدائی چند رسمی باتوں میں شجاعت صاحب نے یہ بھی کہا کہ فون پر مجھ سے گفتگو کرنے کے بعد ہی اطمینان ہوا تھا ورنہ وہ کسی ایسی لڑکی سے ہرگز شادی نہ کرتے جو انہیں کسی دباؤ کی وجہ سے قبول کررہی ہو۔

''انسان، فرشتہ نہیں ہوتا ماہ نور۔'' وہ بولے ''کچھ نہ کچھ خامیاں سبھی میں ہوتی ہیں اور لوگ عموماً وہ خامیاں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں کچھ مختلف قسم کا آدمی ہوں۔ شاید یہ بھی میری ایک خامی ہے کہ میں کسی جوان اور خوب صورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مجھ میں ایک ایسی خامی بھی ہے جسے عموماً لڑکیاں پسند نہیں کرتیں لیکن میں تم سے اپنی وہ خامی بھی نہیں چھپاؤں گا۔''

شجاعت صاحب بول رہے تھے اور میں نظریں جھکائے خاموشی سے سن رہی تھی۔ وہ سگریٹ سلگانے کے لیے رکے اور پھر بولنے لگے ''ابھی میں نے جس بات کا ذکر کیا وہ یہ ہے کہ میں شراب بھی پیتا ہوں۔ ہمارے طبقے میں شراب نوشی اب عام ہوچکی ہے۔ ٹی پارٹی کا تو اب تصور ہی ختم ہوتا جارہا ہے۔ اب صرف کاک ٹیل پارٹیز ہی لوگوں کے میل جول کا ایک بڑا سبب ہیں۔ مجھے بھی ان پارٹیوں میں جانا پڑتا ہے لیکن وہاں میں پینے کے معاملے میں محتاط ضرور رہتا ہوں۔ اتنی بھی نہیں پیتا کہ دل و دماغ پر قابو نہ رہ پائے اور قدم لڑکھڑانے لگیں لیکن جب میں اپنے گھر میں پیتا ہوں تو اتنی پیتا ہوں کہ ہوش میں آنے پر کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ اپنے گھر میں یہ اندیشہ نہیں رہتا نا کہ لڑکھڑاؤں گا تو کوئی مجھ پر ہنسے گا یا میں کسی کو اپنے بارے میں کوئی ایسی بات بتا بیٹھوں گا جو مجھے ہر ایک کو نہیں بتانا چاہیے وغیرہ وغیرہ.....!''

میں بدستور نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

میری وہ سہاگ رات اسی طرح گزری جس طرح گزرتی ہے، لیکن میرے اور شجاعت صاحب کے ساتھ ایک تیسری چیز شراب بھی تھی اور جیسا کہ انہوں نے بتادیا تھا، گھر میں وہ بے تحاشا پیتے تھے۔ اس رات بھی انہوں نے پی۔

اگر وہ نہ پیتے تو شاید مجھے اتنی جلدی وہ سب کچھ معلوم نہیں ہوتا جو اسی رات معلوم ہوگیا۔ غلط یا صحیح، شجاعت صاحب کا ایک نظریہ یہ بھی تھا کہ دنیا میں دولت سب سے افضل ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے منصب سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ جائز و ناجائز، ہر ذریعے سے پیسا جمع کیا تھا۔ اس پیسے سے انہوں نے اپنے لیے ایک بے حد آسودہ زندگی پالی تھی لیکن اس پیسے سے انہوں نے ایسے شوق نہیں پالے تھے جو بربادی کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ ریس سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، جوا نہوں نے کبھی نہیں کھیلا تھا۔ عیاش طبع بھی وہ نہیں تھے۔ مرحوم بیوی ان کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت تھی اور دوسری میں بھی جسے انہوں نے اپنایا تھا۔

میں نے ان کی ہر بات پر یقین کیا۔ شراب کی بو ان کے لہجے کی سچائی نہیں دبا سکی تھی۔ مجھے ان میں صرف یہی ایک برائی نظر آئی کہ پیسا حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ناجائز طریقے بھی اختیار کیے تھے۔ رہی ان کی شراب نوشی تو یہ ہمارے معاشرے کا ایک اہم حصہ بن چکی ہے اور اگر انہیں جوان لڑکی سے شادی کی خواہش تھی تو اسے برا میں اس لیے نہیں سمجھتی کہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے انہوں نے جبر کا راستہ نہیں اپنایا تھا۔ انہوں نے فون کرکے پہلے ہی میری مرضی معلوم کرلی تھی۔ رہی پس پردہ حقیقت تو میں نے اس بارے میں انہیں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

لیکن ایک بہت بڑا دھچکا مجھے جس بات سے لگا وہ میرے والد کے بارے میں تھی۔ شاید وہ سمجھتے ہوں کہ مجھے اس کا علم ہوگا یا شراب نے انہیں کچھ سوچنے سمجھنے ہی نہیں دیا ہوگا۔ انہوں نے ہنس کر مجھے بتادیا کہ جوان لڑکی سے شادی تو میرے والد نے بھی کی تھی۔ پندرہ سال پہلے وہ دوسری شادی کرچکے تھے جس سے ان کی دو اولادیں بھی تھیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکی بڑی تھی جس کی عمر اب چودہ سال تھی۔

''دو دو گھر ہوجائیں تو انسان کے لیے پریشانی ہوتی ہے۔'' شجاعت صاحب نے کہا تھا ''آج کی مہنگائی میں پچاس ہزار کی اہمیت ہی کیا ہے۔''

شجاعت صاحب مجھے یہ سب کچھ بتا رہے تھے اور میرے تن بدن میں آگ بڑھتی جارہی تھی۔ میرے والد نے میرے ارمانوں کا قتل صرف اس لیے نہیں کیا تھا کہ انہیں میری چھوٹی بہن کے مستقبل کی فکر تھی۔ ان کی مجبوریاں ان کا دوسرا گھر بھی تھیں۔ ان کی دوسری بیوی، ان کی دوسری اولادیں اور اپنے لیے انہوں نے وہ پریشانی خود مول لی تھی۔ ''جرم'' انہوں نے کیا تھا جس کی سزا مجھے ملی تھی۔ میں نے شجاعت صاحب کو اس لیے برا نہیں سمجھا تھا کہ دوسری شادی انہوں نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد کی تھی جبکہ میرے والد نے یہ قدم اس وقت اٹھایا تھا جب میری والدہ کی عمر زیادہ سے زیادہ اٹھائیس سال کی ہوگی۔ میری دانست میں وہ یقیناً مجرم تھے۔ وہ شادی

انہوں نے میری والدہ سے چھپائی بھی تھی اور اپنی تنخواہ کے بارے میں بھی جھوٹ بولا تھا۔ میں شجاعت صاحب کی اس بات پر یقین کر چکی تھی کہ وہ پچاس ہزار روپے ماہانہ کے ملازم تھے جبکہ میری والدہ کو انہوں نے بتایا تھا کہ ان کی تنخواہ تیس ہزار روپے ماہانہ تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ بیس ہزار روپے وہ اپنے دوسرے گھر پر خرچ کرتے تھے۔ انہوں نے پہلی زیادتی میری والدہ کے ساتھ کی تھی اور اس کے بعد اب میرے ساتھ۔

یہ باتیں جان کر میرے دل میں اپنے والد کے لیے نفرت پنپنے لگی۔

باتوں باتوں میں شجاعت صاحب نے یہ بھی کہا کہ وہ میرے والد کی ترقی کے لیے جلد ہی کوئی ایسا راستہ نکالیں گے کہ فوری طور پر ان کی تنخواہ اسّی ہزار ہو جائے اور مزید ترقی کے راستے بھی کھل جائیں۔

میرا دماغ کچھ سوچنے لگا تھا۔ میں اب نہیں چاہتی تھی کہ میرے والد کی ترقی ہو لیکن اس وقت میں شجاعت صاحب سے نہ کہہ سکی کہ میرے دل میں اپنے والد کے خلاف انتقام کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے۔ ان سے اس وقت کچھ کہنے کا فائدہ اس لیے بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت تک کافی پی چکے تھے۔ انہی کے بقول ہوش میں آنے کے بعد شاید انہیں یاد بھی نہ ہوتا کہ انہوں نے مجھ سے کیا کیا باتیں کی تھیں۔

کافی رات گئے ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ بالکل مدہوش ہو کر سوئے تھے اس لیے دوسرے دن گیارہ بجے تک سوتے رہے۔ دفتر سے انہوں نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی تھی۔ مجھے انہوں نے بتا بھی دیا تھا کہ دوسرے دن شام کی فلائٹ سے مجھے مری لے جائیں گے اور پانچ دن وہیں گزاریں گے۔

☆☆☆

مری روانگی سے دو گھنٹے پہلے شجاعت صاحب مجھے میرے والدین سے ملانے لے گئے جہاں ان کی خاطر مدارات میں میرے والد نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ وہ بے حد خوش تھے لیکن میں نے ان سے ناخوش ہونے کے باوجود اپنے چہرے سے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی کہ میرے دل میں ان کے خلاف جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی والدہ کو بھی اپنے والد کی دوسری شادی کے بارے میں نہیں بتایا۔ میں انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ شجاعت صاحب کو بھی سمجھا دوں گی کہ میرے گھر میں وہ میرے والد کی دوسری شادی کا ذکر نہ کریں۔

میں نے اپنی بارہ سالہ بہن صفورا اور چھوٹے بھائیوں کو بھی اس طرح پیار کیا جیسے میں اس شادی سے بہت خوش تھی۔ میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میری اس ظاہری خوشی کے پیچھے میرے والد کی خود غرضی کا زہر پھیلا ہوا تھا۔ میں صحیح معنوں میں خوش کیسے ہو سکتی تھی جبکہ میرے ارمانوں کا' میری محبت کا قتل کر دیا گیا تھا۔ میں اس دوران میں جمال کو بھول نہیں سکی تھی۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اس پر کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔

گھر سے میں شجاعت صاحب کے ساتھ ائرپورٹ روانہ ہوگئی۔

مری میں جو پانچ دن گزرے' ان میں شجاعت صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر فدا تھے اور میں نے بھی اپنے دل کے زخموں کا کرب برداشت کرتے ہوئے ایک اچھی بیوی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

ان پانچ دنوں میں شاپنگ بھی خوب کی گئی۔ لوگوں کے لیے تحفے تحائف خریدنے کے علاوہ میرے لیے تو شجاعت صاحب نے ایسی شاپنگ بھی کی جو میرے خیال کے مطابق غیر ضروری تھی۔

☆☆☆

بے چارے شجاعت صاحب۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ان کی زندگی میں خوشی کے یہ چند دن آخری بار آئے تھے۔ ہم واپس جس دن کراچی پہنچے' انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ کمپنی کو کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ انہوں نے پیسا حاصل کرنے کے لیے کیا کیا ناجائز طریقے اختیار کیے تھے۔ اس کے علاوہ ان پر اپنی کمپنی کے ایک آدمی کے قتل کا الزام بھی تھا جس پر مجھے بالکل یقین نہیں آیا۔

جمال سے میری محبت اپنی جگہ مگر ان چند دنوں میں شجاعت صاحب سے مجھے کچھ انسیت تو بہرحال ہو گئی تھی۔ ان کی گرفتاری سے ایک دھچکا لگا تھا مجھے۔ جب میں ان سے ملنے حوالات گئی تو میں واقعی افسردہ تھی۔

''دھوکا کھا گیا میں ایک شخص سے۔'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے ''اتنا اعتماد آج کی دنیا میں کسی پر نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ باتیں چھپانے کے لیے کمپنی کے ایک آدمی کا قتل اسی نے کیا تھا۔''

''مجھے بھی یقین ہے کہ آپ قتل نہیں کر سکتے۔ وکیل آپ کو اس کیس سے تو بچا لے گا۔''

''نہیں ماہ نور!'' شجاعت صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''گرفتاری کے بعد سے اب تک مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے' اس سے پتا چلتا ہے کہ میرے خلاف بڑا مضبوط کیس بنایا

اپریل فول

مغرب کی بے سوچے سمجھے تقلید کے شوق نے ہمارے معاشرے میں جن رسموں کو رواج دیا انہی میں سے ایک رسم ''اپریل فول'' منانے کی بھی ہے۔ گو اس کا رواج اب کم ہو گیا ہے۔ اس رسم کی ابتدا کیسے ہوئی؟ اس کے بارے میں مؤرخین کے بیانات اور روایات مختلف ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف بریٹے نیکا کے مطابق اس مہینے کو رومی لوگ اپنی دیوی وینس (VENUS) سے منسوب کرتے ہیں جو کہ یونانی زبان میں افروڈائٹ (APHRODITE) کہلاتی تھی اور اس تعلق سے وہ اس مہینے کو مقدس سمجھتے تھے۔ اس وقت یکم اپریل سال کی پہلی تاریخ ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ایک بت پرستانہ تقدس بھی وابستہ تھا اس لیے اس دن لوگ جشنِ مسرت منایا کرتے تھے اور اسی جشنِ مسرت کا ایک حصہ ہلکی مذاق بھی تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اپریل فول کی شکل اختیار کر گیا۔

تاریخ میں اپریل فول کی ابتداء کی شہادت فرانس میں کیلنڈر کی تبدیلی کے وقوع پذیر ہونے سے بھی ملتی ہے۔ سولہویں صدی کے وسط تک نئے سال کی استقبالی تقریبات کا آغاز اکیس مارچ سے ہوا کرتا تھا جو یکم اپریل کو ختم ہو جاتی تھیں۔ اس طرح یکم اپریل سے نئے سال کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا تھا۔ 1564ء میں فرانس کے کنگ چارلس نہم نے نئے کیلنڈر کو اپنانے کا اعلان کیا اور یکم جنوری کو سال کا پہلا دن قرار دیا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس تبدیلی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ بضد تھے کہ نئے سال کا آغاز یکم اپریل سے ہی ہوا کرے گا۔ یہ لوگ جب یکم اپریل کو نئے سال کی خوشی مناتے تو لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنتے اور مختلف طریقوں سے تنگ کیے جاتے۔ ان لوگوں کو فرانسیسی زبان میں POISSOND AVRIL کہا جانے لگا جس کا انگریزی میں ترجمہ ARRIL FISH یعنی اپریل کی مچھلی تھا۔ گویا جس کسی کو بے وقوف بنایا جاتا تھا وہ ایسی پہلی مچھلی ہوتا جو اپریل کے آغاز میں شکار کی گئی۔ کچھ سال تک تو بے وقوف بنانے کا عمل صرف انہی لوگوں تک محدود رہا مگر پھر یہ ایک رسم کی حیثیت اختیار کر گیا جو پورے یورپ میں پھیل گئی اور برطانیہ میں اس دن بے وقوف بننے والے لوگوں کو اپریل فول (APRIL FOOL) کا نام دیا جانے لگا۔

تاریخ اسلام میں بھی یکم اپریل کے دن سے ایک تلخ یاد وابستہ ہے۔ اسپین پر عیسائیوں کے دوبارہ قبضے کے بعد عیسائیوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ اسپین میں مسلمانوں کے مکمل اور جلد از جلد خاتمے کے لیے بادشاہ فرڈیننڈ نے اعلان کیا کہ یہاں مسلمانوں کی جان محفوظ نہیں ہے ہم ان کے کسی اسلامی ملک میں جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ جو مسلمان جانا چاہیں حکومت انہیں بذریعہ بحری جہاز بھجوا دے گی۔ لاتعداد مسلمان کسی اسلامی ملک میں بسنے کی خواہش میں بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔ بیچ سمندر میں فرڈیننڈ کے چیلوں نے اس جہاز میں بارود سے سوراخ کر دیا اور خود حفاظتی کشتیوں کے ذریعے بچ نکلے۔ پورا جہاز چشم زدن میں مسافروں سمیت غرق آب ہو گیا۔ عیسائیوں کی جانب سے بادشاہ فرڈیننڈ کو مسلمانوں کو اس طرح بے وقوف بنانے پر بے تحاشا داد دی گئی۔ اور یہ دن بھی یکم اپریل کا تھا۔

سترھویں صدی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ لندن میں یہ اعلان کیا گیا کہ یکم اپریل کے دن لندن ٹاور (LONDON TOWER) میں دو سفید شیروں کو غسل دیا جائے گا۔ اس لیے آپ شریک ہو کر اس منظر سے لطف اندوز ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ شیروں کو غسل کا منظر دیکھنے کے لیے آنے والے سب لوگ سفید گیٹ سے داخل ہوں گے۔ لوگ اس منظر کو دیکھنے کے لیے جب لندن ٹاور پہنچے تو انہیں پتا چلا کہ نہ تو کوئی سفید گیٹ ہے اور نہ ہی کوئی ایسا کھیل دکھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ لوگ نا صرف شرمندہ ہوئے بلکہ انہوں نے بے وقوف بنائے جانے پر احتجاج بھی کیا۔

مرسلہ: فیصل دین پوری۔ خان پور کٹورا۔

گیا ہے۔ جس پر میں نے بہت زیادہ اعتماد کیا' اسی نے مجھے پھنسوایا ہے۔''

''اس کا نام کیوں نہیں بتاتے آپ پولیس کو؟''

''وہ تو بتاؤں گا ہی۔ عدالت میں بھی کچھ سامنے لایا جائے گا لیکن میں جانتا ہوں ماہ نور..... میرے بیان سے ہوگا کچھ نہیں۔ سزا مجھے ہی ملے گی لیکن افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ تمہاری جوان زندگی برباد ہوگئی میری وجہ سے۔''

''ایسی باتیں زبان پر نہ لائیے۔'' میں نے صدق دل سے کہا اور میری آواز بھرا گئی ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

شجاعت صاحب پھر پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے میری بات ان کے لیے طفل تسلی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔

ان حالات کے باعث میرے والد نے چاہا تھا کہ میں شجاعت صاحب کے بنگلے میں اکیلی نہ رہوں اور گھر آجاؤں لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ میں اب اس گھر میں نہیں جانا چاہتی تھی جہاں میرے والد کی خودغرضی کی بو بسی ہوئی تھی۔

جلد ہی شجاعت صاحب کا کیس عدالت میں آگیا۔ میں نے ان دنوں میں اپنے والد کی کچھ عجیب سی کیفیت دیکھی۔ شجاعت صاحب کی گرفتاری سے وہ پریشان بھی تھے لیکن شاید انہیں دوسری طرف یہ اطمینان بھی تھا کہ شجاعت صاحب کے بعد ان کا پچاس لاکھ کا بنگلہ' کار اور ان کا بینک بیلنس میرا ہوجائے گا۔

میرے شب و روز شدید ذہنی تناؤ میں گزر رہے تھے۔ جمال کی یادیں تو میرے دل و دماغ سے محو ہو ہی نہیں سکی تھیں مگر ان دنوں میں دو ایک بار میرا جی چاہا کہ فون پر اس سے رابطہ کروں لیکن جانے کیوں' ہمت نہیں ہوسکی۔

شجاعت صاحب پر کیس چلتے ہوئے ایک سال گزر گیا۔ ہر سماعت کے موقع پر میں بھی عدالت میں ہوتی تھی۔ اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ مجھے احساس ہوتا چلا گیا کہ شجاعت صاحب کا خیال درست تھا۔ کیس جس رخ پر جارہا تھا' اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔

اس ایک سال میں میرے والد کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ میں ان سے بے رخی برتنے لگی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ کچھ پریشان رہنے لگے تھے۔ اس بارے میں انہوں نے میری والدہ سے یقیناً کچھ کہا ہوگا ورنہ وہ مجھ سے یہ ذکر نہ چھیڑتیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے امی جان۔ میں بس شجاعت صاحب کے لیے پریشان ہوں۔'' میں انہیں ٹال گئی۔ میں ان سے نہیں کہنا چاہتی تھی کہ اپنے والد کے لیے میرے دل میں کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔

ایک دن کوریئر سے میرے لیے ایک پیکٹ آیا۔ وہ جیل سے بھیجا گیا تھا اور بھیجنے والے شجاعت صاحب تھے۔ میں نے بڑے اضطراب کے عالم میں وہ پیکٹ کھولا۔ اس میں کچھ خاص قسم کے کاغذات کے علاوہ میرے نام ایک خط تھا جو شجاعت صاحب نے لکھا تھا۔

پیاری ماہ نور!

میں اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ تمہیں پانے کے بعد مجھے لگا کہ میری زندگی میں بہار کا ایک جھونکا آگیا ہے اور میں تنہا نہیں رہا ہوں لیکن اب لگ رہا ہے جیسے ایک خواب دیکھا تھا۔ اگلی ساعت پر مجھے سزا سنادی جائے گی جس کا اندازہ گزشتہ ساعت پر تمہیں بھی ہوگیا ہوگا۔

اپنی سزا کے اس مکمل یقین کے بعد میں نے وکیل سے یہ کچھ کاغذات تیار کروائے تھے جو تمہیں بھیج رہا ہوں۔ میرا جو کچھ بھی ہے' میرے بعد اس کی مالک تم ہی ہوگی لیکن اس خیال سے کہ کوئی انجانی سی قانونی دشواری تمہارے سامنے نہ آجائے' میں نے یہ کاغذات تیار کروائے ہیں۔ اس کے بعد کوئی دشواری تمہارے سامنے نہیں آئے گی۔

تم ابھی جوان ہو ماہ نور۔ دوسری شادی تمہیں کرنا ہی ہوگی لیکن ایک التجا ہے تم سے..... کبھی کبھی مجھے یاد ضرور کرلیا کرنا..... کروگی نا؟

بدنصیب' شجاعت''

میری آنکھوں سے دو آنسو خط پر ٹپک گئے۔

☆☆☆

میرے والد کے خیال کے مطابق ایک امکان تھا کہ شجاعت صاحب کو عمر قید کی سزا سنائی جاتی لیکن انہیں تو سزائے موت سنائی گئی اور اس دن میں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے مجھے جمال سے نہیں' شجاعت صاحب سے محبت تھی۔

پھر دوسری بار میں اس طرح اس وقت روئی جب شجاعت صاحب کو پھانسی دے دی گئی اور ان کی لاش گھر آئی۔ ان کی تدفین کا سارا بندوبست میرے والد نے کیا۔

اس رات صرف والدہ میرے ساتھ شجاعت صاحب کے بنگلے میں رہ گئیں۔ دوسرے دن انہوں نے میرا عندیہ لینا چاہا کہ اب میں کیا کروں گی۔ ان کی باتوں سے مجھے ایک اندازہ ہوا۔ گزشتہ چند دن میں انہیں بھی شبہ ہوگیا تھا کہ میں اپنے والد سے خوش نہیں تھی لیکن یہ بات میں نے ان پر اب بھی ظاہر نہیں کی پھر چند باتوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔

''کیا اب بھی اکیلی ہی یہاں رہتی رہوگی؟''

''جی۔'' میں نے جواب دیا۔

والدہ چند لمحے کچھ سوچتی رہیں' پھر بولیں ''تمہارے ابو کہہ رہے تھے کہ اگر میں تمہیں نہ سمجھا سکی تو وہ آئیں گے آج تمہیں سمجھانے۔''

''مجھے انتظار رہے گا ان کا۔''

میرا جواب اور میرا لہجہ ایسا تھا کہ وہ میرا منہ تکتی رہ گئیں۔

اسی شام کو والد مجھ سے ملنے آئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ میری والدہ کو ساتھ نہیں لائے تھے۔ مجھے جو باتیں کرنا تھیں' وہ میں اپنی والدہ کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''تم اکیلی کیسے رہ سکتی ہو ماہ نور!'' میرے والد نے کہا۔ ''اس عمر میں کوئی لڑکی اکیلی نہیں رہ سکتی۔''

''کیوں نہیں رہ سکتی؟'' میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''وہ خاتون بھی تو اس عمر میں زیادہ تر اکیلی ہی رہتی ہوں گی جن سے آپ نے پندرہ سال پہلے شادی کی تھی۔''

میرے والد چونکے اور غور سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ساری زندگی میں نے ان سے نگاہیں جھکا کر بات کی تھی لیکن وہ پہلا موقع تھا جب میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی۔ آخر انہوں نے ہی مجھ سے نظریں چرالیں۔ شاید وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ مجھے اس کا علم شجاعت صاحب سے ہوا ہوگا۔

''تو پھر میں بھی اکیلی رہ سکتی ہوں۔'' آخر میں نے کہا اور فیصلہ کن انداز میں ''لیکن میں جس طرح بھی رہوں' یہ میرا معاملہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ آپ مجھ سے اس سلسلے میں بات نہ کریں اور نہ امی سے ایسا کرنے کے لیے کہیں۔''

اس وقت خود میں نے محسوس کیا کہ میں بے ادب ہوجانے کی حد تک گستاخ ہوگئی تھی لیکن اس کے ذمے دار میرے والد خود تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی خودغرضی کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ انہیں صرف میری چھوٹی بہن کی نہیں' اپنے دوسرے گھر' اپنی دوسری بیٹی کی بھی فکر تھی۔

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں کے بیچ میں خاموشی کی ایک دیوار سی کھڑی ہوگئی تھی۔ آخر اس میں شگاف میرے والد ہی نے ڈالا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے ''یہ شجاعت صاحب کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں نے وہ شادی کن حالات میں کی تھی۔''

''مجھے ان حالات سے کوئی غرض بھی نہیں ہے ابو جی۔ نہ میں جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے صرف اتنا احساس ہے کہ آپ کی دوسری شادی کی وجہ سے میں' میرے بھائی بہن اور میری ماں ایک آسودہ زندگی سے محروم رہے۔ آپ کی دوسری شادی ہمارے ساتھ ایک بہت بڑی زیادتی تھی۔''

''تم نے شاید اپنی ماں کو اس بارے میں نہیں بتایا۔''

''بتاؤں گی بھی نہیں۔'' میں نے کہا ''اب اس عمر میں انہیں یہ دکھ کیوں پہنچے۔''

میرے والد چند لمحے خاموش رہے' پھر تھکے تھکے سے انداز میں بولے ''اچھا..... چلتا ہوں۔''

☆☆☆

کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ میں شجاعت صاحب ہی کے بنگلے میں رہتی رہی۔ بس دن میں اپنی والدہ اور بھائی بہنوں سے ملنے چلی جاتی تھی۔ کسی وقت والد بھی گھر پر ہوتے تھے۔ میں ان سے بھی کشیدہ نہیں رہی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بہن بھائیوں کے ذہن پر اس کا کوئی اثر پڑے لیکن میری والدہ کو ضرور احساس تھا کہ میں اپنے والد سے خوش نہیں تھی۔ ان کی دانست میں شاید اس کا سبب یہ تھا کہ..... مجھے انہی کی وجہ سے شجاعت صاحب سے شادی کرنا پڑی تھی' حالانکہ اس کا اصل سبب میرے والد کی دوسری شادی تھی۔

جمال کی یادیں بدستور میری زندگی کا حصہ بنی رہیں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی مجھے نہیں بھولا ہوگا۔ اسے میری شادی کے بعد میری بیوی کا علم بھی ہوگیا ہوگا لیکن اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میرا دل تو بار بار چاہا کہ اس سے رابطہ کروں لیکن جانے کیا بات تھی کہ ہمت نہیں ہوسکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے کہوں گی کیا؟ کیا یہ کہ اب میں..... ایک بیوہ اس سے شادی کرسکتی ہوں؟

لیکن ایک دن ایسا آیا کہ گھٹن کے شدید احساس کے ساتھ میں نے اس کے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا۔

''ماہ نور بول رہی ہوں۔'' میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

دوسری طرف جمال کی افسردہ آواز سنائی دی ''تم نام نہ بتاتیں تو کیا میں تمہیں نہیں پہچانتا؟''

''اتنے عرصے میں تم نے مجھے ایک فون کرنا بھی گوارا نہیں کیا؟''

''تم نے مجھے منع جو کیا تھا۔''

''میں نے!'' میں حیرت سے بولی ''میں نے کب منع کیا تھا؟''

''آخری بار ٹیلی فون پر تم سے جو بات ہوئی تھی' اس

وقت فون بند کرنے میں پہل تم نے ہی کی تھی اور کہا تھا کہ اب تم اپنی شادی کے بعد ہی مجھ سے بات کرو گی۔ تم نے میری بات سنے بغیر فون بند کیا اور یہ بات کہی تو اس کا مطلب یہی ہوا نا کہ جب تم مناسب سمجھو گی' خود ہی بات کرو گی مجھ سے۔''

''غلط مطلب اخذ کیا تھا تم نے۔''

''شاید۔''

''شاید نہیں' یقیناً.....! اور کیا تمہیں اس کا حق نہیں کہ میری بات کی پروا کیے بغیر مجھ سے رابطہ کرتے؟''

''تمہاری شادی کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ میرے تمام حقوق ختم ہو گئے۔''

''شادی کے بعد میں یقیناً تم سے رابطہ کرتی اور تمہیں بتاتی کہ میں کن حالات میں اس شادی کے لیے مجبور ہوئی ہوں لیکن شادی کے چند دن بعد ہی حالات ایسی صورت اختیار کرتے چلے گئے کہ میں تم سے رابطہ نہیں کر سکی۔''

''مجھے سب معلوم ہے۔''

''اب میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں اس شادی کے لیے کیوں مجبور ہوئی تھی' مگر فون پر یہ باتیں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ کیا آج تم کہیں مل سکتے ہو؟''

''میرے لیے اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے ماہ نور.....!''

''تو میرے گھر آجاؤ۔''

''کیا یہ مناسب ہوگا؟ وہاں ملازم تو ہوں گے۔''

''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔''

''تو میں آجاتا ہوں۔''

ایک وقت مقرر ہوا اور جمال اس وقت مجھ سے ملنے آ گیا۔ ابتدائی چند رسمی باتوں کے بعد ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم دونوں کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ میری شادی اور اس کے بعد میری بیوگی کا فاصلہ۔

یہ سکوت ٹوٹنے کا بہانہ وہ ملازم بنا جو مشروب کی ٹرے لے کر آیا تھا جس کی ہدایت اسے میں نے ہی دی تھی۔

''تمہاری پسند کا مشروب بنوایا ہے میں نے۔'' میں جمال سے بولی۔

''اتنے عرصے میں تو اپنی پسند' ناپسند' سب کچھ بھول چکا ہوں میں ماہ نور۔'' جمال کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔

میں تڑپ گئی اور اگر میں نے خود کو قابو میں نہ رکھا ہوتا تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپک جاتے پھر میں نے یک بیک بولنا شروع کر دیا' جیسے کوئی مشین چل پڑی ہو۔ میں نے جمال کو اپنی شادی کے بارے میں بتانے کے ساتھ اپنے والد کی شادی کے بارے میں بھی بتا دیا۔ کوئی بات ایسی نہ رہی جو تشنہ رہ جاتی اور جمال کو کوئی سوال کرنا پڑتا۔

پھر چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے پوچھا ''کیا میں نے غلط فیصلہ کیا تھا جمال؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا ''ماں باپ کے لیے اولاد کو ایسی قربانی دینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے لیکن اب..... آئندہ کے لیے تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''اس کے علاوہ کیا پروگرام ہو سکتا ہے جمال کہ اپنی باقی زندگی مجھے ایک بیوہ کی حیثیت سے گزارنا ہوگی۔''

''کیوں ماہ نور.....؟ کیا اب بھی میرے اور تمہارے بیچ میں کچھ حائل ہے؟''

''ہاں۔'' مجھے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہا ''میری بیوگی۔''

''میں تمہارے دل میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہنے دوں گا ماہ نور۔'' جمال نے شدید جذباتی لہجے میں کہا ''لیکن ایک شرط ہے میری۔ تمہارا یہ بنگلہ' یہ کار' تمہارا بینک بیلنس کچھ بھی ہماری زندگی کو نہیں چھوئے گا۔ تمہیں میری مالی حیثیت کے مطابق زندگی گزارنا ہوگی۔''

''تمہارے مقابلے میں ان چیزوں کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں ہے جمال۔''

''بس تو اب ہم بہت جلد ایک ہو جائیں گے۔ محرومیوں کی کسک ہماری زندگی سے ختم ہو جائے گی۔''

''لیکن تمہارے گھر والے.....''

''اس کے لیے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

☆☆☆

اور پھر میری زندگی میں بہاریں لوٹ آئیں' لیکن شادی سے پہلے میں نے بنگلہ اور کار بیچ کر رقم بینک میں جمع کروا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کیا کہ اپنی چھوٹی بہن صفورا اور اپنے والد کی دوسری بیوی کی بیٹی کے نام سے نہایت معقول رقومات بینک میں فکس ڈپازٹ میں ڈال دیں۔ وہ رقومات ان کی شادیوں ہی کے موقع پر نکالی جا سکتی تھیں۔ اب جو باقی رقم بینک میں رہ گئی ہے' میں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں کہ وہ کسی فلاحی ادارے کو دے دوں یا ان سے کچھ غریب لڑکیوں کی شادی کروا دوں تاکہ ان کی وجہ سے ان کی کسی بہن کو میری طرح اپنے ارمانوں کا قتل نہ کرنا پڑے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

تحریر: یمنیٰ احمد

جناب مدیر صاحب، آداب!

آپ کے پرچے اور اس میں چھپنے والی سچی کہانیوں کے تعلق میں نے سنا۔ میں اردو بہت زیادہ تو نہیں جانتی مگر بات چیت کر لیتی ہوں۔ اگر پاکستان میں رہتی تو میں آسانی سے پڑھنا لکھنا بھی سیکھ جاتی۔ مگر وہاں کے خاندانی اور قبائلی جھگڑوں نے مجھے ایک دم غموں کی گہرائیوں میں دھکیل دیا اور مجھے اپنا سب کچھ لٹا کر واپس آنا پڑ گیا۔ یہ واقعہ صرف اس لئے بھجوا رہی ہوں کہ اس ترقی یافتہ دور میں ایسی جاہلانہ روایتوں کو اب ترک کر دینا چاہئے جو دو انسانوں ہی نہیں' کئی خاندانوں اور نسلوں کو تباہ کر ڈالتی ہیں۔

دور دراز سے دعاؤں کی طالب
فاطمہ حیدر، امریکا

گاڑی بڑی روانی سے صاف ستھری اور کشادہ سڑک پر پھسل رہی تھی یوں جیسے بلیئرڈ کی میز پر اس کی گیندیں۔ آس پاس ٹنڈ منڈ پہاڑی نما ٹیلوں اور بے برگ درختوں کا لینڈ اسکیپ ایک خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا وہ میرے برابر میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ انیتا میری دوست قدرے صحت مند اور دلکش تھی۔ اس کی سوجھی ہوئی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ یا تو رات دیر تک جاگتی رہی ہے یا روتی رہی ہے۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھری وہی پرانا مسئلہ ہوگا۔ اس کا نکھٹو اور شرابی شوہر ہر روز کی طرح اس سے لڑا ہوگا ''اف یہ مشرقی عورتیں'' میں نے سر جھٹکا۔

''تم مشرقی لوگ شادی کو عمر بھر کی قید کیوں بنا لیتے ہو بیڑیوں سے جکڑے رہتے ہو' دونوں کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہونا کتنا مشکل ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو ناممکن۔ اس مختصر سی زندگی کو تم لوگ عذاب ناک چیز بنا دیتے ہو۔''

''ہمارے ہاں انفرادی خوشی کا نام زندگی نہیں بلکہ ہم اجتماعی صورت میں رہتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''اور خود کو فریب دیتے ہیں دکھ اٹھاتے ہیں سمجھوتے

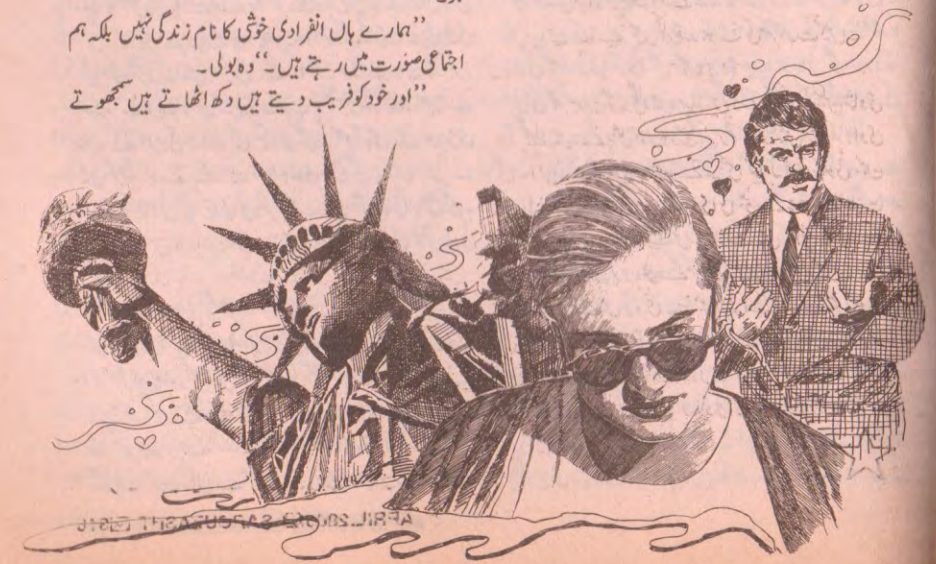

وقار قریم
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

میں پوری زندگی بتا دیتے ہیں' یہ جھوٹ یہ فریب' ریاکاری منافقت نہیں تو اور کیا ہے۔''

''ریٹا! تم نہیں سمجھو گی ہم رشتوں کی کسی ان دیکھی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک بھی کڑی کھل گئی تو سمجھو ہم سب بکھر کر رہ جائیں گے۔''

''کیسی زنجیر؟'' میں نے اپنے سنہری بال جھٹکے سے پیچھے کیے جو ہوا سے بار بار میرے منہ پر آ رہے تھے۔

اگر میں آکاش سے علیحدگی لے لوں تو سمجھ لو ہمارا پورا خاندان تباہ ہو جائے گا۔ ایک میری وجہ سے دو گھرانے برباد ہوں گے۔''

''تو ان لوگوں کی وجہ سے تم یہ پریشانی اٹھاتی رہو گی۔ تمہاری کوئی زندگی نہیں' تمہاری خوشی کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟'' میں حیران رہ گئی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نہ ریٹا تم نہیں سمجھو گی۔''

''انیتا! بھول گئیں ایک دفعہ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ ریٹا تمہاری یہ سنہری زلفیں اور نیلی آنکھیں تو تمہیں مغربی لڑکی ثابت کرتی ہیں مگر تم دل کی گہرائیوں سے ایک مکمل مشرقی دوشیزہ ہو۔'' میں شرارت سے ہنسی۔ اس کے لبوں پر بھی ایک مدھم سی مسکراہٹ لود ینے لگی۔

گاڑی نے موڑ کاٹا اور ہم اپنے ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر پہنچ گئے جہاں میں اور انیتا گذشتہ پانچ سال سے کام کر رہے تھے۔ یہیں میری انیتا سے ملاقات ہوئی تھی اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی اور چند ہی دنوں میں ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ انیتا کا تعلق انڈیا سے تھا۔ وہ اکثر مجھے وہاں کی باتیں بتاتی رہتی تھی۔ جو میرے لیے بڑی دلچسپ ہوا کرتیں تھیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں مشرق کے ممالک دیکھوں ان کا طرز معاشرت ان کا رہن سہن مجھے بہت پرکشش لگتا تھا۔ انیتا سے میں نے اس کی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ ہم آپس میں اردو ہی میں گفتگو کرتے تھے جسے انیتا ہندی کہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ اکثر اس کی کمیونٹی کی تقریبات میں بھی جاتی رہتی تھی۔ جب میں اس کا لباس یعنی ساڑی پہنتی تو انیتا بڑی خوش ہوتی تھی۔

ہمارے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں پاکستان سے تعلق رکھنے والا ایک لڑکا حیدر بھی کام کرتا تھا۔ وہ میری ٹوٹی پھوٹی اردو سن کر مسکرا دیتا اور کبھی کبھی کسی جملے کی تصحیح بھی کر دیتا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا لڑکا تھا۔ کسی قدر دراز قامت اور ہینڈسم تھا۔ میری نوٹ کے مطابق تو... وہ مسلمان تھا اور امریکا میں گذشتہ سات سال سے مقیم تھا اس کے مسلمان ہونے کی وجہ سے میں اس سے تھوڑا دور دور رہتی تھی کیونکہ گیارہ ستمبر کے بعد مسلمان کسی نہ کسی صورت زیرِ عتاب آئے ہوئے تھے اور جھوٹ کیوں بولوں خود میرے خیالات بھی ان کے بارے میں کچھ ایسے ہی تھے کہ یہ لوگ بہت انتہا پسند ہوتے ہیں۔ مگر حیدر بڑا مہذب اور پروقار لڑکا تھا۔ بہت خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا محنتی لڑکا بھی۔ اسے انتھک محنت کرتے دیکھ کر میں سوچتی تھی کہ ''یہ اپنی ساری محنت کی کمائی اپنے گھر والوں کو بھجوا دیتا ہو گا۔ وہاں سے فرمائشی خط آتے ہوں گے' فون آتے ہوں گے اور یہ بے چارہ نئے سرے سے زیادہ سے زیادہ محنت کرنے میں جت جاتا ہو گا تاکہ ان کی خواہشات پوری کر سکے۔'' میں نے جھرجھری سی لی یہ مشرقی لوگ اپنے خاندان کی اکائی کو برقرار رکھنے کے لیے بلکہ بعض نکھٹو اور کام چور لوگوں کو پالنے کے لیے بھی یوں دن رات کولہو کے بیل بنے رہتے ہیں اور ان کے متعلقین کو اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا ہو گا۔ کیا یہ احمق ہوتے ہیں؟

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے حیدر میری بڑی اچھی دوست ہو گئی۔ ہوا یوں کہ اینڈریو جس کے ساتھ میں کبھی کبھار ڈیٹ پر چلی جایا کرتی تھی وہ کچھ عرصے پہلے میرا دوست رہا تھا مگر خود ہی مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کوئی اطلاع دیے بغیر مہینوں غائب رہتا تھا اور پھر اچانک ہی نمودار ہو جاتا تھا۔ مگر اس بار میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے بالکل لفٹ نہیں کراؤں گی۔ انیتا بھی اسے بالکل پسند نہیں کرتی تھی بلکہ وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ میں کسی شریف آدمی سے شادی کر کے گھر بسا لوں۔ میں یہ سن کر اسے کہتی شریف آدمی سے اس کی شادی شدہ زندگی کا طعنہ دیا کرتی تھی جس پر وہ چپ ہو جاتی تھی۔ اس کا درد اس کی آنکھوں میں ہلکورے لینے لگتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے حیدر کی آنکھوں سے بھی انیتا جیسا ہی غم جھلکتا ہوا نظر آتا تھا۔

ہاں تو میں وہ واقعہ بتا رہی تھی جس کی وجہ سے حیدر سے میری دوستی ہوئی تھی۔ اس دن اینڈریو کئی مہینوں کے بعد اچانک ہی میرے سامنے آیا۔ میں چھٹی کے بعد گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی اور خاصی بے رخی سے میں نے اس کی باتوں کا جواب دیا مگر اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا اور میں انکار کرنے لگی۔ حیدر کہیں دور سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ میرے انکار میں ہلتے ہوئے سر کو دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ وہ ہم دونوں کے قریب آیا اور اینڈریو سے شستہ انگریزی میں مخاطب ہوا کہ ''یہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گی

کیونکہ اب ریٹا میری دوست ہے چلو ریٹا دیر ہو رہی ہے۔'' حیدر نے مجھ سے کہا اور اینڈریو کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اینڈریو غصہ میں بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔

''تھینک یو حیدر۔'' میں اس کے قریب آ کر بولی۔

''ریٹا یہ اینڈریو پھر آ گیا؟'' انیتا تیزی سے میرے قریب آ کر بولی۔

''اب نہیں آئے گا۔'' میرے بجائے حیدر بولا اور ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ وہ کچھ نہ سمجھ کر بھی ہماری ہنسی میں شریک ہو گئی تھی۔

اس واقعہ کے شاید دو تین دن بعد اینڈریو ایک رات میرے فلیٹ پر آیا اور مجھے حیدر کو جان سے مارنے کی دھمکی دینے لگا۔ اس نے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ میری چیخوں کی آواز جب پڑوسیوں نے سنی تو انہوں نے پولیس کو انفارم کر دیا چند ہی لمحوں میں پولیس میرے فلیٹ پر پہنچ گئی اور اینڈریو کو پکڑ کر لے گئی۔ میں جسمانی طور پر اتنی مجروح نہیں تھی جتنا روحانی طور پر مجھے صدمہ پہنچا تھا مگر اس کی ذمہ دار میں خود تھی۔ اس صدمے نے مجھے بیمار کر دیا اور میں جاب پر نہیں جا سکی دو دن میں بخار میں پھنکتی رہی۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے میں اٹھی اور کافی کا پانی چولہے پر رکھا اتنے میں ڈور بیل بجی میں نے دروازہ کھولا تو سامنے انیتا اور حیدر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان دونوں کے چہروں پر اپنے لیے فکرمندی کے تاثرات دیکھ کر مجھے انجانی سی خوشی کا احساس ہوا اور ایک طرف ہو کر میں نے ان دونوں کو فلیٹ میں آنے کا راستہ دیا۔

''کیا ہوا ریٹا خیر تو ہے تم کام پر نہیں آ رہیں تھیں۔ ہم دونوں کو تمہاری فکر ہوئی۔ اس لیے تمہاری خیریت معلوم کرنے چلے آئے۔'' حیدر بولا۔

اس کے ہمدردانہ الفاظ سے میرا دل بھر آیا ''میں۔ میں کچھ بیمار تھی۔'' میں ہکلا کر رہ گئی۔

''چولہے پر کچھ ہے کیا؟'' انیتا بولی۔

''اوہ! میں نے کافی بنانے کے لیے پانی رکھا تھا۔''

''تم بیٹھو میں دیکھتی ہوں۔'' انیتا کچن کی طرف بڑھ گئی۔

حیدر مجھے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک گمبھیر خاموشی ہمارے درمیان چھائی ہوئی تھی۔ انیتا ہم تینوں کے لیے کافی لے کر آ گئی۔ اور میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ''یہ تمہارے چہرے اور گردن پر نشان کیسے ہیں؟'' وہ بغور میرے چہرے اور گردن کو دیکھتے ہوئے بولی ''چوٹ لگی ہے؟''

''ہاں بہت گہری چوٹ لگی ہے۔'' میں انیتا کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا تھا؟ کون تھا وہ؟''

''اینڈریو۔''

''اوہ! عورت چاہے مغرب کی ہو یا مشرق کی مظلوم ہی ہے۔'' وہ زمانے بھر کی تلخی اپنے لہجے میں سمو کر بولی۔

''کہاں ملے گا اس وقت وہ؟'' حیدر کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''اس وقت وہ اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہو گا میں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔'' میں نے خود کو سنبھالا اور انیتا کا دیا ہوا کپ تھاما۔

''تم نے ہمیں فون تک نہیں کیا۔'' حیدر کافی کا کپ تھامتے ہوئے بولا۔

''میں تم لوگوں کی مصروفیات میں مخل ہونا نہیں چاہتی تھی۔''

''ہم مشرقی لوگوں کے پاس وقت ہی وقت ہوتا ہے۔ اپنے دوستوں کی خبر گیری کے لیے۔'' وہ خوشگوار موڈ میں آتا ہوا بولا۔

''تم نے کچھ کھایا یا بھوکی ہو؟'' انیتا چونک کر بولی۔

''نہیں دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔''

حیدر یہ سنتے ہی اٹھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ کھانے پینے کی چیزوں سے لدا پھندا آیا اور دونوں نے اصرار کر کے مجھے کھلایا۔ انیتا مجبوراً جانے کے لیے اٹھ گئی اور حیدر کو تاکید کر گئی کہ وہ میرا خیال رکھے۔ حیدر نے وہ رات میرے فلیٹ پر ہی گزاری تھی۔ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا اور میری بڑی دیکھ بھال کی۔ میں اس کے حسنِ سلوک سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ یہ پردیسی انسان جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا جو میرا ہم مذہب بھی نہیں تھا وہ اپنوں سے بڑھ کر میری مدد کر رہا تھا۔

میں کام پر واپس آئی تو میں نے حیدر اور انیتا کا شکریہ ادا کیا۔ وہ پیارے لوگ برا ماننے لگے۔ ہم تینوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے ''حیدر ایک بات پوچھوں؟''

اس نے کہا ''ہاں بالکل پوچھو۔''

''تم اور انیتا ایک جیسے ہو' زبان ایک ہے' رہن سہن بھی ملتا جلتا ہے' لباس بھی۔ تو کیا وجہ ہے جو تم لوگوں میں اتنی دوری ہے؟ کہیں وجہ مذہب تو نہیں؟ انیتا ہندو ہے اور تم مسلمان۔''

''نہیں ریٹا یہ بات نہیں ہے۔ دنیا کا ہر مذہب صرف اور صرف انسانوں سے محبت سکھاتا ہے' نفرت نہیں۔ یہ تو ہمارے ملکوں کے سیاست دان ہیں جنہوں نے اپنی سیاست کی دکان

چکانے کے لیے ہم لوگوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بوئے تھے مگر اب وقت ان کا نہیں رہا ہمارا ہے۔ کیوں انیتا؟''

''بالکل حیدر۔ اب واقعی حالات بدل رہے ہیں نفرت کے لیے عداوت کے لیے ہمارے پاس ٹائم نہیں ہے۔ یہ مختصر سی زندگی محبت کے لیے ہی بہت کم ہے۔'' انیتا مسکرائی۔

''انیتا نے تو مجھے اپنے کلچر کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے اور اپنی مذہبی تقریبات میں بھی مجھے اپنے ساتھ لے کر گئی ہے مگر حیدر میں چاہتی ہوں کہ اسلام کے بارے میں بھی کچھ جانوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ میں تمہیں اسلامک سینٹر لے چلوں گا وہاں تمہیں اسلام کے بارے میں ہر طرح کی معلومات ملیں گی۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔

پھر ایک جمعہ کی شام کو میں حیدر کے ساتھ اسلامک سینٹر گئی اسلام کی دل موہ لینے والی باتوں نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ پھر میں اکثر اکیلے ہی اسلامک سینٹر جانے لگی۔ آخر اسلام نے میرے دل و دماغ کو تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر منور کر دیا اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔ میرا اسلامی نام فاطمہ رکھا گیا جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔ میں نے ابھی یہ بات حیدر اور انیتا سے بھی چھپائی تھی۔ اس روز اسٹور میں راحیلہ سے اچانک سامنا ہوا تو وہ تیزی سے میرے پاس آئی اور زور سے بولی ''فاطمہ تم یہاں جاب کرتی ہو؟'' حیدر میرے قریب ہی کھڑا تھا اس نے بھی یہ سن لیا راحیلہ سے میری دوستی اسلامک سینٹر میں ہی ہوئی تھی۔ حیدر نے کہا ''محترمہ یہ ریٹا ہیں فاطمہ نہیں۔''

''ارے! مسٹر آپ کو نہیں پتا' انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور اللہ کے فضل سے یہ مسلمان ہیں۔''

''کیا؟'' حیدر خوشی سے چیخ پڑا۔

''تم نے مجھے نہیں بتایا۔ اتنی بڑی خوشی کی خبر مجھ سے چھپا کر رکھی۔''

''میں مناسب وقت کے انتظار میں تھی۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔

انیتا نے جب یہ سنا تو ایک رنگ سا اس کے چہرے پر آ کر گزر گیا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے انیتا کو میرا مسلمان ہونا ناگوار گزرا ہو۔ بہرحال وہ میری اچھی دوست تھی جس سے میں اپنے دل کی بہت سی باتیں کر لیا کرتی تھی۔ میں حیدر کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی چمک محسوس کر رہی تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ انیتا نے بھی مجھ سے کہا کہ اگر حیدر تمہیں پرپوز کرے تو تم اسے قبول کر لینا۔ وہ تمہیں چاہتا ہے جو لڑکی بھی بیوی بن کر اس کی زندگی میں آئے گی بہت خوش قسمت ہوگی۔ خود میں بھی حیدر کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ اپنی زندگی بتانا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے اچانک چپ ہو جاتا تھا کہیں کھو جاتا تھا۔ کچھ کہتے کہتے رک جاتا گڑبڑا جاتا۔ میں عجیب الجھن میں گرفتار تھی۔ آخر میں نے ہی بات کرنے کی ٹھانی ''حیدر کئی دنوں سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

''فاطمہ دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو مگر.....''

''مگر؟''

''میں تمہیں اپنا نہیں سکتا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔ میری شادی میری مرضی کے خلاف زبردستی میری کزن سے کر دی گئی تھی۔ اب میں اور وہ ہم دونوں اپنے گھر والوں کے لیے سزا بھگت رہے ہیں۔''

''وہ تمہیں پسند نہیں تو تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔

''تم نہیں سمجھو گی۔'' اس نے بھی کہی ہوئی انیتا کی بات دہرائی۔

''میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

''اچھا مجھے سوچنے دو۔''

''اوکے۔'' میں اسے خدا حافظ کہہ کر چلی آئی۔

اس دن میری خوشی کی انتہا نہیں تھی جب حیدر نے مجھے پرپوز کیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر نیا بہتر علاقے میں فلیٹ خرید لیا اور میں نے اسے بڑے خوبصورت انداز میں ڈیکوریٹ کیا۔ پھولوں اور پودوں سے مجھے عشق تھا۔ میں نے اپنے فلیٹ کو انڈور پلانٹس سے سجا دیا۔ حیدر اور انیتا فلیٹ کی سجاوٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم دونوں کی شادی میں انیتا نے بھرپور انداز میں شرکت کی۔ اسلامک سینٹر کی میری دوستوں نے تمام رسومات ادا کیں جو ایسے موقعوں پر ادا کی جاتی ہیں۔ میری طرف سے تو کوئی شادی میں شرکت کرنے کے لیے تھا ہی نہیں لیکن حیدر کی طرف سے اس کی کمیونٹی کے لوگوں نے بھرپور شرکت کی۔ مجھے ان کی رسومات بہت دلچسپ لگیں۔ مجھے مشرقی انداز کی دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ میں حیدر کو پا کر بہت ہی خوش تھی اور حیدر بھی والہانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے دن رات حیدر کی چاہت میں بسر

ہو رہے تھے میں خدا کا شکر ادا کرتی تھی جس نے مجھے حیدر جیسا شوہر عطا کیا تھا۔ ہم دونوں نے کچھ دنوں بعد جاب پر جانا شروع کر دیا تھا۔ پھر اسے ایک بہت اچھی جاب کی آفر ہوئی تو وہ وہاں چلا گیا۔ اب اس کی تنخواہ میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ سب تمہاری خوش بختی کی وجہ سے ہوا ہے۔ ہم دونوں ہی بہت خوش رہتے تھے۔ ہاں مگر جب بھی پاکستان سے کوئی خط آتا تھا تو وہ ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔ میں کریدکرید کر اس سے پوچھتی کہ خط میں ایسی کیا بات لکھی ہے جو وہ یوں چپ ہو جاتا ہے۔ وہ اکثر مجھے بتا دیا کرتا میں اس سے ضد کرنے لگی کہ مجھے اردو لکھنا پڑھنا سکھا دو تو حیدر نے مجھے اردو لکھنا پڑھنا بھی سکھا دیا۔

اس دن پاکستان سے اس کی بیوی کا خط آیا تو وہ پھر گم صم سا ہو گیا تھا۔

''حیدر تم اجازت دو تو یہ خط میں پڑھ لوں؟'' میں نے خط کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم میری شریک حیات ہو یہ خط بھی اعتماد کا بندھن ہے' لو پڑھو۔'' اس نے خط مجھے تھما دیا۔

''میرے مالک مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وہاں کسی میم سے شادی کرنے والے ہیں یا شاید کر چکے ہیں۔ آپ جو کچھ کرنے والے ہیں یا کر چکے ہیں۔ میرے نزدیک وہی صحیح ہے۔ میں جس دن سے آپ سے وابستہ ہوئی ہوں اس دن سے لے کر آج تک میں نے اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھا ہے کہ آپ کے لیے باعثِ راحت بنوں' آپ کی راہ کی رکاوٹ نہیں۔ لیکن آپ کے لیے باعثِ راحت بننے کی سعادت میری قسمت میں نہیں تھی۔ اب میرا فرض یہی ہے کہ آپ کی راہ میں رکاوٹ بھی نہ بنوں۔ مرنا بہت آسان ہے مگر میں مرنا نہیں چاہتی زندہ رہنا چاہتی ہوں اس دنیا میں، جس دنیا میں آپ رہتے ہیں۔ میں اس دنیا میں آپ کی کامیابیوں اور مسرتوں کو دیکھنے کے لیے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ میں آپ کی مسرتوں کو دور سے دیکھوں گی یہی میرے لیے مسرت کا سامان ہوگا۔ میری آرزو ہے کہ میں ہر حال میں آپ کے نام سے وابستہ رہوں۔ میں ہمیشہ سے آپ کی ہوں مگر آپ میرے نہیں ہیں۔ میں آپ سے جدا ہو کر بھی آپ کی رہوں گی۔ آپ میرے نہیں رہیں گے اب بھی تو میرے نہیں ہیں۔ میں نے اپنی یہ زندگی آپ کے نام کی ہے یہی میرا فیصلہ ہے۔ خدا آپ کو شاد و آباد رکھے۔ کامیابیاں عطا کرے آپ پر اپنی رحمتیں نچھاور کرے آمین۔ آپ کی عطیہ۔''

عطیہ کے خط نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آخر اسے کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟

''حیدر پاکستان چلیں۔ میں عطیہ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''جذباتی نہ بنو۔''

اب مجھے حیدر کے کھوئے کھوئے رہنے کی وجہ معلوم ہو گئی تھی۔ ''میں اور عطیہ ایک ساتھ رہیں گے۔'' میں نے اصرار کیا تو وہ بولا۔

''تمہیں نہیں پتا کہ تم کیا کہہ رہی ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''ممکن ہے۔''

''پاگل مت بنو۔''

''حیدر مجھے ایک بار پاکستان لے چلو۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''یہ میری برسوں پرانی خواہش ہے۔''

''مجھے پتا ہے تم کس لیے کہہ رہی ہو۔''

''آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

''تم وہاں کے ماحول سے واقف نہیں ہو۔''

''ہم عطیہ کو یہاں لے آئیں گے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟'' اس نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ میں خاموش ہو گئی۔ میرے روٹھے روٹھے انداز کو دیکھتے ہوئے حیدر میرے پاس آیا اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا ''اچھا بابا ہم پاکستان چلیں گے مگر نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں زندہ واپس نہیں آؤں گا۔'' اس کی اس بات نے مجھے دہلا دیا۔

''میں اب تم سے کبھی وہاں جانے کی ضد نہیں کروں گی پلیز تم ایسی باتیں نہیں کرو۔'' میں نے حیدر کے کاندھے پر سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''فاطمہ میرا فرض ہے کہ میں تمہیں وہاں کے حالات سے متعارف کرواؤں۔ میں ڈرپوک یا بزدل نہیں ہوں۔ میں مرنے سے بھی نہیں ڈرتا مگر میں صرف اور صرف تمہاری اور عطیہ کی خاطر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اس کے بھائی نہایت جاہل اور اجڈ ہیں عطیہ ان سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے جو ان سب سے مختلف ہے۔ اس نے تعلیم بھی حاصل کی ہوئی ہے اور وہ نہایت مہذب اور سمجھدار بھی ہے مگر وہ مجبور ہے حالات سے'' وہ چپ ہوا تو میں نے کہا..... ''تمہیں اس سے اتنی ہمدردی تھی تو تم نے اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا؟''

''وہ مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑی ہے اس کے علاوہ نہ جانے کیا بات ہے میں اس کے لیے کبھی بھی اپنے دل میں

محبت کا جذبہ محسوس نہیں کر سکا۔ یہ انتقامی جذبہ ہماری زبردستی کی شادی کی وجہ سے ابھرا۔'' نجانے کیا بات ہے مجھے اس سے ایک انجانی سی چڑ رہی ہے۔ مگر میں پھر بھی اس کی محبت کی قدر کرتا ہوں اور اس سے وابستہ رہنا چاہتا ہوں۔ اسے اپنا نام اور مقام دینا چاہتا ہوں۔''

☆☆☆

حیدر کی سرگرمیاں کچھ دنوں سے بڑی پُراسرار سی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی بات چھپانا چاہتے ہیں۔ آخر اس دن ڈراپ سین ہو ہی گیا وہ ہاتھ میں دو ٹکٹ لائے اور میری گود میں ڈالتے ہوئے بولے ''چلو بھئی فاطمہ پاکستان چلنے کی تیاری شروع کر دو۔ ہم چار دن بعد فلائی کرنے والے ہیں۔'' خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی اپنا وطن پھر اپنا ہوتا ہے۔ ان کی خوشی نے مجھے بھی سرشار کر دیا۔ وہ رات ہم نے پاکستان کے بارے میں ڈھیروں باتیں کرتے ہوئے گزاری۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے کام سے ایک ماہ کی رخصت لی۔ حیدر کو چھٹی بڑی مشکل سے مل سکی تھی۔ کیونکہ یہ ان کی نئی نئی جاب تھی۔

جہاز کے پہیوں نے کراچی ائرپورٹ کے رن وے کو چھوا تو حیدر نے بے تابی سے جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ان کی آنکھوں کی الوہی چمک نے مجھے بھی ایک انجانی سی مسرت سے ہمکنار کر دیا۔ حیدر کی بے تابی دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے ماں سے بچھڑا ہوا معصوم سا بچہ ماں کو دیکھ کر بے اختیار اس کی طرف لپکتا ہے۔ دھرتی ماں کی آغوش میں چھپ جانے کے لیے۔

''تھینک یو فاطمہ! شاید تم اتنی ضد نہ کرتیں تو میں اس خوشی سے محروم رہتا جو اس وقت مجھے محسوس ہو رہی ہے۔''

میں نے سر شاری سے اپنا سر ان کے کاندھے پر ٹکا دیا۔

کسٹم، امیگریشن کاغذات کی جانچ پڑتال، سامان کی چیکنگ وغیرہ سے نمٹنے میں ہمیں بہت دیر لگ گئی۔ میں یہاں کی افراتفری دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ مگر یہ سب شاید ان لوگوں کے معمولات میں شامل تھا۔ یہاں کا نظام انتہائی بدانتظامی کا شکار نظر آیا۔

''کس قدر وقت ہے ان لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لیے۔'' میں نے بے دلی سے سوچا۔ وقت کی قدر کا کسی کو بھی کوئی احساس ہی نہیں تھا کوئی بھی کام منظم طریقہ سے نہیں تھا۔ میں کوفت میں مبتلا ہو گئی۔ حیدر بے چارے ایک کاؤنٹر سے دوسرے کاؤنٹر پر چکر لگا رہے تھے تھکن ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ آخر خدا خدا کر کے ہم تمام مراحل سے نمٹ کر ائرپورٹ سے باہر آئے ٹیکسی لی اور ہوٹل روانہ ہو گئے۔

میں ٹیکسی سے باہر نظارے دیکھنے میں محو ہو گئی۔ میرے صاف ستھرے چمکتے دمکتے وطن کے مقابلے میں یہاں میرا پہلا تعارف ہی جن عمارتوں اور سڑکوں سے ہوا وہ سب مجھے میلی اور گرد سے اٹی ہوئی لگی تھیں۔ مسلمانوں میں تو صفائی نصف ایمان ہے پھر ایک اسلامی ملک میں صفائی کا یہ فقدان مجھے قابلِ افسوس لگا۔ مگر میں نے اپنے خیالات اپنے تک ہی محدود رکھے۔ حیدر کو ان میں شامل نہیں کیا۔

ہم بے ہنگم اور ہر قاعدہ قانون سے آزاد ٹریفک میں پھنستے ہوئے بالآخر ہوٹل پہنچ گئے جو کسی قدر صاف ستھرا تھا۔ ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مختلف شہروں سے گھومتے ہوئے ہم میانوالی جائیں گے جہاں کے مضافات میں حیدر کا گھر تھا۔ حیدر گھر جاتے ہوئے کسی قدر خوف زدہ تھے مگر میں نے ان کی ڈھارس بندھائی اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی کہ کچھ نہیں ہوگا ان کے گھر والوں کو ہماری شادی کی خبر تو پہلے سے تھی اس لیے وہ مجھے حیدر کے ساتھ دیکھ کر شدید ردِعمل ظاہر نہیں کریں گے۔ ہم پروگرام کے مطابق دو چار روز ہی وہاں ٹھہریں گے۔

پھر یوں ہی ہوا۔ ہم کراچی سے لاہور اور اسلام آباد وغیرہ گھومتے ہوئے بغیر کسی اطلاع کے حیدر کے گھر پہنچ گئے۔ میں نے پاکستان آ کر اپنے لباس کا خاص طور پر بہت خیال رکھا تھا اور اس وقت بھی میں نے مکمل شرقی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ حیدر کے تمام گھر والے اکٹھا ایک بڑی شاندار حویلی میں رہتے تھے ان کے والد بڑے زمیندار تھے۔ راستے بھر لوگ مجھے بڑی عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ مجھے ان کا یوں خود کو دیکھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حیدر نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی۔ ہمارے آنے کی خبر جیسے ہی حویلی پہنچی تو..... حویلی کے دروازے پر ہی مردوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی تھی۔ حیدر دوڑ کر گیا اور ایک دراز قامت قدرے بڑی عمر کے آدمی سے بغل گیر ہوا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ حیدر کے والد تھے جو حیدر کے بڑے بھائی لگ رہے تھے اس عمر میں اتنی قابلِ رشک صحت دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ وہ میرے نزدیک آئے میرے سر پر ہاتھ پھیرا پھر وہ لوگ مجھے حویلی کے اندرونی حصے میں لے گئے جہاں گھر کی خواتین رہائش پذیر ہوتی ہیں۔ انہیں مردانے میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ حیدر اور ان کے والد بھی ہمارے ساتھ چلے آئے تھے۔ ''ارے حیدر کی ماں دیکھو تو کون آیا ہے۔'' ابا جی زور سے بولے۔

حیدر کی امی اور دوسری رشتہ دار خواتین ہمیں گھیر کر کھڑی ہو گئیں وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں مجھے اردو بولتا دیکھ کر سب بہت خوش ہوئیں۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے دو تین دن گزر گئے تھے۔ حیدر کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرتا تھا میں گھر کی دیگر خواتین کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ مگر میں عطیہ سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔ ابھی تک ان کے ہاں سے کوئی بھی ہمیں ملنے کے لیے نہیں آیا تھا اس دن بھی میں حیدر کی بھابی سے عطیہ کے بارے میں ہی بات کر رہی تھی کہ ملازمہ نے آ کر بتایا کہ دلاور آیا ہے اور حیدر کی بیوی سے ملنا چاہتا ہے میں نے بھابی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ''حیدر کا کزن .....'' ابھی یہیں تک انہوں نے کہا تھا کہ دروازے سے نہایت اسمارٹ قد آور گورا چٹا لڑکا اپنی سیاہ مونچھوں تلے لبوں پر مسکراہٹ سجائے داخل ہوا۔ اس گھرانے کی خواتین خاصی بے ڈول تھیں جبکہ مرد بہت خوبصورت اور اسمارٹ تھے۔

''بھابی اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں ان سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''دیکھو دلاور یہ ہماری مہمان ہیں ان کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔'' وہ تنبیہی انداز میں اس سے کہتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔

''آپ بے فکر رہیں۔''

وہ مسکراتا ہوا بولا ''میرا نام دلاور ہے'' اور آپ حیدر کے کزن ہیں۔'' میں نے اس کی بات بیچ ہی سے اچک لی ''حیدر کا کزن ہونے کے علاوہ میں اس غمزدہ اور آفت رسیدہ عطیہ کا بھائی بھی ہوں۔'' اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔

''اوہ!'' میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں بات کہاں سے شروع کروں۔''

''کہیے میں غور سے سن رہی ہوں۔''

''آپ وعدہ کیجیے کہ مجھے معاف کر دیں گی مجھے چند ایسی باتیں کہنی پڑیں گی جن سے آپ کو تکلیف پہنچے گی چبھنے والی دل دکھانے والی باتیں ہیں۔ میرا مقصد آپ کو اذیت پہنچانا نہیں ہے جس موضوع پر میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں اس کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو بھی گفتگو ہم دونوں کے درمیان ہو اس کی خبر کسی تیسرے کو نہ ہو۔'' وہ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں سنبھل سنبھل کر کہہ رہا تھا۔

''حیدر نے تو بتایا تھا کہ عطیہ کے بھائی ان پڑھ اور غصہ ور ہیں، لیکن آپ تو مجھے تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے انسان نظر آتے ہیں۔'' دراصل حیدر بھائی جب امریکا جا رہے تھے تو میں چھوٹا تھا اس وقت میں اسکول جاتا تھا میں نے ان کے جانے کے بعد تعلیم جاری رکھی تھی۔''

''آپ بے فکر ہو کر مجھ سے ہر بات کیجیے کسی دوسرے کو اس کا کوئی علم نہیں ہوگا یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''میری بہن دل کی اتھاہ گہرائیوں سے حیدر بھائی سے محبت کرتی ہے اس کی امیدوں کا مرکز حیدر بھائی ہیں۔ آپ میری بہن پر رحم کیجیے جو راتوں کو سو نہیں سکتی جو دن رو رو کر گزارتی ہے زندہ درگور تو وہ پہلے ہی تھی مگر حیدر بھائی کی آپ سے شادی کے بعد..... ان پر حزن و یاس کی کیفیت مسلط ہو گئی ہے۔ کوئی غم اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ مجھے خوف ہے کہیں وہ مر ہی نہ جائے آپ اسے اس کا حق دلوایئے، کیسے یہ آپ جانتی ہیں۔''

''صاف صاف الفاظ میں کہیے آپ کیا چاہتے ہیں۔''

''بہت اچھا، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کی زندگی سے نکل جائیں۔''

''آپ کی بہن سے مجھے ہمدردی ہے لیکن مجھے اپنی ذات سے بھی تو ہمدردی ہے۔ یہ خود غرضی میرے خیال میں جائز ہے۔''

''آپ عطیہ باجی کے دکھ کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔'' اس نے ٹہلتے ہوئے کہا۔

''آپ کی برادرانہ محبت قابلِ ستائش ہے مگر فرض کیجیے کہ میرا بھائی اسی طرح آپ کی بہن کے پاس جا کر درخواست کرے تو؟''

وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''میں یہ سب سننا نہیں چاہتا۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ مگر میں نے اسے ٹوکا۔

''یہ حق آپ کو کہاں سے حاصل ہو گیا کہ جو کچھ آپ کے جی میں آئے آپ کہہ دیں۔ دلاور صاحب میں تو یہاں آپ کی بہن سے ملنے آئی تھی۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ اسے اس کا حق دلانے کے لیے ہی میں نے اتنا لمبا سفر طے کیا ہے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا آپ دونوں میں سے ایک کو حیدر کی زندگی میں سے نکلنا ہوگا۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اگر میں انکار کروں تو؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یاد رکھنا ہم لوگ جان دینے سے نہیں ڈرتے اور جو جان دینے سے نہیں ڈرتے وہ جان لینے سے بھی نہیں ڈرتے۔'' اس کے لہجے کی سفاکی نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ''آپ نے یہاں آنے کا فیصلہ بہت غلط کیا تھا جتنی جلدی ممکن ہو آپ یہاں سے چلی جائیں اور

حیدر بھائی کو بھول جائیں وہ اب یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔"

"میں حیدر کے بغیر نہیں جاؤں گی۔" میں فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ آپ کو بتانا میرا فرض تھا آگے آپ کی مرضی۔"

"آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میں امریکی شہری ہوں اگر یہاں میرا بال بھی بیکا ہوا تو آپ لوگ مشکل میں پھنس جائیں گے۔" وہ تمسخر سے ہنسا "بی بی ہم جان ہتھیلی پر لیے پھرنے والے لوگ ہیں ہمیں ان باتوں کا ڈراوا نہ ہی دیں تو بہتر ہے۔"

مجھے لگا کہ دلاور بہر حال خون خرابے سے گریز کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ گفت وشنید سے مجھے قائل کرلے۔ وہ جانے کے لیے کھڑا ہوگیا۔ میں جو ان سب کو اپنانے آئی تھی اتنی دور سے۔ میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

رات حیدر جب میرے پاس آکر لیٹے تو میں نے ان کے سینے پر اپنا سر رکھتے ہوئے کہا "حیدر واپس گھر چلیں میرا یہاں دل نہیں لگ رہا۔"

"ارے اتنی جلدی بور ہوگئیں تم تو بڑے شوق سے یہاں آئیں تھیں؟" انہوں نے میرا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا "ہاں بور ہوگئی ہوں بس چلیں۔"

"کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟ میں نے سنا ہے آج دلاور آیا تھا اس نے تو کچھ نہیں کہا؟" انہوں نے سوچ میں گم لہجے میں پوچھا "نہیں" میرا دل بھر آیا "عطیہ سے ملے بغیر چلے جائیں۔ تم تو عطیہ کو ساتھ لے کر جانا چاہتی تھیں۔ کل ان لوگوں نے تمہیں دعوت دی ہے دیکھو کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ دلاور اسی لیے آیا تھا۔"

"مگر دلاور نے تو مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"وہ امی سے کہہ کر گیا ہے۔" دلاور کی باتیں سن کر میرا دل اس دعوت میں جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ مگر حیدر کی دل آزاری کے خیال سے میں چپ رہی۔

دوسرے دن عطیہ کے گھر دعوت کا بڑا اچھا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجھے حسب روایت خواتین کے ساتھ بیٹھنا پڑا جبکہ حیدر باہر مردانے میں تھے۔ میرا دل نجانے کیوں ڈرا جا رہا تھا۔ عطیہ مجھ سے بڑے خلوص سے ملی۔ میری پذیرائی میں وہ سب سے آگے تھی۔ میں نے اپنے دلی جذبات اس کے سامنے کھول دیے کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں کتنا خلوص اور محبت لے کر آئی تھی۔ وہ بڑی متاثر دکھائی دے رہی تھی اور پُرشوق نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی "عطیہ میں اور تم اب ایک ساتھ رہیں گے بالکل بہنوں کی طرح" ہتھیلیوں کی طرح۔ کیا خیال ہے تم میرے ساتھ خوش تو رہو گی نا؟"

"میں تو تمہیں کچھ اور ہی سمجھی تھی مگر تم تو بالکل ہماری ہی طرح کی ہو اور اردو بھی کتنی اچھی بولتی ہو۔ کہاں سے سیکھی؟"

"اپنی دوست انیتا سے سیکھی تھی" ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں پھر کسی کی زوردار چیخ کی آواز آئی ہم تیزی سے باہر لپکے دیکھا تو عطیہ کے بھائی جن سے میں کچھ دیر پہلے متعارف ہوئی تھی ہاتھ میں ریوالور لیے ہماری ہی طرف آرہے تھے ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ عطیہ نے تیزی سے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے گھسیٹتی ہوئی لے گئی اور حویلی کے کسی چور دروازے سے وہ مجھے باہر نکال کرلے جانے میں کامیاب ہوگئی۔ میرا ذہن تو جیسے بالکل ماؤف ہوگیا تھا۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا۔ کافی دیر ہم پیدل سفر کرتے رہے شام کا جھٹپٹا چھا رہا تھا کھیتوں کی نرم مٹی میں میرے پاؤں دھنس رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے چل رہی تھی۔ عطیہ نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔

"تیز چلو خدا کے لیے تیز چلو۔ وہ لوگ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔"

"مجھے بھی؟ تو کیا انہوں نے حیدر کو مار دیا ہے نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔" میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

اب کچھ پتھریلا علاقہ شروع ہوگیا تھا ٹیلے نما چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں ایک کھوہ سی بنی ہوئی تھی عطیہ نے مجھے اس کھوہ میں بیٹھنے کو کہا۔ پیاس سے حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے "میری بات غور سے سنو فاطمہ میں تمہارا سامان اور کاغذات وغیرہ لینے جا رہی ہوں جب تک میں واپس نہ آؤں تم یہاں سے نہیں نکلنا۔ میرے پاس وقت کم ہے تم نے یہاں آکر اچھا نہیں کیا۔ حیدر مجھ سے دور تھا میرا انہیں تھا مگر وہ زندہ تو تھا۔" وہ آنسو پونچھتی ہوئی تیزی سے اندھیرے کی چادر میں گم ہوگئی۔ ایک پچھتاوا مجھے گھیرے ہوئے تھا۔ میں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہوگیا تھا۔ جب عطیہ واپس آئی تو اس کی بھی تصدیق ہوگئی کہ حیدر اب زندہ نہیں تھا۔ اس کے بھائیوں نے حیدر کو جان سے مار دیا تھا۔

اس کے بھائیوں نے ہم دونوں کو ابدی آنسو دے دیے۔ ابدی غم بخش دیا تھا۔ ہم دونوں نے اس رات کی سیاہی میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر حیدر کی یاد میں جی بھر کے آنسو بہائے۔

"فاطمہ ہو سکے تو ہمیں معاف کردینا اب تم جاؤ۔ رات کے اندھیرے میں اتنی دور نکل جاؤ کہ میرے بھائیوں کی نظر تم پر نہ پڑ سکے۔ اپنے وطن لوٹ جاؤ۔" اس نے الوداعی نظروں سے مجھے دیکھا اور تیزی سے مڑی اور گھپ اندھیرے کا حصہ بن گئی۔

میری فلائٹ اناؤنس ہوگئی ہے میں بوجھل قدموں کے ساتھ جہاز کی طرف بڑھی ہوں اس کی سیڑھیوں پر کھڑی پلٹ کر انٹرپورٹ کی گہما گہمی کو دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں۔" میں اپنی اور تمہاری قیمتی متاع اپنا اور تمہارا حیدر تمہیں سونپ کر جا رہی ہوں الوداع پاکستان الوداع۔"

●●●

فیصلہ

تحریر : اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

مکرمی ایڈیٹر صاحب، آداب!

سرگزشت کی سچ بیانیوں کا حصہ بہت سی ان کہی حقیقتوں کو کھولتا ہے۔ کچھ واقعات پڑھ کر تو رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ لیکن جب میں خود اپنی کہانی پر غور کرتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کیا کسی اور کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا ہے؟ اور ہو تو اس کا کیا حل یا نتیجہ ہوگا؟ اگر آپ اسے قابلِ اشاعت سمجھیں تو میں مشکور رہوں گی۔

راوی: آمنہ کمال، کراچی

"ماما! میں اسد کے ساتھ زندگی نہیں بتا سکتی۔"

سونیا کی بات سنتے ہی میں نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خمار آلود آنکھوں میں گہری سنجیدگی تھی اور دلکش کتابی چہرے پر نفرت آمیز غصے کی جھلک۔ وہ یہ بات مذاق میں نہیں کر رہی تھی بلکہ پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنا فیصلہ سنا رہی تھی۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں لپک کر کھڑکی کا دروازہ لاک کردیا۔ مبادا کوئی اور یہ بات سن نہ لے پھر میں اس کی طرف پلٹ آئی، اسے بازو سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"جی ماما۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" اس کے لہجے میں اٹل فیصلے کی سختی تھی "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے شوہر سے طلاق لے لوں گی۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسکی مانگ میں افشاں چمک رہی تھی اور اس کی ملائم اور گداز ہتھیلیوں پر مہندی سے بنے بیل بوٹے بہار دکھا رہے

تھے۔

''ابھی کل رات تم رخصت ہوکر سسرال گئی ہو۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''اور آج واپس آکر یہ کہہ رہی ہو کہ تم اپنے شوہر سے طلاق لے لوگی؟'' اور شوہر بھی کون؟ اسد! جس کی خاطر تم نے گھر میں سب سے ٹکر لی۔ جبکہ تمہاری اماں بی کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا پھر بھی تم نے ان کی پسند ناپسند کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس سے شادی کی..... اور اب.....''

میری پوری بات سن کر اس نے گہری سانس لی۔

''اماں بی کی جہاندیدہ نگاہوں نے شاید کچھ اندازہ کرلیا ہوگا اسی لیے وہ اسد سے میری شادی کی مخالفت کررہی تھیں۔ کاش میں ان کی بات مان لیتی لیکن اب مجھے احساس ہورہا ہے کہ میں نے اسد سے شادی کرکے غلطی کی ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میں اب تک پوری طرح کچھ بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔

''کیونکہ.....'' سونیا نے نگاہ جھکا کر دھیمی آواز میں اصل مسئلے کی نشاندہی کی ''اسد ایک مکمل مرد نہیں ہے وہ..... وہ ادھورا ہے ماما۔'' اس کے الفاظ میرے ذہن پر گولا بن کر گرے۔

میں نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا۔ اگر میں دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر گئی ہوتی۔ لگتا تھا میرے ہاتھ پیر بے جان ہوگئے ہوں۔ میں قریب پڑی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ کئی لمحے میں اسی طرح آنکھیں بند کیے گم صم بیٹھی رہی پھر میں نے اپنی چہیتی بیٹی کی طرف دیکھا۔

وہ بوٹے سے قد اور بھرے بھرے گداز جسم کی ایک پرکشش اور دلکش لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی شفاف آنکھوں میں گلابی ڈورے اس کی آنکھوں کو عجیب سا خمار بخشتے تھے اور اس کے تراشیدہ گداز لب بناپ اسٹک کے گلابی اور نم آلود سے رہتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ہو بہو مجھ پر گئی ہے۔ میری جوانی بھی اسی کی طرح بھرپور اور قیامت خیز تھی۔ میری بھی چال سے مستی اور آنکھوں سے شراب جھلکتی تھی۔

یہ میرے حسن و شباب کا ہی کرشمہ تھا کہ ایک معزز اور کھاتے پیتے گھرانے کے کمال جیسے پڑھے لکھے لڑکے نے مجھے پسند کرلیا تھا۔ میرے والدین کا تو میرے بچپن میں ہی انتقال ہوچکا تھا۔ مجھے میری ایک غریب اور بیوہ خالہ نے پالا تھا۔ میرے پاس اس دلکش صورت اور پُرکشش جسم کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ جبکہ کمال کا گھرانہ شہر کے کھاتے پیتے گھرانوں میں سے ایک تھا۔ اس کے والد ایک بڑے سرکاری افسر تھے اور شہر کے ایک نسبتاً مہنگے اور صاف ستھرے علاقے میں ان کا شاندار بنگلہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی کچھ جائیداد تھی۔

کمال کے بڑے بھائی اقبال احمد بھی سرکاری افسر تھے اور شادی شدہ تھے انہوں نے ربیعہ بھابی سے پسند کی شادی کی تھی اور انہیں بے پناہ چاہتے تھے۔ ان کے والد کا پچھلے برس ہی انتقال ہوا تھا اور ان کے بعد گھر کی حکومت عملاً ان کی والدہ اماں بی کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ وہ ایک طرح دار اور رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں' کو کہ وہ ہر فیصلہ اور ہر کام اپنی مرضی اور اپنی پسند کے مطابق کرنے کی عادی تھیں' مگر اپنے بیٹوں کی پسند کا احترام کرنا بھی جانتی تھیں۔ چنانچہ اقبال بھائی کی پسند پر انہوں نے ان کی شادی ربیعہ بھابی سے کردی تھی اور کمال کی پسند پر وہ مجھے ان کی دلہن بنا کر اپنے گھر لے آئی تھیں۔

اقبال بھائی کی شادی کو کئی برس بیت گئے تھے مگر ہنوز وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور یہ محرومی ان سے زیادہ اماں بی کو کھلتی تھی۔ گو کہ اقبال بھائی اور ربیعہ بھابی اولاد کے بغیر بھی خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کررہے تھے۔ مگر اماں بی کے نزدیک ان کی زندگی بے آب و گیاہ صحرا جیسی تھی' وہ اپنے سونے آنگن میں مہکار لٹاتے پھول کھلتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ اپنی گود میں کلکاریاں مارتے پوتا پوتی کھلانا چاہتی تھیں۔ مگر چھ برس بیتنے کے بعد بھی ربیعہ بھابی اماں بی کو ایسی کوئی خوشی نہ دے سکی تھیں۔ مجبور ہوکر انہوں نے اقبال کی زندگی سے ربیعہ بھابی کو بے دخل کردینے کا فیصلہ کرلیا اور بھلا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اقبال بھائی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہوگئے۔

وہ دوسری شادی کے بالکل بھی خواہش مند نہ تھے۔ مگر اماں بی نے ان کے لاکھ نا نا کہنے کے باوجود آخر ان کے سر پر دوبارہ سہرا سجا ہی دیا۔ بانو بھابی صرف اماں بی کی پسند نہیں وہ ایک شریف گھرانے کی پڑھی لکھی خوش شکل اور نیک خاتون تھیں' شادی کے ایک برس بعد ہی بیوہ ہوگئی تھیں اور اب تین برس کا ایک معصوم سا بیٹا ان کے ساتھ تھا۔ بچے والی عورت کو بہو بنانے میں اماں بی کی یہ مصلحت شامل تھی کہ بہرحال یہ تو یقین تھا کہ آنے والی بہو ماں بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اقبال بھائی کی اس دوسری شادی کو بھی کئی برس بیت گئے۔ مگر بانو بھابی پھر سے ماں نہ بن سکیں۔ کیونکہ وہ پہلے سے ہی ماں تھیں' اس لیے اس محرومی کا انہیں تو قطعاً ملال نہ تھا۔ مگر اماں بی کو پوتے پوتیوں کی بڑی تڑپ تھی' کو کہ وہ بانو بھابی کو بہت پسند کرتی تھیں۔ بانو بھابی فطرتاً سادہ لوح کم سخن اور محبت کرنے والی شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ بیوگی کا اذیت ناک دکھ جھیل چکی تھیں اس لیے یہ شاندار گھر اور اقبال بھائی جیسے کم

گو اور خیال رکھنے والے شوہر کو پاکر وہ اماں بی کی بے حد ممنون بھی تھیں اور دل و جان سے ان کی خدمت میں لگی رہتیں۔ ان کے بیٹے دانش کو بھی گھر کے بچے کی ہی حیثیت حاصل تھی اور اماں بی بھی اس سے لاڈ پیار کرتی تھیں۔ مگر اپنے خون کی خاطر ان کے دل میں دن رات ہوک اٹھا کرتی۔ اب وہ بڑی دلہن یعنی بانو بھابی سے کسی قدر مایوس ہوچکی تھیں اور ان کی تمام تر امیدیں میری ذات سے وابستہ تھیں۔ اپنے پوتا پوتی کے لیے اب آنکھوں پہر ان کی نگاہیں میری جانب لگی رہتیں۔

جب وہ کھوجتی اور ٹٹولتی نگاہوں سے مجھے سرتاپہ دیکھتیں تو جانے کیوں کمال پریشان سے ہواٹھتے اور ان کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں ایک خوف کا سایہ لہرانے لگتا۔ شاید وہ اقبال بھائی کی پہلی شادی کے انجام سے خائف تھے۔ وہ مجھ سے بے پناہ پیار کرتے تھے اس لیے وہ مجھ سے بچھڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اور جہاں تک میرا تعلق تھا' اپنے اس بھری دنیا میں کمال کے اور اس گھر کے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ میری شادی کے کچھ ہی عرصے بعد خالہ بھی اللہ کی پیاری ہوگئی تھیں۔ اگر کمال کی محبت کا سہارا نہ ہوتا تو میرے لیے اس وسیع دنیا میں تنہا زندگی بسر کرنا کس قدر دشوار ہوتا۔ میں کمال جیسے شوہر کی دیوانگی کی حدوں کو چھوتی چاہت پاکر جس قدر ناز کرتی کم تھا۔ لوگ میرے مقدر پر رشک کرتے تھے اور میں اپنی خوش بختی پر ہر لمحہ خدا کی شکر گزار رہتی۔

مگر گزرتے وقت کا ہر لمحہ میرے رگ و پے میں ایک بے نام سا خوف بھرتا جارہا تھا۔ شادی کو تین برس ہوچکے تھے مگر میری گود خالی تھی۔ میں اماں بی کی کھوجتی اور سوال کرتی نظروں کے ساتھ ہی جب میں کمال کے مایوس چہرے پر دکھ کا بادل چھاتا دیکھتی تو تڑپ اٹھتی تھی۔

انہی دنوں کمال کا سال بھر کے لیے خوشاب میں تبادلہ ہوگیا۔ ان کی ملازمت ہی ایسی تھی کہ ہر تین سال بعد ایک سال کے لیے کسی دور دراز کے اسٹیشن پر فرائض انجام دینا ہوتے تھے۔ اگلے ہی ہفتے وہ مجھے لے کر خوشاب کے لیے روانہ ہوگئے۔

وہاں پہنچنے کے دو ماہ بعد ہی میری زندگی میں وہ خوشی در آئی جس کے لیے میں ہر لمحہ ترسی تھی۔ کمال نے اماں بی کو جب یہ خوش خبری دی تو حسبِ توقع وہ خوشی سے نہال ہو اٹھیں۔ ان کا اصرار تھا کہ مجھے فوری طور پر گھر بھیج دیا جائے مگر کمال نے انہیں سمجھایا کہ خوشاب جیسے دور افتادہ علاقے سے دشوار گزار سفر کرکے گھر واپس پہنچنا اس وقت میرے لیے ممکن نہ تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹروں نے مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ اماں بی چھوٹی موٹی کئی بیماریوں اور ان سے بھی زیادہ بڑھاپے کی وجہ سے خود اس قابل نہ تھیں کہ اتنے دور کا سفر کرکے میرے پاس آسکتیں' چنانچہ دل مسوس کر رہ گئیں اور آنے والی خوشی کا بے قراری سے انتظار کرنے لگیں۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا اور دس ماہ بعد جب میں واپس گھر لوٹی تو میری گود میں ننھا جمال تھا۔ سیاہ چمک دار آنکھوں اور کھلتی ہوئی گندمی رنگت کا گل گوتھنا سا اماں بی کا پوتا' اماں بی اسے گود میں لے کر خوشی سے رو پڑیں۔ گھر گھر مٹھائی تقسیم کی گئی اور بڑی دھوم دھام سے ننھے جمال کا عقیقہ کیا گیا۔

اماں بی پوتا پاکر بے حد خوش تھیں۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اب ان کے دل میں ایک پوتی کا خیال چٹکیاں لینے لگا تھا۔ ان کی خواہش کا مجھے پتا چلا تو میں حیران و پریشان سی کمال کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس پل ان کی آنکھوں اور چہرے پہ ایسا کرب و ملال تھا کہ میں تڑپ کر ان کے سینے سے جا لگی۔

''اللہ بڑا بادشاہ ہے کمال۔'' میں نے ان کے سینے میں اپنا سر چھپاتے ہوئے سرگوشی کی ''اس نے جب پہلے ہمیں بیٹے کی نعمت عطا کی ہے تو وہ بیٹی کی رحمت سے بھی ہمیں ضرور نوازے گا۔''

اور کمال کی مایوس آنکھوں سے محرومی کے دو قطرے نکل کر میرے بالوں میں جذب ہوگئے۔

تین سال کا عرصہ بیت چکا تھا ان کا پھر سے تبادلہ ہوگیا۔ اب کے ان کا تبادلہ خضدار میں ہوا تھا۔ اماں بی کا اصرار تھا کہ وہ مجھے اور ننھے جمال کو گھر پر ہی چھوڑ کر جائیں مگر ان کے اکیلے پن اور کھانے پینے کے خیال سے میں ان کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی۔

''جمال کے بغیر گھر سونا ہوجائے گا۔'' اماں بی کے لہجے میں پوتے کے لیے پیار کی جھنکار تھی۔

''وہ تو ہے۔'' میں نے رسان سے جواب دیا ''مگر ذرا سوچیے یہاں اور لوگ بھی ہیں' دانش ہے اقبال بھائی اور بانو بھابی ہیں مگر وہاں میلوں کی مسافت پر اس غیر آباد اور ویران علاقے میں کمال میرے اور بچے کے بغیر تنہا کیونکر رہ سکیں گے۔ انہیں کھانے کی بھی پریشانی ہوگی' کیونکہ اس جیسے پس ماندہ علاقے میں نہ کوئی ڈھنگ کا ہوٹل ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی اچھا پکانے والا دستیاب ہوتا ہے اور یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ خود پکانے کے معاملے میں کمال بالکل ہی صفر ہیں۔''

آخر میرے سمجھانے بجھانے پر کچھ کمال کے آرام کے

خیال سے وہ مجھے ان کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہوگئیں اور میں اپنے بیٹے کو لے کر ان کے ساتھ خضدار چلی گئی اور وہاں پہنچتے ہی میرا دامن ایک بار پھر خوشی سے بھر گیا۔ اماں بی کو خبر ہوئی تو وہ دامن پھیلا کر بیٹھ گئیں۔ اب کے انہیں پوتی ہی چاہیے تھی اور خدا نے ان کی دعا سن لی۔

اور اس بار جب میں واپس گھر لوٹی تو میری گود میں چاند جیسی سونیا تھی۔ اس کی شفاف بلوری آنکھیں اور صندل کی سی صبیح رنگت دیکھ کر اکثر لوگ کہتے ''یہ تو پٹھان بچی لگتی ہے۔''

یہ جملہ اماں بی کو سخت ناگوار گزرتا۔ وہ تنک کر کہتیں ''پٹھان بچی کیوں لگنے لگی ہو بہو اپنی دادی پر گئی ہے۔''

پھر جوں جوں سونیا بڑی ہوتی گئی لوگوں کو اس میں میری شباہت نظر آنے لگی۔ اب جمال اور سونیا دونوں اسکول جانے لگے تھے۔ کمال اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم اور بہترین زندگی دینا چاہتے تھے۔ اس لیے زیادہ پیسے کی ضرورت تھی اور ویسے بھی اب وہ روز روز کے ان طویل تبادلوں سے عاجز آچکے تھے چنانچہ انہوں نے نوکری سے استعفیٰ دے کر اپنا کاروبار شروع کردیا تھا۔ اور خدا نے کاروبار میں خوب ترقی اور برکت دی۔

سونیا کے آنے سے ہماری زندگی مکمل ہوگئی تھی۔ آرام دہ اور پرسکون گھر، چلتا ہوا کامیاب کاروبار، ایک ذہین بیٹا اور ایک چاندسی بیٹی۔ خدا نے زندگی کی تمام نعمتیں ہمیں عطا کردی تھیں۔ اماں بی بھی بے حد خوش اور مطمئن تھیں۔ وہ بانو بھابی کے بیٹے دانش سے بھی پوتوں کا سا پیار کرتی تھیں، جمال تو ان کا اپنا خون تھا اس پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں۔ مگر لگتا تھا سونیا ان کے دل کی دھڑکن تھی۔ ان کے بے انتہا لاڈ پیار نے سونیا کو کسی قدر خودسر اور ضدی بھی بنادیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برسوں بیت گئے۔ جمال اے لیول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ سدھار گیا تھا اور حصولِ تعلیم کے بعد وہیں ایک انگریز لڑکی سے شادی کرکے اس نے اپنی دنیا وہیں بسالی تھی۔

اب ہمارے پاس صرف سونیا رہ گئی تھی۔ وہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں پہنچ چکی تھی۔ اماں بی کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ اب وہ سونیا کا گھر بسانے کی خواہاں تھیں۔ سونیا انہیں بہت عزیز تھی اور اسے وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہی رکھنا چاہتی تھیں اور شاید اسی لیے انہوں نے سونیا کے لیے دانش کا انتخاب کیا تھا۔

دانش انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک بہت بڑے ادارے میں کلیدی عہدے پر فائز ہوچکا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا فرمانبردار اور محبت کرنے والا لڑکا تھا۔ مجھے اور کمال کو بھی وہ بے حد پسند تھا۔ بچپن کا دیکھا بھالا، نیک چلن، خوش شکل، خوش اخلاق، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کماؤ لڑکا۔ اس سے بہتر اور کون سا رشتہ ہوسکتا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ سونیا کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

مگر اس نے اس رشتے کے لیے سختی سے انکار کردیا۔ انکار کی وجہ اسد تھا۔ اسد سونیا کا کلاس فیلو تھا، وہ پچھلے پانچ سال سے ایک ساتھ پڑھتے چلے آرہے تھے اور ان دونوں کے بیچ بڑی دوستی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ دوستی پیار میں بدل چکی تھی۔ بقول سونیا کے وہ اسد کے بغیر زندگی بتانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ خود اسد بھی اس سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔

اسد شہر کے ایک دولت مند گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ اس کے والد شہر کے ایک انتہائی مشہور ڈاکٹر تھے اور ایک اچھے علاقے میں ان کا ذاتی اسپتال تھا۔ اسد دیکھنے میں بھی خوبرو، جاذب نظر اور رکھ رکھاؤ والا لڑکا تھا۔ بظاہر ایسی کوئی بات نہ تھی کہ اسد کے رشتے کے لیے انکار کیا جاتا۔ مگر اماں بی نے اسد کو دیکھتے ہی اس رشتے سے انکار کردیا تھا۔ میرا اور کمال کا خیال تھا کہ وہ شاید دانش کی محبت میں ایسا کررہی تھیں۔ انہیں پتا چلا تو انہوں نے صاف لفظوں میں اس خیال کی تردید کی، کہنے لگیں۔

''میری یہ خواہش ضرور تھی کہ سونیا کی شادی دانش سے ہوتی۔ اس طرح سونیا اسی گھر میں ہماری نظروں کے سامنے رہتی۔ مگر اسے یہ رشتہ منظور نہیں تو میں کیا کرسکتی ہوں۔ دانش ایک بہت اچھا لڑکا ہے اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ مگر جہاں تک اسد کا تعلق ہے تو وہ اس قابل نہیں کہ سونیا کی اس سے شادی کی جائے۔ بہتر ہوگا کہ سونیا کے لیے کوئی اور رشتہ تلاش کیا جائے۔''

اماں بی کے اس فیصلے پر سونیا غصے سے سلگ اٹھی۔ اس نے ادب لحاظ ایک طرف رکھ کر کہا تھا ''اماں بی کون ہوتی ہیں میری زندگی کا فیصلہ کرنے والی؟'' زندگی مجھے بتانی ہے اس لیے یہ فیصلہ کرنے کا مجھے پورا حق ہونا چاہیے کہ کس کے ساتھ بتاؤں۔''

وہ سونیا کو بے حد چاہتی تھیں، ہر وقت اس کی ناز برداریوں میں لگی رہتی تھیں۔ سونیا بھی ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ مگر آج اس کا چبھتا لہجہ اور بات کا انداز برچھی کی طرح ان کے دل میں پیوست ہوکر رہ گیا۔ کیسی کیسی منتوں مرادوں اور دعاؤں سے انہوں نے یہ پوتی پائی تھی۔ کیا اس دن کے لیے؟ وہ دل شکستہ سی اندر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ

گئیں اور یوں چپ سادھ لی کہ گویا وہ گھر میں ہی موجود نہ ہوں۔

کمال اماں بی کی خاموشی کا سبب سمجھ رہے تھے۔ مگر کیا کرسکتے تھے۔ بظاہر اسد میں انہیں کوئی کمی یا برائی نظر نہ آتی تھی سو انہوں نے اسد کا رشتہ قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر اس رشتے پر رسمی سی مہر تصدیق لگوانے کے لیے وہ اماں بی کے کمرے میں گئے۔ ماں کی خوشی کو ہر چیز سے زیادہ مقدم جاننے والے کمال آج کیا فیصلہ لیتے ہیں۔ اگر اماں نے رشتے کی منظوری سے انکار کردیا تو وہ کیا کریں گے؟ چہیتی ماں کا حکم مانیں گے یا لاڈلی بیٹی کا دل رکھیں گے؟ میں باہر کھڑی سوچ رہی تھی۔

اماں بی نے اپنے چہیتے بیٹے کو کسی امتحان میں نہ ڈالا۔ وہ سونیا کی اس دن کی بیکری کے بعد سے اپنے آپ میں سمٹ گئی تھیں، اس لیے بنا ایک لفظ بولے انہوں نے سر جھکا کر رشتے کے لیے رضامندی دے دی۔

اور یوں کل رات سونیا نے پیارے محبوب اسد کی دلہن بن کر اس گھر سے رخصت ہوکر سسرال چلی گئی تھی۔ اور آج صبح واپس آکر اس نے مجھے اپنا یہ فیصلہ سنادیا تھا کہ وہ اسد کے ساتھ اپنی زندگی نہیں بتاسکتی اس کا جواز اس نے یہ پیش کیا تھا کہ اسد ایک نامکمل مرد ہے وہ سونیا جیسی جوانی سے بھرپور لڑکی کے سینے میں بھڑکتی جذبات کی آگ بجھانے کی صلاحیت سے محروم ہے۔''

''اس کے علاوہ تو اس میں اور کوئی کمی نہیں؟'' بڑی دیر بعد میں نے رسان بھری آواز میں کہنا شروع کیا ''وہ ایک دولت مند گھرانے کا تعلیم یافتہ مہذب نیک صالح اور محبت کرنے والا لڑکا ہے۔ تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور خود تمہارے دل میں اس کے لیے.....''

''میرے دل میں اس کے لیے اب کچھ بھی نہیں ہے۔'' میری بات سن کر شاید اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ اسے بالکل یہ توقع نہیں تھی کہ میں اس کے فیصلے پر اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کروں گی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''اس کی تمام خوبیاں، اس کی اس خامی کے سامنے بے معنی ہیں ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی کیونکر بتائی جاسکتی ہے؟''

''زندگی بتانے کے لیے ایک اچھے ساتھی ایک مہربان دوست اور ایک محفوظ سائبان کی ضرورت ہوتی ہے سونی! اور اسد ان تمام خوبیوں سے مالا مال ہے۔ جہاں تک جذبات کے اٹھتے طوفان کا تعلق ہے تو یہ ندی دیکھے ہی دیکھتے اتر جاتی ہے۔''

''آپ عجیب بات کررہی ہیں۔'' سونیا کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''جذبات کی تسکین کے ساتھ شادی شدہ زندگی اولاد کی بھی متقاضی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ.....''

''اولاد تقاضائے تسکین اور خوشی ضرور ہے۔ مگر اس کے ہونے یا نہ ہونے سے شاید بہت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے اس کے لہجے کی ناگواری نظر انداز کرتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا ''اب دیکھو تمہارا بھائی جمال وہ برسوں سے پردیس میں جا بسا ہے اور اب شاید ہی کبھی لوٹ کر آئے اور جہاں تک بیٹیوں کا تعلق ہے تو وہ تو دوسرے گھر کے لیے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ان سے کیسی توقع اور آخر میں وہی بوڑھے میاں بیوی رہ جاتے ہیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹنے کے لیے۔''

''مجھے حیرت ہے آپ اس طرح کیسے سوچ سکتی ہیں؟'' سونیا نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ذرا سوچیے میری جگہ اگر آپ ہوتیں تو.....؟''

مجھے اس سے ایسے کسی سوال کی توقع نہ تھی۔ میں اس کا غصے سے تمتماتا چہرہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کرب اور ملال کی گہری پرچھائیں میرے چہرے پر چھاتی چلی گئی۔ مجھے اپنا سر چکراتا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے دیوار کو تھام کر اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ سونیا میری بگڑتی حالت دیکھ کر بے اختیار گھبرا اٹھی ''پلیز ماما.....''

اس نے میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنے بازو میرے گرد حمائل کردیے۔

''میری بات آپ کو بری لگی..... سوری ماما..... آئی ایم سوری۔''

ضبطِ گریہ سے سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھول کر میں نے اس کے ملول چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اس کی پریشان آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''شاید آج وہ وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں اس راز میں شامل کرلوں جو برسوں سے میرے سینے میں دفن ہے۔'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پلکیں جھپکا کر میری طرف دیکھا۔

''ابھی تم نے پوچھا تھا اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو.....؟ تو سنو! آج سے برسوں پہلے جب میری شادی ہوئی

تو سہاگ رات کے بعد اگلی صبح میرے سامنے بھی فیصلے کی یہ گھڑی سوالیہ نشان بن کر آ کھڑی ہوئی تھی۔'' میری دھیمی اور کمزور آواز میں برسوں کے تنہا سفر کی تھکن شامل تھی۔

''تمہاری طرح مجھے بھی اسی رات یہ پتا چلا گیا تھا کہ میرا شوہر ایک ادھورا مرد ہے اور اس مرد نے میرے قدموں پر سر رکھ کر اپنی کمزوری کو تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ میرے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ میں نے اپنی حیران حیران آنکھوں سے اپنے حالات کا جائزہ لیا اور پھر اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ اب مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیے؟ کمال کا یہ ادھورا پن قدرت کا ودیعت کردہ تھا اس میں بھلا ان کا کیا قصور تھا۔ میں ان کی کمزوری کو جواز بنا کر ان سے دامن چھڑا سکتی تھی مگر اس طرح ان کے اس راز پر سے پردہ ہٹ جاتا۔ یہ بات ان کے لیے انتہائی اذیت ناک اور ذلت آمیز ہوتی۔ میں ایک اچھے انسان کو جسے قدرت نے پہلے ہی محرومیوں کا شکار بنایا تھا مزید دکھ نہ دے سکی اور میں نے عمر بھر..... کنواری سہاگن بن کر رہنے کا فیصلہ کرلیا۔''

''پھر..... جمال بھائی اور میں.....؟'' سونیا کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکل کر ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔

''شادی کے کئی برس بعد جب میری ساس یعنی اماں جی کو پوتے پوتیوں کی چاہت نے ستانا شروع کیا تو میں نے مزید ایک فیصلہ کیا۔'' میری آواز خود مجھے بھی کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''کمال نے ایک دور افتادہ اسٹیشن پر اپنا تبادلہ کروالیا وہاں پہنچتے ہی ہم نے مختلف لوگوں اور گھرانوں سے رابطے شروع کردیے اور آخر ہمیں ایک ایسا گھرانہ مل ہی گیا جہاں پہلے ہی بچوں کی کثرت تھی اور نئے آنے والے بچے کا نہ کسی کو انتظار تھا نہ خوشی۔ سو ہم نے ایک معقول رقم ان کے حوالے کر کے ان کے ہاں آنے والے بچے کو مانگ لیا۔ اللہ نے ان کے ہاں بیٹا دیا۔ ہم جمال کے ماں باپ بن گئے۔ کمال کے ناکارہ پن کا بھرم رہ گیا اور مجھے بانجھ پن کے طعنے سے نجات مل گئی۔ چند برس بعد میری ساس کو پوتی کی تمنا نے گدگدایا تو ایک بار پھر ہم لوگ ایک دور دراز کے علاقے میں جا پہنچے اور اب کے قدرت نے خود ہماری مدد کی۔ کمال جس ادارے میں ملازم تھے اسی ادارے میں ایک بوڑھا چوکیدار تھا۔ اس کا جواں سال بیٹا اور بہو ایک حادثے کا شکار ہو چکے تھے' فقط ان کی ایک شیر خوار بچی زندہ رہ گئی تھی۔ جوان بیٹے کی موت سے بوڑھا چوکیدار زندہ در گور ہوگیا تھا۔ موت لحہ بہ لحہ اس کی جانب بڑھتی چلی آرہی تھی وہ خود بھی زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا' مگر اس کی دم توڑتی سانسیں اس کی یتیم پوتی میں اٹکی ہوئی تھیں ہم نے اس بچی کو گود لے کر اس بیمار اور قریب المرگ بوڑھے کو پرسکون طریقے سے موت کی وادی میں اترنے کا راستہ فراہم کیا اور اپنے لیے اس بچی کو زندگی کی نئی نوید بنا کر واپس لوٹ آئے..... اور وہ بچی تم تھیں۔''

سونیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے حس و حرکت بیٹھی میری روداد سن رہی تھی۔

''اب بچے بڑے ہو رہے تھے ان کی پرورش اور تربیت کے لیے زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ کمال نے ملازمت چھوڑ کر کاروبار شروع کردیا۔ بچوں کو اچھی زندگی اور اعلیٰ تعلیم مہیا کی' بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیجا' بیٹی کو شہر کے سب سے مہنگے میڈیکل کالج سے تعلیم دلوائی اور پھر بیٹی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شہر کے ایک معزز گھرانے کے تعلیم یافتہ' قابل اور خوبرو لڑکے کے ساتھ کل رات بڑی دھوم دھام سے اس کی شادی کی اور آج وہی بیٹی میرے سامنے ایک سوال لیے موجود ہے!'' میں نے سونیا کے سپید پڑتے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میری جان! فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے تم جو بھی فیصلہ کرو گی ہمیں منظور ہوگا۔ میں نہیں کہوں گی کہ تم خود پر ظلم کرو۔ مگر پھر بھی اتنا ضرور کہوں گی کہ اگر نبھا سکو تو نبھانے کی کوشش ضرور کرنا۔''

سونیا نے اپنی آنکھیں بھینچ کر شکستہ انداز میں سر میری گود میں رکھ دیا۔ میں جانتی تھی یوں لمحوں میں اس کے لیے فیصلہ کرنا ممکن نہیں..... میں نے اسے اختیار دے دیا تھا' جو چاہے فیصلہ کرے..... لیکن اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے کہ ایسی صورتِ حال میں فیصلہ کیا ہونا چاہیے تو آپ کا جواب کیا ہوگا.....؟

شمارہ مارچ کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆اول: پائیدار استقلال..... عبید خیری، حیدر آباد

☆دوم: بانجھ ماں..... الماس شاہد، لاہور

☆سوم: بے اماں..... یمنی احمد، کراچی